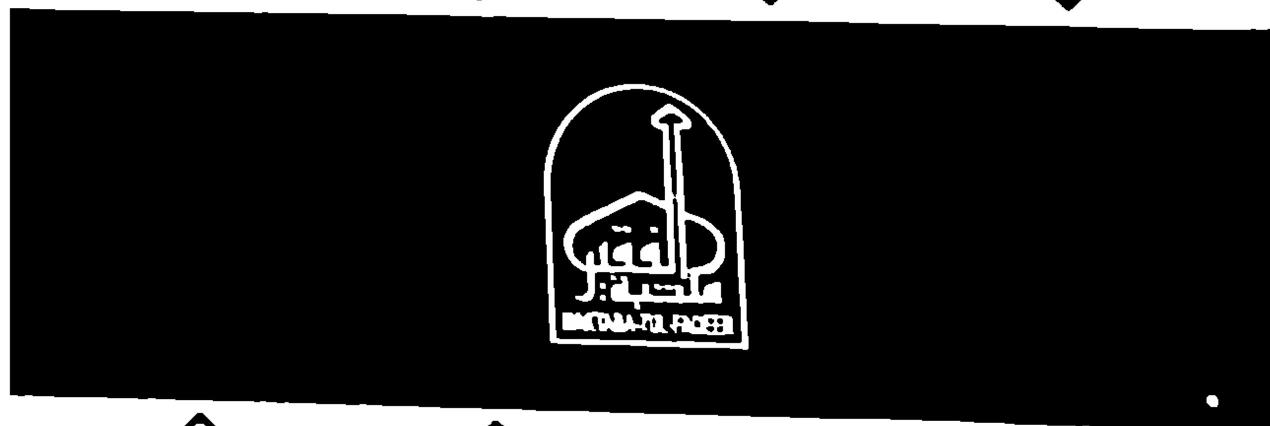
تفسیر مکی

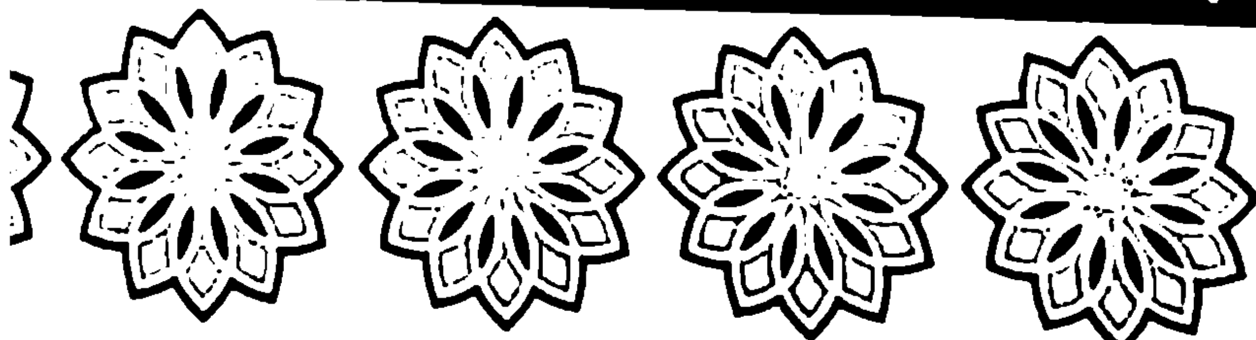
جلد چہارم

استاذ العرب والعجم فضیلۃ الشیخ
حضرت اقدس مولانا محمد مکی حجازی دامت برکاتہم
المدرس بالمسجد الحرام بمکۃ المکرمۃ



اللہ اللہ اللہ



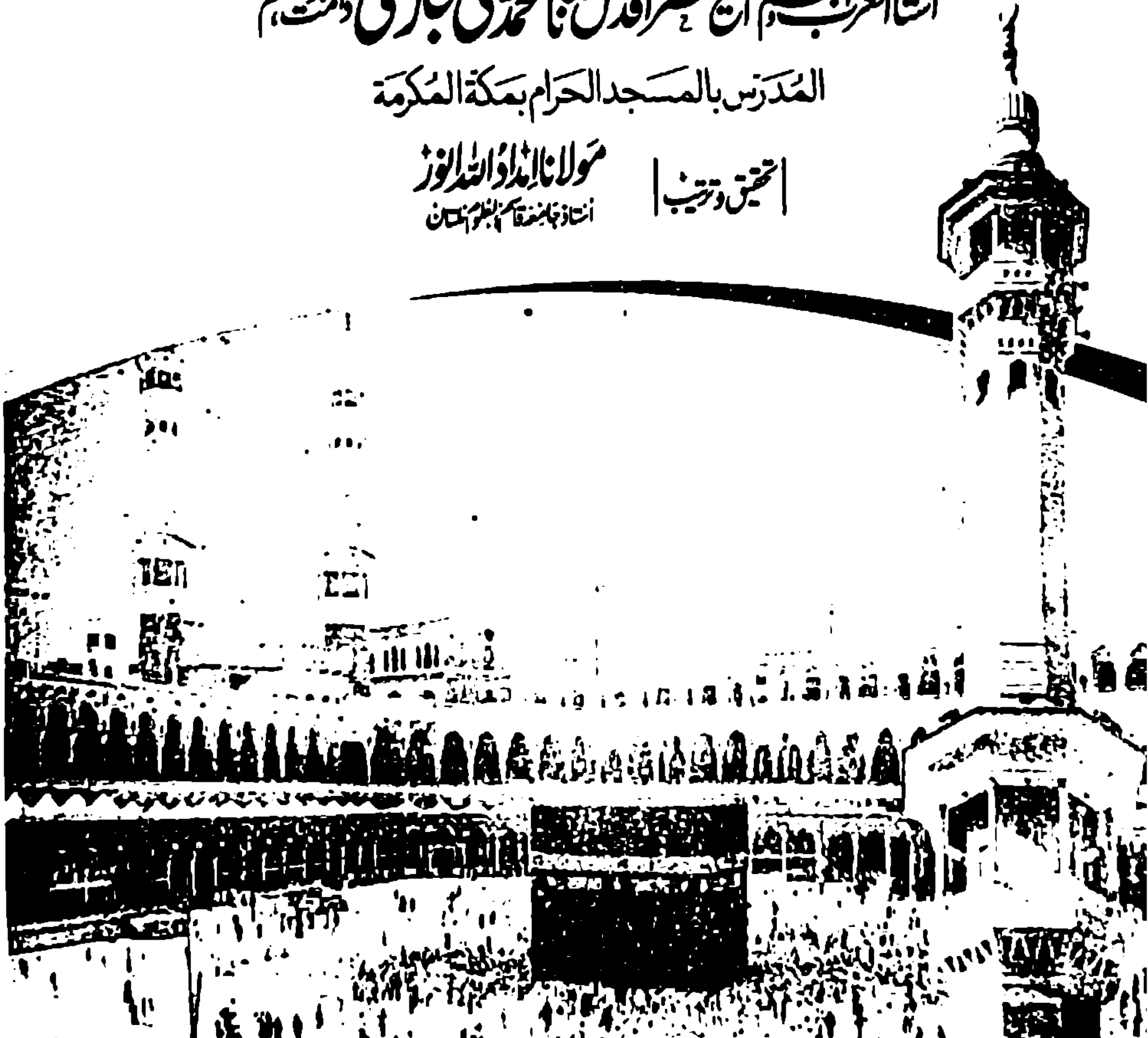


تفسیرِ مکی

جلد 4

اُستاذ العرب والعجم فضیلۃ الشیخ حضرت اقدس مولانا محمد مکی حجازی دامت برکاتہم
المُدرّس بالمسجد الحرام بمکۃ المُکرمۃ

تحقیق وترتیب | مولانا امداد اللہ انور
استاذ جامعہ قاسم العلوم ملتان





نام کتاب — تفسیر مکی جلد 4

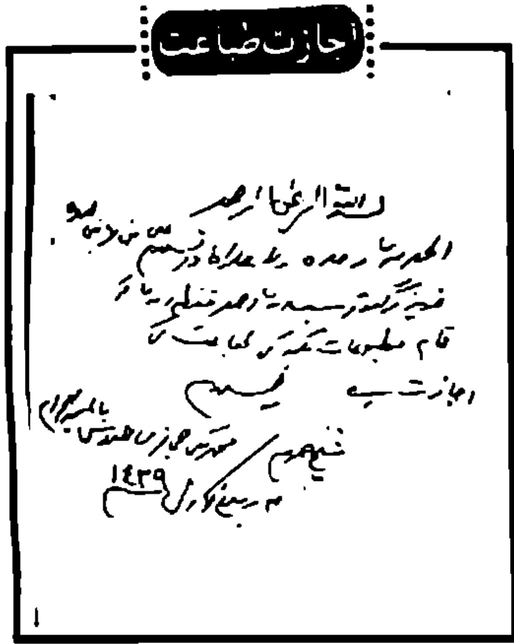
صاحبِ خطبات — استاذ العرب والعجم فضیلۃ الشیخ حضرت اقدس مولانا محمد مکی حجازی دامت برکاتہم
المدرس بالمسجد الحرام بمکۃ المکرمۃ

تحقیق وترتیب — مولانا امداد اللہ انور
استاذ جامعہ قاسم العلوم ملتان

کمپوزنگ — دار التصنیف معہد الفقیر الاسلامی جھنگ

اشاعت اول — اکتوبر 2019ء

تعداد — 1100



اجازت طباعت

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تمام مطبوعات ... کی طباعت کی

اجازت ہے

۱۴۳۹



ناشر

مکتبۃ الفقیر

www.Tasawwuf.org
0300-9652292,03228669680
0335-7873390,03101702690
E-Mail : Alfaqeerfsd@yahoo.com



بسم الله الرحمن الرحيم

فہرست مضامین



فہرست مضامین





فہرست مضامین

















فہرست مضامین



فہرست مضامین





فہرست مضامین





عرضِ ناشر



اس کائنات رنگ و بو میں تین اشیاء ایسی ہیں جو مخلوق کے قلوب کے لیے مقناطیس کی تاثیر رکھتی ہیں: 1 ...... بیت اللہ، 2 ...... کتاب اللہ، 3 ...... اہل اللہ۔

اور اگر کسی جگہ پر ان تینوں کا اجتماع ہو تو مخلوق کے دلوں کا کھنچ آنا امر بدیہی ہے، جس کا مشاہدہ مسجد الحرام میں بقیۃ السلف حضرت مولانا محمد مکی مدظلہ کے درسِ قرآن کے حلقہ میں کیا جا سکتا ہے۔ گرمی ہو یا سردی، رمضان ہو یا شوال، حج کا موسم ہو یا عمرے کا، حضرت مولانا محمد مکی مدظلہ کا درسِ قرآن مسجدِ حرام میں بلا ناغہ ہوتا ہے۔ مسجد حرام میں دوسرے مشائخ کے دروس بھی ہوتے ہیں، تاہم جس کثرت سے اور ذوق شوق سے لوگ حضرت مکی مدظلہ کے درس میں شرکت کرتے ہیں، دوسرے دروس میں یہ کچھ دیکھنے کو نہیں ملتا۔ چنانچہ برصغیر پاک و ہند، بلکہ پوری دنیا میں جہاں بھی اردو دان طبقہ حرم شریف میں آتا ہے، حضرت مکی مدظلہ کے درس سے مستفید ہوتا ہے۔

حضرت مولانا محمد مکی مدظلہ کے درس کا یہ حسن ہے کہ وہ جہاں توحیدِ خداوندی کے رسوخ اور شرک و بدعت کی تردید پر زور دیتے ہیں وہاں عشقِ رسول ﷺ اور سلف صالحین کی عقیدت و احترام پر حرف نہیں آنے دیتے،



بلکہ اپنے اکابر کے طریق پر چلتے ہوئے جس کمالِ مہارت سے سامعین کو راہِ اعتدال پر گامزن کرتے ہیں یہ انہی کے درس کا خاصہ ہے۔

حضرتِ اقدس کے دروس میں جہاں علمی نکات کی کثرت ہوتی ہے، وہیں عقائد کی درستگی، فکرِ آخرت، اخلاص وتقویٰ، اخلاقِ حمیدہ اور سیرت وکردار کی بلندی پر بھی زور دیا جاتا ہے۔

زیرِ نظر تفسیر ''انوارالحرم'' المعروف ''تفسیرِ مکی'' حضرتِ اقدس کے چند دروس کا مجموعہ ہے۔ جسے اس سے قبل اک اور ادارہ نے شائع کیا تھا اب اسے حضرت اقدس ہی کے حکم پر ''مکتبة الفقیر'' شائع کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہے۔

اللہ رب العزت اس کتاب اور ''مکتبة الفقیر'' دونوں کو شرفِ قبولیت سے نوازے۔ آمین بحرمة سید المرسلین ﷺ

اجازت ہو تو آکر میں بھی شامل ان میں ہو جاؤں
سنا ہے کل تیرے در پر ہجومِ عاشقاں ہو گا

قارئینِ کرام! گزارش ہے کہ اشاعت کے اس کام میں کہیں کوئی کمی، کوتاہی محسوس ہو یا اس کی بہتری کے لیے تجاویز رکھتے ہوں تو مطلع فرما کر عنداللہ ماجور ہوں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہمیں تازیست اپنی رضا کے لیے یہ خدمت سرانجام دینے کی توفیق عطا فرمائے اور اسے ہماری آخرت کے لیے صدقہ جاریہ بنائے۔

دعاؤں کا طالب:

فقیر سیف اللہ احمد نقشبندی مجددی

مکتبة الفقیر





پیشِ لفظ



اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ حضرت شیخ مولانا محمد مکی حجازی ان موفق من اللہ لوگوں میں سے ہیں، جن کو اللہ تعالیٰ نے سرزمین حرم میں طُوْبٰی لِمَنْ جَعَلَہُ اللّٰہُ مِفْتَاحًا لِلْخَیْرِ وَ مِغْلَاقًا لِلشَّرِّ کا مصداق کامل بنایا ہے، بفضلہ ان کے دروس حرم کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے ہر سال سینکڑوں لوگوں کو شرک و بدعت کے اندھیروں سے توحید کا نور عطا فرمایا ہے۔

اللہ بہترین جزائے خیر دے مملکت اسلامیہ سعودیہ عربیہ کو جن کے تعاون کی بدولت نصف صدی سے یہ سلسلہ خیر جاری وساری ہے، اسی سلسلہ خیر کی ایک کڑی قرآن حکیم کی عام فہم اور مفید ترین تفسیری فوائد پر مشتمل تفسیر مکی کی جلد چہارم آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ شیخ مکی زاد اللہ برکاتہم کے شکر گزار ہیں کہ انہوں نے اپنے ہزاروں عقیدت مندوں میں سے ہم خدام کو اس کارِ خیر کی نشر و اشاعت کی سعادت بخشی۔ اللہ جزائے خیر دے عزیز صالح حافظ محمد عادل صاحب سلمہ اللہ کو کہ انہوں نے اس کو حسب استطاعت پوری محنت اور توجہ سے طبع کرانے کی سعادت حاصل کی۔ اللہ کریم اپنے فضل خاص سے تاسی بأسوة السّلف کے طور پر حضرت شیخ مکی کے اس فیضِ علمی کو قبولیت عامہ تامہ سے نوازے۔ آمین

وَ مَا ذَالِکَ عَلَی اللّٰہِ بِعَزِیْزٍ

یکے از خدام اسلاف

ظفر احمد قاسم

الخادم بحدیث النبی الشریف بجامعہ خالد بن ولید وہاڑی

تفسیر سورۂ بقرہ

﴿قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلَى قَلْبِكَ بِإِذْنِ اللَّهِ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَهُدًى وَّبُشْرَى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿٩٧﴾ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلَّهِ وَمَلٰٓئِكَتِهِ وَرُسُلِهِ وَجِبْرِيْلَ وَمِيْكٰلَ فَإِنَّ اللَّهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ ﴿٩٨﴾﴾
[البقرۃ:۹۷، ۹۸]

''کہہ دیجیے: جو جبریل کا دشمن ہے (غصہ سے مر جائے)، یہی آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے دل پر اللہ کے حکم سے قرآن لایا ہے، جو تصدیق کرتا ہے جو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے پہلے اُتارا گیا ہے۔ اور ماننے والوں کے لیے ہدایت اور خوشخبری ہے۔ جو شخص اللہ کا اور اس کے فرشتوں کا اور اس کے رسولوں کا اور جبریل و میکائیل کا دشمن ہے تو اللہ بھی کافروں کا دشمن ہے۔''

یہودیوں کے ایمان نہ لانے کی اصل وجہ:

ان آیات میں یہود کی مزید شقاوتوں کو بیان فرمایا ہے۔ جہاں یہود نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عداوت اور دشمنی میں اور بہانے بنائے، وہاں ایک دفعہ انہوں نے یہ بھی سوال کیا کہ اے محمد! آپ پر اللہ پاک نے جس فرشتے کے

ذریعہ وحی اُتاری ہے، وہ کون سا فرشتہ ہے؟ حضور ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے جبرئیل کے ذریعہ مجھ پر وحی اُتاری ہے۔ کہنے لگے: اگر جبرئیل کے بجائے میکائیل فرشتہ، آپ پر وحی لے کر آتا تو ہم اسلام لے آتے: کیونکہ جبرئیل سے ہماری دشمنی ہے، جبرئیل ہی ہمیشہ ہماری قوم پر عذاب لے کر آتے رہے اور ہمارے بارے میں اللہ نے جتنے سخت احکامات جاری فرمائے، وہ سارے کے سارے جبرئیل ہی لے کر آئے اور آپ پر بھی وحی جبرئیل لائے ہیں تو ہم دشمن کی لائی ہوئی وحی پر کیسے ایمان لے آئیں؟ لہٰذا ہم ایمان نہیں لا سکتے۔

فارسی کا ایک محاورہ ہے: ''خوئے بدرا بہانہ بسیار'' یعنی جب آدمی نے ایک بات تسلیم ہی نہ کرنی ہو تو پھر بہانہ بنانے میں کون سی دیر لگتی ہے۔ مختلف بہانے بنائے جا سکتے ہیں، اصل بات یہ تھی۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ وحی سیدھی دل پر اُتاری جائے، یعنی سمع، بصر باقی اعضاء کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ دل میں آنے کے بعد وہ باقی اعضاء کو پہنچ رہی ہے، جیسا کہ صحابہ رضی اللہ عنہم فرماتے ہیں: کبھی کبھی ایسی کیفیت ہوتی تھی کہ سردیوں کی راتوں میں، جبکہ شدید سردی ہوتی تھی، حضور ﷺ پر وحی اُترتی تو آپ ﷺ کے چہرہ مبارک پر ثقل وحی کی وجہ سے پسینہ نمودار ہو جاتا تھا، لیکن ہمیں جبرائیل علیہ السلام نظر نہیں آتے تھے۔

اس کو یوں سمجھیں کہ آدمی آدھی نیند میں دیکھتا ہے تو اس کی کیفیت بالکل یہ ہوتی ہے کہ باقی اعضاء معطل ہوتے ہیں، ہاتھ پاؤں سوئے ہوتے ہیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف اس کا القاء بھی دل سے ہوتا ہے اور انسان دل سے سمجھ رہا ہوتا ہے۔

یہودیوں کے سوالات اور حضور ﷺ کے جوابات:

یہودیوں نے یہ بات کیوں کی تھی؟ اس بارے میں مختلف اقوال ہیں: ایک قول یہ ہے کہ یہودیوں کی ایک جماعت حضور ﷺ کی خدمت میں آئی اور کہا: ہم آپ ﷺ سے چند چیزیں پوچھنا چاہتے ہیں اور ان چیزوں کے بارے میں نبی کے بغیر کوئی جواب نہیں دے سکتا۔ حضور ﷺ نے فرمایا: جب حضرت یعقوب علیہ السلام کے پاس ان کے بیٹے آئے کہ ہمارے ساتھ یوسف کو بھیجیں تو انہوں نے کہا تھا: تم میرے ساتھ وعدہ کرو کہ تم یوسف کی حفاظت کرو گے۔ انہوں نے اللہ کی قسم کھائی اور وعدہ کیا۔ تم بھی اسی طرح میرے ساتھ وعدہ کرو کہ اگر میں جواب دے دوں اور تم جان لو کہ وہ جواب ٹھیک ہے، کیا تم ایمان لے آؤ گے؟ میری اتباع کرو گے؟ انہوں نے کہا کہ

بالکل ٹھیک ہے، ہم مسلمان ہو جائیں گے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

''سَلُونِي عَمَّا شِئْتُمْ'' [مسند احمد بن حنبل، رقم: ۲۵۱۴]

''پوچھو، کیا پوچھتے ہو؟''

انہوں نے کہا: ایک سوال یہ ہے کہ حضرت یعقوب نے تورات کے اُترنے سے پہلے کون سا کھانا اپنے اوپر حرام کیا تھا؟ دوسرا سوال یہ ہے کہ آپ ہمیں یہ بتائیں کہ مرد کا نطفہ کیسا ہوتا ہے اور عورت کا پانی کیسا ہوتا ہے؟ تیسرا سوال یہ ہے کہ کبھی لڑکا پیدا ہوتا ہے اور کبھی لڑکی پیدا ہوتی ہے، حالانکہ میاں بیوی بھی ایک ہیں اور دونوں کا پانی بھی ایک قسم کا ہے، اس کی وجہ کیا ہے؟ اور ہمیں یہ بتائیں کہ تورات میں جس نبی اُمّی کا ذکر ہے کہ ایک اُمّی نبی پیدا ہوں گے تو وہ کون ہے؟ اور اس نبی کا اللہ کے فرشتوں میں سے دوست کون ہے جو وحی لے کر آنے والا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: تم قسم کھاؤ، اگر میں بتا دوں تو ایمان لے آؤ گے؟ انہوں نے کہا: بالکل ہم قسم کھاتے ہیں اور وعدہ کرتے ہیں کہ اگر آپ ہمیں جواب دے دیں تو ہم ایمان لے آئیں گے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: پہلی بات سنو! حضرت یعقوب علیہ السلام عرق النساء کی بیماری میں بیمار ہوئے اور شدید بیمار ہو گئے۔ جب بیماری طویل ہو گئی تو حضرت یعقوب علیہ السلام نے منت مانی: یا اللہ! اگر آپ مجھے بیماری سے شفاء عطا فرما دیں تو اپنا سب سے محبوب کھانا اور اپنے سب سے محبوب مشروب چھوڑ دوں گا۔ جب اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کو شفاء دے دی تو انہوں نے اپنا محبوب کھانا اونٹ کا گوشت اور محبوب مشروب اونٹ کا دودھ چھوڑ دیا تھا۔ حضور ﷺ نے فرمایا: بتلاؤ یہ بات ٹھیک ہے؟ انہوں نے کہا کہ بالکل ٹھیک ہے۔ آپ نے فرمایا: اے میرے اللہ! تُو گواہ ہو جا ان کے اس اقرار پر۔

اس کے بعد حضور ﷺ نے فرمایا: میں تمہیں قسم دیتا ہوں اس خدائے واحد کی جس نے موسیٰ علیہ السلام پر تورات اُتاری، کیا تم جانتے ہو کہ مرد کا پانی گاڑھا اور سفید ہوتا ہے اور عورت کا پانی پتلا اور پیلا ہوتا ہے؟ اگر مرد کا پانی عورت کے پانی پر غالب آ جاتا ہے تو بچہ پیدا ہوتا ہے اور اگر عورت کا پانی مرد کے پانی پر غالب آ جاتا ہے تو بچی پیدا ہوتی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: بتاؤ یہ بات ٹھیک ہے؟ کہنے لگے: بالکل ٹھیک ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اے اللہ! تُو گواہ ہو جا!

اور حضور ﷺ نے فرمایا: تورات میں نبی اُمّی کا جو ذکر ہے، اس کی صفات میں یہ ہے کہ اس کا دل نہیں سوئے گا، آنکھیں نیند کریں گی۔ وہ کہنے لگے: بالکل ٹھیک ہے۔

بس آپ مہربانی کر کے بتلادیں کہ فرشتوں میں آپ کا دوست کون ہے؟ اسی پر آپ کا اور ہمارا فیصلہ ہونا ہے۔
حضور ﷺ نے فرمایا: ''فَإِنَّ وَلِيِّيَ جِبْرِيلُ عَلَيْهِ السَّلَام وَ لَمْ يَبْعَثِ اللّٰهُ نَبِيًّا قَطُّ إِلَّا وَ هُوَ وَلِيُّهُ'' [مسند احمد بن حنبل، رقم: ۲۵۱۴] (میرا ولی جبرئیل ہے۔ اور جتنے نبی آئے ہیں، سب کا ولی جبرائیل ہے)۔ کہنے لگے: اب ہم آپ کے ساتھ نہیں چل سکتے۔ آپ پر ایمان نہیں لاسکتے؛ کیونکہ جبرائیل ہمارا دشمن ہے، ہم دشمن کی بات کو کیسے مان لیں؟
تو اللہ پاک نے یہ آیت اُتاری:

﴿قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۹۷﴾﴾ [البقرۃ:۹۷]

تو یہود اللہ کے غضب کے مستحق بن کر لوٹے کہ انہوں نے جان لیا کہ آپ ﷺ سچے نبی ہیں، لیکن پھر بھی نہ مانے؛ کیونکہ آپ ﷺ کے پاس وحی جبرائیل لاتا ہے۔
ایک روایت میں ہے کہ انہوں نے یہ سوال بھی کیا کہ روح کس کا لقب ہے؟ حضور ﷺ نے فرمایا: میں تمہیں اس اللہ کی قسم دیتا ہوں کہ جس نے تورات میں احکام اُتارے ہیں، وہ روح جبرائیل کا لقب ہے اور وہی اللہ کا فرشتہ ہے، جس کا لقب روح ہے، میری طرف وحی لے کر آتا ہے۔ تو یہود کہنے لگے: وہ جبرائیل ہمارا بڑا دشمن ہے، اس وجہ سے ہم آپ پر ایمان نہیں لاسکتے؛ کیونکہ جب بھی جبرائیل آتا ہے تو خون بہانے کے حکم اور اللہ کا عذاب لے کر آتا ہے۔ اگر جبرائیل کے بجائے کوئی اور فرشتہ ہوتا تو ہم آپ پر ایمان لے آتے، لیکن جبرائیل کی موجودگی میں ہم ایمان نہیں لاسکتے۔

یہ باتیں بالکل جہالت ہیں، جبرائیل تو تمام رسولوں کے پاس وحی لے کر آئے، تمام نبیوں اور اللہ تعالیٰ کے درمیان واسطہ ہیں۔ جبرائیل علیہ السلام اتنی شان والے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو عرش کے پاس رکھا ہے۔ حدیث مبارک میں آتا ہے کہ اللہ پاک نے جتنے فرشتے بنائے ہیں، ان سب کے سردار جبرائیل علیہ السلام ہیں۔
حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ یہودیوں کی ایک جماعت حضور ﷺ کی خدمت میں آئی اور آکر کہنے لگی: اے ابوالقاسم! ہم نے آپ سے پانچ چیزیں پوچھنی ہیں، اگر آپ ان چیزوں کے بارے میں صحیح جواب دے دیں تو ہم مان لیں گے کہ آپ اللہ کے نبی ہیں اور ہم آپ کی اتباع کریں گے اور آپ کا کلمہ پڑھ لیں



گے۔ حضور ﷺ نے ان سے ویسے عہد لیا، جیسے گزشتہ روایات میں ذکر ہوا ہے۔ پھر حضور ﷺ نے فرمایا: پوچھو! کیا پوچھتے ہو؟ انہوں نے کہا کہ پہلا سوال ہم یہ کرتے ہیں کہ ہمیں پیغمبر اور نبی کی نشانی بتلائیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا:

''تَنَامُ عَيْنَاهُ وَ لَا يَنَامُ قَلْبُهُ'' [مسند احمد بن حنبل، رقم: ۲۵۱۴]

''نبی جو ہوتے ہیں ان کی آنکھیں تو نیند کرتی ہیں، لیکن دل ان کا جاگتا ہے۔''

اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر نبی کی یہ صفت ہے، ورنہ اکثر کتابوں میں یہ آتا ہے کہ یہ صفت ہمارے آقا ﷺ کی ہے کہ آپ کی آنکھیں سو جاتی تھیں، لیکن دل مبارک غفلت میں نہیں ہوتا تھا۔

اگر حضور ﷺ کا دل نہیں سوتا تھا تو نیند کیسے آ گئی؟

سوال: بعض لوگوں نے اس حدیث پر اعتراض کیا ہے کہ اگر حضور ﷺ کا دل نہیں سوتا تھا اور آنکھیں سوتی تھیں تو وہ حدیث جس میں ہے کہ حضور ﷺ سفر مبارک سے واپس آ رہے تھے اور آپ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو فرمایا: تم نہ سونا، تم جاگتے رہنا، قافلہ سارا تھکا ہوا ہے، ایک آدمی جاگتا رہے، تاکہ ہماری نماز ضائع نہ ہو جائے اور تم وقت پر اذان دے دینا۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں نے اونٹ کے پالان کے ساتھ ٹیک لگائی اور صبح صادق کی طرف منہ کر کے لیٹ گیا کہ جونہی صبح صادق نکلے گی، میں جلدی اذان کہہ دوں گا، حضور ﷺ غلس (اندھیرے) میں نماز پڑھ لیں گے اور ٹھنڈے وقت میں قافلہ چل پڑے گا، لیکن مجھ پر نیند غالب آ گئی۔ چونکہ سفر میں تھکے ہوئے تھے، اونٹوں کا سفر تھا۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: مجھے نیند آ گئی، قافلہ والوں کو بھی نیند آ گئی، حضور ﷺ کو بھی نیند آ گئی۔ سب سے پہلے حضور ﷺ کی آنکھ کھلی تو سورج نکل چکا تھا۔ آپ ﷺ نے اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ پڑھا اور فرمایا: جلدی کرو، بلال کو بلاؤ۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو بلایا گیا، آپ ﷺ نے ان سے فرمایا: اچھی ہم نے تمہاری ڈیوٹی لگائی، تم نے ہماری نماز بھی ختم کر دی، سورج نکل چکا ہے۔ انہوں نے کہا: یا رسول اللہ! آپ بھی تو سو گئے تھے، جس اللہ نے آپ کو سلا دیا، اس نے مجھے بھی سلا دیا، میں کیا کر سکتا تھا؟ حضور ﷺ نے فرمایا: جلدی کرو، اس وادی سے باہر نکلو، اس وادی میں شیطان کا اثر ہے۔

جس جگہ آدمی کی نماز نہ ہو تو سمجھ لو کہ وہاں شیطان کا ڈیرہ ہوتا ہے۔ اس سے اندازہ لگا لو جن کوٹھیوں میں نماز نہیں

ہوتی، جن بڑے بڑے گھروں میں نمازیں نہیں ہوتیں، جن بڑے بڑے محلات میں نمازیں نہیں ہوتیں یا نماز کی توفیق ہی نہیں ہوتی، وہاں شیطان کا اثر ہوتا ہے، شیطان کا وہاں ڈیرہ ہوتا ہے۔ ہم فقیر لوگ ہیں، دین کے لیے کبھی کہیں اور کبھی کہیں سفر ہوتا ہے۔ تجربہ کیا ہے، بعض مقامات پر جاؤ تو تہجد نہیں چھوٹتی اور بعض مقام پر جاؤ تو فرض نماز بڑی مشکل سے پڑھی جاتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ان جگہوں پر شیطان کے اثرات ہوتے ہیں۔

حضور پاک ﷺ اس جگہ سے تشریف لے گئے اور دوسری جگہ جا کر آپ نے نماز پڑھی۔ لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اگر حضور ﷺ کی یہ علامت تھی کہ آپ کا دل نہیں سوتا تھا تو نماز کیسے چلی گئی؟

پہلا جواب: یاد رکھیں! اوقات کا تعلق آنکھوں سے ہے، دل سے نہیں ہے۔ جیسے آپ لوگ نیند میں خواب دیکھتے ہیں، وہ خواب بھی دل میں القاء ہوتا ہے، آپ کی آنکھیں تو بند ہوتی ہیں، لیکن آپ خواب بھی دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ نبی کے علاوہ تمام انسانوں کی آنکھیں بھی سوتی ہیں اور دل بھی۔ یہ صرف آپ ﷺ کے ساتھ خاص ہے کہ آپ ﷺ کی آنکھیں سوتی ہیں، لیکن دل نہیں سوتا۔ اور جب ہم خواب دیکھتے ہیں کہ مکہ میں طواف کر رہے ہیں، فلاں دوست سے مل رہے ہیں، سب کچھ خواب میں دیکھ رہے ہیں، لیکن آپ پر نیند کا غلبہ ہوتا ہے۔ اوقات کا تعلق آنکھوں کے ساتھ ہے۔ اس لیے حضور ﷺ کو نیند آگئی، باوجود اس کے دل جاگتا تھا، چونکہ آنکھوں پر نیند تھی۔

دوسرا جواب: کبھی کبھی اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبر سے ایسی باتیں اپنی منشاء سے کرا دیتے ہیں، تاکہ قیامت تک کے لیے لوگوں کو دین کا مسئلہ سمجھ آجائے کہ اگر ہم سو جائیں اور نماز چلی جائے تو کیا کریں؟ اگر حضور ﷺ کی نماز قضاء نہ ہوتی تو ہمیں قضاء نماز کا مسئلہ بھی معلوم نہ ہوتا۔ حضور نے سورج نکلنے کے بعد یہ انتظار بھی نہیں فرمایا کہ ظہر کی نماز پڑھ لیں گے یا آئندہ جہاں پڑاؤ کریں گے، پڑھ لیں گے۔

اس سے یہ بھی مسئلہ سمجھ آگیا کہ اگر تمہیں نیند آگئی اور سورج نکل آیا، تمہاری آنکھ کھل گئی ہے تو جلدی سے وضو کر کے فوراً نماز ادا کرو۔ اور اس سے یہ مسئلہ بھی نکلتا ہے کہ اگر آدمی سو جائے اور اُٹھانے والا کوئی نہ ہو، وقت چلا گیا اور نماز قضاء ہوگئی، اس نے اُٹھ کر قضاء پڑھ لی تو اللہ کی طرف سے عذاب نہیں ہوگا؛ کیونکہ سونے والا اگر غفلت کرے یا نابالغ بچہ بلوغ سے پہلے کوئی غفلت کرے یا دماغ خراب ہو جائے تو اس پر بھی مؤاخذہ نہیں ہوتا۔

یاد رکھیں کہ اس کا یہ مطلب نہیں کہ پاگل پر ہر چیز کا مؤاخذہ نہیں ہوتا، بلکہ بعض چیزیں ایسی ہیں کہ پاگل پر بھی مؤاخذہ ہوتا اور بعض چیزیں ایسی ہیں جن کا پاگل پر مؤاخذہ نہیں ہوتا۔ پاگل ایک وہ ہوتا ہے جو مجنون ہے، جسے

آپ دیوانہ کہتے ہیں کہ اس کا دماغ کام ہی نہیں کرتا، اور ایک ہے نشہ پیا اور دماغ کام نہیں کر رہا۔ دونوں کے احکام میں بڑا فرق ہے۔ اگر آدمی نے نشہ کی حالت میں حقوق العباد کو ضائع کیا تو اس کو ادا کرنا پڑے گا۔

جیسے سیدنا حمزہ رضی اللہ عنہ نے نشہ کی حالت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی دو اونٹنیاں ذبح کر دیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بدلے میں دو اونٹنیاں دلوائیں کہ ادا کرو۔ یہ مسئلہ تب تھا، جب نشہ حرام نہیں تھا۔ اب تو چونکہ پینا بھی حرام ہے، جو پیے گا پہلے اس کو اسی کوڑے لگیں گے، اگلا فیصلہ بعد میں کیا جائے گا۔

بہر حال حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھ اس لیے نہ کھلی، تاکہ اُمت کو قضاء نماز کا مسئلہ معلوم ہو جائے۔ اور یہ بھی معلوم ہو جائے کہ نبیوں کے معاملات اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں، اللہ چاہیں تو جگا دیں، اگر اللہ نہ چاہیں تو نہ جگائیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کی مرضی ہے۔

سونے کے آداب:

سونے کا مسنون طریقہ یہ ہے کہ آدمی دائیں طرف لیٹے، دایاں ہاتھ رخسار کے نیچے ہو اور رُخ قبلہ کی طرف ہو۔ یہ مشکل نہیں ہے، لیکن ہم لوگ ان باتوں کا خیال نہیں کرتے۔ ہمارے ہاں کئی بیت الخلاؤں کا رُخ تو قبلہ کی طرف ہوتا ہے، لیکن چار پائی کا رُخ قبلہ کی طرف نہیں ہوتا، ہمیں اس بات کا خیال نہیں ہوتا۔ یاد رکھیں! جتنا ہم زیادہ ادب کریں گے، اتنی زیادہ ہم پر اللہ کی طرف سے رحمتیں نازل ہوں گی۔

علماء نے لکھا ہے کہ جب آپ دائیں طرف لیٹیں گے تو اس میں حکمت ہے؛ کیونکہ دل بائیں طرف ہوتا ہے، دل لٹک جاتا ہے تو آدمی غفلت کی نیند نہیں سوتا۔ اور اگر دوسرے رُخ سو جائیں گے تو آپ غافل ہو جائیں گے، دل کو زیادہ راحت مل جاتی ہے۔

علماء نے لکھا ہے کہ دائیں طرف لیٹنا انبیاء کی نیند ہے، بائیں طرف لیٹنا غفلت والوں کی نیند ہے، اوندھا لیٹنا فاسق وفاجر اور شیطانوں کی نیند ہے، اُلٹا لیٹنا علامت قومِ لوط میں سے ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ ایسے حالات سے ہر مسلمان کو محفوظ رکھیں۔ کوشش کیا کریں کہ جب سونے لگیں تو سنت کے مطابق کچھ دیر لیٹ جائیں، تاکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پوری ہو جائے۔ چاہے وہ ایک منٹ کے لیے ہو، سوتے ہوئے سنت یاد رہی، اللہ کو ہم یاد کریں گے تو اللہ ہمیں یاد کریں گے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں کو یاد کریں گے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محبت اور تعلق

قائم ہوگا۔ حضور ﷺ سے اصل محبت کا معنی یہ ہے کہ آپ اپنی شکل، صورت، سیرت، کردار، اعمال، اقوال، افعال الغرض ہر چیز میں حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی اتباع کریں۔

دوسرا سوال: انہوں نے یہ کیا کہ لڑکا کیسے پیدا ہوتا ہے اور لڑکی کیسے پیدا ہوتی ہے؟

جواب: حضور ﷺ نے فرمایا: ''يَلْتَقِي الْمَاءَانِ فَإِذَا عَلَا مَاءُ الرَّجُلِ مَاءَ الْمَرْأَةِ أَذْكَرَتْ وَ إِذَا عَلَا مَاءُ الْمَرْأَةِ آنَثَتْ.'' [مسند احمد بن حنبل، رقم: ۲۴۸۳] (اگر مرد کا پانی غالب آجائے تو بچہ پیدا ہوتا ہے اور اگر عورت کا پانی غالب آجائے تو بچی پیدا ہوتی ہے)۔

تیسرا سوال: انہوں نے کہا کہ یہ بتلائیں یعقوب علیہ السلام نے اپنے اوپر کیا چیز حرام کی تھی؟

جواب: آپ ﷺ نے فرمایا: ان کو عرق النساء کی تکلیف تھی۔ انہوں نے منت مانی تھی کہ اگر مجھے اس بیماری سے شفاء حاصل ہوگئی تو میں گوشت نہیں کھاؤں گا، اللہ نے شفاء دے دی۔ یہودیوں نے کہا کہ آپ نے بالکل سچی بات کہی ہے۔

چوتھا سوال: انہوں نے کہ آپ یہ بتلائیں کہ بادل کی گرج کی کیا حقیقت ہے؟

جواب: حضور ﷺ نے فرمایا: اللہ کے فرشتوں میں سے ایک فرشتہ ہے، جس کو اللہ نے ان بادلوں پر مسخر کیا ہوا ہے۔ وہ اپنے ہاتھ سے یا اس کے ہاتھ میں آگ کا کوڑا ہوتا ہے، وہ ان پر برساتا ہے تو اس سے یہ آواز پیدا ہوتی ہے۔ یہودیوں نے کہا: آپ نے بالکل ٹھیک کہا ہے۔

پانچواں سوال: انہوں نے کہا کہ ایک بات باقی رہ گئی کہ ہر نبی کا فرشتوں میں سے ایک وحی لانے والا ہوتا ہے، آپ بتلائیں کہ آپ کا وحی لانے والا کون ہے جو وحی لے کر آتا ہے؟

جواب: حضور ﷺ نے فرمایا: میرے پاس اللہ کا فرشتہ جبرائیل وحی لاتا ہے۔ یہودی کہنے لگے: یہ جبرائیل جب بھی آتا ہے اللہ کے عذاب لے کر آتا ہے، اللہ کی طرف سے جنگ کا حکم لے کر آتا ہے، یہ ہمارا دشمن ہے، اگر آپ کا دوست میکائیل ہوتا جو بارش کی خبر لے کر آتا ہے، جس سے سبزے اُگتے ہیں اور آبادیاں اُگتی ہیں تو ہم آپ پر ایمان لے آتے۔ اس پر اللہ نے قرآن نازل فرمایا: اے میرے مدنی کریم! جو جبرائیل کا دشمن ہے، وہ میرا دشمن ہے، میں اس کا دشمن ہوں۔ جبرائیل بھی میرا فرشتہ ہے اور میکائیل بھی میرا فرشتہ ہے۔ اگر کسی کا مجھ پر ایمان ہے تو ایسے بہانے بنانے کی کیا ضرورت ہے؟

حضرت امام بخاری رحمہ اللہ نے یہ قول نقل کیا ہے کہ جبرائیل، میکائیل اور اسرائیل، ان کا معنی "عبداللہ" ہے۔

حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کا اسلام لانے کا واقعہ:

حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے سنا کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم مدینے میں آرہے ہیں۔ وہ ایک بستی میں تھے اور اپنی کھیتی باڑی کر رہے تھے۔ یہ تورات کے بہت بڑے عالم تھے۔ پھر عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: میں آپ سے تین چیزوں کے بارے میں پوچھتا ہوں اور ان کے بارے میں کسی کو علم نہیں ہوتا، مگر نبیوں کو علم ہوتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ابھی جبرائیل نے ان کے متعلق بتایا ہے۔ انہوں نے کہا: جبرائیل نے؟ فرمایا: ہاں۔ کہا: وہ تو فرشتوں میں یہودیوں کا دشمن ہے تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی:

﴿قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾ [البقرة:۹۷]

اور فرمایا: پوچھو۔ انہوں نے کہا: یارسول اللہ! آپ قیامت کی پہلی نشانی کے بارے میں مجھے خبر دیں، جنت والوں کو جو سب سے پہلے کھانا ملے گا، وہ کیا ہوگا؟ یہ کیا بات ہے کہ میاں بیوی کے ملنے کے بعد کبھی لڑکا پیدا ہوتا ہے اور کبھی لڑکی پیدا ہوتی ہے؟ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قیامت کی پہلی نشانی یہ ہے کہ ایک آگ نکلے گی اور وہ لوگوں کو ہانک کر قیامت کے میدان کی طرف لے جائے گی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مچھلی کے جگر سے عجیب غذائیں بنا کر اللہ تعالیٰ جنت والوں کو کھلائیں گے (یہ دنیا کے اندر بھی ایک نعمت ہے اور آخرت کی مچھلی کا تو کوئی مقابلہ بھی نہیں کر سکتا)۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر مرد کا پانی غالب آجائے تو لڑکا پیدا ہوتا ہے اور اگر عورت کا پانی غالب آجائے تو لڑکی پیدا ہوتی ہے۔ جب عبداللہ بن سلام نے یہ سنا تو کہا: "أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَ أَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ" میں مسلمان ہوتا ہوں، مجھے کلمہ پڑھا دیں۔ آپ نے جو فرمایا ہے وہ حق اور صحیح ہے اور ان مسائل کا جواب صرف نبی ہی دے سکتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے اسلام قبول کرنے کے بعد عرض کیا: یارسول اللہ! قومِ یہود بہتان لگانے والی قوم ہے، آپ مہربانی کر کے میری قوم کے کچھ لوگوں کو بلا کر میرے بارے میں پوچھ لیں۔ یعنی میں عام آدمی نہیں ہوں، ان کا ایک بڑا عالم ہوں اور میرا اسلام لے آنا معمولی بات نہیں ہے، لہٰذا آپ میرے بارے میں تسلی کر لیں۔

قاعدہ یہ ہوتا ہے کہ جب بڑے بڑے احبار، رہبان، علماء کسی دین کو قبول کرتے ہیں تو اس کی عزت میں اضافہ

ہوتا ہے، عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ ان لوگوں میں سے ہیں جو اسلام لانے کے بعد اس پر قائم رہے اور حضور ﷺ کے بڑے جلیل القدر صحابی بنے۔ جب کوئی تورات کی بات آتی تو حضور ﷺ عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کو بلاتے تھے۔ اسی طرح ابن صوریا اور بھی بڑے بڑے لوگ مسلمان ہوئے۔ جو بغض وعناد میں تھے وہ محروم ہوگئے۔

جب یہودی آگئے تو حضور پاک ﷺ نے ان سے فرمایا: ''أَيُّ رَجُلٍ عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ سَلَامٍ فِيكُمْ؟'' [صحیح بخاری، رقم:۳۹۳۸] (تمہارے اندر عبداللہ بن سلام کیسا آدمی ہے، اس کا کیا رُتبہ ہے؟) وہ کہنے لگے: وہ بہت اعلیٰ ہے، نسب کے لحاظ سے بھی اعلیٰ ہے، حسب کے لحاظ سے بھی اعلیٰ ہے، وہ ہمارا سردار ہے اور اس کا والد بھی ہمارا سردار تھا، وہ بہت بڑی شان والا آدمی ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: اگر عبداللہ بن سلام کلمہ پڑھ لے، مسلمان ہوجائے تو کیا تم اسلام لے آؤ گے؟ وہ کہنے لگے: اللہ اس کو اس سے بچائے کہ وہ تمہارے مذہب میں جائے۔ (نعوذ باللہ! آدمی جب تعصب میں ہوتا ہے تو وہ اپنے سوا کسی کو حق پر نہیں سمجھتا)۔ حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ اندر بیٹھے تھے، باہر نکلے اور پڑھا: ''أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَ أَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ'' جب یہودیوں نے دیکھا کہ وہ مسلمان ہوگیا تو کہنے لگے: یہ تو بُرا آدمی ہے اور اس کا باپ بھی بُرا تھا۔ فوراً ان کی شان کو گھٹانے لگ گئے۔ حضرت ابن سلام رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یارسول اللہ! میں اسی سے ڈرتا تھا۔ [صحیح بخاری، رقم:۳۹۳۸]

شانِ نزول کی دوسری روایت:

دوسرا قول یہ ہے کہ اس آیت کے نزول کا سبب یہ ہے کہ یہودیوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مناظرہ کیا اور وہ مناظرہ یہودیوں اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے درمیان حضور اقدس ﷺ کے متعلق ہوا تھا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے روحاء مقام پر دیکھا کہ لوگ پتھر اُٹھا اُٹھا کر لا رہے ہیں، پتھروں پر نماز پڑھ رہے ہیں۔ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یہ کیا بات ہے؟ انہوں نے کہا: ان کا گمان یہ ہے کہ ان پتھروں پر حضور پاک ﷺ نے نماز پڑھی تھی، اسی وجہ سے یہ ان پتھروں پر نماز پڑھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کے اس فعل کو پسند نہ کیا اور فرمایا: حضور پاک ﷺ کو جہاں موقع ملتا تھا نماز پڑھ لیتے تھے، کسی وادی میں آئے تو پڑھ لی (خیبر میں آئے تو پڑھ لی، تبوک میں آئے تو پڑھ لی، بدر میں آئے تو پڑھ لی، مکہ، مدینہ کے راستے میں آئے تو پڑھ لی۔ حضور ﷺ نے کوئی ایسی پابندی تو نہیں کی ہے کہ خاص پتھر اُٹھا کر لائے جائیں اور ان پر نمازیں پڑھی جائیں،

لہٰذا تمہیں بھی جہاں موقع ملے، پڑھ لو) اور چلے گئے۔

پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں یہود کے تعلیمی اداروں (مدرسوں) میں جاتا تھا، جب میں یہ سنتا کہ تورات، قرآن کے بارے میں بتلا رہی ہے تو مجھے عجیب اور بڑا اچھا لگتا کہ کتابیں کیسے ایک دوسرے کی تصدیق کر رہی ہیں!؟ ایک دفعہ یہودی کہنے لگے: آپ ہمیں بڑے پیارے لگتے ہیں۔ آپ رضی اللہ عنہ نے پوچھا: کیوں اچھا لگتا ہوں؟ انہوں نے کہا کہ آپ ہمارے پاس آتے ہیں، ہماری مجلسوں میں بیٹھتے ہیں، ہمارے ساتھ باتیں کرتے ہیں اور تو کوئی نہیں آتا۔ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں اس لیے نہیں آتا کہ مجھے تمہارے ساتھ کوئی محبت ہوگئی ہے، بلکہ جب میں تورات سنتا ہوں اور تورات قرآن کی تصدیق کرتی ہے اور قرآن سنتا ہوں تو وہ تورات کی تصدیق کرتا ہے تو یہ بات مجھے بڑی پسند آتی ہے۔ اس کے بعد حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم وہاں سے گزرے تو انہوں نے کہا کہ دیکھو! آپ کے ساتھ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم جا رہے ہیں، تم ان سے مل لو۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہودیوں سے کہا: میں تمہیں اس خدا کی قسم دیتا ہوں جس نے تمہیں پیدا کیا اور جس اللہ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھیجا، جس اللہ نے کتاب تورات نازل فرمائی، تم یہ بتاؤ کہ تم ہمارے ان پاک نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کیا جانتے ہو؟ تو وہ خاموش ہوگئے۔ انہوں نے کہا کہ اللہ کا رسول تو ہے۔ ان یہودیوں کے پاس جو اور لوگ بیٹھے تھے، انہوں نے کہا کہ حضرت عمر نے تو آج تمہارے ساتھ بڑی سخت بات کی اور تم سے اپنی بات منوالی، لہٰذا تم اس کے ساتھ کوئی ایسی بات کرو، ورنہ لوگوں میں ہمارے خلاف زہر پھیل جائے گا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیت گئے اور ہم نے ان کے نبی کے بارے میں مان لیا کہ وہ سچا نبی ہے۔ انہوں نے اپنے بڑے راہب سے کہا کہ اگر یہ مناظرہ اور علم کی بات ہے تو تم یہ بات کرو، ہم نہیں کر سکتے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تم تو برباد ہوگئے۔ انہوں نے کہا: ہم کیوں برباد ہوگئے؟ انہوں نے کہا کہ جب تم مانتے ہو کہ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے نبی ہیں اور پھر کلمہ نہیں پڑھتے ہو تو صاف ظاہر ہے کہ ہلاک و برباد ہو جاؤ گے۔ کہنے لگے: ہم ہلاک نہیں ہوں گے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: کیسے ہلاک نہیں ہوگے؟ انہوں نے کہا کہ اللہ کے فرشتوں میں سے بعض ہمارے دشمن ہیں اور بعض ہمارے دوست ہیں۔ جبرائیل ہمارا دشمن ہے اور میکائیل سے صلح ہے، وہ ہمارے ساتھ صلح کرنے والا فرشتہ ہے؛ کیونکہ جبرائیل جب بھی آتا ہے تو اللہ کی طرف سے سخت حکم لے کر آتا ہے، کبھی حرب کا، کبھی شدت کا۔ اور جب میکائیل آتا ہے تو بارشیں لے کر آتا ہے، مہربانی لے کر آتا ہے اور اللہ کی رحمتیں لے کر آتا ہے۔ تمہارے نبی کا ساتھی جبرائیل ہے، اس وجہ سے ہم ان کا کلمہ نہیں پڑھتے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے فرمایا: یہ بتلاؤ کہ اللہ کے ہاں جبرائیل و میکائیل کا کیا مرتبہ ہے؟ انہوں نے کہا کہ ایک عرش کے دائیں طرف اور دوسرا بائیں طرف ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: مجھے بھی اس رب کی قسم ہے جو عرش والا ہے کہ یہ کبھی نہیں ہوسکتا کہ دونوں عرش کے قریب رہنے والے آپس میں دشمن ہوں، اور پھر جبرائیل ان سے دوستی رکھے۔ جن کا میکائیل دشمن ہو یا میکائیل ان سے نرمی کرے جن کے ساتھ جبرائیل کی دشمنی ہو۔ تم جھوٹ بولتے ہو۔ جب ان کا اللہ کے ساتھ یہ تعلق ہے تو تمہارا یہ کہنا کہ ایک دوست ہے اور ایک دشمن ہے، جھوٹی بات ہے۔

اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں وہاں سے نکلا تو میں نے دیکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک آدمی کے گھر سے باہر تشریف لا رہے ہیں۔ میں نے جا کر سلام کیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ابھی اللہ نے مجھ پر قرآن نازل کیا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیات مبارکہ تلاوت کیں تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: میں ابھی آرہا تھا کہ آپ کو خبر دوں کہ یہودیوں سے کیا کیا بات ہوئی، لیکن اللہ عرش والے نے میری خبر دینے سے پہلے آپ کو خبر دے دی۔

ابن ابی حاتم کی روایت میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہودیوں سے پوچھا کہ تم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں اپنی کتابوں میں کیا پاتے ہو؟ کہنے لگے: اللہ نے ہر نبی کے ساتھ ایک فرشتہ رکھا ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ جبرائیل ہے، اگر فرشتہ میکائیل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آتا تو ہم اسلام لے آتے۔ آگے گزشتہ روایت والی تفصیل ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ وہاں سے اُٹھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ آیات مبارکہ اُتاریں۔

﴿وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ ۚ وَمَا يَكْفُرُ بِهَآ اِلَّا الْفٰسِقُوْنَ ﴿٩٩﴾﴾ [البقرۃ:۹۹]

''اور ہم نے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) پر واضح آیات اُتاری ہیں، ان کا انکار نہیں کرتے، مگر وہی لوگ جو نافرمان ہیں۔''

اللہ تعالیٰ نے ان آیاتِ مبارکہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت ونبوت کا اثبات فرمایا اور کفار، خاص طور پر یہود و نصاریٰ کا رد فرمایا ہے۔ ان آیات میں اللہ نے فرمایا: اگر یہ جبرائیل کی وجہ سے ایمان نہیں لے آتے، جبرائیل تو آپ کے پاس وحی لے کر آیا ہے، لیکن اس کے علاوہ بھی تو ہم نے آپ کو ایسی نشانیاں عطا فرمائی ہیں، جن کا کوئی عاقل انکار نہیں کرسکتا۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ کوئی معاند ہو، اس کے دل میں حسد ہو تو اس کا کوئی علاج نہیں ہے، وگرنہ

ہم نے تو آپ کو بڑی بڑی نشانیاں عطا فرمائی ہیں۔

"اٰیٰتٍۭ بَیِّنٰتٍ" کی تفسیر:

بعض علماء نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے قرآن مقدس میں کچھ آیات ایسی بھی اُتاری ہیں جن کا اقرار یہودیوں کو بھی کرنا پڑتا ہے، جیسا کہ حضور ﷺ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کا واقعہ ذکر فرمایا، حالانکہ حضور پاک ﷺ اس زمانہ میں موجود بھی نہیں تھے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جو معجزات اور آیات عطا فرمائیں، ان کا ذکر فرمایا اور پھر اللہ تعالیٰ نے قصۂ موسیٰ وفرعون کا ذکر فرمایا اور اسی طرح وہ چیزیں جو حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے اوپر حرام کر دی تھیں، اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآن پاک میں ان کا ذکر فرمایا۔ جب یہ ساری کھلی ہوئی نشانیاں ان کو مل گئیں اور جو خبر تورات میں ہے، وہی خبر محمد مصطفیٰ ﷺ دے رہے ہیں، حالانکہ حضور پاک ﷺ نے تورات نہیں پڑھی تھی، ترپن سال تک تورات کا کوئی عالم حضور ﷺ کے پاس نہیں آیا، لیکن آپ نے ایسی خبر دی کہ جس کا پتہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تھا یا موسیٰ علیہ السلام کے متبعین کو تھا، لہٰذا ان واقعات کے بعد یہود کو چاہیے تھا کہ وہ فوراً ایمان لے آتے۔

سابقہ انبیاء علیہم السلام کے معجزات:

علماء نے فرمایا: قرآن کی واضح آیات کی طرف جہاں اشارہ ہوتا ہے وہاں آیات بینات معجزات بھی مراد لیے جاتے ہیں، جیسا کہ اللہ نے فرمایا:

﴿وَلَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسٰی تِسْعَ اٰیٰتٍۭ بَیِّنٰتٍ﴾ [بنی اسرائیل:۱۰۱]

''ہم نے حضرت موسیٰ کو نو آیات بینات، یعنی واضح نشانیاں عطا فرمائیں۔''

اس لیے علماء کرام، محدثین عظام اور سلف صالحین نے اپنی کتابوں میں لکھا ہے کہ سب سے افضل شان حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی ہے۔ آپ کی نبوت ورسالت بھی افضل ہے، آپ کی شریعت بھی افضل ہے، آپ پر جو کتاب اُتاری گئی وہ بھی افضل ہے اور اللہ نے جو ہر نبی کو معجزات دیئے ہیں وہ تمام انبیاء کے معجزات سے افضل ہیں۔ اللہ نے ہر زمانے میں اپنے انبیاء کو معجزات دیئے ہیں، لیکن جو معجزات حضور پاک ﷺ کو ملے ہیں، ان کا مقابلہ نہیں ہوسکتا۔ پہلے انبیاء کو جتنے معجزے ملے تھے، ان کی نبوت کی مدت ایک زمانہ کے لیے محدود تھی تو ان



کے معجزات بھی اس زمانے کے لیے ہی تھے، جب وہ وقت گزر گیا تو اس معجزہ کا صرف ذکر رہ گیا، لیکن وہ معجزہ حقیقتاً باقی نہیں ہے، جیسا کہ اللہ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عصا کے اندر ایسی قوت رکھ دی تھی کہ جب بھی آپ دشمن کے مقابلہ میں اپنا عصا پھینکتے تھے تو وہ ایک اژدھا بن جاتا تھا اور اسی عصا کے معجزے کو دیکھ کر فرعون کے ساحرین مؤمن بن گئے۔ لیکن جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کا وقت گزر گیا تو وہ معجزہ بھی گزر گیا۔ آج حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عصا کا ذکر تو ہے، لیکن وہ معجزہ موجود نہیں ہے، اس کا ذکر اللہ نے قرآن میں فرما دیا، وگرنہ ہزاروں سال بعد اس کے ذکر کے باقی رہنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔

اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بڑے معجزات ملے، آپ مُردے کو ''قُمْ بِاِذْنِ اللّٰہ'' کہتے تو وہ کھڑا ہو جاتا۔ اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام مٹی کا پرندہ بنا کر پھونک مارتے تو وہ زندہ ہو کر اُڑ جاتا، کوئی کوڑھ یا برص کا مریض آتا تو اس پر ہاتھ پھیر دیتے، وہ شفاء یاب ہو جاتا اور اگر کوئی مادرزاد اندھا آپ کے پاس آتا، آپ اس کی آنکھوں پر ہاتھ پھیر دیتے تو اس کی بصارت لوٹ آتی۔ کتنے بڑے معجزے ہیں، لیکن وہ اب باقی نہیں ہیں، صرف ان کا ذکر باقی ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معجزات:

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت قیامت تک ہے، آپ کی شریعت بھی قیامت تک ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو ایسے معجزے دیئے ہیں جو قیامت تک قائم ہیں۔ سب سے بڑا معجزہ قرآن ہے، اس لیے آج چودہ سو سال گزر چکے ہیں، لیکن قرآن کا معارضہ کرنے والے جرأت نہ کر سکے کہ وہ اللہ کے قرآن کے مقابلہ میں ایک آیت بھی بنا سکیں۔ کافروں نے قرآن ماننے سے تو انکار کر دیا، یہود و نصاریٰ نے قرآن ماننے سے تو انکار کر دیا، روافض اور ان کے بعض فرق نے اللہ کے قرآن کی صحت سے انکار کر دیا، لیکن آج تک کسی بڑے سے بڑے معارض کو، کسی بڑے سے بڑے کافر، مستشرق اور کسی دشمن اسلام کو یہ جرأت نہ ہو سکی کہ وہ قرآن کے مقابلہ میں ایک آیت بنا کر لے آتا۔ اللہ نے قرآن کے اندر تحدی یعنی چیلنج کیا کہ قرآن کے مقابلہ پر تم بھی قرآن بنا کر لے آؤ، اگر سارا قرآن نہیں بنا سکتے تو دس سورتیں بنا کر لے آؤ، اگر دس سورتیں بنا کر نہیں لا سکتے تو ایک سورت بنا کر لے آؤ اور اگر ایک سورت بھی نہیں بنا سکتے تو ایک آیت بنا کر لے آؤ، لیکن قرآن نے واضح کر دیا کہ یہ ایسا معجزہ ہے ﴿فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا

﴿وَلَنْ تَفْعَلُوْا﴾ نہ زمانہ ماضی میں کوئی کرسکا ہے اور نہ زمانہ مستقبل میں کوئی قرآن کا مقابلہ کر سکے گا۔

حضور پاک ﷺ کی حیات طیبہ پر نظر ڈالیں تو حضور پاک ﷺ کا وجود مسعود بھی ایک معجزہ ہے۔ حضور ﷺ کے بعد ان کی شان جیسا کوئی پیدا نہیں ہوسکا اور اللہ کے پاک پیغمبر نے کیسے لوگوں کے اندر انقلاب برپا کردیا کہ ظالم، وحشی، کافر، عبادت غیر اللہ میں منہمک، فسق و فجور اور ظلمت میں ڈوبی ہوئی قوم کو میرے اللہ نے ہدایت کے اس مرتبے پر کھڑا کردیا کہ وہ پوری دنیا کے لیے نجوم ہدایت بن گئی، وہ لوگ دنیا کے لیے نور اسلام اور نور مبین بن گئے، ان کی زندگی چمکتا ہوا ستارہ بن گئی۔ اس سے بڑا معجزہ کیا ہوسکتا ہے؟

اسی طرح حضور ﷺ کو اللہ نے معجزہ عطا فرمایا کہ آسمان پر چاند دو ٹکڑے ہوگیا، اس کو اپنوں نے بھی دیکھا اور غیروں نے بھی دیکھا، اس کو مسلمانوں نے بھی دیکھا اور کافروں نے بھی دیکھا۔ اسی طرح حضور ﷺ کے سینکڑوں معجزات ہیں۔

پیدائش والے دن ایک کاہن نے آپ ﷺ کی نبوت کی تصدیق کی:

جب حضور ﷺ کی ولادت ہوئی تو ایک بہت بڑا کاہن جو غاروں میں رہتا تھا اور کبھی باہر نہیں آتا تھا، سرگرداں ہوکر مکہ کی گلیوں میں پھرنے لگا اور لوگوں سے پوچھنے لگا کہ آج جو رات گزر گئی ہے، اس میں مکہ کے اندر کوئی بچہ پیدا ہوا ہے؟ تو اسے راستے میں ایک آدمی ملا اور پوچھا: بات کیا ہے؟ کاہن کہتا ہے: آپ مجھے یہ بتادیں کہ کیا گزشتہ رات مکہ میں کوئی بچہ پیدا ہوا؟ اس نے کہا: ہم نے سنا ہے کہ عبدالمطلب کے گھرانے میں ایک بچہ پیدا ہوا ہے۔ اس کاہن نے کہا: مجھے جلدی جلدی اس گھر میں لے جاؤ۔ وہ عبدالمطلب کے پاس لے آیا اور وہ لوگ کاہنوں کی بڑی عزت کرتے تھے اور ان کو بڑا پہنچا ہوا شخص مانتے تھے اور اپنے تمام دکھ سکھ میں کاہنوں سے مشورہ لیتے تھے۔ (کاہن ان لوگوں کو کہا جاتا تھا جو پہاڑوں میں رہتے تھے، جنات کے ساتھ ان کا تعلق ہوتا تھا، آسمان، فلکیات اور ستاروں کے علم کے ماہر ہوتے تھے)۔ عبدالمطلب نے اس کاہن سے حیران ہوکر پوچھا کہ آج آپ کیسے باہر آگئے؟ اس نے کہا کہ مجھے یہ بتلاؤ کہ تمہارے گھر میں بچہ پیدا ہوا ہے؟ انہوں نے کہا: ہاں! میرے بیٹے عبداللہ کے گھر میں بچہ پیدا ہوا ہے۔ کہنے لگا: مہربانی کرو، مجھے اس بچے کی زیارت کراؤ۔ عبدالمطلب حضور پاک ﷺ کو ہاتھوں پر اُٹھا کر لے آئے۔ کاہن نے جب آپ کو دیکھا تو کہنے لگا: عبدالمطلب! یہ بچہ اس اُمت کا

نبی ہے اور اس کے فوراً بعد کہا: (کیونکہ حق بات نکل چکی تھی) ہاں! ایک جن نے ان کے منہ پر ہاتھ رکھا ہوا ہے، اس لیے یہ دودھ قبول نہیں کرے گا، مجھے کہو تو میں جن کو دور کر دوں؟ عبد المطلب نے کہا: ہمیں تمہاری کوئی ضرورت نہیں، وہ تو دودھ پی رہا ہے، کون کہتا ہے کہ جن نے ہاتھ رکھا ہوا ہے، دودھ نہیں پیتا ہے۔ دیکھیں! ایک دن کے بچے کو دیکھ کر پہچان لینا، یہ صاف دلالت تھی کہ ان لوگوں کو حضور ﷺ کا پورا پورا پتہ تھا۔ اللہ نے فرمایا: ہم نے اتنی کھلی نشانیاں دی ہیں۔

آپ ﷺ کا ایک پہلوان کو گرا دینا:

ایک دن حضور ﷺ مکہ مکرمہ میں تھے، رکانہ نامی ایک بہت بڑا مشہور پہلوان تھا، کہتا ہے: میری آپ سے ایک بات ہے، میں پڑھا لکھا نہیں ہوں، میں ایک کشتی لڑنے والا پہلوان ہوں، لیکن آج تک مکہ اور اس علاقہ میں کوئی پیدا نہیں ہوا جو مجھے گرا سکے، لہٰذا آپ میرے ساتھ کشتی کریں، اگر آپ نے مجھے گرا لیا تو میں سمجھوں گا کہ آپ اللہ کے نبی ہیں، یعنی کشتی کے ذریعہ بھی نبوت کا امتحان لیا جا رہا ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے اس کو گرا دیا اور اس پر غالب آ گئے۔ کہنے لگا: حضور! مجھے ایک موقع اور دے دیں۔ آپ ﷺ نے ایک موقع اور دے دیا اور اس کو گرا دیا، تیسری دفعہ پھر گرا دیا۔ اس نے کہا: مجھے اللہ کی قسم ہے! میں سمجھ گیا ہوں کہ آپ اللہ کے سچے نبی ہیں۔

آپ ﷺ کا چہرہ دیکھ کر ایمان لانے والے:

حضور ﷺ کا چہرہ بھی نبوت کی علامت تھا۔ کافروں کے ایک بڑے سردار نے آ کر حضور اکرم ﷺ کا چہرہ دیکھا اور کہا: مجھے کلمہ پڑھا دیں۔ جب واپس آیا تو ابو جہل کہنے لگا: عجیب آدمی ہو! تم نے کیسے کلمہ پڑھ لیا؟ تم تو بڑے سردار ہو، عقل والے ہو، تم نے کوئی بات بھی نہیں پوچھی؟ اس نے کہا: خدا کی قسم ہے! جب میں نے حضور اکرم ﷺ کا چہرہ دیکھا تو مجھے یقین ہو گیا کہ یہ چہرہ کبھی جھوٹ نہیں بول سکتا۔

آپ ﷺ کے اخلاق و کردار اور گفتار سب واضح علامات ہیں۔ اللہ نے آپ ﷺ کو ایسے معجزات عطا فرمائے کہ کوئی ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ حضور اکرم ﷺ نے اگر پتھروں کو اشارہ کیا تو پتھر بھی کلمہ پڑھنے لگ گئے، پانی میں ہاتھ رکھا تو پانی کا چشمہ جاری ہو گیا، لعاب دہن ڈالا تو کنویں کا پانی میٹھا ہو گیا۔

اللہ فرماتے ہیں: اے میرے نبی! یہ نشانیاں تو جبرائیل لے کر نہیں آئے، لیکن اس کے باوجود بھی یہ نہیں مانتے۔

اصل وجہ یہ ہے کہ ان کے دلوں میں حسد وعناد ہے۔ جب دلوں کے اندر کینہ آجائے تو آدمی بڑے سے بڑے عظیم المرتبت انسان کو بھی ماننے سے انکار کر دیتا ہے۔

﴿وَمَا يَكْفُرُ بِهَآ إِلَّا الْفٰسِقُوْنَ﴾ اور نہیں انکار کرتا ان کا، مگر جو فاسق ہے۔ فاسق کا لفظ کبھی عام گنہگار کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ کوئی آدمی اگر بڑا گناہ کرلے تو وہ فاسق ہے، اسی طرح فاجر اس کو کہتے ہیں جو کبائر کا ارتکاب بھی کرتا ہے اور پھر لوگوں کے سامنے کھلے گناہ کرنے والا ہے، یعنی شراب کھلے عام پی رہا ہے تو یہ فاسق سے فاجر بن جاتا ہے۔ لیکن کبھی فاسق سے مراد کافر ہوتا ہے۔ ہر جگہ سیاق وسباق کو دیکھنا پڑتا ہے۔ جو اللہ کی آیات بینات کا انکار کردے، اس کے کافر ہونے میں کیا شبہ ہوسکتا ہے؟

﴿أَوَكُلَّمَا عٰهَدُوْا عَهْدًا نَّبَذَهٗ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ ۚ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ وَلَمَّا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ نَبَذَ فَرِيْقٌ مِّنَ الَّذِيْنَ أُوْتُوا الْكِتٰبَ ۙ كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ كَأَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝﴾ [البقرۃ:۱۰۰،۱۰۱]

''جب بھی (ان یہود نے حضور ﷺ پر ایمان لانے کا) عہد کیا تو ان میں سے ایک فریق نے اس عہد کو پھینک دیا، بلکہ ان میں سے اکثر ایمان ہی نہیں رکھتے۔ اور جب ان کے پاس اللہ کی طرف سے رسول (محمد ﷺ) آئے، جو تصدیق کرتے ہیں اس کتاب کی جو ان کے پاس ہے تو اہل کتاب میں سے ایک فریق نے اللہ کی کتاب کو اپنے پس پشت ڈال دیا، گویا کہ وہ (اس کو) جانتے تک نہیں۔''

قرآن پاک کے اندر جو مسائل اُصولی ہیں، وہ ایک ہی ہیں۔ اللہ نے جو فرمان حضرت نوح علیہ السلام کو عطا فرمایا، وہی فرمان حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کو عطا فرمایا۔ البتہ فروعی مسائل میں ہر زمانے کے اعتبار سے پروردگار عالم نے اپنے بندوں پر رحم فرمایا۔ جو حکم جس وقت کے مناسب تھا، دیا گیا۔ وگرنہ اصولِ دین سب مشترک ہیں، اور وہ تین ہیں: مسئلہ توحید، مسئلہ نبوت ورسالت اور مسئلہ معاد۔ یہ تین چیزیں اُصولی ہیں، اسی کو علماء کہتے ہیں: ''الإیمان بالثلاثیات'' اور انہی کو ''الأصول الثلاثۃ'' کہا جاتا ہے۔ جب توحید آئے گی تو شرک کی جمیع اقسام کا رد ہوگا اور اللہ نے جتنے رسول اور نبی بھیجے ہیں وہ برحق ہیں، سب حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں، سب بشر ہیں، اللہ کے بھیجے ہوئے ہیں۔ جب ہم نے نبی کو مان لیا تو ان کی شریعت کو خود بخود مان لیں گے، جب ہمارا نبی پر ایمان ہوگا تو اس کی کتاب

پر بھی ایمان ہوگا۔ مسئلہ معاد یہ ہے کہ ہم نے مرنا ہے اور پھر دوبارہ زندہ ہونا ہے اور ہمارا حساب وکتاب، جزاوسزا، جنت وجہنم ہوگی۔

حضور ﷺ کو جو کتاب ملی ہے، اس نے تصدیق کی ہے کہ جو اللہ تعالیٰ نے پہلے کتابیں اُتاری ہیں، وہ حق ہیں۔

واقعہ:

ایک واقعہ مشہور ہے کہ اس زمانے میں یہودیوں کی ایک عورت اور ایک مرد نے زنا کا ارتکاب کیا۔ وہ عورت بڑے قبیلے کی تھی۔ یہودیوں نے سوچا کہ اگر ہم اس کا معاملہ مسلمانوں کے نبی کے سپرد کردیں تو ممکن ہے کہ کوئی رعایت کا فیصلہ کردیں۔ چنانچہ وہ اپنا مسئلہ حضور پاک ﷺ کی خدمت میں لے کر آئے اور عرض کیا کہ ہمارا یہ فیصلہ آپ کردیں۔ حضور پاک ﷺ نے فرمایا: اس مسئلے کا فیصلہ میں کردوں گا، تم یہ بتلاؤ کہ تورات میں کیا حکم ہے؟ کہنے لگے: ہمارے پاس تو بس اتنا حکم ہے کہ اگر کسی سے زنا ہوجائے تو اس کی اہانت کی جائے، یعنی اس کے منہ پر سیاہی مَل دی جائے، گدھے پر بٹھا کر بازار میں گھمایا جائے تو اس کی سزا پوری ہوگئی۔ حضور ﷺ نے فرمایا: تم غلط کہتے ہو۔ انہوں نے کہا: ہم ٹھیک کہتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ چونکہ حافظ تورات تھے، حضور ﷺ کو بتلا چکے تھے، حضور ﷺ نے یہودیوں سے فرمایا: تم کتاب تورات لے آؤ کہ وہ زنا کی سزا کے بارے میں کیا کہتی ہے؟ وہ تورات لے آئے اور اپنے ایک پڑھے لکھے کو بھی لے آئے۔ اس نے حضور ﷺ کے سامنے تورات کھولی اور اس جگہ پر ہاتھ رکھ لیا، جس جگہ زنا کا حکم موجود تھا، اور اس نے آگے پیچھے کی عبارت پڑھنی شروع کردی۔

عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''اِرْفَعْ يَدَكَ عَنِ الْكِتَابِ'' (کتاب سے ہاتھ اُٹھاؤ)۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کہتے ہیں کہ جب اس نے ہاتھ اُٹھایا تو آیت رجم ایسے چمک رہی تھی جیسے موتی چمکتے ہیں کہ اگر مرد اور عورت دونوں شادی شدہ ہیں، انہوں نے زنا کیا ہے تو انہیں رجم کیا جائے گا (یعنی سنگسار کیا جائے گا)۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: یہودیو! اللہ کے قرآن کے اندر بھی رجم کا حکم ہے اور تورات میں بھی رجم کا حکم ہے۔ آؤ، میں اللہ کے قرآن کے مطابق فیصلہ کرتا ہوں۔ یہود پریشان ہوگئے کہ ہم خود آئے تھے، اب بچ نہیں سکتے۔

اللہ نے فرمایا: جب میرے نبی آئے تو وہ ایسی کتاب لے کر آئے جو تصدیق کرنے والی ہے اس کی کتاب کی جو تمہارے پاس ہے، لیکن اہل کتاب نے اس کو اپنی پیٹھ کے پیچھے پھینک دیا۔ یہ حقیقتاً پھینکنا نہیں ہوتا، بلکہ اس کا معنی

یہ ہے کہ جب قرآن کو نہ مانا تو گویا پشت کے پیچھے پھینک دیا۔ ان کے متعلق اللہ نے فرمایا۔

﴿وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ ۚ وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ ۚ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَي الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ ۚ وَمَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَآ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ ۚ فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ ۚ وَمَا هُمْ بِضَاۗرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَيَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّھُمْ وَلَا يَنْفَعُھُمْ ۚ وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ڜ وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَھُمْ ۚ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝ وَلَوْ اَنَّھُمْ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَمَثُوْبَةٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ خَيْرٌ ۚ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝﴾ [البقرۃ: ۱۰۲، ۱۰۳]

''اور انہوں نے اس جادو کی پیروی بھی کی جس کو شیاطین سلیمان کی حکومت (کے عہد) میں پڑھتے تھے حالانکہ سلیمان نے کفر (جادو) نہیں کیا تھا، لیکن شیاطین نے کفر کیا جو لوگوں کو جادو سکھاتے تھے۔ اور اس علم کے پیچھے ہو لیے جو بابل (شہر) میں دو فرشتوں ہاروت و ماروت پر اُتارا گیا، اور یہ فرشتے نہیں سکھاتے تھے کسی کو (جادو) حتیٰ کہ کہہ دیتے: ہم آزمائش کے لیے ہیں، تم کفر نہ کرو۔ پھر بھی یہ ان سے وہ جادو سیکھتے تھے جس سے وہ مرد اور اس کی بیوی میں جدائی ڈالتے تھے اور یہ (جادوگر) نہیں نقصان کر سکتے اس سے کسی کا اللہ کے حکم کے بغیر، اور وہ چیز سیکھتے ہیں جو ان کا نقصان کرے اور نفع نہ دے۔ اور وہ جان چکے ہیں کہ جس نے جادو اختیار کیا، اس کا آخرت (جنت) میں کوئی حصہ نہیں، برا ہے جس کے عوض انہوں نے اپنے آپ کو بیچا۔ کاش کہ یہ جانتے ہوتے۔ اور اگر یہودی (نبی ﷺ اور قرآن پر) ایمان لاتے اور اللہ سے ڈرتے تو اللہ کی طرف سے بہتر ثواب ملتا، کاش کہ وہ جانتے ہوتے۔''

اور وہ شیاطین کے پیچھے چلے؛ اس لیے کہ انہوں نے رحمٰن اور رحمٰن کے بندوں کی اتباع چھوڑ دی، انہوں نے شیطان اور شیطان کی ذریت کی اتباع کی۔ تو لازمی بات ہے جو شیطان کی اتباع کرے گا، وہ بھٹکتا چلا جائے گا اور جہنم میں جا گرے گا۔ اللہ نے فرمایا: اے میرے رسول! آپ غم نہ کریں۔ یہ یہود ایسی قوم ہے انہوں نے تو حضرت سلیمان علیہ السلام پر بھی الزام لگایا کہ وہ جادوگر تھے، انہوں نے جادو کے زور سے جنات و شیاطین کو اپنے تابع

کیا ہوا تھا اور انہوں نے اتنا بڑا کفر کیا۔ حالانکہ یہ نہیں جانتے کہ سلیمان تو نبی ہیں، انہوں نے کبھی جادو نہیں کیا، انہوں نے کبھی کفر نہیں کیا۔ انہوں نے حضرت سلیمان علیہ السلام پر بھی یہ الزام عائد کیا، حالانکہ شیاطین نے کفر کیا، سلیمان علیہ السلام نے تو کفر نہیں کیا۔

اس ضمن میں ہاروت اور ماروت کا قصہ ذکر فرمایا۔ اس واقعہ کے بارے میں بڑی بڑی روایات نقل کی گئی ہیں اور کتابوں میں اس کی بڑی تفصیلات ذکر کی گئی ہیں۔

سحر کی تعریف:

سحر، جادو کو کہتے ہیں۔ اس کی کئی اقسام ہیں:

پہلی قسم:

حقیقت میں کچھ نہیں ہوتا، لیکن دوسرے کو اس طرح دھوکہ میں مبتلا کیا جاتا ہے، اس کی قوتِ خیالیہ پر ایسا اثر ڈالا جاتا ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ جادوگر جو کچھ دکھا رہا ہے، وہ ٹھیک ہے۔ حالانکہ وہ بات حقیقت میں نہیں ہوتی۔ جیسا کہ فرعون کے زمانہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ میں جادوگر آئے اور انہوں نے رسیاں ڈالیں تو قرآن نے صاف بتلایا: ﴿يُخَيَّلُ إِلَيْهِ مِن سِحْرِهِمْ أَنَّهَا تَسْعَىٰ ﴿٦٦﴾﴾ [طٰہٰ: ٦٦] انہوں نے قوتِ خیالیہ پر ایسا اثر ڈالا کہ سب لوگ یہ سمجھنے لگے کہ یہ سانپ دوڑ رہے ہیں، حالانکہ وہ سانپ نہیں تھے، بلکہ رسیاں تھیں۔

دوسری قسم:

اسبابِ خفیہ استعمال کیے جاتے ہیں اور وہ چونکہ ہمیں نظر نہیں آتے، اس لیے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اس نے سب کچھ اپنی قوت سے کر ڈالا ہے، کیونکہ وہ اسباب ایسے خفی ہوتے ہیں کہ دیکھنے والے آدمی کو کوئی پتہ نہیں چلتا۔

قوم کو بے وقوف بنانے والوں کا واقعہ:

جیسا کہ ایک علاقہ میں دو آدمی فوج میں ملازم تھے اور فوج کے ٹیلی فون ڈیپارٹمنٹ (Signal) سے تعلق رکھتے تھے۔ انہوں نے کوئی غلطی کی تو ان کو نوکری سے نکال دیا گیا تو بے کار ہو گئے کہ اب کیا کریں۔ شیطان نے ان کے دماغ میں ڈالا کہ سب سے آسان کام پیر بننا ہے، اس میں کچھ نہیں کرنا پڑتا، صرف جبہ، اور ایک عصا ہاتھ میں لے لو اور سبز پگڑی باندھ لو تو پیر بن جاؤ گے۔ اور کسی نے یہ نہیں پوچھنا کہ آپ کہاں سے پڑھے ہیں یا آپ

پڑھے ہوئے بھی ہیں یا بالکل اللہ کی رحمت ہے؟ بہر حال ایک خلیفہ بن گیا اور ایک پیر بن گیا۔ چونکہ ٹیلی فون کے مسئلے کو جانتے تھے تو انہوں نے اپنے اور خلیفہ کے ڈیرے کے درمیان ایک ہزار میٹر کا فاصل رکھا اور زمین میں انہوں نے تار بچھادی اور تار کے ذریعے انہوں نے اپنے کوڈ ورڈز (Code Words) مقرر کر لیے اور لوگ آنے شروع ہوئے خلیفہ کے پاس کہ حضرت سے ملنا ہے۔ اس نے کہا کہ حضرت وظیفہ میں موجود ہیں، وہ پوچھتے کہ کب ملنے کے لیے آئیں؟ وہ کہہ دیتا فلاں وقت میں آئیں۔ وہ بے چارے چلے جاتے۔

اللہ کی قدرت ہے کہ جوں جوں انتظار بڑھے ویسے ویسے آدمی کا شوق بڑھتا جاتا ہے تو وہ جب دوبارہ آئے تو خلیفہ ان سے پوچھتا کہ کیا بات ہے؟ کیوں بلا وجہ پیر صاحب کو پریشان کرتے ہو؟ وہ اپنی پریشانی بتلا دیتے، میں حضرت سے دعا کروانے آیا ہوں، تعویذ لینے آیا ہوں، تاکہ میری مقدمہ سے جان چھوٹ جائے تو وہ کہتا کہ بیٹھ جاؤ اور خلیفہ صاحب مراقبہ شروع کر دیتے اور تھوڑی دیر کے بعد کہہ دیتا: جاؤ، حضرت صاحب آپ کو بلا رہے ہیں۔ اب ایک ہزار میٹر کے فاصلے میں پانچ دس منٹ تو لگ جاتے ہیں اور جب ادب سے جا رہا ہو، پاؤں میں جوتا بھی نہ ہو تو اور زیادہ وقت لگتا ہے۔ اب خلیفہ صاحب نے مصلے کے نیچے جو تار کا سسٹم لگایا ہوا تھا، ہاتھ مار کر حضرت کو اطلاع کر دی کہ یہ آپ کے پاس مقدمہ کے سلسلہ میں آ رہا ہے۔ جب یہ آدمی وہاں گیا، حضرت مصلے پر بیٹھے ہیں، اس نے سلام کیا، حضرت نے جواب دے کر غصہ سے دیکھا کہ کیا بات ہے؟ کیوں مجھے پریشان کرتے ہو؟ اگر مقدمہ ہو گیا تو کوئی آسمان ٹوٹ پڑے گا، جاؤ مقدمہ ختم ہو جائے گا۔ اب وہ آدمی خوش ہو گیا کہ حضرت تو بہت پہنچے ہوئے ہیں، میں نے ابھی حضرت کو کچھ بتلایا ہی نہیں اور حضرت نے سارا قصہ ہی جان لیا۔ اب وہ آدمی تو قدموں میں گر گیا کہ حضرت! مجھے تو مرید بنالیں۔ سبحان اللہ! حضرت کو تو ہمارے اندر کا بھی پتہ ہے۔

دیکھیں! اب اسباب خفیہ تھے، دیکھنے والے کو نظر نہیں آ رہے تو وہ دھوکے میں مبتلا ہو گیا۔ اسی طرح جادوگر بھی کرتے ہیں کہ اسباب تو ہیں، لیکن وہ اسباب چھپے ہوئے ہوتے ہیں اور ہمیں نظر نہیں آ رہے ہوتے۔ اب ان کا ہاتھ بظاہر صاف ہے، لیکن انہوں نے اپنے ہاتھوں پر کچھ عرصہ ایسی دواؤں کا عمل کیا ہوا ہوتا ہے کہ وہ دوائیں ہمیں نظر نہیں آتیں اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ انہوں نے ہمارے سامنے ہاتھ دھویا ہے۔

حالانکہ بعض چیزیں ایسی ہوتی ہیں کہ جو آدمی اگر استعمال کرے، جیسے آم کا درخت مشہور ہے، اس کا جب بور نکلتا ہے اس بور کو پانچ سات دن ہاتھوں پر رگڑتے رہیں تو ایک سال تک اس کا اثر ہاتھوں میں رہتا ہے۔ اگر کسی آدمی کو

بچھو، مچھر بھڑ یا موذی جانور کاٹ لے اور وہ اپنا ہاتھ اس پر پھیر دے تو ایک منٹ میں آدمی ٹھیک ہو جائے گا، اور لوگ کہیں گے: ماشاء اللہ! حضرت کی بڑی کرامت ہے، حضرت کے ہاتھ میں اتنا اثر ہے۔ حالانکہ آم کے بور کا اثر ہے۔ بعض لوگ انگاروں پر ناچتے ہیں، حالانکہ یہ کوئی کرامت نہیں ہوتی اور نہ اس میں کوئی بزرگی ہوتی ہے۔ یہ ابی لہب کہلانے والی بات ہوئی کہ آگ کے شعلوں کا باپ تو اس نے کنیت بھی وہی رکھی اور اللہ نے اس کا ٹھکانہ بھی وہی دیا۔ اس لیے یہ کوئی بزرگی نہیں، بعض دوائیں دنیا میں ایسی موجود ہیں کہ جب آدمی اپنے بدن پر یا پاؤں پر لگا کر انگارے پر پاؤں رکھ کر چلے تو آپ کا پاؤں نہیں جلے گا۔

تیسری قسم:

شیاطین وجنوں سے مدد لی جاتی ہے، ان کے ساتھ تعلق جوڑا جاتا ہے۔ جیسے انسان کا بندوں سے تعلق ہو سکتا ہے ایسے ہی جنات سے بھی تعلق ہو سکتا ہے۔ جن بھی ایک مخلوق ہے، جن جنات سے تعلق ہو جاتا ہے تو وہ جنات کے لیے کچھ کلمات مخصوص کرتے ہیں، جب وہ پڑھتے ہیں تو جنات آجاتے ہیں۔ یہ آدمی اس جن سے کہتا ہے کہ مجھے فلاں چیز کی ضرورت ہے۔ جن نے وہ چیز ایک منٹ میں لا کر دے دی۔ چونکہ وہ جنات ہمیں نظر نہیں آرہے ہوتے تو ہم اس کے جادو کو جادو سمجھتے ہوئے قائل ہو جاتے ہیں۔ جنات کو اللہ نے اتنی قوت استدراجیہ دی ہوئی ہے کہ وہ ہوا بن جاتے ہیں، وہ اُڑ سکتے ہیں، وہ جانور بن جاتے ہیں، سانپ بن جاتے ہیں، وہ انسانوں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں، وہ سیکنڈوں میں ایک ملک سے دوسرے ملک میں پہنچ جاتے ہیں، ہزاروں سال ان کی عمر ہوتی ہے۔ جادوگر ان شیاطین کی اعانت کے ساتھ اپنے شعبدے دکھلاتا ہے۔

سحر، انسانوں پر اثر کر سکتا ہے یا نہیں؟

سحر، انسانوں پر اثر کرتا ہے، اس کے اثرات بد ہوتے ہیں۔ بلکہ خدا کی قدرت ہے کہ جتنے باطل علوم ہیں، جتنے شیطانی علوم ہیں، ان کا اثر جلدی ہوتا ہے، کیونکہ ان کی وجہ سے عموماً آدمی خیر سے دور اور شر اور گناہوں کے قریب ہوتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ خیر کمزور ہو رہی ہے اور شر کامیاب ہو رہا ہے۔ یہ تو حقیقت ہے کہ شر کی قوتیں زیادہ ہوتی ہیں۔ جادو انسان پر اثر کرتا ہے، بلکہ اللہ کے اولیاء پر بھی اثر کر جاتا ہے، اللہ کے نبیوں پر بھی اثر کرتا ہے، اس سے بڑی بات کیا ہوگی کہ حضرت محمد رسول ﷺ پر بھی جادو نے اثر کر لیا۔

کیا جادو کے اثر سے کسی چیز کی حقیقت بھی بدل جاتی ہے یا نہیں؟

مثلاً انسان پر جادو کرو، وہ پتھر بن جائے یا کسی چیز پر جادو کرو، اس کی حقیقت بدل جائے کہ انسان سے حیوان بن گیا۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے یا نہیں ہو سکتا؟ اس کے بارے میں دو قول ہیں:

پہلا قول:

بعض علمائے کرام تو یہ فرماتے ہیں کہ جادو سے کسی چیز کی حقیقت تبدیل نہیں ہو سکتی۔ کوئی جادوگر یہ نہیں کر سکتا کہ کسی انسان کو حیوان بنا دے۔ اگر ایسا جادوگروں کے ہاتھ میں ہوتا تو وہ کسی اللہ کے ولی کو نہ چھوڑتے۔

دوسرا قول:

بعض علماء اس بات کے قائل ہیں کہ جادو سے حقیقت بھی تبدیل ہوتی ہے۔ انہوں نے حضرت کعب احبار رحمہ اللہ کے ایک قول سے استدلال کیا ہے۔ وہ فرمایا کرتے تھے: اللہ نے مجھے کچھ ایسے کلمات سکھلا دیئے ہیں کہ اگر وہ وظیفہ میں نہ پڑھتا تو یہودی مجھے گدھا بنا دیتے، لیکن اللہ نے مجھے ایسے کلمات عطا فرمائے ہیں کہ ان کے پڑھنے سے مجھ پر جادو اثر نہیں کرتا۔ یہ روایت مختلف کتابوں میں موجود ہے اور لوگوں نے انہیں یہ بھی کہا کہ مہربانی کر کے ہمیں بھی بتلائیں کہ وہ کلمات کیا ہیں، تا کہ ہم بھی وہ کلمات سیکھ لیں اور جادوگروں کے فتنوں سے بچ جائیں تو انہوں نے وہ کلمات سکھلا دیئے۔ وہ کلمات یہ ہیں:

''أَعُوذُ بِاللهِ بِوَجْهِ اللهِ الْعَظِيْمِ الَّذِيْ لَيْسَ شَيْءٌ أَعْظَمَ مِنْهُ وَ بِكَلِمَاتِ اللهِ التَّامَّاتِ الَّتِي لَا يُجَاوِزُهُنَّ بَرٌّ وَّ لَا فَاجِرٌ وَ بِأَسْمَاءِ اللهِ الْحُسْنٰى كُلِّهَا مَا عَلِمْتُ مِنْهَا وَ مَا لَمْ أَعْلَمْ، مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ وَ بَرَأَ وَ ذَرَأَ.''

اس روایت کو سامنے رکھ کر بعض علماء اس کے قائل ہیں کہ حضرت کعب رحمہ اللہ جیسا آدمی جو کہہ رہا ہے، اس کا مطلب ہے کہ ہیئت تبدیل ہو سکتی ہے۔ لیکن اکثر علماء اس طرف گئے ہیں کہ ان کے کہنے کا مقصد یہ تھا کہ جیسا گدھا احمق ہوتا ہے اور پوری دنیا میں حماقت کے لیے ضرب المثل ہے، اسی طرح مجھے بھی یہ لوگ بیوقوف بنا دیتے۔ بہرحال اکثر علماء نے فرمایا کہ حضرت کعب احبار رحمہ اللہ کا مقصد یہ تھا کہ اگر میں کلمات نہ پڑھتا تو یہود مجھے بے وقوف بنا دیتے، جیسے گدھا احمق اور بے وقوف جانور ہے۔

جادو کا حکم:

جادو اس زمانہ میں بھی تھا اور اب بھی ساحر موجود ہیں۔ اس زمانہ میں بھی سحر سب سے زیادہ یہود میں تھا، بڑے جادوگر یہودی تھے، اب بھی جادو ان کے اندر زیادہ ہے۔ جادو پر عقیدت رکھنا اور جادو والا عمل کرنا اور جادو کا علم سیکھنا بھی کفر ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے وضاحت فرمادی کہ جو جادو کرتا ہے یا جادو سیکھتا ہے یا جادو پر عقیدت رکھتا ہے تو اس نے اللہ کے ساتھ کفر کیا ہے۔ یہ علم حرام ہے اور شیطانی علوم میں خاص طور پر سحر کی وہ قسم جس میں شیطانوں سے مدد لی جاتی ہو، اس کے کفر صریح ہونے میں کسی کو کوئی شبہ نہیں ہو سکتا۔ سحر کی بعض ایسی قسمیں ہیں جن سے شیاطین سے استمداد نہیں لی جاتی، بلکہ قوتِ خیالیہ پر اثر ڈالا جاتا ہے، اس کے فسق و فجور ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ اکثر جادو وہ ہوتا ہے جس میں شیاطین سے استمداد لی جاتی ہے تو جب کوئی شیاطین کو مددگار سمجھے، اس کے کفر ہونے میں کوئی شبہ باقی نہیں رہتا۔ البتہ اگر کوئی شخص ایسا منتر یا عمل سیکھے جس میں شرکیہ الفاظ کا استعمال بھی نہ ہو اور غیر اللہ سے مدد بھی نہ مانگی جاتی ہو تو جائز کام کے لیے اس کو سیکھنے کی گنجائش ہے۔

معجزہ اور سحر میں فرق

سحر:

وہ ہوتا ہے جو ساحر کی قوتِ خیالیہ، اس کے کرتب، کسب مہارت اور تعیین وقت کے ساتھ لوگوں کو محیر العقول کام کر دکھاتا ہے۔

معجزہ:

جو خرقِ عادت نبی کے ہاتھ پر ظاہر ہو اور وہ اس کو اپنی نبوت کی تصدیق کے لیے پیش کرے اور اُمت اس کی مثل لانے سے قاصر ہو۔

کرامت:

جو خرقِ عادت کسی ولی کے ہاتھ پر ظاہر ہو۔ اس میں نبوت کا دعویٰ نہیں ہوتا۔

ان میں دو طرح کا فرق ہے: ایک تو فرق دونوں شخصوں میں ہے، وہ یہ کہ جس کے ہاتھ پر معجزہ یا کرامت ظاہر ہو رہی ہے، اگر وہ خرقِ عادت کام کرنے کے ساتھ ساتھ نبوت کا دعویٰ بھی رکھتا ہے تو وہ نبی ہے اور اگر کسی نبی کا متبع ہے اور اس سے کوئی کام خلافِ عادت ظاہر ہوا ہے تو وہ ولی ہے۔ بشرطیکہ اس کا عمل اور کردار شریعت کے مطابق، صورت، سیرت شریعت کے مطابق، قرآن پر عمل کرنے والا ہو۔ اور جس کے ہاتھ پر جادو ظاہر ہو رہا ہے، اس کی زندگی بھی شریعت کے خلاف، عمل بھی شریعت کے خلاف، اُٹھنا بیٹھنا بھی شریعت کے خلاف ہوتا ہے، بلکہ جادو ان لوگوں کا زیادہ چلتا ہے جو زیادہ پلید رہتے ہوں؛ کیونکہ ساحرین کا شیطانوں سے تعلق ہوتا ہے اور شیاطین کا میلان ان کی طرف ہوتا ہے جو ان کے ہم جنس ہوتے ہیں۔ جیسے پاک لوگوں کا تعلق پاک لوگوں سے ہوتا ہے، اسی طرح ناپاک لوگوں کا تعلق ناپاک لوگوں سے ہوتا ہے۔ تو آدمی سیکھنے سے فرق کر سکتا ہے کہ یہ کرامت ہے اور یہ جادو ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ معجزہ اور کرامت میں کوئی اسبابِ خفیہ نہیں ہوتے، وہ تو خالص اللہ کا فعل ہوتا ہے۔ اللہ اس کو اپنے نبی یا ولی کے ہاتھ پر ظاہر کر دیتے ہیں۔ جیسے اللہ نے فرمایا:

﴿وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَكِنَّ اللَّهَ رَمَىٰ﴾ [الانفال: ۱۷]

جب حضور ﷺ نے مٹی کی مٹھی بھر کر دشمنوں کی طرف پھینکی اور فرمایا: ''شَاهَتِ الْوُجُوهُ'' تو اللہ نے فرمایا: آپ نے یہ مٹی نہیں پھینکی، یہ تو میں نے پھینکی ہے، کیونکہ یہ آپ کیسے کر سکتے ہیں کہ سب کی آنکھوں میں پہنچا دیں؟ اصل تو اللہ کا فعل ہے، ہم نے آپ کے ہاتھ پر ظاہر کر دیا ہے۔ اللہ اس کو نبی کے ہاتھ پر ظاہر کر دیں تو وہ معجزہ ہوتا ہے اور اگر ولی کے ہاتھ پر ظاہر کر دیں تو وہ کرامت ہوتی ہے۔ معجزہ بھی برحق ہے اور کرامت بھی برحق ہے، لیکن معجزہ اللہ کے حکم کے بغیر نبی کے ہاتھ پر ظاہر نہیں ہوتا، اس میں نبوت کا دعویٰ ہوتا ہے، اسی طرح کرامت بھی اللہ کے حکم کے بغیر، اللہ کے ارادے کے بغیر ولی کے ہاتھ پر ظاہر نہیں ہوتی، نیز اس میں نبوت کا دعویٰ بھی نہیں ہوتا۔

معجزہ، کرامت اور سحر میں فرق:

معجزہ، کرامت اور سحر میں اتنا بڑا فرق ہے کہ معمولی سی توجہ سے فرق معلوم ہو جاتا ہے۔ ولیوں کا تعلق رحمانی ہوگا اور ساحرین کا شیطانوں سے تعلق ہوگا۔ اس لیے شریعت نے پابندی لگا دی ہے کہ کبھی جادوگروں کے پاس نہ جایا کرو، کبھی نجومی کے پاس نہ جایا کرو، کبھی کاہنوں کے پاس نہ جایا کرو۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: جو شخص ان

کاہنوں، عرافوں، نجومیوں اور جادوگروں کے پاس جائے اور ان کی باتوں کی تصدیق کرے، مان لے کہ یہ سچ کہہ رہا ہے، اس نے کفر کیا اس کتاب کا جو نازل کی اللہ نے محمد ﷺ پر۔ یعنی وہ کافر ہو جاتا ہے۔ [مسند احمد بن حنبل، رقم: ۹۵۳۶]

حضرت سلیمان علیہ السلام جادوگر نہیں تھے:

حضرت سلیمان علیہ السلام اللہ کے پیغمبر تھے۔ اور اللہ کے سارے انبیاء معصوم ہوتے ہیں، وہ علومِ باطلہ سے پاک ہوتے ہیں۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس جنات کا مسخر ہونا، ہوا کا مسخر ہونا، ان کا معجزہ تھا جو اللہ تعالیٰ نے ان کو عطا فرمایا تھا اور مختلف پرندوں کو ان کے تابع فرما دیا، پرندوں کی زبانیں اور لغات کا علم بھی عطا فرما دیا اور جنات و شیاطین کو بھی ان کے لیے مسخر کر دیا اور ہوا کو بھی ان کے تابع کر دیا کہ ان کا تخت ان کے حکم کے مطابق اُڑتا تھا اور صبح کے پہلے حصہ میں ایک مہینے کا سفر طے کرتا تھا اور شام کے حصے میں ایک مہینے کا سفر طے کرتا تھا۔ یہ معجزات تھے، ان کا سحر سے کوئی تعلق نہیں۔

ہاروت و ماروت کا قصہ:

قرآن مقدس نے دو نام ذکر فرمائے: ہاروت اور ماروت۔ اور یہ بھی ذکر فرمایا کہ یہ دونوں اللہ تعالیٰ کے فرشتے ہیں، ان کو اللہ تبارک و تعالیٰ کے حکم سے بابل میں اُتارا گیا امتحان کے لیے۔ لوگ ان سے جادو کے بارے میں آ کر پوچھتے تھے، سیکھتے تھے، لیکن وہ ان کو باخبر کرتے تھے کہ ایسی چیزوں سے بچو، یہ امتحان ہے، اس میں پڑ کر کفر کے کناروں میں نہ پہنچ جاؤ۔ ہم تمہیں بتلا دیں گے، اگر بچ جاؤ تو زیادہ بہتر ہے۔

مفسرین کرام نے ان کے واقعہ کو بڑی تفصیل سے ذکر کیا ہے کہ حضرت ادریس علیہ السلام کے زمانہ میں لوگ فسق و فجور، منکرات اور اللہ کی نافرمانیوں میں اتنے مبتلا ہو گئے کہ ملائکہ دفتروں کے دفتر لکھ کر اللہ کے دربار میں پیش کرتے۔ اس پر بعض ملائکہ نے اللہ تعالیٰ کے دربار میں عرض کیا کہ یا رب! یہ آپ کے کیسے بندے ہیں؟ جن کو آپ نے پیدا فرمایا اور جنہیں آپ نے تمام مخلوقات پر فضیلت عطا فرمائی اور بڑی نعمتوں سے نوازا ہے، لیکن آپ کے بندوں کا یہ عالم ہے کہ وہ اتنے نافرمان، اتنے گناہگار اور اتنے منکرات میں گر گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے ملائکہ سے فرمایا: یہ بھی میری مخلوق ہے، تم بھی میری مخلوق ہو، لیکن تمہارے اور ان کے درمیان ایک بہت بڑا فرق ہے کہ تم میری ایسی مخلوق ہو کہ جن کو میں نے معصوم پیدا کیا ہے اور قوتِ شہوانیہ، قوتِ حیوانیہ، قوتِ غضبیہ جو انسان کو

راستے سے ہٹانے والی ہیں، تمہارے اندر میں نے وہ قوتیں رکھی ہی نہیں ہیں، لہٰذا تم تو گناہ کرنے سے پاک ہو اور انسانوں کو جہاں قوتِ علمیہ سے نوازا ہے، وہاں میں نے ان کے اندر قوتِ حیوانیہ، شہوانیہ اور غضبیہ بھی رکھی ہیں۔ اگر وہ قوتیں تمہارے اندر بھی رکھ دوں تو تم بھی اسی طرح غلطیاں کرو گے۔ ملائکہ نے عرض کیا: یارب کریم! اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ان قوات کے ہونے کے بعد آدمی کے بھٹکنے کا خطرہ ہوتا ہے، لیکن ایسا بھی نہیں کہ انسان باقی ساری قوتوں سے کام نہ لے اور قوتِ حیوانیہ اور شہوانیہ میں اتنا مبتلا ہو جائے کہ اپنے خالق و مالک کے احکام کو بھی بھول جائے۔ اگر ہمارے اندر ایسی قوتیں رکھی جائیں تو ہم ایسی غلطیاں نہیں کریں گے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کو حکم فرمایا کہ تم اپنے ملائکہ میں سے کوئی سے دو فرشتے منتخب کرو، میں ان کو دنیا کے اندر بھیج کر یہ قوات رکھتا ہوں اور ان کا اختبار و امتحان کر لیتے ہیں کہ وہ کیا کرتے ہیں؟

فرشتوں نے دو فرشتوں کو منتخب کیا: ایک کا نام ہاروت تھا اور ایک کا نام ماروت تھا۔ یہ دونوں فرشتے اللہ کی عبادت میں بڑے مصروف تھے۔ ویسے تو سارے فرشتے عبادت گزار ہیں، لیکن بعض دوسروں سے بڑھ جاتے ہیں۔ ان دونوں فرشتوں میں اللہ نے قوتِ حیوانیہ رکھ دی اور انہیں حکم دیا کہ زمین میں جا کر عدل وانصاف سے لوگوں کے درمیان فیصلے کرو۔ خبردار! قتل سے بچنا، زنا سے بچنا اور شربِ خمر سے بچنا۔ وہ زمین میں آگئے اور لوگوں کے درمیان فیصلے کرنے لگے اور اللہ کی عبادت میں مشغول رہتے اور جب شام کو فارغ ہوتے تو اسمِ اعظم پڑھتے اور آسمانوں پر چلے جاتے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے ان کے امتحان کے لیے ایک عورت جس کا نام ''زہرہ'' نقل کیا گیا ہے اور بعض روایات میں ملتا ہے کہ اس عورت کی روح کا تعلق ستارہ زہرہ سے بھی تھا اور بعض کہتے ہیں کہ ستارہ زہرہ تو بعد میں بنا، وہ عورت انسان تھی، لیکن وہ اتنی خوبصورت تھی کہ اسے ستارے کے ساتھ تشبیہ دی جاتی تھی، گویا حسن و جمال میں ایک چمکتا ہوا ستارہ ہے۔ وہ ایک قضیے میں ان کے پاس آئی، جب ہاروت اور ماروت نے اس عورت کو دیکھا تو ان دونوں کے دل میں اس کے حسن و جمال نے اتنا اثر کر دیا کہ وہ اس کی طرف مائل ہو گئے اور اس کو روزانہ مختلف حیلوں بہانوں سے بلاتے رہے اور آخر اس پر اتنا ظاہر کر دیا کہ تم ہمارے ساتھ مل جاؤ، اب ہم تمہارے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اس عورت نے ان دونوں کے سامنے کہا کہ اگر تم مجھے حاصل کرنا چاہتے ہو اور میرے جسم وجان اور حسن و جمال سے تمتع حاصل کرنا چاہتے ہو تو میری کچھ شرائط ہیں: ایک تو میرا خاوند ہے، جب تک وہ زندہ ہے میں کسی دوسرے کے

قریب نہیں جاسکتی، پہلے اس کو قتل کرنا ہوگا۔ دوسری بات یہ ہے کہ میں بُت پرست ہوں، میرا جو خدا اور بت ہے، اس کے سامنے تمہیں بھی سجدہ کرنا ہوگا۔ اور تیسری شرط یہ ہے کہ شراب بھی پینی ہوگی۔ اگر یہ تین شرطیں منظور ہیں تو میں حاضر ہوں، ورنہ تمہارے قریب نہیں آسکتی۔ بہر حال وہ سوچتے رہے۔ اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو عورت کے مکر اور امتحان سے محفوظ رکھے۔

عورتوں کا فتنہ سب فتنوں سے بڑھ کر ہے:

حضور اکرم ﷺ نے اپنے آخری وقت میں اُمت کو نصیحت فرمائی اور بار بار فرمایا:

"اِيَّاكُمْ وَ فِتْنَةَ النِّسَاءِ، اِيَّاكُمْ وَ فِتْنَةَ النِّسَاءِ، اِيَّاكُمْ وَ فِتْنَةَ النِّسَاءِ."

"اے میری اُمت! خبردار! عورتوں کے فتنے سے بچنا، عورتوں کے فتنے سے بچنا، عورتوں کے فتنے سے بچنا۔"

بعض علماء نے لکھا کہ دنیا میں سب سے بڑا مکر اور سب سے بڑا فتنہ عورت کا فتنہ ہے۔ بلکہ یہاں تک لکھا ہے کہ عورت کے مقابلے میں شیطان کا مکر بھی کچھ نہیں ہوتا اور انہوں نے قرآن کی مقدس آیت سے استدلال کیا ہے، ﴿اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا﴾ [النساء:٧٦] شیطان کا مکر ضعیف ہے اور اس کا مکر میرے پاک بندوں پر نہیں چلتا۔ لیکن عورت کے مکر کے بارے میں قرآن میں آتا ہے: ﴿اِنَّ كَيْدَكُنَّ عَظِيْمٌ﴾ [یوسف:٢٨] تحقیق عورتوں کا مکر بہت بڑا ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کو جب آزادی کا پروانہ ملا تو انہوں نے سب سے پہلی یہ بات کہی: ﴿اِنَّ رَبِّيْ بِكَيْدِهِنَّ عَلِيْمٌ﴾ [یوسف:٥٠] پہلے وہ فیصلہ کرو جن عورتوں نے اپنے ہاتھ کاٹے تھے، انگلیاں کاٹ ڈالی تھیں، میرا رب ان عورتوں کے مکر کے بارے میں جانتا ہے۔

علمائے متاخرین نے لکھا ہے کہ دنیا میں دو فتنے ہیں: ایک دولت اور ایک عورت۔ دولت بھی بہت بڑا فتنہ ہے کہ بڑے سے بڑے قدآور لوگ، بڑے علم والے لوگ اور بڑی عظمتوں والے لوگ دولت میں بک گئے۔ فتوے، احکام، مسائل بدل ڈالے، اللہ کے قرآن میں تحریفات کر ڈالیں، اللہ کے نبی کی حدیثوں کو بدل ڈالا۔ اس کا مقصد دولت کا حصول تھا، لیکن جب دولت کا فتنہ ناکام ہوجاتا ہے تو وہاں سے عورت کا فتنہ شروع ہوتا ہے۔ وہ دولت سے بڑا فتنہ ہے، جب تک اللہ عورت کے فتنے سے نہ بچائے، آدمی نہیں بچ سکتا۔

شراب، اُمّ الخبائث ہے:

ان دونوں نے مشورہ کیا کہ بت کے آگے سجدہ کرنا کفر و شرک ہے۔ یہ تو بڑی مشکل بات ہے اور قتل ناحق، بہت بڑا ظلم ہے کہ آدمی کسی کو ناحق قتل کرے۔ اس کے خاوند سے تو ہمارا کوئی جھگڑا نہیں ہے، اس لیے ہم قتل بھی نہیں کر سکتے۔ یہ بڑے گناہ ہیں۔ شراب پینا بہرحال گناہ تو ہے، لیکن ان کے مقابلہ میں اتنا بڑا گناہ نہیں ہے، کچھ دیر نشہ ہو جائے گا۔ جب وہ عورت دوبارہ آئی تو انہوں نے کہا: بات یہ ہے کہ ہم تمہاری پہلی دو شرطیں پوری نہیں کر سکتے، البتہ تیسری شرط شراب پینے کی ہمیں قبول ہے۔ شراب لے آؤ، وہ ہمیں پلا دو۔ اس نے کہا: یہاں تو نہیں ہو سکتا کہ تم یہاں عدالت میں بیٹھ کر فیصلے کرتے ہو۔ تم میرے پاس آؤ، وہاں میں انتظام کروں گی۔ وہ ان کو اپنے مکان پر لے گئی اور ان کو شراب پلائی۔ جب نشہ میں آ گئے تو اس نے اپنے خاوند کو بھی قتل کروا دیا اور بت کے آگے سجدہ بھی کروا دیا۔

اس لیے حدیث میں آتا ہے کہ شراب، اُمّ الخبائث ہے۔ یہ برائیوں کی ماں ہے، اس سے برائیاں پیدا ہوتی ہیں۔ جب آدمی شراب پی لیتا ہے تو اس کی عقل زائل ہو جاتی ہے، اس میں اور حیوان میں کوئی فرق نہیں ہو سکتا۔

شراب کی حد کتنے کوڑے ہونی چاہیے؟

بعض لوگ شراب پیتے ہیں، ان کا دماغ ٹھیک رہتا ہے، بلکہ شراب پینے کے بعد وہ زیادہ کام کرتے ہیں۔ ایک چیز اگر نہ پینے والے کو پلائی جائے اور اس کو نشہ دے تو اس کا نشہ حرام ہے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ پینے سے آدمی کی قوتِ مدافعت بڑھ جائے۔ حلال و حرام کے فیصلے کے لیے کسی نشئی کو شراب نہیں پلائی جاتی، بلکہ عام آدمی کو دیکھا جائے گا۔

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:

"كُلُّ مُسْكِرٍ حَرَامٌ." [صحیح بخاری، رقم: ۴۳۴۳]

"ہر نشہ کرنے والی چیز حرام ہے۔"

چاہے وہ شراب کو جَو سے بنایا گیا، گڑ سے بنایا گیا یا فروٹ سے بنایا گیا۔ غرض کسی چیز سے اس کو بنایا گیا ہو، میرے سرکار نے ایک قاعدہ کلیہ سمجھا دیا کہ ہر نشہ کر دینے والی چیز حرام ہے۔ اور اس کے بعد آپ ﷺ نے

وضاحت بھی فرمادی کہ اس کی تھوڑی سی مقدار بھی حرام ہے اور زیادہ مقدار بھی حرام ہے۔ فرمایا: حرام چیز کی قیمت بھی حرام، اس کا بیچنا بھی حرام، اس کا خریدنا بھی حرام، اس کا نفع حاصل کرنا بھی حرام ہے؛ کیونکہ جب اصل حرام ہے تو اس کی قیمت بھی حرام ہے۔

سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا کہ آپ کی رائے میں شراب پینے والے کو کتنے کوڑے مارنے چاہئیں؟ آپ نے فرمایا: اسی کوڑے مارنے چاہئیں۔ پوچھا گیا: اسی کوڑے کیوں مارے جائیں؟ آپ نے فرمایا: جو آدمی شراب پیے گا، اس کو نشہ ہوگا تو وہ منہ سے گندی گندی باتیں نکالے گا، کسی پر تہمت لگائے گا، کسی پر بہتان باندھے گا۔ تو جیسے بہتان لگانے والے کی حد قذف اسی کوڑے ہے، اسی طرح اس کی بھی حد اسی کوڑے ہونی چاہیے۔

تتمہ کلام:

جب یہ سارے کام ہو گئے تو عورت نے کہا: تم مجھے بھی سکھا دو۔ انہوں نے اس کو بھی سکھا دیئے اور اس عورت کے ساتھ برا کیا۔ برائی کرنے کے بعد ہوش آیا، نشہ اترا تو دیکھا کہ ہم نے قتل بھی کر لیا، بت کو سجدہ بھی کر لیا، اللہ معاف فرمائے زنا بھی کر لیا، عورت بھی غائب ہو گئی۔ دوڑتے ہوئے حضرت ادریس علیہ السلام کے پاس آئے، ہم تو ہلاک و برباد ہو گئے، ہم اتنے بڑے گناہ ہو گئے ہیں، ان کا کیا حل ہے؟ انہوں نے کہا: اللہ سے معافی مانگتے ہیں، جو اللہ فیصلہ فرمائیں گے۔ ان کی توبہ کے بعد اللہ نے حکم دیا: تم تو اولادِ آدم پر اعتراض کرتے تھے، اب تم نے کیا کر لیا ہے؟ انہوں نے کہا: اللہ میاں! ہمارا اعتراض بالکل غلط تھا، آپ کا فرمان ٹھیک تھا، ہم راستہ سے ہٹ گئے، آپ ہماری توبہ منظور فرمالیں۔ اللہ نے حکم دیا کہ اب دنیا کی سزا چن لو یا آخرت کی سزا چن لو۔ کوئی ایک سزا تو بہر حال ملنی ہے۔ انہوں نے کہا: ہمیں دنیا کی سزا قبول ہے؛ کیونکہ دنیا کی سزا کی ایک حد ہوتی ہے، لیکن آخرت کی سزا ختم نہیں ہوتی، وہ شدید بھی ہے، عظیم بھی ہے، الیم بھی ہے۔

لوگ کہتے: ہمیں سحر سکھلاؤ۔ وہ کہتے کہ دیکھو! ہم پہلے خود ایک عذاب میں مبتلا ہیں، تم یہ کام مت سیکھو، لیکن اگر سیکھنا چاہتے ہو تو اس کو غلط استعمال نہ کرنا۔ جب لوگ مجبور کرتے تو وہ ان کو بتلا بھی دیتے۔ اور وہ عورت جس نے یہ سارا کام کیا، اس نے اپنے گناہوں سے توبہ کی اور اس کے بعد اسم اعظم پڑھا، وہ آسمانوں کی طرف چلی گئی اور اس کی شکل قوتِ بشریہ سے قوت کوکبیہ میں بدل کر آسمان میں زہرہ بنا دیا گیا، جو زہرہ ستارے کے نام سے مشہور ہے۔ یہ

روایات مختلف مفسرین نے اپنی کتابوں میں نقل کی ہیں۔ ابن کثیر، درمنثور اور دیگر مفسرین نے بھی اس کو نقل کیا ہے۔

ہاروت و ماروت کے قصہ کی تردید:

اس واقعہ کے بارے میں علماء کے دو قول ہیں: اکثر محدثین کرام، سلف صالحین کی رائے یہ ہے کہ یہ بالکل غلط، من گھڑت قصہ اور یہ بھی یہودیوں کی ایک کارستانی ہے، جیسے یہودیوں نے اپنی کتابوں میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے جھوٹے جھوٹے قصے گھڑے ہیں، ان میں سے ایک قصہ یہ بھی ہے، جس کا حقیقت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔

محدثین کرام نے یہ بھی بحث فرمائی ہے کہ جن لوگوں نے یہ قصہ جن روایات سے نقل کیا ہے، کوئی ایک روایت بھی ایسی نہیں ہے جو صحیح کے درجہ کو پہنچتی ہو اور درایۃً بھی یہ قصہ صحیح نہیں ہے؛ کیونکہ اللہ کے فرشتے معصوم ہیں، اور معصوم گناہ نہیں کر سکتا۔ یہ بات سمجھ سے بالاتر ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ جب ان کو اُلٹا کنویں میں لٹکا دیا گیا تو جو خود عذاب میں لٹکا ہوا ہو، وہ دوسرے کو جادو کیسے سکھا رہا ہے؟ چہ جائیکہ اس وقت لوگوں کو تعلیم دی جائے۔ تیسری بات یہ ہے کہ وہ عورت جو زہرہ ستارہ بن گئی، زہرہ ستارہ تو حضرت آدم علیہ السلام کے پیدا ہونے سے بھی پہلے آسمانوں پر موجود تھا اور یہ قصہ حضرت ادریس علیہ السلام کے زمانے میں پیش آیا تو یہ عورت کیسے زہرہ بن گئی؟

چوتھی بات یہ ہے کہ بڑی عجیب بات ہے کہ عورت زنا کے بعد ستارہ بن جائے۔ اسم اعظم کی برکات پر ہمارا ایمان ہے، لیکن اس کے لیے طہارت اور پاکیزگی چاہیے، ایمان چاہیے۔ یہ نہیں کہ کوئی ناپاک اور گندا بھی اللہ کے پاک نام کو استعمال کرے۔ یہ بات بھی ارادتاً سمجھ نہیں آتی۔ یہودیوں نے ایسے قصے گھڑے ہیں کہ علماء کو آج تک وہ کانٹے چننے پڑ رہے ہیں؛ کیونکہ پڑھنے والا آدمی تو صرف یہ کہہ دیتا ہے کہ کتاب میں لکھا ہوا ہے کہ اب اس بے چارے کو یہ تو پتہ نہیں ہوتا کہ یہ روایت کس کی ہے۔

ہاروت و ماروت کے قصہ کے متعلق بعض علماء کی رائے:

بعض علماء نے کہا ہے کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ راوی ضعیف ہیں، لیکن اس روایت کے بیس طرق ہیں جن سے یہ واقعہ نقل کیا گیا ہے، تو کم از کم حسن لغیرہ کے درجہ تک یہ بات پہنچ جاتی ہے۔ اس لیے ہم یہ نہیں کہتے کہ یہ من گھڑت اور موضوع قصہ ہے، بلکہ اس کی کچھ نہ کچھ حقیقت تو ہے، لیکن ایسی باتیں کریں گے جو قابل عمل ہوں، مثلاً

فرشتوں نے شراب کیسے پی؟ انہوں نے کہا: فرشتے معصوم ہیں، وہ کھانے پینے اور قوت شہوانیہ سے پاک ہیں، لیکن یہ اس وقت تک جب تک وہ فرشتے رہے، جب اللہ نے ان کو فرشتوں سے نکال قوت شہوانیہ ڈال دیں تو اب وہ فرشتے نہیں رہے اور ان میں یہ بات ختم ہوگئی کہ فرشتے سے گناہ نہیں ہوتا۔

دوسری بات یہ کہنا کہ وہ عورت زہرہ ستارہ بن گئی، حالانکہ زہرہ ستارہ پہلے سے موجود تھا، لیکن اس نے اسم اعظم حاصل کرنے کے بعد اس کے ذریعے جو دعا مانگی کہ مجھے بھی اس مقام پر پہنچا دیا جائے تو اس کی روح کا علاقہ اس ستارہ کے ساتھ قائم کر دیا گیا۔ اسم اعظم کی برکات اپنی جگہ قائم رہیں گے، گو حاصل کرنے کا طریقہ غلط، لیکن جب حاصل کر لیا جائے اور توبہ کر لی جائے اور اس پر اللہ کو پکارا جائے تو اللہ سب کی سنیں گے۔

باقی یہ کہنا کہ عذاب کی حالت میں سکھلاتے کیسے تھے؟ آج بھی دنیا میں مجرم جیل خانوں میں پڑے ہوتے ہیں، بیڑیاں لگی ہوئی ہوتی ہیں، وہاں بھی وہ سکھار ہے ہوتے ہیں۔ جب اللہ کو آزمائش مقصود تھی تو چاہے وہ کسی حال میں ہوں، کسی نے ان کے قریب جا کر کھڑا ہو کر پوچھا تو انہوں نے بتلا دیا۔ اس لیے اس کے بارے میں ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ سو فیصد جھوٹا قصہ ہے۔ بہر حال یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ اس کی کوئی نہ کوئی اصل موجود ہے۔ لیکن ہم اس کے بارے میں ایسی تاویلات سے کام لیں گے جو اللہ کے قرآن اور حدیث کے خلاف بھی نہ ہوں اور واقعہ بھی بن جائے۔

اس واقعہ میں راجح قول:

تیسرا قول علماء کا یہ ہے کہ جتنا قرآن میں موجود ہے اتنی بات پر ایمان رکھو، باقی معاملے میں توقف اختیار کرو۔ نہ یہ کہو کہ صحیح ہے اور نہ یہ کہو کہ غلط ہے، بلکہ معاملہ کو اللہ پر چھوڑ دو اور اتنی بات مانو جتنا اللہ نے قرآن میں بیان فرما دیا ہے کہ اللہ نے دو فرشتوں کو بابل میں اُتارا: ایک کا نام ہاروت اور دوسرے کا نام ماروت ہے۔ وہ لوگوں کو سکھلاتے تھے، لیکن ساتھ یہ بھی کہہ دیتے کہ خبردار! خبردار! کفر میں نہ پڑو۔ اس لیے یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ جیسے ایک عالم کے پاس کوئی فلسفہ یا منطق پڑھنے کے لیے آئے اور وہ عالم اس کو کہے: خیال کرنا، کہیں ایسا نہ ہو کہ فلسفہ میں اُلجھ کر قرآن وحدیث کو چھوڑ جاؤ۔ میں تمہیں پڑھا تو دیتا ہوں، تا کہ تمہیں حق اور باطل کا پتہ چل سکے، لیکن اس علم کے ذریعے کفر اختیار نہ کر لینا۔ تو اس عالم کے لیے پڑھانا جائز ہے۔ اب اگر کوئی آدمی کسی بات کو سمجھنے کے

بعد اس سے غلط نتیجہ اخذ کرے تو وہ خود گناہگار ہے، سکھانے والے کا اس میں کوئی گناہ نہیں ہے۔ اس نے تو کہہ دیا ہے کہ کفر نہ کرو، ہم تو آزمائش ہیں۔ اس لیے علماء نے فرمایا: اتنی بات پر عمل کرو، جتنی قرآن میں موجود ہے۔

شبہ اور اس کا ازالہ:

اگر معجزے اور سحر کے درمیان فرق کے لیے جادو کی تعلیم دینا مقصود تھا تو نبیوں کے ذریعہ دے دیتے، آسمانوں سے فرشتے اُتارنے کی کیا ضرورت تھی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ کے نبی ہدایت محضہ کے لیے آئے ہیں، ان کی تعلیم سے چاہے اسباب بعیدہ کی حد تک بھی کوئی شرک کا پہلو نکلے، اللہ اپنے نبیوں کو اس سے پاک رکھتے ہیں اور لوگ انبیاء کے جادو کو جاننے کی وجہ سے جادوگر نہ کہہ سکیں۔

باقی فرشتوں سے اللہ جہاں تشریعی کام لیتے ہیں وہاں تکوینی کام بھی لیتے ہیں۔ جیسے فرشتے ایک مومن کی حفاظت کرتے ہیں، ویسے کافر کی بھی حفاظت کرتے ہیں۔ مومن کا بچہ اگر رحم میں ہے وہاں فرشتے ڈیوٹی دے رہے ہیں، تو کافر کے بچے کے لیے بھی ڈیوٹی دے رہے ہیں۔ اسی طرح حیوانات جب پیدا ہوتے ہیں وہاں بھی فرشتے ڈیوٹی دے رہے ہیں۔ فرشتوں سے تکوینی اور تشریعی یعنی دونوں کام لیے جاتے ہیں۔ اللہ کے انبیاء سے تشریعی کام لیا جاتا ہے، اس کو تکوینیات میں نہیں ڈالا جاتا۔ اس لیے اللہ تبارک وتعالیٰ نے کسی نبی کے ذریعہ یہ کام نہ لیا اور آسمانوں سے دو فرشتے اُتارے گئے اور وہ دنیا کے لیے آزمائش بن گئے اور لوگ پوچھتے تو وہ ان کو بتلا بھی دیتے۔

اس سے بعض علماء نے یہ بھی نتیجہ نکالا ہے کہ اگر کوئی آدمی جادو کو کفر اور حرام سمجھے، لیکن وہ اس کو اس لیے سمجھ رہا ہے، تاکہ میں اس کا توڑ کر سکوں اور مبتلا لوگوں کو بچا سکوں اور ان کو سحر کے اثر سے نکال سکوں تو اس کو اجازت ہے، بشرطیکہ اس میں شرکیہ الفاظ نہ ہوں۔ لیکن یاد رکھیں! شرکیہ الفاظ والے یا لوگوں کو دھوکہ دینے والے سحر کا پڑھنا اور سیکھنا حرام ہے، اس پر اعتقاد رکھنا بھی کفر ہے؛ کیونکہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: جو آدمی سحر سیکھے گا اور اس پر عمل کرے گا، وہ کفر کو اختیار کرے گا۔

واقعات:

سابقہ انبیاء کی کتابوں میں حضور اکرم ﷺ اور صحابہ کی صفات موجود تھیں۔ ایک دفعہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ بیٹھے ہوئے تھے، ایک بوڑھے آدمی نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو ایک پرانا سا کاغذ پیش کیا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے

جب وہ کاغذ دیکھا تو رونے لگے گئے، داڑھی مبارک آنسوؤں سے بھیگ گئی اور کہنے لگے: ''لَا لِعُمَرَ وَ لَا لِبَنِیْهِ'' (نہ عمر کا ہے اور نہ عمر کے بیٹے کا کچھ ہے)۔ ساری مجلس حیران ہے کہ کون سا ایسا کاغذ ہے جس کو دیکھ کر عمر رو پڑے ہیں؟ جب ان سے پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: میں ابھی اسلام نہیں لایا تھا، کفر کا زمانہ تھا اور جاہلیت کا دور تھا، میں نے تجارت کے لیے ایک دفعہ شام کا سفر کیا۔ سفر کے دوران اتفاق سے ایسا ہوا کہ قافلہ نکل گیا اور میں اکیلا رہ گیا...... اس زمانہ میں قافلہ کے بغیر سفر کرنا آسان بات نہیں ہوتی تھی...... میں بڑا اُداس ہو کر ایک دیوار کے سائے میں بیٹھا ہوا تھا کہ قافلہ نکل گیا، اب پتہ نہیں دوسرا قافلہ کب ملے گا؟ ایک آدمی آیا اور کھڑا ہو کر مجھے دیکھتا رہا اور تھوڑی دیر کے بعد مجھے کہا: آؤ میرے ساتھ میرے گھر چلو۔ میں نے کہا: خدا کے بندے! میں پہلے پریشان ہوں، میرا قافلہ نکل گیا ہے اور اب تم مجھے اپنے گھر لے جانا چاہتے ہو، میں تمہارے گھر جا کر کیا کروں گا؟ اس آدمی نے کہا: گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے، تم میرے ساتھ میرے گھر چلو، کھانا کھاؤ، آرام کرو اور اس کے بعد میں تجھے ایسا تیز رفتار گھوڑا دوں گا کہ تم دیکھ کر حیران ہو جاؤ گے، وہ تمہارے قافلے کو ایک دن میں پکڑ لے گا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں حیران کہ جان پہچان نہیں، لیکن وہ مجھے گھر لے گیا، کھانا کھلایا، بڑی عزت و تکریم کی اور اس کے بعد صبح صبح اس نے اپنے نوکروں کو تیار کیا کہ گھوڑے تیار کر کے ان کو قافلے میں پہنچاؤ۔ اس کے بعد ایک کاغذ لے کر آ گیا، کہنے لگا کہ اس کاغذ پر مجھے دستخط کر دو۔ میں نے اس کو کہا: یہ کیسا کاغذ ہے؟ کیا بات ہے؟ اس نے کہا: بات یہ ہے کہ جب تم اس ملک کے بادشاہ بنو گے تو مجھ پر ٹیکس نہیں لگاؤ گے۔ آپ نے فرمایا: مجھے تو کبھی سردار بننے کا خیال بھی نہیں آیا اور تم مجھے یہاں کا بادشاہ بنا رہے ہو۔ اس نے کہا: اگر تم بادشاہ نہ بنو گے تو تمہارے اس دستخط کو لے کر میں کیا کروں گا؟ یہ میرے کس کام آئیں گے؟ اور اگر تم بن گئے تو تمہیں اتنی سخاوت کرنے میں کیا تکلیف ہے؟ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اس کو کہا: مجھے بتلاؤ، وجہ کیا ہے؟ اس نے کہا: تمہارا نام عمر ہے، تم خطاب کے بیٹے ہو؟ آپ نے کہا: یہ بالکل ٹھیک ہے۔ اس نے کہا: قریشی ہو؟ آپ نے کہا: یہ بھی ٹھیک ہے۔ اس نے کہا: مکہ میں پیدا ہوئے ہو۔ وہاں ایک نبی پیدا ہوگا، جس کا نام محمد مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وسلم) ہوگا اور تم اس کے وزیر بنو گے، اس کے ساتھی بنو گے، اس کے دین اور مذہب کا پرچم لے کر اُٹھو گے اور پوری دنیا پر چھا جاؤ گے، جس جگہ اب تم بیٹھے ہو تمہاری حکومت ہوگی۔ یہ سب کچھ ہماری کتابوں میں لکھا ہوا ہے، میں نے تمہاری وہ نشانیاں پڑھی ہیں، اس لیے تمہیں گھر لایا ہوں۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں ہنس پڑا اور اس کو کہا: ٹھیک، اگر تمہارا خیال ہے تو لکھوا لو۔ جب ہم بادشاہ بنیں گے تو تمہیں ٹیکس نہیں لگائیں گے۔ میں نے لکھ دیا۔ بات بھول گئی، مدت گزر گئی۔ آج وہ بوڑھا آدمی میرا لکھا ہوا لے کر آیا ہے اور میں اس جگہ کا بادشاہ ہوں اور اسلام مجھے اجازت نہیں دیتا کہ میں کسی پر ٹیکس معاف کردوں، اس لیے میں نے کہا کہ یہ میری ذاتی حکومت تو نہیں ہے اور نہ میرے بیٹے کی جائیداد ہے، جو اسلام حکم کرے گا وہ سب پر نافذ ہوگا، میں کچھ نہیں کرسکتا۔

احبار یہود نے بیت المقدس کی چابیاں بغیر کسی جنگ کے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں پر رکھ دیں۔ وہ پاگل تو نہیں ہو گئے تھے، بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ کتابوں میں پڑھ چکے تھے کہ یہ وہی خلیفہ ہے جس کے ہاتھ پر بیت المقدس فتح ہوگا۔

حضرت سلیمان علیہ السلام پر جادوگری کا الزام:

مفسرین فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ کی طرف سے امتحان آیا اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی بادشاہت کچھ عرصہ کے لیے چلی گئی تو انسانوں اور جنات کی بہت ساری جماعتیں مرتد ہو گئیں اور شہوات کے پیچھے چل پڑیں اور جادو کی کتابیں حضرت سلیمان علیہ السلام کی کرسی کے نیچے چھپا دیں۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو پھر حکومت عطا فرما دی اور پھر ملک عطا فرما دیا۔ لوگ پھر دین پر آ گئے جیسے پہلے تھے۔ خدا کی قدرت ہے کہ جب حضرت سلیمان علیہ السلام فوت ہو گئے تو جنات اور مخالفین نے آ کر وہ کتابیں نکالیں اور لوگوں سے کہا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام جادو کے زور سے ہم پر حکومت کرتے تھے اور وہ جادو ان کتابوں میں ہے جو انہوں نے اپنی کرسی کے نیچے چھپا دی تھیں۔

ان کتابوں میں ہر وہ چیز تھی جو اللہ کے راستے سے روکنے والی تھی۔ بعض روایات میں ہے کہ حضرت آصف بن برخیا سلیمان علیہ السلام کا کاتب تھا اور حضرت سلیمان علیہ السلام جو حکم فرماتے اس کو لکھ لیتا اور اس کو دفن کر دیا جاتا تو جب حضرت سلیمان علیہ السلام کی وفات ہو گئی تو لوگوں نے اس کو نکالا اور اس کی دو سطروں کے درمیان ایک سطر اپنی طرف سے بڑھاتے گئے، جس میں جادو کی تعلیم اور کفریات تھے۔ جب لوگوں کو پتہ چلا تو انہوں نے گالیاں دینا شروع کیں کہ کفر لکھ گئے، حالانکہ جہالت تھی۔ اس لیے اللہ نے وضاحت فرما دی کہ یہ شیاطین کے کام ہیں۔ نعوذ باللہ! سلیمان علیہ السلام نے سحر نہیں لکھوایا۔ انہوں نے نہ کبھی سحر کیا اور نہ کبھی سحر کی تعلیم دی، نہ ان کی زبان مبارک سے، نہ قلم



سے منکرات نکلے۔ وہ اللہ کے نبی تھے۔ یہ حرکت ساری شیاطین کی تھی، لوگوں کو دھوکہ دینے کے لیے۔

جیسے آج بھی ہوتا کہ گمراہ قسم کے لوگ قرآن کا ترجمہ مثلاً انگریزی میں کر دیا۔ اب علماء دین بے چارے انگریزی نہیں جانتے، سارا ترجمہ انہوں نے ٹھیک کر دیا، لیکن بعض آیات میں ایسا مسئلہ اُلجھا دیا کہ بندہ کفر میں چلا جائے۔ اسی طریقہ سے بعض لوگوں نے کتابوں کے ترجمے کیے، بعض لوگوں نے احادیث مبارکہ کے ترجمے کیے۔ لوگ پڑھنے والے بڑے مطمئن ہوتے ہیں کہ اگر وہ آدمی دیندار نہیں تھا تو اس کو قرآن کے ترجمے کی کیا ضرورت تھی؟ اتنا بڑا آدمی تھا، اس نے قرآن کی خدمت کی اور اس کا ترجمہ کیا۔ لوگ یہ نہیں سمجھتے کہ باطل کیا کچھ نہیں کرتا۔ جب کوئی مسلمان ہو کر گمراہ کرتا ہے تو اتنا بڑا کافر بن کر گمراہ نہیں کر سکتا، اس لیے کوئی آدمی کہے کہ میں یہودی ہوں تو کون اس کی بات مانے گا؟ کوئی کہے کہ میں نصرانی ہوں تو کون اس کی بات مانے گا؟ کوئی کہے کہ میں ہندو ہوں تو کون اس کی بات مانے گا؟ اگر وہی ہندو داڑھی رکھ لے، مسجد میں مصلے پر کھڑے ہو کر امام بن جائے تو کیا کرو گے؟ وہ تسبیحات بھی پڑھتا رہے اور ذکر بھی کرتا رہے، جمعہ بھی پڑھاتا رہے، جیسا کہ آپ کے ملک میں ہو چکا ہے کہ کئی مساجد میں ہندو پکڑے گئے کہ وہ مسلمانوں کے امام بن کر کھڑے رہے۔ ایسی باتیں ہر دور میں ہوتی ہیں، شیاطین الانس والجن ایسے حملے کرتے ہیں۔ زیادہ تر وہ آدمی اس کے اندر پھنستا ہے جو زبانیں نہیں جانتا۔ اس لیے بہت سارے تراجم جو انگریزی میں کیے گئے ہیں، ان میں ایسا زہر بھرا ہوا ہے کہ آدمی حیران رہ جاتا ہے۔ کئی ترجمے ایسے ہیں جو ازبک زبانوں میں کیے گئے ہیں، کئی ترجمے ایسے ہیں جو افریقی زبانوں میں کیے گئے یا عربی میں ترجمے کیے گئے اور ان زبانوں والے علاقوں میں پہنچائے گئے، وہ اس کو جاننے والے نہیں اور انہوں نے اس کے اندر ایک سطر بھی بڑھا دی تو سارا دین ختم ہو گیا۔ اس لیے جب کوئی قرآن کا ترجمہ یا کوئی کتاب پڑھو، پہلے علماء اور ذمہ دار آدمی سے پوچھ لو کہ یہ ترجمے والا شخص قابلِ اعتبار ہے؟ کیونکہ جب ایک دفعہ ٹھوکر لگ گئی تو ٹھیک ہونا بڑا مشکل ہو جاتا ہے۔

ابن جریر نے حضرت شہر بن حوشب سے ایک روایت نقل کی ہے کہ جب حضرت سلیمان علیہ السلام کا ملک اور سلطنت نہ رہی تو شیاطین ان کی عدم موجودگی میں خود جادو اور منتر وغیرہ لکھتے کہ فلاں کام کرنا ہو تو سورج کی طرف رخ کر کے یہ کلمات پڑھو گے تو تمہارا کام ہو جائے گا اور فلاں کام کرنا ہو تو سورج کی طرف پشت کر کے یہ کلمات پڑھو گے تو تمہارا کام ہو جائے گا؛ کیونکہ شیاطین سورج اور چاند تاروں کے پجاری ہوتے ہیں، اسی لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو حکم دیا کہ جب سورج نکل رہا ہو، جب سورج ڈوب رہا ہو، جب سورج سر پر ہو تو نماز ادا نہ کرو؛ کیونکہ

یہ اوقات ان لوگوں کے ہیں جو سورج کے پجاری ہیں، وہ ان اوقات میں عبادت کرتے ہیں، کہیں مسلمانوں کی عبادت سے وہ حجت نہ پکڑیں کہ یہ بھی ہماری موافقت کررہے ہیں۔ ان لوگوں نے ایسا جادو لکھنے کے بعد اس کتاب کے اوپر عنوان یہ دیا کہ یہ تمام چیزیں لکھنے والا آصف بن برخیا ہے اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے حکم سے اور ان کے لیے لکھی گئی ہیں۔ یہ ان کے علمی خزانے کے موتی ہیں جو ہم نے جمع کیے ہیں۔ اور اس کے بعد اس کو حضرت سلیمان علیہ السلام کے تخت کے نیچے دفن کردیا۔ جب حضرت سلیمان علیہ السلام فوت ہوگئے تو ابلیس انسانوں کی شکل میں آکر لوگوں سے کہنے لگا: اے لوگو! خیال رکھو! حضرت سلیمان علیہ السلام اللہ کا نبی نہیں تھا، بلکہ وہ جادوگر تھا اور اگر اس کا جادو ڈھونڈنا ہے تو اس کے آس پاس اور اس کے سامان میں تلاش کرو۔ جب لوگوں نے تلاش شروع کی تو ابلیس نے ان کو خود بتایا کہ اس جگہ دفن ہے۔ جب لوگوں نے تلاش کیا تو وہ سحر (جادو) مل گیا۔ کہنے لگے: ہاں! بالکل سچی بات ہے، سلیمان علیہ السلام نبی نہیں تھے، بلکہ جادوگر تھے، اسی جادو کے زور سے انہوں نے ہمیں اپنا غلام بنایا ہوا تھا، ہم پر اپنا غلبہ حاصل کیا ہوا تھا۔ اس وقت جو ایمان والے تھے، انہوں نے کہا: وہ اللہ کے نبی تھے اور سچے علم والے تھے۔ جب اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو پیدا فرمایا، جہاں آپ نے دیگر انبیاء کا ذکر کیا، وہاں حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام کا ذکر بھی فرمایا کہ حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام بھی نبی تھے تو یہود کہنے لگے: محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے حق اور باطل کو ملا دیا ہے، حضرت سلیمان علیہ السلام تو نبی نہیں تھے، بلکہ (نعوذ باللہ) جادوگر تھے اور جادو کے زور پر ہوا پر چلتے اور ہوا پر تخت اُڑاتے تھے۔ اللہ پاک نے ان کے رد میں قرآن پاک نازل فرمایا کہ یہ لوگ شیاطین کے پیچھے چل پڑے، جو حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانے میں شیاطین جادوگر تھے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے تو کبھی کفر نہیں کیا، وہ تو اللہ کے نبی اور پیغمبر تھے جن کو اللہ نے نبوت بھی عطا کی اور ملک بھی عطا کیا۔

حضرت ابی مجلز کی روایت میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام چرند و پرند اور جانور حضرت سلیمان علیہ السلام کے تابع کردیئے تھے، اللہ کے پیغمبر نے ان تمام جانوروں سے ایک عہد لیا تھا کہ جو تمہیں میرا عہد یاد دلائے تو تم اس کو اس کو نقصان نہیں پہنچاؤ گے۔ اس لیے جب بھی کسی آدمی کو اس قسم کی مشکلات سے واسطہ پڑتا ہے جیسا کہ مشہور بات ہے کہ گھر میں سانپ ہو، اگر آدمی اس کو کہہ دے کہ ہم تمہیں عہد سلیمان کے بارے میں یاد دلاتے ہیں، تم ہمیں ایذاء نہ پہنچاؤ، ہم تمہیں ایذاء نہیں پہنچائیں گے۔ اگر وہ جن ہے تو نکل جائے گا، اگر حقیقتاً سانپ ہے تو نہیں نکلے گا، پھر مارنے کی اجازت ہے۔ شیاطین کو اس طرح جادو پھیلانے کا موقع مل گیا۔

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: جادو حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانہ سے پہلے بھی موجود تھا، جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں فرعون نے جادوگروں کو مقابلہ کرنے کے لیے بلایا تھا اور موسیٰ علیہ السلام کا زمانہ حضرت سلیمان علیہ السلام سے بہت پہلے کا ہے۔ لہٰذا جادو پہلے بھی تھا، لیکن اللہ تعالیٰ نے جنات کو حضرت سلیمان علیہ السلام کے تابع کر دیا اور ہواؤں کو تابع کر دیا تو جنات وشیاطین نے بدلہ لینے کے لیے ان چیزوں کو پھیلایا۔

جادو کے بارے میں ایک اور واقعہ:

قصہ ہاروت و ماروت اور سحر کے بارے میں ایک اور قصہ بھی کتابوں میں آیا ہے، اس کو اس لیے ذکر کر رہے ہیں، تا کہ تنبیہ ہو جائے، اہل علم ان میں سے حق لے لیں اور باطل کو چھوڑ دیں۔

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: دومۃ الجندل (ایک قبیلہ) کی ایک عورت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے فوراً بعد آئی، وہ سحر کے بارے میں بعض چیزیں معلوم کرنا چاہتی تھی۔ حضرت عائشہ اپنے بھانجے عروہ سے کہتی ہیں کہ جب اس عورت کو پتہ چلا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوگئی ہے تو وہ عورت غم میں سخت روتی تھی، مجھے خوف آتا تھا، میں اس پر ترس کھاتی تھی اور مجھے خوف تھا کہ وہ اتنی غمزدہ ہے۔ اس عورت نے کہا: میں ڈرتی ہوں اس بات سے کہ شاید میں ہلاک ہوگئی۔ اب اللہ کے نبی بھی وفات پا گئے ہیں تو میرے مسئلے کا حل کیا ہوگا؟ کہنے لگی کہ مدت ہوگئی، مجھ سے میرا خاوند غائب ہو گیا ہے، میں بڑی پریشان تھی، ایک بوڑھی عورت میرے پاس آئی، میں نے اس سے شکوہ کیا کہ میرا خاوند اتنے عرصہ سے غائب ہے، اس نے کہا: ایک کام ہے، اگر تم میری بات مان لو اور میری بات پر عمل کرو تو تمہارا خاوند آ جائے گا۔ میں نے کہا: ٹھیک ہے۔ میں مان گئی۔ وہ عورت دوسری دفعہ آئی تو اس کے ساتھ دو سیاہ رنگ کے کتے تھے، کتے پر تو وہ خود سوار ہوگئی اور ایک کتے پر اس نے مجھ کو سوا کیا۔ ہم کتوں کو دوڑاتے ہوئے بابل میں ایک کنویں پر پہنچے، وہاں دیکھا کہ دو آدمی کنویں کے اندر اُلٹے لٹکے ہوئے ہیں، انہوں نے کہا: کیوں آئے ہو؟ ہم نے کہا: جادو سیکھنے کے لیے آئے ہیں۔ انہوں نے کہا: ہم تو اللہ کی طرف سے آزمائش میں مبتلا ہیں، تم واپس لوٹ جاؤ، کفر میں نہ پڑو۔ ہم نے کہا: ہم نے ضرور سیکھنا ہے۔ جب میں نے بہت زیادہ اصرار کیا کہ مجھے جادو سکھاؤ تو انہوں نے کہا: فلاں جو تندور ہے، وہاں پیشاب کر کے پھر ہمارے پاس واپس آ ؤ۔ کہتی ہے: میں وہاں پیشاب کرنے کے لیے گئی، لیکن میں ڈر گئی اور میں نے پیشاب نہ کیا۔ انہوں نے پوچھا: پیشاب کر آئی ہو؟ میں نے کہا:

ہاں! کر آئی ہوں۔ انہوں نے کہا کہ تم نے کوئی چیز دیکھی تھی؟ میں نے کہا: میں نے تو کچھ بھی نہیں دیکھا۔ انہوں نے کہا: تم اپنے گھر لوٹ جاؤ، تم جادو اور کفر میں نہ پڑو۔ میں نے کہا: میں لوٹتی نہیں ہوں، میں سیکھنا چاہتی ہوں۔ انہوں نے کہا: جاؤ، پھر اس طرح کرو جیسے ہم نے تمہیں کہا ہے۔ جب میں اس تندور کے پاس گئی تو پھر ڈر گئی۔ میرے بال کھڑے ہونے لگ گئے، میں کانپنے لگ گئی اور واپس آ کر کہا کہ میں نے کرلیا ہے۔ انہوں نے کہا: تم نے وہاں کوئی چیز دیکھی؟ میں نے کہا: نہیں۔ انہوں نے کہا: جھوٹ بول رہی ہو، تم نے پیشاب کیا ہی نہیں ہے۔ تم لوٹ جاؤ، کفر میں نہ پڑو۔ اس عورت نے کہا کہ میں ان کے حکم پر دوبارہ گئی اور وہاں جا کر پیشاب کیا۔ جب فارغ ہوئی تو دیکھا کہ میرے اندر سے گھڑ سوار نکلا اور وہ آسمانوں کی طرف غائب ہوگیا۔ جب میں واپس آئی تو انہوں نے کہا: پیشاب کرلیا؟ میں نے کہا: کر آئی ہوں۔ انہوں نے کہا: کچھ دیکھا تھا؟ میں نے ان کو بتلایا۔ انہوں نے کہا: وہ تمہارا ایمان تھا، وہ خارج ہو کر چلا گیا، اب تم کافر ہوگئی ہو، اب تم لوٹ جاؤ۔ میں نے اس عورت سے کہا: میرا کچھ بنا تو نہیں، میرا ایمان بھی چلا گیا۔ اس نے کہا: تم ابھی غم نہ کرو۔ اس عورت نے مجھے گندم کے دانے دیئے اور کہا: ان کو کاشت کرو۔ میں نے ان کو کاشت کیا۔ اس نے کہا: جب یہ زیادہ ہو جائیں تو ان کو صاف کرو تو میں نے صاف کیا۔ اس کے بعد اس نے کہا: ان کو خشک کرو، میں نے خشک کیا۔ اس نے کہا: ان کو پیسو، میں نے پیسا۔ اس نے کہا: اس کی روٹی بناؤ، میں نے اس کی روٹی بنائی۔ اس کے بعد یہ حالت ہوگئی کہ میں کوئی چیز بھی چاہتی تھی تو فوراً میرے ہاتھ میں آجاتی تھی۔ اب میں نے کچھ کیا نہیں اور میں آئندہ بھی کبھی نہیں کروں گی۔ اس وقت اصحابِ رسول موجود تھے، اس نے ان سے عرض کیا کہ مجھے بتلاؤ، میں کیا کروں، اس کا کیا حل ہے؟ صحابہ رضی اللہ عنہم خاموش رہے۔ انہوں نے کہا: ہم کیسے فتویٰ دے سکتے ہیں جس کے بارے میں ہمیں علم نہیں، تم حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی طرف رجوع کرو۔ اور ایک صحابی نے کہا: اگر تمہارے والدین میں سے کوئی زندہ ہیں تو ان کو لے کر آؤ، ہم ان کو اس کا حل اور فتویٰ بتلائیں گے۔

حضرت ہشام فرماتے ہیں: صحابہ تقویٰ وخشیت والے تھے، یہ نہیں تھا کہ بات نہ جانتے ہوں اور کہہ دیتے، بلکہ وہ محتاط لوگ تھے، ہر بات پر زبان نہیں کھولتے تھے۔

اس واقعہ کو لے کر بعض علماء نے یہ بھی استدلال کیا کہ جادو کے زور سے کسی چیز کی حقیقت کو بھی بدلا جاسکتا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: جادوگر کسی چیز کو بدل نہیں سکتا، بلکہ وہ قوتِ خیالیہ پر اثر ڈالتا ہے۔ جیسے ہپناٹزم ہوتا ہے کہ آدمی

پر ایسا اثر ڈالتے ہیں کہ وہ آدمی تابع ہو جاتا ہے، اس کو جو چاہے وہ کروائے تو اس کا نام سحر ہے۔
یہ جادو سب سے زیادہ یہودیوں میں ہے، اس کے بعد روافض میں ہے اور ہندوستان کے بنگال کے علاقوں میں اب تک پایا جاتا ہے، بعض مصر کے علاقوں میں بھی یہ پایا جاتا ہے۔

اب یورپ میں انگریز اس کے اندر مبتلا ہو گئے اور ان کے اندر ایک نیا علم چلا ہے، اس علم کو وہ "علم الحاضرات" کہتے ہیں، یعنی کسی غائب کو حاضر کرنا کہ ایک کمرہ کو بند کر کے، اندھیرا کر کے، کمرے کے اندر ایک ٹیبل پر خالی گلاس رکھ دیتے ہیں اور سامنے ایک بندے کو آنکھیں بند کر کے بٹھا دیتے ہیں اور کہتے ہیں: آپ کو اپنے باپ سے ملنا ہے تو اس کا تصور کر کے بیٹھ جائیں، میں عمل کروں گا۔ جب یہ گلاس حرکت کرنے لگے تو سمجھ لینا کہ میں نے تمہارے باپ کی روح منگوالی ہے۔ جو باپ سے پوچھنا ہو پوچھ لینا۔ اس کے اندر کئی لوگ مبتلا ہوئے اور کہا کہ ہم نے خود اپنے باپ سے بات کی ہے۔ یہ سب علوم باطلہ اور کفر ہیں، قرآن وسنت کے خلاف ہیں۔ ہاں! اگر ایک آدمی عابد وزاہد ہے، کثرت سے درود شریف پڑھتا ہے، اس کا مال حلال کا ہے، حرام کھانا پیٹ کے اندر نہیں جاتا، پاک بستر پر سوتا ہے اور اللہ سے دعائیں مانگتا ہے تو اس کو حضور اکرم ﷺ کی خواب میں زیارت ہوگی۔ یہ بات ٹھیک ہے۔
حضور پاک ﷺ کی سچی زیارت ہوتی ہے؛ کیونکہ شیطان سب کی شکل بنالیتا ہے، لیکن اللہ کے نبی کی شکل نہیں بنا سکتا۔ اسی طرح اللہ کے اولیاء یا انسان کو اپنے ماں باپ کی خواب میں زیارت ہو جاتی ہے اور کیفیات خواب سے آدمی اندازہ لگالیتا ہے۔

بی بی خدیجہ رضی اللہ عنہا نے حضور اکرم ﷺ سے ورقہ بن نوفل کے بارے میں پوچھا کہ اس نے آپ کی تصدیق بھی کردی تھی اور ساتھ یہ تمنا بھی کردی کہ میں آپ کی مدد کروں گا تو اس کا مرنے کے بعد کیا حال ہے؟ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ میں نے خواب دیکھا کہ اس پر بڑا سفید لباس ہے، اگر وہ جہنمی ہوتا تو اس پر سفید لباس نہ ہوتا: کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوهٌ وَتَسْوَدُّ وُجُوهٌ﴾ [آل عمران:۱۰۶] اور فرمایا: ﴿وَأَمَّا الَّذِينَ ابْيَضَّتْ وُجُوهُهُمْ فَفِي رَحْمَةِ اللَّهِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ﴾ [آل عمران:۱۰۷] کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ چہروں کو رونق والا اور سفید کردیں گے اور کچھ کے چہروں کو سیاہ کردیں گے۔ سیاہ چہرے جہنمی کی علامت ہوں گے اور سفید چہرے جنتی کی علامت ہوں گے۔

کسی آدمی نے اپنے والدین کو اچھے لباس میں دیکھا، اچھی ہیئت اور صورت میں دیکھا تو اللہ کا شکر کرے۔ اگر

(نعوذ باللہ) کسی بُری حالت میں دیکھا تو صدقہ وخیرات اور دعائیں کرے۔ اگر اللہ تبارک وتعالیٰ چاہیں تو اپنے ولی پر آنے والی دور کی بات کھول دیتے ہیں اور وہ اللہ کے ولی کرامت کے اعتبار سے اس بات کو بتا دیتے ہیں۔

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا ''یا ساریہ الجبل!'' کہنے کا واقعہ:

سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ مدینہ منورہ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے منبر پر کھڑے ہو کر خطبہ دے رہے تھے کہ اس دوران فرمایا: ''یَا سَارِیَۃُ! اَلْجَبَلَ، یَا سَارِیَۃُ! اَلْجَبَلَ، یَا سَارِیَۃُ! اَلْجَبَلَ'' اے ساریہ! پہاڑ کو اپنی پشت پر لے کر جنگ کرو۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم حیران ہوئے اور آپ سے پوچھا کہ ساریہ تو نہاوند ایک علاقے کا نام ہے اور وہ اڑھائی سو میل دور ہے تو آپ کیسے یہ بات فرما رہے تھے؟ آپ نے فرمایا: اللہ نے میرے سامنے اس میدانِ جنگ کا نقشہ ظاہر کر دیا اور میں نے آواز دی تو اللہ نے پہنچا دی۔ جب حضرت ساریہ رضی اللہ عنہ واپس آئے تو انہوں نے کہا: ہم شکست کھا رہے تھے، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے جو آواز دی تو ہم نے اپنی جنگ کا طریقہ بدلا تو اللہ نے ہمیں فتح عطا فرما دی۔

اگر اللہ چاہیں تو اس کو کسی پر کھول دیتے ہیں، نہیں چاہتے تو کسی پر بھی نہیں کھولتے۔ یہ کسی کے اپنے ہاتھ میں نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے ہمارے لوگ اپنے عقیدے خراب کر کے یہ کہہ دیتے ہیں کہ میرے شیخ کے اپنے ہاتھ میں ہے۔ یہ حد سے تجاوز ہے۔

بابل شہر ایک نہاوند میں ہے اور ایک عراق میں ہے۔ قرآن مقدس کے اندر جس بابل کا ذکر ہے وہ عراق میں ہے۔ خدا کی قدرت ہے کہ جتنے فتنے پیدا ہوئے، تقریباً اسی زمین سے پیدا ہوئے۔

ایک دفعہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حرم نبوی میں دعا مانگ رہے تھے: اے اللہ! مجھ میں برکت عطا فرما، یمن کے علاقہ میں برکت عطا فرما، مکہ میں برکت عطا فرما، مدینہ میں برکت عطا فرما۔ ایک صحابی نے عرض کیا: عراق کے لیے بھی دعا مانگیں تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خاموش ہو گئے۔ انہوں نے دوبارہ کہا: حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خاموش ہو گئے۔ انہوں نے تیسری دفعہ کہا کہ حضور! عراق کے لیے دعا کر دیں، وہاں ہمارا آنا جانا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں دیکھ رہا ہوں کہ اس جگہ سے فتنے اُٹھیں گے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میری اُمت تہتر (۷۳) فرقوں میں تقسیم ہو جائے گی، ان میں سے بہتر (۷۲) جہنم میں جائیں گے اور ایک جنت میں جائے گا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے پوچھا: وہ نجات پانے والا کون سا فرقہ ہوگا؟

آپ ﷺ نے فرمایا: جو میرے اور میرے صحابہ کے طریقہ پر ہوگا۔

علماء نے لکھا ہے کہ وہ بہتر فرقے عراق سے پیدا ہوئے۔ إِنَّا لِلّٰهِ وَ إِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ.

سیدنا علی رضی اللہ عنہ سفر کر رہے تھے، نماز کا وقت آیا، مؤذن نے آپ کی خدمت میں آ کر عرض کی کہ نماز کا وقت ہے۔ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: آگے چلو۔ جب اس جگہ سے نکل گئے تو آپ نے فرمایا: اب اذان کہو۔ اذان کہی گئی تو آپ نے نماز پڑھی اور فرمایا: میرے حبیب حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے مجھے منع کیا تھا کہ کبھی قبرستان میں نماز نہ پڑھنا، اور مجھے فرمایا: کبھی تمہارا بابل کی زمین سے گزر ہو تو وہاں بھی نماز نہ پڑھنا، کیونکہ اس زمین پر اللہ کی لعنت ہے۔ اس لیے میں نے وہاں نماز نہیں پڑھی۔

﴿فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ﴾ [البقرة: ١٠٢]

لوگ ہاروت و ماروت سے اس قسم کا جادو سیکھتے تھے کہ میاں اور بیوی کے درمیان جھگڑا ڈلوا دیا۔

یہ انتہائی مذموم حرکت ہے؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے میاں بیوی کا ایک ایسا رشتہ رکھا ہے جس کی بنیاد محبت ہی محبت ہے اور رحمت ہی رحمت ہے، حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ﴾ [البقرة: ١٨٧]

''وہ تمہارا لباس ہیں اور تم ان کا لباس ہو۔''

اچھی بیوی کی صفات:

بعض علماء نے فرمایا: جیسے لباس بندے کو چھپا لیتا ہے تو میاں بیوی کو جو رشتہ ہے، یہ دونوں کو گناہوں سے اور شیطانی حرکات سے چھپا لیتا ہے، اللہ تعالیٰ ان کو آپس میں مودّت اور محبت عطا فرماتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کے اندر جو قوتِ شہوانیہ رکھی ہے اس کو پورا کرنے کے لیے حلال کا ایک راستہ پیدا فرمایا ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اچھی عورت وہ ہوتی ہے کہ جب اس پر خاوند کی نظر پڑے تو خاوند کو خوش کر دے اور جب خاوند حکم کرے تو عورت اس کی فرمانبرداری کرے اور جب خاوند باہر چلا جائے تو اس کی عزت، اولاد اور اس کے مال کی حفاظت کرے۔ ماں اور بیٹے میں وہ بے تکلفی پیدا نہیں ہو سکتی جو میاں بیوی میں ہے، ایک بھائی اور بہن میں وہ بات نہیں ہو سکتی جو ایک میاں بیوی میں ہو سکتی ہے۔ اور زندگی کی بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں جو آدمی اپنی ماں اور

بہن سے بھی نہیں کہہ سکتا، لیکن بیوی سے کہہ سکتا ہے۔ بیوی، مرد کی زندگی میں باقاعدہ شریک حیات ہے۔ اب جو اس رشتہ کو توڑ ڈالے، اس سے بڑا شیطان کون ہوگا کہ دونوں میاں بیوی کے درمیان نا چاقی اور فساد کرا دیا جائے۔ جب دونوں کے درمیان فساد ہوگا تو یہ نسلوں میں چلا جائے گا، دو خاندان لڑ جائیں گے، دونوں گناہ کریں گے، اولاد برباد ہوگی، آگے نسل بھی غلطیوں میں پڑتی پڑتی آخرکار ہلاکت میں چلی جائے گی۔

شیطان کی جماعتیں اور ان کے اُمور:

''إِنَّ إِبْلِيسَ يَضَعُ عَرْشَهُ عَلَى الْمَاءِ، ثُمَّ يَبْعَثُ سَرَايَاهُ، فَأَدْنَاهُمْ مِنْهُ مَنْزِلَةً أَعْظَمُهُمْ فِتْنَةً.''

[صحیح مسلم، رقم: ۲۸۱۳]

امام مسلم رحمہ اللہ نے اپنی صحیح مسلم میں حدیث نقل فرمائی ہے کہ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ حضور پاک ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: شیطان اپنا تخت پانی پر ڈالتا ہے، وہ اپنی جماعتوں کی جماعتیں بھیجتا ہے کہ جا کر لوگوں کو گمراہ کریں۔ جب وہ واپس آتے ہیں تو سب سے زیادہ وہ اس کے قریب ہوتا ہے جو سب سے زیادہ دنیا کے اندر فتنہ ڈالے۔ اس لیے جب وہ واپس آتے ہیں تو ان سے پوچھتا ہے کہ تم نے کیا کیا؟ ایک کہتا ہے کہ فلاں شخص کو میں نے ایسے گمراہ کیا اور اس نے ایسی ایسی باتیں کیں۔ وہ کہتا ہے: تم نے کچھ نہیں کیا۔ اس طرح پوچھتے پوچھتے ایک شیطان کہتا ہے کہ میں نے میاں بیوی کے درمیان جھگڑا کرا دیا۔ ابلیس کہتا ہے: تم نے بہت اچھا کیا ہے، میرے قریب آجاؤ۔ اس کو اپنے قریب بٹھاتا ہے اور ہاتھ ملاتا ہے اور کہتا ہے: تم ہی بڑا کام کر کے آئے ہو؛ کیونکہ وہ گھر برباد ہوگیا اور جہنم بن گیا۔

﴿وَمَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾ [البقرۃ: ۱۰۲]

دنیا کے اندر کوئی نفع یا نقصان اللہ کے حکم کے بغیر نہیں پہنچ سکتا۔

کیونکہ ہر چیز اللہ کی طرف لوٹ جائے گی۔ جب تک اللہ کا حکم اور اذن نہ ہو، دنیا کی کوئی طاقت کسی کو نقصان نہیں دے سکتی۔ قاعدہ یہ ہے کہ جب کوئی بُری بات ہوگی تو نسبت شیطان کی طرف ہوگی اور جب اچھی بات ہوگی تو نسبت رحمٰن کی طرف ہوگی، ورنہ خالق خیر بھی اسی کی ذات ہے اور خالق شر بھی اسی کی ذات ہے۔ حضرت محمد بن اسحاق رحمہ اللہ فرماتے ہیں: نقصان اس وقت ہوتا ہے جب اللہ تعالیٰ اس کو علیحدہ چھوڑ دیں، اپنی رحمت سے دور

کردیں۔ جب رحمت کا سایہ نہیں رہے گا تو نقصان ہوگا۔ اس لیے حضور اکرم ﷺ دعا مانگا کرتے تھے: اے اللہ! مجھے میرے نفس کے حوالہ نہ کرنا ایک آنکھ جھپکنے کی دیر یا اس سے بھی تھوڑی دیر۔ بلکہ مجھے اپنے سایہ رحمت کے نیچے رکھنا۔ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اللہ چاہتے ہیں تو جادوگر کو مسلط کردیتے ہیں اور اگر نہ چاہیں تو وہ کیا کرسکتا ہے۔ اللہ اس کی حفاظت فرماتے ہیں، شیطان خود بھی ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا، اس لیے کہ اللہ نے شیطان کو فرمایا تھا کہ جاؤ، جو تمہارے دل میں آئے کرو۔

﴿إِنَّ عِبَادِي لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَانٌ إِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغَاوِينَ﴾ [الحجر:۴۲]

''جو میرے بندے ہیں ان پر تیرا کوئی زور نہیں چلے گا، مگر وہ سرکشوں میں سے ہے جس نے تمہاری پیروی کی۔''

اس لیے اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے انبیاء اور عباد صالحین کو شیطان کے حملوں سے محفوظ فرمالیتے ہیں، شیطان ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔

جادوگر کی سزا:

بجالہ بن عبدہ فرماتے ہیں: حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے حکم جاری کیا کہ جادوگر مرد ہو یا عورت، اس کو قتل کردو۔ ہم نے تین جادوگروں کو قتل کیا۔ اس روایت کو امام بخاری نے بھی نقل کیا ہے۔

بی بی حفصہ رضی اللہ عنہا کی ایک لونڈی تھی، اس نے بی بی حفصہ رضی اللہ عنہا پر جادو کردیا۔ جب ثابت ہوگیا تو بی بی صاحبہ نے اس کے قتل کا حکم دیا، وہ قتل کردی گئی۔ حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: حضور اکرم ﷺ کے تین صحابہ کا یہی فتویٰ ہے کہ ساحر کو قتل کیا جائے۔

ترمذی میں ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ ساحر کی سزا یہ ہے کہ اس کی گردن اُڑادو، اس کو قتل کردو۔

ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ کے پاس ایک ایسا جادوگر تھا کہ لوگوں کے سامنے آکر وہ جادوگری کرتا، چیخ کر سر کو جدا کردیتا، پھر وہ گردن لگا دیتا کہ آدمی اُٹھ کر کھڑا ہوجاتا تھا۔ لوگ کہتے تھے: بڑی بات ہے، یہ تو مرے کو زندہ کردیتا ہے۔ ایک مہاجر صحابی ایک دن تلوار لے کر آگئے۔ اس جادوگر نے اپنا جادو دکھانا شروع کیا، صحابی نے اس کو تلوار ماری اور اس کی گردن اُڑادی اور کہا: اگر سچا ہے تو اب خود اپنی گردن لگالے اور اپنے آپ کو زندہ کرے اور صحابی نے یہ آیت پڑھی: ﴿أَفَتَأْتُونَ السِّحْرَ وَأَنتُمْ تُبْصِرُونَ﴾ [الانبیاء:۳] ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ اس صحابی پر ناراض ہوگئے کہ تم

نے میری اجازت کے بغیر کیوں قتل کر دیا؟ اور ان کو جیل میں ڈال دیا، پھر ان کو چھوڑ دیا۔

اور ایک روایت میں ہے کہ حضرت جندب رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ آدمی جادو سے کرتب دکھاتا تھا، حضرت جندب رضی اللہ عنہ آئے اور اس کو قتل کر دیا۔

امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: بی بی حفصہ رضی اللہ عنہا نے جو قتل کا حکم دیا یا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے جو قتل کا حکم دیا، اس کی وجہ یہ تھی کہ اس سحر میں شرک بھی پایا جاتا تھا۔

معتزلہ کہتے ہیں: دنیا میں جادو کا کوئی وجود نہیں ہے، بلکہ جو اس کے وجود کا عقیدہ رکھتا ہو، وہ کافر ہے۔

اہلسنت والجماعت کا یہ عقیدہ ہے کہ سحر موجود ہے، اس کا اثر بھی ہے۔ البتہ اہلسنت والجماعت کا یہ عقیدہ ہے کہ جب جادوگر اس قسم کے الفاظ کہتا ہے تو اللہ کی قدرت اور قضا سے ایسا ہو جاتا ہے۔ یہ نہیں کہ وہ جادو یا ستارہ یا نجوم یا چاند، سورج اثر کرتے ہیں۔ ان کا اثر نہیں ہوتا، بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہوتا ہے۔ لیکن منجمین، فلاسفہ یہ بات نہیں مانتے۔

پانچواں مسئلہ:

بعض علماء کہتے ہیں: علم تو علم ہے، جاننا تو بہتر ہے۔ جب ہم جادو کو جانتے ہوں گے تو جادو اور معجزے کے درمیان فرق کر سکیں گے، وگرنہ فرق کیسے ہو سکے گا؟ مفسرین فرماتے ہیں: یہ شرعاً حرام ہے۔ جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو حرام کر دیا تو یہ حرام ہے۔

اور جو آدمی گرہ لگاتے ہیں، یہ بھی جادو کی ایک قسم ہے: مفسرین فرماتے ہیں: محققین علماء نے جو یہ بات کی ہے، ان کے پاس اس کی کوئی دلیل بھی تو ہونی چاہیے۔ انہوں نے علم سحر کو اس آیت میں داخل کیا ہے:

﴿قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ ۗ إِنَّمَا يَتَذَكَّرُ أُولُو الْأَلْبَابِ ⑨﴾ [الزمر: ۹]

مفسرین فرماتے ہیں: اس میں نظر ہے۔ یہ آیت تو ان کی مدح میں ہے جو علم شرعی حاصل کرتے ہیں۔ باقی ان کا یہ کہنا کہ معجزے کا کیسے پتہ چلے گا؟ سب سے بڑا معجزہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا قرآن ہے تو کیا قرآن سیکھنے کے لیے جادو سیکھنا ضروری ہے؟ یا جو لوگ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تھے، ان کا معجزہ سمجھ نہیں آیا؟ حالانکہ انہوں نے نہ جادو سیکھا اور نہ جادو کا علم پڑھا۔

جادو کی آٹھ اقسام

ابو عبداللہ الرازی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ آٹھ قسم کا جادو ہوتا ہے:

پہلی قسم:

"الأول سحر الكذابين و الكشدانيين" جو سات ستاروں کی عبادت کرتے ہیں۔ ان لوگوں کا یہ عقیدہ تھا کہ تمام دنیا کا نظام ان سات ستاروں کے پاس ہے، انہی کے ذریعے پوری کائنات میں خیر و شر کا نظام چل رہا ہے۔ اور یہ وہی لوگ ہیں جو سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ میں تھے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ان کی طرف نبی بنا کر بھیجا اور انہوں نے ان کے اس عقیدے کا رد کیا اور ان کے ساتھ مقابلہ کیا اور اللہ نے حق کو غالب فرما دیا۔

ابو عبداللہ الرازی نے ایک کتاب "السر المكتوم في مخاطب الشمس و النجوم" لکھی ہے۔ بعض علماء نے کہا ہے کہ انہوں نے یہ کتاب لکھی تھی، لیکن بعد میں انہوں نے توبہ کر لی تھی۔ بعض لوگوں نے لکھا کہ اس نے کتاب کو عقیدہ کے طور پر نہیں لکھا تھا، بلکہ انہوں نے اس کتاب میں لکھا ہے کہ ستاروں کو کیسے مخاطب کرتے ہیں اور کون سے کلمات پڑھتے ہیں؟ سب اس کتاب میں لکھ دیا۔ بعض علماء ایسے ہوتے ہیں جو ہر فن میں ایک کتاب لکھ دیتے ہیں، اللہ تبارک و تعالیٰ نے چونکہ ان کو علم عطا فرمایا ہوتا ہے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ کوئی اس کو پڑھنے کے بعد غلط استعمال کرے۔ بہرحال بہتر یہ ہوتا ہے کہ علماء کو ایسی کتابوں کی تصنیف سے پرہیز کرنا چاہیے؛ کیونکہ ہزاروں میں سے ایک آدمی علم کے لیے پڑھتا ہے اور نوسو ننانوے آدمی نقصان پہنچانے کے لیے پڑھتے ہیں۔ وہ ایسی کتابیں جب بھی پڑھے گا تو جادو سیکھے گا۔

دوسری قسم:

دوسری قسم ان لوگوں کی ہے جو اوہام اور قوتِ نفسانیہ کے ذریعہ جادو کرتے ہیں؛ کیونکہ کبھی کبھی وہم کی بھی تاثیر ہوتی ہے۔ مثلاً آپ سڑک پر جا رہے ہیں اور آپ کو وہم ہو گیا کہ میں گرا تو آپ گر جائیں گے اور اگر وہم نہ آئے تو آپ پُل سے بھی گزر جائیں گے۔ اس قوتِ وہمیہ کو "لَا حَوْلَ وَ لَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ" پڑھ کر ختم

کر دے، چل پڑے تو کچھ بھی نہیں ہوتا۔

طبی ٹوٹکے:

علمائے طب کہتے ہیں کہ جس مرد کو ناک سے خون آتا ہو تو آپ اس کو سرخ چیز نہ دکھائیں، اگر سرخ چیز دکھائیں گے تو اس کا خون جاری ہو جائے گا۔ اسی طرح سے علمائے طب کہتے ہیں کہ جس کو مرگی کا مرض ہے، اس کو بہت تیز چمکنے والی چیز نہ دکھائیں، وگرنہ اس کو دورہ پڑ جائے گا اور اسی طرح جو چیزیں گول پھرنے والی ہیں، اگر مرگی والے کو وہاں لے جاؤ تو دورہ پڑ جائے گا۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسان کی جو طبیعتیں پیدا کی ہیں، لازمی بات ہے کہ ان پر اثر پڑتا ہے۔ جیسا کہ نظر بد کا لگ جانا حق ہے۔ اس لیے جب بھی آپ کو کوئی چیز اچھی نظر آئے تو "مَاشَاءَ اللّٰهِ" یا "اَللّٰهُ اَکْبَرُ" یا "سُبْحَانَ اللّٰهِ" کہہ دیں تو نظر نہیں لگے گی۔

اسی طرح اگر کسی آدمی کی نظر لگتی ہو تو اس سے بچنے کے لیے علماء نے لکھا ہے کہ جب وہ سامنے آئے تو لَا حَوْلَ وَ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ یا اَللّٰهُ اَکْبَرُ اَللّٰهُ اَکْبَرُ، یا آیۃ الکرسی پڑھ کر پھونک دیں تو اس کی نظر نہیں لگے گی۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:

"اَلْعَیْنُ حَقٌّ، وَ لَوْ کَانَ شَیْءٌ سَابَقَ الْقَدَرَ سَبَقَتْهُ الْعَیْنُ." [صحیح مسلم، رقم: ۲۱۸۸]

"نظر لگنا برحق ہے، اور اگر اللہ کی تقدیر سے بھی سبقت لے جانے والی کوئی چیز ہوتی تو یہ نظر ہوتی۔"

اس لیے روایت میں آتا ہے کہ آدمی کو نظر، قبر میں پہنچا دیتی ہے اور اونٹ کو دیگچے میں پہنچا دیتی ہے۔

قوتِ تخلیہ کا اثر کس طرح ہوتا ہے؟

جو لوگ قوت تخلیہ ڈالتے ہیں، بعض اتنے قوی ہوتے ہیں کہ آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں گے اور آپ کو مسحور کر دیں گے اور کبھی وہ آلات بھی استعمال کرتے ہیں۔

اصل میں بات یہ ہوتی ہے کہ اگر نفس بدن سے مستعلی ہے تو عالم سماوات کے ساتھ تعلق شدید ہے، گویا وہ ارواح سماویہ کی روح ہے، اس کی تاثیر بہت زیادہ ہوتی ہے، اور اگر ضعیف ہے تو اس کی تاثیر بدن پر ہوتی ہے۔ ان چیزوں کو حاصل کرنے کے لیے یہ ہے کہ غذا کم کھائے، لوگوں سے علیحدہ رہے، ریاء سے بچے تو طبیعت کے اندر یہ قوت پیدا ہوتی ہے۔ یہ تصرف کرنا کبھی کبھی تو شریعت کی حدود میں ہوتا ہے۔ وہ اللہ کے ولی ہوتے ہیں کہ کسی پر نظر

ڈالتے ہیں تو وہ تابع ہو جاتا ہے، دنیا چھوڑ دیتا ہے اور اچھے کام شروع کر دیتا ہے۔ یہ کرامات ہیں۔ اور کبھی کبھی وہ لوگ ہوتے ہیں جو شریعت، قرآن وحدیث کے بھی مخالف ہیں، ان کی شکل وصورت بھی شریعت کے خلاف ہے اور اللہ ورسول کے بھی خلاف کام کرتے ہیں، یہ شیطان ہوتے ہیں۔ جیسے اللہ نے دجال کو بھی قوتیں دی ہیں کہ وہ آئے گا تو ساری دنیا پر چلے گا، زمین کو حکم دے گا کہ اپنے خزانے نکالو تو وہ اپنے خزانے نکال دے گی، خشک دریاؤں کو حکم دے گا کہ چلو تو وہ چل پڑیں گے، نہروں کو حکم دے گا کہ ٹھہرو تو نہریں ٹھہر جائیں گے، بادلوں کو حکم دے گا کہ برسو تو بادل برسنا شروع ہو جائیں گے۔ اصل بات یہ ہے کہ کوئی آدمی اگر ایسا اثر پیدا کرتا ہے اور اس کی صحبت میں اثر ہوتا ہے تو اس کی شکل وصورت اور افعال شریعت کے مطابق ہیں تو وہ ولی ہے، اگر شریعت کے خلاف ہیں تو وہ دجال ہے، شیطان ہے۔ ولیوں کی تاثیر خیر کے کاموں میں ہوتی ہے۔ بزرگوں کے ایسے واقعات موجود ہیں کہ بڑے شرابی اور گناہگار لوگ ان کی صحبت میں تھوڑی دیر بیٹھے، بزرگوں نے توجہ کی اور دعا کی تو ان لوگوں نے توبہ کر لی اور بڑے بڑے شیطان قسم کے لوگ ٹھیک ہو گئے۔

تیسری قسم:

ارواحِ ارضیہ یعنی جو جنات زمین میں موجود ہیں، ان سے مدد لینا۔ چونکہ مرنے کے بعد دو کیفیات ہیں: مومن ہوگا یا کافر ہوگا۔ اگر مومن ہوں گے تو ارواح اعلیٰ علیین میں جائیں گی اور اگر کافر ہوں گے تو اسفل سافلین میں جائیں گی۔ اگر وہ زندہ ہے تو کوئی شک نہیں، وہ زمین پر ہوتے ہیں تو جادوگران ارواحِ ارضیہ یعنی ان جناتِ ارضیہ کی روح کے ساتھ تعلق جوڑتے ہیں اور ان سے مدد لیتے ہیں۔

یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے، چھوٹے چھوٹے جادوگر اور منتر پڑھنے والے کر لیتے ہیں۔ فلاسفہ اور معتزلہ اس کو نہیں مانتے۔ ان ارواح ارضیہ کے ساتھ تعلق آسان اعمال کے ساتھ ہو جاتا ہے کہ عود جلا دیا، لوبان جلا دیا، ان کے دھوئیں میں ان جنات کی ارواح حاضر ہوتی ہیں۔ بہر حال اس قسم کو عزائم اور عمل تسخیر کہتے ہیں، یہ جادو کی تیسری قسم ہے۔

چوتھی قسم:

اس کو تخیلات کہتے ہیں کہ کسی کی آنکھوں کو قبضے میں لے لینا اور ہاتھوں کی کاریگری دکھانا کہ ایک جادوگر بیٹھتا ہے اور لوگوں کو باتوں میں لگا کر ان کی آنکھیں ایک چیز پر مرکوز کر دیتا ہے اور جب سب لوگوں کی نظریں اس پر گاڑ دیتا

ہے تو اس کے بعد وہ حرکت کر کے دوسری چیز دکھا دیتا ہے کہ دیکھنے والے حیران ہو جاتے ہیں۔ ان کے بعض طریقے ایسے ہوتے ہیں یا تو وہ کبھی ایسی جگہ کھڑا ہوتا ہے جو سب سے زیادہ روشنی والی ہو یا ایسی جگہ کھڑا ہوتا ہے جو سب سے زیادہ اندھیرے والی ہو۔ چونکہ تیز روشنی میں بھی آدمی اچھی طرح نہیں دیکھ سکتے اور اندھیرے میں بھی اچھی طرح نہیں دیکھ سکتے تو اس لیے جب جادوگر اپنے ہاتھوں سے حرکتیں کرتے ہیں تو بات سمجھ نہیں آتی اور وہ اس کو جادو سمجھتا ہے، حالانکہ جادو نہیں ہوتا، بلکہ ہماری آنکھوں پر ایک کنٹرول اور ہاتھوں کی چالاکی ہے۔

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بعض مفسرین نے فرمایا کہ موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ پر جو جادوگر آئے تھے، وہ بھی دراصل یہی شعبدہ تھا، انہوں نے بھی لوگوں کی آنکھوں پر کنٹرول کر لیا۔ جیسا کہ قرآن میں آتا ہے:

﴿فَاِذَا حِبَالُهُمْ وَعِصِيُّهُمْ يُخَيَّلُ اِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰى﴾ [طٰہٰ:٦٦]

ان کے دماغوں میں قوت خیالیہ میں یہ بات ایسے ڈال دی۔ لوگ سمجھتے تھے کہ یہ رسیاں سانپ بن کر دوڑ رہی ہیں، حالانکہ وہ حقیقت میں نہیں دوڑ رہی تھیں۔

پانچویں قسم:

بعض اعمالِ عجیبہ جو کہ دیکھنے میں بڑے عجیب لگتے ہیں، حالانکہ یہ بھی ایک فن اور کاریگری ہے۔ جیسا کہ سینگ لگا دیا اور ایک لکڑی کا گھوڑا ہو، اس پر ایک آدمی بیٹھا ہوا ہے، ٹھیک جب گھنٹہ ہوتا ہے تو وہ آ کر اس پر مارتا ہے، اس طرح وہ آ رہا ہے اور جا رہا ہے۔ یہ ایک شعبدہ ہے جو دیکھنے والے کو حیرانی میں مبتلا کر دیتا ہے کہ ایک لکڑی کے بندے کو کیسے پتہ کہ گھنٹہ ہو گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ کہ اس کے چلنے کی انہوں نے حرکات ایسی رکھی ہیں کہ جب اس کے پاؤں کا پہلا نمبر دبے گا تو وہ سمجھے گا کہ ایک بج گیا ہے اور جب دو نمبر دبے گا تو دو بج گئے۔ انڈیا کے حیدرآباد میں یہ موجود ہے اور اسی طرح سے پیرس میں ایک گھڑی بنائی ہے جو پانی کے ساتھ چلتی ہے۔

جیسے ہندوستان کے اندر رہٹ ہوتے تھے اس حساب سے کہ پانی ایک جگہ گرتا ہے، دوسری جگہ گرتا ہے، پھر تیسری جگہ اور اس پانی کی حرکات سے سوئیاں ٹھیک چل رہی ہیں، ایک منٹ بھی غلطی نہیں کرتیں۔ سینکڑوں سال گزر گئے اور اس میں فرق نہیں آیا اور آج تک لوگ نہیں سمجھ سکے۔ مغلیہ دور کے اندر ایک حوض بنایا گیا تھا، اس کی خاصیت یہ تھی کہ گرمیوں کے موسم میں اس کا پانی معتدل تھا، لیکن جب سردیوں کا زمانہ آتا تو پانی گرم ہوتا تھا۔ تحقیق

اور ریسرچ سے معلوم ہوا کہ ایک موم بتی وہ گرم ہوتا تھا۔ اب اس موم بتی کو ہوا نہیں لگ رہی تھی اور وہ جل بھی رہی تھی۔ سالہا سال گزر گئے، وہ ختم بھی نہیں ہوئی۔ جب اس کو کھودا تو دوبارہ اس کو نہیں بنا سکے۔ انگریز جو شیطانوں کا بھی باپ ہے، لیکن اب تک وہ نہیں بنا سکا۔ وہ پریشان ہیں کہ یہ کیا بات تھی کہ اس زمانے کے کاریگر بنا گئے۔

مفسر ﷫ نے فرمایا: رومی اور ہندی لوگوں نے ایسی صورتیں بنائی ہیں کہ دیکھنے والا فرق نہیں کر سکتا کہ یہ صورت ہے یا حقیقتاً انسان کھڑا ہے۔ بعض اوقات انہوں نے شیروں کے ایسے مجسمے بنائے ہیں کہ کئی لوگ دھاڑیں مار مار کر ڈر کر بھاگ آئے۔ اس میں بھی ان کی ایک کاریگری اور فن ہے، لیکن دیکھنے والے حیران رہ جاتے ہیں۔

(واقعہ) ایک بادشاہ کے پاس رومی کاریگروں اور ہندی کاریگروں کا آپس میں مقابلہ ہوگیا۔ روم کے کاریگر کہیں کہ ہم زیادہ فنکار ہیں اور ہندی کہیں ہم زیادہ کاریگر ہیں۔ وہ دونوں بوٹے اور تصویریں بناتے تھے۔ بادشاہ کے بیٹھنے کا بڑا کمرہ تھا، اس نے کہا: اس کے درمیان میں پردہ کردو کہ ایک حصہ میں رومی کام کریں اور دوسرے حصہ میں ہندی کام کریں۔ اس کے بعد ہم فیصلہ کریں گے کہ کس کا کام اچھا ہے۔ جب دونوں اپنے اپنے حصہ میں داخل ہوئے تو دونوں کے دروازے بند کردیئے گئے، تاکہ ایک دوسرے کو دیکھ نہ سکیں۔ رومیوں نے ایسے پھول اور بوٹے بنائے، محسوس یہ ہوتا تھا کہ حقیقتاً ہمارے سامنے پھول ہے اور ہندی کاریگروں نے بھی اپنا فن دکھایا۔ جب تاریخ مقرر آگئی اور دونوں نے اپنا فن انتہاء کو پہنچا دیا، بادشاہ اپنے وزراء کو لے کر ان کے کام کو دیکھنے آیا۔ درمیان سے پردہ ہٹا دیا گیا۔ ہندی کاریگروں نے اپنی دیوار کو اتنا صاف پالش کیا، شیشے کا رنگ دیا کہ جب بادشاہ اندر داخل ہوا تو جو رومیوں نے بنایا تھا وہ ادھر نظر آرہا تھا اور اس میں کمال یہ تھا کہ ہر چیز سیدھی نظر آتی تھی، اُلٹی نظر نہیں آتی تھی، حالانکہ شیشہ میں چیز اُلٹی نظر آتی ہے۔ بادشاہ نے کہا: ہندی قوم تم لوگوں سے زیادہ نمبر لے گئی۔ تم لوگوں نے بڑی محنت کی، لیکن ان لوگوں نے تمہارے علم کو اپنی دیوار میں منتقل کردیا۔ اس قسم کے عجائبات بھی دنیا میں ہوتے ہیں اور لوگ اس کو جادو سمجھتے ہیں، حالانکہ یہ جادو نہیں ہوتا۔

امام رازی ﷫ نے اس قسم میں لکھا ہے کہ بعض لوگ ایسے صندوق بناتے ہیں کہ جس میں گھڑیاں ہوتی ہیں اور بعض ایسے طریقے کے ہیں کہ بہت بھاری چیز کو ایک خفیف چیز سے کھینچ لیں گے۔ مثلاً ایک مَن کے پتھر کو ایک دھاگے سے کھینچا، دھاگا بھی نہ ٹوٹا اور پتھر بھی کھنچ آیا۔ تو یہ جادو نہیں، کیونکہ اس کے اسباب اور علامات موجود ہیں، لیکن لوگ اس کو بھی جادو شمار کرتے ہیں۔

اسی طریقے سے نصرانیوں کے حیلے ہیں کہ انہوں نے بیت المقدس میں ایسا انتظام کیا کہ مخفی طور پر ایسی جگہ سے آگ داخل کرتے ہیں کہ وہ قنادیل میں جلتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس سے وہ جاہل لوگوں پر اپنا اثر ڈالتے ہیں اور ان کے خاص لوگ جانتے ہیں کہ یہ حقیقت نہیں، بلکہ یہ آگ ہے جو خاص طریقہ سے جلائی جاتی ہے۔

(واقعہ) ایک نصرانی راہب اپنے کنیسہ میں عبادت کرتا تھا۔ اس نے وہاں ایک کمزور پرندے کو دیکھا کہ وہ بڑی کمزور آواز نکالتا ہے، اس کی آواز میں اتنا درد ہے کہ باقی پرندے بھی اکٹھے ہوجاتے ہیں تو اس راہب نے اس شکل کا ایک پرندہ بنایا اور اس کو اندر سے خالی رکھا اور اس طریقہ سے بنایا کہ اس طرف سے ہوا گزرے تو اس پرندے کی طرح آواز نکلے۔ اس نے عبادت خانے کی چھت پر اس کو رکھ دیا اور زیتون وغیرہ رکھ دیتا۔ جب ہواؤں کا زمانہ آتا تو اس طرف سے وہ دروازہ کھول دیتا۔ جب ہوا چلتی اور اس پرندے سے آواز نکلتی تو سارے پرندے اکٹھے ہوجاتے تھے اور زیتون کھاتے تھے۔ لوگ آکر دیکھتے تو کہتے کہ اس بزرگ کی کرامت ہے کہ اس کو سلام کرنے کے لیے سارے پرندے آرہے ہیں۔ لاکھوں لوگ اس طرح برباد ہوگئے۔ مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: قیامت تک ایسے لوگوں پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو، جو لوگوں کے عقیدے برباد کرتے ہیں۔

چھٹی قسم:

بعض جادوگر دواؤں کے خواص سے فائدہ اُٹھاتے ہیں کہ دوا پلائی، آدمی کو نشہ ہوگیا، آدمی کا درد بدن سے ختم ہوگیا۔ ایسی چیزیں وہ اپنے مشروبات اور مطعومات میں تیار کرتے ہیں۔ جیسے مقناطیس میں بھی اس کا مشاہدہ کیا گیا۔ بعض ایسی دوائیاں ہیں کہ آدمی اگر ہاتھوں پر لگا کر سانپ کو پکڑ لے تو اگر سانپ ڈس بھی لے تو کچھ نہیں ہوتا۔

ساتویں قسم:

ساتویں قسم یہ کہ جادوگر دعویٰ کرتا ہے کہ میں اسم اعظم کا عامل ہوں، جنات میرے تابع ہیں۔ بعض سننے والے ضعیف العقل ہوتے ہیں، وہ بھی مان لیتے ہیں کہ شاید اس کے پاس اسم اعظم ہے۔ بعض لوگ اپنے تجربات سے دیکھتے ہیں کہ یہ آدمی چالاک ہے تو اس سے بات نہیں کرتا اور جو سیدھے سادے نظر آتے ہیں تو اس کو کہتا ہے: میں اسم اعظم کا عامل ہوں، جن میرے تابع ہیں، تم جو چیز کہو، میں ابھی لاکر دکھا سکتا ہوں، منگوا سکتا ہوں۔ جب کوئی آدمی ان کے ہاتھ آجاتا ہے تو اس کو لوٹ کر چلے جاتے ہیں۔

آٹھویں قسم:

چغلی کر کے لوگوں کو آپس میں لڑوانا۔ اور لوگوں نے سمجھا کہ میں اس سے تعویذ لے کر آیا تو ان کی آپس میں دشمنی ہو گئی ہے۔ ایک چغلی لوگوں کو لڑوانے اور لوگوں کو جدا کرنے کے لیے ہوتی ہے، یہ حرام ہے۔ اور ایک ایسا جھوٹ ہوتا ہے جس کے ذریعے سے آدمی لوگوں کو ملانا چاہتا ہے، جھگڑا ختم کرانا چاہتا ہے، یہ گناہ نہیں ہوتا۔ کافروں کے مجمع کو منتشر کرنے کے لیے ایسی بات کی کہ ان کا باہم تعلق ختم ہو جائے، یہ ٹھیک ہے۔ جیسا کہ حضرت نعیم بن مسعود رضی اللہ عنہ نے جنگ احزاب کے موقع پر کیا تھا، جس کی تفصیل سورۃ الاحزاب میں آئے گی۔ یہ چغلی حرام نہیں ہے، بلکہ جنگ میں تو ایسے حیلے اور تدبیریں کی جاتی ہیں۔

امام رازی رحمہ اللہ نے سحر کی ساری انواع بیان کی ہیں۔ اصل میں بعض چیزیں مخفی ہوتی ہیں اور سحر بھی یہی ہے کہ خفیہ طور پر کسی کے اوپر اثر کر دے، جیسا کہ حدیث میں آیا ہے: "إِنَّ مِنَ الْبَيَانِ لَسِحْرًا" [صحیح بخاری، رقم: ۵۱۴۶] اللہ نے بعض بندوں کو بولنے میں جادو دیا ہوتا ہے۔ وہ بات کرتے ہیں تو لوگوں کے دلوں کو کھینچ لیتے ہیں۔ اس لیے امام رازی رحمہ اللہ نے بعض ایسی چیزوں کو بھی سحر میں شامل کر دیا، جو حقیقتاً سحر نہیں ہیں، کیونکہ وہ بھی مخفی ہیں۔

اس لیے رمضان المبارک میں جو آدمی صبح کو کھانا کھاتا ہے، اس کو "سحری" کہتے ہیں؛ کیونکہ وہ بھی رات کو چھپ کر کھاتا ہے اور جیسا کہ ابوجہل علیہ اللعنہ نے بدر والے دن عتبہ سے کہا تھا: "إِنْتَفَخَ سَحْرُهُ" (ڈر کے مارے اس کا پتہ بھی پھول گیا ہے)۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا:

"تُوُفِّيَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي بَيْتِي، وَ فِي يَوْمِي، وَ بَيْنَ سَحْرِي وَ نَحْرِي." [صحیح بخاری، رقم: ۴۴۵۱]

حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے گھر میں، میری باری کے دن اور میرے سینے اور حلق کے درمیان وفات پائی، یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا سر مبارک میرے سینے پر تھا (سَحر، پتہ کو کہتے ہیں، کیونکہ وہ بھی چھپا ہوا ہوتا ہے) جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی، اور جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿قَالَ أَلْقُوا ۖ فَلَمَّا أَلْقَوْا سَحَرُوا أَعْيُنَ النَّاسِ وَاسْتَرْهَبُوهُمْ وَجَاءُوا بِسِحْرٍ عَظِيمٍ ﴿١١٦﴾﴾ [الاعراف: ۱۱۶]

کہ انہوں نے لوگوں کی آنکھوں پر جادو کر دیا، یعنی ایسے مخفی طریقے سے عمل کیا کہ کسی دوسرے کو سمجھ نہ آئے۔

ابو عبداللہ القرطبی نے لکھا ہے کہ اہلسنت والجماعت کے نزدیک سحر حقیقت ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کے حکم کے

بغیر تو بہر حال کوئی چیز پیدا نہیں ہو سکتی۔ لیکن معتزلہ کہتے ہیں: جادو حقیقت نہیں، بلکہ ایک دھوکہ اور تخیل ہے، یہ ہاتھ کی چالاکی یا آنکھوں پر اثر ڈالنا ہے۔

امام قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: بعض کلام ایسے ہوتے ہیں جن کو وہ یاد کرتے ہیں، بعض کلام ایسے ہوتے ہیں جو اللہ کے کلام سے پڑھتے ہیں اور بعض ایسے کلام ہوتے ہیں جو شیاطین کے عہد ہوتے ہیں اور دوائیں اور دھوئیں ہوتے ہیں جو اثر کرتے ہیں۔

بعض علماء فرماتے ہیں کہ "إِنَّ مِنَ الْبَيَانِ لَسِحْرًا" یا تو یہ تعریف ہے یا جادو کی مذمت ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: بعض آدمی میرے پاس مقدمہ لے کر آتے ہیں، ایک آدمی زیادہ بولنے والا اور اپنی بات کو سمجھانے والا ہوتا ہے، حالانکہ وہ جھوٹا ہوتا ہے، لیکن اپنی بات کے زور پر اپنی بات منوا لیتا ہے اور میں اس کے حق میں فیصلہ کرتا ہوں۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقُولُوا رَاعِنَا وَقُولُوا انظُرْنَا وَاسْمَعُوا ۗ وَلِلْكَافِرِينَ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿١٠٤﴾﴾ [البقرة: ١٠٤]

"اے ایمان والو! (نبی) کو "رَاعِنَا" نہ کہو، بلکہ "انظُرْنَا" (ہماری طرف دیکھیے) کہو اور سنو، اور انکار کرنے والوں کے لیے دردناک عذاب ہے۔"

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا﴾ کے ساتھ مومنوں کو خطاب:

اس آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کی ایک اور قباحت کا ذکر فرمایا اور حضور اکرم ﷺ کی عظمت کو بیان فرمایا ہے اور آپ کی اُمت کی عظمت کو اس طرح بیان فرمایا کہ اٹھاسی (۸۸) مقامات پر قرآن میں ان کو مخاطب فرمایا۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اپنے دوستوں سے فرمایا کہ خیال کیا کرو جہاں قرآن میں ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا﴾ سے خطاب آئے تو اپنے فکر و نظر اور دل و جان کے ساتھ اللہ کے کلام کی طرف متوجہ ہو جایا کرو؛ کیونکہ اللہ بغیر کسی واسطہ کے اپنے مومنین بندوں سے خطاب فرما رہے ہوتے ہیں اور اللہ پاک جب بھی مومنین کو خطاب فرماتے ہیں تو کسی خیر کا حکم دیتے ہیں اور شر سے منع فرماتے ہیں۔

ربط آیات:

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَ قُوْلُوا انْظُرْنَا وَ اسْمَعُوْا ؕ وَ لِلْكٰفِرِیْنَ عَذَابٌ اَلِیْمٌ﴾ [البقرة: ۱۰۴]

جیسے آدمی جادو کے ذریعے سے دکھلاتا کچھ ہے اور اس کی حقیقت کچھ ہوتی ہے، اسی طرح یہودیوں کا سحر لسانی تھا، جس سے بظاہر تو عظمت محمد مصطفیٰ ﷺ معلوم ہو، لیکن در پردہ ان کا مقصد حضور اکرم ﷺ کی اہانت تھا۔ اس طرح گزشتہ آیات اور اس آیت کے درمیان ربط معلوم ہو گیا۔

شانِ نزول:

یہودیوں کی یہ عادت تھی کہ جب وہ آپ ﷺ کی خدمت میں آتے تو بڑے ادب واحترام سے کہتے تھے: ﴿رَاعِنَا﴾ اب ظاہر لفظ کا معنی یہ ہے کہ ہماری رعایت کیجیے، ہم سے مہربانی کیجیے۔ لیکن ان کا مقصد توہین تھا کہ بظاہر تو ﴿رَاعِنَا﴾ بول رہے ہیں، لیکن اپنے لہجے کو بدل دیتے تھے اور کہتے تھے: ''رَاعِیْنَا'' یعنی تم تو ہمارے چرواہے ہو (نعوذباللہ من ذلك)۔ ان کا مطلب یہ تھا کہ مکہ میں مشرکین کی بکریاں چراتے رہے اور اب نبوت کا دعویٰ کرتے ہو۔

''رَاعِیْنَا'' کا دوسرا معنی آتا ہے: (نعوذ باللہ) تم بے عقل ہو۔ جو لوگ اس وقت نئے نئے مسلمان ہوئے تھے وہ سمجھتے تھے کہ یہودیوں کے بڑے بڑے علماء، احبار اور رُہبان جب اس لفظ سے اللہ کے نبی کو پکارتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ بڑا اچھا لفظ ہے، وگرنہ ان لفظوں کے ساتھ یہ نہ بلاتے۔ تو ان ایمان والے لوگوں نے بھی حضور اکرم ﷺ کو اس لفظ کے ساتھ مخاطب کرنا شروع کیا تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآن مقدس میں یہ آیت اُتاری کہ اے ایمان والو! تم ان کی باتوں میں آکر ایسا لفظ اختیار نہ کرو کہ جس کے معنی بظاہر ٹھیک ہیں، لیکن در پردہ دشمن اس سے اہانت کا معنی لیتا ہے۔ اور میرے نبی کی شان اتنی بڑی ہے کہ اس کی شان میں اشارۃً یا کنایۃً کسی طرح بھی اگر کوئی شخص جان بوجھ کر ایسا کلمہ زبان سے نکالے جس سے میرے پاک نبی کی شان میں کمی ہوتی ہو تو اس کے کفر میں کوئی شک نہیں۔

علمائے کرام نے لکھا ہے کہ اگر کوئی آدمی حضور اکرم ﷺ کی شان میں گستاخی کرے اور ایسا لفظ زبان سے کہے جو میرے حضور ﷺ کی شان کے لائق نہ ہو یا (نعوذ باللہ) کوئی سب وشتم کرے یا حضور اکرم ﷺ کی اہانت وتوہین کرے تو وہ زندیق اور واجب القتل ہے۔



گستاخِ رسول واجب القتل ہے، اس کا قصاص بھی نہیں:

اسی موضوع پر عظیم کتاب علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے "الصارم المسلول علی شاتم الرسول" لکھی ہے کہ اگر کوئی آدمی حضور اکرم ﷺ کی شان میں گستاخی کرے تو اس کی سزا یہ ہے کہ وہ واجب القتل ہے اور وہ زندیق ہے، اس کی توبہ قبول نہیں کی جائے گی۔ اور جو آدمی ایسے آدمی کو قتل کرے گا، اس پر سزا بھی نہیں ہوگی۔

اور اس پر احادیث سے استدلال کیا ہے کہ ایک نابینا صحابی کی شادی ایک کنیز سے ہوئی اور وہ نوجوان لڑکی تھی، بڑی خوبصورت تھی، کافرہ تھی، اس کو اپنی جوانی پر گھمنڈ تھا۔ جب بھی صحابی آتے تو وہ پوچھتی کہ آپ کہاں رہ گئے؟ وہ کہتے کہ مجھے حضور اکرم ﷺ کی مجلس میں دیر ہوگئی تو وہ بدبخت لڑکی حضور پاک ﷺ کی شان میں گستاخی کرتی تھی۔ اس صحابی نے بڑا سمجھایا اور اس کو ہدایت کی، لیکن وہ باز نہ آئی۔ ایک دن اس صحابی نے سوچا کہ اگر میں ایسے مقابلہ کروں تو وہ آنکھ والی ہے، وہ بھاگ جائے گی اور اگر کہہ کر مقابلہ کروں تو ہوسکتا ہے کہ وہ طاقت میں بھی مجھ سے زیادہ ہو جائے، کیونکہ جوان لڑکی ہے۔ میں نے ایک دن ارادہ کرلیا، جب وہ سوگئی تو اس کے سینہ پر بیٹھا اور اس کے سینے میں خنجر گھونپ دیا اور اس وقت تک ہاتھ نہیں اُٹھائے جب تک یقین نہیں ہوگیا کہ یہ شاتمہ، بدبخت عورت اپنے انجام کو پہنچ گئی۔ اس کو قتل کرنے کے بعد حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوکر عرض کیا: یارسول اللہ! میں نے بڑا برداشت کیا، لیکن آپ کی شان میں گستاخی میں کب تک برداشت کرتا، میری قوتِ برداشت جواب دے گئی اور میں نے اس کو مارڈالا۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ٹھیک ہے، اور آپ ﷺ نے اس پر کوئی مقدمہ قائم نہیں فرمایا اور اسے کسی قتل کی سزا بھی نہیں دی۔ اس سے علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے استدلال کیا کہ اگر کوئی شاتم رسول ہے، چاہے وہ صراحتاً گستاخی کرے یا کنایۃً گستاخی کرے یا اشارۃً گستاخی کرے تو اس کے کفر میں علماء کو کسی قسم کا شبہ نہیں ہے۔

حضور اکرم ﷺ کے ساتھ ادب فرض ہے:

ادب، ہمیشہ دوستوں کو اور اپنوں کو سکھایا جاتا ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں مومنین سے خطاب فرمایا۔ اور دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَرْفَعُوا أَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوا لَهُ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ

اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ﴿۲﴾ [الحجرات:۲]

اے ایمان والو! خبردار! میرے مدنی ﷺ کے سامنے اپنی آواز کو اونچا بھی نہ کرو، یعنی آپ کے فرمان کی مخالفت نہ کرو، گستاخانہ طور پر یا ایسے ذریعہ سے کہ جس سے میرے مدنی کی آواز دب جائے اور توہین کا پہلو نکلے۔ وگرنہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ اونچی آواز میں اذان دیتے تھے، اسی طرح بعض صحابی جب بات کرتے تھے تو اونچی آواز میں کرتے تھے۔ ان کی فطرتاً آواز اونچی تھی۔ اس لیے اس آیت میں مقصد یہ ہے کہ کوئی آدمی توہین کے ارادے سے میرے پاک نبی ﷺ سے بات کرے کہ اس کی آواز اونچی ہو جائے یا نافرمانی کرے یا انکار کرے یا حضور پاک ﷺ کے سامنے ایسا شور مچائے کہ حضور اکرم ﷺ کی آواز دب جائے۔

فرمایا: جب میرے مدنی پاک جا رہے ہوں تو ان کو ایسے نہ بلایا کرو جیسے تم ایک دوسرے کو بلاتے ہو کہ اے فلانے! ادھر آؤ۔ بلکہ میرے نبی ﷺ کے سامنے آ کر ادب سے عرض کیا کرو۔ اگر تم نے کبھی ایسی غلطی کی کہ تمہاری آواز میرے نبی کی آواز سے اونچی ہو گئی تو اس کی سزا یہ ہے کہ میں تمہارے نیک اعمال برباد کر دوں گا اور تمہیں پتہ بھی نہیں چلے گا۔

تیسرا ادب: فرمایا: جو لوگ میرے مدنی کے سامنے آ کر پست آواز میں بات کرتے ہیں، ادب سے بات کرتے ہیں، یہ پکے مومن ہیں، ان کے دلوں کو میں نے آزما لیا ہے، یہی وہ لوگ ہیں جو تقویٰ کے اعلیٰ مرتبہ پر ہیں اور انہی کے لیے مغفرت ہے اور بہت بڑے درجات ہیں۔

چوتھا ادب: اللہ نے سکھایا ہے کہ کچھ لوگ جنگل سے آئے اور حضور پاک ﷺ کے دروازے کے باہر کھڑے ہو کر زور زور سے کہنے لگے: "اُخْرُجْ يَا مُحَمَّدُ! اُخْرُجْ يَا مُحَمَّدُ" (محمد! باہر آ، ہماری بات سن)۔ اس وقت حضور اکرم ﷺ سوئے ہوئے تھے اللہ پاک نے فرمایا: خبردار! میرے نبی جب اپنے حجرے میں چلے جائیں تو باہر سے شور نہ مچایا کرو، بلکہ صبر کرو اور جب میرا نبی خود باہر آئے اور تمہاری طرف توجہ کرے تو درخواست پیش کرو۔

اس لیے اللہ نے اس آیت میں اشارہ فرمایا کہ ایسا لفظ استعمال کیا کرو جن کا دوسرا معنی نہ ہو، تاکہ دوسری تاویل نہ ہو سکے۔ اور جس چیز کا تمہیں حضور اکرم ﷺ حکم کریں، اس کی اطاعت کرو۔ اور جو کافر ایسے لفظ کہتے ہیں، وہ حضور اکرم ﷺ کی اہانت کرتے ہیں، ان کے لیے بڑا دردناک عذاب ہے۔

﴿مَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَلَا الْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ خَيْرٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۝﴾ [البقرۃ:۱۰۵]

''نہیں پسند کرتے اہل کتاب کافر اور مشرکین کہ تم پر خیر (وحی) نازل ہو تمہارے رب کی طرف سے، حالانکہ اللہ اپنی رحمت (نبوت) سے مخصوص کرتا ہے جس کو چاہتا ہے، اور اللہ فضل عظیم کا مالک ہے۔''

شانِ نزول:

اس آیت کا شانِ نزول یہ ہے کہ یہودیوں کے بڑے راہب مسلمانوں سے کہنے لگے کہ اگر تمہارے دین میں کوئی بات زیادہ بہتر ہوتی یا تمہارا دین ہمارے دین سے مجموعی طور پر بہتر ہوتا تو ہم مان لیتے، لیکن دین اسلام زیادہ بہتر نہیں۔ اللہ نے ان کی اس بات کو رد کرتے ہوئے کہا: کافر اہل کتاب اور مشرکین یہ نہیں چاہتے کہ اللہ تمہارے اوپر کوئی بھلائی نازل کرے، ان کے دلوں میں حسد و بغض ہے، ان کو دین اسلام کی اچھائی نظر نہیں آ رہی، حالانکہ یہ جاہل اتنا بھی نہیں جانتے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت و رسالت برحق ہے، تورات اور انجیل اللہ کی کتابیں ہیں، لیکن وہ دونوں صرف بنی اسرائیل کے لیے نبی تھے، ساری کائنات کے لیے نبی نہیں تھے۔ یہ شرف صرف حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ملا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت بھی ساری کائنات کے لیے اور رسالت و شریعت بھی ساری کائنات کے لیے ہے اور نبوت آپ پر آ کر ختم ہو گئی۔ اللہ نے فرمایا: چونکہ ان کافر، یہودیوں اور عیسائیوں کے دلوں میں بغض و حسد ہے، یہ مسلمانوں کی خیر کبھی پسند نہیں کرتے اور اللہ نے فرمایا: اللہ تبارک و تعالیٰ جس کو خاص کر لیں، جس کو چُن لیں اپنی نبوت کے لیے، اس کی مرضی ہے۔ یہ اعتراض کرنے والے کون ہیں؟

جو کسی قوم کی مشابہت اختیار کرے گا، وہ انہی میں شمار ہوگا:

اللہ تبارک و تعالیٰ نے ان آیات میں مسلمانوں کو منع فرمایا ہے کہ تم کافروں کے کسی کام کی، فعل کی مشابہت نہ کیا کرو کہ ان کے لباس وغیرہ میں ان کی پیروی کی جائے، ان کی عادات میں اور ان کے قول میں مسلمانوں کے لیے ان کی پیروی کرنا ہلاکت کا باعث ہے؛ کیونکہ یہود جب بات کرتے تھے تو توریہ کرتے تھے۔

احادیث مبارکہ میں آیا ہے کہ جب یہودی آ کر حضور پاک ﷺ کو سلام کرتے تو کہتے: ''اَلسَّامُ عَلَيْكُمْ'' یعنی آپ ﷺ پر موت آئے۔ اس لیے ہمیں یہ حکم دیا گیا کہ جب کبھی یہودی یا کافر تم کو سلام کرے تو تم کہو: ''وَعَلَيْكُمْ''، تا کہ جو کچھ اس نے کہا، وہ بلا اللہ تعالیٰ اس پر ڈالے۔ اللہ کی رحمت سے ہماری جوان کے بارے میں دعا ہے وہ اللہ منظور فرمائیں گے اور ان کی بد دعا ہمیں نہیں لگے گی۔ اس بات کا خلاصہ یہ نکلا کہ مسلمانوں کو چاہیے کہ کافر کی کسی بات میں پیروی نہ کرے۔

کفار کے ساتھ مشابہت اختیار کرنے سے متعلق احکام:

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:

''مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ.'' [سنن ابی داود، رقم: ۴۰۳۱]

''جو آدمی جس قوم کی شکل اختیار کرتا ہے وہ ان میں سے شمار ہوگا۔''

اس لیے جو لباس خاص طور پر یہود و نصاریٰ یا مشرکین اور کافرین کی علامت ہے، مسلمان اس سے بچیں۔ اگر کوئی شخص اس طرح کرے گا تو اللہ اس کو انہی میں سے بنا دے گا اور وہ ان میں سے اُٹھایا جائے گا۔

کوٹ، پتلون کے مسئلے کے بارے میں علماء نے لکھا ہے کہ ان کے استعمال میں کوئی حرج نہیں؛ کیونکہ یہ اب کافروں کی علامت نہیں رہا۔ کوئی آدمی پینٹ پتلون پہنے ہوئے ہو اور ہم یہ سمجھیں کہ یہ کافر ہے۔ چونکہ اب اس کو مسلمان اتنا استعمال کرتے ہیں کہ اب یہ کفار کا مخصوص لباس نہیں رہا، لیکن بعض چیزیں جیسے ٹائی لگانا یا ایسے کپڑے پہننا جس کے اندر چھ ستارے ہوتے ہیں یہودیوں کے، یا تین ستارے ہوں عیسائیوں کے، تا کہ وہ اس سے تثلیث کا عقیدہ ثابت کریں۔ بہر حال جو چیزیں ان کا شعار ہیں، جس کو دیکھ کر فوراً نظر اُدھر جائے کہ یہ یہودیوں کا شعار ہے یا یہ نصرانیوں کا شعار ہے، ہندو لوگ دھوتی الٹا کر پہنتے ہیں تو یہ مسلمانوں کے لیے جائز نہیں، اسی طرح سے وہ چوٹی رکھتا ہے، جائز نہیں ہے؛ کیونکہ وہ ان کا شعار اور ان کی علامت ہے۔ اسی طرح جیسے پادریوں کے لباس ہیں، وہ ان کے شعار ہیں۔ اور بھی بہت ساری چیزیں ہیں، مسلمانوں کو استعمال نہیں کرنی چاہئیں۔ ہندو عورتیں اس طرح ساڑھی باندھتی ہیں کہ آدھا پیٹ کھلا ہوتا ہے، یہ ان کا شعار ہے، اگر مسلمان عورت اس طرح باندھے تو یہ بالکل حرام ہے؛ کیونکہ مسلمان عورت سر سے لے کر پاؤں تک عورت ہے۔ عورت کا معنی وہ چیز ہے جو چھپائی جائے، اور



مرد کا عورۃ یعنی ستر ناف کے نیچے سے لے کر گھٹنے سمیت تک ہے، اس جگہ کا چھپانا شریعت کے اندر فرض ہے، اگر اس میں ذرا بھی جگہ کھلی ہوگی تو نماز نہیں ہوگی، دیکھنے اور دکھانے والے دونوں پر لعنت ہوگی۔

عورت برقعہ کا کرتہ اتنا لمبا پہنے کہ ایک بالشت کے برابر پاؤں سے بھی نیچے ہو کہ وہ کپڑا زمین پر پڑ جائے اور عورت کے پاؤں بھی نظر نہ آئیں۔ عیسائی تین انگلیوں سے سلام کرتے ہیں، تاکہ تثلیث کا عقیدہ ثابت ہو، اور یہ ان کا شعار ہے۔ اس لیے ایسے شعار جو باطل فرقوں کے ہوتے ہیں، ان سے بچنا ضروری ہے، ورنہ قیامت میں اللہ پاک انہی میں سے اُٹھائیں گے۔

حضرت خیثمہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا﴾ سے خطاب فرمایا اور تورات میں خطاب ہوتا تھا: ''يَا أَيُّهَا الْمَسَاكِينُ!''

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ﴿رَاعِنَا﴾ کا معنی ''ارعنا سمعك'' ہے، یعنی ہماری بات سننے میں آپ ہماری رعایت کریں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسے نہ کہو، یہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان کے خلاف ہے۔

حضرت سدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: قینقاع قبیلہ سے ایک یہودی جس کا نام رفاعہ بن زید تھا، وہ بھی حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آتا اور کہتا تھا: ''ارعنی سمعك وَ اسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ'' مسلمانوں نے سمجھا کہ شاید یہ بڑا اچھا کلمہ ہے کہ اس سے انبیاء کی عزت و وقار کیا جاتا ہے تو انہوں نے بھی یہ کہنا شروع کر دیا، لیکن اللہ تعالیٰ نے منع فرما دیا کہ ایسا لفظ یا کوئی ایسا کلمہ اختیار نہ کرو جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں کوتاہی کا ذریعہ بنتا ہو؛ کیونکہ یہودی تو دشمن ہیں، وہ تو ایسی باتیں کرتے ہیں۔

کافروں کا ایک ذہین آدمی تھا، وہ بڑے فخر سے لوگوں کو کہتا تھا کہ تم کمال کرتے ہو، محمد کے پیچھے جاتے ہو، میں اس سے زیادہ سمجھدار ہوں، میرے پاس دو دل ہیں اور میرے پاس اتنا عقل اور فہم ہے۔ اللہ نے اس کو اس طرح سزا دی کہ جب بدر کے میدان میں کافروں کو شکست ہوئی تو وہ بدبخت بھی وہاں تھا۔ یہ ڈر کے مارے بھاگا تو ایک جوتا ہاتھ میں تھا اور ایک پاؤں میں تھا۔ راستہ کے اندر ابوسفیان ملے اور پوچھا کہ لوگوں کا کیا حال ہوا؟ اس نے کہا: شکست ہوگئی۔ ابوسفیان نے کہا: ان کے ساتھ تو جو ہوا سو ہوا، لیکن تمہیں کیا ہوگیا کہ ایک جوتا ہاتھ میں ہے اور دوسرا پہنے ہوئے ہو؟ کہنے لگا: اچھا! میں سمجھا کہ دونوں پہنے ہوئے ہوں۔ تب لوگوں کو سمجھ آئی کہ یہ اس طرح کا سمجھدار ہے۔

﴿رَاعِنَا﴾ کا لفظ:

مفسر ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: راجح بات یہ ہے کہ ﴿رَاعِنَا﴾ کا لفظ عام استعمال ہوتا تھا، لیکن اللہ کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں پسند نہ آیا تو منع فرمادیا کہ خبردار ایہ کلمہ آئندہ نہیں کہنا۔

﴿مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا ۭ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۞ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ۞﴾ [البقرۃ:۱۰۶،۱۰۷]

''ہم جو آیت بھی منسوخ کرتے ہیں یا بھلا دیتے ہیں تو اس سے زیادہ مفید یا اس جیسی اُتارتے ہیں، کیا آپ نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے؟ کیا آپ نہیں جانتے کہ اللہ ہی کے لیے ہے بادشاہی آسمانوں اور زمین کی، اور تمہارے لیے اللہ کے سوا کوئی محافظ اور کوئی مددگار نہیں (جو عذاب سے بچا سکے)۔''

قرآن میں احکام کی تبدیلی کی وجوہات:

ان آیات مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے یہود اور اعدائے اسلام کا رد فرمایا ہے جو لوگ اسلام پر اور حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارکہ پر الزام لگاتے تھے کہ آپ کے پیغمبر بھی ایک حکم دیتے ہیں، پھر اس کو بدل دیتے ہیں اور نیا حکم دے دیتے ہیں۔ اگر یہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے جو پیغمبر آپ کو دیتا ہے تو اس میں تبدیلی کیوں ہوتی ہے؟ اگر خدا کا پہلا حکم خیر تھا تو پھر اس خیر کو بدلنے کی کیا ضرورت تھی؟ اور اگر یہ پہلا حکم (نعوذ باللہ!) غلط تھا تو پھر خدا نے اس عمل کے کرنے کا حکم کیسے دے دیا؟

یہ ایک شبہ تھا جس سے اعدائے اسلام نے اور خصوصاً یہود نے مسلمانوں کو اسلام اور پیغمبر اسلام سے بدظن کرنے کی کوشش کی۔ اس کے جواب میں پروردگار عالم نے فرمایا کہ جو آیت یا جو حکم ہم منسوخ کر دیتے ہیں وہ حکم بھی اپنے وقت و زمانہ کے اعتبار سے خیر ہی خیر تھا، اور اس کے بدلے میں جو حکم دے رہے ہیں وہ بھی بطور حکم اور ثواب کے اس سے بڑھ کر ہوتا ہے یا اس کے برابر ہوتا ہے۔ یعنی ایک آیت اگر پہلے نازل ہوئی تو وہ بھی اللہ کا کلام ہے اور پھر دوسری آیت نازل ہوئی تو وہ بھی اللہ کا کلام ہے۔ بہتر ہونے کا مطلب یہ ہے کہ بطور ثواب، بطور اجر،

بطور مصلحت پہلے حکم سے دوسرے حکم میں زیادہ بہتری اور ثواب ہے یا اس میں ثواب تو زیادہ تھا، مگر مصلحت کے تقاضے کے مطابق اس کا بدلنا زیادہ ضروری تھا۔

نسخ کا معنیٰ:

نسخ کا ایک معنیٰ ہے: ''نقل کرنا''۔ یعنی کتاب کو نقل کریں تو اس کو بھی نسخ کہتے ہیں اور ایک معنیٰ ''کسی چیز کو ہٹا دینا، بدل دینا''۔ جیسے ''نَسَخَتِ الشَّمْسُ الظِّلَّ'' (سورج نے آ کر سائے کو ختم کر دیا)۔ تو ایک حکم کو دوسرے کی طرف نقل کر دیا جائے، یہ نسخ قرآن کا معنیٰ ہے۔

نسخ اور منسوخ کی قسمیں:

1...... ''منسوخ الحکم و التلاوۃ'': پہلے ایک حکم تھا، اللہ نے اس کو منسوخ فرما دیا اور آیت بھی منسوخ التلاوۃ ہوگئی، یعنی اب وہ آیت نہ پڑھی جاتی ہے اور نہ اس پر عمل کیا جاتا ہے، اس کو ''منسوخ الحکم و التلاوۃ'' کہتے ہیں، یعنی حکم اور آیت کی تلاوت دونوں منسوخ ہیں۔ جیسے سورۃ الاحزاب بڑی طویل سورۃ تھی، حتیٰ کہ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم فرماتے ہیں کہ سورۃ البقرۃ کے برابر تھی، یعنی تقریباً دوسو آیات، اور اب سورۃ الاحزاب جو اللہ کے قرآن میں موجود ہے، اس میں تہتر آیات ہیں۔ اس کی باقی آیات منسوخ الحکم اور منسوخ التلاوۃ ہوگئیں۔ اب نہ تو پڑھی جاتی ہیں اور نہ ہی اس کے احکام پر عمل ہوتا ہے۔

2...... دوسری قسم ''منسوخ الحکم باقی التلاوۃ'': حکم منسوخ ہے، لیکن تلاوت منسوخ نہیں ہے، یعنی قرآن پاک میں وہ آیت موجود ہے، پڑھی جاتی ہے، تلاوت کا حکم ختم نہیں ہوا، صرف اس پر عمل کو منسوخ کر دیا گیا ہے، تلاوت میں ثواب اس کا موجود ہے۔ جیسے پہلے حکم یہ ہوتا تھا کہ اگر کسی عورت کا خاوند مر جائے تو اس کی عدت ایک سال تھی۔ اب اللہ تبارک وتعالیٰ نے دوسرا حکم دے کر پہلا حکم منسوخ فرمایا کہ اگر کسی عورت کا شوہر فوت ہو جائے تو ﴿أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ وَّعَشْرًا﴾ اس کی عدت (چاند کے اعتبار سے) چار مہینے دس دن ہے۔ پہلی آیت میں جو عورت کو حکم تھا، وہ بھی پڑھی جاتی ہے، لیکن اس پر عمل باقی نہیں رہا کہ کوئی عورت ایک سال عدت میں بیٹھے۔

3...... تیسری قسم ''منسوخ التلاوۃ باقی الحکم'': اس آیت کا تلاوت کرنا منسوخ ہو گیا، لیکن حکم باقی ہے۔ اس سے اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے بندوں کو آزماتے ہیں کہ ہم نے ایک دفعہ ایک حکم دیا، ضروری تو نہیں کہ وہ حکم ہر وقت لکھا

ہوا باقی رہے۔ بس نبی ﷺ نے بتلا دیا کہ وہ حکم باقی ہے، رسول اللہ ﷺ نے منسوخ نہیں کیا۔ جیسا کہ رجم کی آیت تھی:

"اَلشَّیْخُ وَ الشَّیْخَۃُ إِذَا زَنَیَا فَارْجُمُوْهُمَا شَاهِدًا نَطَابَرًا"

یعنی اللہ نے حکم فرمایا کہ اگر شادی شدہ مرد اور عورت زنا کرے اور زنا ثابت ہو جائے، گواہوں کے ساتھ یا اقرار کے ساتھ تو ان دونوں کو رجم کیا جائے۔

اب یہ آیت نہیں پڑھی جاتی، مگر اس کا حکم باقی ہے۔ اسی لیے امیر المومنین سیدنا عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے منبر رسول ﷺ پر کھڑے ہو کر خطبے میں فرمایا: "رَجَمَ رَسُوْلُ اللّٰہِ وَ رَجَمْنَا" لوگو! حضور اکرم ﷺ نے بھی رجم کیا اور ہم نے بھی رجم کیا)۔ ایسا نہ ہو کہ صدیاں گزرنے کے بعد کچھ لوگ آ جائیں اور کہیں: "إِنَّا لَمْ نَجِدْ آیَۃَ الرَّجْمِ فِیْ کِتَابِ اللّٰہِ" کہ اللہ کے قرآن میں آیت رجم تو نہیں ہے تو ہم رجم کیوں کریں؟ فرمایا: "وَاللّٰہِ! لَوْ لَا نَخَافُ" میں اگر اس سے نہ ڈرتا کہ کل آنے والے لوگ کہیں یہ نہ کہہ دیں، "زِیْدَ فِیْ کِتَابِ اللّٰہِ أَوْ نُقِصَ مِنْہُ" اللہ کے قرآن میں بڑھا دیا گیا یا گھٹا دیا گیا تو میں حکم دیتا کہ آیت رجم کو لکھ دیا جائے۔

4 ......"باقی التلاوۃ باقی الحکم": یعنی قرآن کی وہ قسم جس کی تلاوت بھی باقی ہے اور حکم پر عمل کرنا بھی باقی ہے، اور یہ قسم اکثر قرآن پر مشتمل ہے۔

اسی کے ساتھ یہ بات بھی یاد رکھیں کہ نسخ و منسوخ کا مسئلہ اوامر و نواہی میں ہوتا ہے، یعنی ایک امر تھا، پھر اس کو منسوخ کر دیا گیا، یا ایک نہی تھی، وہ منسوخ کر دی گئی۔ لیکن یہ کبھی نہیں ہوتا کہ اخبار و حالات میں کبھی نسخ ہو۔ جیسے اللہ کے نبی ﷺ نے قوم عاد، قوم نوح، قوم ثمود کے بارے میں خبر دی، ان اخبار و حالات میں نسخ نہیں ہوتا؛ کیونکہ وہ تو ایک خبر، ایک واقعہ اور ایک قصہ ہے، ان میں نسخ ہونے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ نسخ جب بھی ہوگا تو وہ کسی حکم یا نہی میں ہوگا۔ اور حکمت و مصلحت کا تقاضا بھی یہی ہے کہ احکام میں حسب احوال تغیر اور تبدل کیا جاتا ہے۔

نکات:

جیسا کہ آج کل ایک بڑا جھگڑا چلا ہوا ہے لوگوں میں کہ یہ بنیاد پرست ہے، یہ نہیں ہے۔ یہ اصطلاح آج کل نکلی ہوئی ہے۔ مجھ سے ایک جلسے میں سوال کیا گیا کہ بنیاد پرست کے کیا معنی ہیں؟ میں نے کہا: کوئی بنیاد پرست، کوئی

سورج پرست، کوئی آگ پرست، کوئی دیوتا پرست، کوئی سانپ پرست، کوئی قبر پرست، ہم تو خدا پرست ہیں، ہم کیا جانیں بنیاد وغیرہ کے معنی؟ ہم بنیاد پرست تھوڑی ہیں، ہم تو خدا پرست، خدا کی عبادت کرنے والے لوگ ہیں۔ ہم کسی کی پرستش کا کیا کریں؟

یہ تو ایسے ہے بس ایک عیسائیوں کے زمانے میں ایک اصطلاح تھی Fundamentalism کی، جو انہوں نے مسلمانوں کے گلے میں ڈالی ہوئی ہے، یہ دکھانے کے لیے کہ یہ جو پرانے مولوی، پرانے مسلمان اور پکے قسم کے لوگ ہیں، یہ بالکل ادھر اُدھر ہٹنا نہیں چاہتے، یہ بنیاد پرست ہیں، یہ بڑے خطرناک ہیں۔ اصل میں یہ اصطلاح عیسائیت کے اندر تھی، اس کا اسلام سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔ اور مسلمان تو ہوتا ہی خدا پرست ہے، وہ تو کسی اور کی پرستش کا تصور بھی نہیں کرسکتا، سوچ ہی نہیں سکتا۔ ہم جب کعبے کی طرف رخ کرتے ہیں تو یہ صرف جہت کعبہ ہے، ہم سجدہ تو اپنے خدا کو کر رہے ہیں۔

پتھر کی پوجا کے جواز کے لیے ہندوؤں کا مسلمانوں پر اعتراض:

بعض ہندو مسلمانوں پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ دیکھو جی! اگر ہم پتھر کو سجدہ کرتے ہیں تو مسلمان بھی تو پتھر کی بنی ہوئی عمارت کو سجدہ کرتے ہیں؟

یہ خیال غلط ہے۔ اگر بالفرض محال آج اس کعبے کی عمارت نہ ہو تو کیا ہم نماز چھوڑ دیں گے؟ جب یہ کعبہ تعمیر ہو رہا تھا تو تعمیر سے پہلے باقاعدہ گرا دیا گیا تھا، زمین کے برابر ہو گیا تھا، لوگ کیا نماز پڑھنا چھوڑ گئے تھے؟ کہ پتھر ہمارے سامنے نہیں ہے یا جب ہم ہوائی جہاز میں سفر کر رہے ہوتے ہیں، نماز پڑھ رہے ہوتے ہیں تو کیا کعبہ ہمارے سامنے ہوتا ہے؟ تو اگر ہم پتھر کے پجاری ہوتے تو وہاں بھی ہم پتھر کا ایک بت کھڑا کر کے نماز پڑھتے۔ کیا اسی طرح ابھی بھی مسجد حرام کی تیسری منزل کی چھت پر کھڑے ہو جائیں تو کعبہ تو نیچے رہ جاتا ہے اور ہم کعبے سے اونچے کھڑے ہوتے ہیں۔ لہٰذا بات صاف سمجھ آ گئی کہ مسلمان پتھر کی پوجا نہیں کرتا، وہ تو اللہ کے حکم پر اللہ کا سجدہ کرتا ہے اور سجدہ کے لیے نماز میں رخ کرنے کے لیے اللہ نے ایک مرکز بنا دیا ہے کہ آخر مسلمانوں کی توجہ کا بھی تو کوئی مرکز، کوئی جہت ہو۔ ایسا تو نہ ہو کہ ایک آدمی اِدھر منہ کرلے اور ایک اُدھر منہ کرلے۔ چار آدمی مختلف جہتوں میں نماز پڑھیں تو یہ ایک تماشا سا لگے گا۔ اللہ نے ایک مرکز، ایک قبلہ بنا دیا ہے، یہ وہ مرکزیت ہے، یہی وہ

اجتماعیت ہے اور یہی وہ امتیاز ہے جو دشمن سے برداشت نہیں ہوتا۔ جب نماز کا وقت آئے، مسلمان دنیا کے کسی علاقے میں ہوں، سب کعبے کی طرف متوجہ ہو کر نماز پڑھتے ہیں۔

﴿فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ﴾ [البقرۃ: ۱۴۴]

والی آیت جب اُتری جو نبی کریم ﷺ اور صحابہ رضی اللہ عنہم کو علم ہوا تو بعض علماء نے فرمایا کہ اس سے یہ بات سمجھ آئی کہ ہمارے علم میں تو نسخ کا علم اس حکم کے نزول کے بعد آیا، لیکن اللہ کے علم میں تو پہلے تھا کہ کس زمانہ میں کس دن تک بیت المقدس قبلہ رہے گا، اس کے بعد قبلہ کب کعبہ بنے گا۔ اس کے علم میں یہ سب چیزیں پہلے سے موجود تھیں تو صرف یہ ہمارے لیے ایک نئی چیز بن گئی۔

اگر کوئی مریض ایک ڈاکٹر کے پاس آیا، اس نے اس کا چیک اپ کیا، مرض کی تشخیص کی، اس کا درجہ حرارت دیکھا، بلڈ پریشر دیکھا، ایکسرے وغیرہ کروائے، پھر ایک نسخہ تجویز کیا اور ڈاکٹر نے اسی وقت ذہن میں یہ فیصلہ کر لیا کہ میں نے پانچ دن کے لیے اس کو یہ دوائی دینی ہے، پانچ دن کے بعد میں نے یہ دوائی دینی ہے اور دس دن کے بعد اس کو میں نے پھر اس دوائی پر لانا ہے اور دو مہینے کے بعد میں نے پھر اس کو یہ دوائی دینی ہے۔ پھر تین مہینے کے بعد کورس مکمل ہو جاتا ہے۔

اب ہمیں جب دوا دیتا ہے تو ہمیں اس وقت پتہ چلتا ہے کہ گولی بدل گئی، کل ہمیں دوسری گولی دی گئی اور آج اور دی گئی، اس لیے ہم کہتے ہیں کہ پہلی گولی بدل گئی اور دوسری آ گئی، کیونکہ ہمیں علم نہیں ہوتا اور پھر اس پر اعتراض بھی نہیں کرتے، بلا چوں چرا اس وہ دوائی استعمال کرتے ہیں۔ تو اللہ کے علم میں یہ چیز پہلے سے تھی، کعبہ بیت المقدس کب تک قبلہ رہنا ہے اور اس کے بعد ہم نے اس کو کب منسوخ کر دینا ہے۔

ناسخ و منسوخ کے علاوہ ایک قسم یہ ہے کہ حکم نہیں تھا، حکم آیا ہی بعد میں۔ وہ علیحدہ مسئلہ ہے۔ جیسے پردہ کا حکم پہلے نازل نہیں ہوا تھا۔ حضور اکرم ﷺ کے گھر میں بھی صحابہ آتے تھے، کھانا کھاتے تھے، حضور اکرم ﷺ بھی صحابہ کے گھروں میں جاتے تھے تو کوئی پردہ نہیں ہوتا تھا۔ اللہ نے جب پردہ کا حکم نازل کر دیا تو اب حضور اکرم ﷺ نے اپنے خادم حضرت انس رضی اللہ عنہ کو بھی منع فرما دیا کہ آج کے بعد تم میرے گھر میں داخل نہیں ہو سکتے، اللہ نے پردے کا حکم دے دیا۔ حالانکہ حضور اکرم ﷺ کی جتنی بیویاں ہیں، وہ اُمت کے لیے ماں کا درجہ رکھتی ہیں۔ ماں

بھی ایسی نہیں کہ زبانی کلامی، بلکہ اللہ نے قرآن میں فرمایا کہ میرے نبی ﷺ کی جتنی بیویاں ہیں، وہ اُمت کی مائیں ہیں۔

اُمہات المؤمنین کا لقب صرف نبی ﷺ کی ازواج کے لیے:

یاد رکھیں! اللہ نے جو اُمت کے لیے ماں کا حکم دیا ہے، یہ حکم صرف نبی ﷺ کی بیوی کو حاصل ہے۔ نبی ﷺ کی بیٹیوں کو بھی یہ مرتبہ حاصل نہیں ہے۔

مسئلہ سمجھیے! ان بیویوں کی اولاد کو بھی یہ مرتبہ حاصل نہیں؛ کیونکہ اگر ان کو یہ مرتبہ حاصل ہو تو جب نبی ﷺ کی بیوی ہماری ماں بنی تو ان کی بیٹی ہماری کیا بنے گی؟ تو پھر بہن سے تو نکاح نہیں ہو سکتا، پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کا نکاح کیسے ہوا؟ حضرت عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ کا نکاح کیسے ہوا؟ تو پھر یہ حکم صرف اسی تک محدود ہے۔ ﴿وَأَزْوَاجُهُ أُمَّهَاتُهُمْ﴾ [الاحزاب:٦] تو اللہ نے یہ مرتبہ نبی ﷺ کی بیویوں کو دے دیا۔ اس کی حکمت کیا ہے؟ اس کی کئی حکمتیں ہیں:

افسوس یہ ہے کہ آج بھی دنیا میں اسلام کے نام سے بہت ملک ہیں، اپنے آپ کو اسلامی ملک کہلاتے ہیں، نام بھی انہوں نے بڑے خوبصورت رکھے ہیں اور اپنے آپ کو اسلامی بھی لکھتے ہیں، ان میں سب کچھ ہے، نہیں ہے تو اسلام نہیں ہے۔ حالانکہ اگر آپ غور کریں! اسلامی ملک وہ ہوتا ہے جہاں اسلام ہو، جہاں اسلام کی حکمرانی ہو، جہاں اسلام کا قانون چلتا ہو، جہاں اسلام بحیثیت دستور کے، بحیثیت ضابطہ حیات کے نافذ ہو، وہاں اس ملک کو آپ اسلامی کہیں، وہاں آپ کہہ سکتے ہیں کہ مسلمانوں کا ملک ہے، یعنی اس میں تو مسلمان رہتے ہیں۔ لیکن جہاں تک اسلامی حدود کا تعلق ہے، جب تک وہ نافذ نہ ہوں تو اس وقت تک ہمیں صحیح معنوں میں اسلام کا ملک کہلانے کا حق نہیں پہنچتا۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ چونکہ مسلمان حاکم ہوتے ہیں تو اس وجہ سے ہم اسلامی کہہ دیتے ہیں، وہاں نماز، روزہ بھی ہوتا ہے، مسجدیں بھی ہوتی ہیں، قرآن بھی پڑھا جاتا ہے، اس نسبت کے ساتھ اسلامی کہہ دیا جاتا ہے، ورنہ حقیقی معنوں میں اسلامی ملک وہ ہوتے ہیں جہاں اسلام نافذ ہو۔

اور یہ بھی آپ یقین کر لیں! آپ ساری دنیا کے نظام کو کنگھال ڈالیں، آپ ساری دنیا کے فلسفے کو اپنا کر دیکھ لیں، آپ ساری دنیا کے چاہے جمہوری نظام ہو یا سیکولر نظام ہو، چاہے وہ شیوعیین ہو، سوشلسٹ ہوں یا جمہوریت پسند ہوں، چاہے وہ پارلیمانی ہوں یا صدارتی ہوں، آپ ساری دنیا کے نظاموں کو دیکھ لیں، اس قوم کو، انسانیت کو،

اولادِ آدم کو امن نہیں ملے گا، جب تک وہ محمد مدنی ﷺ کے قانون کو نہیں اپنائیں گے۔ بندوں کے بنائے ہوئے قوانین ہیں، بندے توڑ ڈالتے ہیں، ایک انسان قانون بناتا ہے تو دوسرا اسے توڑنے کا راستہ نکال لیتا ہے۔ ایک پارلیمنٹ میں ایک قانون پاس ہوتا ہے تو اس سے زیادہ اچھا دماغ رکھنے والے آدمی اس کو توڑ بھی دیتے ہیں۔ اگر، مگر، کیونکہ، چونکہ، چنانچہ، ہیں، ہی، بھی کے فرق بھی نکال لیتے ہیں اور ان کا حلیہ بگاڑ دیتے ہیں۔ یہ اللہ کا نظام ہے جس میں انسانوں کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ اس میں زیر زبر کی کوئی تبدیلی کریں۔ اور پھر ساری دنیا کے نظام جرم ختم نہیں کرتے، وقتی طور پر ایک انسداد ہوتا ہے، لیکن جرم ختم نہیں ہوتا۔ جیسے انگریزی کی دوائی بیماری کو ختم نہیں کرتی، اسی طرح انگریز کا قانون بھی اصل روحانی بیماری کو ختم نہیں کرتا۔ آپ بیمار ہوں گے، ڈاکٹر کے پاس جائیں گے تو وہ کوئی اینٹی بائیوٹک تجویز کر دیتا ہے کہ جناب! آپ کو نزلہ ہے، فلاں کیپسول کھالیں تو نزلہ ختم ہو جائے گا، لیکن ان شاء اللہ پھیپھڑے تباہ ہو جائیں گے، اور اگر کوئی دوائی پھیپھڑے ٹھیک کرنے کے لیے دے گا تو ان شاء اللہ ٹھیک ہو جائیں گے، لیکن جگر ڈیمج ہو جائے گا، اگر وہ جگر ٹھیک کرنے کی دوائی دے گا تو جگر تو ان شاء اللہ ٹھیک ہو جائے گا، مگر دماغ پر اثر ہو جائے گا: کیونکہ وہ تو جراثیم کو زور سے مارنے کی کوشش کرتا ہے، اس بیماری کو جڑ سے نہیں کاٹتا۔ اسی طرح یہ قانون ہے جو برائی کو ختم نہیں کرتا، زنا کو ختم نہیں کرتا، ڈاکہ کو ختم نہیں کرتا اور اسلام کا قانون یہ ہے کہ جرم ختم کر دیتا ہے۔ مثلاً ہاتھ اگر اتنا لمبا ہو گیا ہے کہ دوسرے کے گھر میں چلا گیا ہے تو اس کو ختم کرو، ایسے ہاتھ کو دنیا میں زندہ رہنے کی ضرورت کیا ہے جو دوسروں کے گھر میں داخل ہو جاتا ہے، دوسرے کی جیب میں داخل ہو جاتا ہے، اور پھر ایسے بندے کو دنیا میں زندہ رہنے کا کیا حق حاصل ہے جو دوسرے کی بیوی کی عزت لوٹتا ہو۔ تو اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جب دو چار اسلام کی سزائیں نافذ ہو جاتی ہیں تو پوری دنیا میں امن قائم ہو جاتا ہے۔

ناسخ القرآن میں حکمت:

جن کا اللہ پر ایمان ہے، وہ سمجھتے ہیں کہ جو اللہ نے حکم منسوخ کیا ہے اس میں بھی حکمتیں ہیں اور جو اللہ نے حکم باقی رکھا ہے اس میں بھی حکمتیں ہیں، اللہ کے نبی ﷺ کی احادیث مبارکہ ہیں اس میں بھی حکمتیں ہیں، تاکہ لوگ یہ نہ کہیں کہ جو قرآن میں ہے، ہم تو صرف وہی مانیں گے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی خدمت میں ایک عورت آئی اور پوچھنے لگی کہ آپ نے جو فلاں حکم دیا ہے، میں نے قرآن پڑھا ہے، لیکن قرآن میں تو نہیں ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ بی بی! قرآن میں ہے۔ اس نے کہا: حضرت! میں نے سارا قرآن پڑھا ہے، الحمد للہ! میں

ایک عرب عورت ہوں اور سمجھنے والی ہوں، قرآن میں یہ حکم نہیں ہے۔ آپ نے فرمایا کہ تم نے قرآن پڑھا ہی نہیں ہے، اگر تم نے قرآن پڑھا ہوتا تو یہ اعتراض نہ کرتی؛ کیونکہ قرآن کہتا ہے:

﴿وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۗ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝﴾ [الحشر:۷]

نسخ میں کئی مصلحتیں ہیں، کبھی یہ ہوتا ہے کہ پہلے جو حکم تھا، اس کے بعد جو حکم آیا وہ ثواب میں باعتبار پہلے کے زیادہ انفع تھا، یا پہلے جو حکم تھا اس میں شدت تھی اور بعد میں جو حکم آیا اس میں نرمی، رحمت اور بندوں کے لیے آسانی ہوگئی۔ وغیرہ۔

نسخ کے معنی کے متعلق علماء کے اقوال:

اسی لیے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ نسخ کا معنی یہ ہے کہ ہم کوئی آیت تبدیل کر دیتے ہیں۔ اسی طرح حضرت مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ہم اگر کسی آیت کو مٹا دیتے ہیں۔ ابن ابی نجیح نے مجاہد رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے اور یہی عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے اصحاب سے بھی مروی ہے کہ ﴿مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ﴾ کا مطلب یہی ہے کہ بعض اوقات ﴿مِنْ اٰيَةٍ﴾ لکھے ہوئے حروف قرآن میں باقی ہیں، لیکن حکم بدل جاتا ہے۔

ابو حاتم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: کچھ دیر کے لیے ایک چیز کا چھوڑ دینا اور حکم نہ بھیجنا۔ اور سدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کا معنی کسی چیز کو روک لینا ہے۔ ابن ابی حاتم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس کا معنی اُٹھالینا ہے، یعنی جیسے اللہ نے پہلے آیت نازل کی تھی کہ جب شادی شدہ مرد اور شادی شدہ عورت زنا کریں تو انہیں رجم کر دیا جائے اور اسی طرح حدیث میں ہے: "لَوْ كَانَ لِابْنِ آدَمَ وَادِيَانِ مِنْ ذَهَبٍ لَأَحَبَّ أَنْ يَكُونَ لَهُ ثَالِثٌ" [جامع ترمذی، رقم: ۲۳۳۷] (ابن آدم کو اگر اللہ تبارک وتعالیٰ دو سونے کی وادیاں دے دے تو وہ چاہے گا کہ مجھے تیسری بھی ملے)۔

دو حریص، جن کا پیٹ کبھی نہیں بھرتا:

(حدیث) اسی طرح حدیث پاک میں آتا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: دو حریص دنیا میں ایسے ہوتے ہیں جن کا پیٹ کبھی نہیں بھرتا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "مَنْهُومٌ فِي الْعِلْمِ لَا يَشْبَعُ مِنْهُ وَ مَنْهُومٌ فِي الدُّنْيَا لَا يَشْبَعُ مِنْهَا" [سنن الدارمی، رقم: ۳۴۰] ایک علم کا حریص، وہ کبھی سیر نہیں ہوتا، اسے حرص ہوتا ہے کہ میں یہ بھی پڑھ لوں اور یہ بھی پڑھ لوں، میں یہ کتاب بھی خرید لوں اور یہ بھی خرید لوں، اور اسی طرح فرمایا کہ جن لوگوں کو دنیا کی حوس پڑ گئی، ان کا

پیٹ دنیا سے کبھی نہیں بھرتا۔ جب ہزار نہ ہوں تو کہتے ہیں: بس بھئی! ہزار مل جائیں تو کام چل جائے گا، اور جب ہزار مل جائے تو کہتے ہیں: یار! ہزار سے کیا بنتا ہے؟ آج کل تو پیسے کی قیمت نہیں ہے، لاکھوں ملیں تو پھر گاڑی چلے گی۔ اب چاہے لاکھوں بھی مل جائیں تو لاکھوں سے کیا بنتا ہے؟ ہمیں تو کروڑوں ملنے چاہئیں۔ اسی طرح آقائے نامدار خاتم الانبیاء ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ابن آدم کا پیٹ کسی چیز سے نہیں بھرے گا، مانگتا ہی رہے گا، لیکن جب قبر میں جائے گا تو پھر مٹی سے بھر جائے گا، اس وقت تمنا خود بخود ختم ہو جائے گی۔

ابن جریر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: نسخ کا معنی یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ چاہیں تو کسی حلال چیز کی حرمت بیان فرمادیں یا کسی حرام چیز کو حلال فرمادیں۔ چونکہ سب تحلیل وتحریم اللہ کے ہاتھ میں ہے، اس میں بندے کو اختیار نہیں ہے۔ جن کا استعمال مباح تھا ان کو روک دے اور جن سے روکا تھا ان کو مباح کردے۔

نسخ کے اور بھی اقوال:

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ نسخ کے اور معانی بھی ہیں، ایک نسخ کا معنی یہ ہوتا ہے کہ دلیل شرعی جب مل جائے تو پہلا حکم اُٹھالیا جائے، کبھی یہ حکم ہوتا ہے کہ آسان کے بدلے ثقیل آجائے، کبھی حکم ثقیل تھا، پھر خفیف آگیا۔

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر آپ نے نسخ کے انواع وشروط کے احکام دیکھنے ہوں تو اصولِ فقہ کی کتابیں دیکھیں، آپ کو ساری تفصیل مل جائے گی؛ کیونکہ تفسیر میں اتنا ذکر کیا جاتا ہے جتنا آیت کے سمجھنے کے لیے ضروری ہوتا ہے؛ باقی تفصیلات اور اس کے احکامات کے لیے ماشاء اللہ باقی الگ الگ کتابیں موجود ہیں۔ یہ احکام دیکھنے ہوں تو اصولِ فقہ میں ملیں گے۔

روایت میں ہے کہ دو آدمی تھے، ان کو حضور اکرم ﷺ نے دو آیتیں پڑھائی تھیں، دونوں آیات وہ یاد کرتے تھے اور پڑھا کرتے تھے۔ ایک رات جب وہ دونوں آیات یاد نہ رہیں اور وہ نہ پڑھ سکے۔ جب صبح ہوئی تو انہوں نے حضور پاک ﷺ کی خدمت میں عرض کیا کہ یا رسول اللہ! ہم اتنے عرصے تک یہ آیات پڑھتے رہے اور اب ہمیں بالکل بھول گئیں۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ یہ آیات ان آیات میں سے ہیں جو اللہ نے خود بھلوادی ہیں، بس اب آپ خود ان سے غافل ہو جائیں، ان کی طرف توجہ نہ کریں۔

﴿نُنسِهَا﴾ کی قراءتیں:

﴿اَوْ نُنْسِهَا﴾ کو بھی دو طرح سے پڑھا گیا ہے، "نَنْسَاهَا" اور "نُنْسِهَا"۔ جن کے نزدیک "نَنْسَاهَا" ہے، ان

کے نزدیک تو اس کا معنی "نُؤَخِّرُهَا" ہے، یعنی ایک چیز کو پیچھے کر دیا۔

علی بن ابی طلحہ رحمۃ اللہ علیہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ﴿فَانَنْسَخْ مِنْ اٰیَۃٍ اَوْ نُنْسِہَا﴾ کے بارے میں نقل کرتے ہیں کہ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم آیت کو نہ بدلتے ہیں اور نہ اس کو چھوڑ دیتے ہیں۔ امام مجاہد رحمۃ اللہ علیہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے اصحاب سے نقل کرتے ہیں: "أَوْ نَنْسَاهَا نُثْبِتَ خَطَّهَا وَ نُبَدِّلَ حُكْمَهَا" کہ ہم اس کے خط کو ثابت رکھتے ہیں اور اس کے حکم کو بدل دیتے ہیں۔ اور "نُنْسِہَا" کی قراءت کے مطابق حضرت معمر رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے یہ مطلب بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو جو چاہیں بھلا دیں۔ جیسے اللہ نے قرآن میں دوسری جگہ فرمایا: ﴿سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰۤى ۙ﴾ [الاعلیٰ:۶] کہ اے ہمارے نبی! آپ کو ایسا پڑھا دیں گے کہ آپ کبھی نہیں بھولیں گے، لیکن اللہ جو چاہیں وہ بھلوا دیں اور ذہن سے اٹھا لیں۔ جیسے لیلۃ القدر کی تعیین آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھلا دی گئی۔

بہترین قاری اور بہترین قاضی:

"عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ عُمَرُ: أَقْرَأُنَا أُبَيٌّ وَ أَقْضَانَا عَلِيٌّ." [عمدۃ القاری شرح صحیح البخاری]

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ سب سے بہتر قاری اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ ہیں اور بہتر فیصلہ (قضا) کرنے والے حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ "أَقْضَانَا عَلِيٌّ" اللہ تعالیٰ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو فیصلہ کرنے والا بنایا ہے، یعنی اللہ نے ان کو فیصلے کا بڑا علم دیا ہے۔ حضرت اُبی رضی اللہ عنہ کو اللہ نے قرآن پڑھنے کا علم دیا ہے۔ لیکن کبھی کبھی ہم حضرت اُبی رضی اللہ عنہ کی بعض چیزوں کو چھوڑ بھی دیتے ہیں؛ کیونکہ حضرت اُبی رضی اللہ عنہ کی عادت مبارک ہے کہ وہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے جو سنتے تھے اسے نہیں چھوڑتے تھے، بعض چیزیں جب منسوخ بھی ہو گئیں اور بعض چیزوں کو جبکہ احکام ختم ہو گئے تو بھی پڑھتے تھے۔

حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ کے ہاں نسخ کی تفسیر:

حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ نے اللہ تعالیٰ کے فرمان ﴿نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَاۤ اَوْ مِثْلِهَا﴾ کے بارے میں فرمایا کہ مکلفین

کہ مصلحت کے اعتبار سے دوسرا حکم بہتر ہے۔

حضرت علی بن ابی طلحہ رضی اللہ عنہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس آیت کے بارے میں نقل کیا ہے کہ اللہ جو دوسرا حکم دیتے ہیں، وہ نفع میں زیادہ ہے اور تمہارے لیے اللہ کی طرف سے زیادہ مہربانی اور نرمی ہے۔

اور سدی رحمہ اللہ اس آیت کے بارے میں فرماتے ہیں: ہم اس سے بہتر لاتے ہیں جس کو ہم نے منسوخ کر دیا یا اس کی مثل لاتے ہیں جس کو ہم نے چھوڑ دیا۔

نسخ کی حکمتیں:

اس میں کئی حکمتیں ہیں، لیکن یہ بھی ضروری نہیں کہ ہمیں ہر حکمت سمجھ میں آئے، کچھ چیزیں ہماری سمجھ میں نہیں آتیں، آدمی اب ہر وقت اسی بات میں لگا رہے کہ جی! بکری تو حلال ہے اور سُور حرام ہے اور اس کو حلال کیوں کیا؟ اور اس کو حرام کیوں کیا؟ تو آسان مسئلہ یہی ہے کہ اللہ دونوں کو پیدا کرنے والا ہے، مالک ہے، ہمیں پیدا کرنے والا ہے، مالک ہے، اس نے ہمارے لیے جو حلال کیا وہ ہمارے لیے حلال ہے، اس نے ہمارے لیے جو حرام کیا وہ ہمارے لیے حرام ہے۔ زیادہ بحث میں اُلجھنے کی ضرورت نہیں، ہمارا کام صرف یہ ہے کہ ہم اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے حکم کے آگے سر جھکا دیں۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ جس کو حرام کیا، اس میں ضرور کوئی حکمت ہے۔ یہ دیکھو جی! خنزیر کو اللہ نے حرام کیا، جو اقوام اس کا گوشت کھاتی ہیں، اب انہوں نے بھی اعتراف کرلیا ہے کہ خنزیر کے گوشت کھانے سے فلاں بیماری پیدا ہوتی ہے، آدمی کی غیرت ختم ہوجاتی ہے، اس کے گردے ختم ہوجاتے ہیں، آدمی کی فلاں چیز ختم ہوجاتی ہے۔ خنزیر وہ واحد جانور ہے جس میں غیرت نہیں ہوتی، چنانچہ جتنے لوگ اس کا گوشت کھائیں گے اسی صفت کے ہوجائیں گے۔ اس لیے اب انہوں نے یہ خود اعتراف کرلیا ہے، یعنی کافروں نے خود مان لیا کہ اس کے کھانے سے ایڈز ہوسکتی ہے، اس کے کھانے سے کینسر اور فلاں بیماریاں لاحق ہوسکتی ہیں۔ لیکن ہمیں تو ایک ہی بات پر ایمان ہے کہ جب حضور اکرم ﷺ نے فرمادیا کہ حرام ہے اور میرے اللہ نے فرمادیا کہ حرام ہے تو بات ختم ہوگئی۔ کیونکہ جب ہمارا ایمان ہے کہ اللہ کی مخلوق میں سب سے افضل کون ہے؟ محمد ﷺ۔ سب سے بڑے علم والے کون ہیں؟ محمد رسول اللہ ﷺ۔ سب سے بڑے عقل والے کون ہے؟ محمد رسول اللہ ﷺ۔ سب سے بڑے فہم والے کون ہیں؟ محمد رسول اللہ ﷺ۔ جب انہوں نے فرمادیا کہ میرے اللہ نے یہ حرام کیا ہے تو ہماری عقل ان سے بڑی ہو تو ہم بات کریں، جب ہماری کوئی حیثیت ہی نہیں ہے تو ہم حضور

اکرم ﷺ کے فرمانے پر یقین کریں گے، اس پر ایک تو ہمیں ثواب ملے گا، دوسرا ہم حرام سے بچیں گے۔ہم نے حضور اکرم ﷺ کی اطاعت بھی کر لی اور حرام سے بھی بچ گئے۔

نسب کا ثبوت نکاح سے ہوتا ہے:

دوسری مثال کہ اللہ نے عورت سے نکاح کا حکم دیا تو اب بیوی سے ملنا صرف حلال نہیں، بلکہ ثواب ہے۔علماء نے لکھا ہے کہ اگر کوئی خاوند اپنی بیوی کے ساتھ کھیل کود میں مصروف رہے تو نفل پڑھنے سے زیادہ ثواب ہے۔ چونکہ نفلیں پڑھنے سے تو ثواب ہی ملے گا، جبکہ بیوی سے ملنے میں گناہوں سے بھی بچے گا، زنا سے بھی اور حرام سے بھی بچے گا۔اس میں اللہ نے حلال کر دیا، باقی کو حرام کر دیا، تو اس حلت وحرمت کے بارے میں ہمارا ایمان ہے کہ جو حلال کیا ہے اس میں حکمت ہے اور جو حرام کیا ہے اس میں بھی حکمت ہے۔

نکاح میں بھی بہت ساری حکمتیں ہیں:

اب وہ لوگ جن کے نزدیک زنا میں کوئی برائی نہیں تھی، اب انہوں نے بھی اعتراف کر لیا ہے کہ اگر انسانیت کو بچانا ہے تو اسلام کا قانون نافذ کرو۔اب وہ بھی مان گئے، تنگ آ گئے، جنہوں نے زنا کو عام کر دیا تھا۔سڑکوں میں، پارکوں میں، ہوٹلوں میں زنا، کتوں کی طرح زنا ہو رہا ہے، کوئی روک ٹوک والا نہیں ہے، نتیجہ کیا نکلا کہ سو سال، پچاس سال کے بعد نسل مشتبہ ہو گئی، پتہ ہی نہیں کہ کون کس کا بیٹا ہے؟ نسل ہی ختم ہو گئی، نہ باپ کا پتہ ہے نہ ماں کا پتہ ہے، نہ دادے کا پتہ ہے، نہ چاچے کا پتہ ہے۔نسل کا کیا معنی ہے؟ ان کے اندر کیا ہمدردی آئے گی تو رحم کیسے پیدا ہو گا؟ حقیقی بیٹا تو ہے نہیں، رحم کیسے پیدا ہو؟ مرد خود غیر مطمئن ہے اپنی اولاد سے، پتہ نہیں کہ میری اولاد ہے؟ پتہ نہیں کسی اور کی ہے؟ تو ہمدردی کیسے ہو گی؟ اس لیے وہ بھی اب تنگ آ گئے۔اسی لیے اللہ نے جن چیزوں کو حرام کیا ہے، "لَا شَكَّ فِيْ ذٰلِكَ" ہمارا ایمان ہے کہ اللہ کے اس حرام کرنے میں کروڑوں حکمتیں ہیں، ہمیں سمجھ آئے تو الحمدللہ، نہ سمجھ میں آئے تو ہمارا کام صرف ماننا ہے، ہمارا علم، عقل اور ہماری معلومات بھی ناقص، اللہ کا علم کامل ہے اور اللہ کی ہر صفت میں کمال، جمال اور جلال ہے تو اس کا جو فیصلہ ہے وہ اپنے بندوں کے لیے بالکل حق ہے۔بندے کا کام یہ ہے کہ بلا چوں و چرا اس گردن جھکائے کہ جس کو اللہ نے حلال کیا تو الحمدللہ، اگر حرام کیا تو بھی الحمدللہ، اس میں ہمارے لیے فائدہ ہے۔

ایک حکم کی تبدیلی میں حکمت:

اللہ تعالیٰ حکم کو بدل کر بندوں کا امتحان لیتے ہیں کہ میرے بندے میرے حکم کے تابع ہوتے ہیں یا نہیں؟ ایسا تو نہیں کہ پہلی بات پر کھڑے رہیں گے۔

کعبہ شریف کی تعمیر کتنی بار ہوئی؟

کعبۃ اللہ کی تعمیر کئی مرتبہ ہوئی۔ سب سے پہلے اللہ کے حکم سے فرشتوں نے تعمیر کیا، پھر آدم علیہ السلام نے بنایا، پھر ابراہیم علیہ السلام نے بنایا، پھر قوم عمالقہ نے بنایا، پھر قبیلہ جرہم نے بنایا، یہ تقریباً گیارہ مرتبہ ردّ و بدل ہوئی۔ اب کوئی مسلمان پتھر کا پجاری تو نہیں ہے، ہم تو بس اللہ کے حکم کی تعمیل میں سجدہ کر رہے ہیں، اللہ کا حکم ہے: ﴿فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ﴾ [البقرۃ: ۱۴۴]

ہم مقامِ ابراہیم کے پیچھے نماز کیوں پڑھتے ہیں؟ اس لیے کہ اللہ نے حکم دیا ہے: ﴿وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى﴾ [البقرۃ: ۱۲۵] اس لیے ہمیشہ سب سے پہلے اپنے عقائد کی اصلاح کریں۔

مفسر رحمہ اللہ، ابن کثیر میں فرماتے ہیں کہ امام ابوجعفر رحمہ اللہ اور ابن جریر رحمہ اللہ نے ارشاد فرمایا کہ اس آیت ﴿اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۗ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿١٠٧﴾﴾ [البقرۃ: ۱۰۷] میں خطاب حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے اور اس کے بعد ساری اُمت کے لیے ہے۔ اس میں اللہ نے فرمایا کہ اے محمد! کیا آپ نہیں جانتے کہ آسمانوں اور زمینوں کا مالک میں ہوں اور اس میں میرا حکم چلتا ہے، آسمانوں اور زمینوں میں مَیں جو چاہوں حکم کروں اور جس چیز سے چاہوں تغیر و تبدل کروں۔ اگر کوئی آدمی ہمارے احکام منسوخ کرنے پر اعتراض کرتا ہے کہ پہلا حکم کیوں منسوخ کر دیا؟ تو یہ اس کی جہالت ہے؛ کیونکہ تکوینی طور پر بھی جب ساری کائنات کا میں مالک ہوں، مجھے اپنی کائنات میں تغیر اور تبدل کا حق ہے، میں چاہوں تو رات کر دوں، میں چاہوں تو دن کر دوں، میں چاہوں تو روشنی کر دوں اور میں چاہوں تو اندھیرا کر دوں۔ اگر ان تمام چیزوں میں تکوینیات کے طور پر میرا ہی اختیار ہے، آسمان اور زمین بھی میرے ہیں اور ان کے اندر تمام مخلوق بھی میری ہے تو پھر اگر میں اپنے ارادے سے کوئی حکم بدل دوں تو کسی کو اعتراض کرنے کا کیا حق ہے؟ اعتراض تو تب کرے جب کسی دوسرے کی ملکیت میں کوئی تصرف کرے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے تقدیر کے متعلق مسئلہ پوچھنے کا واقعہ:

ایک شخص حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں آیا اور اس نے کہا: اے علی! مجھے ایک مسئلہ سمجھ نہیں آتا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے پوچھا: کون سا مسئلہ ہے؟ اس نے جواب دیا کہ تقدیر کا مسئلہ ہے...... تقدیر کا مسئلہ بہت پیچیدہ ہے کہ آدمی اس میں زیادہ نہ اُلجھے؛ کیونکہ بسا اوقات ہم اپنی جہالت کی وجہ سے مسئلہ کو صحیح سمجھ نہیں سکتے اور آدمی کا ایمان (نعوذ باللہ) متزلزل ہو جاتا ہے...... کہنے لگا: اللہ تعالیٰ نے اس آدمی کو تو ایمان والا بنا دیا اور اس کے بھائی کو کافر بنا دیا، ایمان والے کو جنت میں اور اس کے بھائی کو جہنم میں بھیج دیا۔ ایک ہی باپ کے تو دو بیٹے ہیں، دونوں کے ماں باپ ایک ہیں۔ یا مثال کے طور پر ابو جہل لعنۃ اللہ علیہ تو جہنم کا سردار بن گیا اور اس کا بیٹا عکرمہ رضی اللہ عنہ جنت کا سردار بن گیا۔ اللہ نے ایسا کیوں کر دیا؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بڑی پیاری بات کی، آپ نے فرمایا: پہلے یہ بتاؤ کہ یہ دونوں بندے اللہ نے بنائے ہیں یا تم نے بنائے ہیں؟ اس نے کہا کہ بنائے تو اللہ ہی نے ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یہ مخلوق تمہاری مِلک ہے یا اللہ کی مِلک ہے؟ اس نے کہا: اللہ کی مِلک ہے، ہمارا کیا ہے، ہم تو کچھ بھی نہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا: اگر وہ اپنی مِلک میں جو چاہے اس کی مرضی۔ تم تب اعتراض کرو کہ تمہاری مِلک میں اللہ نے کوئی ایسا فیصلہ کیا ہو، تمہیں اچھا نہ لگتا ہو۔ اگر وہ اپنی مِلک کے اندر تصرف کر رہا ہے تو وہ جانتا ہے کہ یہ جنت کے لائق ہے اور یہ جنت کے لائق نہیں ہے۔ بنانے والا جانتا ہے، ہمیں اس کے بارے میں کیا پتہ ہے، ہم تو اس کی ظاہری صورت کو دیکھ رہے ہیں، حقیقت جو ہے وہ تو صرف اللہ کے علم میں ہے، اس کے باطن کا پتہ تو اللہ کو ہے۔

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اگرچہ یہ خطاب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے، لیکن سارے معترضین اور یہودیوں کو اس میں جواب دیا ہے۔

تورات کے بعد قرآن کو کیوں بھیجا گیا؟

ان کا ایک اعتراض یہ بھی تھا کہ اللہ نے تورات کے بعد یہ کتاب کیوں بھیج دی؟ پہلا حکم صحیح تھا تو دوسرا غلط ہے اور دوسرا صحیح تھا تو پہلا غلط کیوں ہے؟ اللہ کے احکام میں کبھی تناقض نہیں ہو سکتا، اللہ بھولنے اور نسیان سے پاک ہے تو اللہ دوسرا حکم کیوں دیتے ہیں؟ ان کو یہ سمجھایا کہ بدبختو! بادشاہ مصلحت کے مطابق جیسے احکام چاہتے ہیں نازل فرماتے ہیں۔ یعنی یہ تو ہمارے اوپر اللہ کا رحم ہے کہ اللہ نے اپنے احکام میں ہمارے اوپر نرمی فرما دی، ورنہ اگر وہی

حکم باقی ہوتا جو شروع میں اللہ نے پچاس نمازوں کا دیا تھا تو کیا حال ہوتا؟ یہ تو حضور اکرم ﷺ کی درخواست پر پانچ پانچ معاف ہو کر پانچ رہ گئیں۔ آپ نے حال دیکھا ہے کہ لوگ اب پانچ نمازیں بھی نہیں پڑھتے، آپ نے دیکھا ہے کہ کتنے لوگ ہیں جو صحیح معنوں میں اللہ کی نماز ادا کرتے ہیں، آپ نے اپنے ملک میں دیکھا ہوگا کہ فجر کی نماز میں مسجدوں میں ایک صف بھی کامل نہیں بنتی اور پھر ظہر میں ماشاء اللہ ان کے کاروبار کا وقت ہوتا ہے، عصر میں ان کے سونے کا وقت ہوتا ہے، مغرب میں لوگوں کے واپس گھر جانے کا وقت ہوتا ہے اور عشاء کو تو ویسے بھی گھر سے نہیں نکلتے، لہٰذا مسجدیں ویران ہیں۔

یاد رکھو کہ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کا فتویٰ ہے کہ جو شخص ایک نماز جان بوجھ کر چھوڑ دے، کوئی عذر بیماری کچھ نہیں تھا، تندرست تھا اور بغیر کسی عذر کے اس نے نماز چھوڑ دی تو اس نے کفر کیا۔

یاد رکھو! جو لوگ یہاں عمرے پر آئے ہوئے ہیں، انہیں اب عمرہ کرنا ہے اور بڑی تمنا ہے کہ حج کریں اور حرم میں بھوکے، پیاسے پڑے رہیں گے، لیکن اگر کوئی فرض نماز چھوڑ دی تو ایسے حج اور عمرے کا کوئی فائدہ نہیں ہے، اس سے بہتر ہے کہ اپنے گھر چلا جائے۔ اگر ایک فرض نماز چھوڑ کر حج اور عمرہ کرے تو اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ حج کا حکم جبرائیل علیہ السلام لے کر آئے اور نماز خود حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ لائے، حج استطاعت والے پر فرض ہے، بشرطیکہ اس کے ساتھ قانون کی پابندی اور رکاوٹ بھی نہ ہو، اس پر حج فرض ہے، لیکن نماز ہر مسلمان بالغ، غریب، امیر، مرد وعورت پر فرض ہے۔ اگر ایک نماز چھوڑنے کی اتنی بڑی سزا ہے تو جو پڑھتے ہی نہیں، ان کا کیا ہوگا؟ اس لیے میرے بھائی! اگر آپ کو اللہ نے توفیق دی ہے سب سے پہلے اپنی نمازوں کا خیال رکھو، ضروری نہیں ہے کہ حرم شریف میں آ کر نماز پڑھیں، بلکہ جہاں مسجد قریب ہے وہاں ادا کریں، اللہ توفیق دے تو حرم میں آ جائیں۔ الحمد للہ! حرم کی فضیلت تو دنیا میں کہیں بھی میسر نہیں آ سکتی کہ ساری زندگی ہم جس کعبے کے لیے ترستے رہے، اس کے سامنے اللہ ہمیں کھڑے ہو کر نماز پڑھنے کی توفیق دے دے۔ اس سے بڑی سعادت کیا ہو سکتی ہے، وگرنہ آپ نے نمازوں کی پابندی نہیں کی تو ایک ہزار حج بھی کر لیں تو کوئی فائدہ نہیں۔ ایک ہزار حج ادا کرو اور نماز نہ پڑھو، گھر جانے کے بعد مسجدوں کے اندر نماز کی حاضری نہ دو تو ایسے عمرہ اور حج کا کوئی فائدہ نہیں۔ یہ علامتِ قیامت ہے۔

ایک روایت میں ہے کہ ایک وقت آئے گا، مولوی شہرت کے لیے حج کریں گے اور امیر سیر و سیاحت کے لیے حج کریں گے اور درمیانی طبقہ تجارت کے لیے حج کرے گا، غریب بھیک مانگنے کے لیے حج کرے گا۔ ایمان سے کہیں

کہ آج وہ وقت آ گیا ہے یا نہیں؟ لوگ ہر سال آ جاتے ہیں، جن کے گھر میں ماشاء اللہ روٹی بھی نہیں پکتی، کیا خیال ہے کہ ان کو کعبہ شریف کا شوق ہے؟ انہیں صرف مانگنے کا شوق ہے، ہر سال وہاں سے آتے ہیں بیس ہزار خرچ کر کے، یہاں سے ایک لاکھ بھیک اکٹھی کر کے لے جاتے ہیں، گھاٹے کا سودا ہے بھلا؟ اسی ہزار بھی بچ گیا اور لوگوں نے کہا کہ ہاں جی! بڑا مقبول آدمی ہے کہ اللہ ہر سال گھر بلاتا ہے، اللہ کا پیارا ہے۔ اللہ کے بندو! اگر اللہ کے پیارے ایسے بنتے ہوتے تو جو مکہ میں پیدا ہوئے تو وہ جہنم میں نہ جاتے۔ جو لوگ پیدا بھی مکہ میں ہوئے، زمزم کی گھٹیاں جنہیں دی گئیں اور جنہوں نے اپنی جوانی اور شباب مکہ میں گزارا، کعبے کے مجاور بھی بنے رہے، کعبۃ اللہ بھی بناتے رہے، لیکن شرک کیا تو سیدھے جہنم میں چلے گئے۔ اس لیے ہمیشہ اللہ کے احکام کی پابندی کریں۔ اگر اللہ نے آپ کو حج نصیب کرنا ہے، حج کے لیے تیاری کریں۔ دوسروں کے حقوق کا خیال رکھیں، اللہ کے فرائض کا خیال رکھیں۔

گناہوں سے بچنے کا خیال رکھیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی سرزمین حرم ہے، علماء نے لکھا ہے کہ یہاں کوئی برائی کا ارادہ بھی کر لے تو اللہ پکڑ لیتے ہیں۔ اکثر علماء کا قول یہ ہے کہ الحاد سے مراد شرک ہے، بے دینی ہے۔ لیکن بعض علماء لکھتے ہیں کہ قرآن کے الفاظ عام ہیں۔ ارشادِ خداوندی ہے:

﴿وَمَنْ يُّرِدْ فِيْهِ بِاِلْحَادٍۢ بِظُلْمٍ نُّذِقْهُ مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝﴾ [الحج:۲۵]

فرمایا کہ جو شخص دوسرے ملک میں گناہ کے ارادے سے جائے تو پکڑا نہیں جاتا، لیکن یہ سرزمین حرم ہے، اتنی عظمت والی جگہ ہے کہ اللہ تعالیٰ گناہ کے ارادہ پر بھی پکڑ لیتے ہیں، اس لیے اپنی زبانوں کو محفوظ رکھو۔ کبھی زبان سے ایسا لفظ نکلتا ہے کہ فوراً پکڑ آ جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے معافی مانگیں۔

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہودیوں نے جو اعتراض کیا کہ اللہ کے احکام نہیں بدل سکتے۔ یہ بات تو عقلاً بھی درست نہیں ہے۔ کوئی جاہل سے جاہل بھی نہیں کہہ سکتا؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ اگر صرف ایک حکم دے سکتا ہو اور دوسرا حکم نہ دے سکتا ہو تو پھر قادر کیسے ہو؟ ''قدیر'' کا تو معنی یہ ہے:

﴿اِنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝﴾ [الحج:۶]

﴿فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ ۝﴾ [ھود:۱۰۷]

﴿يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ ۝﴾ [آل عمران:۴۰]

﴿يَحْكُمُ مَا يُرِيْدُ ①﴾ [المائدة:١]

اس لیے میرے آقا سرکارِ دو عالم ﷺ اکثر یہ دعا کرتے تھے: میرے اللہ! کوئی روکنے والا نہیں جب تُو دینے پہ آئے اور کوئی دینے والا نہیں جب تُو روکنے پہ آئے۔ کسی کو کوئی چیز نفع نہیں پہنچا سکتی۔ حضور پاک ﷺ روزانہ ہر دعا کے بعد یہ دعا فرماتے تھے:

"يَا مُقَلِّبَ الْقُلُوْبِ! ثَبِّتْ قُلُوْبَنَا عَلٰى دِيْنِكَ." [سنن ابن ماجہ، رقم:١٩٩، مسند احمد بن حنبل، رقم:١٧٦٣٠]

اے اللہ! دلوں اور آنکھوں کے پھیرنے والے! ہمیں دین پر قائم فرما۔ کیونکہ تُو جب چاہے دلوں کو پھیر دے، سالہا سال کفر کرنے والوں کو میرے مدنی ﷺ کا صحابی بنا دے اور اگر وہ چاہے تو گنہگاروں کو ولی بنا دے اور چاہے تو پیغمبروں کے بیٹوں کا کافر بنا کر موت سے ہمکنار کر دے۔ کس کو دخل دینے کی طاقت ہے؟ حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے کو اسی وقت غرق کر دیا، اللہ تعالیٰ کی مرضی ہے۔

نسخ کی مثالیں:

یہود کا اعتراض عقلاً بھی غلط ہے اور شرعاً بھی؛ کیونکہ نسخ پہلی کتابوں اور پہلی شریعتوں میں بھی موجود ہے، جیسا کہ آدم علیہ السلام کے زمانے میں اللہ نے حکم دیا تھا کہ آدم و حواء سے جو اولاد پیدا ہو، بیٹے ہوں یا بیٹیاں، ان کا آپس میں نکاح جائز ہے، اب بہن بھائی کا نکاح جائز نہیں ہے، لیکن ابتداء میں اللہ تعالیٰ نے جائز رکھا تھا۔ اس حکم میں بھی حکمتیں تھیں اور بعد میں جب اس نکاح کو حرام کیا گیا تو اس میں بھی حکمتیں ہیں۔ اسی طرح نوح علیہ السلام اور ان کی قوم کے لیے کشتی سے نکلنے کے بعد ہر قسم کے حیوانات کھانا حلال تھا، بعد میں کئی حیوانات کو حرام کر دیا گیا۔ دو بہنوں کو ایک وقت میں ایک شخص کے نکاح میں رہنا اسرائیل علیہ السلام اور ان کی اولاد کے لیے حلال تھا، تورات اور اس کے بعد کی شریعتوں میں اس کو حرام کر دیا گیا۔ اور ابراہیم علیہ السلام کو حکم دیا کہ اپنے بیٹے کو ذبح کرو، وہ تیار ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے اس حکم پر عمل کرنے سے پہلے اپنے حکم کو منسوخ کر دیا۔ اور بنی اسرائیل نے جب بچھڑے کی عبادت کی تو ان کو حکم دیا کہ اپنے آپ کو قتل کرو، جب کئی لوگ قتل ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے اس حکم کو منسوخ کر دیا۔ یہود بھی ان تمام باتوں کا اعتراف کرتے ہیں، لیکن اس کے باوجود ضد و عناد سے اعتراض کرتے ہیں۔

نسخ کے متعلق معتزلہ کا عقیدہ:

سب سے پہلے نسخ کی مخالفت یہود نے کی، ان کے بعد فرقہ معتزلہ نے کی۔ کہتے ہیں: ﴿مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ﴾ یہاں ایک قید ہے کہ اگر ہم چاہتے تو کوئی آیت منسوخ کر کے اس کے بدلے میں بہتر لاتے، لیکن ہم نے کوئی آیت منسوخ نہیں کی۔ یعنی اللہ نے کوئی حکم منسوخ نہیں کیا، اگر چاہتے تو کر دیتے۔ یہ معتزلہ کا عقیدہ ہے جو فرقہ ضالہ ہے۔ لیکن اہلسنت والجماعت، صحابہ رضی اللہ عنہم سے لے کر متقدمین اور متاخرین تمام کے تمام قرآن میں نسخ واقع ہونے کے قائل ہیں۔ پھر علماء کے درمیان اصطلاح کا تھوڑا سا اختلاف ہے، متاخرین علماء نے تو بالکلیہ ایک حکم کو بدل دینے کا نام نسخ رکھا ہے، یعنی ایک تمام کا تمام بدل جائے، جیسے پہلے قبلہ بیت المقدس تھا، اس کے بعد اللہ نے حکم دیا: ﴿فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ﴾ [البقرۃ: ۱۴۴] پہلا حکم بالکل اور پورے کا پورا بدل گیا۔ اور متقدمین علماء یہ کہتے ہیں کہ اگر چہ سارا حکم نہ بدلے، بلکہ اس کا کوئی ایک جز وہی بدل جائے تو وہ بھی نسخ ہے۔

قرآن میں نسخ کی مقدار:

متقدمین علماء نے لکھا ہے کہ قرآن میں تقریباً پانچ سو آیات ایسی ہیں جو منسوخ ہو گئیں یا تو وہ بالکلیہ منسوخ کر دی گئیں یا بھلا دی گئیں یا پھر وہ آیات باقی تو ہیں، لیکن وہ حکم ختم کر دیا گیا؛ کیونکہ بعض نے یہ شرط لگا دی کہ نسخ کا معنی ہے کہ پورا حکم بدلے۔ جب یہ شرط لگی تو آیات کم ہو گئیں، اس لیے انہوں نے کہا کہ کل پچیس آیات ہیں جن میں نسخ ہوا ہے، گویا پانچ سو سے ہو کر ۲۵ پر آ گئے۔ اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ نے ان آیات میں بھی تطبیق کی کوشش کی تو اس کے نتیجہ میں وہ پانچ آیات کے قائل ہیں، یعنی قرآن میں کل پانچ آیات ایسی ہیں جن میں نسخ ہوا ہے۔ کیونکہ جب تطبیق کرنا ممکن ہے تو ہم بلا وجہ نسخ کی طرف کیوں جائیں؟ بہر صورت اس میں تو کوئی شبہ نہیں کہ صحابہ رضی اللہ عنہم سے لے کر آج تک علماء حق نسخ کے قائل ہیں۔

جیسے ایک دن حضرت علی رضی اللہ عنہ مسجد میں تشریف لائے تو دیکھا کہ ایک آدمی لوگوں کو وعظ کر رہا ہے، آپ نے لوگوں سے پوچھا کہ یہ کون آدمی ہے اور کیا کر رہا ہے؟ انہوں نے کہا کہ یہ آتا ہے اور لوگوں کو وعظ و نصیحت کرتا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ نہیں نہیں، یہ وعظ و نصیحت نہیں کرتا، اس کا مقصد یہ ہے کہ لوگ سمجھیں کہ میں کوئی عالم ہوں۔ یہ اپنی شہرت چاہتا ہے۔ لہٰذا آپ نے اس کو بلا کر پوچھا کہ کیا تم ناسخ و منسوخ کے تمام احکام جانتے ہو؟ تم جانتے ہو

کہ قرآن مقدس میں کتنی آیات منسوخ ہیں؟ اور کون سی آیات ناسخ ہیں؟ اس طرح حدیث پاک میں حضور اکرم ﷺ کے کتنے حکم منسوخ ہوئے ہیں؟ ان کے بارے میں تمہیں علم ہے؟

کیونکہ ایسے واقعات صرف قرآن میں نہیں، احادیث میں بھی موجود ہیں۔ اس طرح بعض احکام ایسے ہیں کہ جن کا نسخ صرف احادیث مبارکہ سے ثابت ہے، جیسا کہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ جلیل القدر صحابی ہیں، فرماتے ہیں کہ میں سفر سے واپس آیا تو حضور اکرم ﷺ نماز پڑھ رہے تھے۔ میں نے عرض کیا: السلام علیکم! حضور اکرم ﷺ نے جواب نہ دیا۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں دل میں بہت گھبرا گیا کہ آقا ﷺ نے میرے سلام کا جواب نہیں دیا، شاید حضور اکرم ﷺ مجھ سے ناراض ہو گئے ہیں۔ لہٰذا میں پیچھے ہٹ کر چلا گیا۔ حضور اکرم ﷺ جب نماز سے فارغ ہوئے تو آپ ﷺ نے مجھے بلوایا اور فرمایا: اللہ کے بندے! میں نے سلام کا جواب اس لیے نہیں دیا کہ پہلے نماز کی حالت میں سلام کا جواب دینا شریعت میں جائز تھا، اب اللہ نے منع کر دیا ہے کہ نماز کی حالت میں کوئی بھی سلام کا جواب نہیں دے سکتا۔ میں چونکہ نماز پڑھ رہا تھا، اس لیے سلام کا جواب نہیں دیا۔

تو پہلا حکم یہ تھا کہ نماز کی حالت میں سلام کا جواب دینا جائز ہے، یعنی کوئی السلام علیکم کہے تو کہہ سکتے تھے: وعلیکم السلام! اپنی نماز بھی جاری رکھی۔ لیکن بعد میں اللہ تعالیٰ نے یہ حکم منسوخ کر دیا اور اس کا ذکر بھی احادیث مبارکہ میں موجود ہے۔ اسی طرح اور بھی کئی آیات مبارکہ آئی ہیں، جن میں نسخ واقع ہوا ہے۔

قبر آخرت کی یاد دلاتی ہے:

حضور پاک ﷺ نے فرمایا: میں نے تم لوگوں کو منع کیا تھا کہ قبروں پر نہ جایا کرو اور قبروں کی زیارت نہ کیا کرو۔ فرمایا کہ اب میں اجازت دیتا ہوں کہ جایا کرو۔

لیکن زیارت کا معنی تو یہ نہیں ہوتا جو ہمارے ملک میں زیارت کا مطلب سمجھا یا جاتا ہے۔ ہمارے ملک میں تو تجارت اور شرک ہوتا ہے، ہمارے ملک میں تو باقاعدہ قبریں فروخت ہوتی ہیں، باقاعدہ وہاں میلے لگتے ہیں، وہاں ٹکٹیں اور تماشے کا انتظام کیا جاتا ہے، پھر قبروں پر سجدہ اور ہاتھ باندھ کر باقاعدہ قبر کا طواف ہوتا ہے جیسے اللہ کے کعبے کا طواف ہوتا ہے۔ اس سے بڑا شرک کوئی ہو سکتا ہے؟ اللہ کے گھر کا چونکہ طواف ہے تو ولی کی قبر کا بھی طواف

ہے، اللہ کے کعبے کی طرف ہم نے سجدہ کرنا ہے تو قبر کی طرف بھی سجدہ کرنا ہے اور یہاں تو میرے خیال میں لوگ صرف نماز میں سجدہ کرتے ہیں، پہلے چوکھٹ پر پھر قبر پر سجدہ کرتے ہیں، وہاں لوگ اس کے بعد ہاتھ باندھ کر کھڑے ہوں گے اور اُلٹے پاؤں واپس آئیں گے کہ قبر والے کی تعظیم ہو رہی ہے۔ اب خدا جانے کی تعظیم کس کی کرتے ہیں؟ اللہ تعالیٰ ایسے شرک سے بچائے۔ مقصد زیارت کا کیا ہے؟ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ قبروں کی زیارت کرو، کیوں؟ قبروں کی زیارت کرنے سے آدمی کو اپنی موت یاد آتی ہے اور آدمی کو اپنی آخرت کی یاد تازہ ہوتی ہے کہ جب وہ کسی اللہ کے ولی کی قبر پر جاتا ہے تو اس کے دل میں یقین آجاتا ہے کہ مولیٰ! یہ تیرے صالح بندے بھی مٹی کے نیچے سو گئے تو ہم نے بھی مرنا ہے، ہمیں بھی اسی جگہ جانا ہے اور ہمیں بھی موت آئے گی اور ہم پر بھی یہ وحشت کا گھر آئے گا، لہٰذا ہمارا خاتمہ ایمان پر فرما کہ ہمارے لیے قبر باغ جنت، نہ کہ جہنم کے گڑھے بن جائیں۔ لہٰذا پہلے منع کا حکم تھا، پھر حضور اکرم ﷺ نے اجازت دے دی۔

کفار کے برتنوں کا حکم:

جس طرح حضور اکرم ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو منع فرمایا تھا کہ اگر تم لوگ سفر میں جاؤ، راستے میں کافروں کی آبادیاں ہوتی ہیں، اس میں یہودی، نصرانی اور مشرک بھی ہوتے ہیں تو ان کافروں کے برتنوں میں تم کھانا نہ کھایا کرو۔ مسافر کو جیسے آج ضرورت پیش آتی ہے، پہلے دور میں بھی سفر کرتے تھے تو راستے میں کافروں کی ایک بستی آگئی اور مسلمان بے چارا محتاج ہے کہ میں نے ان سے برتن لے کر کھانا پکانا ہے، اب کیا کروں؟

جبکہ ادھر حضور اکرم ﷺ نے منع فرما دیا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! اب سفر بھی ضروری ہے، بعض علاقے ایسے ہیں کہ راستے میں مسلمانوں کی کوئی بستی ہی نہیں آتی اور ہم برتن لینے کے لیے مجبور ہوتے ہیں، ہم کیا کریں؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اچھا میں اجازت دیتا ہوں، لیکن ان کو اچھی طرح دھولیا کرو اور پاک کرلیا کرو، تاکہ کسی قسم کا اس کے اندر شبہ نہ رہ جائے۔

اسی طرح حضور اکرم ﷺ نے پہلے بہت سی چیزوں سے منع کر دیا۔ یہ کھجور کا جو درخت ہے، اس کے تنے سے لوگ پہلے مٹکا بناتے تھے، اس کے باہر سے لکڑی صاف کرلی، اندر سے سوراخ کر کے مٹکے کی شکل بنالی۔ اسی طریقے سے جو آپ کے ہاں کدو ہوتا ہے، لمبا بھی ہوتا ہے اور گول بھی، اس کو بھی اندر سے صاف کر کے سکھا کر مادہ

نکال کر برتن بنا لیتے تھے۔ اس سے بھی حضور اکرم ﷺ نے منع فرمایا کہ اس طرح کے برتن تم استعمال نہ کیا کرو؛ کیونکہ لوگ اس میں شراب بنایا کرتے تھے۔ اس زمانے میں ابتداء میں شراب ان چیزوں میں بناتے تھے، ان میں بند کر کے زمینوں میں دفن کر دیتے تھے، اس میں خمیر زیادہ اُٹھتا تھا؛ کیونکہ یہ بالکل بند ہو جاتا تھا اور ہوا اس میں نہ جا سکتی تھی۔ حضور اکرم ﷺ نے منع فرما دیا تو جب حرمت شراب قائم ہو گئی اور مسلمانوں کو پتہ چل گیا کہ شراب حرام ہو گئی ہے، "كُلُّ مُسْكِرٍ حَرَامٌ" (ہر نشہ آور چیز حرام ہے)۔ جب الحمد للہ! تمام لوگ نشہ آور چیزوں سے بچ گئے تو پھر حضور اکرم ﷺ نے اجازت دے دی کہ اب کوئی بات نہیں، اگر تم ان برتنوں کو استعمال کرتے ہو تو کر لو۔ ابتداء میں اندیشہ تھا کہ کہیں آدمی ان برتنوں کے استعمال سے نشہ آور اشیاء کی طرف نہ چلا جائے۔ لہٰذا جب پورا سد باب ہو گیا تو ان برتنوں کے استعمال کی اجازت مل گئی۔

تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جب تمہیں ناسخ و منسوخ کا پتہ نہیں ہے تو پھر تمہیں تقریر اور وعظ و نصیحت کا کیا حق حاصل ہے؟ جب تمہیں پتہ نہیں اور تم ایک ایسی حدیث سناتے رہو گے جو منسوخ ہو چکی ہے۔

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہودیوں کی کتابوں میں حضور اکرم ﷺ کی بشارت دی گئی، آپ ﷺ کی پیدائش اور آپ ﷺ کی پیدائش کی جگہ کا ذکر اور آپ ﷺ کی علامات اتنی واضح تھیں کہ ان میں کوئی معاند تو شک کر سکتا ہے، لیکن عقل والا شک نہیں کر سکتا۔ لیکن پھر بھی وہ انکار کر گئے اور کتابوں میں تحریف کر دی اور لوگ پوچھتے تو کہتے کہ جس نبی کے آنے کا ذکر تورات میں ہے، یہ وہ نبی نہیں ہیں۔ اس لیے کہ یہود کے مزاج میں رد کرنا، خیانت کرنا اور اللہ کے احکام میں تبدیلیاں کرنا شامل ہے۔ لہٰذا آج وہ نسخ کا انکار کرتے ہیں تو یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔

کراماتِ صحابہ رضی اللہ عنہم:

اسی لیے آپ صحابہ رضی اللہ عنہم کے واقعات پڑھیں کہ حضرت امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ نے مصر کے دریائے نیل کو خط لکھا تھا۔ سوچو! دریا کو بھی کوئی خط لکھتا ہے؟ آج تم کوئی خط لکھ کر پانی میں ڈالو، مٹ جائے گا، دھل جائے گا، گم ہو جائے گا، لیکن سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے دریاؤں کو حکم نامے جاری کر دیئے۔ پھر کمال کی بات یہ ہے کہ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ جو مصر کے گورنر تھے، انہوں نے یہ بھی نہیں کیا کہ امیر المؤمنین نے کیا آرڈر جاری کیا، بھلا دریا کو بھی کوئی آرڈر کرتا ہے؟ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے خط بھیج دیا، انہوں نے کہا کہ ہمارے ذمے تعمیل حکم ہے، بہر حال دریا میں وہ خط

ڈال دیا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کہتے ہیں کہ ہم خطارکھ کر باہر آئے تو اسی رات دریا اتنا چڑھ گیا کہ کبھی نہیں چڑھا تھا اور پورا علاقہ آباد ہو گیا اور آج تک پھر کبھی نہیں اُترا۔ یعنی دریا، فضائیں اور جنگل کے حیوانات بھی ان کے تابع ہو گئے، سمندر تابع ہو گئے۔

اور اسی طرح ایک موقع پر دریا عبور کرنا تھا، کشتیاں موجود نہیں ہیں، حیران ہیں کہ کشتیاں نہیں ہیں، کہنے لگے: چل پڑو، دریا کے اوپر چل پڑے۔ دریا ان کے تابع ہیں، دریا اپنا کام کر رہا ہے۔ صحابہ کے لشکر اوپر سے گزرے، کوئی مسئلہ نہیں ہوا۔

ایک مرتبہ جب خالد رضی اللہ عنہ بن ولید کو زہر دیا گیا تو کمانڈر نے بتایا کہ یہ ایک ایسا زہر ہے کہ اس کا ایک قطرہ زبان پر لگ جائے تو آدمی مرجاتا ہے۔ دیکھنا! کہیں دشمن تمہارے کھانے میں زہر نہ دے دے، کھانا کھانے میں احتیاط رکھنا۔ خالد رضی اللہ عنہ بن ولید نے کہا کہ دکھلاؤ تو سہی، تمہارا زہر کہاں ہے؟ انہوں نے انگیٹھی کھولی، زہر نکالا۔ آپ رضی اللہ عنہ نے ہاتھ میں لیا اور فرمایا:

"بِسْمِ اللّٰهِ الَّذِي لَا يَضُرُّ مَعَ اسْمِهِ شَيْءٌ فِي الْأَرْضِ وَ لَا فِي السَّمَاءِ، وَ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ."

[سنن الترمذی، رقم:٣٣٨٨/سنن أبی داود، رقم:٥٠٨٨]

اور پی گئے۔ اس نے کہا: یہ کیا کر رہے ہو؟ خالد رضی اللہ عنہ بن ولید نے فرمایا کہ میرے مدنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ دعا پڑھ لو تو کوئی چیز نقصان نہیں دے سکتی، بس میرا ایمان ہے۔ آج تم یہ آیت سات مرتبہ پڑھ کو کھا کر دیکھو کہ تمہیں ہضم ہوتی ہے۔ اب کیا قرآن بدل گیا؟ یا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان بدل گیا؟ ٹھنڈے دل سے سوچو، یہ کہو کہ نہ قرآن بدلا ہے اور نہ فرمان بدلا ہے، بلکہ ہمارا ایمان بدل گیا کہ ہمارا ایمان ہے ہی نہیں۔ ہم زمزم کا پانی بھی پیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ گولی بھی دینا، اللہ میاں شفا دے گا۔ اب پتہ نہیں عقیدہ زمزم پر تھا یا گولی پر؟ اللہ فرماتے ہیں کہ جب تم خود منافق ہو تو فائدہ کیا ہوگا؟ نہ تمہیں زمزم فائدہ دے گا اور نہ گولیاں فائدہ دیں گی۔ جن کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث پر یقین ہے، ان کو زم زم پینے سے شفا بھی ملتی ہے۔

زمزم پینے کے بعد دعا کی قبولیت کا واقعہ:

یعنی آپ اندازہ لگائیں! سفیان بن عیینہ رحمہ اللہ، امام بخاری رحمہ اللہ کے بھی استاد ہیں، محدث جلیل گزرے ہیں۔

فرماتے ہیں کہ میں زمزم پینے کے لیے آیا تو میں نے دیکھا کہ ایک آدمی کھڑا ہے اور زمزم پی رہا ہے، پتہ نہیں کون ہے؟ زمزم پینے کے بعد اس نے کہا: یا اللہ! تیرے سچے نبی کی سچی حدیث ہے، تیرا نبی بھی سچا اور نبی کا فرمان بھی سچا کہ زمزم کا پانی جس غرض کے لیے پیو، اللہ وہ پوری کرتے ہیں...... یاد رکھو! ماء زمزم یہ صرف بیماریوں کا علاج نہیں، بلکہ اس کے پینے کے بعد جو دعا مانگو، وہ قبول ہوتی ہے۔ اس لیے محدثین کرام نے لکھا ہے کہ زمزم کا پانی جنت کے حوضِ کوثر کے پانی سے بھی افضل ہے، جنت کے پانی سے بھی افضل ہے۔ جبرائیل علیہ السلام نے معراج کی رات جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا سینہ مبارک کھولا تو ہر چیز جنت سے لے آئے لیکن پانی زمزم کا لیا تو اس سے معلوم ہوا کہ اگر جنت کا پانی افضل ہوتا تو جبرائیل علیہ السلام جنت سے پانی لے آتے۔ اگر جبرائیل علیہ السلام نے زمزم کا پانی لیا ہے تو محدثین نے یہ مسئلہ استنباط کیا ہے کہ یہ ایسا پانی ہے جو جنت کے پانی سے بھی افضل ہے۔ اس آدمی نے کیا دعا مانگی؟ تم کیا دعا مانگتے ہو کہ اللہ میاں! پیسے دے دو، بعض حاجی یہ دعا کرتے ہیں کہ کسی کا بٹوہ ملے غسل خانے میں، کسی کا پاسپورٹ، کسی کی ٹکٹ مل جائے، نام بدل دیں گے، حاجی کے لیے تو سب جائز ہے نا؟ یعنی طواف کرتے ہوئے جیب کاٹ لینا، ایمان سے کہو یہودی آ کر کاٹتے ہیں؟ ایمان سے بتاؤ کہ ایک کعبے میں، بیت اللہ میں جیب کٹ رہی ہے تو کیا کاٹنے کے لیے یہودی آتا ہے؟ مسلمان کعبہ کا طواف بھی کر رہا ہے اور نظر لوگوں کے بٹوے پر، جیب پر، پاسپورٹ پر اور ٹکٹ پر، اور آیا بھی کعبہ میں ہے، شرم بھی نہیں آتی۔ آج مجھے ایک دوسرے سنا رہے تھے کہ ایک نیا طریقہ نکالا ہے کہ سپرے ہاتھ میں ہے، وضو کر رہا ہے، اس کے کپڑوں پر سپرے کر دیتے ہیں اور پھر اس کو خود کہہ دیتے ہیں کہ بھئی! تمہارے کپڑے گندے ہو گئے ہیں، انہیں دھو لو۔ اب اگر آدمی کا قمیص گندہ ہو جائے تو دھونے کے لیے غریب کیسے نماز پڑھے؟ وضو کے لیے جب اُتارے گا تو بٹوہ یا کپڑے کچھ تو باہر رکھے گا۔ یعنی کیا خیال ہے آپ کا کہ یہ مسلمان ہیں؟ دعا کرو، اللہ پاک ان کو ہدایت دے...... حضرت سفیان بن عیینہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ زمزم پی کر جو دعا مانگو، قبول ہوتی ہے۔ اس نے کہا کہ آج مجھے سفیان بن عیینہ مل جائے اور حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی سو حدیثیں سنا دے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ابھی اس نے ڈول رکھا ہی تھا کہ میں نے اس کے ہاتھ پکڑ لیے اور میں نے کہا: میں سفیان ہوں اور تمہاری دعا قبول ہو گئی ہے، چلو میں تمہیں حدیث سناؤں۔ اس کو میں لے آیا اور میں نے اس کو حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث سنانا شروع کر دیں۔



﴿اَمْ تُرِیْدُوْنَ اَنْ تَسْـَٔلُوْا رَسُوْلَكُمْ كَمَا سُىِٕلَ مُوْسٰى مِنْ قَبْلُ ؕ وَ مَنْ یَّتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْاِیْمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِیْلِ﴾ [البقرۃ:۱۰۸]

''کیا تم مسلمان بھی چاہتے ہو کہ سوال کرو اپنے رسول سے جس طرح سے موسیٰ سے سوال ہو چکے اس سے پہلے؟ اور جس نے ایمان کی جگہ کفر کمایا، سیدھے راستے سے بھٹک گیا۔''

یہاں ''اَمْ تُرِیْدُوْنَ اَنْ تَسْـَٔلُوْا''، ''لَا تَسْـَٔلُوْا'' کے معنی میں ہے یا بطور استفہام انکاری ہے۔ اس کا مخاطب عام ہے مومن اور کافر سب کو شامل ہے؛ کیونکہ اللہ کے نبی تو سب کے لیے آئے ہیں، جنہوں نے آپ ﷺ کی نبوت کو مان لیا، وہ (الحمدللہ!) اُمت محمدیہ میں شامل ہو گئے اور جنہوں نے نہ مانا وہ محروم ہو گئے۔ باقی حضور اکرم ﷺ کی نبوت قیامت تک کے لیے ہے۔

بلا وجہ سوالات کرنے کے نقصانات:

رافع بن حرملہ اور وہب بن زید آئے اور کہنے لگے: یا محمد! اگر آسمان سے ہمارے سامنے کتاب اُترے اور ہم اس کو پڑھیں اور مکہ میں ہمارے لیے نہریں جاری ہو جائیں تو ہم تصدیق کریں گے کہ آپ سچے نبی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے یہ آیتِ مبارکہ نازل کی کہ تم بھی ایسے سوال کرتے ہو جیسے موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کیے تھے!!؟؟

دوسری حدیث میں آتا ہے کہ ایک آدمی نے آ کر حضور اکرم ﷺ سے سوال کیا اور کہنے لگا: یارسول اللہ! مہربانی فرمائیں کہ ہمارے گناہوں کا کفارہ بھی ایسا ہو جائے جیسا کہ بنی اسرائیل کے زمانے میں تھا، (بنی اسرائیل کے زمانے میں یہ تھا کہ کسی آدمی سے کوئی گناہ ہو جاتا تو اس کے دروازے پر لکھا جاتا کہ اس نے فلاں گناہ کیا ہے اور اس کا کفارہ یہ ہے۔ اگر کفارہ ادا کر دیتا تب بھی دنیا میں ذلیل ہو جاتا کہ ہر کسی کو پتہ چل گیا کہ گناہ کیا ہے اور کفارہ ادا نہ کرتا تو دنیا میں بھی ذلیل اور آخرت میں بھی ذلیل)۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو، تم تو بہتر حالت میں ہو۔ تم سے کوئی گناہ ہو گیا تو اللہ معاف کر دیتے ہیں اور کسی کو پتہ بھی نہیں چلتا، تم ایسی باتیں مانگتے ہو کہ دنیا کی رُسوائی حاصل ہو جائے یا دنیا اور آخرت دونوں کی رُسوائی حاصل ہو جائے۔ لہٰذا ایسے سوالات نہ کیا کرو۔

مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ جیسے انہوں نے کہا تھا کہ اللہ پاک ہمیں زیارت کرائیں، ایسے ہی قریشیوں نے کہا تھا کہ حضور اکرم ﷺ صفا پہاڑ سونے کا بنا دیں، پھر ہم ایمان لائیں گے۔ آپ ﷺ

نے فرمایا: جیسے بنی اسرائیل نے سوال کیا تھا، تم بھی ایسی ہی باتیں کرتے ہو؟ سدی رحمہ اللہ اور قتادہ رحمہ اللہ سے اسی کی مثل روایت کیا گیا ہے۔

قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی:

﴿وَمَنْ يَّتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ﴾ [البقرة:١٠٨]

جو ایمان لانے کے بعد کفر خریدے، وہ سیدھے راستے سے گمراہی کی طرف نکل گیا۔ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ حال ان لوگوں کا ہے جنہوں نے پیغمبر کی تصدیق کے بجائے ان کی مخالفت کی اور اللہ کے انبیاء سے ایسے سرکشی کے سوال کیے جن کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔

ابو العالیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ وہ ایسے لوگ ہیں جو سوال کر کے نرمی کی بجائے سختی مول لیتے ہیں، یعنی پہلے نرمی تھی، طرح طرح کے سوالات کیے، جس سے سختی والے احکام نازل ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کی مذمت بیان کی ہے جو لوگ رسول اللہ ﷺ سے بطور تعنت کے سوال کرتے، جیسا کہ بنی اسرائیل حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بطور ضد وعناد اور جھٹلانے کے لیے سوال کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ﴿وَمَنْ يَّتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ﴾ مطلب یہ ہے کہ جس نے ایمان کے بدلے کفر کو خریدا، ﴿فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ﴾ [البقرة:١٠٨] تو وہ صراط مستقیم سے نکل کر جہالت اور گمراہی کے راستے میں جا پڑا۔

سوال کر کے اُمت کو مشکل میں ڈالنے والے کے لیے وعید:

حدیث مبارک میں آتا ہے کہ وہ آدمی اللہ کے ہاں غضب کا مستحق ہوتا ہے جو کوئی سوال کرے اور اس کے سوال کرنے کی وجہ سے اللہ اس چیز کو حرام کر دیں اور ساری اُمت قیامت تک مشکل میں مبتلا ہو جائے۔ یہ حکم خاص طور پر اس زمانے میں تھا جب وحی اُتر رہی تھی، قرآن نازل ہو رہا تھا، حضور اکرم ﷺ موجود تھے؛ کیونکہ اگر کوئی سوال ہوتا تو فوراً اس کے مطابق حکم آ جاتا۔ اس لیے اللہ نے اپنے بندوں کو منع فرمایا۔ علماء نے لکھا ہے کہ آج بھی بندہ ایسے سوالات نہ کرے جو بلا وجہ پریشانی کا باعث ہوں۔ مثلاً فرضی مثالیں پیدا کر کے آدمی مسئلے سوچنا شروع کر دے۔

جیسے کہ سیدنا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو ایک دفعہ مسئلہ پیش آ گیا کہ آپ اپنا لشکر مسلمانوں کی مدد کے لیے لے جا رہے تھے، جب راستے میں پہنچے تو آپ کو اطلاع ملی کہ جس جگہ آپ جا رہے ہیں، وہاں طاعون کی بیماری ہے (اللہ

پاک اس سے محفوظ رکھے، اللہ کا عذاب ہے، اللہ تعالیٰ جب کسی قوم پر عذاب بھیجتے ہیں تو کبھی طاعون مسلط کر دیتے ہیں، کبھی آندھیاں بھیج دیتے ہیں، کبھی پانی ختم کر دیتے ہیں، کبھی فصلات ختم کر دیتے ہیں۔ تو یہ "أنواع من العذاب" ہیں، ان کا علاج یہ ہوتا ہے کہ توبہ و استغفار اور اللہ کی طرف رجوع کرو، نمازیں پڑھو، زکوٰۃ ادا کرو، صدقات کرو، اللہ سے معافی مانگو)، جب طاعون کے بارے میں پتہ چلا تو صحابہ رضی اللہ عنہم رُک گئے اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو جمع کیا کہ ہمارے لیے ایک بڑا مشکل مسئلہ پیش آ گیا ہے کہ جہاں ہم جا رہے ہیں وہاں مسلمانوں کی افواج کی مدد کرنی ہے اور وہاں طاعون کی بیماری بھی ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ ہماری ساری فوج طاعون کا شکار ہو جائے۔ اب ہمیں بتائیں کہ ہم کیا کریں؟ آپ نے اس کے لیے بڑے بڑے علماء صحابہ رضی اللہ عنہم کو جمع کر لیا کہ اس مسئلہ کا حل نکالو کہ اب ہم کیا کریں؟ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے کہا کہ ہمیں جانا چاہیے، جو اللہ کی تقدیر میں لکھا ہے وہ تو ہونا ہے، وہ ٹل نہیں سکتا۔ اور بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے کہا کہ بالکل نہیں جانا چاہیے، ہمیں جب پتہ ہے کہ وہاں بیماری ہے اور اللہ کے قرآن میں موجود ہے:

﴿وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ﴾ [البقرۃ:۱۹۵]

اپنے ہاتھوں سے اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔ جب ہم دیکھ رہے ہوں کہ آگ جل رہی ہے تو یہ کوئی عقل مندی نہیں کہ آدمی اس میں کود پڑے، ہم دیکھ رہے ہیں کہ آگے دریا بہہ رہا ہے تو یہ کوئی عقل مندی نہیں کہ آدمی یہ کہے کہ میں اس میں داخل ہو جاؤں، جو ہونا ہے وہ ہو جائے گا۔ اللہ نے کہا کہ اپنے آپ کو ہلاک نہ کرو۔ اب اس پر بحث ہوئی۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے غور کرنے کے بعد فرمایا کہ لشکر کو روک دو، ہم اس عذاب والی بستی میں داخل نہیں ہوں گے۔ لہٰذا قافلہ کو واپس چلنا چاہیے۔ ایک آدمی کو جلال آ گیا...... بعض آدمی جلالی بھی ہوتے ہیں...... اس نے کہا: یا امیر المؤمنین! آپ اللہ کی تقدیر سے بھاگ رہے ہو!؟ اللہ کی تقدیر سے کون بھاگ سکتا ہے؟ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اللہ کے بندے! اللہ کی تقدیر سے بھاگ کر کہاں جائیں گے؟ جانا تو پھر بھی اللہ کی تقدیر کی طرف ہے، کہیں بھی چلے جائیں تو اللہ کی تقدیر سے کون بھاگ سکتا ہے؟ تو آپ اسی مسئلے پر جم گئے۔ صبح کو ایک صحابی آئے، انہوں نے آ کر حدیث سنا دی، انہوں نے امیر المؤمنین سے کہا کہ آپ نے صحیح فیصلہ کیا ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے میں نے حدیث سنی ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر تمہیں پتہ چل جائے کہ کسی بستی میں

طاعون پھیلا ہوا ہے تو اس میں تم کبھی داخل نہ ہونا اور اگر تم پہلے سے ایسی بستی میں موجود ہو جہاں طاعون آ جائے تو پھر تم اس بستی سے نہ نکلو، لیکن اگر تم اس طاعون والی بستی سے باہر ہو اور اس میں آ رہے ہو اور تمہیں پتہ چل جائے کہ اس بستی میں طاعون آیا ہے تو اس میں داخل نہ ہو۔ حضور اکرم ﷺ کا فرمان سُن کر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ خوش ہو گئے اور کہا: الحمد للہ! اللہ نے مجھ سے بھی وہی فیصلہ کرایا ہے جو حضور اکرم ﷺ کا فیصلہ ہے۔ اس میں بھی حکمتیں ہیں کہ تم طاعون والے علاقے سے باہر ہو تو بلا وجہ عذاب میں کیوں جاؤ؟ اور اگر وہاں عذاب آ گیا ہے تو تم باہر نکل جاؤ گے تو لوگوں کا جنازہ کون پڑھے گا؟ کون دفن کرے گا؟ کون ان کی قبریں بنائے گا؟ اور پھر تم جہاں جاؤ گے تو اس بیماری کو بھی ساتھ لے جاؤ گے، پھیلاؤ گے اور دوسرے مسلمانوں کے لیے بھی بیماری کا سبب بنو گے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ کے نبی پاک ﷺ کے فرمان میں حکمتیں ہیں۔

﴿وَدَّ كَثِيرٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يَرُدُّونَكُم مِّنۢ بَعْدِ إِيمٰنِكُمْ كُفَّارًا حَسَدًا مِّنْ عِندِ أَنفُسِهِم مِّنۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ ۖ فَاعْفُوا وَاصْفَحُوا حَتّٰى يَأْتِيَ اللّٰهُ بِأَمْرِهِۦٓ ۗ إِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿١٠٩﴾ وَأَقِيمُوا الصَّلٰوةَ وَآتُوا الزَّكٰوةَ ۚ وَمَا تُقَدِّمُوا لِأَنفُسِكُم مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوهُ عِندَ اللّٰهِ ۗ إِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ﴿١١٠﴾﴾ [البقرۃ: ۱۰۹، ۱۱۰]

"بہت سے اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) پسند کرتے ہیں کہ تمہیں لوٹا لے جاتے تمہارے ایمان لانے کے بعد، حالت کفر میں اپنی طرف سے حسد کرتے ہوئے، بعد اس کے کہ ان کے لیے حق واضح ہو گیا۔ پس (اے مؤمنو!) تم بھی ان کو چھوڑ دو اور ان سے اعراض کرو جب تک کہ اللہ اپنا نیا حکم لائے (ان سے جہاد کا)، بلاشبہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اور قائم کرو نماز اور ادا کرو زکوٰۃ، اور جو تم آگے بھیجو گے اپنے لیے، پاؤ گے اس کو اللہ کے پاس، جو کچھ تم کرتے ہو اللہ دیکھتا ہے۔"

آیاتِ مبارکہ کا شانِ نزول:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حیی بن اخطب، ابو یاسر ابن اخطب دونوں یہودیوں کے بڑے سردار تھے۔ ان دونوں کو اسلام سے بڑی عداوت اور مسلمانوں سے بغض تھا۔ آپ ﷺ کو خصوصی طور پر ان دونوں

کے بارے میں بتلایا گیا کہ یہ دونوں اپنی طاقت کے مطابق لوگوں کو اسلام سے روکتے ہیں۔ ان کے بارے میں اللہ نے یہ آیات نازل فرمائیں۔

زہری رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے کہ یہ کعب بن اشرف کے بارے میں نازل ہوئی ہے کہ کعب بن اشرف یہودیوں کا بڑا مشہور آدمی اور شاعر تھا اور اپنے شعروں میں ہجو کرتا تھا، یعنی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان کے خلاف شعر کہتا تھا، اس پر اللہ نے یہ آیات نازل فرمائیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اللہ پاک نے اپنے پیغمبر حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو اُمّی بنا کر بھیجا، آپ کسی مدرسہ اور کسی استاد سے نہیں پڑھے تھے، لیکن انہیں بتاتے تھے کہ تمہاری تورات، انجیل میں یہ لکھا ہوا ہے، اور وہ بات جس کی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خبر دیتے، ان کے حسد اور بغض کو مزید بڑھا دیتا۔ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ یہود جو مخالفت کرتے ہیں، جہالت کی وجہ سے نہیں کرتے، بلکہ ان پر تو حق روشن ہو چکا ہے، ان کو پتہ ہے کہ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم سچے نبی ہیں، ان کو پتہ ہے کہ اللہ کا قرآن سچی کتاب ہے، ان کو پتہ ہے کہ دین اسلام سچا دین ہے، پھر یہ بغض اور حسد کی بناء پر مخالفت کرتے ہیں۔ بنی اسرائیل سے نبوت چلی گئی اور اولادِ اسماعیل میں چلی آئی تو اللہ پاک نے فرمایا کہ آپ اپنی اُمت کو حکم دیں کہ کفار و مشرکین جو آپ کو تکالیف دیں، ان سے درگزر کرتے رہیں اور اللہ کی مدد و نصرت کا انتظار کریں۔

ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: پہلے حکم نازل ہوا تھا کہ ان کو معاف کر دیں اور ان سے اعراض کریں۔ پھر یہ حکم منسوخ ہو گیا۔ نیا حکم یہ نازل ہوا کہ اللہ نے اب طاقت دی ہے، اگر یہ لڑائی کریں تو آپ بھی اس کے بدلے میں لڑائی کریں اور ان کے ساتھ قتال و جہاد کریں۔

قتادہ رحمہ اللہ اور سدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہ ﴿فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا﴾ [البقرة:١٠٩] کا حکم پہلے تھا، مگر جب تلوار کا حکم آیا تو یہ حکم ختم ہو گیا۔

حضرت اُسامہ بن زید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ مشرکین کو معاف کر دیتے تھے، درگزر کرتے تھے جیسا کہ اللہ نے حکم دیا تھا کہ درگزر کرو، برداشت کرو اور اللہ تعالیٰ کے پیغمبر انتظار کرتے رہے، جب اللہ نے جہاد اور قتال کا حکم دیا تو پھر اللہ کے نبی اُٹھے اور کافروں کے بڑے بڑے سردار قتل ہوئے۔

ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ صحاح ستہ میں تو یہ روایت موجود نہیں ہے، لیکن اس روایت کی اصل صحیحین میں

اُسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کی روایت میں موجود ہے۔[صحیح بخاری، رقم: ۵۶۶۰ /صحیح مسلم، رقم: ۱۷۹۸]

جب نماز پڑھیں گے، زکوٰۃ ادا کریں گے تو اللہ کی نصرت شامل حال ہوگی دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ نماز قائم کرو۔ جہاں بھی قرآن میں دیکھو قائم کرنے کا حکم ملے گا۔ نماز قائم کرنے کا معنی یہ ہے کہ نماز کو وقت پر ادا کرو اور نماز کے تمام ارکان اور شرائط پورے کرو۔ وقت پر نماز ادا کرنے کے بارے میں تاکید آئی ہے۔

منافقوں والی نماز:

(حدیث) حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے فرمایا کہ یہ منافقوں کی نماز ہوتی ہے کہ انتظار کرتے کرتے عصر کو اتنا لیٹ کر دیتے ہیں کہ سورج غروب ہونے کے قریب آ جاتا ہے۔

نماز پڑھنے کا صحیح طریقہ:

حضور پاک ﷺ کے سامنے ایک صحابی نے جلدی جلدی نماز پڑھی...... جیسے اکثر ہمارے بھائی نماز پڑھتے ہیں، اللہ اکبر اللہ اکبر! ایک سجدے میں سیدھے نہیں ہوتے اور دوسرے سجدے میں چلے جاتے ہیں، رکوع سے سیدھے کھڑے نہیں ہوتے کہ سیدھے سجدے میں چلے جاتے ہیں...... اس طرح ایک صحابی نے نماز پڑھی، پھر حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں آئے، سلام کیا۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:

"اِرْجِعْ فَصَلِّ، فَإِنَّكَ لَمْ تُصَلِّ." [صحیح بخاری، رقم: ۷۵۷]

جاؤ، نماز پھر پڑھو، تمہاری نماز نہیں ہوئی۔ وہ بیچارا گیا، اس نے پھر سے نماز پڑھی، واپس آ گیا، حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں آیا۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: جاؤ نماز پڑھو، تمہاری نماز نہیں ہوئی۔ اس نے جا کر تیسری مرتبہ نماز پڑھی اور پھر آ کر سلام کیا۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ اللہ کے بندے! پھر نماز پڑھو، تمہاری نماز نہیں ہوئی۔ اس نے کہا: حضور! میں دیہاتی ہوں، میں نے اسی طرح سے نماز یاد کی ہوئی ہے، میں تو جتنی مرتبہ پڑھوں گا اسی طرح پڑھوں گا۔ اب آپ مہربانی فرما کر مجھے نماز سکھلا دیں۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اللہ کے بندے! جب رکوع میں جاؤ تو اطمینان سے پوری کمر سیدھی ہو جائے، جب جھک جاؤ تو اپنے گھٹنوں کو ذرا مضبوطی کے ساتھ پکڑ لو اور پھر بڑے آرام سے تسبیح کہو تو شاید حدیث کے الفاظ یہیں تک بیان کیے گئے ہیں تو تم کو پتہ تو ہو کہ میں کیا کہہ رہا ہوں، ایسے تو نہیں کہ پتہ ہی نہیں کہ میں کیا کہہ رہا ہوں، جلدی جلدی میں ایسے بالکل نماز ادا نہیں

ہوتی۔ اللہ تبارک وتعالیٰ رحمت فرمائے۔

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ جب تم رکوع سے اُٹھو تو ''سَمِعَ اللّٰہُ لِمَنْ حَمِدَہٗ'' کہو، پورے جوڑ اپنی جگہ پر آ جائیں، سیدھے کھڑے ہو جاؤ، پھر کھڑے کھڑے ''رَبَّنَا لَکَ الْحَمْدُ'' کہو۔ پھر تم سجدہ میں جاؤ تو سجدہ بھی پورے اطمینان سے کرو۔ اپنے ہاتھوں کو ایسے رکھو کہ ان کا رخ بھی قبلہ کی طرف ہو اور کلائیوں کو یوں نہ بچھاؤ، بلکہ اپنے بازو زمین سے اوپر ہوں اور پہلو پیٹ سے دور ہو اور کم از کم تین بار ''سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی'' کہو اور اگر اللہ توفیق دے تو سات مرتبہ بھی کہہ سکتے ہو۔ اگر نفل پڑھ رہے ہو تو اس سے زیادہ بار بھی کہہ لو تو کوئی منع نہیں ہے، کیونکہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ جتنا لمبا سجدہ ہو، بندہ اتنا ہی اللہ کے قریب ہوتا ہے؛ کیونکہ سجدہ انسان کے تذلل کی آخری انتہا ہے کہ آدمی اپنے چہرے کو مٹی میں ڈال کر کہتا ہے کہ یا اللہ! اب میں تیرے دروازے پر آ گیا، میرا سب سے زیادہ عزت والا بدن کا حصہ چہرہ تھا، اس عزت والے حصہ کو میں نے مٹی میں ملا دیا ہے۔ جب اس انتہاء پر آتا ہے تو مولا کے قریب ہو جاتا ہے، فرمایا کہ جب سجدہ سے اُٹھو تو سیدھے بیٹھو اور ''اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِیْ وَ ارْحَمْنِیْ وَ ارْزُقْنِیْ وَ اهْدِنِیْ وَ اعْفُ عَنِّیْ'' یہ دعا پڑھو۔ پھر دوسرا سجدہ کرو، یہ نہیں کہ بغیر تعدیل ارکان کے اللہ اکبر کہتے رہو۔ اس طرح نماز ناقص ہوتی ہے، اس لیے حکم ہے نمازوں کو قائم کرو۔

علمی نکات:

قرآن پاک ایسی مذہبی کتاب نہیں کہ صرف تبرک کے لیے پڑھی جائے۔ قرآن کوئی وظیفہ کی کتاب بھی نہیں کہ آپ اس کو بطور وظیفہ پڑھیں گے اور آپ کو ثواب ہوگا، کسی کو تکلیف ہوگی اور آپ پڑھ کر پھونک ماریں گے تو وہ ٹھیک ہو جائے گا اور اگر کوئی بندہ مر جائے تو اس کے اوپر پھرا لیں گے اور وہ بخشا جائے گا۔ اللہ کا قرآن تو ایک جامع اور کامل و مکمل زندگی ہے، نظامِ حیات اور دستورِ حیات ہے جو اوپر سے لے کر آخر تک ہر مسئلے پر اپنا ایک نظریہ بیان کرتا ہے، جو اس پر عمل کرے گا وہ کامیاب ہوگا۔

﴿اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ﴾ [آل عمران:۱۹]... ﴿وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝﴾ [آل عمران:۸۵]

مسلمانوں کے داخلی معاملات:

اور جب یہ دین کامل و مکمل ہے تو اس نے ساری باتیں بتائیں۔ اس نے ہمیں خارجی اور داخلی تعلقات کے

بارے میں بتایا ہے۔ اسلام ہمیں یہ تعلیم دیتا ہے کہ داخلی طور پر تم ایسے بن جاؤ کہ بالکل شیر و شکر ہو۔ اسلام ہمیں یہ سبق دیتا ہے کہ یہ مومنوں کی ایک جماعت ہے، نہ ان کے اندر کوئی رنگ کا جھگڑا کہ یہ کالا، پیلا یا سفید ہے، نہ ان کے اندر زبان کا جھگڑا کہ یہ فارسی النسل اور یہ عربی النسل ہے، نہ ان کے اندر کسی بات کا تفاخر کہ یہ امیر ہے یا غریب ہے۔ اوس اور خزرج ساری عمر ایک دوسرے کے دشمن تھے، لیکن جب اسلام لائے تو بھائی بھائی بن گئے۔ اور اسلام نے ہمیں پہلا سبق یہ دیا کہ ایمان لانے والے بھائی ہیں۔ اب مومن مشرق یا مغرب میں ہے وہ ایک دوسرے کا بھائی ہے۔ جب کلمہ پڑھ لیا تو ہر کلمہ پڑھنے والا دوسرے کا بھائی ہے۔ ''لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ'' اور بھائی بننے کا معنی یہ ہوتا ہے کہ بھائی بھائی کا درد محسوس کرے۔

آپ دیکھ لیں کہ مہاجرین جو مکہ سے تشریف لے گئے تھے، بڑے بڑے سردار گھرانے کے لوگ تھے، بڑے خاندان والے، مگر جب مدینہ پہنچے تو دو تین کپڑوں میں پہنچے۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ دیکھو مدینہ والو! یہ تمہارے بھائی ہیں، مہاجر ہیں، لٹے ہوئے ہیں، گھر ان کے چھن گئے ہیں، اولادیں ان کی علیحدہ ہوگئیں، مال و متاع ان کا چھن گیا، یہ مہاجر ہو کر محض دین اسلام اور ایمان کے لیے، اللہ کے نبی ﷺ کے لیے مدینے آئے ہیں تو میں چاہتا ہوں کہ تم ایک دوسرے کو بھائی بنالو۔ انصار نے کہا: ''آمَنَّا وَ صَدَّقْنَا يَارَسُوْلَ اللّٰهِ!'' حاضر یارسول اللہ! بالکل ہمارے بھائی ہیں۔ اچھا! بھائی بنانے کا مقصد کیا تھا کہ ایک دوسرے کی مدد کریں۔ انصاریوں نے کہا: ہمارے گھر میں دو کمرے ہیں: ایک کمرہ تمہارے لیے۔ اگر میرے پاس کھجور کے چار درخت ہیں تو دو تمہارے۔ میرے پاس دو بکریاں ہیں تو ایک بکری تمہاری، حتیٰ کہ بعض انصار صحابہ نے تو یہ بھی پیشکش کی کہ میری دو بیویاں ہیں، ان میں سے جس کو چاہو پسند کرو، میں اس کو طلاق دے دیتا ہوں، عدت کے بعد شادی کر لینا۔ جب بھائی بن گئے تو میں شادی والا اور تم بغیر شادی کے کیوں رہو؟ لیکن مہاجرین کی بھی تو غیرت تھی، انہوں نے کہا: اللہ تمہیں جزائے خیر دے، تم نے تو ہمیں بھائی بنالیا، ہمیں گھروں میں جگہ دے دی، بس اللہ تمہیں برکت دے، اللہ تمہیں نصرت دے۔ یہ نہیں کہ تمہارے سروں پر سوار ہو جائیں کہ اب ہم یہ کہیں کہ ہم مدینہ والوں کو نکال دیں اور خود یہاں رہ جائیں۔ بالکل نہیں! گھر، بیویاں اور مال سب تمہیں مبارک، اولادیں اور باغ بھی تمہارے، ہمیں بس ایک آدمی رسی دے دو، کوئی کلہاڑی دے دو، ہم لکڑیاں کاٹ کر بیچیں گے اور کھائیں گے۔

[مسند احمد بن حنبل: ۳/۲۷۳، اتحاف السادۃ المتقین: ۸/۲۰۲، جمع الجوامع، رقم: ۹۹۲۰، کنز العمال، رقم: ۲۷۳۸]



اب ہماری داخلی پالیسی یہ ہوئی: ﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ﴾ [الحجرات:١٠] کہ مومن بھائی ہیں، ﴿رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ﴾ [الفتح:٢٩] آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ رحمت کرنے والے اور پھر نبی پاک ﷺ نے کتنی تاکید کردی: ''مَنْ لَا يَرْحَمْ لَا يُرْحَمْ'' [صحیح بخاری، رقم:٥٩٩٧] کہ تم رحم نہیں کروگے تو تم پر بھی رحمت والا رحم نہیں کرے گا۔ اور فرمایا کہ جو کوئی اپنے سے کمزور والے پر رحم کرے، رحمت والا اس پر رحم کرے گا۔ قرآن نے فرمایا: ﴿وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ﴾ [التوبۃ:٧١] اے ایمان والو! تم ہی دراصل ایک دوسرے کے دوست ہو۔ مومن، مومن کا دوست، بھائی اور خیر خواہ ہے۔ پھر کیا سبق دیا: ﴿اَلْاَخِلَّآءُ يَوْمَئِذٍۢ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِيْنَ﴾ [الزخرف:٦٧] فرمایا کہ یاد رکھو! تمام دوستیاں آخرت میں ختم ہو جائیں گی، لیکن ایمان والوں کی دوستیاں قائم رہیں گی۔ جو دوستی اللہ اور اس کے رسول اکرم ﷺ کے لیے ہو، جو اللہ کے لیے محبت کرے، اللہ کے لیے بغض رکھے، اللہ کے لیے دے دے، اللہ کے لیے روک لے، اس نے اپنا ایمان پورا کرلیا۔

یہ ہماری داخلی پالیسی تھی جو اسلام نے ہمیں سکھائی کہ ہم کیسے رہیں؟ کبھی جھگڑا نہ کریں کہ یہ اُردو، سندھی، پنجابی یا پشتو یا کوئی اور زبان بولتا ہے۔ کوئی عربی، چینی، ہندی بولے، مسلمان تو بس ایک ہو جائیں، آپس میں اتحاد و اتفاق ہو۔ ﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا﴾ [آل عمران:١٠٣] فرمایا کہ اللہ کی رسّی (قرآن) کو آپس میں مضبوطی سے پکڑلو اور آپس میں جھگڑے اور اختلاف نہ کیا کرو، گویا کہ یہ ہمارا داخلی مسئلہ تھا۔

مسلمانوں کے لیے خارجی معاملات:

اب ہم نے باہر والوں سے خارجی طور پر بھی تو تعلقات رکھنے ہیں، وہ کیسے رکھیں؟ فرمایا: ﴿وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ﴾ [الفتح:٢٩] کافروں کے مقابلے پر چٹان بن جاؤ، کافروں کے مقابلہ پر سخت ہو جاؤ، کافروں کے مقابلے پر کبھی نرمی نہ کرنا۔ فرمایا کہ کفار آپس میں دوست ہیں، تمہارے کبھی دوست نہیں بن سکتے۔ فرمایا: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّيْ وَعَدُوَّكُمْ اَوْلِيَآءَ﴾ [الممتحنۃ:١] مسلمانو! جو میرا اور میرے رسول ﷺ کا دشمن ہے اس کو دوست کبھی نہ بنانا۔ ہمیں ہدایت دی گئی کہ ہم خارجی معاملات کیسے کریں؟ فرمایا: کفار کے مقابلے پر مضبوط رہو، ان کے ساتھ معاملات رکھو، لیکن قلبی تعلق نہیں، ہمدردی نہیں، قلبی واسطہ نہیں۔ ان سے خیر اور بھلائی کی امید کبھی نہ کرنا، وہ تمہارے دشمن ہیں اور تم کتنی باتیں ان کی مانتے جاؤ، وہ کبھی تمہارے ساتھ راضی نہیں ہوں گے۔

کفار کے مسلمانوں پر مظالم:

فرمایا کہ یہ یہودی اور نصرانی تم سے کبھی راضی نہیں ہوں گے، مگر یہ کہ تم اپنا دین چھوڑ کر یہودی اور نصرانی بن جاؤ تو پھر راضی ہو جائیں گے کہ ہمارے کروڑوں مسلمانوں نے ہندوؤں کے ساتھ زندگی گزاری، ایک ملک میں رہ کر زندگی گزاری، کبھی ان کے کسی عبادت خانے کو نہیں چھوا، کبھی ان کے مذہبی معاملات میں مداخلت نہیں کی، کبھی ان کے ساتھ دشمنی نہیں کی، کبھی کسی مسئلے سے ان کو نقصان نہیں پہنچایا، لیکن جب بھی ہندو کو موقع ملا اس نے مسلمانوں کے ساتھ کیا سلوک کیا؟ جب بھی کافر کو طاقت ملی اس نے مسلمانوں کے ساتھ کیا کیا؟ مسلمانوں کی مسجدیں اس نے شہید کیں، عصمتوں کو پامال کیا، ہزاروں مسلمان عورتوں کی اجتماعی طور پر آبرو ریزی کی، مسلمان عورتوں کو (نعوذ باللہ) بغیر کپڑوں کے گھروں سے نکال کر ان کی فلمیں بنائی گئیں، مسلمان عورتوں کے پستان کاٹے گئے اور کئی کئی افراد ان کے ساتھ بدفعلی کی اور پانی مانگنے پر ان پر پیشاب کرتے رہے۔ کیا ایسی قوموں سے تم کسی بھلائی کی توقع کر سکتے ہو؟ اسلام نے تو واضح کر دیا: ﴿وَالَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا﴾ [الفتح:۲۹] مسلمانوں کو اللہ کے قرآن نے واضح کر دیا: ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّيْ وَعَدُوَّكُمْ اَوْلِيَآءَ﴾ [الممتحنۃ:۱] قرآن نے واضح کر دیا کہ کبھی ان کے سامنے نہ جھکنا: ﴿يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ اتَّقِ اللّٰهَ وَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۟ۙ﴾ [الاحزاب:۱] میرے مدنی ﷺ! کبھی کافروں اور منافقوں کی بات نہ ماننا، کبھی ان کی کسی بات پر آپ قائل نہ ہو جانا، یہ دشمن ہیں۔ آپ یہ نہ سمجھیں کہ ہم کمزور ہیں، ان کے بغیر گزارہ کیسے کریں؟ فرمایا: ﴿وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ﴾ [النساء:۸۱] اللہ پر توکل کر لو تو جس نے اللہ پر توکل کر لیا اللہ اس کے لیے کافی ہے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ﴾ [الطلاق:۳] جس نے اللہ پر توکل کیا اللہ اس کے لیے کافی ہے اور پھر اس کے لیے اسلام نے ہمیں نمونے دکھلا دیئے۔

کفار مل کر مسلمانوں پر حملہ اور جنگ کرتے ہیں:

اسلام نے ہمیں دکھایا کہ اس وقت غور کر لو جب میرے پاک نبی ﷺ مدینہ منورہ میں تھے اور صحابہ کی جماعت مدینہ منورہ میں تھی اور تمام کفر کی طاقتیں مل گئیں۔ تمام کفار یعنی یہود کے بنو قریظہ اور بنو نضیر اور مکہ کے کفار بنو ثقیف، بنو غطفان یہ تمام جتنے بڑے بڑے قبائل تھے، سب مل کر اکٹھے ہو گئے اور عہد کیا کہ اکٹھے ہو کر مدینہ پر

حملہ کرو اور مسلمانوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم کر دو۔ یعنی آپ اندازہ لگائیں کہ چودہ سو سال پہلے بھی کفر اسلام کے خلاف ایک تھا اور آج بھی کفر اسلام کے خلاف ایک ہے۔ جہاں اسلام کو مٹانے کا وقت آئے گا سب کافر مل جائیں گے، جہاں مسلمانوں کو تکلیفیں پہنچانے کا وقت آئے گا، تمام کفر کی طاقتیں مل جائیں گی۔

غزوۂ خندق میں کفار کا اتحاد:

حضور اکرم ﷺ کے زمانے میں سب مل گئے اور جب حضور اکرم ﷺ کو پتہ چلا کہ اتنی افواج آرہی ہیں۔ اس زمانے میں بارہ ہزار کے لشکر نے مدینہ کو گھیر لیا۔ جنگجو تیار ہو کر آئے تھے اور مسلمانوں کی کل تعداد تین ہزار تھی۔ یعنی اتنا بڑا واقعہ پیش آیا کہ حضور پاک ﷺ کو حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے مشورہ سے خندق کھودنا پڑی۔ جب جنگ اور دشمن زیادہ ہو اور خطرہ بہت ہو تو شہر کے باہر ایک خندق یا ایک نہر بنا دیتے، دشمن اسے عبور نہیں کر سکتا تھا۔ ادھر اپنے مورچے لگا کر بیٹھ جاتے ہیں جو بھی عبور کرے گا، تیروں پر رکھ لیں گے؛ کیونکہ ہم تو تھوڑے ہیں؛ وہ زیادہ ہیں۔ حضور اکرم ﷺ نے یہ خندق کھودی۔ یہ بڑا مشہور واقعہ ہے اور اندر جو بنو قریظہ یہودی بیٹھے ہوئے تھے، وہ تو مدینہ کے اندر تھے، وہ تو مدینہ سے چند میل کے فاصلے پر تھے اور ان کی طاقت، جائیدادیں، قلعے وغیرہ سب کچھ تھے، بارہ سو تو اکیلا ان کے پاس لڑاکا آدمی موجود تھا۔ بعض روایات میں سات سو اور بعض میں نو سو یا بارہ سو آتا ہے، وہ بھی ان سے مل گئے جو باہر سے آرہے ہیں یعنی اندر سے بھی دشمن موجود اور باہر بھی پوری قوت نے انہیں گھیرے میں لے رکھا تھا۔

مشکل وقت میں صرف اللہ سے مدد حاصل کریں:

اتنی دہشت اور خوف تھا، میرے پاک نبی ﷺ نے ایک رات میں اشارہ فرمایا کہ میرے صحابہ میں کون ہے جو دشمنوں کے حالات لے کر آئے اور میرے دشمنوں کا پتہ کرے؟ ان کے ارادے کیا ہیں اور تعداد کتنی ہے؟ اور حملہ کرنے کے بارے میں کیا منصوبے بنا رہے ہیں؟ ان کی خبر لے آئے۔ صحابہ کہتے ہیں کہ ہم جرأت نہیں ہوئی کہ ہم جواب دیں۔ ہم چپ کر گئے کہ کیسے جائیں؟ دشمن کے کیمپ میں اتنی شدید سردی اور پھر اتنی ٹھنڈی ہوا اور اتنی بڑی دشمن کی طاقت اور اس کے اندر گھس کر جانا اور خبر لے کر آنا کوئی معمولی بات تو نہیں تھی، واپس آنے کا کوئی یقین ہی نہیں تھا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کہتے ہیں کہ ہم تو ڈر کے مارے چپ ہو گئے، لیکن حضور اکرم ﷺ نے پھر بھی فرمایا کہ کون

ہے جو دشمن کے کیمپ سے ان کی خبر لے کر آئے؟ صحابہ رضی اللہ عنہم کہتے ہیں کہ ہم تیسری مرتبہ پر بھی چپ رہے کہ ہمت ہی نہیں پڑتی تھی۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ بیٹھے تھے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حذیفہ! اُٹھو اور حال احوال لے کر آؤ، لیکن ایک بات یاد رکھنا! میں تمہیں معلومات لینے کے لیے بھیج رہا ہوں، ایسی کوئی حرکت نہیں کرنا کہ اُلٹا دشمن کو ہم سے لڑوا دو۔ صرف یہ معلوم کرنا کہ ان کے ارادے، طریقہ جنگ اور وہ کس جانب سے حملہ کرنا چاہتے ہیں؟ ان کی تعداد کیا ہے؟ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم تھا، خدا کی قسم! میں کھڑا تو ہو گیا تھا، مگر مجھ میں ہمت نہیں پڑ رہی تھی، ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے کہ اتنے دشمنوں کے اندر ایسی شدید سردی میں کیسے جاؤں؟ کیونکہ اب تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا نام لے لیا تھا تو انکار تو نہیں ہو سکتا تھا، پہلے تو ایک عام بات تھی کہ کون جائے گا؟ لیکن اب تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا نام لے لیا۔ حذیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں کھڑا ہو گیا اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یا اللہ! اس شدید سردی کے موسم میں میرے صحابی (جو قوم کی خبر لینے کے لیے جا رہا ہے) ان کی تُو حفاظت فرما اور ان کو خیریت سے واپس لے آ۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا ایسے لگی کہ میں جونہی نکلا تو میں سمجھا کہ میں ایسے گرم حمام میں جا رہا ہوں جس میں سردی ہی نہیں۔ ہم جو اندر بیٹھ کر بھی کانپ رہے تھے باہر یوں لگا کہ جیسے میرے ارد گرد گرمی کا انتظام کیا گیا ہے اور میں جہاں جہاں سے گزر رہا ہوں یوں لگتا تھا جیسے کسی کو پتہ نہیں چل رہا تھا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا تھی، حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ ساری معلومات لے کر واپس آ گئے۔ انہوں نے آ کر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر دی کہ دشمنوں کی تعداد بارہ ہزار ہے اور دشمن مسلح ہے اور تمام کے تمام آپس میں متحد ہیں اور ان کا ارادہ یہ ہے کہ محاصرہ اور لمبا کرو۔ اس طرف سے ہم نے رسد کاٹی ہوئی ہے، مدینہ والوں کو گندم اور پانی نہیں پہنچ سکتا، نہ انہیں کہیں سے کوئی امداد پہنچ سکتی ہے۔ ایک مہینے کے بعد تو یہ خود بخود ہتھیار ڈال دیں گے۔ ہمیں جنگ کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی۔ ایسی حالت میں میرے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اللہ کے آگے ہاتھ اُٹھائے اور عرض کیا: اے اللہ! تیرے سوا ہماری کون مدد کرے گا؟ ہمیں اس واقعہ سے سبق ملا کہ جب ایسے حالات پیدا ہو جائیں تو کس سے مانگو؟ صرف اللہ سے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا مانگی اپنے اللہ سے، اور آج کا مسلمان...... اللہ معاف فرمائے...... کبھی کافروں سے اور کبھی غیروں سے مدد مانگتا ہے۔ جب بات ہی اُلٹ ہو گئی تو اللہ کی مدد کیسے آئے؟ جبکہ قرآن نے یہ بتا دیا: ﴿وَمَا النَّصْرُ إِلَّا مِنْ عِندِ اللَّهِ الْعَزِيزِ الْحَكِيمِ ۝﴾ [آل عمران: ۱۲۶] کہ مسلمانو! تمہاری مدد اللہ کے سوا کہیں سے نہیں آتی۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب دعا

مانگی تو اللہ نے قرآن نازل فرمایا کہ میرے نبی! جو میرے اوپر توکل کرتے ہیں، ان کی حفاظت میں خود کرتا ہوں۔ اللہ نے فرمایا کہ جب تم نے میرے آگے پھیلائے ہیں تو میں نے بھی ایک لشکر بھیجا ہے جو تمہیں نظر بھی نہیں آتا اور ہم نے ہوا کو حکم دیا ہے کہ کافروں کو اُڑا دو اور ایسے حکم دیا کہ یہ درمیان میں خندق ہے اس طرف دشمن ہیں اور دوسری طرف حضور اکرم ﷺ ہیں، ہوا دشمنوں کی طرف ہے اور ادھر مسلمانوں کی طرف نہیں ہے۔ ہوا بھی ایسی اللہ کے حکم کے تابع ہے کہ جہاں حکم ملا کہ خبردار! ادھر مدینہ والوں کو پریشان نہیں کرنا، وہ آرام سے سوتے رہیں، نیند کریں۔ ادھر ہمارے اور ہمارے نبی ﷺ کے دشمن ہیں، ان کو ہم نے سبق سکھانا ہے۔ اس پر آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ نے بادِ صبا بھیج کر میری مدد کی اور قوم عاد کو ہلاک کیا تو تبور والی ہوا بھیجی، ہوا ایسی چلی کہ خیمے اُڑ گئے۔ جانور، برتن، کھانے وغیرہ سب اُڑ گئے اور یوں پتھر برسائے اور مٹی پڑی کہ ہاتھ بھی نظر نہ آئے۔ دشمنوں نے بھاگنا شروع کیا اور جس کا جدھر منہ آیا، بھاگ پڑا۔ اب صبح کی جب نماز ہوئی تو لازمی بات ہے کہ بارہ ہزار آدمی ہوں تو شور ہوتا ہے، کوئی آواز اور خیمہ نہیں۔ صحابہ نے جا کر دیکھا تو وہاں تو کوئی بندہ ہی نہیں۔ انہوں نے آ کر کہا کہ حضور! وہاں تو کچھ نہیں، پتہ نہیں وہ سب کہاں گئے؟ حضور اکرم ﷺ نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا اور واپس مدینہ تشریف لے آئے اور آپ ﷺ نے اپنی زرہ مبارک بھی اُتار دی۔ اُتار کر بیٹھے ہی تھے کہ جبرائیل علیہ السلام آ گئے، کہنے لگے کہ حضور! آپ نے زرہ اُتار دی ہے، لیکن ہم نے تو ابھی تک نہیں اُتاری اور میں کافروں کو فلاں مقام تک بھگا کر آیا ہوں، وہ جوں دوڑتے تھے تو ہم فرشتے اللہ تعالیٰ کے حکم سے آوازیں دیتے تھے کہ پیچھے سے مسلمانوں کی فوج چڑھی آ رہی ہے اور دوڑتے دوڑتے ان کا ستیاناس ہو گیا، اب وہ کبھی مدینہ کا رخ نہیں کریں گے۔ اب بنو قریظہ جو آپ کے مدینے میں دشمن ہیں، ان کا محاصرہ کر کے آپ کو انہیں ختم کرنا چاہیے اور میں جا کر ان کے دلوں میں رعب ڈالتا ہوں اور آپ جا کر محاصرہ کریں۔ یہ کیا تھا؟ اگر حضور پاک ﷺ مسلمانوں کی مدد کی دعا مانگتے، ویسے ہی خندق کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ سبق دیا گیا کہ نظر اپنے اسباب پر رکھو، لیکن بھروسہ اپنے اللہ پر رکھو اور غیر سے امید نہ لگاؤ اور جب دشمن مقابلہ پر آ جائے تو تمہارے پاس علاج کیا ہے کہ نماز قائم کرو۔

مصیبت کے موقع پر اذان دینے کا حکم:

ہمارے ملک میں ایک نیا رواج ہے کہ کوئی مصیبت آ جائے تو اذان دیتے ہیں۔ پتہ نہیں ہمارے مولویوں کو یہ

مسئلہ کہاں سے ملا ہے؟ یہ تو ہم نے پڑھا ہے اور حدیثوں میں آتا ہے کہ حضور اکرم ﷺ کو جب کوئی مشکل اور مصیبت پیش آجاتی تو آپ ﷺ جلدی سے نماز شروع کر دیتے اور اللہ نے بھی حکم دیا ہے: ﴿وَاسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ۚ وَإِنَّهَا لَكَبِيرَةٌ إِلَّا عَلَى الْخٰشِعِينَ﴾ [البقرۃ: ۴۵] کہ ایمان والو! کوئی مصیبت پڑ جائے تو صبر اور نماز سے مدد پکڑو۔ اسی لیے حکم ہے کہ تم پر جیسی کوئی مصیبت آجائے تو فوراً نماز شروع کر دو، فوراً اللہ کے سامنے سجدہ میں گر اسی کو علماء نے صلوٰۃ الحاجۃ کے نام سے لکھا ہے کہ جب کوئی مصیبت آجائے تو اللہ کے سامنے دو رکعت نماز پڑھو، اس کے آگے اپنی مشکل کشائی کراؤ، اللہ سے مدد مانگو۔ اسی لیے حکم ہے کہ چاند کو گرہن لگ جائے تو نماز پڑھو، سورج گرہن لگ جائے تو نماز پڑھو، کوئی مصیبت آجائے تو ﴿أَقِيمُوا الصَّلٰوةَ﴾ (نماز قائم کرو)۔ لیکن ہمارے لوگوں نے نیا مسئلہ نکالا ہے کہ اذان دو۔ اصل میں اذان ایک آدمی کو دینی پڑتی ہے، تکلیف تو کوئی ہوتی ہی نہیں۔ ایک آدمی لاؤڈ سپیکر لگا لیتا ہے اور سارے محلے والوں کو بھی نہیں سونے دیتا۔ ایک اُترتا ہے تو دوسرا چڑھ جاتا ہے۔ ساری رات یہی کام ہوتا ہے، لیکن نماز نہ محلے والے پڑھنے آتے ہیں اور نہ مولوی خود پڑھتا ہے، صرف اذانوں پر زور ہے۔ اصل مقصد جو ہے وہ حاصل نہیں ہوتا۔

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ اہل کتاب چاہتے ہیں کہ تمہیں ایمان سے کفر کی طرف لوٹائیں۔ پھر حکم دیا کہ کیسے مقابلہ کرو؟ فرمایا: ﴿وَأَقِيمُوا الصَّلٰوةَ﴾ [البقرۃ: ۴۳] کہ تم اپنی عبادت پر قائم رہو۔ عبادت بدنیہ اور مالیہ پر قائم رہو۔ اللہ کے راستے میں خرچ کرو اور جب تمہاری نمازیں قائم اور ٹھیک ہو جائیں تو اللہ کی مدد اور نصرت آجائے گی۔ آج ہم لوگ یہ بنیادی فلسفہ نہیں سمجھتے کہ جب ہم نماز میں اللہ کے آگے جھکتے ہیں تو کہتے ہیں کہ اے اللہ! ہم عاجز ہیں، ہم خود کو کچھ نہیں سمجھتے، ہم تو تیرے دروازے پر گر گئے تو جب ہم سب سے بڑی قوت کو اپنے ساتھ کر لیتے ہیں تو چھوٹی قوتیں ہمارا کیا بگاڑ سکتی ہیں؟

اس کا یہ معنی نہیں کہ آلات اور اسباب نہ اپناؤ۔ ورنہ حضور اکرم ﷺ بھی خندق نہ کھودتے۔ آلات اور اسباب بھی بناؤ اور اپنی قدر امکان کوشش بھی کرو، لیکن اصل بھروسہ اور تعلق اپنے اللہ کے ساتھ جوڑو۔ اور یہ فرمایا کہ نماز کے ساتھ زکوٰۃ بھی ادا کرو۔ ایسا نہ ہو کہ غریب اور امیر کی لڑائی ہو جائے۔ وہ غریب ہوتا جائے اور تم دولت مند بنتے جاؤ، اپنی دولت میں ان کو بھی شریک کرو اور مسلمان جب صحیح معنی میں زکوٰۃ ادا کرنا شروع کر دیں تو کسی محلے میں کوئی غریب نہیں رہ سکتا۔ اور فرمایا کہ جو تم دے رہے ہو، یہ نہ سمجھو کہ ضائع ہو گیا، بلکہ جو دے رہے ہو وہ آگے اللہ کے ہاں

محفوظ ہے اور پھر جو تم عمل کر رہے ہو، چاہے عبادت بدنیہ ہو یا مالیہ ہو، وہ تمہارے عمل کو دیکھنے والے ہیں کہ تم دکھاوے کے لیے کر رہے ہو یا دل سے کر رہے ہو۔

اس لیے مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ نے ان آیات میں ان اعمال کی ترغیب دی ہے جن سے تم کو نفع پہنچے اور جن کا فائدہ تمہیں قیامت والے دن ملے اور اس کی وجہ سے دنیا میں بھی اور قیامت میں بھی اللہ کی مدد آئے۔ بعض مفسرین نے فرمایا کہ یہ اللہ کی طرف سے خبر ہے کہ اللہ پاک نے مومنوں کو حکم دیا تھا تو اللہ پاک فرماتے ہیں کہ تم جو عمل کرتے ہو، خواہ اچھا کرو یا بُرا، ظاہری طور پر کرو یا چھپ کر، اللہ کے آگے کوئی چیز چھپی ہوئی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال کا تمہیں بدلہ دیں گے۔

ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ﴿اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ﴾ یہ جملہ باعتبار ظاہر خبر ہے، مگر اس کے اندر وعظ بھی ہے، وعدہ بھی ہے کہ اچھا عمل کرو گے تو بدلہ دوں گا، وعید بھی ہے کہ بُرا کرو گے تو سزا دوں گا اور اس میں حکم اور زجر بھی ہے۔ اللہ پاک نے قوم کو خبر دی کہ میں تمہارے اعمال کو دیکھنے والا ہوں۔ تاکہ وہ پوری محنت کے ساتھ عمل کریں اور وہ عمل اللہ کے ہاں ذخیرہ ہوں گے اور اللہ ان کا ثواب دیں گے۔

﴿وَقَالُوْا لَنْ یَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰی ؕ تِلْكَ اَمَانِیُّهُمْ ؕ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ﴿۱۱۱﴾ بَلٰی ۚ مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗۤ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۪ وَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ﴿۱۱۲﴾﴾ [البقرۃ:۱۱۱،۱۱۲]

”اور (اہل کتاب) کہتے ہیں: ہرگز داخل نہ ہوگا جنت میں، مگر جو یہودی ہوگا یا عیسائی، یہ ان کی جھوٹی خواہشات ہیں، (ان سے) کہہ دیجیے اپنی کوئی دلیل لاؤ اگر تم سچے ہو۔ ہاں جس نے خود کو اللہ کے سپرد کیا اور وہ موحد تھا اس کے لیے اس کا اجر اس کے رب کے پاس ہے، نہ ایسے لوگوں پر خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

آیات کا ماقبل سے ربط:

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے یہود کا ایک دعویٰ پیش کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم ہی جنت میں داخل ہوں گے۔ ان کے مقابلے میں یہ دوسرا فرقہ نصرانیوں کا ہے، نصرانی صرف اپنے جنت میں داخل ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ ان

آیات کا پچھلی آیات سے تعلق یہ ہے کہ یہود نسخ کے قائل نہیں تھے تو اسی وجہ سے یہود اس بات پر بھی اڑے ہوئے تھے کہ تورات اللہ کی کتاب ہے، جو اس پر عمل کرے گا بس وہی جنت میں جائے گا؛ کیونکہ یہی بس اللہ کا حکم ہے اور یہ حکم ختم نہیں ہوسکتا۔ نصاریٰ نے بھی اس کے تقابل پر یہ کہا کہ عیسیٰ علیہ السلام بھی اللہ کے رسول ہیں اور انجیل بھی اللہ کی کتاب ہے، تورات پہلے اور انجیل بعد میں ہے۔ لہٰذا انجیل پر عمل کرنے والے یعنی صرف نصاریٰ جنت میں جائیں گے، ان کے علاوہ کوئی نہیں جائے گا۔ پہلا دعویٰ ان کا یہ تھا۔ اب اسی دعویٰ میں وہ ذرا آگے بڑھتے گئے اور کہا کہ جو یہودی ہے، چاہے تو وہ تورات پر عمل کرے یا نہ کرے وہ جنت میں جائے گا، یعنی جو یہودی کے گھر میں پیدا ہوگیا، یہود کے ملک میں رہ کر اپنا اندراج یہودیوں میں کرانے کے بعد یہودی ہے، چاہے وہ تورات پر عمل نہ بھی کرتا ہو، نصرانیوں نے بھی یہی دعویٰ کردیا کہ جو شخص نسلی طور پر نصرانی ہے، انجیل پڑھے یا نہ پڑھے، جنت میں صرف نصرانی جائیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ آج دنیا میں جہاں جہاں نصرانی موجود ہیں، انہیں اپنے مذہب کا کوئی پتہ نہیں، وہ صرف کہتے ہیں کہ ہم نصرانی ہیں اور ان کی مذہب سے بیگانگی کا یہ عالم ہے کہ ان کے جوگرجے اور عبادت گاہیں ہیں، وہ سالہا سال سے ویران پڑی ہوئی ہیں۔ اب ان لوگوں نے ان کو بیچنا شروع کردیا ہے کہ عمارت ضائع ہونے کے بجائے پیسے مل جائیں، لیکن دعویٰ یہ ہے کہ جنت میں صرف نصرانی جائے گا۔ اور ان کی دیکھا دیکھی مسلمانوں میں چند گمراہ فرقوں نے بھی یہی دعویٰ کرنا شروع کردیا ہے کہ جو ان کے فرقہ میں شامل ہوگیا وہ جنت میں جائے گا، خواہ کوئی عمل بھی نہ کرے اور خواہ توحید و رسالت کا عقیدہ بھی نہ رکھتا ہو۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے یہود و نصاریٰ کے دعویٰ نقل کرکے مسلمانوں کو تنبیہ کی ہے کہ تم ایسا کبھی نہ کرنا۔

جنت کس کو ملے گی؟

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ ان کی تمنائیں ہیں، خواہشیں ہیں، ورنہ حقیقت سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ آگے اللہ نے فرمایا: چیلنج کرو اہل کتاب کو کہ تم جو دعویٰ کرتے ہو اس کی دلیل دو، صرف زبانی کلامی کہنے سے تو کچھ نہیں ہوجاتا۔ اگر کوئی دلیل ہے تو لے آؤ، کوئی عقلی یا نقلی لے آؤ، تورات وانجیل میں سے کوئی حکم لے آؤ۔ آگے اللہ نے قاعدہ کلیہ بتادیا کہ نہ یہودیوں نے جنت کا ٹھیکہ لیا ہے، نہ نصرانیوں نے اور نہ صرف مسلمان کہلانے والوں نے۔ فرمایا: ﴿بَلٰى ۚ مَنْ أَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ﴾ ہم نے جنت کسی قوم کے لیے نہیں بنائی کہ صرف یہودی جائیں

گے یا صرف نصاریٰ جائیں گے یا صرف مسلمانوں کا لفظ کہلانے والے یا عربی بولنے والے یا گورے یا کالے۔ فرمایا کہ نہیں، جنت میں وہ جائے گا جس نے اپنے آپ کو اللہ کے سپرد کر دیا۔ نام چہرے کا ہوتا ہے، مراد سارا بدن ہوتا ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ﴾ [البقرۃ:۱۴۴] اپنا چہرہ مسجد حرام کی طرف کرو کہ پورے بدن میں سب سے اشرف چہرہ ہے، لہٰذا حکم بھی چہرہ کا ہوتا ہے، لیکن اس سے مراد پورا بدن ہوتا ہے۔

اسلام کا معنی ہے: استسلام یعنی اپنے آپ کو اللہ کے سپرد کر دے کہ مولا! تیرا حکم ہے، میں اس کی تعمیل کروں گا۔ جب اس نے اپنے آپ کو اللہ کے سپرد کر دیا کہ مولا! تیرے حکم کے اتباع میں جو ملے گا اس کی تعمیل کروں گا اور اس کے ساتھ مخلص ہو اور منافق نہ ہو، تو پہلی بات یہ ہے کہ اللہ کے حکم کی اطاعت کرنے والا ہوں۔ دوسری بات یہ ہے کہ وہ اطاعت ظاہری طور پر بھی نہ ہو کہ جب لوگوں کو دیکھا تو لمبی لمبی نمازیں پڑھ لیں اور جب گھر میں ہو تو نماز، روزہ سب عبادتیں ختم۔ کیونکہ منافق کا ایمان قبول نہیں کہ جو ظاہر میں اسلام اسلام کرے اور عمل کافروں والا کرے۔ ہم لوگوں نے آج کل یہی سمجھ لیا ہے کہ ہم چونکہ مسلمان ہیں، ہمارے باپ دادا بھی مسلمان تھے اور ہمارے شناختی کارڈ پر بھی مسلم لکھا ہوا ہے، لہٰذا ہم پکے مسلمان ہیں، ہم تو جنت میں جائیں گے چاہے نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کریں یا نہ کریں، اعمال صالحہ کریں یا نہ کریں، حالانکہ دوسری جگہ اللہ نے وضاحت کر دی۔ فرمایا:

﴿إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ كَانَتْ لَهُمْ جَنَّاتُ الْفِرْدَوْسِ نُزُلًا﴾ [الکہف:۱۰۷]

جو لوگ ایمان لے کر آئے۔ ایمان لانے کی نشانی کیا ہے؟ کہ عمل اچھے کیے جن اعمال کا اللہ نے حکم دیا اور فرمایا: ہم نے ان کی مہمانی کے لیے جنت والے باغ تیار کر رکھے ہیں۔

﴿خَالِدِينَ فِيهَا لَا يَبْغُونَ عَنْهَا حِوَلًا﴾ [الکہف:۱۰۸]

وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے، اس سے کبھی نکلیں گے بھی نہیں، نہ نکلنے کی تمنا کریں گے۔

حوضِ کوثر سے ہٹا دیئے جانے والے:

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: حوضِ کوثر پر آنے والے چند فرشتے لوگوں کو پکڑ کر لا رہے ہوں گے۔ میں کہوں گا: لے آؤ میرے اُمتیوں کو، میں ان کو حوضِ کوثر سے پلاؤں۔ فرشتے جواب دیں گے کہ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے آپ

کے بعد بدعتیں ایجاد کی تھیں تو فرشتے ان کو جہنم میں ڈال دیں گے۔

آپ ﷺ کے سامنے عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا تورات پڑھنے کا واقعہ:

ایک دن حضور اقدس ﷺ تشریف فرما تھے تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو کسی نے تورات کے اوراق دے دیئے تو آپ دیکھ رہے تھے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ پڑھے لکھے آدمی تھے، وہ تورات پڑھنے لگے، حضور ﷺ کے چہرۂ مبارک کا رنگ متغیر ہو گیا، غصے اور جلال میں آ گئے، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ راز دانِ نبوت تھے، وہ سمجھ گئے کہ حضور اکرم ﷺ ناراض ہو گئے ہیں۔ انہوں نے جلدی سے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو اشارہ کیا کہ کیا کر رہے ہو؟ حضور ﷺ ناراض ہو رہے ہیں۔ اب حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے کتاب سے نظر ہٹا کر جب حضرت محمد ﷺ کے چہرے پر ڈالی، جس کی سیرت اور خُلق قرآن تھا تو دیکھا کہ حضور اکرم ﷺ جلال میں ہیں، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ بھی سمجھنے والے تھے۔ فوری طور پر عرض کیا کہ آقا! ہم اللہ کی ربوبیت اور اُلوہیت کے قائل، توحید کے قائل اور آپ کی نبوت و رسالت کے قائل ہیں، مجھ سے کیا ایسی غلطی ہوئی ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: عمر! میرے اور قرآن کے ہوتے ہوئے تم اپنی توجہ تورات کی طرف کر رہے ہو۔ اب بھی اگر موسیٰ علیہ السلام دنیا میں موجود ہوتے تو وہ بھی میری شریعت پر ہی چلتے۔ یعنی موسیٰ علیہ السلام خود نبی اور رسول ہیں، اسی لیے حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ دنیا میں کوئی شخص، چاہے یہودی ہے یا نصرانی، جب اس کو میری نبوت و رسالت کی اطلاع مل گئی ہے تو ان کے سارے دین ختم، ساری کتابیں اور شریعتیں ختم، اب قرآن کے بعد جو آدمی یہ کہے کہ میں تورات پر کھڑا ہوں، وہ بھی کافر ہے، انجیل کا دعویٰ کرے تو وہ بھی کافر ہے۔ ایمان جب بنے گا کہ جب تورات کا زمانہ تھا تو کہا: ''آمَنَّا وَ صَدَّقْنَا''، انجیل اور قرآن کا حکم بھی آیا تو ''آمَنَّا وَ صَدَّقْنَا'' کہا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر تم نے جنت میں جانا ہے تو ایک بات یاد رکھو، ﴿بَلٰى ۚ مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ﴾ اپنے آپ کو اللہ کے سپرد کر دو اور عمل میں سچے اور مخلص بنو، منافقت نہ ہو۔ اس لیے ﴿فَلَهٗۤ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ﴾ اس کا ثواب رب کے پاس محفوظ ہے، فرمایا: ﴿وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ﴾ پہلے مفرد ضمیر ﴿فَلَهٗۤ اَجْرُهٗ﴾ پھر عند اللہ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کبھی ''مَنْ'' کے لفظ کی رعایت ہوتی ہے، معنی کی رعایت نہیں ہوتی، لفظ کے اعتبار سے چونکہ مفرد ہے۔ ﴿بَلٰى ۚ مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗۤ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ﴾ آگے معنی کی رعایت کر دی: ﴿وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ﴾ اور اسلام پر پکے عمل

کرنے والے قیامت کے دن جب اپنے رب کے پاس آئیں گے تو ان کو کوئی ڈر اور کوئی غم نہ ہوگا، جنت ان کے انتظار میں ہوگی۔

عیسائی اور یہودی افراط وتفریط میں مبتلا ہیں:

بعض لوگ آپس میں اتنے بغض اور غلو میں آکر برباد ہوئے کہ نصرانیوں نے تو محبت میں بڑھ کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا بنادیا، انہوں نے کہا کہ عیسیٰ علیہ السلام اللہ کا بیٹا ہے، انہی نصرانیوں کی جماعت میں سے ایک جماعت اس طرف چلی گئی کہ (نعوذ باللہ) عیسیٰ علیہ السلام خود خدا ہیں اور ایک جماعت نصاریٰ کی اس طرف چلی گئی کہ بہرحال یہ تینوں خدا ہیں: عیسیٰ، بی بی مریم اور اللہ تعالیٰ۔ تو وہ غلو میں اتنے آگے بڑھ گئے کہ عیسیٰ علیہ السلام کو خدا بنادیا۔ اور یہودی دشمنی میں اتنے بڑھے کہ انہوں نے کہا کہ (نعوذ باللہ) عیسیٰ علیہ السلام تو خود حلال کی اولاد بھی نہیں ہیں، وہ تو یوسف نجار کا بیٹا ہے اور بلاوجہ بی بی مریم نے اپنے گناہ کو چھپانے کے لیے ساری کہانی گھڑی ہے۔ اور پھر انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنے کے لیے بڑی کوششیں کیں۔ اس لیے میں نے عرض کیا تھا کہ آدمی یا محبت میں گمراہ ہوتا ہے یا بغض میں گمراہ ہوتا ہے۔ کبھی عداوت میں بہت زیادہ بڑھنے سے گمراہ ہوگیا۔ اس لیے دعا کریں کہ اللہ ہمیں قرآن وحدیث کی سمجھ عطا فرمائے، اللہ ہمیں صحیح علماء کی اتباع نصیب فرمائے، ورنہ جو آدمی جس جگہ کو پکڑ کر کھڑا ہوگیا آج بھی آپ یہودیوں کو ملیں، وہ کہیں گے کہ مسلمان گمراہ ہیں اور ہم حق پر ہیں۔ آج بھی نصرانی کہیں گے کہ مسلمان گمراہ ہیں، یہ گوشت کھاتے ہیں اور عورتیں رکھتے ہیں اور ان کا کیا کام ہے، ورنہ مسلمان ترقی نہ کرجاتے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ کیسے مسلمان ہیں کہ جھوٹ ان کے اندر ہیں؟

ایک آدمی نے باقاعدہ کتاب میں لکھا کہ جب میں نے ان مسلمانوں کو دیکھا تو اسلام لانے کا ارادہ میں نے بدل لیا، اس نے کہا کہ میں نے ان کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ خنزیر کا گوشت کھاتے، شراب پیتے، زنا کرتے، عورتوں کے ساتھ ناچ گانے کرتے، ان کی عورتیں بے پردہ پھرتی ہیں، ان کے گھروں میں گندی فلمیں چلتی ہیں، حلال وحرام کی ان کے یہاں کوئی قید نہیں، بینکوں میں یہ معاملہ کرتے ہیں، پھر ان کا یہ کیسا اسلام ہے؟ اور ہم میں اور ان میں پھر فرق کیا ہے؟ پھر جو دنیا کا کام ہے یہ بھی کررہے ہیں ہم بھی کررہے ہیں۔ جو محنت کرے گا ترقی کرجائے گا، جو نہیں کرے گا وہ ذلیل ہوجائے گا۔ پھر ان کے مذہب میں اگر کوئی بات سچی ہوتی تو یہ اپنے مذہب پر

کیوں نہ چلتے؟

ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یاد رکھو! ہر عمل جو اللہ کے ہاں قبول ہوتا ہے، اس کے اندر دو شرطیں پائی جانی ضروری ہیں: پہلی شرط یہ ہے کہ وہ عمل خالص اللہ تعالیٰ کے لیے ہو۔ اگر اللہ کے لیے خالص نہیں ہے تو مقبول نہیں، جیسے کوئی کہے کہ یہ نیاز اللہ اور فلاں کی ہے وغیرہ۔ یہ عمل اللہ تعالیٰ کے لیے خالص رہا ہی نہیں۔ یا اسی طرح کوئی کسی خاص جگہ جا کر صدقہ کرنے کو لازم سمجھے تو یہ عمل بھی خالص اللہ کے لیے نہ رہا؛ کیونکہ اگر خالص اللہ کے لیے عمل ہوتا تو جہاں بھی صدقہ دیا جائے اللہ تعالیٰ اجر دیں گے۔ دوسری شرط یہ ہے کہ وہ عمل اللہ کے لیے ہو اور سنت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق بھی ہو۔ اگر بڑا عمل ہے، لیکن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے مطابق نہیں تو قبول نہیں ہوگا۔ تو ہر عمل میں دو باتیں ہوں تو وہ قبول ہوگا، ورنہ مردود ہوگا۔

کعبہ شریف کے چار کونے ہیں، ان کے دو کونوں کو ہاتھ لگاتے ہو کہ نہیں؟ ایک موٹی بات یاد رکھو کہ دین سمجھنا مشکل نہیں۔ رکن یمانی پر ہاتھ لگاتے ہو، حجر اسود کو بوسہ دیتے ہو، رکن عراقی اور رکن شامی پر نہ ہاتھ لگاتے ہو، نہ اشارہ کرتے ہو، نہ بوسہ دیتے ہو۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ وجہ یہ ہے کہ میرے مدنی صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں ہاتھ لگایا وہاں ہاتھ لگانا اور جہاں بوسہ دیا وہاں بوسہ دینا سنت اور جہاں ہاتھ نہیں لگایا وہاں نہ لگانا سنت ہے، اب اسی کو دیکھ کر اور لمبے چوڑے جھگڑوں میں نہ جاؤ۔ جو آدمی کہے کہ قبر شریف کا بوسہ جائز ہے تو اس سے کہو کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے کون سی قبر کا بوسہ لیا تھا؟ دکھا دو۔

جس پتھر پر ابا ابراہیم علیہ السلام کھڑے ہوئے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مقام کو مصلیٰ تو قرار دیا، لیکن بوسہ نہیں دیا، ہاتھ نہیں لگایا۔ یہ تو کہہ دیا کہ وہاں اس کے پیچھے نماز پڑھو، وہاں نماز پڑھنے کا یہ معنی بھی نہیں ہے کہ وہاں مقام ابراہیم کو سجدہ کرو۔ بعض جاہلوں کو مصیبت ہے، کہتے ہیں کہ دیکھو! وہ پتھر جس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاؤں لگے ہیں، جب اس جگہ پر سجدہ جائز ہے تو پھر پیر سائیں کی قبر پر جائز کیوں نہیں؟ یہاں تو خود پورا پیر موجود ہے اور وہاں تو صرف پاؤں لگے ہیں۔

تو یاد رکھو! وہاں سجدہ نہیں، مسئلہ کو سمجھو۔ ﴿وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى﴾ [البقرۃ: ۱۲۵] اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ مشورہ لیا تھا اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے یہ مشورہ دیا تھا، جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿فِیْهِ

ایٰتٌۢ بَیِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرٰهِیْمَ ۚ وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا﴾ [آل عمران: ۹۷] یعنی اس جگہ میں کھڑے ہوکر نماز پڑھیں گے، اس مقام پر سجدہ ہم اللہ کو کریں گے، تاکہ ثواب بانی کعبہ کو بھی ملتا رہے، عبادت ہم اللہ کی کریں گے۔ چنانچہ اب کوئی کہے کہ جناب! جب پتھر کے پیچھے نماز جائز ہے تو پیر سائیں کی قبر کے پیچھے جائز کیوں نہیں؟ وہاں بھی ہم نماز اللہ کے لیے پڑھیں گے، لیکن ثواب پیر صاحب کو ہوگا۔ لیکن میرے مدنی آقا ﷺ نے فرمادیا کہ خبردار! جہاں سامنے قبر ہو وہاں نماز نہ پڑھنا۔ اگر حضور اکرم ﷺ نہ روکتے تو ہم پڑھتے۔ حضور پاک ﷺ نے یہ مسئلہ سمجھادیا کہ اللہ نے جنازہ میں رکوع نہیں رکھا تو پھر قبر پر نماز کیسے؟ جنازہ میں رکوع اور سجود اس لیے نہیں، تاکہ کوئی جاہل یہ نہ سمجھے کہ میت کو سجدہ ہورہا ہے۔ اس دھوکہ سے بچنے کے لیے اللہ نے جنازہ میں رکوع و سجود نہیں رکھا۔ اس لیے حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ خبردار! کسی مقبرے پر نماز نہ پڑھنا، فرمایا: خبردار! کسی قبر پر کوئی بناء اور عمارت نہ بنانا، خبردار! کسی قبر کو اونچا نہ کرنا، نہ اس پر چلنا اور نہ اس پر ٹیک لگا کر بیٹھنا۔ پہلی امتیں جو گمراہ ہوئی ہیں وہ بھی اسی وجہ سے کہ وہ اپنے صالحین کی قبروں پر بیٹھتے تھے، پھر ان سے محبت کرتے کرتے پہلے ان کی تصویریں بنائیں، پھر ان کے بت بنائے اور ان کی پوجا کرنے لگ گئے۔ اس لیے حضور اکرم ﷺ نے وہاں منع فرمادیا۔

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ قبر کی زیارت کرو، تو کیا ہم نہیں کرتے؟ ''اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ دَارَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِیْنَ'' اب سورج نکلے تو نماز نہ پڑھو، سورج ڈوب رہا ہو تو نماز نہ پڑھو، سورج سر پر ہے تو نماز نہ پڑھو، تاکہ کسی دیکھنے والے کو شبہ نہ پڑے کہ یہ سورج کے پجاری ہیں؛ کیونکہ سورج کی عبادت کرنے والے ان اوقات میں سورج کی عبادت کرتے ہیں۔ اللہ نے فرمایا کہ تم ان اوقات میں میری عبادت بھی نہ کرو، تاکہ لوگوں کو دھوکہ بھی نہ پڑے، تاکہ کوئی جاہل کسی غلط فہمی میں مبتلا ہو کر یہ سوچنے نہ پڑ جائے کہ یہ سورج کے پجاری ہیں۔

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ اگر سامنے آگ جل رہی ہو تو نماز نہ پڑھو، تاکہ لوگوں کو یہ دھوکا نہ ہو کہ یہ آگ کے پجاری ہیں۔ حدیث میں آتا ہے کہ اگر حضور اکرم ﷺ کے سامنے دیوار پر قرآن لٹکا ہوا ہوتا تو حضور اکرم ﷺ اُتار دیتے۔ کبھی تلوار بھی لٹکی ہوتی تو حضور اکرم ﷺ اُتار دیتے، تاکہ کوئی دھوکہ میں نہ پڑے کہ تلوار کو سجدہ ہو رہا ہے۔ اگر سامنے قبر ہے تو پھر بھی میری عبادت نہ کرو، تاکہ دیکھنے والا یہ نہ سمجھے کہ یہ قبر کی پوجا کررہا ہے۔

ایک اُصولی بات یاد رکھو کہ جو کام تم کر رہے ہو یا جو عمل تم کر رہے ہو تو کیا یہ اللہ کے لیے ہے یا اس میں کسی

دوسرے کا بھی کچھ حصہ ہے؟ اگر کسی کا حصہ ہے تو یہی معنی ہے شریک بنانے کا۔ اب عمل میں شرکت آ گئی تو اللہ کے ہاں یہ عمل مقبول نہیں۔ اللہ کے ہاں کون سا عمل مقبول ہوتا ہے؟ جو خالص اسی کے لیے ہو، ﴿فَادْعُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ﴾ [المؤمن: ۱۴] فرمایا: اسی کو پکارو۔ خالص عمل کی مقبولیت کے لیے کچھ اصول ہونے چاہئیں، وہ اصول قرآن وسنت سے حاصل ہوتے ہیں، اگر وہ عمل قرآن وسنت کے مطابق ہو تو مقبول ہے، ورنہ مردود ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ''مَنْ عَمِلَ عَمَلًا لَيْسَ عَلَيْهِ أَمْرُنَا فَهُوَ رَدٌّ'' [صحیح بخاری، باب النجش، صحیح مسلم، رقم: ۱۷۱۸] کہ تم میں سے جو عمل کرنے والا عمل کرے اور اگر وہ عمل میری سنت کے مطابق نہ ہو تو ایسے عمل کو پھینک دو، اس کی کوئی حیثیت وقیمت نہیں، وہ مردود ہے۔

پادریوں کے چلّے بھی مردود:

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ نصرانی، یہودی یا ان کے جو بڑے بڑے پادری ہیں، ساری ساری زندگی مجاہدے کرتے ہیں، غاروں میں رہتے ہیں اور کئی کئی سال کے روزے رکھتے ہیں، ہڈیوں کے ڈھانچے بن جاتے ہیں، ہو سکتا ہے کہ ان کا عمل خالص اللہ کے لیے ہو، لیکن چونکہ شریعت کے مطابق نہیں، اس لیے اللہ نے انہیں بھی رد کر دیا کہ ان کا کوئی عمل قبول نہیں۔

عبادت میں مجاہدہ کرنے کا مسنون طریقہ:

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کچھ لوگ اُمہات المومنین کے پاس آئے اور آپ ﷺ کے عمل کے متعلق دریافت کیا تو بعض نے فیصلہ کیا کہ ہم رات کو بالکل نہیں سوئیں گے، بعض نے کہا کہ ہم خصی ہو جاتے ہیں، زندگی میں کبھی شادی نہیں کریں گے اور بعض نے کہا کہ ہم ساری زندگی روزے رکھیں گے۔ حضور اکرم ﷺ کو پتہ چلا تو تشریف لائے اور فرمایا: کہاں ہیں میرے صحابہ؟ میں نے سنا ہے کہ تم نے ایسا مشورہ کیا ہے کہ ہم اللہ کی عبادت کریں، اللہ کو راضی کریں۔ کون ہے تم میں سے جو میری شان کا مقابلہ کرے؟ فرمایا کہ تم میرے مقابل بن سکتے ہو؟ نبی کے برابر تمہارا مرتبہ ہو سکتا ہے؟ انہوں نے کہا: نہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں روزہ بھی رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں، میں رات کو اُٹھتا بھی ہوں، تہجد بھی پڑھتا ہوں اور سو بھی جاتا ہوں، شادیاں بھی کرتا ہوں، میری بیویاں بھی ہیں، ان کے حقوق بھی ادا کرتا ہوں۔ فرمایا کہ جب میں یہ سارے کام کرتا ہوں تو میرا مقابلہ تم نہیں کر سکتے، پھر اور

آگے بڑھ رہے ہو۔ جب تک میری سنت کے مطابق عمل نہیں کرو گے اللہ کے ہاں کوئی اجر نہیں ملے گا۔

مصائبِ دنیا کے خوف سے شادی نہ کرنے کی وعید:

آج بھی کئی آدمی کہتے ہیں کہ میں شادی نہیں کروں گا۔ پوچھا کہ کیوں؟ کہتے ہیں کہ بس بھائی! بیوی کے بڑے جھگڑے ہوتے ہیں، میں بس اللہ کی عبادت کروں گا۔ اللہ فرماتے ہیں کہ ایسی عبادت کی مجھے کوئی ضرورت نہیں، تُو نے میرے محمد ﷺ کی سنت کا انکار کیا ہے۔ جب اللہ کے نبی ﷺ نے شادی کی تو تم کون ہوتے ہو شادی نہ کرنے والے؟ کیا تم ان سے بھی زیادہ پاک بن سکتے ہو؟ جو معصوم ہے اور اس کے علاوہ تو کوئی معصوم بھی نہیں ہے۔ جب حضور اکرم ﷺ نے ایک شادی نہیں کی، بلکہ حضور اکرم ﷺ کے نکاح تو پچیس ہوئے اور گیارہ تو باقاعدہ بیویاں ساتھ تھیں، جنہیں حضور پاک ﷺ باقاعدہ ملے ہیں۔ وفات کے وقت بھی 9 بیویاں حضور اکرم ﷺ کے پاس موجود تھیں۔

واقعہ:

ہمارے پاس ایک حافظ صاحب تھے، معلوم نہیں زندہ ہیں یا فوت ہو گئے ہیں۔ اللہ کی رحمت سے قرآن پر زبان ایسے چلتی تھی کہ وہ جب پیشاب کرنے جاتے تو زبان کو پکڑ کر بیٹھ جاتے، لیکن زبان چل رہی ہوتی تھی۔ یعنی پیشاب کے دوران بھی زبان نہیں رک سکتی تھی اور قرآن پڑھتے ہوئے اتنی زبان چلنے لگی کہ ایک منٹ کے لیے بھی اللہ کے قرآن سے ان کی زبان نہیں رکتی تھی تو اللہ تعالیٰ اپنے ان بندوں کی زبان پر اپنا ذکر اتنا حاوی کر دیتے ہیں گویا کہ وہ دنیا سے کٹ گئے ہیں، نہ ان کو پیسے، نہ دنیا اور نہ کمانے کی غرض ہے، بس ہر وقت اللہ کا ذکر ہے۔ لیکن کوئی شریعت کا مخالف ہو اور یہ کہا جائے کہ یہ اللہ تک پہنچ گیا ہے تو اس کے لیے یہ حکم ہے کہ سب سے پہلی چیز موافقت عمل ہے، اللہ نے فرمایا کہ یہ لوگ شریعت انبیاء کے خلاف عمل کرتے ہیں، اللہ کے ساتھ شرک والے عمل کرتے ہیں، ان کے عمل ہمارے پاس آئے تو ہم نے ان کو ہوا میں اُڑا دیا، جیسے روئی اُڑاتے ہیں۔ یعنی ان کی کوئی حیثیت نہیں۔

حضرت سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ آخرت میں بھی ان پر کوئی ڈر نہیں ہوگا اور نہ موت کی پریشانی ہوگی، بلکہ وہ تو موت کے لیے تیار ہوتے ہیں، ان کو پتہ ہے کہ موت کا وقت مقرر ہے اور اس کے بعد تو ہمیں اللہ کی رحمتیں اور



نعمتیں ملی ہیں۔

﴿وَقَالَتِ الْيَهُودُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَيْءٍ ۖ وَّقَالَتِ النَّصٰرٰى لَيْسَتِ الْيَهُودُ عَلٰى شَيْءٍ ۙ وَّهُمْ يَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ۗ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ ۚ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ﴾ [البقرة: ۱۱۳]

''اور یہودی کہتے ہیں: عیسائی درست راہ پر نہیں اور عیسائی کہتے ہیں: یہودی درست راہ پر نہیں، حالانکہ یہ دونوں فریق کتاب کو پڑھتے ہیں۔ اسی طرح سے ان لوگوں نے ان کی سی بات کہی جو جاہل ہیں۔ اللہ ان کے درمیان قیامت کے دن فیصلہ کرے گا جس میں یہ اختلاف کر رہے ہیں۔''

اختلافی مسائل میں اعتدال کی راہ:

اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں فرمایا کہ یہود اور نصاریٰ کا آپس میں بغض وعناد اور تجاوز اور ظلم دیکھو کہ ایک دوسرے کو جھوٹا کہتے ہیں۔ یہودی کہتے ہیں کہ نصرانیوں کے پاس کوئی دلیل، حجت کچھ بھی نہیں ہے، نصرانیوں کا بھی یہی کہنا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: حالانکہ یہ کتاب پڑھنے والے ہیں، یہ جھوٹ بول رہے ہیں کہ جب تک یہودی دین موسیٰ علیہ السلام پر قائم تھے، تورات اللہ کی کتاب تھی، اسی طرح جو نصرانی صحیح معنوں میں عیسیٰ علیہ السلام کے دین پر قائم تھے، ان کے پاس بھی اللہ کی کتاب انجیل تھی، لیکن ضد میں آکر یہ کہنا کہ کچھ بھی نہیں جیسے آج کل کوئی آدمی جس جماعت یا عقیدہ سے لگ گیا وہ دوسرے کو تو کچھ سمجھتا ہی نہیں۔ حالانکہ اصول یہ ہے کہ اگر کوئی چیز اچھی ہے تو اس کو اچھا کہیں اور اگر کوئی چیز بری ہے تو اس کو برا کہیں۔ یعنی ایک جماعت اگر اچھا کام کر رہی ہے تو آپ کہیں کہ ان کا کام اچھا ہے، اگر ان کے اندر کوئی خامی یا بُرائی ہے تو پھر خامی اور بُرائی کا بھی ان کو کہیں۔ یہ نہیں کہ جس سے بھی اختلاف ہو جائے تو آدمی اس کو باطل قرار دے دے، صرف اپنے آپ کو سمجھے کہ میں حق پر ہوں اور دنیا میں کوئی حق پر نہیں ہے۔ یہ بہت بڑی غلطی ہے۔ ہر انسان کے اندر خامیاں بھی ہوتی ہیں، لیکن جہاں تک ایمان اور اسلام کا تعلق ہے، قرآن اور حدیث میں واضح ہے، ان میں دو باتیں تو ہو ہی نہیں سکتیں۔ اس کے اندر تو بالکل کھلے ہوئے قاعدے ہیں۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ میں اپنی اُمت کو چمکتی ہوئی شریعت دے کر جا رہا ہوں، اس کی رات

بھی دن کی طرح روشن ہے، اس کے اندر کا راستہ بالکل صراط مستقیم ہے، مثلاً حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ نماز پڑھو۔ صرف نماز کا حکم نہیں دیا، بلکہ نماز پڑھ کر دکھا دی، آپ ﷺ نے فرمایا: وضو کرو اور آپ ﷺ نے وضو کر کے دکھلا دیا، آپ ﷺ نے جہاد کے حکم کے ساتھ جہاد کر کے بھی دکھا دیا۔ پھر صحابہ رضی اللہ عنہم نے حضور اکرم ﷺ کے طریقے پر چل کر اور عمل کر کے ایک ایک مسئلہ امت تک پہنچا دیا، اس کے اندر تو کسی جھگڑے اور اختلاف کی ضرورت ہی نہیں۔ اگر بعض فروعی مسائل میں اختلاف ہوتا ہے تو اس کو آدمی اتنی اہمیت تو نہ دے کہ ایک دوسرے کو کافر قرار دے کر لڑائی جھگڑے اور فتنہ وفساد کھڑا لے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جب بغض آ جاتا ہے تو آدمی ضد میں بڑھتا چلا جاتا ہے اور حدود سے نکل جاتا ہے اور پھر حدود سے نکلنے کے بعد گمراہی ہی گمراہی ہے۔

مسنون عمل کے فوائد:

بہرحال اگر وہ عمل سنت کے مطابق ہے تو "آمَنَّا وَ صَدَّقْنَا"، اور اگر وہ چیز قرآن، فرمانِ رسول ﷺ اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے عمل کے خلاف ہے تو سیدھی بات ہے کہ وہ گمراہی ہے اور اس پر عمل کرنے سے آدمی گمراہ ہوگا اور وہ دین کے اندر ایجاد کی ہوئی چیز ہے۔ ایک موٹی سی بات ہے کہ آپ کے علاقے یا ملک میں کسی جگہ ایک آدمی ایک مسئلہ بیان کرتا ہے، آپ غور کریں کہ قرآن وحدیث میں ہے؟ اگر نہیں ہے تو اس مولوی صاحب کو بھی علیحدگی میں سمجھاؤ؛ کیونکہ لوگوں کے سامنے اسے چھیڑو گے تو اسے بھی جوش آ جائے گا، پھر تو بات لڑائی میں چلی جائے گی، بات سمجھنے میں نہیں جائے گی۔ جب علیحدہ ہوں اور اس کو علیحدگی میں جا کر بڑے ادب سے پوچھیں کہ حضرت! آپ نے جو مسئلہ بیان کیا ہے، اس مسئلے کے متعلق قرآن وحدیث یا صحابہ رضی اللہ عنہم کے عمل سے متعلق کوئی ثبوت ہے؟ اگر ہے تو آپ ہمیں دکھلا دیں، آپ بتا دیں کہ فلاں جگہ فلاں کتاب میں ہے، دکھا دیں تو ہماری تسلی ہو جائے، "جَزَاكَ اللّٰهُ" اگر وہ دکھلاتا ہے تو یہ بات بھی یاد رکھ لینا کہ ہر آدمی تو کتابیں لیے پھرتا ہے، ہر آدمی کی کتاب میں تحقیق باعث حجت اور دلیل نہیں ہوتی۔ اب دیکھیں! سارے محدثین نے جو زندگی گزار دی فرمایا کہ یہ حدیث ضعیف، مردود یا منقطع ہے، اس کا راوی ضعیف، متروک یا رافضی ہے یا یہ راوی جھوٹا یا اس کا حافظہ ختم ہو گیا تھا یا یہ راوی غیر مقبول ہے۔ یہ باتیں اس لیے کیں کہ کوئی آدمی جرأت کر کے حضور اکرم ﷺ کی ذات پر کوئی غلط بات منسوب نہ کر لے، انہوں نے ساری زندگی اس میں محنت کر کے گزاری۔ تو اس کے لیے دو باتیں ہیں کہ ایک عمل اللہ کے لیے خالص ہو اور

دوسری بات کہ وہ عمل خالص محمد مصطفیٰ ﷺ کی سنت کے مطابق ہو۔ اب دیکھیں کہ آدمی جب حمام میں داخل ہوتا ہے تو پہلے کون سا پاؤں رکھے گا؟ بایاں۔ اور پڑھے گا: ''اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنَ الْخُبُثِ وَالْخَبَائِثِ''۔ باہر نکلے گا تو دایاں پاؤں رکھے گا اور یہ پڑھے گا: ''غُفْرَانَكَ، اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ أَذْهَبَ عَنِّي الْأَذٰى وَ عَافَانِي'' بظاہر آدمی کے نزدیک چھوٹی سی سنت ہے، لیکن اس کا اتنا بڑا ثواب ہے کہ کروڑوں غیر مسنون عمل کرتے ہو، اس کے ثواب کو نہیں پہنچ سکتے؛ کیونکہ تم نے اس وقت بھی حضور اکرم ﷺ کی سنت پر عمل جاری رکھا۔

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: وضو کرو، نماز پڑھو اور مسواک کرو۔ اب مسواک جو کرتے ہو تو میرے نبی ﷺ نے فرمایا کہ یہ منہ کو پاک کرنے کا اور تیرے رب کو راضی کرنے کا ذریعہ ہے۔ اس لیے محدثین نے لکھا کہ مسواک کرنے سے آدمی کو ستر سے زائد فوائد حاصل ہوتے ہیں اور ان میں سے ایک یہ کہ مسواک کی سنت پر عمل کرنے والے کا خاتمہ ایمان پر ہوگا۔ اب اس سے بڑی نعمت اور کیا ہوگی کہ خاتمہ ایمان پر ہو جائے اور جنت نصیب ہو جائے۔

اور مشقت کتنی ہے؟ صرف مسواک۔ یہ ایک سنت مبارکہ ہے، لیکن اس میں کئی فوائد ہیں، مثلاً: اس سے تمہارے دانت صاف ہوں گے، غذا اچھی طرح ہضم ہو جائے گی اور تم بیماریوں سے محفوظ رہو گے۔ اگر تمہارا منہ اور دانت گندے ہوں تو غذا بھی گندی ہو کر جائے گی، وہی دانتوں کا زہر آپ کے معدے میں پہنچے گا، معدہ میں پہنچ کر بیماریوں کا سبب بنے گا۔ اس لیے یاد رکھیں کہ سنت کے موافق عمل کرو گے تو جنت بھی ملے گی اور اگر لاکھ تیرا عمل خوبصورت ہو، لیکن بدعت ہو تو اس عمل کا کوئی فائدہ نہیں۔

بدعت کا معنی و مفہوم:

بدعت کا معنی ہے: ایسا عمل کرنا جس کا ثبوت قرآن میں بھی نہ ملے اور حدیث پاک میں بھی نہ ملے، اسی طرح صحابہ رضی اللہ عنہم اور خیر القرون میں اس عمل پر ثبوت نہ ملے۔ بعد میں لوگوں نے اسے دین سمجھ کر بنایا ہو، اسی کا نام ''بدعت'' ہے۔ اس تعریف پر لوگ اعتراض کر کے یہ سوالات شروع کر دیتے ہیں کہ یہ جو بٹن پہنے ہوئے ہیں، یہ بدعت نہیں ہیں؟ کیا یہ حضور اکرم ﷺ نے پہنے تھے؟ پوری دنیا میں پہلے گاڑیاں اور ہوائی جہاز وغیرہ نہیں تھے، اب آ گئے ہیں، اسی طرح اور بھی بہت سے ٹیکنالوجیز دنیا میں آ گئی ہیں اور بہت سی آئیں گی۔ پہلے زمانے میں لوگ

ایک ایک مہینہ سمندروں اور دریاؤں میں رہ کر حج کرنے آتے تھے، اب تین چار گھنٹوں میں بھی پہنچ جاتے ہیں۔ ہم ساڑھے تین چار گھنٹے میں اپنے ملک سے یہاں پہنچ جاتے ہیں۔ دنیا کے اندر جو ایجادات ہیں ان کا دین سے کیا تعلق ہے؟ حضور اکرم ﷺ کے زمانے میں مِل نہیں لگی تھی، مِل کا کپڑا نہیں ملتا تھا، اب مِل لگ گئی ہے، صرف ریشم خالص نہ پہنو، باقی جو مرضی آئے پہن لو، منع نہیں۔ اسی طرح شریعت کے اندر ٹخنوں سے نیچے کپڑا نہ پہنو، اس کے علاوہ جو مرضی پہنو۔ شلوار، تہبند یا پاجامہ اور قمیص چھوٹی ہو یا بڑی کوئی بات نہیں۔ بدعت وہ ہے کہ آدمی دین کے اندر کوئی نیا طریقہ پیدا کرے، اس کو ہم بدعت کہیں گے کہ بدعت کا معنیٰ یہی ہوتا ہے کہ ایسی چیز کا احداث فی الدین کیا جائے کہ جس کا ثبوت قرآن وحدیث اور صحابہ رضی اللہ عنہم سے نہ ملے۔

آیت کا شانِ نزول:

ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نجران کے علاقے سے عیسائیوں کا ایک وفد حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں آیا۔

"أَحبار" یا "حَبر" سے ہوتا ہے یا "حِبر" سے۔ "حَبر" کے معنیٰ ہوتے ہیں: زینت۔ کیونکہ دنیا میں قوم کے علماء بھی زینت ہوتے ہیں، علماء سے لوگ پہچانے جاتے ہیں کہ جیسے ایک چھوٹی سی بستی ہو اور وہاں ایک عالم پیدا ہو تو پوری بستی اس عالم کے نام سے جانی جاتی ہے اور ایک بڑے سے بڑا علاقہ ہو وہاں کوئی سرمایہ دار ہو یا مِل آنر ہو تو کوئی پوچھتا ہی نہیں کہ مر گیا تو جان چھوٹی ختم۔ تو علماء جو ہوتے ہیں وہ قوم کی زینت ہوتے ہیں، لیکن کون علماء؟ وہ جو وارثِ انبیاء ہوں۔ ایسے علماء، جو علماء سُوء ہوتے ہیں، اللہ ان کے فتنوں سے بچائے۔ اور دوسرا لفظ ہے: "حِبر" اس کے معنیٰ سیاہی کے آتے ہیں جو قلم میں ڈالتے ہیں وہ سیاہی ہے۔ اب جو لکھا جاتا ہے وہ کافی عرصہ تک باقی رہتا ہے۔ علماء کا علم بھی اسی طرح چلتا رہتا ہے کہ شاگردوں کے شاگرد آتے رہتے ہیں۔ اس لیے احبار بڑے بڑے علماء کو کہتے ہیں اور رہبان یہود ونصاریٰ کے بڑے بڑے پادری، صوفی اور پیروں کو کہتے ہیں۔

بہر حال وہ وفد جس میں یہود ونصاریٰ کے عالم تھے اور ان کا آپس میں جھگڑا ہو گیا تو رافع بن حرملۃ نے ان سے کہا کہ تم تو جھوٹے ہو، میں انجیل کو نہیں مانتا، نصرانیوں نے کہا کہ ہم موسیٰ علیہ السلام کو بھی نہیں مانتے اور تورات کو بھی نہیں مانتے۔ اللہ پاک نے فرمایا کہ ان کا حال دیکھو کہ یہ ایک دوسرے کو جھٹلا رہے ہیں اور دونوں ایک دوسرے کی

تردید میں اتنے آگے بڑھ گئے ہیں کہ کہتے ہیں کہ تم کسی چیز پر بھی نہیں ہو۔ حالانکہ تورات میں عیسیٰ علیہ السلام کی خوشخبری موجود ہے، انجیل کا اُترنا موجود ہے۔ اگر یہ تورات کے ماننے والے ہوتے تو عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آتے اور عیسیٰ علیہ السلام کی کتاب میں بھی تورات اور موسیٰ علیہ السلام کی تصدیق موجود ہے، اگر یہ صحیح معنی میں دین عیسیٰ پر ہوتے تو بھی موسیٰ علیہ السلام اور تورات پر اعتراض نہ کرتے اور ایک دوسرے کو کافر نہ کہتے۔

قتادہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ابتداء میں جو لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دین پر تھے، وہ سچے تھے، لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا انہوں نے بھی بدعتیں اختیار کیں اور تفرق اختیار کر کے مختلف راستے نکال لیے۔

ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ آیت جب اُتری حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں، اس وقت جو یہود و نصاریٰ تھے، اگر یہودی کہتے کہ تم کچھ نہیں تو وہ بھی سچے تھے؛ کیونکہ اس زمانے میں جو یہود موجود تھے وہ جھوٹے تھے۔ نصاریٰ ان کو جھوٹا کہہ رہے تھے، بات تو دونوں سچ کہہ رہے تھے، لیکن اللہ پاک ان کی تردید فرما رہے ہیں کہ یہ غلط کہتے ہیں؛ کیونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں دونوں جھوٹے ہو چکے تھے، لیکن ابتداء میں اصل تورات اور انجیل تو موجود تھی۔ پھر ''مَا أَنتُمْ عَلَىٰ شَيْءٍ'' کہنا غلط تھا؛ کیونکہ تورات و انجیل کسی نہ کسی حالت میں موجود تھی، اگرچہ اس وقت والے لوگ ان پر عامل نہ تھے اور تحریف کر چکے تھے۔

اللہ نے فرمایا کہ اسی طرح ان لوگوں نے بھی کہنا شروع کر دیا کہ جن کے پاس علم نہیں تھا۔ ان سے کون مراد ہے؟ یہودیوں اور نصرانیوں میں سے جو جاہل ہیں، وہی ایک دوسرے کو کہتے ہیں کہ تم کسی چیز پر نہیں ہو۔ لیکن راجح قول یہ ہے کہ جب یہودیوں نے نصرانیوں کی اور نصرانیوں نے یہودیوں کی تردید کی تو مکہ کے مشرک جو جاہل تھے، ان کے پاس تو کوئی کتاب اور سابقہ دین بھی نہ تھا، یہ مشرکین مکہ تو خالص جاہل تھے، جب ان پڑھے لکھوں نے ایک دوسرے کو جھوٹا کہا تو ان مشرکوں نے کہا کہ تم سب جھوٹے ہو اور انہوں نے یہ بھی کہا کہ (نعوذ باللہ) حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی کوئی دین نہیں۔

مفسر ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ یہ لفظ عام ہے۔ یہودی، نصرانی اور پڑھے لکھے، علماء بھی لڑ پڑے تو جاہل یہی کہنے لگے کہ تم بھی کچھ نہیں، ہم بالکل ٹھیک ہیں۔ اللہ نے فرمایا کہ یہود و نصاریٰ ہوں یا صابی ویا مجوسی یا مشرک، سب قیامت کے دن میرے دربار میں حاضر ہوں گے اور ہم ان کے درمیان حق اور عدل کا فیصلہ فرما دیں گے۔ اس

دن واضح ہو جائے گا کہ کون حق پر ہے اور کون غلطی پر ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اعلانِ حج:

اللہ کا گھر جب بن گیا تو اللہ نے ابراہیم علیہ السلام کو فرمایا کہ اعلان کرو کہ میرا کعبہ بن گیا ہے، لوگو! حج کرنے کے لیے آؤ۔ ابراہیم علیہ السلام نے عرض کیا کہ اے باری تعالیٰ! اگر میں یہاں مکہ میں اعلان کروں تو میری کون سنتا ہے؟ وہاں تو قبیلہ بنو جرہم کے علاوہ کوئی قبیلہ آباد نہ تھا، اتنی بڑی آبادی بھی نہ تھی۔ ابراہیم علیہ السلام نے عرض کیا کہ یہ جو کچے کے اردگرد گھر ہیں، میری آواز ان تک بھی نہیں پہنچی ہوگی تو میں کون سے لوگوں کو بلاؤں کہ حج کے لیے آجاؤ۔ اللہ نے حکم فرمایا کہ تمہارے ذمہ میرے حکم کی تعمیل ہے، تم اعلان کرو، باقی پہنچانا ہمارے ذمہ ہے۔ تمہاری ڈیوٹی صرف یہ ہے کہ کھڑے ہوکر اعلان کر دو۔ اللہ نے اس آواز کو ایسا پہنچایا کہ پوری دنیا میں آواز پہنچ گئی حتیٰ کہ بعض روایات میں ہے کہ اگر ماں کے بطن میں بھی کوئی بچہ تھا تو وہاں تک بھی آواز پہنچی اور بعض روایات میں آیا ہے کہ جس نے ندائے خلیل پر لبیک کہا تھا یا جس نے ایک مرتبہ لبیک کہا تھا تو اللہ اسے ایک مرتبہ حاضری نصیب کریں گے اور جس نے دو مرتبہ لبیک لبیک کہا، اسے دو مرتبہ حاضری نصیب کریں گے۔ جس نے عالم ارواح میں لبیک کہا تھا تو اسے تو اللہ ضرور بالضرور بھیجیں گے، خواہ وہ غریب ہو یا امیر، حج کی فرضیت کے لیے اصل مسئلہ غریب یا امیر کا نہیں، مسئلہ ہے فرض ہونے کا کہ بھئی! یہ فرض کس پر ہے ایک یہ ہے؟

جس نے لبیک کہا ہے وہ آئے گا۔ اچھا! یہ بھی علماء نے لکھا ہے کہ پاکستان اور ہندوستان والے زیادہ آئیں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب ہمارے ابا حضرت آدم علیہ السلام کو اُتارا گیا تو وہ ہند میں اُترے تھے تو سب سے پہلا حج ہمارے ابا نے ہند سے پیدل چل کر کیا۔ چونکہ ہمارے باپ نے وہاں سے کیا ہے تو اس اولاد میں اثرات زیادہ ہیں بہ نسبت دوسرے ملکوں کے۔ اسی لیے آپ نے دیکھا ہوگا کہ ہندوستان تا بنگال اور پاکستان کے کمزور حاجی آپ کو ایسے بھی نظر آئیں گے کہ ابھی جہاز سے اُتریں گے اور مر جائیں گے، لیکن حج پر آئے ہوئے ہیں۔ اتنے بوڑھے، کمزور اور ہڈیوں کے ڈھانچے چل نہیں سکتے اور لکڑی پکڑ کر کھڑے نہیں ہو سکتے۔ بحری جہاز میں مشقتیں برداشت کر کے کعبہ شریف میں آجائیں تو بے چاروں کو یہ تک پتہ نہیں کہ کعبہ شریف کدھر ہے، کوئی پتہ نہیں کہ صفا اور مروہ کدھر ہے، طواف کرتے کوئی بھول جائے تو بے چاروں کو دس دن تک تو گھر تک نہیں ملتا۔

دخولِ جنت اللہ کے فضل سے ہوگا:

(حدیث) صحابہ ﷺ نے سوال کیا کہ جو لوگ جنت میں جائیں گے وہ اپنے اعمال سے جائیں گے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے جنت میں جائیں گے۔ صحابہ ﷺ نے عرض کیا: یارسول اللہ! کیا آپ بھی؟ آپ ﷺ نے فرمایا: جی ہاں! میں بھی۔ یعنی انبیاء ﷺ بھی اللہ کے فضل سے جنت میں جائیں گے۔

چنانچہ اہلسنت والجماعت کا عقیدہ ہے کہ جو جنت میں جائے گا وہ اللہ کے فضل سے جائے گا اور جو جہنم میں جائے گا وہ اللہ کے عدل سے جائے گا۔ اللہ کسی کو جہنم میں نہیں ڈالتے جب تک اس کے ساتھ عدل کا تقاضا پورا نہیں ہوتا اور جنت دیتے ہیں تو وہ بھی مہربانی ہے۔

﴿وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ أَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِيْ خَرَابِهَا ۚ أُولٰٓئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ أَنْ يَّدْخُلُوْهَآ إِلَّا خَآئِفِيْنَ ۚ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ﴾ [البقرۃ:۱۱۴]

''اور کون بڑا ظالم ہے اس سے جو اللہ کی مساجد سے روکے کہ ان میں اس کا نام لیا جائے اور وہ اس کے ویران کرنے کے درپے ہو (ان کو جہاد کے ساتھ خوف زدہ کرو کہ) یہ لوگ ان میں داخل نہ ہونے پائیں، مگر خوف زدہ ہو کر، ان کے لیے دنیا میں ذلت ہے اور ان کے لیے آخرت میں بڑا عذاب ہے۔''

اب فرمایا کہ اس شخص سے بڑا ظالم کون ہے جو اللہ کی مساجد سے روکنے والا ہے کہ ان میں اللہ کا ذکر نہ ہو اور کوشش کرتا ہے کہ ان مسجدوں کو ویران و منہدم کر دے۔ فرمایا: جو یہ کرنے والے ہیں، ان کے لیے سزا ہے کہ دنیا میں بھی رُسوا کریں گے اور آخرت میں ان کو بہت بڑا عذاب ہوگا۔ اس آیت کا ماقبل سے تعلق یہ ہے کہ سب سے بڑی مساجد تین ہیں: ایک اللہ کا کعبہ مسجد الحرام اور دوسری مدینہ منورہ کی مسجد (مسجد نبوی) اور تیسری بیت المقدس (مسجد اقصیٰ)۔ یہ تینوں سب سے افضل اور شان والی مسجدیں ہیں، جن کا مقابلہ دنیا کی کوئی مسجد نہیں کرسکتی۔ اگرچہ آیت میں ﴿مَسٰجِدَ اللّٰهِ﴾ کا حکم سب مسجدوں کے لیے مشترک ہے۔

بیت اللہ و مسجد نبوی ﷺ و مسجد اقصیٰ کس نے بنائیں؟

بعض مسجدیں علماء اور بعض اولیاء اللہ اور بعض عام مسلمانوں نے بنائیں، لیکن یہ کعبہ تو ایسا ہے جو اللہ کے حکم سے

سب سے پہلے ملائکہ نے بنایا۔ پھر آدم علیہ السلام نے، پھر حضرت ادریس علیہ السلام نے اور پھر حضرت نوح علیہ السلام نے بنایا۔ اور مدینہ کی مسجد بھی اتنی شان والی ہے کہ جس کی بنیاد خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے رکھی، وہاں زندگی کا ایک حصہ گزارا، نمازیں پڑھائیں، دس سال کی زندگی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدینہ میں گزری۔ اور مسجد اقصیٰ بھی بڑی شان والی مسجد ہے، جس کو حضرت داؤد علیہ السلام و سلیمان علیہ السلام نے بنایا۔ پھر ایک وقت ایسا آیا کہ مدنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وزیر امیر المومنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے بنایا، مسجد اقصیٰ کی شان اتنی بڑی ہے کہ اللہ چاہتے تو اپنے محبوب کو سیدھا معراج کی رات آسمان پر لے جاتے، لیکن اللہ پاک پہلے مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک لے گئے، وہاں ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء سے ملاقات ہوئی اور پھر وہاں سے معراج شروع ہوا۔ اس لیے قرآن پاک نے صاف کہہ دیا: ﴿سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِيْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ لِنُرِيَهٗ مِنْ اٰيٰتِنَا ۭ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ①﴾ [الاسراء:۱] میرے مدنی! ہم آپ کو اس مسجد کی طرف لے جا رہے ہیں جس کے ارد گرد ہم نے ظاہری اور باطنی دونوں برکتیں رکھی ہیں۔ ظاہری برکتیں یہ ہیں: پھل، فواکہ، نہریں اور چشمے۔ باطنی برکتیں یہ ہیں کہ اس زمین سے اللہ نے سینکڑوں انبیاء پیدا فرمائے۔

مساجد کو ویران کرنے کا معنیٰ:

پہلے تو قبلہ بیت المقدس تھا، پھر بیت اللہ بنا تو یہودیوں نے نسخ کا انکار کیا اور کہا کہ یہ حکم غلط ہے کہ پہلے قبلہ بیت المقدس تھا، اب یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ تو اس حکم کو غلط کرنے کا مقصد یہ تھا کہ لوگ بدظن ہوں اور اللہ کی مسجدیں برباد ہوں؛ کیونکہ لوگوں کے دماغ میں شبہ پیدا ہوا ہوگا کہ پتہ نہیں، وہ قبلہ سچا تھا یا یہ قبلہ سچا ہے تو اس کی وجہ سے دونوں گھروں میں آنے سے رک جائیں گے۔ برباد کرنے کا اصل سبب یہودی بنے۔ اسی طرح نصرانیوں نے یہود کا مقابلہ کیا اور بیت المقدس کو برباد کر دیا۔ ستر ہزار یہودیوں کو تو صرف بخت نصر کے زمانے میں قتل کرایا۔ انہوں نے بھی مسجدوں کو ویران کیا۔ مکہ کے مشرکین نے بھی چوکیاں بٹھا دیں کہ مسلمانوں کو کعبہ میں نہ آنے دیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی نہ آنے دو۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حدیبیہ میں بیٹھے ہیں، کافر اندر نہیں آنے دے رہے تو ان سب نے اللہ کے گھروں کو ویران کرنے کی کوششیں کیں۔ یہودیوں نے مدینہ منورہ میں بھی یہی کوشش کی کہ مکہ والوں سے مل کر مدینہ پر حملہ کروایا، تاکہ مسجد نبوی ویران ہو جائے۔ اس لیے اللہ پاک نے پہلے ان تین جماعتوں کا ذکر کیا، اس کے

بعد یہ آیت آئی:

﴿وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ أَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِيْ خَرَابِهَا﴾ [البقرۃ:۱۱۴]

اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں ان کی بات کا رد فرمایا کہ اگر تم جنت میں جانے کا دعویٰ کرتے ہو اور اپنے آپ کو اللہ کا محبوب سمجھتے ہو تو جو اللہ کا پیارا ہوگا وہ اللہ کے گھروں کو برباد نہیں کرے گا۔ اگر تم یہ دعویٰ کرتے ہو کہ ہم اللہ کے بیٹے اور محبوب ہیں اور یہ دعویٰ ہے کہ جنت میں کوئی نہیں جائے گا، مگر یہود و نصاریٰ، تم تو دنیا میں جنت کے دعویدار ہو اور تمہارا عالم تو یہ ہے کہ تم اللہ کے گھروں کو برباد کر رہے ہو۔ اگر تم اللہ کے دوست، پیارے اور فرمانبردار ہوتے اور واقعتاً تم صحیح معنوں میں جنت کے حق دار ہوتے تو اللہ کے گھروں کو برباد کیوں کرتے؟ ان آیات میں جو حکم ہے وہ تمام روئے زمین کی مساجد کے لیے ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے دوسری جگہ بھی ارشاد فرمایا: ﴿إِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَأَقَامَ الصَّلٰوةَ﴾ [التوبۃ:۱۸] اس آیت میں اللہ نے اپنے ماننے والوں کے ذمہ لگایا کہ جہاں بھی مسجد ہو، اس مسجد کا آباد کرنا ایمان کی نشانی ہے اور مسجد کا ویران کرنا کفر کی نشانی ہے۔ اب مسجد کی بربادی ایک تو ظاہراً ہوتی ہے جسے تخریب ظاہری کہا جاتا ہے، جیسے مسجد کو توڑ دینا اور گرا دینا، مسجد کا نام ونشان مٹا دینا، یہ بھی مسجد کا برباد کرنا ہے۔ اور ایک ہے مسجد کی تخریب معنوی یا تخریب باطنی، اس میں مسجدوں کو تو نہیں گرایا جاتا، لیکن اس میں ایسے حالات پیدا کر دیئے جاتے ہیں کہ مسجدوں میں کسی کو آنے نہ دیا جائے۔ تو جب مسجد میں کوئی نہیں آئے گا تو مسجد برباد اور ویران ہوگی۔

مساجد کو ویران کرنے میں یہود و نصاریٰ کا کردار:

یہ تو یا تخریب ظاہری ہے جیسے کہ یہودیوں نے حضرت یحییٰ علیہ السلام جو اللہ کے پیغمبر حضرت زکریا علیہ السلام کے بیٹے ہیں، ان کو قتل کر دیا۔ یہ سابقہ دور سے چلا آرہا ہے۔ یاد رکھو کہ جتنے حق والے ہوتے ہیں وہ کافروں کے ہاتھ سے ہمیشہ شہید ہوتے ہیں، حتیٰ کہ بعض انبیاء بھی ان کے ظلم نہ بچ سکے، بلکہ بنی اسرائیل نے تو سینکڑوں ہزاروں انبیاء تک کو قتل کیا۔ حالانکہ اللہ نے ستر ہزار یا اس سے بھی زیادہ انبیاء ان کی نسلوں میں بھیجے، لیکن ان ظالموں نے ناحق گناہ کیے، حالانکہ انبیاء تو معصوم ہوتے ہیں اور نبی کا قتل تو کبھی حق ہو ہی نہیں سکتا، بلکہ اللہ نے ان کے لیے ''بِغَيْرِ الْحَقِّ'' کہہ کر ان کے ظلم کو اور آشکارا کر دیا کہ میرے پیغمبروں کو انہوں نے ناحق قتل کر دیا اور ستر ستر نبی ایک دن میں قتل ہوئے۔ اسی طرح

تاریخ عالم پر نظر ڈالیں تو اسی طرح حق والے باطل والوں کی تلواروں کے نیچے آئے۔ ہمیشہ حق والوں نے اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے قربانیاں دیں، ہمیشہ حق والوں نے اللہ کے لیے قید، صعوبتیں اور جیلیں برداشت کیں۔ حضرت یحییٰ علیہ السلام کو جب یہودیوں نے قتل کیا، اس وقت روم کے جو نصاریٰ تھے ان کے بادشاہ کا نام طیطوس تھا، اس کو نصاریٰ نے تیار کیا کہ ہم یہودیوں سے بدلہ لیں گے اور اس زمانے میں عراق کے اندر بھی ایک مجوسی بادشاہ تھا۔ بعض مؤرخین نے اس کا نام بخت نصر لکھا ہے۔ ویسے یہ بات تاریخی اعتبار سے غلط ہے؛ اس لیے کہ بخت نصر کا جو زمانہ ہے وہ حضرت یحییٰ علیہ السلام سے بہت پہلے کا ہے۔ البتہ یہ ہوسکتا ہے کہ یہ بادشاہ دوسرا ہو، وہ بخت نصر اوّل ہو اور اسے بخت نصر ثانی سمجھا جاتا ہو۔ جیسے مصر کے بادشاہوں کا لقب فرعون ہوتا تھا، حبشہ کا جو بادشاہ ہوتا اس کا لقب نجاشی ہوتا تھا اور روم کے بادشاہ کا لقب قیصر ہوتا تھا اور فارس کے بادشاہ کا لقب کسریٰ ہوتا تھا۔ اسی طرح اس کا لقب بھی بخت نصر ہوسکتا ہے، اس لیے شاید اس کا لقب بخت نصر ثانی ہو۔ بخت نصر اوّل جو بھی ہو ہی نہیں سکتا تو اس طیطوس نے بخت نصر ثانی سے مدد مانگی کہ یہودی اب اپنے ظلم و جور میں اتنے آگے بڑھ گئے کہ انہوں نے حضرت یحییٰ علیہ السلام کو قتل کر ڈالا تو اس یہود بے بہبود قوم سے ہم انتقام لینا چاہتے ہیں، تم ہماری مدد کرو۔ اس بادشاہ نے بھی اپنی افواج اور طیطوس نے بھی روم سے اپنی افواج نکال کر بیت المقدس اور مسجد اقصیٰ کا محاصرہ کرلیا، یہودیوں کو قتل کر کے ان کی جائیدادیں ویران کر ڈالیں، لیکن اس کے ساتھ ان ظالموں نے یہ کیا کہ یہود تو دشمن تھے، لیکن اللہ کا گھر بیت المقدس کو بھی برباد کردیا، بیت المقدس کو بھی انہوں نے منہدم کردیا اور مسجد کے اندر نجاسات پھینکی گئیں اور مسجد کے اندر خنزیر ذبح کر کے اس کا گوشت اور خون پھینکا گیا۔ یہ وہی بات ہے جو آج بھی کافر دہراتے ہیں کہ مسلمانوں کے گھروں اور ان کی مسجدوں میں آکر خنزیر ڈال دیتے ہیں، خون ڈال دیتے ہیں۔ یہ یہود و نصاریٰ کی پرانی رسم ہے۔ انہوں نے جہاں یہودیوں کا قتل عام کر ڈالا اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے مسجد اقصیٰ کو بھی برباد کردیا۔

مساجد کی آبادکاری میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا کردار:

اور یاد رکھیں کہ یہ مسجد اقصیٰ اتنے عرصے تک منہدم اور ویران رہی، جب سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا دور آیا تو اس وزیر رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی افواج بھیجیں اور ساتھ انہیں یہ بھی حکم دیا کہ مسجد اقصیٰ چونکہ اللہ کا گھر ہے اور یہ قبلہ انبیاء ہے، اسے داؤد علیہ السلام نے بنایا ہے، اس گھر کو دوبارہ تعمیر کیا جائے، پھر اس کو آباد کیا سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے۔ اور یہ

خدا کی شان ہے کہ اللہ جس کے نصیب میں کوئی بات رکھ دے، اسے کون روک سکتا ہے؟ یعنی آج دنیا میں کوئی دشمن سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا نہ ماننے والا بھی اور آپ رضی اللہ عنہ کے نام سے نفرت کرنے والا بھی یہ انکار نہیں کر سکتا کہ مسجد اقصیٰ کو آباد کرنے والا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ تھا۔ آپ اندازہ کریں کہ قبلہ اوّل کی آبادی ظاہری بھی کی، اس کو دوبارہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے تعمیر کرایا اور آج آپ جس قبلہ کے اندر نماز پڑھ رہے ہیں، اس قبلہ کی معنوی آبادی بھی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے ذریعے ہوئی تھی، یعنی مسجد اقصیٰ کی تو آپ رضی اللہ عنہ نے تعمیر بھی دوبارہ کرادی اور اللہ کا کعبہ، ابتدائے اسلام میں جب سرکارِ مدینہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلانِ نبوت فرمایا تو ابتدائے اسلام میں جتنی نمازیں، عبادت اور اللہ کا ذکر ہوتا تھا، وہ ذکر خفیہ طریقے سے ہوتا تھا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ جب اسلام لائے، انہوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اسی دن کلمہ پڑھا اور اپنا ہاتھ نبوت کے ہاتھ میں دیا تو غیرتِ فاروقی نے یہ برداشت نہ کیا کہ ہم اب بھی چھپ کر نماز پڑھیں۔ انہوں نے سرکارِ مدینہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ الحمدللہ! میں مسلمان ہوگیا ہوں، میں ایک بات آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا اسلام اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت اللہ کے نزدیک حق نہیں ہے؟ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بالکل حق ہے۔ عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کی کہ کیا یہ باطل اور بت اور ان کی بت پرستی کے باطل ہونے میں کوئی شبہ ہے؟ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بالکل نہیں، وہ باطل پر ہیں اور ہم حق پر ہیں تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ غیرتِ فاروقی یہ برداشت نہیں کرسکتی کہ جھوٹے خدا کے ماننے والے تو کعبے میں کھل کر عبادت کریں اور ہم سچے خدا کے ماننے والے چھپ کر عبادت کریں۔ یہ میری غیرت کے خلاف ہے۔ آپ مہربانی کریں، آپ آگے چلیں، آج ہم جتنے مسلمان ہیں تیس ہیں یا چالیس، اور قلیل ہیں، لیکن ایمان تو ہمارے اندر موجود ہے تو سب سے پہلے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم آگے چلے اور پیچھے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور پھر امیر حمزہ رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی تلوار ان کے ہاتھ میں ہے۔ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اے قریشیو! اگر کسی کو شوق ہو اپنی بیوی کو بیوہ کرانے کا، بچوں کو یتیم کرانے کا تو میرے سامنے آئے، کیونکہ عمر مسلمان ہو چکا ہے، آج کعبہ میں تمہاری بات نہیں چلے گی۔ اس کعبہ کو آباد کرنے کا ذریعہ بھی عمر بنا اور مسجد اقصیٰ مسلمانوں کے قبضہ میں رہی، تو پھر کافی عرصہ گزر جانے کے بعد جب ضعف آگیا اور مسلمانوں کے اندر کمزوری کے پہلو داخل ہونا شروع ہوگئے تو (نعوذ باللہ) پھر اس پر کفار نے قبضہ کرلیا تو مسجد اقصیٰ پھر مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل کر کافروں کے ہاتھ میں چلی گئی اور پھر چھٹی صدی ہجری میں سلطان صلاح الدین ایوبی نے دوبارہ جنگ لڑ کر مسجد اقصیٰ کو آزاد کرایا،

اس نے پھر کافروں سے چھینا۔

مسجد اقصیٰ ضرور آزاد ہوگی:

اور آج بدقسمتی سے ہماری بداعمالیوں کی وجہ سے پھر کافروں کے ہاتھ آ گئی ہے، لیکن ان شاء اللہ ا ہمیں اپنے اللہ کے فرمان اور فرمانِ رسول ﷺ پر ایسا یقین ہے کہ جیسے اب رات ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے اور جیسے اللہ کا گھر ہمارے سامنے ہے اور کعبہ میں ہمیں کوئی شبہ نہیں ہے۔ حضور اکرم ﷺ کے فرمان میں بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ پوری روئے زمین پر اسلام کو پھر غالب کر دیں گے اور فرمایا کہ ایک وقت ایسا آئے گا کہ یہود کو کہیں پناہ نہیں ملے گی، اگر یہ کسی پتھر یا درخت کے پیچھے چھپیں گے تو وہ بول پڑیں گے: اے مسلمان! ادھر آؤ، میرے پیچھے یہودی چھپا ہوا ہے، اس بدبخت کو قتل کر دو۔ اس لیے ہمیں یقین ہے کہ اسلام کا سورج پھر پوری آب و تاب سے چمکے گا۔ پوری دنیا پر اسلام کا غلبہ ہوگا۔

اسلام ہر غریب و امیر کے گھر میں داخل ہوگا:

جیسا کہ میرے مدنی سرکار ﷺ نے فرمایا: کوئی مٹی کا بنا ہوا گھر یا بالوں کا بنا ہوا خیمہ نہیں بچے گا، مگر اسلام اس کے اندر داخل ہو کر رہے گا۔ فرمایا کہ اسلام کا داخلہ عزت کے ساتھ ہوگا، اسلام میں لوگ اگر عزت سے داخل نہیں ہوں گے تو پھر عاجز ہو کر سرنگوں یا ذلیل ہو کر اسلام کی حقانیت کو جان لیں گے۔

اسی طرح اللہ نے قرآن مقدس میں دو مقام پر فرمایا: ﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۙ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ۝﴾ [الصف: ۹] فرمایا کہ میرے مدنی! ہم تیرے دین کو تمام ادیان پر غالب کر دیں گے۔ اور ایک جگہ فرمایا: ﴿وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ۝﴾ [التوبۃ: ۳۲] اور دوسری جگہ فرمایا: ﴿وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ۝﴾ ان دونوں لفظوں میں اشارہ ہے کہ یہ نہیں اسلام صرف کافروں پر غالب ہوگا، بلکہ کافروں کی جتنی انواع ہیں: یہودی، نصرانی، بدھ مت، ہندو مت یا جو بھی مذاہب ہیں، اللہ سب پر اسلام کو غالب کر دے گا۔ بہرحال اللہ پاک ہم سب مسلمانوں کو حق بات سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔

حدیبیہ کے مقام پر حضور اکرم ﷺ کو روکا گیا، آخر نتیجہ یہ نکلا کہ حضور اکرم ﷺ بغیر عمرہ کے واپس مدینہ تشریف لے گئے۔ اللہ نے فرمایا: حالانکہ تم لوگوں کو تو یہ چاہیے تھا کہ جب تم اللہ کے گھروں میں داخل ہوتے تو



ڈرتے ہوئے داخل ہوتے، کہیں بے ادبی اور اللہ کے گھر کی بے حرمتی نہ ہو جائے۔ اسی لیے مسنون ہے کہ جب آدمی مسجد میں داخل ہو تو دو رکعت تحیۃ المسجد ادا کرے اور اللہ کا ذکر کرے۔

مشرکین مکہ کو دنیا کی رُسوائی اسی دن حاصل ہوئی تھی جس دن حضور اکرم ﷺ اپنی جماعت کے ساتھ اسلام اور توحید کا پرچم لہراتے ہوئے مکہ میں داخل ہوئے اور بلال رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ بلال! یہ اللہ کا گھر ہے، جس میں مشرک ہمیں داخل نہیں ہونے دیتے تھے، آج الحمد للہ! ہم فاتح مکہ کی حیثیت سے کعبہ میں داخل ہو رہے ہیں، آج تم کعبے کی چھت پر چڑھ جاؤ اور اذان بلند کرو۔

تو اللہ نے فرمایا کہ دنیا کی ذلت تو تمہیں پہنچے گی اور آخرت میں بھی تمہارے لیے دردناک عذاب ہے۔

مساجد کی رونق عمارت سے نہیں، نمازیوں سے بنتی ہے:

مسجدوں کو آباد کرنا ایک تو یہ ہے کہ ظاہر میں بڑی بڑی خوبصورت مسجدیں بنانا۔ یہ آباد کرنا نہیں ہے۔ مسجدوں کی آبادی نماز پڑھنے سے ہوتی ہے چاہے مسجد کچی ہو۔ حضور اکرم ﷺ نے جب مسجد نبوی بنائی تو اس کی دیواریں کچی تھیں اور کھجور کی چھڑیاں ڈالی ہوئی تھیں، جب بارش ہوتی تھی تو چھت ٹپکتی تھی اور سب کے کپڑے گیلے ہو جاتے تھے اور زمین پانی سے تر ہو جاتی تھی اور اسی کیچڑ کے اندر سجدہ اور اسی میں نمازیں ہوتی تھیں، لیکن اس مسجد کا مقابلہ دنیا کی کون سی مسجد کر سکتی ہے؟ اس لیے اصل آبادی مساجد کی یہ ہے کہ وقت پر اذان اور جماعت ہو، اللہ کے ذکر سے مسجدوں کو آباد کیا جائے۔ ہاں اس کے ساتھ اللہ کی توفیق ہو کہ اللہ کا گھر خوبصورت بنائے تو منع نہیں ہے، لیکن اصل مسجد کا آباد رہنا عمارت کا نام نہیں ہے۔ حضور پاک ﷺ نے فرمایا: ''مَسَاجِدُهَا عَامِرَةٌ وَ هِيَ خَرَابٌ عَنِ الْهُدٰى''[] کہ میری امت پر ایک وقت آئے گا، بڑی خوبصورت مسجدیں بنائیں گے، جو بڑی مزین ہوں گی، لیکن نماز پڑھنے والے نہیں ہوں گے۔ حضور اکرم ﷺ نے اس کو علاماتِ قیامت میں شمار کیا ہے۔ جیسا کہ اقبال مرحوم نے کہا ہے:

مسجد تو بنا دی شب بھر میں ایماں کی حرارت والوں نے
مَن اپنا پُرانا پاپی ہے برسوں سے نمازی بن نہ سکا

﴿وَسَعٰى فِىْ خَرَابِهَا﴾ کی تفسیر:

مسجدوں کو آباد کرنے کا مطلب یہ ہے کہ وہاں نمازیں اور اللہ کا ذکر زیادہ ہو۔ اور مسجدوں کی آبادی میں یہ بھی داخل ہے کہ ایسے امام بنائیں جو قرآن وحدیث کو سمجھنے والے، قاری القرآن ہوں، ایسے امام نہ بنائیں کہ جو قرآن بھی صحیح نہ پڑھیں۔ اسی طرح مسجدوں کو گرانا بھی بربادی ہے اور مسجد سے کسی کو روکنا بھی بربادی ہے۔ بلکہ علماء نے فرمایا کہ اگر کوئی مسجد سے تو نہیں روکتا، لیکن مسجد کے قریب اس نے گانے بجانے کی کوئی دکان بنا رکھی ہے یا ریڈیو یا ٹی وی کی دکانیں یا لاؤڈ سپیکر لگا دیتے ہیں، ہر دو منٹ کے بعد کوئی نہ کوئی گانا چل رہا ہے، یہ بھی مسجد کی بربادی ہے، اس کو بھی مسجد سے روکنے والا سمجھا جائے گا۔ اور اسی طرح اگر کوئی مسجد میں نماز پڑھ رہا ہے اور ایک آدمی زور زور سے قرآن پڑھنا اور ذکر کرنا شروع کر دیتا ہے تو دوسروں کی نماز خراب کر دی، تو یہ بھی مسجدوں سے روکنے والا ہے۔ ہاں! اگر مسجد خالی ہے، کسی کو حرج نہیں ہوتا تو آپ اللہ کا ذکر زور سے اور قرآن زور سے پڑھ سکتے ہیں، اور اسی طرح مسجدوں میں ایسے کام کیے جائیں جو حضور اکرم ﷺ سے ثابت نہ ہوں، یعنی جو چیزیں قرآن وسنت کے خلاف ہوں، نئی نئی بدعتیں ایجاد کی جائیں؛ کیونکہ سنت کے ذریعے آبادی اور بدعت کے ذریعے بربادی ہوتی ہے، یہ بھی مسجدیں ویران کرنے کا ذریعہ ہیں۔

مسجد کے آداب:

آدمی پاک لباس پہن کر مسجد میں داخل ہو جو اللہ نے اس کو دیا ہے۔ مسجدوں کے احترام میں یہ بات بھی داخل ہے کہ اپنا ناک صاف کر کے مسجدوں میں نہ پھینکو اور مسجد میں باہر کی کوئی گندی چیز مت لاؤ، اور اگر تم نے کوئی لہسن، پیاز یا کوئی بدبودار چیز کھائی ہو یا سگریٹ، حقہ پیتے ہیں، نسوار اور نشہ کھاتے ہو تو اپنا منہ صاف کر کے مسجد میں جاؤ۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: جو لوگ کچے پیاز کھائیں اور لہسن کھائیں، فرمایا کہ وہ جماعت میں نہ آئیں؛ کیونکہ اس سے نمازی کو ایذاء ہوتی ہے، ساتھ جو کھڑا ہو اس کے لیے تو آپ نفرت کا باعث بن جائیں گے اور گویا آپ اس کو مسجد سے روکنے کا ذریعہ بن جائیں گے۔ اور یہ بھی آدابِ مسجد میں شامل ہے کہ جب آپ مسجد میں داخل ہوں تو پہلے دایاں قدم رکھیں اور یہ دعا پڑھیں: ''بِسْمِ اللّٰهِ وَ الصَّلٰوةُ وَ السَّلَامُ عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ، اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِىْ ذُنُوْبِىْ وَ افْتَحْ لِىْ اَبْوَابَ رَحْمَتِكَ''۔ اسی طرح مسجد کے آداب میں یہ شامل ہے کہ جب آپ باہر نکلیں تو پہلے بایاں پاؤں

باہر رکھیں اور اس کے بعد پڑھیں: "بِسْمِ اللّٰهِ وَ الصَّلٰوةُ وَ السَّلَامُ عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ، اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِيْ ذُنُوْبِيْ وَ افْتَحْ لِيْ أَبْوَابَ فَضْلِكَ" مسلمانو! یہ صلوٰۃ وسلام کے موقع ہوتے ہیں اور اسی طرح آپ نماز کے اندر بھی پڑھتے ہیں: "اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ أَيُّهَا النَّبِيُّ وَ رَحْمَةُ اللّٰهِ وَ بَرَكَاتُهٗ"، نماز پڑھیں گے تو اس میں بھی پڑھیں گے درود ابراہیمی۔

تحیۃ المسجد کے مسائل:

تو اصل جو طریقہ کار ہے جو اللہ کے نبی نے خود سکھایا ہے اور اسی طرح مسجدوں کے اندر داخل ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ توفیق دے تو دو رکعت تحیۃ المسجد ادا کریں۔

فجر کی اذان ہوگئی، آپ اب مسجد میں داخل ہوئے تو اب جو دو رکعت سنت فجر سے پہلے پڑھنی ہے، بس وہی پڑھ لو۔ اسی کے اندر تحیۃ المسجد بھی آگئی اور سارے حق ادا ہو گئے اور ان کے بعد فجر کے فرض پڑھنے کے علاوہ کوئی نماز نہ پڑھو۔ یعنی اسی طرح آپ اب عشاء سے پہلے آئے، اپنی چار سنتیں جو غیر مؤکدہ ہیں یا دو سنتیں پڑھ لیں، تحیۃ المسجد بھی اسی میں آگئی۔ ہاں اگر وقت موجود ہے اور آپ اذان کے بعد آئے اور نماز تک دس یا پندرہ منٹ کا وقفہ ہے تو آپ تحیۃ المسجد کی دو رکعت بھی پڑھ لیں اور پھر سنت بھی ادا کر لیں۔ زیادہ سے زیادہ جتنی محنت کریں گے، اللہ پاک اتنا ہی اجر عطا فرمائیں گے۔

عصر اور فجر کے بعد تحیۃ المسجد کا حکم:

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر مکروہ وقت ہے تو تحیۃ المسجد بھی نہ پڑھی جائے، یعنی اگر عصر کے بعد مسجد میں داخل ہوں تو مغرب تک تحیۃ المسجد نہ پڑھیں اور فجر کے بعد مسجد میں داخل ہوں تو سورج نکلنے تک تحیۃ المسجد نہ پڑھیں۔

مسجد الحرام اور مسجد نبوی میں نماز کی فضیلت اور ثواب:

مسجد نبوی کی فضیلت ہے کہ حضور اکرم ﷺ ہجرت فرمانے کے بعد جب مدینہ تشریف لے آگئے تو جس مسجد کو میرے نبی ﷺ نے ہاتھوں سے بنایا اور جس میں آپ ﷺ نے خود امام بن کر دس سال تک نمازیں پڑھائیں، اس مسجد کی فضیلت بھی بہت بڑی ہے۔ اور بعض روایات میں یہ بھی آتا ہے کہ اس میں ایک نماز پچاس ہزار نماز کے برابر ہے، لیکن زیادہ راجح اور صحیح حدیث مبارک میں ایک نماز ایک ہزار کے برابر ہے۔

لیکن ایک بات کا فرق سمجھ لیں کہ ایک ہزار یا پچاس ہزار کا ثواب ان لوگوں کو ملے گا جو مسجد نبوی میں نماز

پڑھیں، مسجد نبوی کے علاوہ مدینہ پاک کی کسی اور مسجد میں نماز پڑھے تو یہ فضیلت نہیں ملے گی۔ لیکن مسجد حرام میں نماز باجماعت پڑھیں گے تو ستائیس لاکھ نمازوں کا ثواب ملے گا اور اگر آپ نے حرم میں اکیلے بھی ادا کی تو ان شاء اللہ! ایک لاکھ کا ثواب اللہ تعالیٰ عطا فرمائیں گے۔ چونکہ رحمت کے معاملے میں آدمی کو ان اعمال پر عمل کر لینا چاہیے جن میں زیادہ ثواب ہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی رحمت وسیع ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ﴾ [البقرۃ:۲۶۱] میں چاہوں تو جتنا جس کا اجر و ثواب بڑھا دوں۔ اس لیے فرمایا کہ میری رحمت جو ہے وہ ہر چیز سے زیادہ ہے۔ اور تیسری مسجد اقصیٰ یعنی بیت المقدس ہے، وہاں ایک نماز پڑھنے کا ثواب ایک ہزار کے برابر ہے۔ یہ تین مساجد دنیا کی تمام مساجد میں افضل، اعلیٰ اور اشرف ہیں۔

مساجد کے متعلق چند مسائل:

جب آپ نے ایک جگہ مسجد بنادی تو یہ اللہ کا گھر ہے، پھر اس میں آپ کوئی تصرف نہیں کر سکتے، یعنی اس کو توڑ کر مکان یا دکان نہیں بنا سکتے۔

میرے ایک دوست تعلق والے ہیں، وہ ڈی سی کے عہدہ پر تھے، انہوں نے مجھے بڑے فخر سے بات سنائی۔ کہنے لگا: جی ماشاء اللہ! اللہ کی رحمت اور توفیق سے میں جس ضلع بھی جاتا ہوں، وہاں مسجد بناتا ہوں۔ میں نے کہا: وہ مسجد آپ کیسے بناتے ہیں؟ اس نے کہا کہ مسجد کے لیے ہم چندہ مقرر کر دیتے ہیں کہ جو آدمی کام کے لیے آتے ہیں تو کہہ دیتے ہیں کہ دس روپے مسجد کے لیے دے دو، اور کاموں کے معیار کے مطابق یومیہ ہزار روپے لیتے ہیں، اگر کوئی بڑی پارٹی آ گئی تو اس سے پچاس ہزار روپے یا دس ہزار روپے مسجد کے لیے لے لیتے ہیں۔ میں نے کہا کہ حضرت! اس طرح تو مسجد بنوانا حرام ہے! کیونکہ جو آدمی اپنے اقتدار کے دباؤ سے کسی سے پیسہ لیتا ہے، یہ بھی رشوت ہے۔ اس لیے آپ مہربانی فرما کر ایسی مسجدیں نہ بنوایا کریں، اس سے بہتر تو یہ ہے کہ اپنے حلال کے پیسے سے ایک چھپر ڈال دیں اور وہاں لوگوں کو نماز پڑھوا دیں، اس سے آپ کو زیادہ ثواب ملے گا۔

زکوۃ کا پیسہ بھی مسجدوں پر نہیں لگ سکتا۔ زکوۃ کے پیسے کا مصرف وہی ہے جو اللہ نے معین کر دیا ہے، اس کے علاوہ کسی پر صرف نہیں ہو سکتا۔

اسی طرح جو مسجد بن گئی، لیکن اس میں پانی کا انتظام نہیں ہے تو یہ بھی مسجد کو ویران کرنے کے مترادف ہے۔ مثلاً

جب ہم سفر میں ہوتے ہیں، کئی مساجد ایسی ہوتی ہیں جن میں نماز کے لیے رک جاتے ہیں، لیکن وہاں پانی کا انتظام نہ ہونے کی وجہ سے ہم سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ اب وضو کہاں جا کر کریں؟ ہم نے ایسی بھی مساجد دیکھی ہیں کہ ان کے اندر اتنا بڑا گھاس کھڑا ہوا ہے اور ایسے لگتا ہے کہ اس میں کبھی بھول کر بھی کوئی آدمی داخل نہیں ہوا۔ اسی طرح شریعت نے یہ بھی حکم دیا ہے کہ اگر اللہ نے آپ کو گھر دیا ہے تو اپنے گھر میں بھی ایک چھوٹی سی جگہ مسجد بنا لو کہ عورتیں وہاں نماز پڑھیں اور ان کو مسجد کا ثواب ملتا رہے۔ یہ بھی اللہ مسلمانوں کو توفیق عطا فرمائے کہ ہم اپنے گھروں کو آباد کرنے والے ہیں۔ واللہ اعلم۔

مساجد کو ویران کرنے والے کون لوگ ہیں؟

ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: مفسرین کا اس بات کا اختلاف ہے کہ جن لوگوں نے اللہ کی مساجد سے روکا اور ان کو ویران کرنے اور خراب کرنے کی کوشش کی، اس سے مراد کون لوگ ہیں؟ اس میں دو قول ہیں:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ جن لوگوں نے اللہ کی مساجد سے روکا اور ان کی ویرانی کی کوشش کی، وہ نصاریٰ ہی ہیں؛ کیونکہ نصرانی بیت المقدس کی مسجد میں گندگی ڈالا کرتے اور لوگوں کو منع کرتے کہ اس میں نماز نہ پڑھیں؛ کیونکہ بیت المقدس کے ساتھ یہودیوں کی عقیدت ہے اور یہودیوں اور نصرانیوں کی آپس میں بڑی دشمنی تھی، اس لیے نصرانی کوشش کر رہے تھے کہ بیت المقدس کو ویران کریں اور اس میں کوئی گندی چیزیں ڈال دیں اور لوگوں کو منع کریں۔

عبدالرزاق رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ﴿وَسَعَىٰ فِي خَرَابِهَا﴾ سے مراد بخت نصر اور اس کے ساتھی ہیں کہ بخت نصر نے مسجد اقصیٰ کو ویران کیا، خراب کیا اور نصرانیوں نے بھی اس کی مدد کی۔

یہ قول نقل کیا ہے کہ اللہ کی مساجد سے روکنے والے اور مساجد کو خراب کرنے والے نصرانی ہیں، یہودیوں سے بغض کرنے کی وجہ سے، کیونکہ انہوں نے بخت نصر بابلی (جو عقیدہ کے طور پر مجوسی تھا) سے مدد لے کر بیت المقدس کو منہدم اور ویران کیا۔

سدی رحمہ اللہ بھی فرماتے ہیں کہ بخت نصر نے چڑھائی کی اور بیت المقدس کو خراب کیا اور حکم دیا کہ اس کے اندر مردار جانور ڈال دیئے جائیں، اس میں روم والوں نے بھی مدد کی کہ بنی اسرائیل کے یہودیوں نے بھی یحییٰ بن

زکریا علیہ السلام کو قتل کیا تھا۔ اسی طرح حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ بھی فرماتے ہیں کہ اس سے مراد نصرانی ہیں۔

دوسرا قول مفسرین کا یہ ہے کہ اس آیت سے مراد مشرکین مکہ ہیں، جنہوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو عمرہ کرنے سے منع کر دیا اور حدیبیہ کے مقام پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو روک دیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے جانور وہیں ذبح کر دیئے اور بغیر عمرہ ادا کیے واپس مدینہ پاک تشریف لے گئے۔ حالانکہ اس زمانے میں مشرکین مکہ کا کعبہ کے احترام کا یہ عالم تھا کہ ان کے باپ کا قاتل بھی مل جاتا تھا تو حرم میں قتل نہیں کرتے تھے، لیکن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو روک دیا۔

ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے پہلے قول سے حجت پکڑی کہ قریش نے اللہ کے کعبے کو خراب اور منہدم نہیں کیا اور نصرانیوں نے تو بیت المقدس کو توڑ ڈالا۔ اس لیے آیت سے نصاریٰ مراد ہیں۔

ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر نصرانیوں نے یہودیوں کو منع کیا کہ بیت المقدس میں داخل نہ ہوں تو نصرانی حق پر تھے؛ کیونکہ ان کا دین یہودیوں سے اس وقت زیادہ بہتر تھا؛ کیونکہ وہ عیسیٰ علیہ السلام کے دین پر قائم تھے اور یہودی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے منکر اور اپنا دین چھوڑ چکے تھے اور اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے یہودیوں پر حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زبان کے ذریعے لعنت بھی بھیجی تھی تو ایسے ملعونوں کو روکا جاتا، لیکن یہ تو نہیں کہ وہ (عیسائی) بیت المقدس کو بھی منہدم کر دیتے۔

ابوجہل کا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر دوبارہ حملہ کرنا اور اس کا انجام:

ایک دفعہ کعبہ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عبادت فرما رہے تھے تو ابوجہل آ کر کہنے لگا کہ آئندہ آپ یہاں آ کر نماز نہ پڑھا کریں، آئندہ مسجد الحرام اور کعبۃ اللہ کے پاس عبادت نہ کیا کریں۔ اور اس بدبخت نے اتنے گستاخانہ الفاظ کہے، کہنے لگا: (نعوذ باللہ) پھر میں آپ کو یہاں نماز پڑھتے ہوئے نہ دیکھوں، ورنہ میں آپ کی گردن مَسل ڈالوں گا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لے گئے، اور اس وقت جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عادت مبارک تھی آپ پھر مسجد میں آ گئے اور نماز پڑھ رہے تھے تو مکہ کے سرداروں نے ابوجہل کو چھیڑا کہ تم نے حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو چیلنج کیا تھا کہ میں نماز نہیں پڑھنے دوں گا۔ محمد کو دیکھیں! نماز پڑھ رہے ہیں۔ ابوجہل گیا اور بڑا پتھر اٹھا کر لے آیا۔ (نعوذ باللہ!) اس نے ارادہ کیا کہ جب حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سجدہ میں جائیں گے تو میں پتھر مار کر قتل کر دوں گا۔ ابھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نزدیک گیا کہ اُلٹے پاؤں واپس آ گیا اور کانپتے کانپتے پتھر بھی ہاتھ سے گر گیا۔ کفار مکہ نے ابوجہل کو جا پکڑا کہ تم

تو بڑے بہادر ہو، تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ کہنے لگا کہ محمد (ﷺ) اور میرے درمیان آگ کی ایک خندق تھی، اگر میں آگے جاتا تو آگ میں جل کر مر جاتا، اس لیے بھاگ کر واپس آ گیا اور حملہ نہیں کر سکا۔ اسی طرح اس نے دوسری مرتبہ بھی حملہ کرنے کا ارادہ کیا، حضور اکرم ﷺ کو نقصان پہنچانے کا ارادہ کیا، لیکن ناکام ہو کر واپس چلا گیا۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ مجھے اس ذات کی قسم! اگر یہ بدبخت مجھ پر حملہ کرتا تو اللہ کے فرشتے اس کی بوٹی بوٹی کر کے اُڑا دیتے، لیکن آج اس نے جرأت نہیں کی اور وہ ناکام ہو کر واپس لوٹ گیا۔ اس لیے اللہ نے فرمایا کہ ان سے بڑا ظالم کون ہوگا جو اللہ کے نبی ﷺ کو مسجد میں نہ آنے دے۔

مساجد اللہ کا گھر ہیں، بندوں کی مِلک نہیں:

اب تو پوری دنیا میں یہ حال ہو گیا ہے کہ اللہ کی مسجدیں تو بہت کم ہیں۔ جس ملک میں چلے جاؤ، کہتے ہیں کہ یہ فلاں پارٹی کی مسجد ہے اور یہ فلاں پارٹی کی مسجد ہے۔ او جی! کوئی اللہ کی مسجد بھی ہے کہ نہیں؟ تو جواب میں کہتے ہیں کہ نہیں جی، ویسے تو سب اللہ کی مسجدیں ہیں، لیکن ان کے علاوہ دوسری جماعت والا (نعوذ باللہ!) مسجد میں قدم بھی نہیں رکھ سکتا۔ کتنی مساجد ہیں کہ لوگ تبلیغ کے لیے وہاں گئے تو کتنے لوگوں نے انہیں اُٹھا کر مسجد سے باہر ڈال دیا۔ کپڑے، بستر اُٹھا کر باہر پھینک دیئے، مسجدوں کو دھو ڈالا کہ اس میں کوئی اللہ کا نام لیوا نہیں آ سکتا۔ یعنی اتنا ظلم اور تشدد ہے کہ بس ایک ٹھیکیداری ہے کہ یہ اگر دیوبندی کی ہے تو بریلوی نہیں آ سکتا، کسی بریلوی کی ہے تو دیوبندی نہیں آ سکتا، اہل حدیث کی مسجد میں حنفی نہیں آ سکتا، کوئی آمین کہہ دے تو بس لڑائیاں شروع ہو گئیں، یعنی اپنے فسادات اور وہ بھی مسلمانوں میں ہیں۔

اللہ کے بندو! اللہ کی مسجدیں تو ہوتی ہی اللہ کے لیے ہیں، اگر مسجد تمہاری مِلک ہے تو وہ اللہ کا گھر تو نہیں رہا۔ ﴿وَّاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا﴾ [الجن:۱۸] تمام مساجد اللہ کے لیے ہیں۔ اس لیے فرمایا کہ یہ مسجدیں اللہ کے گھر ہیں، ان کے اندر اللہ کا ذکر کیا جائے، اللہ کا نام بلند کیا جائے، اس میں نمازیں ہوں، تلاوت ہو، قرآن ہو، عبادت ہو، صبح و شام اللہ کی تسبیح ہو۔

اسی طرح اللہ نے فرمایا کہ اللہ کی مساجد کو وہ آباد کرتے ہیں جن کا اللہ پر اور یومِ آخرت پر ایمان ہے، جو اللہ سے اور روزِ آخرت سے نہیں ڈرتا اور جس کو اپنی سزا و جزا کا کوئی پتہ نہیں، وہ چھوٹے چھوٹے مسئلوں پر جھگڑا کرتا

ہے۔حالانکہ ہمیشہ یادرکھو کہ جتنے فرقے باطلہ اور ضالہ ہیں، جتنے گمراہ فرقے ہیں، وہ تو پہلے ہی تمہاری مسجدوں سے دور ہیں اور بلکہ ان کو تو اللہ توفیق ہی نہیں دیتا کہ وہ اپنے عبادت خانے کا نام مسجد رکھ لیں، جیسا کہ یہود و نصاریٰ کے نزدیک کنیسہ، گرجا، سکھوں کا گردوارہ اور ہندوؤں کا مندر وغیرہ۔اسی طرح ان کے عبادت خانوں کے نام بھی مسجد نہیں ہیں۔

یہ لفظ اللہ نے اگر دیا ہے تو اہل سنت والجماعت کو نصیب فرمایا ہے۔کعبہ کا نام بھی مسجد الحرام ہے اور مدینہ پاک کا شرف بھی حضور اکرم ﷺ کی ذات اور مسجد النبی ہے، اور جہاں دو رکعت نفل نماز پڑھنے سے عمرہ کا ثواب ملتا ہے وہ مسجد قبا ہے، اسی طرح جہاں تحویل قبلہ ہوئی وہ مسجد قبلتین ہے، میرے مدنی سرکار ﷺ جہاں معراج سے گئے وہ مسجد اقصیٰ ہے، اسی سے اندازہ لگالو کہ نبی ﷺ کے ماننے والے کون ہیں، جن کی مسجدیں ہیں، جو لوگ مسجد کے لفظ سے بھی الرجک ہیں، ان کا پھر اسلام سے کیا تعلق ہے؟

مسجد کا نام رکھنے کا حکم اللہ تعالیٰ نے دیا:

اللہ نے مسجد کا لفظ اہلسنت والجماعت کو دیا کہ ان کے نزدیک مسجدیں ہیں: کیونکہ ہمارا تعلق ہی مسجد الحرام سے ہے، ہمارا رُخ اور قبلہ بھی مسجد الحرام ہے۔اللہ نے فرمایا: ﴿فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ﴾ [البقرۃ:۱۴۴] اللہ نے ''شَطْرَ الْكَعْبَةِ'' نہیں فرمایا کہ تم اپنے رخ کعبہ کی طرف پھیرو، بلکہ اللہ نے فرمایا کہ مسجد الحرام کی طرف پھیرو۔ اب اہلسنت والجماعت ہی ایک ایسی جماعت ہے جن کا تعلق مسجد سے ہے۔اب اگر تم اہلسنت ہونے کے باوجود بھی لڑائیاں شروع کردو کہ یہ داخل ہوسکتا ہے اور یہ داخل نہیں ہوسکتا، یہ نوری مسجد ہے، یہ خاکی، یہ عرشی اور وہ فرشی مسجد ہے تو پھر قیامت کا انتظار کرو اور تو کچھ نہیں کہا جاسکتا۔پھر اللہ سے خیر مانگو کہ اللہ خاتمہ بھی ایمان پر کردے۔ جب مسجدیں تقسیم اور مسجدوں کی امامت پر جھگڑا، اذان پر جھگڑا اور اب تو ظالم ایسے بھی لوگ پیدا ہوگئے ہیں کہ مسجدوں میں نمازیوں پر حملہ، چاہے عبادت کوئی کررہا ہو یا ذکرواذکار یا درس وتدریس میں مشغول ہو، اسلام یہ حکم تو نہیں دیتا کہ آپ اس انداز سے لڑائیاں لڑیں۔ایک آدمی چلو آپ کو قبول نہیں، وہ آکر مسجد میں نماز پڑھتا ہے تو یہ کون سی عقلمندی ہے کہ اسے منع کیا جائے کہ تم نماز نہیں پڑھ سکتے؟ یا اس کو مسجد میں موت کے بھینٹ چڑھا دیا جائے، یا اس لیے کہ تمہارا اس پارٹی سے تعلق نہیں ہے، تم اس لیے نماز نہیں پڑھ سکتے۔

اب جبکہ ضرورت ہے کہ اللہ مسلمانوں کو ملنے کی توفیق دے، اب اگر ہم ان مسائل میں اُلجھ گئے تو نتیجہ کیا نکلے گا کہ دشمن تو یہی چاہتا ہے کہ تم لڑتے رہو اور تمہارا علم تقریر، قلم اور طاقت وقوت آپس میں لگی رہے، تا کہ دشمن کی طرف تم نظر ہی نہ اُٹھا سکو، اللہ رحمت فرمائے۔ تو اس لیے یاد رکھو! مسجدوں کا ویران کرنا دو طریقوں سے ہوتا ہے: ایک مسجد کا گرا دینا، یہ بھی ظلم ہے، یا مسجد کے اندر ایسے حالات پیدا کر دینا کہ لوگ نماز ہی نہ پڑھنے آئیں، یہ بھی بڑا ظلم ہے۔

ایک شبہ اور اس کا ازالہ:

ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ابن جریر رحمہ اللہ نے صرف ظاہری چیز پر نظر رکھی کہ نصاریٰ نے بیت المقدس کو خراب کیا، لیکن مسجد الحرام کو مکہ کے قریشیوں نے خراب نہیں کیا یعنی توڑا نہیں۔ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اس سے بڑی خرابی کیا ہوگی کہ اللہ کے نبی ﷺ کو اللہ کے گھر سے روک دیا جائے۔ عمارت بنا دی جائے اور اللہ کے نبی ﷺ کو نہ آنے دیا جائے اور بتوں کو وہاں داخل کر دیا جائے، لیکن محمد ﷺ کو داخل نہ ہونے دیا جائے۔ اس سے بڑا ظلم کیا ہوگا کہ اللہ کی توحید ماننے والے تو مسجد میں نہ آئیں، لیکن جو بت پرستی، قبر پرستی اور غیر اللہ کو مشکل کشا ماننے والے ہوں، وہ کہیں کہ ہم مسجد آباد کر رہے ہیں۔ یہ کس قسم کی مسجد آباد کریں گے؟ بہر حال مساجد جو بھی ہیں، وہ اللہ کے لیے ہیں، اس کے اندر کسی کو حق نہیں پہنچتا کہ وہ یہ کہے کہ یہ میری مسجد ہے، یہ تیری ہے۔

﴿لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴾ [البقرۃ: ۱۱۴] کہ اللہ کیوں نہ عذاب دے ان لوگوں کو جو مسجد الحرام سے روکنے والے ہیں؟ اور دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم اس کے ولی، وارث اور مجاور ہیں۔ فرمایا: اللہ کی مسجدوں کا وارث وہ ہو سکتا ہے جو اللہ سے ڈرنے والا ہو، یہ نہیں کہ ہر آدمی دعویٰ کرے کہ یہ مسجد ہم نے بنائی تھی۔

مسجد حرام کا احترام:

ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس آیت کا ترجمہ بعض مفسرین کے قول میں یہ ہے کہ نہیں زیب دیتا ان لوگوں کو کہ داخل ہوں مسجد حرام میں مگر ڈرتے ہوئے، ہیبت اور خوف سے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ جب بھی اللہ تعالیٰ کے گھر میں داخل ہوتے، ہیبت اور عظمت کے ساتھ داخل ہوتے کہ میں اللہ تعالیٰ کے گھر میں جا رہا ہوں۔ جب انسان کسی بادشاہ کے گھر میں قدم رکھتا ہے تو لازمی بات ہے کہ اس کے دل میں ہیبت ہوتی ہے اور جب وہ اللہ تعالیٰ کے گھر میں قدم رکھ رہا ہو جو بادشاہوں کا بادشاہ، ساری کائنات کا مالک، قادر مطلق ہے تو اس کے گھر میں جب بندہ قدم رکھے تو

آرام سے، ادب سے رکھے۔

غیر متبع سنت پیر کا واقعہ:

ایک آدمی نے سنا کہ فلاں جگہ بڑا پیر، بزرگ رہتا ہے تو اس کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں اور بیعت کرلوں اور اللہ اللہ سیکھوں۔ وہاں کچھ دن رہا اور اس سے اجازت لی کہ حضرت! مجھے اجازت ہے؟ جب اس نے اجازت مانگی تو اس نے پوچھا کہ بھئی! تم کیسے آئے تھے؟ یہاں کچھ دن رہے اور جارہے ہو، کیا بات ہے؟ اس نے کہا کہ آیا تو میں آپ کا نام سن کر تھا کہ آپ بڑے پیر اور بزرگ ہیں اور آپ کے بڑے مرید ہیں، تو میرا بھی دل ہوا اور میں بھی آپ کے پاس آگیا کہ مرید ہوتا ہوں۔ لیکن اب میرا دل مرید ہونے کو نہیں چاہتا، اس لیے واپس جارہا ہوں۔ اس نے پوچھا کہ کیا وجہ ہے؟ جواب دیا کہ آج آپ جب عصر کے بعد مسجد میں داخل ہوئے تو آپ نے بایاں پاؤں مسجد میں پہلے رکھا اور دایاں پاؤں بعد میں رکھا، اسی وقت میں نے سمجھ لیا کہ جو اللہ کے گھر میں داخل ہونا نہیں جانتا، وہ اللہ کو کیسے جانتا ہوگا؟ اس لیے ایسے آدمی سے بیعت کرکے اپنے آپ کو گمراہ کرنے والی بات ہے۔

پہلے لوگ جو پیر و مرشد پکڑتے تھے تو اس پر نظر رکھتے تھے کہ کتاب اللہ و سنت رسول اللہ کا کتنا متبع ہے اور اس کا اپنا عمل و کردار اور زندگی سنت کے کتنے مطابق ہے۔ اگر وہ خود ہی (نعوذ باللہ!) قرآن و سنت کا مخالف ہے اور اس نے کبھی خود اللہ کے فرائض: نماز، روزہ وغیرہ ادا نہیں کیے، نہ اللہ تعالیٰ کا ذکر اور نہ قرآن اور تسبیح وغیرہ ہے تو وہ کسی کی کیا اصلاح کرے گا؟ وہ تو اور گمراہی کا ذریعہ بنے گا۔ جو آدمی ان سے تعلق جوڑے گا، وہ لازمی یہ سوچے گا کہ جب میرا مرشد نماز نہیں پڑھتا تو مجھے نماز پڑھنے کی کیا ضرورت ہے؟ جب میرا مرشد روزہ نہیں رکھتا اور گانا سنتا اور غیر عورتوں کے ساتھ بیٹھتا ہے تو مجھے کیا ضرورت ہے اللہ سے ڈرنے کی؟ اگر قیامت کے دن پیر بخشا گیا تو ہم بھی بخشے جائیں گے، جہنم میں اگر یہ سزا بھگت لے گا تو ہم بھی سزا بھگت لیں گے۔

پہلے دور میں یہ بات نہیں ہوتی، لوگ سمجھدار تھے۔ اگر کسی کے پاس حدیث پڑھنے کے لیے جاتے تھے تو پہلے سوچتے تھے کہ یہ کتنا بڑا محدث ہے، کسی سے اگر حدیث سننے کے لیے جاتے تھے تو تحقیق کرتے تھے، ان کو اگر تھوڑا سا بھی شک و شبہ ہو جاتا تو وہ اس سے کبھی روایت نہیں لیتے تھے اور اگر کسی نے اپنی اصلاح کے لیے کسی شیخ کے ساتھ تعلق جوڑا تو دیکھتے کہ خود شیخ بھی اپنی اصلاح کے تابع ہے کہ نہیں؟ وہ خود بھی کتاب اللہ اور سنت رسول ﷺ

کا عامل ہے کہ نہیں۔ بہر حال کہنے کا مقصد یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کے گھر میں داخل ہونے کے آداب ہیں۔

مساجد کے آداب:

اسی طرح مساجد کے آداب میں سے یہ بھی ہے کہ اگر آدمی حالت جنابت میں ہو تو مسجد میں داخل نہ ہو، یا اسے احتلام ہو گیا تو جب تک غسل نہ کرے تو مسجد میں داخل نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح اگر کوئی عورت حیض کی حالت میں ہے یا نفاس کی حالت میں ہے تو اسے بھی مسجد میں داخل ہونے کی اجازت نہیں ہے۔

اور یہ بڑی غلطی ہے کہ اب جو لوگ حج کرنے آئیں گے کہ سب سے پہلے جو عورت حائضہ ہو جاتی ہے وہ وہاں سے احرام ہی نہیں باندھتی کہ میں تو ناپاک ہوں، حالانکہ اس کو پتہ ہونا چاہیے کہ حالت حیض میں احرام باندھنا جائز ہے، صرف یہ ہے کہ نماز نہ پڑھے، غسل کرلے اور لبیک پڑھتی ہوئی آجائے۔ اور دوسری غلطی یہ کرتے ہیں کہ اگر کوئی عورت احرام باندھ کر آگئی اور راستہ میں اس کو حیض آگیا تو پہلے تو وہ عورت شرم سے بتاتی نہیں کہ مجھے حیض آگیا ہے، حالانکہ یہاں شرم کرنے کا مقام نہیں ہے؛ کیونکہ اللہ پاک نے آدم کی بیٹیوں پر ایک چیز لکھی ہے تو پھر اس میں شرم کی کیا ضرورت ہے؟ اگر کسی نے بتا بھی دیا تو اپنے کسی عزیز رشتہ دار محرم کو بتائے گی یا خاوند کو بتائے گی۔ اکثر کو مسائل کا علم نہیں ہوتا تو وہ کہتے ہیں کہ نہیں جی! اب عمرہ کے لیے جائیں، کسی کے لیے عمرہ منع نہیں ہے۔

اکثر کو مسائل کا علم نہیں ہوتا تو وہ اسی حالت میں مسجد حرام میں داخل ہو جاتی ہیں، حالانکہ اس کا مسجد میں داخل ہونا حرام ہے۔ اگر وہ اس ناپاکی میں حج اور عمرہ کا طواف کرے تو تو یہ بھی کرنی پڑے گی اور تین سو (۳۰۰) ریال کی بکری بھی ذبح کرنی پڑے گی۔ لوگوں کو ابھی تک یہ پتہ نہیں کہ مسجد میں کون آسکتا ہے اور کون نہیں آسکتا؟ یعنی ابھی تک لوگ اتنا بھی نہیں سمجھے، اس سے بڑی بدقسمتی ہماری کیا ہو سکتی ہے؟ اس لیے حکم ہے کہ حالت جنابت میں کوئی مسجد میں داخل نہ ہو، حالت حیض ونفاس میں عورت داخل نہ ہو۔

اسی طرح جب مسجد میں داخل ہوں تو سنت یہ ہے کہ پہلے دو رکعت تحیۃ المسجد پڑھیں اور مسجد حرام میں جب آپ داخل ہوں تو پہلے اللہ تعالیٰ کے کعبے کا طواف کریں اور پھر بیٹھیں، لیکن اگر طواف کرنے کی ہمت نہ ہو تو پہلے دو رکعت تحیۃ المسجد پڑھیں اور پھر بیٹھیں۔

اور یہ بھی مسجد کے آداب میں سے ہے کہ مسجد میں جتنی دیر بیٹھیں، قرآن پڑھتے رہیں، اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے

رہیں، یا نوافل پڑھتے رہیں، طواف کرتے رہیں، یا پھر کعبۃ اللہ کو دیکھتے رہیں۔ اگر کچھ بھی نہیں کر سکتے تو خاموشی سے بیٹھے رہیں اور بات نہ کریں۔

اسی طرح میرے سرکار مدینہ ﷺ نے سنا کہ کوئی آدمی اپنا اونٹ ڈھونڈ رہا ہے اور کہہ رہا ہے کہ کسی نے میرا اونٹ دیکھا ہے؟ ایسے لوگ بھی ہیں جو اللہ کے گھروں کو اعلان کی جگہ بنا دیتے ہیں۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ ایسے آدمی کی چیز اللہ واپس ہی نہ کرے۔ اور اسی طرح حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ اگر کوئی مسجدوں میں تجارت کی باتیں کر رہا ہو تو آپ کہیں کہ اللہ تیری تجارت میں کبھی برکت نہ دے۔

یہ مسجدیں کاروبار کے لیے ہیں یا تمہارا سامان ڈھونڈنے کے لیے ہیں؟ آج کل تو خیر ہمارے ہاں رواج ہو گیا ہے کہ کسی کا بچہ گم ہو جائے تو مولوی صاحب سے کہتے ہیں کہ اعلان کرو۔ ہم نے ویسے ہی مسجدوں کو اعلان گاہ بنا دیا ہے۔

دوسری وجہ کیا ہے؟ اللہ رحمت فرمائے کہ ہماری مولوی برادری جتنی ہے، انہوں نے مسجدوں میں جمعہ کے دن دین سکھانے کے لیے تھا کہ اس دن لوگوں کو دین سکھایا جاتا، طہارت کے، صلوٰۃ کے، زکوٰۃ کے، نکاح وطلاق کے، رضاعت، عورتوں کی عدت کے مسائل سمجھائے جاتے، اللہ کی توحید کا بیان ہوتا، حضور پاک ﷺ کی سیرت کا بیان ہوتا، یوں کہا اور فلاں کی ہم گردن توڑ دیں گے، یہ قصے کہانیاں ہوتی رہتی ہیں، اور اسی پر دین کہاں سے سیکھیں؟ جو دین سیکھنے کا مرکز تھا وہاں تو دین سکھایا نہیں جاتا، جو مقام دین سمجھانے کا تھا وہاں دین سمجھایا ہی نہیں جاتا تو لوگ کہاں سے سیکھ کر آئیں۔

اور دوسری وجوہات کچھ یہ بھی ہیں کہ ہمارے ہاں رواج بن گیا ہے کہ اگر آواز خوبصورت ہے اور بال بھی ہیں، داڑھی پگڑی بھی ہے تو بس امام بنالو۔ اس بے چارے کو خود طہارت کے مسئلے نہ آتے ہوں، چاہے اس کو سجدہ سہو کا بھی پتہ نہ ہو۔ جب اس کو خود مسائل نہیں آئیں گے تو وہ لوگوں کو کیا مسائل بیان کرے گا؟ اس لیے وہ لوگوں کو دور دور کی باتوں میں اُلجھائے رکھے گا کہ کوئی آدمی غلطی سے اُٹھ کر مجھ سے مسئلہ ہی نہ پوچھ لے، اگر مسئلہ پوچھ لیا تو میرا علم کھل جائے گا اور میں کیا کروں گا؟

کافر اور مشرک کو مسجد میں نہ آنے دیں:

اب یہ ہے کہ کافر اور مشرک، ان کے لیے حکم یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے گھروں میں داخل نہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ کی

مساجد میں ان کو داخل نہ ہونے دیں۔ ہاں اگر بالفرض محال ایسے حالات ہیں کہ جگہ ہی نہیں، جیسے نصرانیوں کا وفد آیا اور حضور اکرم ﷺ نے مسجد میں ٹھہرا دیا۔ مقصد یہ تھا کہ ایک تو ان کے ٹھہرانے کے لیے جگہ نہیں تھی، دوسری بات یہ تھی کہ مسجد میں رہ کر ہمارے دین، عبادت اور نماز کو دیکھیں، تاکہ ان کے دلوں میں ہمارا دین اثر کرے، اس وجہ سے حضور اکرم ﷺ نے ان کو مسجد میں ٹھہرا دیا۔

مفسرین کرام فرماتے ہیں: اللہ پاک نے فرمایا کہ تمہیں عزت اور غلبہ دے دیں تو ان کو اللہ کی مساجد میں داخل نہ ہونے دیں، اگر آئیں بھی تو پھر ڈرتے ہوئے ذلت اور خوف کے ساتھ آئیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے جب مکہ فتح کرادیا اور حضور اکرم ﷺ کو غلبۂ کامل حاصل ہو گیا۔

حجۃ الوداع سے پہلے والے حج کے امیر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ تھے:

حضور اکرم ﷺ نے حجۃ الوداع سے ایک سال قبل یعنی جس سال حج فرض ہوا، آپ ﷺ نے اس سال حج نہیں کیا اور پہلے سال حج کا امیر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو بنایا اور فرمایا کہ تم امیر بن کر جاؤ اور تمام مسلمانوں کو حج کے ارکان ادا کراؤ، ان کو حج کے ارکان سکھاؤ۔ میں اگلے سال حج کروں گا۔ اور اس کے ساتھ حضور اکرم ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو جو حکم دے کر بھیجا۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اے علی! امیر تو ابوبکر ہوں گے، لیکن تمہارے ذمہ یہ کام ہے کہ اس زمانے میں یہ رواج ہوتا تھا کہ اگر کوئی بادشاہ بڑا اہم حکم جاری کرے تو جب تک بادشاہ کا کوئی قریبی رشتہ دار وہ حکم لے کر نہ آئے، وہ مانتے نہیں تھے۔ اس لیے حضور پاک ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ذمہ یہ ڈیوٹی لگائی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: جاؤ اور مکہ میں جا کر یہ کام کرو کہ جتنی اونچی اونچی قبریں بنی ہوئی ہیں اور بڑے بڑے نشانات ہیں، سب کو توڑ کر برابر کر دو اور کوئی قبر اونچی نہ چھوڑو، ان کو بالکل برابر کر دو۔ صرف ایک علامت باقی رہے گی کہ یہ قبر ہے۔ اسی طرح جہاں جہاں کوئی بت ہے، سب کو توڑ ڈالو، جہاں کوئی تصویریں لگی ہوئی ہوں، ان سب کو مٹا ڈالو۔

ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ نے مشرکوں، کافروں اور یہودیوں کو دنیا میں بھی رُسوا کیا اور آخرت میں بھی ان کے لیے بڑا دردناک عذاب تیار کیا ہوا ہے۔ دنیا میں اس طرح رُسوا کیا کہ انہوں نے مکہ سے مسلمانوں کو روکا تھا، اللہ تعالیٰ نے قیامت تک مشرکوں کو روک دیا۔ تو اسی طرح ان کو سزا ملی جس طرح انہوں نے عمل کیا تھا۔ اور آخرت

میں اللہ ان کو دردناک عذاب دیں گے؛ کیونکہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے گھر کی حرمت کو توڑا، اس کے گھر کی عزت و عظمت کو توڑا، اللہ تعالیٰ کے گھر میں بتوں کو رکھا اور اللہ کے گھر میں کھڑے ہو کر غیر اللہ کو پکارا اور اللہ کے کعبے کا طواف عریانی کی حالت میں کیا تو اللہ پاک نے دنیا اور آخرت میں ایسی سزا دی۔ اسی طرح اگر کوئی شخص اللہ کی مسجد میں آ کر غیر اللہ کو پکارے یا غیر اللہ سے مدد مانگے تو اس کے لیے بھی یہی وعید ہوگی۔ اسی لیے حضور اکرم ﷺ دعا مانگتے تھے: یا الٰہ العالمین! ہمیں دنیا کی رُسوائی سے بھی بچانا اور ہمیں آخرت کی ذلت و رُسوائی سے بھی بچانا۔

﴿وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ۚ اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۱۵﴾﴾ [البقرۃ:۱۱۵]

''اور مشرق و مغرب اللہ ہی کا ہے، پس جس طرف (نماز میں) رُخ کرو ادھر اللہ متوجہ ہے، بلاشبہ اللہ وسیع فضل والا ہے، جاننے والا ہے۔''

ماقبل آیات سے ربط:

گزشتہ آیات میں یہود کا ردّ تھا، ان آیات میں بھی ان کا ردّ ہے کہ وہ ناسخ و منسوخ کے منکر تھے کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی حکم منسوخ نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ نے جب حضور پاک ﷺ کو حکم دیا کہ اب آپ کا قبلہ کعبہ ابراہیمی ہے؛ کیونکہ اصل حقیقت میں قبلہ اوّل کعبہ ہی تھا۔

تحویل قبلہ پر یہود و مشرکین کے اعتراضات:

جب تحویل قبلہ کا حکم ہوا تو اس سے پہلے یہود، مشرکین کو یوں بتایا کرتے تھے کہ تمہارے قبلہ کو محمد قبلہ ہی نہیں مانتے اور بیت المقدس کی طرف نماز پڑھ رہے ہیں، گویا ہمارا دین سچا ہے۔ اور جب اللہ تعالیٰ نے کعبہ کو بدلنے کا حکم دیا تو یوں کہا کہ دیکھا مکہ والوں کو راضی کرنے کے لیے کعبہ کو بدل دیا اور ہمارا قبلہ چھوڑ دیا۔

دوسرا پروپیگنڈہ یہ کیا کہ جن لوگوں نے نمازیں بیت المقدس کی طرف پڑھی تھیں اور اس دوران وہ فوت ہو گئے، اگر پہلا قبلہ غلط تھا تو ان کی نمازوں کے بارے میں کیا کہو گے؟ اور اگر یہ قبلہ بہتر ہے تو اس کی طرف انبیاء کو نماز کیوں پڑھوائی گئی؟ اور اگر وہ کعبہ بہتر تھا تو بدلنے کی کیا ضرورت تھی؟ لہٰذا ناسخ و منسوخ کا یہ مسئلہ ہمیں سمجھ نہیں آتا۔

بس یہ تو (نعوذ باللہ!) نبی پاک ﷺ کی اپنی مرضی ہے کہ کبھی قبلہ اِدھر بنا لیتے ہیں اور کبھی اُدھر بنا لیتے ہیں، لہٰذا ہم حضور اکرم ﷺ کی بات کو نہیں مانتے اور نہ ہی ناسخ و منسوخ کو مانتے ہیں۔

اس کے جواب میں یہ مختصر، جامع اور کامل آیت نازل کی گئی، جس میں اتنے بڑے مسائل، شبہات اور اعتراضات کا جواب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ایک بنیادی بات کہہ دی کہ آپ ان کو کہہ دیں کہ مشرق اور مغرب کا مالک اللہ ہے۔ کیا مشرق اور مغرب یہودیوں اور نصرانیوں نے بنائے ہیں؟ جب ساری جہتیں اللہ کی ہیں تو اللہ تعالیٰ کی مرضی ہے کہ اپنے بندوں کو جس طرف حکم دیں تو اس طرف اپنا رخ کر لیں۔ تم کون ہو اعتراض کرنے والے؟ نہ تمہارا زمینوں میں کوئی حصہ اور نہ آسمانوں میں۔ اس طرف اپنا رخ کریں نہ زمین و آسمان کی پیدائش، نہ مغرب و مشرق میں کوئی حصہ۔ تو جب سب کچھ اللہ تعالیٰ کا ہے تو اللہ تعالیٰ کا حکم ہے جب چاہیں، جس طرف چاہیں، جب تک چاہیں اور جتنا عرصہ چاہیں اس کی مرضی ہے بدل دیں۔ تو بنیادی طور پر اُن کا رَدّ ہو گیا۔

قبلہ کی جہت متعین کرنے کی حکمت:

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ اس آیت کے تحت ارشاد فرماتے ہیں کہ مشرق ہے یا مغرب یہ تو اللہ کے لیے ہے۔ اللہ تعالیٰ جب چاہیں، جدھر چاہیں اپنے بندوں کو متوجہ ہونے کا حکم دے دیں۔ تعیین جہت قبلہ میں سب سے بڑی حکمت یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو اجتماعیت، اتحاد و اتفاق اور ایک مرکز پر نظر جمانے کی تربیت دے رہے ہیں، ورنہ اللہ تعالیٰ جدھر چاہیں حکم دے دیں۔ اور اگر ہر آدمی کو اللہ تعالیٰ حکم دیتے کہ جہاں مرضی آئے، جس طرف دل کرے رخ کر کے نماز پڑھتے رہو تو اس میں ایک انتشار اور افتراق کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ کچھ لوگ اِدھر منہ کیے ہوئے ہیں، کچھ اُدھر کیے ہوئے ہیں، لیکن جب مرکز ایک ہو تو اس میں اجتماعیت، اتحاد اور وحدت کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو اس کا حکم دیا۔

آیات کا شانِ نزول:

ابو عبید القاسم بن سلام نے کتاب ''ناسخ و منسوخ'' میں یہ ذکر کیا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ سب سے پہلے جو نسخ کا حکم آیا، وہ یہی قبلہ کا تھا۔ اور بعض علماء فرماتے ہیں: یہ آیت پہلے نازل ہوئی تو ابھی کعبۃ اللہ کی طرف رُخ پھیرنے کا حکم نہیں ہوا تھا تو اللہ پاک نے یہ آیت نازل فرمائی، تاکہ اپنے پیغمبر کو بتائیں اور

صحابہ رضی اللہ عنہم کو بھی تعلیم دی کہ جدھر بھی تم رخ پھیرو گے، اسی طرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔

ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ کہا کہ کوئی جگہ ایسی نہیں ہے جہاں اللہ تعالیٰ کی ذات نہیں ہے۔ اگر اس سے مراد معیت علم ہے تو یہ بات صحیح ہے۔

جنگ اور سواری اور مجبوری میں نماز کا قبلہ:

بعض مفسرین نے فرمایا کہ یہ آیت اللہ تعالیٰ نے اس لیے نازل فرمائی کہ آپ نے اپنی سواری پر نفل نماز پڑھنی ہو تو جس طرف سواری کا رُخ ہو، آپ نماز پڑھ سکتے ہیں یا اسی طرح کسی کا خوف ہو یا دشمن سے جنگ ہو تو اس حالت میں ایک جہت متعین کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ بعض نے فرمایا کہ یہ آیت حالت جنگ کے لیے نازل ہوئی ہے کہ جنگ میں جدھر بھی رخ ہے، نماز نہ چھوڑو۔ نماز پڑھو، ادھر بھی اللہ کی ذات ہے، ہر جہت اللہ کے لیے ہے۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ جب سفر میں ہوتے، جب سواری پر ہوتے تو سواری پر بیٹھے بیٹھے نفل پڑھتے، چاہے سواری کا رخ جدھر ہو جائے۔ جب ان سے پوچھا گیا تو انہوں نے کہا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی نفل نماز سواری پر پڑھتے تھے، جبکہ سواری کا رخ بھی بدلتا رہتا تھا۔

صحیح بخاری میں بھی یہ روایت آتی ہے کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے جب پوچھا جاتا کہ حضرت! جب جنگ میں خوف کا عالم ہو تو نماز کس رخ پر پڑھیں؟ آپ رضی اللہ عنہ فرماتے کہ کھڑے ہو کر یا بیٹھ کر جیسے موقع ملے اور قبلہ کی طرف رخ ہو سکے یا نہ ہو سکے، ہر حال میں نماز ادا کرو۔

حضرت نافع رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے: یہ نہیں ہو سکتا کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ ایسی بات اپنی طرف سے کریں۔ لازمی بات ہے کہ یہ بات انہوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہوگی۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: بڑا لمبا سفر ہو یا ویسے آدمی سفر پر ہے تو نفل نماز آدمی اسی حالت سفر میں سواری پر بیٹھ کر پڑھتا رہے، سواری کا رخ اگر قبلہ سے بھی بدل جائے تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اور یہی امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے، لیکن امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اس کے خلاف ہیں۔ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ و ابو سعید رحمۃ اللہ علیہ نے بھی فرمایا کہ اگر کوئی شہر کے اندر پھر رہا ہے اور نفل نماز سواری پر پڑھنا چاہتا ہے تو پڑھ سکتا ہے۔

ناواقف نمازی پہلے جہت قبلہ کی تعیین کرے:

مفسرین فرماتے ہیں کہ یہ آیت ایسے نازل ہوئی کہ کچھ صحابہ سفر میں تھے، قبلہ معلوم نہیں ہو سکتا تھا کہ قبلہ کدھر

ہے، کوئی اِدھر کا اور کوئی اُدھر کا کہے تو سب نے جس کا خیال جدھر جدھر آیا، پڑھ لی۔ جب حضور اکرم ﷺ کو عرض کیا گیا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ سب کی نمازیں ٹھیک ہیں، سب جہتیں میری ہیں، ان سب کی نمازیں ادا ہو گئی ہیں۔ اس لیے یہ مسئلہ ہے کہ آدمی سفر میں یا صحرا میں ہے اور قبلہ کی تعیین نہیں ہو سکتی تو وہ اپنی طرف سے جہت معلوم کرنے کی کوشش کرے اور اس کے بعد جس طرف اس کا غالب گمان ہو کہ قبلہ اس طرف ہے تو نماز پڑھ لے۔ نماز پڑھنے کے بعد روشنی ہو جائے اور پتہ چلے کہ جس طرف میں نے نماز پڑھی، وہ غلط سمت ہے تو پھر بھی اس کی نماز ادا ہو جائے گی، دوبارہ پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے۔

حضرت عامر بن ربیعہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ ہم ایک اندھیری رات میں حضور اکرم ﷺ کے ساتھ سفر میں تھے۔ جب آپ ﷺ نے پڑاؤ فرمایا تو ہر آدمی نے یہ کیا کہ میں عارضی طور پر اینٹیں رکھ کر اپنی مسجد بنالوں...... کیونکہ صحابہ رضی اللہ عنہم کو اس بات کا حرص تھا کہ مسجد میں نماز پڑھنے کا درجہ بڑھ جاتا ہے، لہٰذا وہ جب سفر میں بھی ہوتے تو اس طرح مسجد بناتے اور اس میں نماز پڑھتے، اور بعض صحابہ کے پاس اگر اینٹیں نہ بھی ہوتیں تو صحرا کی ریت سے دیوار بنالیتے، اور بعض کچھ بھی نہ کرتے، صرف ایک لکیر کھینچ لیتے، تاکہ ہمیں مسجد کا ثواب مل جائے...... وہ کہتے ہیں کہ ہم رات کو پتھر رکھ کر نمازیں پڑھتے رہے۔ اب صبح جب اُٹھے تو ہم سب کی نمازیں قبلہ کی سمت کے مخالف تھیں تو حضور پاک ﷺ کی خدمت میں ہم نے عرض کیا: یارسول اللہ! رات ہماری نمازیں تو سب غلط ہو گئیں۔ آپ ﷺ نے جواب ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم نے جدھر نماز پڑھی ہے، ہم نے قبول کر لی۔

ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ترمذی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ یہ حدیث حسن ہے، حالانکہ اس میں اشعث السمان ضعیف ہے اور اس کا استاد عاصم بھی ضعیف درجہ کا ہے۔ اصل میں امام ترمذی رحمہ اللہ جب کسی حدیث کو حسن کہہ دیں تو ان کے پاس دوسری سندیں بھی ہوتی ہیں جو اس حدیث کو قوی کر رہی ہوتی ہیں۔ مختلف سندیں ایک دوسری کو طاقت پہنچائیں تو حدیث حسن لغیرہ کے درجے تک پہنچ جاتی ہے۔

حضرت عطاء رحمہ اللہ، حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ حضور پاک ﷺ نے ایک سَرِیہ بھیجا...... سَرِیہ کا معنی یہ ہوتا ہے کہ حضور پاک ﷺ کسی جانب فوج بھیجیں، لیکن خود اس میں شرکت نہ فرمائیں...... راستے میں ایک جگہ ایسی آئی کہ ہمیں ایک سخت اندھیری رات سے واسطہ پڑ گیا۔ رات اتنی اندھیری تھی کہ کوئی چیز سمجھ نہیں آتی تھی۔ جب ہم وہاں پہنچے تو ہمیں یہ پتہ نہ چلے کہ کعبہ شریف کس طرف ہے۔ ہم میں سے ایک جماعت نے کہا: ہم

نے پہچان لیا کہ قبلہ ادھر ہے، حالانکہ وہ شمال کی طرف نماز پڑھ رہے تھے۔ ہم نے کہا: اچھا ایسے کرو کہ نمازیں پڑھ لو، لیکن نشان لگالو کہ ہم نے کس طرف نماز پڑھی۔ جب روشنی ہوگی تو پھر اندازہ ہو جائے گا۔ کہتے ہیں کہ جب روشنی ہوئی تو ہم نے دیکھا کہ ہم سب نے غلط جانب نماز پڑھی تھی۔ ہم نے حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں عرض کیا کہ یارسول اللہ! ہم نے بہت تلاش کیا، لیکن قبلہ نہیں ملا، ہم نے نمازیں پڑھ لیں اور صبح دیکھا تو قبلہ کی طرف رخ نہیں کیا تھا۔ یہ سن کر حضور اکرم ﷺ چپ ہو گئے، آپ ﷺ نے کوئی حکم جاری نہیں کیا تو اللہ تعالیٰ نے قرآن کی یہ آیت نازل کی۔

ایک روایت میں یہ بھی آتا ہے کہ بادل چھا گئے اور بادلوں کی وجہ سے اندھیرا ہو گیا کہ ہم حیران ہو گئے کہ کعبہ شریف کدھر ہے؟ سب نے کعبہ کی سمت تلاش کی اور ہم سب نے جیسے جیسے اندازہ لگایا وہاں نشان لگا دیا، نمازیں پڑھ لیں، لیکن جب اندھیرا ختم ہو گیا تو ہم سب نے غلط سمت نماز پڑھ لی تھی۔ حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں ہم نے عرض کیا تو آپ ﷺ نے اس پر خاموشی اختیار کی تو اللہ پاک نے یہ آیات نازل فرمائیں۔ ایک روایت میں آتا ہے کہ آپ ﷺ نے ہمیں نماز کا اعادہ کرنے کا حکم نہیں دیا، بلکہ فرمایا کہ اللہ تمہاری اس نماز کو قبول فرمائے۔

ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جتنی روایات میں نے نقل کی ہیں، ان میں سے بعض روایات میں ضعف ہے، لیکن شاید ایک دوسری کو طاقت پہنچا رہی ہیں، اس لیے نقل کر دی گئی ہیں۔

ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر ایک آدمی نے نماز پڑھی، بعد میں اس کو پتہ چل گیا کہ میں نے غلطی کی اور قبلہ کی طرف نماز نہیں پڑھی تو اب وہ نماز لوٹائے یا نہ لوٹائے؟ اس بارے میں علماء کے دو قول ہیں: جو دلائل ابھی آپ نے پڑھے ہیں، ان کی رُو سے نماز کو دوبارہ لوٹانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اور بعض علماء فرماتے ہیں کہ وہ نماز لوٹائے۔

علماء احناف نے ایک اور بھی وضاحت کی کہ نمازی نے غلط سمت نماز پڑھ لی، اگر نماز کے دوران پتہ لگ جائے کہ قبلہ اس طرف ہے تو اسے لازم ہے کہ نماز میں اسی طرف رخ موڑ لے اور اگر نماز پڑھ لی، نماز کا وقت باقی ہے تو کسی نے بتلا دیا کہ کعبہ اس طرف ہے تو اسے چاہیے کہ وہ دوبارہ نہ پڑھے۔

آیت کا نزول نجاشی کے بارے میں:

بعض علماء نے لکھا ہے کہ یہ آیت نجاشی کے متعلق نازل ہوئی تھی۔ نجاشی حبشہ کا بادشاہ تھا...... یہ نجاشی کا لقب

ہے؛ کیونکہ اس زمانے میں یہ رواج تھا کہ مختلف علاقوں کے بادشاہوں کے القاب مختلف ہوا کرتے تھے، جیسے مصر کا فرعون، فارس کا کسریٰ، روم کا قیصر اور حبشہ کے بادشاہ کا لقب نجاشی تھا...... یہ نجاشی بادشاہ بڑا ہی خداترس انسان تھا، جب صحابہ رضی اللہ عنہم نے مکہ مکرمہ سے حبشہ کی طرف ہجرت کی تو اس نے مسلمانوں کا ساتھ دیا اور ان کو پناہ دی اور امن وامان میں رکھا۔ اور جب اس نے اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں سنیں اور قرآن سنا تو اس نے اسی وقت اپنے اسلام کا اظہار کیا۔ اور یہ بادشاہوں میں وہی شخص ہے جس نے اُمّ حبیبہ رضی اللہ عنہا جو حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ کی بیٹی ہیں، ان کا نکاح حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کروایا اور حق مہر بھی اپنی طرف سے ادا کیا اور ان کو بڑے اعزاز واکرام کے ساتھ مدینہ منورہ بھجوایا۔ بہر حال یہ بڑے عظیم انسان گزرے ہیں۔ جب ان کی وفات ہوگئی تو اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اپنے بھائی کا جنازہ پڑھو تو بعض نے پوچھا کہ یارسول اللہ! وہ تو مسلمان نہیں تھا۔ اس پر یہ آیت بھی نازل ہوئی کہ بعض اہل کتاب میں سے بھی ایسے لوگ ہیں جو اپنے صحیح دین اور جو اللہ نے تمہاری طرف اُتارا ہے، اس پر بھی ایمان رکھتے ہیں، ﴿وَمَآ اُنۡزِلَ اِلَیۡکُمۡ﴾ تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بہر حال اس کا جنازہ مدینہ منورہ میں پڑھا۔

اسی سے یہ مسئلہ ائمہ کے درمیان باعث اختلاف بن گیا کہ بعض علماء اور ائمہ کرام جیسا کہ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کی ایک روایت میں ہے اور امام شافعی اور اہل حدیث علماء غائبانہ جنازہ کو جائز سمجھتے ہیں، یعنی اگر کوئی ہمارا مسلمان کسی دوسرے ملک میں فوت ہوگیا تو اگر کسی اور جگہ اس کا جنازہ غائبانہ طور پر ادا کر دیا جائے تو جائز ہے، امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور امام مالک رحمہ اللہ کی الشرح الکبیر علی متن المقنع (۲/۳۵۵) اور امام احمد کی ایک روایت کے نزدیک غائبانہ جنازہ جائز نہیں ہے، اور جو جائز سمجھتے ہیں ان کی دلیل مدینہ منورہ میں نجاشی کے جنازہ والی روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھا۔

اور امام صاحب فرماتے ہیں کہ یہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت تھی؛ کیونکہ اس کے بعد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی کا بھی غائبانہ جنازہ پڑھنا ثابت نہیں ہوتا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بڑے بڑے جلیل القدر صحابہ رضی اللہ عنہم جنگ کے میدانوں میں شہید ہوتے رہے، حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی شہادت کی خبریں بھی خود عطا فرمائیں، لیکن اس کے باوجود بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا غائبانہ جنازہ نہیں پڑھا۔

نجاشی کس طرف نماز پڑھتا تھا؟

نجاشی قبلہ طرف نماز پڑھنے والا نہیں تھا تو یہ اعتراض بھی ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ مشرق ومغرب اللہ کا ہے،

جس طرف بھی نماز پڑھی تو نماز ہو جاتی ہے۔ لیکن ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس آیت کے ساتھ اس واقعہ کو جوڑنا کوئی مضبوط بات نہیں ہے، بلکہ اس کے اندر غرابت ہے۔ اور بعض مفسرین نے فرمایا کہ نجاشی بیت المقدس کی طرف نماز پڑھتا تھا، اس کو پتا نہیں تھا کہ اللہ نے تحویل قبلہ کا حکم فرمایا ہے کہ نہیں۔

نجاشی کی غائبانہ نمازِ جنازہ پڑھنے کی خصوصیات

قرطبی نے نقل کیا ہے کہ جب نجاشی فوت ہو گیا تو حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر غائبانہ جنازہ پڑھا۔ اس لیے بعض ائمہ صلوٰۃ علی الغائب کی طرف چلے گئے کہ نماز جنازہ غائبانہ پڑھنا جائز ہے۔ لیکن مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ خصوصیت تین وجہ سے ہے۔

پہلی خصوصیت:

یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نجاشی کی میت کو اور لحد کو سامنے دکھا دیا اور درمیان میں تمام زمین کو لپیٹ دیا گیا۔ یہ خصوصیت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تھی۔

دوسری خصوصیت:

بعض علماء نے فرمایا کہ دوسری خصوصیت یہ تھی کہ وہ تو مسلمان تھا اور جس ملک میں فوت ہوا، وہاں کوئی مسلمان ایسا نہیں تھا جو اس کا جنازہ پڑھ سکے، لہٰذا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وجہ سے اس کا جنازہ پڑھا۔

امام قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی مسلمان دوسرے ملک میں ہو اور وہ مر گیا، اس کا نماز جنازہ کسی نے نہیں پڑھا تو دوسرے ملک کے مسلمان اس کے لیے ایسے نمازِ جنازہ پڑھ سکتے ہیں، اور اگر وہاں کوئی مسلمان موجود ہو اور اس نے اس کی نمازِ جنازہ پڑھ لی تو پھر دوبارہ غائبانہ جنازہ پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے۔

اب مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس دوسری توجیہ پر قرطبی رحمہ اللہ نے اعتراض کیا۔ اس نے کہا کہ بادشاہ تھا اور مسلمان تھا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اس کے پاس کوئی بھی جنازہ پڑھنے والا مسلمان موجود نہ ہو۔ لیکن ابن عربی رحمہ اللہ نے اس کا یہ جواب دیا کہ یہ تو ٹھیک ہے کہ وہاں مسلمان تھے، لیکن ان کو جنازہ کا طریقہ ہی نہیں آتا تھا کہ جنازہ کیا

چیز ہے۔ چونکہ ان کو یہ مسائل معلوم ہی نہ تھے، اس لیے مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ جواب بڑا معقول اور عمدہ ہے۔

تیسری خصوصیت:

تیسری وجہ مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ چونکہ وہ بادشاہ تھا، اس لیے حضور اکرم ﷺ نے اس کا جنازہ پڑھایا، تاکہ دوسرے بادشاہوں کے دل بھی اسلام کی طرف مائل ہوں، تاکہ لوگوں کو چلے کہ حضور پاک ﷺ اپنے ماننے والوں سے کتنی محبت کرتے ہیں کہ ان غائبانہ جنازہ پڑھتے ہیں اور ان کے لیے دعائیں کرتے ہیں، تاکہ دوسرے لوگوں کے لیے اسلام میں داخل ہونے کا یہ سبب بنے۔ بعض ائمہ کے نزدیک یہ صرف خصوصیت تھی، لہٰذا غائبانہ جنازہ دوسرے کسی واقعہ میں ثابت بھی نہیں ہوتا۔

''عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: مَا بَيْنَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ قِبْلَةٌ لِأَهْلِ الْمَدِيْنَةِ وَ أَهْلِ الشَّامِ وَ أَهْلِ الْعِرَاقِ.'' [تفسیر ابن کثیر: ۱/۲۲۹ (جامع ترمذی، رقم: ۳۴۴)]

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مشرق اور مغرب کے درمیان مدینہ، شام اور عراق والوں کا قبلہ ہے۔

مسجد حرام کا اِطلاق:

﴿فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا﴾ کے کیا معنیٰ؟ کہ جب ہم نماز پڑھتے ہیں تو مغرب کی جانب رخ کر کے پڑھتے ہیں؛ کیونکہ ہماری جہتِ قبلہ مغرب ہے اور بعض ملکوں کی جانب قبلہ بالکل مشرق ہے اور اسی طرح بعض کو شمال اور بعض کو جنوب لگے گا۔ چونکہ پوری دنیا کے اندر جہات بدلیں گی۔ جہت کے لیے ضروری ہے کہ ہم جہاں بھی نماز پڑھیں، ہماری مسجدوں کے رخ اللہ تعالیٰ کے گھر کی طرف ہوں، اگر مسجد الحرام کے اندر ہم موجود ہیں اور کعبہ ہمیں نظر آ رہا ہے تو پھر ہر بندے کا اس طرف رخ ہونا ضروری ہے، اگر ہم مسجد الحرام سے باہر ہیں تو پھر یہ ساری مسجد الحرام ہمارے لیے قبلہ ہے اور اگر پھر ہم مسجد الحرام سے باہر چلے جائیں تو پھر پورا حرم ہمارے لیے قبلہ بن جاتا ہے۔ چونکہ پورے حرم پر بھی مسجد الحرام کا اطلاق ہوا ہے اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ﴾ کہ اپنا رخ مسجد الحرام کی طرف کرو اور مسجد الحرام کا اطلاق موجودہ مسجد پر ہوتا ہے، ورنہ حضور اکرم ﷺ کے زمانے میں تو مسجد مطاف جتنی تھی، اس کا چوتھا حصہ بھی نہیں تھا، پھر مسجد بڑھتی گئی۔

ایک تو مسجد الحرام کا اس پر اطلاق ہو گیا، ایک اطلاق پورے حد حرم پر ہے، جہاں تک حرم ہے وہاں مسجد الحرام ہے، جیسا کہ عرفات تک حدِ حرم ہے، اسی طرح جعرانہ تک حدِ حرم ہے، تنعیم تک حدِ حرم ہے، یعنی کسی جانب تین میل، سات میل اور کسی جانب اس سے بھی زیادہ ہے تو یہ پورا حرم کا علاقہ ہے، اس کو بھی اللہ تعالیٰ نے قرآن میں مسجد الحرام فرمایا، جیسا کہ فرمایا: ﴿ذٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهٗ حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ﴾ [البقرۃ:١٩٦] کہ تمتع وہی لوگ کر سکتے ہیں کہ جن کے اہل وعیال مسجد الحرام میں رہنے والے نہ ہوں۔ باہر سے آنے والے آفاقی ہیں اور عشرہ حج کے اندر جنہوں نے عمرہ کیا ہے تو اب لوگوں کے بال بچے تو اس مسجد میں نہیں رہتے، لوگوں کے بال بچے تو پورے حرم میں رہتے ہیں، اس لیے اطلاق مسجد الحرام کا پورے حرم پر بھی ہو گیا۔

اس لیے فرمایا کہ مشرکین پلید ہیں، آج کے بعد ان کا مسجد الحرام میں داخلہ منع ہے۔ لہٰذا ان کو بھی ہم حد حرم پر روک دیتے ہیں۔ اور اسی طرح جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ﴾ [البقرۃ:١٩٦] قربانی کے جانور کو اپنی جگہ پر پہنچاؤ کہ قربانی کا جانور کعبہ میں پہنچا کر ذبح کرو۔ کعبہ میں کوئی ذبح نہیں کرتا۔ کعبہ میں کون جانور ذبح کرے؟ منیٰ میں کسی مذبح خانے میں جانور کو ذبح کرے گا۔ چونکہ منیٰ بھی حرم کے اندر ہے، لہٰذا یہ بھی مسجد الحرام اور کعبہ کے حکم میں آ گیا۔ اس لیے علماء نے فرمایا کہ اگر کعبہ کے سامنے ہے تو عین کعبہ ضروری ہے، اگر باہر ہے تو پوری مسجد ہمارے لیے کعبہ کے حکم میں ہے، یعنی اس میں ہمارے لیے اتنی رعایت ہے کہ اب ہم اپنے ملک میں مسجد بناتے ہیں تو عین جہت کعبہ نہ بھی ہو تو پھر بھی ٹھیک ہے، مکہ کی طرف اس کا رخ ہو، اتنی جہت کافی ہے۔

یہ علیحدہ بات ہے کہ اب کچھ جدید آلات ایسے بھی آ گئے ہیں کہ جہاں بھی آدمی ہو، صحیح جہت قبلہ کی تعیین کی جا سکتی ہے۔ بعض لوگ سورج کے ساتھ سایہ کا نشانہ لگا کر مغرب اور مشرق کی جہت صحیح کر لیتے ہیں، ورنہ اس طرف رخ ہو جائے تو الحمد للہ! نماز ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ صرف جہت کی طرف پڑھی جانے والی نماز قبول فرماتے ہیں۔

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس سند میں ایک راوی ابی معشر ہے، ان کے بارے میں محدثین نے کلام کیا ہے کہ آخری عمر میں ان کا حافظہ کمزور ہو گیا تھا۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس سند کے ساتھ بھی روایت کی ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مَا بَيْنَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ قِبْلَةٌ'' (مشرق اور مغرب کے درمیان میں قبلہ ہے)۔ اس کے بعد امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے فرمایا

کہ پہلی سند جس میں ابی معشر راوی ہے، یہ سند صحیح ہے اور زیادہ اصح ہے۔ حضرت امام ترمذی رحمہ اللہ کی اس روایت کو صحابہ میں سے بھی کئی صحابہ نے روایت کیا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے بھی اس روایت کو نقل فرمایا ہے۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ مشرق تمہارے بائیں طرف اور مغرب تمہارے دائیں طرف ہو تو تمہارا رخ قبلہ کی طرف ہو جائے گا۔ یہ مدینہ والوں کو سمجھا رہے ہیں۔

قبلہ دو ہونے کی وجہ:

ایک اور قول مفسر رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے۔ انہوں نے فرمایا: اگر کوئی آدمی یہ اعتراض کرے (نعوذ باللہ!) پہلے کعبہ بیت المقدس تھا، اب یہ کعبہ کیوں ہو گیا؟ اس کا ایک جواب یہ ہے کہ مشرق بھی اللہ کا ہے اور مغرب بھی اللہ کا ہے۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حکمتیں تھیں، اگر اوّل سے (حضرت آدم علیہ السلام سے) لے کر میرے آقا صلی اللہ علیہ وسلم تک تمام انبیاء کا ایک ہی قبلہ رہتا، مثلاً بیت المقدس یا کعبۂ ابراہیمی رہتا تو نتیجہ یہ نکلتا کہ مخالفین اعتراض کرتے کہ دیکھو! مسلمان بھی تو کسی نہ کسی جہت کی پوجا کرتے ہیں، اگر ہم لوگ سورج، آگ، دیوی، دیوتا کی پوجا کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی حکمت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قبلے ہی دو کر دیئے۔ کبھی تو رخ بیت المقدس کو ہو رہا ہے اور پھر حکم ہو جاتا ہے کہ بیت اللہ کی طرف۔ اور بعض روایات کے مطابق پہلے قبلہ بیت اللہ تھا، پھر اللہ نے بیت المقدس کو قبلہ بنایا، پھر دوبارہ اسی کعبہ کی طرف لوٹنے کا حکم دیا، تاکہ کسی دشمن اسلام کو یہ موقع ہی نہ ملے کہ مسلمان ایک طرف کعبہ یا کسی ایک جہت کا پجاری ہے، بلکہ واضح ہو گیا کہ مسلمان اپنے اللہ کے حکم کا پابند ہے۔ مشرق بھی اللہ تعالیٰ کا ہے اور مغرب بھی اللہ تعالیٰ کا ہے، اللہ تعالیٰ نے جس طرف حکم دیا، جھک گیا اور جس طرف حکم نہیں دیا، نہیں جھکا۔

کیا مسلمان پتھر اور عمارت کی پوجا کرتے ہیں؟

ایک اعتراض ہندو بھی کرتے ہیں کہ تم لوگ جو ہم پر اعتراض کرتے ہو کہ ہم بتوں کے پجاری ہیں، تم بھی تو پتھر اور (مقام ابراہیم ایک پتھر ہے) اس کو پوجتے ہو اور اسی طرح تمہارے سامنے بھی تو ایک پتھر کی عمارت ہے۔ یہ بات غلط ہے؛ کیونکہ آج اس خانہ کعبہ کو اللہ نہ کرے، گرا دیا جائے تو کیا ہم نماز پڑھنا چھوڑ دیں گے؟ اس لیے کہ ہمارے سامنے وہ پتھر نہیں ہے یا اس زمانے میں جب کعبۃ اللہ کی عمارت ہی نہیں تھی، بہہ گیا تھا، کعبہ شریف یہاں

ایک ٹیلہ تھا، پتہ نہیں لگتا تھا۔ جب سیدنا ابراہیم علیہ السلام کعبہ بنانے کے لیے آئے تو اللہ سے پوچھا کہ میرے مولا! میں کہاں کعبہ بناؤں؟ مجھے کیا پتہ کہ کعبہ کہاں تھا؟ اور اس کا طول وعرض کیا ہے، مجھے تو کچھ پتہ ہی نہیں۔

اچھا! اگر (نعوذ باللہ!) ان ہندوؤں کی طرح کسی دیوتا کی پوجا کرتے ہیں تو ہم کعبہ سے اونچا ہو کر نماز نہیں پڑھیں گے: کیونکہ ہمارے سامنے پھر کعبہ نہ ہوا، کعبہ تو نیچے ہو گیا۔ پھر ہم ہوائی جہازوں میں بیٹھ کر بھی نماز نہ پڑھیں، ہم بیس ہزار یا تیس ہزار فٹ کی بلندی پر چلے جاتے ہیں۔ اس لیے یہ اعتراضات مسلمانوں کو دھوکہ دینے کے لیے ہوتے ہیں۔ اور مقامِ ابراہیم پر جہاں تک نماز کا مسئلہ ہے میرے مدنی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مکہ فتح کیا، اسلام پھیل گیا تو اب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے مشورہ کیا کہ دو رکعت طواف کہاں ادا کریں؟ یہ تو حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے مشورہ لیا کہ بھائی! طواف کے بعد جو دو رکعت ہم نے پڑھنی ہیں، کہاں پڑھیں؟ آپ لوگوں کا کیا مشورہ ہے؟ کسی نے کہا: یہاں پڑھیں اور کسی نے کہا: وہاں پڑھیں۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! میری بات مانیں تو کعبہ ابراہیمی اور بنانے والے ابراہیم علیہ السلام اور آپ بھی ولدِ ابراہیم علیہ السلام اور آپ بھی علی ملت ابراہیم علیہ السلام، تو مہربانی کر کے مقامِ ابراہیم کو مصلیٰ بنالیں، جہاں ابراہیم علیہ السلام کھڑے ہوتے اور اللہ کے کعبہ کی تعمیر کرتے تھے، تاکہ ان کی یاد قیامت تک باقی رہ جائے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے قبول فرمالی اور اللہ تعالیٰ نے بھی قرآن نازل فرما دیا: ﴿وَاتَّخِذُوا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى﴾ مقامِ ابراہیم ہی کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کی جگہ بنالی۔ وہ پتھر درمیان میں آئے، پیچھے آئے، جہاں مرضی آئے، جہاں آپ کو موقع ملے، آپ وہاں کھڑے ہو جائیں۔

اگر پوجا ہوتی تو پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے سے ہوتی، اس کے باوجود بھی مسلمانوں کا مسئلہ دیکھیں! اگر مقامِ ابراہیم پر جگہ نہ ہو تو کوئی ضروری نہیں، اگر ہم مقامِ ابراہیم کے پجاری ہوتے تو جگہ نہ ہوتی، پھر بھی ہم ضرور پڑھتے۔ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمادیا کہ مقامِ ابراہیم پر رش ہو گیا، جگہ نہیں ہے تو تم حطیم میں پڑھ لو، اگر حطیم میں بھی جگہ نہیں ہے تو مطاف میں کسی جگہ پڑھ لو، اگر مطاف میں بھی جگہ نہیں ہے تو پوری مسجد الحرام میں جس جگہ دل چاہے پڑھ لو، اگر مسجد حرام میں بھی تمہیں بھول گئی ہو، گھر چلے گئے ہو تو وہیں جا کر پڑھ لو۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے بارے میں واقعہ آتا ہے کہ انہوں نے طواف کیا، قدرتی طور پر عصر اور مغرب کے درمیان وقت تھا۔ انہوں نے کہا کہ اس وقت تو میں دو رکعت نہیں پڑھتا۔ ادھر قافلہ مدینہ کو جانے والا تھا، آپ قافلہ

میں چلے گئے، تنعیم سے بھی گزر گئے، وہاں جا کر بعد میں آپ نے دو رکعتیں پڑھ لیں۔ لہٰذا اب کسی پتھر کے پابند ہوتے تو اس کے بغیر ہماری کسی دوسری جگہ نماز نہ ہوتی۔ اس سے ثابت ہو گیا کہ مسلمان نہ تو کسی پتھر کا پجاری ہے، نہ کسی خاص جہت کا اور نہ ہی سورج اور کواکب کا پجاری ہے، بلکہ وہ تو اپنے اللہ کے حکم کا پابند ہے۔

اس لیے ایسے مسائل کو سمجھا کریں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں صحیح عقیدہ عطا فرمائیں۔ ہم اس جہت میں اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل کر رہے ہیں، اگر ہم نے حجر اسود کو بوسہ دیا تو اتباع سنت رسول ﷺ کی وجہ سے دیا۔

ایسا دور بھی گزرا کہ حجر اسود چوری ہو گیا، مکہ میں تھا ہی نہیں تو کیا لوگوں نے طواف کرنا چھوڑ دیا تھا کہ حجر اسود نہیں ہے تو پھر ہم بوسہ کس کو دیں؟ جب نوح علیہ السلام کا طوفان آیا تو کعبہ بھی بہہ گیا اور حجر اسود بھی۔ جب نوح علیہ السلام کا طوفان آیا اور پوری سرزمین عرب کو ڈبو دیا تو اللہ تعالیٰ کی شان ہے کہ حجر اسود جبل ابو قبیس میں جا کر ٹھہر گیا۔ لہٰذا ہمیشہ یاد رکھیں کہ مسلمان ہر مسئلہ میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا پابند ہے، یہی فرق مسلمان اور غیر مسلمان کا ہے۔

مثال کے طور پر مسلمانوں کا ایک آدمی مر جاتا ہے تو یہ فوراً کہے گا کہ بس اللہ کی مرضی۔ اللہ کی قضا جو مقرر تھی، وقت آ گیا۔ اس کے بعد پوچھے گا کہ وجہ کیا بنی؟ وہ بیمار تھا اور ڈاکٹر کہتے ہیں کہ ہارٹ اٹیک ہوا، ان چیزوں کو تبعاً بیان کرے گا۔ اصل اور پکی بات وہ یہ کرے گا کہ بس حضرت! وقت آ گیا تھا، اللہ پاک نے جو وقت لکھا تھا وہ پورا ہو گیا۔ جبکہ کافر اسباب میں اٹک جاتا ہے اور وہ کم بخت حقیقی سبب کی طرف نہیں جاتا۔ ورنہ تو کافر اور مسلمان دونوں مرتے ہیں، لیکن وہ جب مرتا ہے، اس سے پوچھیں گے کہ تمہارے باپ کو کیا ہوا تھا؟ وہ کہے گا کہ ہارٹ اٹیک ہو گیا تھا، اس نے بڑی غلطی کی تھی، میں نے انہیں کہا تھا کہ بائی پاس کروا لو، وغیرہ وغیرہ۔ اور مسلمانوں کا دماغ سیدھا اللہ تعالیٰ کی طرف جاتا ہے۔ یہی مسلمان اور غیر مسلمان کا فرق ہے۔

مسلمان کے ہاں بچہ پیدا ہوگا تو وہ کہے گا: اللہ تعالیٰ کی مہربانی اور احسان سے پیدا ہوا اور کافر کہے گا کہ میں نے شادی کی اور بیوی کا علاج کرایا تو میری محنت سے پیدا ہوا ہے، خدا نے تھوڑی دیا ہے۔ میں شادی نہ کرتا تو بچہ کہاں سے پیدا ہوتا؟ اس بے وقوف سے پوچھو کہ تمہیں کس نے پیدا کیا؟

یہی بات جاہل کی دیکھ لیں! وہ کہتا ہے کہ میرا فلاں کام اٹک گیا تھا، میں پیر صاحب کی قبر پر نو راتیں بیٹھا، بس میرا کام ہو گیا۔ مسلمان کہے گا کہ پیر کا بھی خدا کرتا ہے اور تمہارا بھی خدا نے کیا۔ اس پیر کو بھی خدا نے پیدا کیا ہے اور قیامت والے دن اس پیر کو پھر کون اُٹھائے گا؟ جنت میں کون لے جائے گا؟ تو اسے جب لے جانے والا بھی اللہ

تعالیٰ ہے تو ہمیں دینے والا بھی اللہ ہے۔ چنانچہ مسلمان راستے میں نہیں اٹکتا، بلکہ سیدھا اللہ تعالیٰ کی طرف جاتا ہے۔ یاد رکھیں! اصل وجہ یہ ہے کہ نہ جوگی کچھ کر سکتا ہے، نہ یہ مٹی کے بھگوان کچھ کر سکتے ہیں، نہ مُردہ کچھ کر سکتا ہے اور نہ زندہ کچھ کر سکتا ہے، سب اسی اللہ کے ہاتھ میں ہے، جس نے سب کو پیدا کیا ہے۔

آیت کا خلاصہ:

آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ساری کائنات اور ذرہ ذرہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کا ہے کہ جب بھی جس جگہ بھی تم چہرے کو پھیر کر دعا مانگو گے تو میں تمہاری دعا قبول کروں گا۔ یہ نہیں ہے کہ تم مشرق میں مانگو تو میں سنوں اور تم مغرب میں مانگو تو میں نہ سنوں۔ حضرت مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جب اللہ نے قرآن میں فرمایا کہ مجھ سے مانگو، میں دعائیں منظور کروں گا تو مسلمانوں نے پوچھا کہ کہاں جا کر مانگیں؟ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جہاں ہو، جیسے ہو مانگو، میں سننے والا ہوں۔

اللہ تعالیٰ کی دو صفات کا ذکر آیا: ایک ''وَاسِعٌ'' اور ایک صفت ''عَلِیْمٌ'' کہ اللہ پاک کی ساری مخلوق کو اللہ پاک کی ذات ہی کفایت کرنے والی ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے جود و فضل سے سب کو رزق دینے والے ہیں، تمام مخلوق پر اس کی رحمت واسع ہے، اللہ پاک اپنے بندوں کے ہر عمل کو جاننے والے ہیں، اللہ کے آگے ان کا کوئی عمل بھی چھپا ہوا نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کے علم سے کوئی چیز دور نہیں، بلکہ کائنات کا ذرہ ذرہ چھوٹا بڑا سب اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے، جیسا عمل کریں گے ویسی ہی اللہ ان کو جزا عطا فرمائیں گے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

﴿وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ۙ سُبْحٰنَهٗ ؕ بَلْ لَّهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ ۝ بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَاِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۝﴾ [البقرۃ:۱۱۶،۱۱۷]

''اور (یہود و نصاریٰ) کہتے ہیں: اللہ نے اولاد بنائی ہے، وہ تو سب باتوں سے پاک ہے، بلکہ اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں اور زمین میں ہے، سب اس کے تابع فرمان ہیں۔ وہ بغیر کسی سابقہ مثال کے آسمانوں اور زمین کا موجد ہے اور جب وہ حکم کرتا ہے کسی ایجاد کا تو وہ اس کو کہتا ہے ہو جا تو وہ ہو جاتی ہے۔''

گزشتہ آیات کے ساتھ ربط:

گزشتہ آیات اور یہ آیات یہود و نصاریٰ کی تردید کے لیے آئی ہیں، اسی طرح مشرکین عرب جنہوں نے

فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں قرار دیا تھا، اللہ تعالیٰ ان آیات میں ان تمام فرقوں کی تردید کر رہے ہیں جو اللہ کے لیے بیٹے یا بیٹیوں کی نسبت کرتے ہیں، لہٰذا فرمایا: سبحانہ وتعالیٰ ان جیسے عیوب سے پاک اور منزہ ہے، اس کی ذات بلند و بالا ہے، اللہ تعالیٰ کی ذات بے مثل و بے مثال ہے اور اللہ تعالیٰ کی صفت واحد، احد اور صمد کے علاوہ ﴿لَمْ يَلِدْ ۙ وَلَمْ يُوْلَدْ ۝﴾ [الاخلاص: ۳] بھی ہے، اللہ تعالیٰ تمام صفاتِ کاملہ سے متصف ہیں اور تمام صفاتِ نقصان سے منزہ ہیں، یعنی جو صفتیں نقص کا ذریعہ ہوں یا جن میں نقص کا شائبہ بھی پایا جائے، اللہ تعالیٰ ان تمام نقائص سے پاک ہیں، لیکن دنیا میں جتنے لوگ مختلف اَدوار اور ازمان میں پیدا ہوئے، مختلف مذاہب، طبقات اور مختلف جماعتیں پیدا ہوئی ہیں، ان تمام نے اللہ تعالیٰ کی توحید کے عقیدہ میں غلو کیا، جیسا کہ یہود و نصاریٰ۔

یہود و نصاریٰ کی گمراہی:

ان کا ذکر اکثر اس لیے کیا جاتا ہے کہ حضور اکرم ﷺ کے زمانے میں یہ دونوں طبقے موجود تھے اور یہود و نصاریٰ آج بھی دنیا میں موجود ہیں اور ان سے پہلے جتنے لوگ تھے، وہ یا تو فنا ہو گئے اور ان کا نام تک نہیں رہا، ان کا زمانہ اتنا بعید تھا کہ ان کا ذکر کیا جاتا تو لوگوں کو بات سمجھ نہ آتی۔ یہودیوں نے عقیدۂ توحید میں حد سے تجاوز کر کے اللہ تعالیٰ کے لیے بیٹے کا اثبات کیا۔ حضرت عزیر علیہ السلام جو کہ ایک قول کے مطابق اللہ تعالیٰ کے نبی تھے، ان کے بارے میں یہ دعویٰ کیا کہ وہ اللہ کے بیٹے ہیں۔ پھر اسی بات پر قائم نہ رہے، بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ گئے، حتیٰ کہ یہ دعویٰ کیا ہم سب اللہ تعالیٰ کی اولاد ہیں، ہم سب اللہ کے محبوب اور پسندیدہ لوگ ہیں۔

اسی طرح نصرانیوں نے بھی حد سے تجاوز کر کے عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا قرار دیا، جس کے بارے میں قرآن پاک نے کئی مقامات پر وضاحت بھی فرمائی اور پھر بعض نصاریٰ نے کچھ اور بھی تجاوز کیا اور کہا کہ بی بی مریم علیہا السلام اللہ کی بیوی ہیں (نعوذ باللہ!)، اور اکثر عیسائی عقیدۂ تثلیث میں کھو گئے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ جہالت ہے۔ اور دوسری بڑی وجہ یہ کہ جب محبت میں جہالت بھی ساتھ ہو تو آدمی غلو کرتا ہے اور بڑھتا ہوا حدود سے تجاوز کر جاتا ہے۔

نصاریٰ کے سامنے جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات آئے تو انہوں نے ان کی بات سننے کی طرف توجہ نہ کی، بلکہ فوراً ان کو اللہ کا بیٹا بنا بیٹھے۔ اسی طرح یہود نے عزیر علیہ السلام کے دوبارہ زندہ ہونے کو دیکھا تو وہ بھی اس میں کھو گئے۔ اور یہی واقعہ مشرکین مکہ کا تھا کہ جب ان کے سامنے فرشتوں کا ذکر آیا کہ وہ اللہ کی آسمانی مخلوق ہے اور وہ

فرشتے نظر بھی نہیں آتے، فرشتے آسمانوں سے اُترتے اور اوپر جاتے ہیں اور کسی کو ان کی باتیں بھی سنائی نہیں دیتیں تو انہوں نے بھی اپنے تخیل سے ایک عقیدہ گھڑ لیا کہ جتنے فرشتے ہیں، دراصل یہ اللہ کی لڑکیاں ہیں اور جیسے ہم لڑکیوں کو چھپاتے ہیں تو اللہ نے بھی لڑکیوں کو چھپا رکھا ہے اور ان کو زمینوں میں نہیں، بلکہ آسمانوں میں آباد کیا اور ان کو ایسی شکل وصورت دی ہے کہ کوئی ان کو دیکھ نہیں سکتا۔

اللہ تعالیٰ امتحان کیوں لیتا ہے؟

یہ بات یاد رکھیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ابتلاء اور امتحان ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کا اس لیے امتحان لیتے ہیں، تاکہ جو صحیح معنی میں مومن ہیں وہ بھی نکھر کر سامنے آجائیں اور جو کافر ہیں وہ بھی کھل کر سامنے آجائیں، اور جو منافق ہیں وہ بھی سامنے آجائیں۔ مقصد یہ نہیں ہوتا کہ اللہ تعالیٰ نہیں جانتے۔ اللہ تعالیٰ تو جانتے ہیں امتحان سے پہلے بھی اور امتحان کے بعد بھی۔ مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ میں جو جانتا ہوں، وہ ذرا بندوں کے سامنے بھی آجائے کہ کس نے ابوجہل اور کس نے صدیق بننا ہے؟ کس نے دشمن اور کسی نے دوست بننا ہے؟ اللہ کے تو علم میں ہے، لیکن اگر اللہ تعالیٰ اس آزمائش کی بھٹی میں نہ ڈالتے تو سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی خلافت، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی عدالت، حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا غنا وحیا، حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شجاعت اور ابوجہل کی عداوت وجہالت سامنے نہ آتی۔ اللہ تعالیٰ اپنے انبیاء کو معجزات بھی عطا فرماتے ہیں، پھر انبیاء پر مشقتیں بھی ڈالتے ہیں، تاکہ جو صحیح عقیدے والا آدمی ہے اس کو پتہ چل سکے کہ عیسیٰ علیہ السلام اپنی جان بچانے کے لیے مختلف مقامات پر چھپ رہے ہیں، پناہ لے رہے ہیں، اللہ کے آگے فریادیں کر رہے ہیں کہ اے اللہ! مجھے یہود کی دشمنی سے بچا، مجھے یہودیوں کے قاتلانہ حملے سے بچا، اپنے ساتھیوں سے مدد مانگ رہے ہیں کہ کون ہے تم میں سے میری اس مشکل وقت میں مدد کرے؟ اب جو اہل ایمان ہے وہ ان چیزوں پر بھی نظر رکھتا ہے، کہتا ہے کہ خدا نہ کرے! اللہ کا بیٹا ہو، اگر خدانخواستہ خداوند قدوس کی بیوی ہو تو مصیبت آنے کا کیا مطلب؟ ہر آدمی اپنی بیوی کی حفاظت کرتا ہے (نعوذ باللہ!) خدا اپنی بیوی کی حفاظت نہیں کر سکتا، اللہ تعالیٰ اپنے بیٹے کی حفاظت نہیں کر سکتے۔

جب وہ سمجھتے ہیں کہ یہ اللہ کے رسول اور نبی ہیں، یہ جنس بشر اور اولادِ آدم میں سے ہیں، جیسے اللہ تعالیٰ نے اولادِ آدم کو پیدا کیا، یہ بھی اسی طرح ماں کے بطن سے پیدا ہوئے۔ اولادِ آدم کی طرح انہوں نے بھی اپنی ماں کے پیٹ

میں نو ماہ کا وقت گزارا ہے، اگر کہیں کوئی ایسا واقعہ آیا ہے تو یہ معجزہ ہے، کرامت اولیاء میں شمار ہوگا۔ یہ نہیں کہ ہم کہیں کہ یہ خدا ہے یا خدا کا بیٹا یا اس کی بیوی ہے۔ (نعوذ باللہ من ذالک)

منکرین خدا اور مذہب کی بدحالی:

اس لیے ہمیشہ یاد رکھیں کہ جب بھی آدمی (اللہ تعالیٰ رحمت فرمائے) توحید کے عقیدے سے بھٹکتا ہے تو اس کو ہمیشہ دو چیزیں ہلاک کرتی ہیں: یا تو وہ محبت میں اتنا آگے بڑھ جاتا ہے کہ وہ پٹڑی سے اُتر جاتا ہے یا پھر اتنا نیچے آ جاتا ہے کہ اس کے دل میں نفرت آ جاتی ہے، جس کی وجہ سے دماغوں کے اندر دہریت پیدا ہو جاتی ہے، پھر آدمی کہتا ہے: یار! کہاں ہے خدا؟ اس کے ماننے والے مسلمان تو ہر جگہ مار کھا رہے ہیں، اس کا نام لینے والے تو ہر جگہ بے عزت ہو رہے ہیں، اس کی نمازیں پڑھنے والے تو ذلیل ہو رہے ہیں، اور جو خدا کو مانتے نہیں، شراب پیتے ہیں اور ان کے ہاں حلال وحرام کی تمیز نہیں ہے، وہ تو بڑے مزے میں ہیں، ان کے پاس تو امن وسکون ہے۔

ان کا کہنا ہے کہ خدا وغیرہ کا قصہ مولویوں کا بنایا ہوا ہے، کوئی خدا، نبی اور رسول نہیں، بس جس نے اچھا کام کیا وہ اچھا لیڈر ہے اور جس نے بُرا کام کیا وہ بُرا لیڈر ہے، بات ختم ہوگئی۔ ایسے لوگ بالکل نفرت میں آ جاتے ہیں اور خدا کا انکار کر کے دہریت میں چلے جاتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ہم نے دنیا میں بس کھایا، کمایا، دولت اور روٹی سب کچھ ہمارے پاس موجود ہیں۔ جو چاہیں ہم آزادی سے کرتے رہیں، جس چیز کی ضرورت ہو وہ ہم لے لیں اور جس کی ضرورت نہ ہو وہ چھوڑ دیں۔ کسی کے ساتھ زیادتی نہ کریں، بس نہ کوئی خدا ہے، نہ رسول اور نہ ہی قیامت وآخرت ہے۔ جو لوگ ہزاروں سال پہلے مر گئے، وہ کہاں ہیں؟ آباؤ اجداد مر گئے، ہم بھی مر جائیں گے، مٹی میں مل جائیں گے۔ وہ اس نفرت میں آ کر (اللہ تعالیٰ معاف کرے) کفار کے ساتھ مل گئے۔

عقیدت اور عداوت میں غلو کرنے والوں کی بدحالی:

جن لوگوں نے حضور اکرم ﷺ کے صرف معجزات پر نظر رکھی کہ حضور اکرم ﷺ کی انگلی سے چاند کے دو ٹکڑے ہو جائیں، لعاب دہن سے کڑوے کنوئیں میٹھے ہو جائیں، حضور اکرم ﷺ پتھر پر چوٹ لگائیں تو چٹانیں ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں، حضور اکرم ﷺ پہاڑ پر پاؤں ماریں تو زلزلہ آنے سے رک جائے۔ جب انہوں نے ان معجزات پر نظر ڈالی تو بس انہی میں کھو گئے اور کہا کہ یہ صورتاً تو بشر تھے، بشریت کا لبادہ اوڑھا ہوا تھا، لیکن اصل



میں خود خدا تھے۔ جب عرش پر تھے تو خدا تھے اور جب مدینے میں اُترے تو محمد مصطفیٰ ﷺ بن گئے۔ یہ بھی دراصل اسی محبت کا نتیجہ تھا، لیکن محبت میں غلو اور تجاوز کر گئے اور حد سے نکل گئے۔

بعض لوگ تعصب کا شکار ہو گئے۔ وہ کہتے تھے کہ یہ تو ہماری طرح کھانا کھاتے ہیں، بازاروں میں جاتے ہیں، ان کو دکھ تکلیف آتی ہے تو کیسے خدا کا رسول مان لیں؟ ایک عام آدمی ہے، مکہ مکرمہ کی سرداری لینے کے لیے ایک نعرہ دے دیا ہے، تاکہ لوگ اس کے پاس اکٹھے ہو جائیں۔ یہ کوئی نبی اور رسول نہیں ہے۔ وہ دشمنی میں بڑھ کر نبوت و رسالت کا بھی انکار کر بیٹھے اور کوئی محبت میں ایسے بڑھے کہ خدا کے مرتبے پر فائز کر بیٹھے۔ لہٰذا دونوں راستے سے ہٹ گئے۔

اللہ تعالیٰ نے جن لوگوں کو ہدایت اور صراطِ مستقیم پر رکھا، انہوں نے اپنے عقیدے کو صاف رکھا کہ جب ساری کائنات کا مالک وخالق اللہ تعالیٰ ہے تو اس کو بیٹوں کی کیا ضرورت ہے؟ بیٹے کی ضرورت تو اس کو ہوتی ہے جو محتاج ہو، جیسے اپنے بڑھاپے کا خطرہ ہو کہ کل جب میں بوڑھا ہو جاؤں گا تو میری لاٹھی کون پکڑے گا؟ کھانے اور رہائش کا انتظام کون کرے گا؟ بیمار پڑ جاؤں تو میری عیادت اور مدد کون کرے گا؟ اللہ تو ہر نقص سے پاک ہیں، انہیں کیا ضرورت ہے؟ ساری کائنات جس کی مخلوق ہو، اس کو کیا ضرورت ہے کہ بیٹے بنائے؟ اسے کیا بیوی کی احتیاج ہے؟ اللہ تعالیٰ کا تو سارا مِلک ہے، سب اس کے عبد ہیں، وہ چاہے تو ساری مخلوق کو ایک لمحہ میں ختم فرما دے اور چاہے تو ساری مخلوق دوبارہ پیدا فرما دے۔ اس پاک ذات کو کس چیز کی ضرورت ہے؟

اسی طرح انہوں نے کہا کہ جتنے رسول آئے ہیں، بالکل اللہ کے نبی ہیں، ان کے والدین ہیں، ان پر بھی ولادت کا دور گزرا ہے، ان پر بھی دورِ رضاعت گزرا ہے، ان پر جوانی اور بڑھاپے کا دور گزرا ہے، ان پر بخار اور تکالیف آئی ہیں، ان پر جادو ہوئے ہیں، ان پر بھی زخم لگے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو ایسے ایسے معجزات عطا فرمائے۔ اس لیے الحمدللہ! وہ لوگ راہِ حق پر رہے۔

ایک پادری سے مناظرہ، چنے بیچنے والے نے ہرا دیا:

دنیا میں ایک ایسا طبقہ لوگوں کا موجود ہے کہ جس قسم کا آدمی دعویٰ کرے، اس کے ماننے والے کچھ دنوں بعد اسے مل ہی جاتے ہیں۔ آپ نے دیکھا ہے کہ دنیا میں کتنے پیر ہیں، ہر پیر کا کوئی نہ کوئی حلقہ موجود ہے۔ کسی کے پانچ

ہزار اور کسی کے دس ہزار ہیں، ایسے بھی پیر ہیں کہ جن کو خود نماز پڑھنی نہیں آتی، لیکن ان کے بھی مرید ہیں۔

مرزا نے دعویٰ نبوت کیا، اس کے ماننے والے بھی موجود ہیں، جس نے مجدد کا دعویٰ کیا اور کسی نے بڑے عجیب عجیب دعوے کیے، ان کے ماننے والے بھی موجود ہیں۔ اسی طرح اس کے ساتھ عیسائیوں نے بھی اس مسئلہ پر بڑا شور مچایا اور کہا کہ اس مسئلہ پر ہمارے ساتھ مناظرہ کریں اور ایسے مسائل پر اہل حق ہمیشہ احتراز کرتے ہیں کہ مناظرہ تو ایسی بات میں کیا جاتا ہے کہ جس کے حق ہونے میں کوئی شک ہو، تاکہ آدمی دلائل دے کر حق بات کو واضح کرے، لیکن جو بات قرآن وسنت اور شرع وعقل کے بالکل خلاف ہو، اس پر کیا بات کرنی ہے؟ لیکن باطل جب مجبور کر دیتا ہے تو علماء مجبور ہو جاتے ہیں کہ اب اگر ہم جواب نہیں دیں گے تو لوگ باتیں بنائیں گے کہ دیکھا جی! مولوی جھوٹے ہیں، اس لیے سامنے آکر بات نہیں کرتے۔

ہمیشہ یاد رکھیں! مناظرہ یا مسئلہ وہاں ضروری ہوتا ہے جب پوچھنے والے نے اپنی تسلی کرنی ہو کہ جی! مجھے اس مسئلہ میں تسلی کرنا ہے کہ عشاء کی نماز کی چار رکعات ہیں یا تین یا دو، کتنی ہیں؟ اور میں عشاء کی نماز کیسے پڑھوں؟ آپ نے اس کو بتا دیا کہ چار رکعت فرض ہیں اور چار سنتیں پہلے ہیں، پڑھ لو تو ثواب ملے گا نہیں پڑھو گے تو گناہ نہیں ہوگا، دو سنتیں بعد میں پڑھو گے اور اس کے بعد تین رکعت وتر پڑھو گے۔ اب اس نے مسئلہ سمجھنا تھا، آپ نے سمجھا دیا، لیکن ایک ہوتا ہے محض فساد۔ مسئلہ سمجھنا مقصد نہیں ہوتا، مقصد صرف فساد مچانا اور ایک شرارت کرنی ہوتی ہے کہ جب میں شور کروں گا تو لوگ کہیں گے کہ نہیں جی! اس بات میں بھی کچھ وزن معلوم ہوتا تھا اور کچھ کہیں گے کہ نہیں، وہ تو جھوٹ بول رہا تھا۔ بس یہیں سے لڑائی شروع ہوگئی۔ دو فرقے پیدا ہو گئے: کچھ اس کے اور کچھ دوسرے کے حامی بن گئے۔

واقعہ:

اللہ تعالیٰ رحم فرمائے۔ جب اس مسئلہ اہمیت پر علماء کو چیلنج کیا تھا تو حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کو مناظرہ کے لیے بلایا گیا۔ ابھی حضرت نانوتوی رحمہ اللہ تشریف نہیں لائے تھے، وہ اپنی تقریر کر رہا تھا کہ کوئی بے چارہ چنے بیچنے والا جو جلسے کے باہر کھڑے ہو جاتے ہیں، اس کی عقل میں کوئی بات آئی تو اندر چلا گیا۔ اس نے کہا: پادری صاحب! کیا شور کر رہے ہو، مسئلہ کیا ہے؟ ساری مخلوق کیوں اکٹھی کی ہوئی ہے؟ سینکڑوں لوگ اکٹھے کیوں ہیں؟ اس نے کہا: بس

میں مناظرے کے لیے یہاں آیا ہوں۔تمہارے مسلمانوں کا مولوی ابھی تک نہیں آیا ہے۔اس نے کہا کہ مناظرہ تم نے کرنا کس موضوع پر ہے؟اس نے کہا کہ وہ عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا نہیں مانتے،ہم اس کے بیٹے کے بارے میں بات کرنا چاہتے ہیں۔اس نے کہا: اچھا تم مانتے ہو؟ کہا: ہاں بالکل۔اس آدمی نے کہا: اللہ کا بیٹا ہے کون؟اس نے کہا: حضرت عیسیٰ علیہ السلام۔اس نے کہا: خدا کی عمر کتنی ہے؟اب پادری صاحب چپ۔اللہ کی عمر کیسے بتائیں؟اس نے کہا کہ تم نے اللہ کا بیٹا جو بنایا ہے تو عمر بھی بتاؤ نا! خدا بوڑھا ہے یا جوان؟اس کا جواب تو آیا ہی نہیں۔اس نے پادری سے کہا: اچھا یہ بتاؤ کہ اللہ کا ایک ہی بیٹا ہے یا دو، چار، پانچ اور بھی ہیں۔اس نے کہا کہ نہیں،بس ایک ہی بیٹا ہے۔اس نے کہا: کمال کرتے ہو،میں چنے بیچتا ہوں،سات تو میرے ہیں،ایسا کمزور خدا کہ ایک کے جننے کے بعد چھٹی ہوگئی۔ایسا خدا جو مجھ سے بھی کمزور ہو،میں نہیں مانتا۔پادری مناظرہ چھوڑ کر بھاگ گیا،جھوٹا آدمی کیا جواب دے سکتا ہے؟حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ آئے تو بتایا گیا۔انہوں نے فرمایا کہ بہرحال ایسے آدمی کا علاج تو یہی تھا۔علمی بحثیں کرتے تو کچھ لوگوں کو سمجھ آتی اور کچھ کو نہ آتی۔کچھ لوگوں کے دماغ میں مسئلہ داخل ہوتا تو کچھ لوگوں کے دماغ میں داخل ہی نہ ہوتا۔یہ تو ایک ایسا علاج ہے ہر کسی کو ماشاء اللہ! سمجھ آگیا،اچھا مناظرہ کیا۔

واقعہ:

ایک پنڈت دیانند سرسوتی سے مناظرے پر گئے تو ان کے لیے شرائط طے کرنے کے لیے علماء کو بھیجا گیا۔جب وہ علماء آئے تو انہوں نے دیکھا کہ اس پادری کے آگے انواع واقسام کے کھانے پڑے ہوئے ہیں،وہ بھی کھا رہا ہے اور باتیں بھی کر رہا ہے۔وہ کہنے لگے کہ ہم بڑے گھبرائے کہ یہ اتنا کھاتا ہے،کہیں مولانا کو کھانے میں چیلنج نہ کردے کہ کھانے میں مقابلہ کرو۔مولوی قاسم صاحب تو اس زمانے میں ایک چپاتی پر دن بھر گزارتے تھے تو اس نے کہا کہ ہمارے استاد صرف چپاتی ہی کھا سکتے ہیں اور یہ آدمی پچاس آدمیوں کا کھانا کھا گیا۔

جب وہ واپس آئے تو پریشان! مولانا نے فرمایا کہ بھئی! چپ چپ لگتے ہو،کیا بات ہے؟انہوں نے کہا کہ وہ پادری اگر کھانے پر آپ سے مناظرہ کرلے تو وہ تو بہت کھاتا ہے،آپ کیسے مناظرہ کریں گے؟حضرت نے فرمایا کہ بھائی! مناظرہ علم میں ہوتا ہے،جہل میں ہوتا ہی نہیں۔کھانے کا تعلق جہالت سے ہے،اگر اس نے کھانے میں چیلنج کیا تو ہم کوئی بھینس کھڑی کردیں گے،کیونکہ اس کا علم سے تو تعلق نہیں ہے،اور اگر اس نے زیادہ مجبور کیا تو تم

میرے ساتھ آئے ہو، تم کس بلا کا علاج ہو؟ اور اگر علم میں مناظرہ ہوا تو علم میں ہم حاضر ہیں اور نہ کھانا وہ علم کی صفت ہے، اس سے کہیں گے کہ تم نہ کھانے میں ہمارے ساتھ مناظرہ کرو کہ بھئی! کھانا ایک مرتبہ کھا لیتے ہیں، وضو کر کے ہمیں مسجد میں بند کر دو، نمازیں پڑھتے رہو اور ایک مہینے تک کھانا نہ دو، پھر جو زندہ رہ جائے وہ سچا ہے اور جو مر جائے وہ جھوٹا ہے۔ نہ کھانا، یہ علم کی صفت ہے، اس میں ہم مناظرہ کرلیں گے۔

اگر کھانا صفتِ علم ہوتا تو اللہ بندے کو سب سے زیادہ کھانے کی توفیق دیتا، جیسا کہ جانور زیادہ کھاتا ہے۔ چونکہ وہ جاہل ہے، اس لیے زیادہ کھاتا ہے، اور جس میں زیادہ علمیت آجائے گی اس کا کھانا اتنا کم ہوتا جائے گا، وہ تو ذکر اللہ میں مشغول ہو جائے گا، کھانے میں تو نہیں لگا رہے گا (یہ واقعہ حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کی کتاب ''انتصار الاسلام'' کے دیباچہ میں کچھ تغیر کے ساتھ درج ہے۔ انور) پھر اللہ تعالیٰ ان کی غذا کو ذکر بنا دیتے ہیں، تلاوت وعبادت کو غذا بنا دیتے ہیں۔

اسی لیے آپ تصور کر سکتے ہیں کہ دو دو مہینے تک اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں آگ نہیں جلتی تھی، وہاں کھانا پکتا ہی نہیں تھا تو گزارا کیسے ہوتا تھا؟ تو بیوی نے فرمایا: کھجور کے دانے مل جاتے تھے اور پانی مل جاتا تھا۔ سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے گھرانے میں تو کھجوریں بھی پیٹ بھر کر نہیں کھائیں۔

بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے گھی لگی ہوئی روٹی زندگی بھر نہیں کھائی...... ہمارا ناشتہ تو پراٹھے کے بغیر ہوتا ہی نہیں...... اس لیے میں کہہ رہا تھا کہ لوگ اسی لیے دھوکے میں پڑ جاتے ہیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ کتنے بڑے جاہل ہیں؟ جو چیز میری مخلوق اور میری ملک ہے، جو اس میں چاہوں، مَیں کروں، مجھے کسی سے پوچھنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

آیت مبارکہ سے یہود ونصاریٰ کا رَدّ:

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے یہود ونصاریٰ اور ان لوگوں پر رد کیا ہے جنہوں نے اللہ کے لیے بیٹے اور بیٹیاں ثابت کیں۔ اللہ نے ان سب کو ان کے دعویٰ میں جھوٹا کیا کہ ان کا یہ قول جھوٹا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اولاد ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کی ذات بلند وبالا اور مقدس ہے، اللہ تعالیٰ کی ذات ان باتوں سے پاک ہے جو یہ ظالم کہتے ہیں۔ ایسے نہیں جیسے ان لوگوں نے اللہ تعالیٰ پر بہتان باندھا۔

ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بیٹا لازمی اپنے ماں باپ کے مشابہ ہوتا ہے، جبکہ اللہ تعالیٰ کی ذات کا تو کوئی شبیہ ہو ہی نہیں سکتا، پھر اللہ تعالیٰ کا بیٹا کیسے ہوسکتا ہے؟ اس لیے فرمایا کہ خداوند قدوس اس سے پاک ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی کوئی نظیر ہو۔ نہ اس کی عظمت و کبریائی میں کوئی شریک ہے اور نہ اس کی کوئی بیوی ہے۔

دوسری بات یہ کہ جب بھی کوئی اولاد ہوگی، لازماً وہ اپنے والد کی جزء ہوگی اور جزء اسی چیز کا ہوسکتا ہے جو قابل تقسیم ہو، جبکہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہر طرح کی تقسیم سے منزہ اور مقدس ہے۔

تیسری بات یہ کہ خدا کا بیٹا بھی تو کیا وہ بھی خدا ہوگا؟ اگر وہ خدا ہو تو خدا کسی کا محتاج نہیں ہوتا، جبکہ ایسا بیٹا وجود میں باپ کا محتاج ہے۔ اسی طرح اگر کوئی بیٹا خدا نہیں ہوگا تو پھر کیا ہوگا؟ اگر مخلوق ہوگا تو دنیا میں یہ قاعدہ ہے کہ ابنیت اور عبدیت دنیا میں جمع نہیں ہوسکتی، یعنی اگر بفرض محال کسی نے غلام خریدا اور وہ اس کا بیٹا تھا، مثلاً بچپن میں جنگ میں گرفتار ہوگیا تھا، پھر بکتے بکتے جب باپ نے خریدا تو پتہ چلا کہ وہ اس کا بیٹا ہے تو وہ اسی وقت آزاد ہو جاتا ہے؛ کیونکہ جو بیٹا ہے وہ عبد نہیں ہوسکتا؛ کیونکہ عبدیت اور ابنیت بندے میں جمع نہیں ہوسکتی۔ لہٰذا جب ساری مخلوق اللہ تعالیٰ کی عبد ہو تو اللہ کے بیٹے ہونے کا کیا مقصد؟ اس لیے سب سے پہلا جواب یہ دیا کہ ﴿سُبْحٰنَهٗ﴾ اللہ کی ذات پاک ہے۔

ابن آدم کا اللہ کو جھٹلانا:

ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس آیت مبارکہ کے تحت امام بخاری رحمہ اللہ نے حدیث قدسی نقل کی ہے:

''عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، قَالَ قَالَ اللّٰهُ: كَذَّبَنِي ابْنُ آدَمَ وَ لَمْ يَكُنْ لَهُ ذٰلِكَ، وَ شَتَمَنِي، وَ لَمْ يَكُنْ لَهُ ذٰلِكَ، فَأَمَّا تَكْذِيبُهُ إِيَّايَ فَزَعَمَ أَنِّي لَا أَقْدِرُ أَنْ أُعِيدَهُ كَمَا كَانَ، وَ أَمَّا شَتْمُهُ إِيَّايَ، فَقَوْلُهُ لِي وَلَدٌ، فَسُبْحَانِي أَنْ أَتَّخِذَ صَاحِبَةً أَوْ وَلَدًا.'' [صحیح بخاری، رقم: ۴۴۸۲]

اللہ پاک نے فرمایا کہ ابن آدم نے مجھے جھٹلایا، میری تکذیب کی، حالانکہ بندے کو یہ حق نہیں پہنچتا تھا کہ وہ اپنے خالق و مالک کو جھٹلاتا۔ ابن آدم نے مجھے گالی دی، حالانکہ اسے نہیں چاہیے تھا کہ وہ مجھے گالی دیتا۔ اب تکذیب کا کیا معنی؟ اللہ کو کیسے جھٹلایا؟ اللہ پاک فرماتے ہیں کہ بندے یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم مرنے کے بعد دوبارہ زندہ نہیں ہوں گے، اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ مجھے جھٹلاتے ہیں۔ کیا میں دوبارہ پیدا کرنے پر قادر نہیں ہوں؟ جب میں پہلے

بنانے پر قادر ہوں تو تمہیں قبر سے دوبارہ پیدا کرنے پر بھی قادر ہوں۔ فرمایا کہ ان کا گالی دینا یہ ہے کہ وہ میرے لیے بیوی اور بچے ثابت کرتے ہیں، حالانکہ میری ذات بیوی اور بچے سے پاک ہے۔

اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کے باوجود وہ اپنے بندوں سے رزق نہیں روکتا:

صحیحین میں روایت ہے کہ حضور پاک ﷺ نے فرمایا:

"لَيسَ أَحَدٌ، أَوْ: لَيسَ شَيْءٌ أَصْبَرَ عَلَى أَذًى سَمِعَهُ مِنَ اللهِ، إِنَّهُمْ لَيَدْعُونَ لَهُ وَلَدًا، وَإِنَّهُ لَيُعَافِيهِمْ وَ يَرْزُقُهُمْ." [صحیح بخاری، رقم:۶۰۹۹]

اللہ سے بڑا صبر کرنے والا کون ہے؟ جتنی تکالیف اللہ تعالیٰ کو پہنچائی گئیں اور اللہ نے سنیں، اس کے بعد وہ صبر کا مظاہرہ فرماتے ہیں کہ اللہ کی طرف اولاد اور بیوی جیسی گندی باتیں منسوب کی جائیں، لیکن اس کے باوجود وہ ان کو رزق بھی دیتا ہے اور صحت بھی دیتا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا کمال صبر ہے، اللہ تعالیٰ کا کمال ہے کہ وہ پھر بھی ہمیں زندہ رکھتے ہیں۔

﴿كُلٌّ لَّهُ قٰنِتُوْنَ﴾ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا کہ ﴿قٰنِتُوْنَ﴾ کے معنی "مُصَلِّيْنَ" یعنی نماز پڑھنے والے کے ہیں۔ اسی طرح حضرت عکرمہ اور ابو مالک نے فرمایا: یعنی وہ تمام اشیاء جو آسمانوں اور زمینوں میں ہیں، وہ اپنی عبدیت کا اقرار کرنے والی ہیں کہ ہم اللہ کی مخلوق ہیں۔

سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے فرمایا کہ ﴿قٰنِتُوْنَ﴾ کا معنی اخلاص ہے اور ربیع بن انس رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس کا معنی یہ ہے کہ آسمانوں اور زمینوں کے رہنے والے سب قیامت کے دن اسی کے سامنے حاضر ہونے والے اور اس کی اطاعت کرنے والے ہیں۔

حضرت مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جو بھی مخلوق آسمانوں اور زمینوں میں ہے، سب اللہ تعالیٰ کی اطاعت گزار ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جس کو انسان بننے کا حکم دیا وہ انسان بن گیا، جس کو حیوان بنایا وہ حیوان بن گیا، کوئی حیوان یہ نہیں کہہ سکتا کہ مجھے انسان کیوں نہیں بنایا؟ اور کوئی انسان یہ نہیں کہہ سکتا کہ مجھے کسی اور مخلوق میں کیوں پیدا نہیں کیا؟

اس کے بعد دوسرا جواب یہ دیا ہے کہ جب آسمانوں اور زمینوں کی تمام مخلوق اسی کی مِلک اور مخلوق اور مملوک ہے تو پھر اس کے لیے بیٹے کی کیا ضرورت ہے؟

اور تیسرا جواب یہ دیا ہے کہ تمام کی تمام مخلوق اسی کی اطاعت گزار ہے، وہ تو خود اعتراف کرنے والے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی ذات منزہ ہے اور اللہ تعالیٰ کی ذات برتر و بالا ہے، جن کو تم اللہ کا بیٹا بنا رہے ہو وہ تو خود کہتے ہیں کہ خدا بیٹے سے پاک ہے، اللہ تعالیٰ کی صفت ﴿لَمْ يَلِدْ ۙ وَلَمْ يُوْلَدْ ۝﴾ ہے۔

سجدۂ عبادت و تعظیمی میں فرق:

اسی طرح یاد رکھیں کہ عیسائی، مسلمانوں کو یہ دھوکہ بھی دیتے ہیں کہ ہم اصل میں عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا تو کہتے ہیں، لیکن ہمارا بیٹا کہنے سے وہ حقیقی بیٹا مراد نہیں، بلکہ یہ مجازی بیٹا ہے۔ جیسا کہ آج کل آپ نے بھی دیکھا ہوگا کہ جتنے اہل بدعت ہیں، ان کو جب آپ کہیں گے کہ آپ قبر پر سجدہ کرتے ہیں، اپنے پیروں کو ان کی خانقاہوں میں سجدہ کرتے ہیں تو وہ کہیں گے: نہیں جی! حقیقی سجدہ عبادت اور نماز والا ہے، وہ تو اللہ کے لیے ہے، یہ تو تعظیمی سجدہ ہے، یہ شکل تو ہے سجدہ والی، لیکن اس سے تو مقصد ہمارا تعظیم ہے، اور اللہ تعالیٰ نے خود حکم دیا ہے کہ میرے بندوں کی توقیر کرو۔ لہٰذا ہم تو تعظیم کر رہے ہیں، یہ سجدہ حقیقی یا عبادت والا نہیں، بلکہ تعظیمی ہے۔ وہ اس پر بعض فقہاء کے اقوال سے بھی حجت پکڑتے ہیں۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ کسی آدمی نے غیر اللہ کو تعظیم کی نیت سے سجدہ کیا تو یہ حرام ہے، لیکن کفر نہیں۔ کفر تو اس وقت ہوگا جب اسی طرح کا خیال عبودیت کرے جو اللہ کے لیے کیا جاتا ہے، جب اس قسم کا تذلل اختیار کرے گا تو کفر ہے، ورنہ اس کا مقصد تعظیم تھا، جیسے آدمی والدین کے پاؤں میں گر جاتا ہے، کبھی باپ کے پاؤں میں گر جاتا ہے۔

لیکن اصولی بات یاد رکھیں کہ جب تک دل میں تعظیم نہ ہو تو سجدہ ہوتا ہی نہیں۔ سب سے پہلے عظمت، پھر اس ذات کے ساتھ محبت، پھر غایت تذلل اور غایت عبودیت پیدا ہوگی۔ لہٰذا سب سے بہتر راستہ ان علماء کرام نے اختیار فرمایا کہ کسی حال میں بھی ہو، غیر اللہ کو سجدہ کفر ہے؛ کیونکہ جب صحابہ رضی اللہ عنہم نے اجازت مانگی تھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سجدہ کے لیے کہ یا رسول اللہ! لوگ بادشاہوں کو سجدہ کرتے ہیں، ہم بھی آپ کو سجدہ کریں؟ لازمی بات ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم بھی تعظیم والا سجدہ کرنا چاہتے ہوں گے، کوئی عبادت والا سجدہ تو نہیں کرنا چاہتے ہوں گے؟ صحابہ رضی اللہ عنہم بھی یہی چاہتے ہوں گے کہ جیسے لوگ بادشاہوں کے سامنے جھکتے ہیں اور کوئی فرشی سلام بجالاتے ہیں، کوئی باقاعدہ زمین پر سجدہ کرتا ہے، کوئی ہاتھ باندھ کر اپنے معروضات پیش کرتا ہے، ہم بھی آپ کو ایسا سجدہ کریں۔

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: بالکل نہیں! اللہ کے سوا مخلوق میں کسی کو سجدہ کی اجازت ہوتی تو میں عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے خاوند کی تعظیم میں سجدہ کرے، لیکن اللہ تعالیٰ کے سوا چونکہ کسی غیر کو سجدہ کی اجازت ہی نہیں ہے، لہٰذا خبردار! کوئی کسی کو سجدہ نہ کرے۔ راستہ ہی بند کردیا، تاکہ سجدہ کی ظاہری شکل بھی کسی غیر کے سامنے نہ بنے، ورنہ تو پھر راستے نکلتے چلے جائیں گے اور آدمی ایک نہ ایک بہانہ بناتا چلا جائے گا۔

چنانچہ عیسائیوں نے بھی ایک بہانہ بنایا، انہوں نے دیکھا کہ جب ہم علماء جواب نہیں دے سکتے اور قرآن و حدیث کے دلائل کا ہمارے پاس کوئی جواب نہیں تو اب جان چھڑانے کے لیے انہوں نے ایک اور راستہ اختیار کرلیا اور کہا کہ ہم عیسیٰ علیہ السلام کو حقیقی بیٹا نہیں مانتے، بلکہ مجازی بیٹا مانتے ہیں۔ یہ باطل کا قاعدہ ہے کہ جب وہ لاجواب ہوتا ہے تو بہانہ بناتا ہے۔

ظلّی و بروزی نبی کی داستانیں:

مرزا غلام احمد قادیانی کا علماء کرام نے خوب تعاقب کیا کہ تم نے کیسے نبوت کا دعویٰ کردیا؟ حضور اکرم ﷺ پر تو اللہ تعالیٰ نے نبوت ختم فرمادی، سب سے آخری نبی حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ ہیں، تُو نے پھر قراءتوں کا سہارا لیا۔ ''خَاتَم النَّبِيين'' ''ت'' کے زبر کے ساتھ یا ''خَاتِم النَّبِيين'' ''ت'' کے زیر کے ساتھ ہے۔ جب علماء نے تمام لغت کی کتابیں سامنے رکھ دیں اور کہا کہ ''خَاتَم'' ہو یا ''خَاتِم''، معنی ایک ہی بنتا ہے، اور پھر جب اس آیت قرآنی کا ترجمہ خود حضور اکرم ﷺ نے فرمادیا اور فرمایا: ''أَنَا خَاتِمُ الْأَنْبِيَاءِ وَ أَنْتُمْ خَاتِمُ الْأُمَمِ'' اور پھر دوسری حدیث میں فرمادیا: ''أَنَا خَاتِمُ الْأَنْبِيَاءِ وَ أَنْتُمْ آخِرُ الْأُمَمِ'' اور اس کے بعد فرمادیا: ''لَا نَبِيَّ بَعْدِيْ وَ لَا رَسُوْلَ بَعْدِيْ'' حضور اکرم ﷺ نے علی رضی اللہ عنہ کو بھی فرمایا کہ علی! تم باعتبار قرابت کے میرے ایسے قریب ہو جیسے ہارون علیہ السلام، موسیٰ علیہ السلام کے قریب تھے۔ وہاں بھی میرے نبی ﷺ نے فرمادیا کہ کوئی بدظن اور بدبخت دھوکہ نہ دے سکے۔ تم میرے قریب ہو ہارون علیہ السلام کی طرح، لیکن خبردار! میرے بعد کوئی نبی نہیں۔ ایسا نہ ہو کہ کوئی ہارون علیہ السلام کی طرح تمہیں بھی نبی سمجھ بیٹھے۔

اتنی وضاحتوں کے بعد مرزا نے ایک اور چال چلی، اس نے کہا کہ تم نے تو سمجھا ہی نہیں، میں نے یہ جو کہا ہے کہ میں نبی ہوں۔ اصل بات یہ ہے کہ میں تو ظلّی نبی ہوں اور حضور اکرم ﷺ کے بعد کوئی حقیقی نبی نہیں ہوگا۔ حضور



اکرم ﷺ نے فرمایا کہ میرے بعد نبی نہیں ہوگا۔ مطلب یہ ہے کہ اب کوئی حقیقی نبی نہیں ہوگا، کوئی تشریعی نبی نہیں ہوگا، بلکہ میں حضور اکرم ﷺ کی شریعت کے اوپر چلوں گا اور میں ظل ہوں گا، گویا حضور اکرم ﷺ کا پرتو اور سایہ ہوں۔ اور سایہ کہتے ہیں کہ انسان چل رہا ہے تو اس کا سایہ ہے اب سایہ تو اسی انسان کا ہے، لیکن وہ سایہ ہے اور یہ انسان ہے۔

علماء کرام نے پکڑا اور فرمایا کہ اگر تم ظلی نبی ہو تو پھر صحابہ تم سے زیادہ اقرب ہیں، اگر تم چودہ سو سال کے بعد اتباع کر کے حضور اکرم ﷺ کا ظل بننا چاہتے ہو تو پھر سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ زیادہ حق دار ہیں اور باقی تین خلفاء زیادہ حق دار ہیں، عشرہ مبشرہ زیادہ حق دار ہیں، جب انہوں نے اپنے آپ کے لیے ظل کا دعویٰ نہیں کیا تو تمہاری ظلیت کو ہم کیسے مان لیں؟

ہاں البتہ یہ ہے کہ تم ''ظل'' تو نہیں ہو، بلکہ ''ذل'' ہو۔ ظل اگر ''ظ'' سے ہو تو سایہ کے معنی میں ہوتا ہے اور اگر ''ذ'' سے ہو تو ذلیل کے معنی میں ہوتا ہے، یعنی تم ذلیل ہو، کیونکہ حضور اکرم ﷺ نے خود فرمادیا ہے کہ میرے بعد تیس ایسے دجال ہوں گے جو جھوٹے ہوں گے اور ان سب میں سے ہر ایک دعویٰ کرے گا کہ میں نبی ہوں۔ لیکن خبردار! میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا، میرے بعد کوئی رسول نہیں ہوگا۔ یہ تو اجتماعی عقیدہ ہے کہ اگر ایک آدمی نبی ﷺ کی رسالت کا بھی قائل ہو، نبوت و شریعت کا بھی قائل ہو، لیکن آپ کے خاتم النبیین ہونے کا قائل نہ ہو تو وہ مسلمان نہیں ہوسکتا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بیٹا کے دعویٰ کی تردید میں جب عیسائیوں کے خلاف علماء حق میدان میں نکلے ان سے کہتا کہ تم کیسے بدبخت ہو کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ابن اللہ کہتے ہو؟ اگر عیسیٰ علیہ السلام ابن اللہ ہے تو پھر بتاؤ کہ وہ کب پیدا ہوئے؟ اتنے ہزارہا سال میں تو تم نے خدا کا کوئی اور بیٹا نہیں بنایا اور پھر عیسیٰ علیہ السلام جن کو تم کہتے ہو کہ خدا کا بیٹا ہے، وہ تو خود کہتے ہیں: ﴿اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰهِ﴾ میں تو اللہ کا ایک بندہ ہوں، اللہ تعالیٰ نے مجھے کتاب دی اور مجھے نبی بنایا ہے، (نعوذ باللہ!) میں اللہ کا بیٹا نہیں ہوں۔

آپ ساری انجیل پڑھ لیں، کسی جگہ آپ کو یہ نہیں ملے گا کہ عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے آپ کو اللہ کا بیٹا کہا ہو۔ عیسائی بھی مجازی بیٹے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ مجازی کا کیا معنی؟ ایک آدمی جب کسی کے قریب ہوتا ہے تو آدمی کہتا ہے کہ فلاں شخص کو فلاں نے بیٹا بنالیا ہے۔ بیٹا تو نہیں ہوتا، وہ تو غیر ہے، لیکن محبت اور اکرام و تکریم میں ایسا مرتبہ دیا گیا ہے، لہٰذا وہ



بیٹا ہے۔

دوسرا وہ یہ کہتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ کی صفات کا پرتو ہم عیسیٰ علیہ السلام میں دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں کہ گویا یہ اللہ کا مجازی بیٹا ہے۔ مجازی کا مطلب یہ کہ جیسے اللہ مُردوں کو زندہ کرتا، اندھوں کو آنکھیں دیتا ہے، اللہ کا بھی ماں باپ نہیں ہے، بغیر باپ کے ہے، اسی طرح عیسیٰ علیہ السلام بھی مُردوں کو زندہ کرتے، اندھوں کو بینائی دیتے ہیں اور ایک حصے میں عیسیٰ علیہ السلام کا بھی باپ نہیں ہے، لہٰذا وہ صفات ہمیں عیسیٰ علیہ السلام میں نظر آتی ہیں۔ علماء نے کہا کہ بدبختو! اگر ایسی بات ہے تو پھر تمام انبیاء اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ ہیں۔ ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء کو اللہ نے چن لیا: ﴿اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ﴾ [الانعام:۱۲۴] اگر کسی کے ہاتھ پر مُردہ زندہ ہونے سے وہ خدائی صفات آجاتی ہیں تو پھر یہ تو ابراہیم علیہ السلام میں بھی موجود ہیں، جب ابراہیم علیہ السلام نے اللہ سے پوچھا: ﴿رَبِّ اَرِنِيْ كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى ؕ قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ ؕ قَالَ بَلٰى وَلٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِيْ﴾ [البقرۃ:۲۶۰] اللہ پاک! مجھے تو دکھائیں کہ مُردہ کیسے زندہ ہوتا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام سے فرمایا کہ کیا ابھی تمہارا اس پر ایمان ویقین نہیں ہے کہ میں مُردوں کو زندہ کرنے والا ہوں؟ ابراہیم علیہ السلام نے عرض کیا: ہاں! میرا ایمان ہے، لیکن میں اپنے علم الیقین کو عین الیقین میں بدلنا چاہتا ہوں کہ میں مشاہدہ کرلوں کہ مُردہ کا احیاء کیسے ہوتا ہے؟ فرمایا: ابراہیم! چار پرندے لے لو، پھر ان کے ٹکڑے ٹکڑے کردو، ان کا گوشت آپس میں ملا دو، پھر اس گوشت کو چار حصوں میں تقسیم کر کے مختلف پہاڑوں پر رکھ دو اور پھر ایک جگہ کھڑے ہو جاؤ اور ان کو پکارو تو پھر دیکھنا کہ تمہارے سامنے کیسے زندہ ہو کر آجائیں گے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اسی طرح کیا اور جب بلایا تو پرندے زندہ ہو گئے۔ علماء نے کہا کہ یہی اگر دلیل ہے تو پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بھی خدا یا خدا کا بیٹا مانو۔

اسی طرح آپ دیکھیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کے حکم سے لکڑی میں حیات پیدا کردی کہ جس ستون کے ساتھ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ٹیک لگا کر خطبہ پڑھتے تھے، حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے جب خطبہ دینا چھوڑ دیا تو اس تنے سے باقاعدہ رونے کی آواز آنے لگی۔ اب ہم کیا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کا بیٹا بنالیں؟

ہمیشہ یاد رکھیں کہ یہ جتنے باطل اور گمراہ کا فرفرقے ہوتے ہیں، اسی طرح کے جھوٹے دلائل اکٹھے کر کے اور قرآن وحدیث میں تحریف کر کے اپنے مطلب کی آیت کا ایک ٹکڑا لے کر باقی سارا قرآن چھوڑ دیں گے، اس پر عمل نہیں کریں گے، صرف اس کو لوگوں کے سامنے پیش کر دیں گے، جیسے عیسائیوں نے کہا کہ دیکھیں جی! قرآن میں آیا

ہے: ﴿إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ﴾ [الحجر: ۹] (تحقیق ہم نے یہ قرآن اُتارا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں)۔ یہاں اللہ نے جمع کا صیغہ استعمال کیا ہے اور جمع کے کم از کم تین ہوتے ہیں، لہٰذا ہمارا تثلیث کا عقیدہ ٹھیک ہو گیا۔

اسی طرح کئی آیات ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم حفاظت کرنے والے ہیں، ہم قرآن کو نازل کرنے والے ہیں۔ یہ جمع ہے اور جمع کم از کم تین عدد کے لیے ہوتی ہے۔ لہٰذا عیسائیوں نے کہا کہ ان میں سے ہر ایک خدا ہے اور تینوں قرآن اور ذکر کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ اب ایک آیت پیش کر دی، لیکن جہاں قرآن نے کہا: ﴿إِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ﴾ [حٰم السجدۃ: ٦] اس آیت کا انکار کر دیا، اور ﴿قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ﴾ کا بھی انکار کر دیا، سارے قرآن کو چھوڑ دیا اور لوگوں کو دھوکہ دینے کے لیے ایک آیت لے لی اور کہا کہ دیکھو جی! قرآن میں لکھا ہوا ہے کہ اللہ کا صیغہ جمع کے لیے استعمال ہوا ہے۔

حالانکہ یاد رکھو! قاعدہ یہ ہوتا ہے کہ کبھی جمع کا صیغہ تعظیم کے لیے بھی ہوتا ہے، جیسے دنیا میں بادشاہ کسی کو آرڈر لکھتے ہیں تو وہ یہ نہیں لکھتے کہ میں نے لکھا ہے، بلکہ وہ لکھتے ہیں کہ ہم نے یہ لکھا ہے۔ حالانکہ آرڈر تو ایک آدمی نے کیا ہوتا ہے، وہ جمع کا صیغہ بطور عظمت و تعظیم کے استعمال ہوتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی ذات تو واحد ہے، لیکن عظمت کے لیے اللہ تعالیٰ کی ذات کے لیے بھی جمع کے صیغے استعمال ہوئے ہیں۔

اس لیے پروردگارِ عالم نے قرآن پاک کی اس آیت میں تین انداز میں رد بیان فرما دیا ہے۔ سب سے پہلے تو فرمایا کہ اللہ پاک کی ذات ہے اور جاہلوں کی طرف توجہ کی ضرورت ہی نہیں۔ اس کے بعد فرمایا کہ آسمانوں اور زمینوں میں جو ہے سب اس کا مملوک ہے اور عبد ہے تو عبدیت اور ابنیت جمع ہی نہیں ہو سکتی۔ جب ساری کی ساری مخلوق اسی کی ہے اور آسمان اور زمین کا ذرّہ ذرّہ اس کا ہے تو اگر تمہیں عقل ہوتا تو اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراتے۔

مفسر رحمہ اللہ اصل مضمون کی طرف عود کر رہے ہیں کہ ﴿قَانِتِينَ﴾ کے معنی میں جو قول حضرت مجاہد رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے، وہی قول ابن جریر رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے جیسا یہ سب اقوال کو جمع کرنے والا قول ہے، کیونکہ قنوت کا معنی ہے: اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرنا اور خود کو اللہ تعالیٰ کے سامنے جھکا دینا۔ خواہ اطاعت شرعی طور پر کرے، جیسا کہ مومن کرتا



ہے کہ وہ تمام احکام میں اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل کرتا ہے، یا تکوینی طور پر کرے، جیسے تقدیر کا تو وہ بھی پابند ہے۔ اللہ تعالیٰ کو ہر چیز سجدہ کرتی ہے جو آسمانوں اور زمین میں ہے، چاہے وہ خوشی سے اطاعت کرے یا مجبوراً کرے۔ تقدیر کے حکم سے کوئی نہیں نکل سکتا۔ اسی طرح ہر چیز کے سائے صبح یا شام کو کبھی چڑھ رہے ہیں اور کبھی اُتر رہے ہیں اور کبھی پھیل اور کبھی سکڑ رہے ہیں، یہ سب دراصل اللہ تعالیٰ کو سجدہ اور اس کی اطاعت کر رہے ہیں۔ کوئی چیز اللہ تعالیٰ کے حکم اور اس کی اطاعت سے نہیں نکل سکتی۔

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بعض احادیث مبارکہ میں یہ ذکر کیا گیا ہے:

''كُلُّ حَرْفٍ مِنَ الْقُرْآنِ يُذْكَرُ فِيهِ الْقُنُوتُ فَهُوَ الطَّاعَةُ.'' [مسند احمد بن حنبل، رقم: ۱۱۷۱۱]

جہاں جہاں قرآن پاک میں لفظ قنوت آیا ہے وہاں اس سے مراد اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور فرمانبرداری ہے۔

ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ قنوت کے معنی اطاعت کے ہیں اور جہاں تک اس حدیث کا تعلق ہے تو حدیث ضعیف ہے، ضعف بھی شدید ہے۔ اس لیے اس پر کوئی اعتماد نہیں کیا جا سکتا اور جو اس حدیث کے مرفوع ہونے کا انکار کرتے ہیں ہو سکتا ہے کہ کسی صحابی یا تابعی کا قول مبارک ہو۔ اس قسم کی اسناد کے ساتھ بہت سی آیات مبارکہ کی تفسیر منقول ہے، لیکن ان کے اندر نکارت پائی جاتی ہے؛ کیونکہ ان کی سند میں ضعف ہوتا ہے۔

﴿بَدِيعُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ﴾ [البقرۃ: ۱۱۷] اور کہیں ﴿فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ﴾ [الزمر: ۴۶] آتا ہے۔ ''بدیع'' یا ''فطر'' کا لغوی معنی ہے ایسی چیز بنانا جس کا پہلے کوئی نمونہ اور مثال نہ ہو۔ جب اللہ تعالیٰ نے آسمان اور زمین بنایا تو اس سے پہلے نہ کوئی آسمان و زمین تھا اور نہ ان کی کوئی مثال تھی۔

بدعت کا لغوی اور حقیقی اطلاق:

ابوداؤد شریف میں روایت ہے:

''إِنَّ كُلَّ مُحْدَثَةٍ بِدْعَةٌ، وَكُلَّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ.'' [سنن ابی داود، رقم: ۴۶۰۷]

دین کے اندر کوئی نئی چیز پیدا کی جائے جس کی اصل قرآن وحدیث پاک اور اقوال صحابہ میں نہ ہو تو وہ چیز بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے۔

ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ بدعت شرعی ہے اور بدعت کا لفظ کبھی کبھی بطور لغت کے بھی استعمال کیا جاتا ہے،



جیسا کہ تراویح جب رمضان المبارک میں پڑھی جاتی تھی تو صحابہ رضی اللہ عنہم متفرق پڑھتے تھے، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اگر ان تمام صحابہ کو ایک قاری پر جمع کر دیا جائے تو اچھا ہے۔ چنانچہ حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ کو بلا کر فرمایا کہ آپ سب کو ایک مصلے پر تراویح پڑھایا کرو۔ حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ نے پڑھانا شروع کر دیں تو کسی صحابی نے انکار نہ کیا۔ ایک تو خلیفہ راشد کا حکم ہو گیا اور دوسرا جب کوئی صحابی بھی انکار نہ کرے تو اجماع صحابہ ہو جاتا ہے، اور جب صحابہ رضی اللہ عنہم کا اجماع ہو جائے تو پھر وہ حکم مقامِ سنت پر آ جاتا ہے، پھر اس کا کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یہ ہے تو نیا طریقہ، لیکن اچھا ہے۔ اب اس کو بدعت نہیں کہہ سکتے؛ کیونکہ خلیفہ راشد کا عمل تو ہوتا ہی سنت ہے، بدعت ہو ہی نہیں سکتا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے باعتبار لغت کے کہا تھا کہ ایک نئی چیز ہے؛ کیونکہ اس سے پہلے ایک امام پر صحابہ رضی اللہ عنہم جمع نہیں ہوئے تھے۔

بعض علماء نے فرمایا کہ ''بَدِیْع''، ''فَعِیْل'' کے وزن پر ''مُبْدِع'' کے معنی میں ہے، جیسا کہ ''أَلِیْم''، ''مُؤْلِم'' کے معنی میں ہے۔

ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس آیت (اللہ تعالیٰ اولاد سے پاک ہے) کے بعد زمینوں اور آسمانوں کے پیدا کرنے کا ذکر فرمایا۔ اس میں بھی نصاریٰ کی تردید ہے کہ تم تو کہتے ہو کہ عیسیٰ علیہ السلام کو بغیر باپ کے کیسے بنایا؟ جس نے آسمانوں اور زمینوں کو بغیر مثال کے پیدا کر دیا، وہ عیسیٰ علیہ السلام کو بھی پیدا کرنے پر قادر ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی کمال قدرت اور عظمت وسلطنت کا یہ عالم ہے کہ جب وہ کسی چیز کا ارادہ فرمالیں تو بس ایک ہی دفعہ حکم دیتے ہیں، وہ ہو جاتی ہے۔ تم عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش پر کیوں حیران ہو رہے ہو؟ یہاں بھی تو ہم نے حکم دیا تو ہو گیا۔

﴿وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ لَوْلَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ اَوْ تَاْتِيْنَآ اٰيَةٌ ۭ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّثْلَ قَوْلِهِمْ ۭ تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ ۭ قَدْ بَيَّنَّا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ۝﴾ [البقرۃ: ۱۱۸]

''اور وہ لوگ جو کچھ نہیں جانتے کہتے ہیں: کیوں نہیں بات کرتا ہم سے اللہ (کہ تم اس کے رسول ہو) یا کوئی نشانی ہمارے پاس کیوں نہیں آتی؟ اسی طرح ان کی بات کی طرح کہا تھا ان لوگوں نے جو ان سے پہلے تھے، ان کے دل ایک جیسے ہیں، ہم نے یقین رکھنے والی قوم کے لیے نشانیاں واضح کر دی ہیں۔''

آیات کا ربط:

گزشتہ آیات میں اللہ پاک نے فرمایا کہ یہودی و نصرانی جو اپنے آپ کو اہل کتاب کہتے ہیں، ان کا توحید کے بارے میں یہ عقیدہ ہے کہ انہوں نے اللہ کے بیٹے بنا دیئے۔ اب ان آیات میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ان کا نبوت کے بارے میں بھی حال دیکھو! ان کے بارے میں فرمایا کہ یہ نبوت کے بارے میں علم نہیں رکھتے؛ کیونکہ اس علم کا کیا فائدہ جو حقیقت تک نہ پہنچائے۔ اس لیے آدمی کتنے بڑے علوم کا ماہر ہو جائے، لیکن اگر وہ اللہ کی توحید اور حضور اکرم ﷺ کی نبوت و رسالت کا عقیدہ نہیں سمجھا تو وہ جاہل ہے۔ اصل علم تو وہ ہے جس سے آدمی اپنے مالک کو پہچانے اور اس کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کو پہچانے اور اسی طرح اللہ تعالیٰ کے اوامر و نواہی کا علم حاصل کرے۔ اگر اس کے پاس ایسا علم ہے جو اسے دنیاوی معاملات میں فائدہ تو پہنچاتا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات اور انبیاء و رسل کی تعلیمات میں فائدہ نہیں پہنچاتا تو اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔

یہود و نصاریٰ کے دو دعووں کا رد:

پہلا سوال: اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ وہ لوگ جو نہیں جانتے، یعنی جنہیں اللہ تعالیٰ کی توحید اور ذات و صفات کا علم نہیں، وہ جاہل یہ کہتے ہیں کہ اللہ پاک ہم سے خود براہِ راست گفتگو کیوں نہیں کرتے؟ یعنی انبیاء جو فرماتے ہیں کہ ہم پر وحی آتی ہے، اللہ تعالیٰ فرشتے بھیجتے ہیں اور کبھی فرشتے کے بغیر بھی دل میں القاء فرماتے ہیں وغیرہ۔ اب یہ کافر کہنے لگے کہ اللہ تعالیٰ ہم سے بات کیوں نہیں کرتے؟ (نعوذ باللہ!) یہ اتنا بڑا جہل ہے جیسے آج اگر کوئی وزیر حکم لے کر آئے اور کوئی کہے کہ یہ حکم میں تب مانوں گا جب بادشاہ خود مجھے آکر کہے۔ اور اگر بادشاہ ہر آدمی کو خود حکم پہنچاتا پھرے تو یہ بادشاہ کی شان ہوگی؟ اس لیے قرآن پاک نے ان کے اس جاہلانہ سوال کا جواب ہی نہیں دیا؛ کیونکہ یہ سوال قابلِ جواب ہی نہیں تھا، یہ تو جہل مرکب ہے۔ اللہ کو کیا ضرورت ہے کہ خود آکر بات کریں؟ جبکہ دنیا کے بادشاہ کو ضرورت نہیں ہوتی کہ وہ ہر ایک سے خود آکر بات کرے۔

دوسرا سوال: کفار نے کہا کہ ایسے کوئی واضح نشان آئے جو نبوتِ محمدیہ پر دلالت کرے۔ پہلا سوال جاہلانہ تھا، اللہ تعالیٰ نے اس کا جواب ہی نہیں دیا، البتہ دوسرے کا جواب اللہ تعالیٰ نے دیا، فرمایا: میرے نبی! یہ تو جاہل ہیں، کہتے ہیں کہ ایک نشانی لے آؤ، تحقیق ہم نے کھول کھول کر آپ کو نشانیاں دیں، ہم نے آپ کو کیا ایک معجزہ دیا ہے؟

نہیں، بلکہ ہم نے تو آپ کو سماوی وارضی معجزات عطا کیے، ہم نے آپ کو ایسے بھی معجزات عطا فرمائے کہ جن کا تعلق نباتات، جمادات، حیوانات، انسانوں، زمینوں اور پانی تک ہے۔

بعض علماء نے فرمایا ہے کہ اس آیت سے مراد معجزات ہیں اور بعض علماء نے کہا کہ ان آیات سے مراد قرآن مجید کی کھلی نشانیاں ہیں۔ لیکن یہاں معجزات ہی مراد ہیں؛ کیونکہ سب سے پہلے جوان کا سوال تھا وہ نشانی کے بارے میں تھا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میرے مدنی! ان کی باتیں سن کر آپ غمگین نہ ہوں، ان سے پہلے جو کافر اور مشرک گزرے ہیں، انہوں نے بھی ایسے سوالات کیے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے پاس براہِ راست خود فرشتہ کیوں نہیں بھیجا؟ اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ خود بات کیوں نہیں کرتے؟ یا فلاں نشانی خود کیوں نہیں عطا کی؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ان کے دل گویا ایک دوسرے کے بالکل متشابہ ہیں، حالانکہ جو مشرکین مکہ میں پیدا ہوئے وہ نوح علیہ السلام کے زمانہ کے کافروں کو نہیں ملے، لیکن باتیں دونوں کی ایک ہی ہیں۔ گویا کہ ان کے ان کے ساتھ ملے ہوئے ہیں، جیسے انہوں نے انبیاء کو شاعر کہا، اسی طرح انہوں نے بھی کہا۔ انہوں نے ساحر، جادوگر، کاہن، جھوٹا کہا، اسی طرح انہوں نے بھی انبیاء کو یہ سب کچھ کہا۔ دوسری جگہ فرمایا: ﴿أَتَوَاصَوْا بِهِ﴾ یہ ایک دوسرے کو وصیت کر گئے تھے کہ یہ بات ہر آنے والے نبی سے کہنا۔

ایک لفظ تشابہ ہوتا ہے اور ایک تشبیہ۔ دونوں میں تھوڑا سا فرق ہے۔ تشبیہ، مشبہ اور مشبہ بہ کے درمیان فرق ہوتا ہے، یعنی مشبہ بہ عموماً مشبہ سے بڑھا ہوتا ہے، جیسا کہ عام طور پر آپ محاورات میں مثال دیکھتے ہیں کہ زید ایسے ہے جیسے شیر۔ تو اب شیر طاقت میں بڑھا ہوا ہے، یعنی زید کی شجاعت کو تشبیہ دی جا رہی ہے۔ تشابہ کے اندر یہ نہیں ہوتا، یہاں دونوں برابر ہوتے ہیں۔ اس لیے یہاں اللہ تعالیٰ نے تشبیہ نہیں، بلکہ تشابہ کا لفظ لائے ہیں۔ جیسے ان کے دلوں میں کفر وعناد اور پتھر سے زیادہ سختی تھی، اسی طرح مشرکین عرب کے دل بھی ایسے ہی سخت ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ہم نے تو بڑی بڑی نشانیاں کھول کر رکھ دی ہیں، لیکن ان نشانیوں کا فائدہ صرف ان کو ہوتا ہے جو ایمان لانے والے ہوتے ہیں، جو یقین کرنے والے ہوتے ہیں۔ جس آدمی نے انکار ہی کرنا ہو، اس کے لیے لاکھ نشانیاں بھی تھوڑی ہیں، اس کے لیے لاکھوں دلائل بھی بے کار ہیں اور جس کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت نصیب فرمائی ہو، اور جس کے سینے کو اللہ تعالیٰ اسلام کے لیے کھول دے، اس کے لیے معمولی سی بات ہدایت کا ذریعہ بن

جاتی ہے۔

مشرکین مکہ کی ہٹ دھرمی:

محمد بن اسحاق سند کے ساتھ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رافع بن حر حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں آیا اور کہنے لگا: یا محمد! اگر آپ واقعی اللہ کے رسول ہیں، جیسے آپ کہتے ہیں کہ میں اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں تو اللہ سے کہیں کہ ہمارے ساتھ براہِ راست کلام کریں اور ہم اللہ کا کلام سنیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل کیں اور ارشاد فرمایا کہ یہ لوگ علم نہیں رکھتے۔

مجاہد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ سوال رافع بن حر کا نہیں، بلکہ نصرانیوں کا سوال تھا کہ خدا خود ہمارے ساتھ بات کرے؛ کیونکہ اس سے پہلے جو آیات تھیں وہ ساری نصرانیوں کے رَد میں تھیں۔ اس لیے سیاق کا تقاضا یہی ہے کہ یہ آیت نصاریٰ کے رد میں ہے۔

قرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ لکھا ہے کہ وہ یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہم سے خود کیوں نہیں کہتے کہ محمد ﷺ میرے نبی ہیں؟ اللہ کو تمہاری کیا ضرورت ہے کہ تمہارے ساتھ بات کرے؟ بعض لوگوں کے دلوں میں یہ بات آجاتی ہے کہ اللہ اگر بات کر لیتے تو اچھا تھا، یہ مسلمان ہو جاتے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ جانتے ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ کلام فرمائیں گے تو بھی یہ نہیں مانیں گے، جیسے موسیٰ علیہ السلام سے قوم نے کہا تھا، لیکن اللہ تعالیٰ سے کلام کرنے کے بعد کہنے لگے کہ کلام تو سنا ہے، لیکن دیکھا تو نہیں ہے۔ تو اس لیے اللہ تعالیٰ نے ایسے سوالات جو خاص جاہلانہ تھے، ان کے جواب دینے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی۔

ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ظاہر سیاق کا تقاضا یہی ہے کہ حضور اکرم ﷺ کی نبوت کے بارے میں اللہ تعالیٰ ہم سے خود بات کیوں نہیں کرتے؟ جیسا کہ اللہ پاک نے دوسری جگہ قرآن میں ارشاد فرمایا کہ جب ان کو، یعنی حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو کوئی معجزہ دیتے ہیں، نشانی پہنچتی ہے تو یہ مشرکین مکہ کہتے ہیں کہ یہ معجزہ تو ہم نہیں مانتے، ان کو پہلے انبیاء جیسے معجزات کیوں نہیں ملے؟ موسیٰ علیہ السلام کو ید بیضا اور عصا ملا تھا، ان کو کیوں نہیں ملا؟ جب ان کو ملا تھا تو وہاں بھی نہ ماننے والوں نے نہ مانا۔ اگر حضور اکرم ﷺ کو وہ سانپ والا معجزہ بھی دے دیتے تو کوئی بڑی بات نہ تھی، لیکن نہ ماننے والے پھر بھی نہ مانتے؛ کیونکہ مشرکین مکہ اس قسم کے سوالات کرتے تھے۔

ایک بزرگ اور ان کی بیوی:

ایک مشہور مثال ہے کہ ایک پیر صاحب تھے، ان کی بیوی اس کی پیری نہیں مانتی تھی...... کیونکہ بیویاں اکثر مانتی نہیں ہیں۔ ویسے حقیقت میں ہوتا بھی ایسا ہے کہ بیوی عام طور پر (خاوند کتنا بڑا بزرگ بن جائے) بیوی بزرگی نہیں مانتی...... بہرحال پیر صاحب کہیں کہ دیکھو! اتنے لوگ میرے مرید ہیں، لاکھوں لوگ مجھے سلام کرتے ہیں اور تم ایسی مٹی کی بنی ہوئی ہو کہ میری کسی بات کا تم پر اثر نہیں ہوتا۔ بیوی کہتی ہے: اچھا چھوڑو! تم جیسے بڑے پیر دیکھے ہیں، اگر تم واقعی بڑے پیر ہو تو مجھے اُڑ کر دکھاؤ۔ ایک دن پیر صاحب کو غصہ آیا تو اس نے اپنے مکان کے اوپر اُڑ کر دکھادیا۔ اب جناب پیر صاحب بڑے خوش ہو کر آئے کہ آج تو بیوی میری بزرگی مان ہی لے گی۔ انہوں نے کہا کہ دیکھو! آج تو میں اُڑ رہا تھا۔ اس نے کہا: اچھا! اس لیے ٹیڑھے لگ رہے تھے، اس لیے تمہاری اُڑان ٹھیک نہیں تھی؛ کیونکہ کوئی اور پیر ہوتا تو سیدھا اُڑتا۔

جب نہ ماننا ہو تو اُڑتا ہوا آدمی بھی ٹیڑھا نظر آئے گا۔ اسی لیے آدمی نے نہ کھیلنا ہو تو آنگن ٹیڑھا نظر آتا ہے۔

﴿إِنَّآ أَرْسَلْنَٰكَ بِٱلْحَقِّ بَشِيرًا وَنَذِيرًا ۖ وَلَا تُسْـَٔلُ عَنْ أَصْحَٰبِ ٱلْجَحِيمِ ﴿١١٩﴾﴾ [البقرۃ:۱۱۹]
''(اے محمد!) ہم نے آپ کو سچا دین دے کر رسول بنا کر بھیجا ہے خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا اور آپ سے دوزخیوں کا نہیں پوچھا جائے گا۔''

ربط آیات:

اللہ تعالیٰ نے گزشتہ آیات میں فرمایا کہ یہود اور مشرکین توحید اور نبوت و رسالت دونوں میں گم کردہ راہ پر ہیں اور ان کے پاس کوئی دلائل نہیں، نہ ان کے پاس کوئی دلیل عقلی ہے نہ نقلی، اور وہ رسالت کی تصدیق کے لیے مَن چاہی نشانیوں کا مطالبہ کرتے ہیں۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ نوح علیہ السلام کے زمانے سے لے کر حضور سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ تک قرآن خود یہ بیان فرما رہا ہے کہ ان سب کے سوال ایک جیسے تھے۔ مطالبات ایک جیسے ہیں، ایسا کیوں تھا؟ حالانکہ درمیان میں اتنے بڑے

فاصلے ہیں، آج تو مواصلات کے ذرائع نے دنیا کو سکیڑ کر ایک ملک بنا دیا ہے، جدید سائنسی آلات کے ذریعے آپ پوری دنیا سے رابطہ کر سکتے ہیں، لیکن پہلے دور میں تو یہ تصور بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ ایک بات شام والے کہیں اور وہی بات مکہ والے کہیں؛ کیونکہ درمیان میں کوئی ایسا رابطہ نہیں تھا کہ ان کے درمیان ذہنی ہم آہنگی ہو سکتی ہو۔ پھر ان سوالات کا ایک جیسے ہونا تو گویا دل ان کے ایک ہیں۔ اور کسی جگہ قرآن مقدس میں فرماتا ہے: ﴿أَتَوَاصَوْا بِهِ﴾ یوں معلوم ہوتا ہے کہ گویا یہ ایک دوسرے کو وصیت کرتے چلے گئے کہ تم بھی یہی بات کہنا۔

جدید عقلمندوں کی بدحواسی:

علماء کرام تمام کتب سابقہ اور تمام کتب موجودہ کا مطالعہ کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ دراصل تمام لوگ اپنے عقل اور ہوا کے متبع تھے، ہر چیز کو عقل کے ترازو میں تولنا چاہتے تھے اور انہوں نے کہا کہ یہ یوں دیکھیں کہ آج دنیا چاہے ترقی پر چلی گئی، لیکن آج بھی کافر اسی عقل کے چکر میں مبتلا ہے، وہ کہتا ہے کہ ایک نبی سرزمین مکہ میں پیدا ہوتے ہیں، وہ نبوت کا دعویٰ کرتے ہیں اور ان پر اللہ کی وحی آتی ہے تو ہم پر کیوں نہیں آتی؟ وہ کہتے ہیں کہ کیا وجہ ہے کہ سرزمین عرب کو تو اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء کے ذریعے منتخب فرمالیا، لیکن ایشیاء کے ممالک اور دوسرے ممالک کو اللہ تعالیٰ نے منتخب نہیں فرمایا۔

آج بھی جب آپ ان کو اسلام کی تعلیمات سے روشناس کرائیں، اسلام کی حدود، بنیادی عقائد کے بارے میں قائل کرنا چاہیں تو بالکل وہی بات کریں گے جیسا کہ آپ نے قرآن مقدس میں پڑھا ہے: ﴿أَجَعَلَ الْآلِهَةَ إِلَٰهًا وَاحِدًا ۖ إِنَّ هَٰذَا لَشَيْءٌ عُجَابٌ ۝﴾ [ص:۵] یہ کیسا پیغمبر ہے جو کہتا ہے کہ سارے خداؤں کو چھوڑ دو اور ایک اللہ کو مان لو، یہ تو عجیب بات ہے! عقل میں نہیں آتی کہ ایک اللہ سارے جہان کا کام کر گزرے۔

آج ملکوں کے پاس بڑی طاقت ہے، مشینری ہے، میڈیا ہے، پھر بھی وہ اپنے ملک کے کام نہیں کر سکتے تو ایک اللہ سارے ملکوں کے کام کیسے کر سکتا ہے؟ ایک اکیلا زمیندار جس کی کئی ایکڑ زمین ہو، وہ اکیلا کاشت نہیں کر سکتا، اس کاشت کے اندر بھی نقائص، مثلاً کھاد صحیح نہیں ڈالی گئی، بیج نہیں تھا یا پانی نہیں پہنچایا گیا وغیرہ۔ تو ایک خدا ساری کائنات اور ایسی چیزیں جو ہم نے دیکھی ہی نہیں، جیسے زہرہ، مریخ، مشتری وغیرہ اتنے بڑے کرے ہیں کہ کئی گنا بڑی ہماری دنیا بڑھا دی جائے تو پھر بھی ہماری دنیا چھوٹی ہے، ان سب کا نظام ایک خدا چلاتا ہے، یہ بات عقل میں



نہیں آتی۔

اور اسی طرح ہمارے دماغ میں یہ بات بھی نہیں آتی کہ ساری کائنات کے الٰہ (جو کائنات کے ذرّے ذرّے کا مالک ہے) نے ہم جیسے ایک بندے کو نبی بنا دیا، جو کھانا بھی کھاتا ہے اور بازاروں میں بھی جاتا ہے۔ اس لیے وہ کہتے ہیں کہ ہمیں سمجھ نہیں آتی۔ اگر خداوند قدوس نے اپنی رسالت کا کوئی کام ہی لینا تھا تو کسی بڑے آدمی کو منتخب کرتے۔ کسی سرمایہ دار، ساہوکار، دولت مند تاجر کو، جس کے پاس پیسہ ہوتا اور اللہ تعالیٰ کے احکام لوگوں تک پہنچانے کے ذرائع بھی رکھتا۔ اس نے تو ایک یتیم مکہ کو جس کے گھر میں دیا نہیں جلتا، جن کے اپنے گھر میں کھانا اور اتنا پیسہ نہیں کہ دائی کو دیا جا سکے۔ جس کا اپنا یہ عالم ہے کہ کبھی دادا کی کفالت میں اور کبھی چچا کی، جن کے اپنے معاش کا کوئی مستقبل نہیں، مکہ والوں کی بکریاں چراتے، کبھی محنت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے اتنے بڑے بڑے لوگ ولید بن مغیرہ، عتبہ، شیبہ جو اس زمانے میں بھی سو سو اونٹ ذبح کر کے اس کے شوربے میں حاجیوں کو ثرید بنا کر کھلاتے تھے، ان لوگوں کو خدا نے نبی نہیں بنایا اور یتیم مکہ کو نبی بنا دیا۔ ہماری عقل میں یہ بات نہیں آتی۔

شبہات کا جواب:

یہ سارا مسئلہ اس لیے اُلجھتا ہے کہ ہر آدمی سمجھتا ہے کہ میرے پاس جو عقل ہے وہ اتنی بڑی ترازو اور روشن درہبر ہے کہ غلطی نہیں کر سکتی۔ اسی لیے آج بھی آپ دیکھیں کہ کوئی آدمی غلطی بھی کر رہا ہو تو بڑی مشکل سے مانے گا کہ کیوں جی! میں کوئی غلط کہہ رہا ہوں؟ آپ کو سمجھ ہے اور مجھے سمجھ نہیں ہے؟ یہ ساری بنیاد اس سے چلی ہے کہ سب سے بڑا رہبر انہوں نے اپنی عقل کو مانا کہ جب آدمی اپنی عقل کے مطابق فیصلہ کرتا ہے تو اپنی ہوائے نفس، خواہشات کے تابع ہو جاتا ہے اور شیاطین جن وانس اس کو مزید گمراہیوں کے راستے کی طرف بھٹکاتے چلے جاتے ہیں اور سیدھے راستے کی طرف آنے ہی نہیں دیتے۔

حالانکہ دنیا کے اندر آپ دیکھتے ہیں کہ گندم کا وزن کرنا ہو تو اس کا علیحدہ ایک ترازو ہوتا ہے اور گنے کا وزن کرنا ہو تو اس کے لیے علیحدہ ترازو ہوتا ہے۔ مثلاً ٹرک لا کھڑا کر دیں گے، وہ اسی وقت آپ کو بتائے گا کہ ٹرک کا وزن اتنا ہے اور گنے کا وزن اتنا ہے۔ آپ چاندی اور سونا وزن کریں، اسی طرح زمرد، ہیرے وغیرہ کو وزن کرنا ہو تو چھوٹے اور بڑے نفیس سے کمپیوٹرائزڈ ترازو سے کرتے ہیں۔ اب جس ترازو میں ہیرا تولا جاتا ہے، اس میں اگر آپ گنے کا



ایک ٹرک لے کر کھڑا کر دیں تو کیا نتیجہ نکلے گا؟ وہ ترازو وہیں ٹوٹ جائے گا اور پھر کہنے والا یہ کہے کہ یہ بڑا بیکار ترازو ہے۔ کہتے تھے کہ یہ بڑا قیمتی ترازو ہے اور اس میں بڑے ہیرے تولتے ہیں، میرا تو یہ گنے کا ٹرک بھی وزن نہیں کر سکا، اور کہتے ہیں کہ اس میں کروڑوں روپے کے ہیرے تلتے ہیں۔ اصل وجہ یہ ہے کہ آدمی نے اپنی عقل کے ترازو میں دنیاوی معلومات کو تولنا تھا، مگر اس نے اللہ تعالیٰ کی اُلوہیت کو بھی اسی میں تولنا شروع کر دیا۔ نتیجہ یہ کہ عقل مسخ ہو گئی۔ اصل بات یہ تھی کہ خدا کی اُلوہیت اور انبیاء کی نبوت و رسالت کو سمجھنے کے لیے اس کی کتاب والے ترازو میں سمجھے، جو میرے اللہ تعالیٰ نے کتاب اور میزان کو اُتارا تھا، اس ترازو میں دیکھتے تو بات سمجھ آ جاتی۔

جن لوگوں نے اپنی عقل کو اس روشنی کے تابع کر دیا جو قرآن وسنت کی روشنی ہے تو ایک منٹ میں مسئلہ حل ہو گیا۔ حبشہ سے بلال رضی اللہ عنہ آئے اور فارس رضی اللہ عنہ سے سلمان آئے، ان حضرت کو سمجھ گئے، اسی طرح دنیا کے کونے کونے سے لوگ آئے، عرب و عجم اور فارس سے آئے، ہر قسم کی مخلوق آئی اور انہوں نے آ کر دیکھا کہ جب یہ رسول دعویٰ کرتا ہے کہ میں اللہ کا رسول ہوں تو اسے اللہ کی کتاب کی روشنی میں جانچا جائے، اس کو تو ہم پھر اسی کتاب کی روشنی میں جانچیں گے جو رسول لے کر آیا ہے اور جن باتوں کا یہ کتاب حکم دیتی ہے، اس پر یہ رسول کاربند ہے کہ نہیں؟ ان احکام پر چلنے والا ہے کہ نہیں؟ ان صفات سے موصوف ہے کہ نہیں؟ جب یہ سب باتیں ان میں پائیں تو سمجھ لو کہ اللہ کا سچا بھیجا ہوا رسول ہے کہ جو اللہ نے اسے حکم دیا ہے، وہ کر کے دکھا رہا ہے اور جس سے اللہ تعالیٰ نے منع کیا ہے، اس سے رک رہا ہے۔

اب اس کو اپنی عقل کی ترازو میں تو لیں کہ انسان ہے، کھانا کھاتا ہے، بخار آتا ہے اور بخار بھی ایسا کہ اگر ہم جیسے لوگوں کو آئے تو ہم تو ختم ہو جائیں، یعنی جو دو آدمیوں کو بخار آئے، وہ اللہ کے نبی کو آتا ہے۔ کیونکہ جتنی شان بڑی ہے، اتنی آزمائش بھی بڑی ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: یہ تو جاہل ہیں، ان کے علوم دنیا سے ہمیں کیا واسطہ ہے؟ ہم نے ان کو پیدا کر کے بھیجا تھا کہ جن وانس میری عبادت کریں تو جب انہوں نے میری ذات کا علم حاصل نہیں کیا اور میرے بھیجے ہوئے پیغمبر اور رسولوں کو نہیں پہچانا تو ان کے علم کا کیا فائدہ؟ یہ تو جاہل ہیں۔

پھر یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان سے بات کرے۔ اللہ ان کا کوئی محتاج ہے؟ اللہ تو اس بات پر بھی قادر ہے کہ ان سب کو فنا کر کے ایک اور قوم پیدا فرما دے، پھر ان کی کوئی مثل بھی دنیا کے اندر نہ ملے تو اسے کیا پڑی ہے کہ ایک ایک سے بات کرے اور کہے کہ میرے نبی کو مان لو۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ نشانیاں کہتے ہیں؟ نشانیاں تو ہم نے

اتنی دی ہیں کہ اگر کوئی حق تلاش کرنا چاہے تو دھوکہ میں نہیں رہے گا، لیکن یہ معنی نہیں ہوتا کہ ہر آدمی جو مطالبہ کرے، اس کی بات پوری کرو تو پھر خدا نہ ہوا، بلکہ لوگوں کے تابع ہو گیا۔ (نعوذ باللہ!)

''بشیر'' اور ''نذیر'' کی تفسیر:

ان آیات میں ارشاد ہے: ﴿اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا﴾ [فاطر: ۲۴] میرے مدنی! ہمیں کیا ضرورت ہے کہ ہم ان کے مطالبے پورے کریں؟ آپ کو جو ہم نے بھیجا ہے حق کے ساتھ، یہی بہت بڑی نشانی ہے۔ ہم نے جب کہا کہ ہم نے رسول بنایا ہے اور ہم نے بھیجا ہے تو بات ختم ہوگئی۔ پھر کون ہے اعتراض کرنے والا؟ ہم نے آپ کو بھیجا بشارت دینے والا اور ڈرانے والا، ان لوگوں کو جو ایمان لاتے ہیں، ان کی جنت کی بشارت دینے والا، کامیابی اور فلاح کی بشارت دینے والا اور ان لوگوں کو ڈرانے والا جو کافر و مشرک ہیں، اللہ کے انبیاء کی رسالت و نبوت کے منکر ہیں۔

کئی مقامات پر اللہ تعالیٰ نے پیغمبروں کی صفات بیان فرمائی ہیں، وہاں ایک صفت آئی ہے ''بَشِیْر'' اور ''نَذِیْر''۔ ''نذیر'' کا معنی ہوتا ہے ڈرانے والا۔ لیکن ڈرانا بھی کئی طرح کا ہوتا ہے: کوئی دشمن کو ڈراتا ہے، آدمی سانپ کو دیکھ لے تو ڈر کر بھاگتا ہے اور دوسروں کو ڈراتا ہے۔ اللہ کے انبیاء کا جو ڈرانا ہے، اس کے اندر ایک رحمت اور ہمدردی چھپی ہوتی ہے، جیسے باپ بھی اپنے بچے کو ڈراتا ہے، بیٹا! رات کو بے وقت باہر گلی میں نہ نکلنا۔ لیکن اس ڈرانے میں ہمدردی ہے۔ استاد بھی ڈراتا ہے کہ ایسی غلطی نہ کرنا، گندے بچوں کے ساتھ مت کھیلنا۔ اس ڈرانے میں ایک ہمدردی اور رحمت ہوتی ہے کہ میرا بچہ یا شاگرد غلطیوں سے بچ جائے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ انبیاء کو بھی ڈرانے والا بنا کر بھیجتے ہیں، ان کے ڈرانے میں بھی ایک رحمت ہوتی ہے کہ امت جہنم سے بچ جائے۔ اسی لیے حضور پاک ﷺ نے فرمایا کہ میری مثال ایسے ہے جیسے تم جہنم کے کنارے پر کھڑے ہو، تم اس میں گرنا چاہتے ہو اور میں تمہیں پکڑ پکڑ کر کھینچ رہا ہوں، خیال کرو، خیال کرو، جہنم میں نہ گرو۔

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: تمہاری اور میری مثال ایسے ہے کہ لوگ زبردستی جہنم میں جانا چاہتے ہیں اور میں کھینچ کھینچ کر ان کو نکالنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ اس لیے فرمایا کہ آپ کے لیے یہی بڑی گواہی اور نشانی ہے کہ ہم نے آپ کو بھیجا ہے، کوئی مانتا ہے تو مان لے، ورنہ اپنی عاقبت خود خراب کرے گا۔ اور آپ کیوں غمگین ہوتے ہیں؟

آپ سے ان جہنم والوں کے بارے میں نہیں پوچھا جائے گا کہ یہ کیوں جہنم میں گئے؟

تبلیغ کرنا آپ کا کام، ہدایت دینا میرا کام ہے:

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میرے مدنی آقا ﷺ کے ذمے "اِنْذار" اور "تبشیر" ہے۔ آپ دعوت دیتے رہیں، اس کے بعد اگر کسی نے مان لیا تو اس کا اپنا فائدہ ہے، اگر نہیں مانا تو اس کا اپنا نقصان ہے، ہم آپ سے نہیں پوچھیں گے کہ یہ جہنمی لوگ کافر و مشرک کیوں رہ گئے؟ ایمان کیوں نہیں لائے؟ قرآن میں دوسرے مقام پر بھی فرمایا: ﴿يَاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ۝ وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ۝﴾ [الاحزاب: ۴۵، ۴۶] اے میرے مدنی! ہم نے آپ کو گواہ بنا کر بھیجا ڈرانے والا، اپنی توحید کی طرف دعوت دینے والا بنا کر بھیجا، ہم نے آپ کو سراج منیر بنا کر بھیجا، تاکہ آپ کی نبوت کی روشنی ہر گھر میں پھیل جائے، آپ کی ذمہ داری صرف اتنی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یہی میری سنت ہے، ﴿وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ ۝﴾ [فاطر: ۲۴] ہم نے کوئی اُمت پیدا نہیں کی، مگر ہم نے ڈرانے والا بھیجا، ہم نے ان کو اپنے عذاب سے ڈرانے والا بنا کر بھیجا۔ ﴿وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا ۝﴾ [بنی اسرائیل: ۱۵] جب تک کہ ہم اپنا پیغمبر ان کے پاس نہ بھیجیں، جب تک بات مکمل نہ ہو جائے، اس وقت تک ہم کسی قوم پر عذاب نہیں بھیجتے۔ اسی طرح فرمایا: ﴿تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا ۝﴾ [الفرقان: ۱] پاک ہے وہ ذات جس نے اُتارا قرآن اپنے عبد محمد ﷺ پر، تاکہ وہ تمام عالم کو ڈرانے والے ہوں۔ پہلے انبیاء کے ڈرانے کا علاقہ محدود ہوتا تھا کہ وہ اپنی اپنی اقوام کو ڈرانے کے لیے آئے، اپنے علاقے میں ڈرانے کے لیے آئے، لیکن حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے پورے عالم کے لیے "نذیر" بنا کر بھیجا۔ چونکہ آپ ﷺ کی نبوت تمام دنیا کے انس و جن اور قیامت تک کے لیے تھی، اس لیے اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو جو مقام بشارت و نذارت تفویض فرمایا ہے، وہ پوری دنیا کے لیے تفویض فرمایا ہے اور اسی طرح انبیاء و رُسل کے بعد پھر صحابہ اور ان کے بعد تابعین اور تبع تابعین، ائمہ مجتہدین، محدثین، فقہاء اور علماء قیامت تک ہیں، ان کی ذمہ داری بھی فقط یہ ہوتی ہے کہ وہ حق بات بتا دیں اور واضح کر دیں کہ یہ صراطِ مستقیم ہے اور یہ بتا دیں کہ یہ حزب الرحمٰن ہے اور یہ حزب الشیطان ہے، وہ یہ بتا دیں کہ یہ طریقہ حق اور یہ باطل ہے۔ ان کے لیے یہ نہیں ہوتا کہ لوگوں کو زبردستی ایمان کی طرف لائیں، دلوں کا بدلنا میرے اللہ کے اختیار میں ہے۔ علماء حق کا کام

صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ حق و باطل میں امتیاز کریں، وہ ایک مسئلہ قوم کو سمجھا دیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کی توحید اور نبوت و رسالت کا معنی اور یہ معاد کا مسئلہ ہے اور یہ حق اور یہ باطل ہے۔ کوئی مان لے تو الحمد للہ! اور جو نہ مانے تو اس نے قیامت میں خود جواب دینا ہے۔

﴿وَلَا تُسْـَٔلُ﴾ کی مختلف قراءتیں:

ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اکثر قاریوں نے ﴿وَلَا تُسْـَٔلُ﴾ پڑھا ہے، اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ نے "وَ لَا" کے بجائے "مَا" بھی پڑھا ہے اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت میں "وَلَنْ تُسْـَٔلَ" ہے۔ اس قراءت کے اختلاف سے بعض فرق باطلہ لوگوں کو گمراہ کرتے ہیں کہ قرآن پاک ایک صحابی ﴿وَلَا تُسْـَٔلُ﴾، ایک صحابی "وَمَا تُسْـَٔلُ"، اور ایک صحابی "وَلَنْ تُسْـَٔلَ" پڑھتے ہیں تو صحابہ نے قرآن بدل دیا۔ یہ جہالت کی بات ہے؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مقدس سات قراءتوں کے مطابق اُتارا ہے۔ قراءت کا اختلاف خود اللہ کی طرف سے اُتارا ہوا ہے۔ جو جس قراءت میں پڑھے، معنی اور ترجمہ میں فرق نہیں آئے گا اور اس کو تحریف کہا جائے گا۔

قرآن کی مختلف قراءتیں:

جیسے قرآن میں آپ پڑھتے ہیں: ﴿اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ ضُعْفٍ﴾ [الروم: ۵۴] تو "ضُعْف" بھی قراءت ہے، اسی طرح زبر کے ساتھ "ضَعْف" بھی قراءت ہے، ترجمہ دونوں کا ایک ہے۔ اسی طرح فرمایا: ﴿وَقَالَ ارْكَبُوْا فِيْهَا بِسْمِ اللّٰهِ مَجْــرٖىهَا وَمُرْسٰىهَا ۭ اِنَّ رَبِّيْ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝﴾ [ہود: ۴۱] اکثر قراء ﴿مَجْــرٖىهَا﴾ کو ﴿مُجْرٰىهَا﴾ (میم کو پیش اور را کو کھڑی زبر کے ساتھ) پڑھتے ہیں۔ یہ بھی قراءت کا اختلاف ہے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے سامنے ایک صحابی نے قرآن پڑھا، جب اس نے قرآن پڑھا تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ جلال والے آدمی تھے تو عمر رضی اللہ عنہ نے فوراً کپڑا اس کے گلے میں ڈالا اور پکڑ لیا اور فرمایا: تم قرآن کیسے پڑھ رہے ہو؟ اس نے کہا کہ مجھے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی طرح پڑھایا ہے۔ اس کو پکڑ کر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے آئے۔ آپ نے فرمایا: کیا کر رہے ہو؟ عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: حضور! یہ تو قرآن عجیب طرح سے پڑھتا ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھے سناؤ۔ صحابی نے سنایا۔ اس کے بعد حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ اب تم بھی سناؤ۔ انہوں نے بھی سنایا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ٹھیک ہے یہ بھی اور وہ بھی۔ تو اللہ کے بندے!

اس میں قراءت کا اختلاف ہے۔

اور قراءت میں کیوں اختلاف ہے؟ اس بات کو بھی دماغ میں رکھ لیں۔ اصل پتہ تو علماء قراءت کو ہے۔ جب میرے مدنی سرکار ﷺ تشریف لائے تو قرآن لغت عرب میں اور لغت قریش میں اُتارا گیا، لیکن اس وقت بڑے بڑے قبائل تھے جیسے بنو ثقیف اور بنو وائل وغیرہ۔ اور یہ قاعدہ ہوتا ہے کہ قدرتی طور پر تھوڑے سے فاصلے کے بعد قبائل کے اندر لحن بدل جاتا ہے۔ اب دیکھیں کہ کوئی یمن والا عربی بول رہا ہے، کوئی شام والا، الجزائر والا عربی بول رہا ہو تو فرق ہوگا۔ اتنا بڑا فرق ہے کہ بندہ حیران ہو جاتا ہے۔ حالانکہ صحیح معنوں میں عرب ہیں۔ یہ سار عرب بلادِ عرب اور عربی بولنے والے لوگ ہیں، لیکن ان کی عربی اُن کو اور اُن کی عربی اِن کو سمجھ نہیں آتی۔

کئی دفعہ جب ہم ایام حج میں صبح کو بیٹھے ہوتے ہیں تو لوگ مسائل پوچھنے کے لیے آجاتے ہیں۔ کبھی کوئی عربی آجائے گا مسئلہ پوچھنے۔ ہمیں پتہ ہی نہیں ہوتا کہ کیا کہہ رہا ہے۔ آخر ہم مجبور ہو کر یہ کہتے ہیں کہ ہم نے نہیں سمجھا۔ مہربانی کرو کہ کسی عربی زبان والے کے پاس جاؤ۔ وہ دراصل عربی بول رہا ہوتا ہے، لیکن اصولی طور پر ان کے اندر لحن اور ادائے حروف، ادائے مخارج اور ان کے بات کرنے میں اتنا بڑا فرق پڑ جاتا ہے کہ یہ بات عربوں کو سمجھ نہیں آتی۔

جب قرآن اُترا تو تمام قبائل بیچارے اس طرح نہیں پڑھ سکتے تھے: کیونکہ ان کے لحن میں فرق آرہا تھا، ان کے الفاظ کی ادائیگی اور مخارج میں فرق آرہا تھا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے رعایت کر دی کہ اللہ کا کلام ہے، کوئی غلط نہیں پڑھے گا۔ اس لیے قراءتوں کی رعایت دے دی گئی، تاکہ ہر آدمی قرآن کے ان الفاظ کو اپنی قراءت میں صحیح طریقے سے ادا کر سکے۔ پھر جو قاری جس علاقے میں چلا گیا، وہاں اس کی قراءت پھیل گئی، کہیں قراءتِ حفص اور کہیں عاصم کی قراءت عام ہوگئی؛ کیونکہ قاری کا جس علاقے سے گزر ہوا، جہاں جہاں اس کے شاگرد پہنچے، اسی کی قراءت اس ملک میں پھیلتی چلی گئی۔

الحمدللہ! اہلسنت والجماعت میں آج بھی ایسے قراء موجود ہیں جو ''قراء سبعہ'' کہلاتے ہیں، وہ سات قراءتوں کے مطابق قرآن پاک پڑھ سکتے ہیں۔ اسی طرح اب بھی یہ نہیں کہ ہم آج سے چودہ سو سال پہلے کی بات کر رہے ہیں، اب بھی مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ میں ایسے قاری ہیں کہ پورا قرآن ایک قراءت میں ختم کریں گے اور دوسرا قرآن دوسری قراءت میں شروع کریں گے، پھر تیسری اور چوتھی باری قراءت سے پڑھیں گے۔

لہٰذا قراءت کا اختلاف علیحدہ بات ہے اور اللہ تعالیٰ کے قرآن میں تبدیل یا تحریف یا قرآن میں حرف یا جملہ

بدل دینا علیحدہ بات ہے۔ اللہ تعالیٰ کے قرآن میں نہ کوئی حرف بڑھایا جاسکتا ہے اور نہ گھٹایا جاسکتا ہے۔ جیسے ہمارے ہاں جو علماء ہوتے ہیں انہوں نے قرآن وحدیث والی عربی پڑھی ہوتی ہے، وہ بیچارے آکر پریشان ہوتے ہیں، انہیں کہا جائے: "أقلدى" تو وہ کہیں گے: "أقلدىَ" ہوتا ہے۔ اصل لفظ "أَقُولُ لَكَ" تھا، لیکن جب بازاری عربی ہوگی تو یہی حال ہوگا۔

عجمی زبان پر ایک لطیفہ:

جیسے ایک مولوی اور ایک دیہاتی کی آپس میں دوستی تھی۔ وہ مولوی صاحب شہر جانے لگے تو انہوں نے اپنے دوست دیہاتی سے پوچھا کہ آپ کو سودا سامان کی ضرورت ہو تو میں شہر جا رہا ہوں، تمہارے لیے لے آؤں گا۔ اس نے کہا: مولوی صاحب! میں دیہاتی آدمی ہوں، میرے لیے آپ کیا لائیں گے؟ کیسے اُٹھائیں گے؟ اس نے کہا کہ نہیں بھائی! کوئی بات نہیں، مجھے بتادو، میں لے آؤں گا۔ اس نے کہا کہ مجھے مٹی ٹھیک کرنے کے لیے "کہی اور وہولہ" کی ضرورت ہے، میرے لیے لے آنا۔ مولوی صاحب نے ڈائری میں لکھ لیا اور اس کے بعد تشریف لے گئے۔

کافی دنوں کے بعد جب واپس آئے تو دیہاتی ملنے گیا تو اس نے کہا: حضرت! خیریت سے آپ واپس آگئے، میرے سامان کا کیا ہوا؟ حضرت نے فرمایا کہ کمال ہے کہ تم ایسے دیہاتی بنتے ہو، میں نے سارا شہر ڈھونڈ مارا، لیکن تم نے ایسا سامان لکھوایا تھا کہ نہیں ملا۔ میں نے تمہارے سامان کے لیے شہر میں کوئی دکان نہیں چھوڑی۔ تمہاری دوستی میں ڈھونڈ ڈھونڈ کر مر گیا۔ حضرت عجیب بات ہے۔ اس نے کہا: میں ایک ایک دکان پر گیا اور پوچھا کہ "کَہِیِ وَ هُوَ لَهُ" تمہارے پاس ہے؟ وہ لکھا تھا نا "کہی وہولہ" اب مولوی صاحب اس کو زبر زیر کے ساتھ پڑھ رہے تھے اور جس دکاندار کے پاس جاتے، وہ کہتا کہ یہ لفظ تو ہم نے آج سنا ہے۔ اس نے کہا: مولوی صاحب! یہ "کہی وہولہ" ہے۔ مولوی نے کہا: لاحول ولا قوۃ، میں تو ایک ایک دکان سے پوچھ پوچھ کر مر گیا۔

دوسرا لطیفہ:

میرے استادوں کے بھی استاد بہت بڑے عالم اور مفسر جنہوں نے تفسیر قرآن لکھی ہے محمد ادریس کاندھلوی رحمہ اللہ۔ ان کی تفسیر "معارف القرآن" کے نام سے بہت مشہور ہے۔ بعد میں ایک مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ نے

لکھی۔ ان سے پہلے محمد ادریس صاحب نے لکھی، یعنی اتنے بڑے عالم۔ اب وہ ایک دن بڑے غصے اور جوش میں آئے اور آکر طلبہ سے کہنے لگے کہ جب میں گھر سے نکلا، راستے میں یہ کریم تبت سنو کے بڑے بڑے بورڈ لگے ہوئے تھے "تبت سنو" تو حضرت پڑھتے ہوئے آئے، آکر طلبہ سے کہنے لگے کہ لوگ بڑے بے وقوف ہیں، ہر جگہ لکھا ہوا ہے: "تَبَّتْ سُنو"، آخر "قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَد" کیوں نہ سنو؟ یہ تو لکھ دیتے ہیں کہ تبت سنو۔ تو طلبہ نے کہا: حضرت! یہ "تَبَّتْ" نہیں ہے، یہ ولائی لامہ والا "تبت" ہے اور اس کے حوالے سے انہوں نے ایک Snow بنائی ہوئی ہے۔ یہ "تبت" ایک جگہ کا نام ہے، قرآن والا تبت سورۃ نہیں ہے۔ چونکہ مولانا صاحب کا دماغ قرآن میں اٹکا ہوا تھا، دوسری طرف ان کا دماغ کبھی جا ہی نہیں سکتا تھا، اس لیے انہوں نے اسے "تَبَّتْ" پڑھ دیا۔ اب اگر کوئی یہ کہے کہ مولوی صاحب نے غلط پڑھا تھا اور پھر ان پر فتوے لگانا شروع کر دے تو یہ کون سی عقلمندی ہوگی؟

حضور اکرم ﷺ کے والدین کا ایمان:

ایک حدیث پاک میں آتا ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے اپنے والدین کے متعلق پوچھا کہ ان کا اُخروی انجام کیسا ہوا؟ وہ تو اس زمانہ میں فوت ہوئے جو زمانہ جاہلیت کا تھا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ آپ ان کے بارے میں سوال نہ کریں۔ پھر حضور پاک ﷺ نے اپنی حیاتِ طیبہ میں دوبارہ ان کے بارے میں سوال نہیں کیا۔

ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ کتاب تذکرہ میں ہم نے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم ﷺ کے والدین کو دوبارہ زندہ کیا اور وہ ایمان لے آئے اور اس حدیث کا بھی ہم نے وہاں جواب دیا ہے کہ اس حدیث کی کوئی حیثیت نہیں، کوئی اصل نہیں، اور نہ وہ حدیث صحاحِ ستہ میں موجود ہے، اور نہ کوئی اس حدیث کے اندر اتنا استدلال اور اتنی طاقت ہے۔ نیز اس کی سند بھی ضعیف ہے، اس سے عقیدہ کے بارے میں حجت نہیں پکڑی جا سکتی۔ واللہ اعلم۔

آپ کو ہم نے ڈرانے والا اور بشارت دینے والا بنا کر بھیجا۔ آپ ان لوگوں کے بارے میں سوال نہ کریں جن کے بارے میں جہنم کا فیصلہ ہو چکا ہو۔

اب مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ کچھ لوگوں نے اس کا رَد کیا ہے کہ یہ بھی حجت والی بات نہیں ہے؛ کیونکہ یہ ممکن ہی نہیں کہ حضور اکرم ﷺ اپنے والدین کے بارے میں شک میں پڑے ہوں اور جو بھی بات ہے اللہ تعالیٰ نے ان

پر واضح فرما دی ہوگی۔

علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے والدین کی نجات کے بارے میں کئی رسائل لکھے ہیں، جن میں انہوں نے کئی دلائل سے ان کے ایمان لانے اور نجات پانے کو تفصیل سے ذکر کیا ہے۔(امداداللہ انور)

ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ پہلی جو قراءت صحیح ہے آپ سے سوال نہیں کیا جائے گا ان لوگوں کے بارے میں جو ایمان نہیں لے آئے۔ آپ کے ذمہ صرف پہنچانا ہے۔

اسی طرح حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دادا سیدنا ابراہیم علیہ السلام بھی اپنے والد کے لیے بخشش مانگتے رہے: میرے اللہ! میرے باپ کی مغفرت فرما، وہ گم کردہ راہوں میں ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے منع فرما دیا، ان کی موت کفر پر آ گئی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: بس اب اس کے بعد سوال نہ کرنا۔ قرآن میں آ گیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ابراہیم (علیہ السلام) نے ایک زمانہ مقررہ تک اپنے والدین کے لیے بخشش مانگی، لیکن جب ہم نے واضح کر دیا کہ بس وہ جہنم میں گئے تو حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے بھی بخشش مانگنا چھوڑ دی۔

اس لیے مفسر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ابن جریر کا یہ قول بھی قابلِ حجت نہیں ہے۔ صحیحین میں یہ بات ثابت ہو چکی ہے، اللہ تعالیٰ نے واضح فرما دیا کہ جو لوگ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان نہیں لائے، چاہے وہ جو بھی ہوں، زمانہ جاہلیت اور شرک میں فوت ہو گئے تو وہ ''اصحاب الجحیم'' ہیں۔(سوائے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے والدین کریمین کے)۔(امداداللہ انور)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صداقت نبوت:

اب مفسر رحمۃ اللہ علیہ سورۃ البقرۃ کی اس آیت مبارکہ میں ارشاد فرماتے ہیں کہ جیسے آپ نے پڑھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہود و نصاریٰ اور مشرکین عرب اور معاندین و معارضین کا رَدّ فرمایا ہے اور ارشاد فرمایا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت و نبوت کی صداقت کے لیے یہ بات کافی ہے کہ ہم نے آپ کو بھیجا ہے، جب بھیجنے والا تصدیق کر دے کہ میں نے بھیجا ہے تو معترض کو اعتراض کا کوئی حق نہیں ہے۔

اصولی بات یہ ہے کہ اب دنیا میں کسی ملک نے کسی کو سفیر بنا کر بھیجا ہو تو جب بھیجنے والے کا آرڈر موجود ہو تو اعتراض کرنے والے کو کوئی حق نہیں پہنچتا۔ اب یہ ضروری نہیں کہ جس ملک میں وہ سفیر بنا کر بھیجا جائے، اس ملک



والے بھی یہ کہیں کہ بادشاہ خود آ کر کہے: یہ ہمارے سفیر ہیں۔ یہ بات تو عقل اور نقل کے خلاف ہے۔ اور پھر اگر آپ غور کریں تو یہ سوال کسی پیغمبر کے لیے نہیں کیا گیا۔ سب سے پہلے شریعت کی ابتداء نوح علیہ السلام سے ہوئی تو نوح علیہ السلام سے لے کر جتنے پیغمبر تشریف لائے، سب شان والے ہیں، ہم سب پر ایمان رکھتے ہیں، لیکن کسی پیغمبر کے بارے میں آپ کو یہ بات نہیں ملے گی کہ ان کے آنے سے پہلے اللہ تعالیٰ نے اتنا بڑا اہتمام کیا ہو کہ سابقہ کتابوں میں بھی ذکر، سابقہ انبیاء کرام سے بھی ان کے بارے میں کوئی عہد لیا گیا ہو، اللہ تعالیٰ نے جتنا اہتمام کیا ہے وہ آپ ﷺ کی شان کی وجہ سے ہے؛ کیونکہ آپ ﷺ کی نبوت قیامت تک کے لیے ہے۔ آپ ﷺ کے بعد کوئی نبی اور رسول نہیں۔ اور یہ سلسلہ جاتا ہے ہزاروں سال تک۔ اس لیے اتنا اہتمام کیا گیا ہے کہ ماسوا اس انسان کے جس کی عقل اللہ تعالیٰ نے چھین لی ہے یا جس کے دل پہ مہر لگ گئی ہو۔ اگر وہ عقل سلیم سے ذرا سا بھی غور کرے تو اسے حضور اکرم ﷺ کی صداقت نظر آ جائے گی۔

اس لیے آپ دیکھیں کہ بڑے بڑے مذاہب کے لوگ جو بھی دنیا میں گزرے ہیں، یہودی، عیسائی اور بدھ مت، سب نے حضور اکرم ﷺ کی فضیلت کا اعتراف کیا۔ حضور اکرم ﷺ کی شان میں کتابیں، قصیدے اور مدحیہ اشعار لکھے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ ہر آدمی نے تعریف اپنی عقل کے مطابق کی، لیکن انہوں نے حضور اکرم ﷺ کی فضیلت کا اعتراف کیا۔ اور یہ سلسلہ صرف حضور اکرم ﷺ کی شان میں آپ کو ملے گا کہ حضور اکرم ﷺ ابھی پیدا نہیں ہوئے اور اللہ تعالیٰ تمام انبیاء سے عہد لے رہے ہیں کہ جب میرے نبی ﷺ کا زمانہ آئے گا تو ان پر ایمان لے آنا اور ان کی مدد بھی کرنا۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ تو جانتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ سب سے آخر میں آئیں گے، لیکن مسئلہ کی اہمیت وعظمت کو واضح کرنے کے لیے ایسا کہا۔

جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی ربوبیت کا وعدہ لیا: ﴿أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ﴾ حالانکہ اللہ تعالیٰ جانتے ہیں کہ کتنے لوگ ہیں جو کافر ہو جائیں گے، کتنے لوگ ہیں جو میری ربوبیت کا انکار کریں گے، لیکن مسئلہ کی عظمت کے پیش نظر عالم ارواح میں عہد لیا جا رہا ہے کہ اعتراف کرو کہ تمہارا رب کون ہے؟ سب نے اقرار کیا کہ اللہ تعالیٰ ہی ہمارے رب ہیں۔

اسی طرح بعینہ نبی ﷺ کی نبوت وعظمت کا مقام اُجاگر کرنے کے لیے اور پھر تمام کتب سابقہ میں اور تمام کتب منزلہ میں اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم ﷺ کی صفات کا بیان فرمایا اور تمام پیغمبر جو تشریف لاتے رہے، وہ حضور اکرم ﷺ کے آنے کا ذکر فرماتے رہے۔ چنانچہ قرآن مقدس کے اندر یہ آیت موجود ہے کہ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام

نے اپنے زمانے میں اپنے حوارین اور انصار سے فرمایا کہ اے لوگو! تم اس زمانے کا انتظار کرو کہ جب ایک رسول پیدا ہوں گے اور میرے بعد وہ آئیں گے اور ان کا نام احمد مجتبیٰ ہوگا۔ اسی طرح حضور اکرم ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم کا ذکر کیا گیا، آپ ﷺ کے خلفاء کا ذکر کیا گیا، آپ ﷺ کے مولد، ہجرت، صفات، عادات کا ذکر کیا گیا، حتیٰ کہ جو سابقہ بادشاہ گزرے تھے ان لوگوں نے اپنے اپنے تخیلات اور کتابوں کی صفات کے مطابق تصاویر بنا کر بھی اپنے گھر میں رکھ لی تھیں کہ اس شکل والا نبی پیدا ہوگا، جس کا نام محمد مصطفیٰ، احمد مجتبیٰ (ﷺ) ہوگا۔ لیکن اس کے باوجود بھی کوئی حضور اکرم ﷺ کی نبوت کا انکار کرے تو اس کا معنی یہ ہے کہ اس کے دل پر مہر لگ چکی ہے۔ یہ بھی میرے اللہ تعالیٰ کا نظام ہے۔

اب دیکھتے ہیں کہ دنیا میں کتنے لوگ ہیں جو ایک چیز کو غلط بھی کہتے ہیں، لیکن چھوڑتے بھی نہیں ہیں۔ حالانکہ ان سے جب پوچھا جائے تو اعتراف کرتے ہیں کہ یہ کام غلط ہے، لیکن اسی کام پر ان کی زندگی کا ایسا مدار بن جاتا ہے کہ چھوڑ نہیں سکتے۔ آج بھی کتنے لوگ ہیں کہ جن سے آپ پوچھیں گے تو وہ اقرار کریں گے کہ سود حرام ہے اور سودی معیشت ایک انتہائی خطرناک معیشت ہے، چند لوگوں کو بڑا بنا دیتی ہے اور لاکھوں کی ہلاکت کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود بھی وہ سود کو نہیں چھوڑتے۔ اسی طرح بہت سارے لوگ ایسے ہیں جو یہ مانتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ کی شان بڑی ہے، آپ ﷺ کی عظمت بڑی ہے، لیکن ایمان نہیں لاتے۔

اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میرے نبی! آپ اس فکر میں نہ پڑیں، ہم نے آپ کو حق کے ساتھ جنت کی بشارت دینے والا بنا کر بھیجا ہے اور کافروں کو جہنم سے ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔ اب اس کے بعد بھی کوئی ایمان نہ لائے تو آپ غم نہ کریں۔ ان کافروں اور جہنیوں کے بارے میں آپ سے نہیں پوچھا جائے گا کہ یہ اسلام یا ایمان کیوں نہیں لائے؟ ان لوگوں نے آپ کا کلمہ کیوں نہیں پڑھا؟ آپ کی ذمہ داری تو صرف اتنی ہے کہ آپ فرائض رسالت کے ذریعے میری دعوت کو پہنچادیں، ان کا حساب لینا، جزا دینا اور ان کو پکڑنا، یہ پھر ہمارا کام ہے۔

اس کے ضمن میں امام احمد رحمہ اللہ نے یہ روایت نقل فرمائی ہے کہ عطاء بن یسار فرماتے ہیں کہ میں عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے ملا اور میں نے ان سے کہا: چونکہ آپ تورات پڑھنے والے ہیں، مہربانی فرما کر مجھے خبر دیں کہ تورات کے اندر حضور اکرم ﷺ کی صفات کیا بیان ہوئی ہیں؟ چونکہ حضور اکرم ﷺ کے زمانے میں تورات اور انجیل موجود تھیں (اگرچہ محرف تھیں)، انہوں نے فرمایا کہ ہاں میں بتاتا ہوں۔ اس کے بعد حضرت عبداللہ بن عمرو



بن العاص رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ خدا کی قسم! اللہ کے نبی ﷺ کو جو صفات تورات میں موجود ہیں، بعینہ انہی صفات کے ساتھ آپ ﷺ کا ذکر قرآن میں موجود ہے۔ چنانچہ ﴿يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا﴾ [الاحزاب:۴۵] یہ آیت قرآن اور تورات دونوں میں موجود ہے۔ اے میرے پاک نبی! تحقیق ہم نے آپ کو گواہ بنا کر بھیجا ہے، ہم نے آپ کو ایمان والوں کے لیے بشارت دینے والا اور کافروں کو ڈرانے والا بنا کر بھیجا اور ایسی قوم کے لیے جن کے پاس کوئی کتاب نہیں آئی تھی، ان کو کتاب پڑھ کر سنانے والا بنا کر بھیجا ہے، آپ میرے عبد بھی ہیں، میرے رسول بھی ہیں اور ہم نے آپ کا نام ''متوکل'' رکھا، یعنی اللہ پر توکل رکھنے والا کہ حضور اکرم ﷺ سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ پر توکل رکھنے والے تھے۔ حضور اکرم ﷺ ہر بات میں وظیفہ پڑھتے: ''لَا حَوْلَ وَ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ''۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ اے میری اُمت! اگر سوال کرو تو سیدھا اللہ سے کرو، اگر مدد پکڑو تو اللہ کے ساتھ مدد پکڑو اور جب کسی پر بھروسہ کرو تو اللہ تعالیٰ کی ذات پر بھروسہ کرو؛ کیونکہ اگر مخلوق پر بھروسہ کرو گے مخلوق خود فانی ہے، مخلوق تو خود محتاج اور فنا ہونے والی ہے، پھر تمہارا توکل کس کام کا ہے؟ تم اس ذات پر توکل کرو جس نے ہمیشہ رہنا ہے۔

آپ ﷺ کی یہ بھی فضیلت ہے کہ حضور اکرم ﷺ سخت اور ترش رو نہیں تھے، نہ ایسی زبان استعمال کرنے والے تھے کہ آپ ﷺ کی زبان سے کوئی ایسا لفظ نکلے کہ جو دوسروں کے لیے بھاری معلوم ہو، اور محمد ﷺ کی یہ صفات مبارکہ تھیں کہ وہ بازاروں میں شور مچانے والے نہیں تھے۔ حضور اکرم ﷺ ضرورت کے لیے، تجارت و کاروبار کے لیے بازار میں بھی تشریف لے جاتے، لیکن آپ ﷺ کی یہ شان نہیں تھی کہ اپنی چیزوں کو بیچنے کے لیے شور مچائیں اور آوازیں لگائیں، بلکہ ہر کام میں اعتدال تھا۔ حضور اکرم ﷺ نے کبھی بُرائی کا بدلہ بُرائی سے نہیں دیا، حضور اکرم ﷺ کے ساتھ کسی نے زیادتی کی تو آپ ﷺ نے معاف فرمادیا، حضور اکرم ﷺ نے کبھی گالی کا جواب گالی سے نہیں دیا، لوگوں نے راستے میں کانٹے بچھائے تو آپ ﷺ نے دعائیں دیں، حضور پاک ﷺ کو اگر کسی نے کوئی لفظ سخت بھی کہا جو آپ ﷺ کی شان کے خلاف تھا تو بھی حضور پاک ﷺ نے ہمیشہ معافی عطا فرمادی، حضور پاک ﷺ نے اپنی ذات کے لیے کبھی کسی سے بدلہ نہیں لیا۔

اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس وقت تک زمین سے نہیں اُٹھایا جب تک کہ یہ بگڑی ہوئی امت سیدھی نہیں ہوگئی اور جب تک انہوں نے اقرارِ توحید نہیں کرلیا۔ اور اس عقیدۂ توحید کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے ان کی اندھی آنکھوں کو توحید

کی روشنی عطا فرما دی، ان کے کان جو حق سننے سے بند تھے، ان کو کھول دیا اور ان کے دل جو غلافوں میں پڑے تھے، ان کو حضور پاک ﷺ کے ساتھ انشراح صدر کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اتنی ہمت دی، اتنی طاقت دی کہ پورے جزیرۂ عرب کے اندر اسلام کا پرچم لہرا گیا۔ وہ لوگ جو مشرک تھے موحد بن گئے، جو ظالم تھے وہ ﴿رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ﴾ کی تصویر بن گئے، جو لوگوں کو ڈاکے مار کر لوٹا کرتے تھے وہ ان لوگوں میں سے بن گئے جن کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی: ﴿وَیُؤْثِرُوْنَ عَلٰۤی اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ﴾ [الحشر:۹] وہ دوسروں کو اپنی جانوں پر ترجیح دیتے ہیں، اگرچہ وہ خود ضرورت مند ہوں۔ اسی لیے آج بھی الحمدللہ! نظر انصاف سے دیکھنے والے جو لوگ ہیں وہ صحیح معنی میں اعتراف کرتے ہیں کہ حضرت محمد ﷺ انقلاب لائے ہیں۔

دنیا میں بڑے بڑے انقلاب آئے، کوئی معاشی انقلاب آیا جس میں صرف پیٹ کا مسئلہ حل ہو گیا، کسی انقلاب کے اندر کوئی خاص عنوان سامنے تھا، اس کے پیش نظر انقلاب آیا، لیکن سب سے بڑا انقلاب حضور اقدس ﷺ لے کر آئے کہ عقیدہ اور سیرت میں انقلاب آیا، وہ بھیڑیے، وحشی قوم جن کا کام قتل کرنا، شرابیں پینا، ڈاکے مارنا، سرمایۂ افتخار تھا، ان کو ایسا بنا دیا کہ قرآن نے ان کا خود نقشہ کھینچا ہے: ﴿اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ﴾ [الفتح:۲۹] کہ میرے مدنی کے صحابہ کو تو دیکھو! کفر کے مقابلے میں چٹان بن جاتے ہیں، لیکن آپس میں مہربان ہیں۔ ان کی عملی زندگی ایسی ہے: ﴿تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا یَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا﴾ [الفتح:۲۹] جب ان کو دیکھو گے تو کوئی رکوع اور سجدہ میں ہیں، اللہ تعالیٰ کے فضل اور رضا کے طالب ہیں اور رات کو کثرتِ عبادت کی وجہ سے ان کے چہروں پر نورِ توحید اور نورِ عبادت چمکتا ہے اور وہ علامات ان کے چہروں سے نظر آ رہی ہیں۔ آپ اندازہ فرمائیں کہ پوری دنیا عاجز ہے، یعنی آج تک بھی اور قیامت تک بھی کوئی حضور اکرم ﷺ کے صحابہ جیسی ایک جماعت پیدا نہیں کر سکتا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے حضور پاک ﷺ کے ساتھ جو وعدہ فرمایا وہ کامیاب ہوا، دین مکمل ہو گیا، نعمتیں پوری ہو گئیں اور پوری دنیا پر اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے دین کو پھیلایا۔ آپ ﷺ کی تمام صفات جیسی قرآن مجید میں ہیں، ویسے ہی تورات وانجیل میں موجود ہیں۔

عطاء فرماتے ہیں کہ اس کے بعد میں کعب احبار سے ملا، چونکہ کعب احبار کے پاس سابقہ کتابوں کا بڑا ذخیرہ تھا اور سابقہ کتابوں کا علم تھا، ان سے بھی میں نے حضور اکرم ﷺ کی صفات کے متعلق پوچھا۔ فرماتے ہیں کہ انہوں نے تورات وانجیل میں جو کچھ تھا اور جو کچھ قرآن میں تھا، اس میں بھی کوئی اختلاف نہیں پایا۔ اسی طرح صفات بیان

کیں جو پہلے مجھے عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے فرمائی تھی۔ ہاں البتہ تھوڑا سا الفاظ میں فرق ضرور تھا، معنی اور ترجمہ بھی ایک ہی تھا۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ اے میرے نبی! ان مخالفوں کی باتوں کا آپ غم نہ کریں۔ آپ کی صداقت تو قرآن، تورات اور زبور سب میں موجود ہے۔ یہ ایمان نہیں لانا چاہتے، یہ تو محض فساد مچانا چاہتے ہیں، ان کا مقصد محض اعتراض برائے اعتراض ہے، یعنی اگر کوئی معجزہ مانگیں اور ہم آپ کو وہ معجزہ عطا بھی فرمادیں تو یہ ایمان نہیں لائیں گے، بلکہ کسی دوسرے معجزہ کا مطالبہ شروع کردیں گے۔

جیسا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ معجزات کا مطالبہ کیا کہ یہ پہاڑ ہٹ جائیں، چشمے نکل آئیں، کھیتی باڑی ہوجائے۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں بھی خیال آیا کہ اللہ تعالیٰ کے آگے کوئی مشکل تو نہیں، اگر اللہ تعالیٰ یہ ساری باتیں مجھے عطا فرمادیں۔ شاید یہ مکہ والے ایمان لے آئیں تو اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرائیل علیہ السلام کو بھیجا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے میرے نبی! سنت اللہ یہ ہے کہ اگر کوئی قوم مطالبہ کرے، معجزہ مانگے اور وہ معجزہ ان کے مطابق ان کو دے دیا جائے اور پھر بھی وہ ایمان نہ لائیں تو پھر ان کو ہمیشہ کے لیے اس دنیا سے مٹا دیا جاتا ہے۔

جیسا کہ قوم صالح علیہ السلام نے خود معجزہ مانگا، اللہ تعالیٰ کے نبی کے پاس آئے اور کہنے لگے کہ ہم آپ کی نبوت کا اقرار کریں گے، لیکن ایک شرط ہے کہ اس پہاڑ سے ایک اونٹنی نکل آئے اور وہ گابھن ہو اور اس کے بعد دودھ دینا شروع کردے اور پھر جس کا دودھ بھی پئیں تو پھر ہم آپ پر ایمان لے آئیں گے اور آپ کو نبی مان لیں گے۔ حضرت صالح علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے پیغمبر تھے، انہیں بڑی نصیحت کی اور سمجھایا کہ اللہ تعالیٰ سے معجزات کا مطالبہ نہ کرو؛ کیونکہ جب کوئی چیز مانگی جائے اور مل جائے اور پھر آدمی ایمان نہ لائے تو پھر اللہ تعالیٰ کا عذاب آجاتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ نہیں جی! ہم تو اپنی پر پکے ہیں۔ حضرت صالح علیہ السلام نے دعا کی، اللہ تعالیٰ نے آپ کو معجزہ عطا فرمایا۔ ان کے سامنے پتھر سے ایک اونٹنی نکل آئی اور اتنی عظیم ماشاء اللہ! ایک دن جو دودھ دیتی تھی تو ساری قوم کو کافی ہوجاتا تھا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے حکم فرمادیا: جو بستی کا چشمہ ہے اس سے ایک دن تم دودھ پیا کرو اور ایک دن پانی اونٹنی کے لیے چھوڑ دیا کرو۔ ایک دن تم پانی پیا کرو اور اونٹنی پانی نہیں پیا کرے گی اور ایک طریقے سے ہم نے تمہارے لیے حصہ کردیا۔ ایک دن دودھ استعمال کرو اور پانی اونٹنی استعمال کرے گی اور ایک دن پانی تم استعمال کرو اور دودھ آپ کو نہیں ملے گا۔



چند دنوں تک تو اس پر چلتے رہے، لیکن کچھ عرصے کے بعد پھر اپنے کفر پر آ گئے، کہنے لگے: یہ کیا ہے کہ ہم دودھ پینے کے لیے پابند ہیں؟ سارا پانی اونٹنی پی جاتی ہے اور ہم پانی پینے سے محروم رہتے ہیں۔ یہ اچھا جانور ہے کہ جس کی وجہ سے ہم پانی بھی نہ پئیں۔ لہٰذا اپنے چند لوگوں کو تیار کیا کہ اس اونٹنی کو ختم کرو۔ جب اس اونٹنی کو ذبح کیا گیا تو اللہ تعالیٰ کے عذاب نے پکڑ لیا۔

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ میرے نبی! مکہ والے جو مطالبات کرتے ہیں ہمارے لیے مشکل نہیں، ہم تو ہر چیز پر قادر ہیں، ہم نے چاہا تو طائف میں چشمے نکال دیئے، آج بھی طائف کے چشمے دنیا کے اندر ضرب المثل ہیں۔ طائف کا موسم ضرب المثل ہے، وہاں کے پھل دیکھیں تو اس جیسا انگور دنیا میں نہیں، انار دنیا میں نہیں، اگر یہاں سو میل ہم پہاڑوں میں چشمے جاری کر سکتے ہیں اور پھر سب سے بڑا چشمہ ماءِ زمزم ہم نے مکہ میں جاری کر دیا تو کیا باقی چشمے جاری کرنے پر ہم قدرت نہیں رکھتے؟ لیکن اگر یہ قوم اسلام نہ لائی اور انہوں نے ایمان قبول کرنے سے انکار کر دیا تو پھر قریش کا بچہ بچہ قیامت تک کے لیے نسلاً نسلاً ختم کر دیا جائے گا۔ آپ ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیں، جس کے مقدر میں اسلام ہے وہ اسلام لے آئیں، جن کے مقدر میں کفر ہے وہ کفر میں مر جائیں گے اور یہ عالم جو ہے وہ چلتا رہے گا۔

چونکہ آپ ﷺ جانتے تھے کہ ضدی قوم ہے، کہیں معجزات دیکھنے کے بعد ضد پر نہ آ جائے، جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کا قہر ٹوٹ پڑے گا۔ دیکھا نہیں کہ فرعون کی قوم نے خود مطالبات کیے، جب پورے ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے پوری قوم کو غرق کر ڈالا۔ یہ تو سنت اللہ فی الدین ہے، ﴿سُنَّةَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلُ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ﴾ [الفتح: ۲۳] یہ تو اللہ تعالیٰ کی سنت جاریہ ہے، اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔

ایسی قومیں جب مانگتی ہیں تو علماء نے لکھا ہے کہ یاد رکھو! آدمی خود کہے کہ یا اللہ! یہ چیز دے دے، پھر میں تیری نافرمانی نہیں کروں گا اور اس کے بعد اگر نافرمانی ہوتی ہے تو پھر پکڑ آ جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے بس یہ معافی مانگتا رہے کہ اللہ! میں تیرا بندہ ہوں، عاجز ہوں، میں اتنی طاقت ہی نہیں رکھتا کہ تیرے احکام کی بجا آوری کر سکوں۔

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: مولا! تیری عبادت کا جیسا حق ہے ویسے ہم نے تیری عبادت نہیں کی، ہم نے تیری شان کو پہچانا نہیں، ہم نے تیری معرفت حاصل نہیں جو حقیقی معنوں میں تیری معرفت ہے، اور ہم نے صحیح معنوں میں

تیری نعمتوں کا شکر بھی ادا نہیں کیا، بلکہ ہم تو اللہ کا شکر کرنے کی طاقت ہی نہیں رکھتے کہ تیری نعمتوں کا شکر ادا کر سکیں۔

اسی لیے حضور پاک ﷺ نے اپنی اُمت کو سبق پڑھایا۔ جب بھی دعا مانگو تو کہو:

"اَللّٰھُمَّ اِنِّي أَسْأَلُكَ الْعَفْوَ وَ الْعَافِيَةَ فِي الدُّنْيَا وَ الْآخِرَةِ." [سنن ابن ماجہ، رقم: ۳۸۷۱]

اے اللہ! ہمیں معافی عطا فرما اور عافیت بھی عطا فرما۔ بہت سے لوگ ہوتے ہیں جو بڑی باتیں اپنے منہ سے نکال پھینکتے ہیں۔ یا اللہ! آپ دیکھیں کہ آدمی جب نئے نئے مکہ مکرمہ میں آتے ہیں تو ان کی نماز، روزہ دیکھیں، ان کا طواف اور احرام دیکھو۔ جب ایک سال گزر جائے گا تو بیس فیصد کمی آجائے گی اور جب چار پانچ سال کا ہو جائے تو پھر آپ کو ہدایت بھی کریں گے کہ کیا کر رہے ہو؟ یہ عربیوں کو کیا تم نہیں دیکھتے، یہ مکے والے بھی تو سگریٹ پیتے ہیں، ہمیں کہتے ہیں کہ سگریٹ نہ پیو۔ حالانکہ ہر آدمی یہ جانتا ہے کہ انہوں نے کلمہ ان عربوں کا نہیں پڑھا، ہم نے کلمہ محمد رسول اللہ ﷺ کا پڑھا ہے، ہمارے لیے نمونہ اور اُسوہ وہ مدنی ﷺ کی ذات ہے۔

کی محمد سے وفا تُو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

اگر یہ عربی محمد مدنی ﷺ کے غلام بنیں گے تو ہم ان کے غلام ہوں گے، پھر ہم ان کے غلاموں کے بھی غلام بننے کے لیے تیار ہو جائیں گے، اور دین محمد مصطفیٰ ﷺ کو انہوں نے اگر خود چھوڑ دیا تو وہ پہلے پکڑے جائیں گے؛ کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کی سنت جاریہ ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میرے نبی کی بیویو! خبردار! تم اور عورتوں کی طرح نہیں ہو، محمد ﷺ کی بیویاں ہو، تمہارے گھروں میں قرآن اُترتا ہے، اگر تم نے غلطی کی تو تم کو دوگنا عذاب دوں گا، اگر تم سے کوتاہی ہوئی تو تمہیں ہم زیادہ پکڑیں گے۔

وجہ کیا ہوتی ہے؟ خود قرآن پاک میں فرمایا کہ دیکھو! جب ہم خود کسی بندے کو پکڑ لیتے ہیں، ہم کسی بندے پر سختی بھیجتے ہیں، بیماری اور دکھ بھیجتے ہیں تو مجھ سے بڑی لمبی لمبی دعائیں کرتا ہے اور جب ہم وہ تکالیف ہٹا دیتے ہیں اور اس پر نعمتیں بھیج دیتے ہیں تو ہمیں ایسے بھول جاتا ہے کہ یاد ہی نہیں کہ میرا کوئی خدا ہے، یاد نہیں کہ میرا کوئی پیدا کرنے والا ہے، یاد ہی نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے فرائض نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج بھی ہے۔

اللہ سے دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں صراطِ مستقیم پر رکھے اور ہمیں امتحان اور ابتلاؤں سے بچائے اور معافی عطا



فرمائے۔ کیونکہ ہم بالکل عاجز ہیں اور ہم بالکل ناکارہ ہیں اور ہم آج اس دور سے گزر رہے ہیں جو قیامت کے قرب کا دور ہے اور یہ بھی دور ابتلاء اور فتن کا ہے۔ یہ ایسا دور ہے کہ اگر کوئی آدمی دسویں حصے کے برابر بھی دین پر عمل کر رہا ہے تو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے شکر و کرو کہ چلو کوئی دین کا نام لینے والا تو ہے؛ کیونکہ جب فتنے ہر طرف سے منہ کھولے ہوئے ہوں، حرام عام ہو جائے، کفر عام اور بدعات دین بن جائیں، جو نماز پڑھتے ہیں وہ تو ملاں قسم کا گھرانہ ہے اور جن کے گھروں میں قرآن کریم پڑھا جائے وہ تو یہ سمجھو کہ چودہ سو سال پرانے لوگ ہیں۔

آج عزت کی علامت کیا ہے؟ کون لوگ عزت دار سمجھے جاتے ہیں؟ جن کے گھروں میں پردہ نہ ہو، جن کے گھروں کے اندر وی سی آر چلتے ہوں، جن کے گھروں میں ڈانس فلور ہوں اور جن کی لڑکیاں دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر ڈانس کرتی ہوں، ہوٹلوں میں جاتی ہوں، دوپٹے جن کے اُڑتے ہوں، نئے سال منائے جائیں تو اپنی اور پرائی بیوی کا پتہ نہ ہو اور پرائی بیٹی اور بہن کا پتہ نہ ہو۔ یہ بڑے آدمی کی علامات ہیں تو اس دور میں اگر کوئی حیا کرتا ہے اور نماز، روزہ کرتا ہے تو شکر و کرو، کہ وہ تو کوئی مجاہد ہے کہ اب بھی خدا کا نام لیتا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ آپ کی صفات ہر جگہ موجود ہیں، اگر کوئی نہ مانے تو نہ ماننے والوں کا قصور ہے، آپ پر تو کوئی سوال نہیں آئے گا۔

﴿وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ؕ قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ؕ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ الَّذِيْ جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ؔ۝۱۲۰ اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ ؕ اُولٰٓئِكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ؕ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝۱۲۱﴾

[البقرة: ۱۲۰، ۱۲۱]

''اور آپ سے یہود اور نصاریٰ ہرگز راضی نہیں ہوں گے، حتیٰ کہ آپ ان کے دین کی پیروی کریں۔ آپ کہہ دیجیے: جو راہ اللہ بتادے، وہی سیدھی راہ ہے۔ اور اگر بالفرض آپ نے ان کی خواہشات کی پیروی کی اس کے بعد کہ آپ کے پاس علم آ گیا تو آپ کو اللہ سے بچانے والا اور کوئی مددگار نہ ہوگا۔ وہ لوگ جن کو ہم نے کتاب دی وہ اس کو اس طرح پڑھتے ہیں جیسا کہ اس کے پڑھنے کا حق ہے۔ یہی لوگ اس پر ایمان رکھتے ہیں، اور جنہوں نے اس کا انکار کیا وہ نقصان (جہنم) میں رہیں گے۔''

گزشتہ آیات میں یہود و نصاریٰ اور مشرکین کے نبوتِ محمدی پر اعتراضات کا رد تھا۔ اب ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے ایک قاعدہ بیان فرمادیا کہ آپ یہود و نصاریٰ کو سمجھانے کے لیے جتنی محنت کریں، یہ راضی نہیں ہو سکتے۔ ہاں! ایک صورت میں راضی ہو سکتے ہیں کہ آپ اپنا دین چھوڑ کر ان کے دین کے تابع ہو جائیں۔ اور ان کا دین اختیار کرنا تو محال ہے، وہ تو حضور اکرم ﷺ کبھی نہیں کر سکتے؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے تو وہ باطل کی پیروی کیسے کریں؟

اور اسی میں اُمت محمد مصطفیٰ ﷺ کو ایک سبق دیا گیا کہ آپ یہود و نصاریٰ کی کتنی خوشامدیں کریں، آپ ان کی کتنی شرائط مان لیں، آپ ان کے کتنے خیر خواہ بن جائیں، وہ کبھی آپ سے راضی نہیں ہو سکتے جب تک کہ آپ یہودی یا نصرانی نہ بن جائیں۔

اس سے ایک بات واضح ہوگئی کہ کبھی کوئی کافر اور گمراہ فرقہ آپ پر راضی نہیں ہو سکتا، جب تک کہ آپ ﷺ اپنا دین چھوڑ کر اس کی پیروی نہ کریں۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے دوسری جگہ بیان فرمایا: اے ایمان والو! یہود و نصاریٰ سے دوستی مت کرو؛ کیونکہ کافر ایک دوسرے کا دوست تو ہو سکتا ہے، مسلمانوں کا دوست نہیں ہو سکتا۔

آپ تاریخ عالم پر نظر ڈال کر دیکھ لیں! پوری دنیا میں مشرق سے مغرب اور شمال سے جنوب تک کفر جس رنگ میں ہے، ان کے نام تو علیحدہ ہو سکتے ہیں، مگر ''اَلْكُفْرُ مِلَّةٌ وَّاحِدَةٌ''، کفر ایک جماعت ہے، اب کا سب سے بڑا دشمن اسلام ہے۔ اسی طرح مسلمانوں میں فرقِ باطلہ کا حال ہے کہ وہ جماعت حقہ سے تب تک راضی نہیں ہو سکتے جب تک ان کے فرقہ میں شامل نہ ہو جائیں۔

اسی طرح ہمارے بڑے بڑے مولوی صاحبان اور مبلغ حضرات تو بیچارے کوشش کرتے ہیں کہ ہم کسی باطل کے ساتھ نہ ٹکرائیں، ان کا مقابلہ اور ان سے سخت بات نہ کریں اور کسی بدعت والے سے نہ لڑیں، کسی بغض صحابہ والے سے جھگڑا نہ کریں، کسی بغض اہل بیت والے کی کھل کر مخالفت نہ کریں۔ ان سے ملتے اور ان کی مجلسوں میں جاتے ہیں اور دعوتوں میں شریک ہو جاتے ہیں، اور دل میں یہ ہوتا ہے کہ نرمی اختیار کر کے ان کو قائل کریں گے اور راستہ پر لے آئیں گے۔ لیکن آپ لوگ بتائیں کہ وہ آج تک کتنے لوگوں کو لے آئے ہیں؟ کبھی کوئی اہل بدعت آپ سے راضی نہیں ہو سکتا، آپ لاکھ راضی کر لیں، جب تک آپ اچھے طریقے سے بدعات نہ کرو، وہ کبھی آپ کو مسلمان ماننے کے لیے بھی تیار نہیں۔

کتنے ہمارے ایسے لوگ ہیں کہ اگر قل خوانی ہو تو کہتے ہیں کہ یہ ایک رواج بن گیا، آدمی مر جاتے ہیں تو تیسرے دن قل خوانی ہوتی ہے، اب نہ جائیں تو جھگڑے ہوں گے، برادری ناراض ہوگی اور اس کے بعد فتنے کھڑے ہو جائیں گے۔ چپ کر کے چلے جائیں گے، چلو زیادہ سے زیادہ تقویٰ کرنا ہے تو چاول نہیں کھائیں گے، چپ کر کے بیٹھ جائیں گے۔ آپ جائیں، بیٹھ جائیں، چاول نہ کھائیں، پھر بھی وہ کہیں گے کہ دیکھا جی! دہابی ہے، بس ویسے ہی ہمیں خوش کرنے کے لیے آیا تھا۔

ہمیشہ یاد رکھیں کہ حق بات کے لیے آپ کو ہمیشہ کھل کر بات کرنا پڑے گی اور اس کا نتیجہ کیا ہوگا کہ آپ اگر مولوی، خطیب، واعظ یا کچھ بھی ہیں، جس دن آپ نے کھل کر توحید بیان کی، اسی دن جھگڑا شروع ہو جائے گا، لیکن اسی دن لوگ آپ کے ساتھ جڑنا بھی شروع ہو جائیں گے۔ اگر پچاس آدمی آپ کو گالی دیں گے تو پچاس آپ کے ساتھی بھی بن جائیں گے۔ جس دن آپ حق کا مسئلہ سنائیں گے، سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ حق کا اثر نہ ہو۔

اگر یہ نرم پالیسی ہو تو مکہ والے حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں آئے اور کہنے لگے: آپ ایسا کریں کہ ایک سال ہمارے مذہب کو اختیار کریں، ایک سال ہم آپ کا مذہب مان لیتے ہیں۔ ایک سال آپ کا دین چلے گا ہمارا مذہب ختم، ایک سال پھر آپ ہمارے مذہب پر رہیں آپ کا دین ختم۔ اچھا! بعد میں کچھ یوں بھی آ گئے کہ آپ ایسا کریں، آپ اپنا کام تو کریں، لیکن ہمارے خداؤں کا نام نہ لیں، بس ہماری تردید نہ کریں، آپ لوگوں سے یہ کہیں کہ اللہ کو مانو، مجھے نبی مانو، میرا کلمہ پڑھ لو، لیکن یہ نہ کہو کہ یہ مشرک ہیں، یہ جہنمی اور کافر ہیں، یہ لات وعزیٰ کے بندے ہیں۔ یہ بات نہ کریں تو پھر بھی ہم آپ کے ساتھ گزارا کرتے ہیں۔

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: بدبختو! کیا کہتے ہو؟ اگر سورج اور چاند بھی لا کر میرے ہاتھ پر رکھ دو تو میں پھر بھی اللہ کی توحید کو نہیں چھوڑ سکتا۔ جب حضور اکرم ﷺ نے توحید کی بات شروع کی تو اب ایک ایک موتی نکلنا شروع ہوا، کبھی صدیق اکبر رضی اللہ عنہ، کبھی عمر فاروق رضی اللہ عنہ، کبھی عثمان غنی رضی اللہ عنہ وعلی رضی اللہ عنہ اور کبھی بلال آئے۔ کبھی دس ہوئے، کبھی بیس ہوئے، پھر ہجرت شروع ہوئی، دین حبشہ تک پہنچ گیا، پھر میرا مدنی ﷺ مدینہ پہنچ گیا اور پھر اسلام پھیلنا شروع ہو گیا۔

ہمارے مسلمانوں نے ان کی طرح داڑھیاں منڈوائیں، ان کی طرح سوٹ پہنے، ان کی زبان انگریزی اپنائی، ان کی طرح سود کھایا اور کلب، ہوٹل اور شراب خانے بنائے۔ ہر کام میں ان کی نقل کر لی، لیکن وہ راضی نہ

ہوئے۔ بعض ہمارے نقل کرنے والے ان سے بھی آگے نکل گئے، انہوں نے اپنی لڑکیوں کو منی سکرٹ پہنائی، مسلمانوں نے بھی پہنائی، انہوں نے اپنی لڑکیوں کو بے پردہ کیا، ڈانس کلب میں لے گئے، انہوں نے شراب پی اور خنزیر کھایا اور انہوں نے سود کھایا اور بینکوں پر ایمان رکھا، اور یہ سب کام مسلمانوں نے بھی کیے۔ یعنی مسلمانوں نے بھی بعینہ ایسے کام کیے کہ آپ فیصلہ نہیں کر سکتے کہ وہ انگریز ہیں یا مسلمان ہیں، لیکن اس کے باوجود وہ آپ سے راضی نہیں ہوئے۔ وہ آج بھی کہتے ہیں کہ یہ مسلمانوں کا ملک ہے، اس کو رگڑ لگاؤ۔ حالانکہ ان کو پتہ ہے کہ اس میں رہنے والے نوے فیصد ہماری برادری کے لوگ ہیں، ہمارے کہنے پر چلتے اور ہماری شکل بناتے ہیں اور ہمارے سکولوں میں پڑھتے اور ہماری ڈگریاں لے کر نوکری حاصل کرتے ہیں۔ اس کے باوجود بھی وہ راضی نہیں، وہ کہتے ہیں کہ ہیں تو مسلمان ناں! ابھی یہ کہتا ہے کہ ہم مسلمان ہیں، یہ اسلام کا جو نام لیتا ہے، یہ نام لینا بھی ان کو برداشت نہیں۔

یاد رکھو! ایک نفی ہوتی ہے "لَا" کے ساتھ اور ایک نفی "لَمْ" کے ساتھ اور ایک نفی "لَنْ" کے ساتھ ہوتی ہے، یہ نفی تابید کے لیے ہوتی ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ﴾ [البقرۃ: ۲۴] کہ زمانہ ماضی میں بھی تم میرے قرآن کا مقابلہ نہیں کر سکے اور آئندہ قیامت تک بھی نہیں کر سکو گے تو وہاں بھی "لَمْ" اور "لَنْ تَفْعَلُوْا" دونوں لفظ آئے تھے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے یہاں فرمایا: ﴿وَلَنْ تَرْضٰی عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰی حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ﴾ [البقرۃ: ۱۲۰] ہرگز نہیں راضی ہوں گے یہود و نصاریٰ، جب تک آپ ان کی ملت اور ان کے طریقے کی اتباع نہیں کرو گے۔

یہ بھی یاد رکھیں کہ یہود و نصاریٰ کا تو صرف نام لیا کہ حضور اکرم ﷺ کے زمانے میں یہود و نصاریٰ ہی دو زیادہ مشہور مذہب تھے۔ یہی وہ لوگ تھے جو اہل کتاب ہونے کا دعویٰ کرتے تھے، جبکہ مشرکین مکہ کا کوئی مذہب ہی نہ تھا، ان کے پاس نہ تو کوئی کتاب تھی اور نہ دلیل تھی۔ ان کے پاس تو یہ تھا کہ جو پتھر اچھا لگا اسے خدا بنالیا اور جو اچھا نہ لگا اسے پھینک دیا۔ مشرکین مکہ تو اپنے خدا جیب میں رکھتے تھے۔ راستے میں چلے گئے، کوئی اور اچھا اور خوبصورت پتھر نظر آ گیا تو پرانا پھینک دیا اور نیا خدا جیب میں رکھ لیا کہ یہ ہمارا خدا ہے اس خدا کو ہم نے چھٹی دے دی۔ کبھی لات و منات اور کبھی عزیٰ کو پوجنا شروع کر دیا؛ کیونکہ ان کا کوئی مذہب تو تھا ہی نہیں۔

ویسے بھی مشرکین کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ جہاں کوئی جھنڈا نظر آیا تو ہاتھ باندھ کر اور سر جھکا کر کھڑے ہو گئے۔



سبز غلاف ڈال دو، یہ بھی پوچھنا گوارا نہیں کرتا کہ یہاں کوئی قبر بھی ہے کہ نہیں؟ آپ غلاف یا جھنڈی کو درخت یا ٹیلے پر ڈال دو اور کہو کہ رات مجھے پتہ چلا ہے کہ یہاں ایک بزرگ دفن ہے۔ بس کام شروع ہو گیا۔ کسی نے یہ تحقیق کرنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کرنی کہ یہاں اللہ کا کوئی بزرگ دفن ہوا بھی تھا یا نہیں؟

کسی کو زندہ پیر یا غازی پیر بنا دیں گے، کوئی صحابی پیر بنا دیں گے، یعنی حضور اکرم ﷺ کے صحابہ وہاں دفن ہیں، آج تک کسی نے تحقیق نہیں کی کہ کون سے صحابہ دفن ہیں؟ ان کا نام کیا تھا؟ کس جگہ سے تشریف لائے تھے؟ اور کس سن میں یہاں پہنچے تھے؟ اس کی تو ضرورت ہی نہیں ہے، بس سجدہ کرنا ہے، ہمیں جھنڈا چاہیے۔ اگر جھنڈا نہ ملے تو لوہے کا ایک پنجہ لگا دو، وہ اس سے شروع ہو جائیں گے۔ اگر وہ بھی نہ ملے تو ایک کالا کپڑا باندھ دو، وہ ایک کالا جھنڈا بن جائے گا۔ کیونکہ مشرک تو بس اپنی خواہشات کی پیروی کرنے والا ہوتا ہے، اس کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ البتہ یہود و نصاریٰ دعوے دار تھے کہ ہمارا دین ہے، ہمارے پاس تورات اور انجیل ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ان پڑھے لکھے لوگوں کا نام لیا۔ ان پڑھے لکھے لوگوں کا یہ حال ہے کہ ان کے دین پر نہ چلو تو راضی نہیں ہوتے تو یہ مشرک کبھی راضی نہیں ہوں گے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کا نام لے لیا، ورنہ مجوسی، روافض، خوارج، آغا خانی اور قادیانی، جتنے بھی باطل فرقے ہیں، آپ لاکھ ہمدردی کریں، لیکن آپ جب تک ان کی جماعت میں شامل نہیں ہوں گے، وہ راضی نہیں ہوں گے۔ اس لیے فرمایا: ﴿وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ﴾ [البقرۃ: ۱۲۰] دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں ملت اسلام پر رکھے اور اپنی رحمت سے ہمیں فرقہائے باطلہ سے بچائے۔

ابن کثیر رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے کہ ابن جریر رحمہ اللہ نے اس آیت کے بارے میں فرمایا کہ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ یہودی اور نصرانی یہ دونوں گروہ ہرگز راضی نہیں ہوں گے۔ لہٰذا آپ ان کو راضی کرنے کی کوشش کرنا چھوڑ دیں۔ آپ کو جس مقصد کے لیے اللہ تعالیٰ نے مبعوث کیا ہے، بس آپ اس پر رہیں اور اپنی دعوت پر جمے رہیں۔ ایسی آیات مبارکہ قرآن مقدس میں جہاں بھی ہیں، اصل خطاب تو حضور پاک ﷺ کو ہے، لیکن اس سے مقصود اُمت کو تنبیہ ہوتی ہے کہ اُمت کو یہ بات سمجھ آ جائے کہ جب اتنا بڑا حکم اللہ اپنے نبی کو فرما رہے ہیں تو اگر غیر نبی نے کوئی ایسی بات کی تو اس کا انجام کیا ہوگا؟



اس آیت مبارکہ کو سامنے رکھیں اور پورے عالم پر نظر ڈالیں! مسلمان جس ملک میں بھی ہیں وہ اقتصادی، معاشی، معاشرتی اور طاقت کے لحاظ سے ہر جگہ ذلیل ہو رہے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے صاف صاف فرمادیا ہے کہ آپ یہود و نصاریٰ کی پیروی نہ کریں، وگرنہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کا کوئی مددگار نہیں ہوگا۔ جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے مدد اُٹھ جائے تو ہم ذلیل ہو جائیں گے۔ چونکہ مسلمانوں کے لیے اصل نصرت تو اللہ ہی کی طرف سے ہے، جب اللہ تعالیٰ نے اپنی ہدایت اور نصرت واپس لے لی تو پھر ہم جیسا بیکار دنیا میں کوئی نہیں، پھر نہ ہم دنیا کے رہیں گے اور نہ دین کے۔ یعنی ہم نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی نافرمانی کی ہے، ان کو ناراض کرلیا ہے اور جن کو راضی کرنے کے لیے چلے تھے وہ بھی ہمارے نہ بنے، وہ بھی ہمیں منافق سمجھتے ہیں کہ جب یہ اپنا دین چھوڑ سکتے ہیں تو ہمارے ساتھ کہاں رہیں گے؟ ان کی نظروں میں بھی ہم منافق بن گئے، اللہ اور اس کے رسول ﷺ کو بھی ہم نے ناراض کرلیا تو ہم نہ اِدھر کے رہے اور نہ اُدھر کے رہے۔ اب ادھر اللہ تعالیٰ کے عذاب بھی ہم پر ٹوٹ رہے ہیں اور دشمنوں کی مار بھی پڑ رہی ہے۔

حضرت علاء حضرمی رضی اللہ عنہ کی قبولیت دعاؤں کا تذکرہ:

حضرت علاء بن الحضرمی رضی اللہ عنہ ایک لشکر کی قیادت فرما رہے ہیں۔ اس لشکر والوں نے عرض کیا کہ حضرت! ہم ایک ایسے صحراء میں اُلجھ گئے، راستہ بھول گئے، میلوں تک پانی نہیں ہے، ہمارے پاس جو پانی ہے وہ زیادہ سے زیادہ ایک دو گھنٹے نکال دے گا اور اس کے بعد لشکر اور جانور، اونٹ، گھوڑے اور انسان پانی کے بغیر ہم کب تک زندہ رہیں گے؟ انہوں نے فرمایا کہ غم کرنے کی کوئی بات نہیں۔ آپ نے اسی وقت تیمم فرما کر دو رکعت نماز پڑھی، پھر ہاتھ اُٹھائے اور یہ الفاظ ''اَللّٰھُمَّ یَا عَلِیْمُ، یَاحَلِیْمُ، یَا عَلِیُّ، یَا عَظِیْمُ'' کہے اور اسماء اللہ کے ساتھ دعا کی اور دو لفظ کہے کہ یا اللہ! ہم تیرے بندے ہیں اور آپ کو ہماری نیتوں کا پتہ ہے، اگر ہم تیرے نام کی بلندی کے لیے نکلے ہیں تو ہماری مدد فرما اور اگر ہماری نیت کے اندر کھوٹ ہے تو پھر ٹھیک ہے، ہمیں مرنا چاہیے۔ اتنی سی دیر تھی۔ لشکر والے کہتے ہیں کہ ابھی علاء الحضرمی نے ہاتھ بھی نیچے نہیں ڈالے تھے کہ اسی وقت اللہ تعالیٰ نے بادل بھیج دیئے، بارش برسنے لگی، پانی ہی پانی جمع ہوگیا، گڑھے بھر گئے، جانوروں نے پانی پی لیا، راستے کا سامان ہوگیا۔ وہ صحراء اور ریت جو عذاب بن گئی تھی، وہ جم گئی اور راستہ بھی بن گیا۔

اس کے بعد وہی لشکر دریا پر جا پہنچا اور کوئی پُل اور راستہ وسائل اور کشتی نہیں ہے، پھر لشکر والے کہنے لگے: حضرت! دریا کیسے عبور کریں؟ فرمایا: کوئی بات نہیں۔ اسی وقت دو رکعت نماز پڑھی اور دعا مانگی۔ فرمایا: چلو، دریا میں سواریاں ڈال دو۔ اس طرح صحابہ رضی اللہ عنہم نے دریا عبور کرلیا۔ آپ نے فرمایا کہ کسی کی کوئی چیز تو نہیں رہ گئی تو صحابہ نے فرمایا: کسی کی کوئی چیز نہیں گری۔

آج تم سارے مولوی اکٹھے کر کے زور لگالو اللہ رحمت کرے جو پہلے امید ہوتی ہے وہ بھی ختم ہو جاتی ہے۔ آخر وجہ کیا ہے؟ آپ تو قرآن ان سے زیادہ پڑھتے ہیں، دعائیں بھی آپ بڑی بڑی مانگتے ہیں۔ صحابہ نے تو میرے خیال میں کبھی ایک دن میں دو طواف اکٹھے نہیں کیے ہوں گے، آپ لوگ تو ماشاء اللہ! دس دس طواف اکٹھے کرتے ہیں اور ایک ایک دن میں پانچ پانچ عمرے بھی اکٹھے کر لیتے ہیں۔ ماشاء اللہ! بڑی جدوجہد کر رہے ہیں، لیکن حالات وہی ہیں۔ آخر کیا وجہ ہے؟ یاد رکھو! اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے اندر حرام آگیا ہے اور جب بدن میں حرام داخل ہو جائے تو دعائیں قبول نہیں ہوتیں۔

اس لیے یاد رکھیں کہ جب تک عالم اسلام یہود و نصاریٰ کے تابع رہے گا، اس کی پیروی کرے گا اور ان کے حکم پر چلے گا تو اللہ کی نصرت ختم ہو جائے گی اور مسلمان ذلیل ہو جائیں گے اور جس دن اپنے اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے لیے کھڑا ہو گیا اور اپنے اللہ کو راضی کر لیا، اس دن یہ یہود و نصاریٰ اور مجوسی وہ تو تمہارے نام سے ڈرے گا۔ اب تو ہم قصے سنتے ہیں تو عجیب لگتے ہیں۔

مسواک کی سنت کے اثر کا واقعہ:

ایک مرتبہ ایک کافر مسلمانوں کے لشکر میں جاسوسی کر رہا تھا۔ نماز کا وقت آیا تو مسلمان مسواک کر رہے تھے۔ اس نے جلدی سے جا کر اپنی فوج کو رپورٹ دی کہ ان کے ساتھ مت لڑو؛ کیونکہ یہ تو دانت تیز کر رہے ہیں، ہمیں کھا جائیں گے۔ اس کو پتہ تو نہیں تھا کہ مسواک کیا چیز ہے؟ یعنی مسلمان کی مسواک کی سنت کا یہ اثر تھا کہ کافر بھاگ گئے۔ مسلمانوں کے نعرہ تکبیر میں یہ اثر ہوتا تھا کہ ہزاروں کافروں کا مسلح لشکر ہے اور چار سپاہی وہ بھی نہتے ہیں تو اللہ اکبر کہتے تھے، سب کافر ہتھیار ڈال دیتے تھے۔ ان چار نے ان کے ہتھیار سے ہزارہا آدمیوں کو آگے لگایا ہوا ہے۔ اب تو ایک کافر بھی نہیں ڈرتا۔ آخر وجہ کیا ہے؟ کہ نعرے بڑھتے جا رہے ہیں، کافر اور بہادر ہوتا جا رہا ہے۔

محمد بن قاسم اور فتح ہندوستان:

آپ اندازہ فرمائیں کہ چار یا پانچ لڑکیاں تھیں، دیبل کی بندرگاہ پر جن کو راجا داہر نے گرفتار کیا تھا۔ ان لڑکیوں نے کوئلے سے ایک رومال پر خط لکھ کر بھیجا کہ بھئی! ہم مسلمان لڑکیاں ہیں اور راجا داہر کافر کی فوج نے ہمیں پکڑ لیا ہے، ہماری عصمت لوٹی ہے اور ہم اس کی قید میں ہیں۔ مسلمانوں کی غیرت جاگ اُٹھی کہ اپنی بیٹیوں کو رہا کروائیں۔ محمد بن قاسم رحمۃ اللہ علیہ یہاں سے یلغار کرتا ہوا چلا، کفر کو روند دیا، تباہ و برباد کر دیا اور پورا ملک فتح کر لیا۔

آج دیکھیے! ہم مسلمانوں کی پانچ پانچ سو عورتوں کی ہندو ڈانس کروا کر فلمیں بنواتے ہیں اور ہم بے غیرت زندہ ہیں۔ ان کے ساتھ ہماری دوستیاں اور تعلقات ہیں، ہم ان کی چیزیں خریدتے اور ان کے ساتھ تعاون کرتے ہیں۔ ہندو اور وہ بھی بت پرست، یہود و نصاریٰ بھی نہیں۔ یعنی جن کو مسلمان کے نام سے ڈر لگتا تھا کہ مسلمان کا نام بھی تو ہندو کانپنا شروع کر دیتا تھا۔ ہندو کی تاریخ میں بزدلی، مکاریت اور اتنی بزدل قوم تھی کہ کروڑپتی ہندو لوگ تو ایک آواز سے دبک جایا کرتے تھے اور تین دن کے لیے گھر سے باہر نہیں نکلتے تھے۔ آج وہ ہندو مسلمانوں کی عزتوں سے کھیلتا ہے۔ وجہ کیا ہے کہ اسلام ہے ہی نہیں۔

آپ وہاں چلے جائیں، دیکھ لیں، آپ کو پتہ نہیں چلے گا کہ وہ ہندو ہے یا مسلمان؟ وہ بھی داڑھی کٹواتا ہے، مسلمان بھی کٹواتا ہے... ہندو سوٹ پہنتا ہے تو مسلمان بھی پہنتا ہے... ہندو لڑکی تلک لگاتی ہے تو مسلمان عورت بھی تلک لگواتی ہے... مسلمان لڑکی عائشہ کہلواتی ہے اور ہندو اوشی کہلواتی ہے... پردہ اور لباس دونوں کے عریاں ہیں... بازاروں میں ہندو اور مسلمان لڑکیاں دونوں پھرتی ہیں۔ ان دونوں میں کسی کو فرق معلوم نہیں ہوتا کہ مسلمان کون ہے اور غیر مسلم کون؟ تو ہندو مسلمان سے کیوں ڈرے گا؟ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ راضی ہو جائے اور مسلمانوں کو اپنے دروازے پر گر کر توبہ کرنے کی توفیق دے دے۔

انفرادی اور اجتماعی گناہ کی معافی کا طریقہ:

یاد رکھو! گناہ جب تک اکیلے ہو تو توبہ اکیلے کافی ہوتی ہے، یعنی مجھ سے گناہ ہو گیا تو مجھے کرنی چاہیے، لیکن جب گناہ اجتماعی ہو جائے اور جس میں پوری امت مبتلا ہو جائے تو جب تک توبہ بھی اجتماعی نہیں ہوتی تو اللہ تعالیٰ کی رضا بھی حاصل نہیں ہوگی۔ اب تو امت کو اجتماعی طور پر اللہ کے دروازے پر گرنا چاہیے، اجتماعی طور پر توبہ اور اللہ تعالیٰ



کو راضی کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ قرآن کہتا ہے کہ یہود و نصاریٰ کبھی آپ سے راضی نہیں ہو سکتے تو پھر ہم کیسے راضی کر سکتے ہیں؟ جس اللہ نے پیدا فرمایا، وہی اللہ فرما رہے ہیں کہ یہ کبھی آپ سے راضی نہیں ہو سکتے۔

حق پر قائم رہنے والی جماعت:

حضور پاک ﷺ نے فرمایا: ہمیشہ میری امت میں ایک جماعت ایسی رہے گی جو حق کے لیے جہاد کرتی رہے گی اور اپنے حق پر اللہ کی مدد سے غالب ہوگی اور ان کو کوئی مخالفت کرنے والا نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔ غالب کا معنی یہ ہوتا ہے کہ وہ حق کے دلائل کے ساتھ غالب رہے گی۔ پوری دنیا کے ہر ملک، ہر علاقے میں الحمد للہ! ایسی جماعت موجود ہوتی ہے جو دین پر قائم ہے، جو اللہ تعالیٰ کی توحید اور رسول پاک ﷺ کی رسالت اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے طریقے پر قائم ہے۔

ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حدیث صحیح میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر ﷺ سے فرمایا: ہم نے آپ کو علم اور نبوت عطا فرمائی اور ہم نے آپ کو خبر دی کہ یہود و نصاریٰ کبھی آپ کے خیر خواہ نہیں ہو سکتے۔ اگر اس کے بعد آپ نے ان کی اتباع کی تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے مدد نہیں ہوگی۔

مفسر رحمۃ اللہ علیہ کا طرزِ استدلال:

مفسر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بہت سے فقہاء کرام نے اس آیت سے یہ استدلال کیا ہے کہ کفر جس انداز میں بھی ہو، ایک ملت ہے۔ جب ملت کو مفرد ذکر کیا گیا تو معلوم یہ ہوا کہ تمام کفر ایک ملت کی طرح ہے خواہ وہ کسی قسم کا ہو۔

مفسر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے میرے مدنی پاک! آپ ان کو فرما دیں کہ میرا راستہ الگ، تمہارا الگ ہے۔ اس وجہ سے مفسرین اور فقہاء نے یہ مسئلہ نکالا کہ مسلمان، کافر کا اور کافر، مسلمان کا وارث نہیں بنے گا۔ اگر کافر مر جائیں تو پھر وہ ایک دوسرے کے وارث بن سکتے ہیں، یعنی یہودی اور نصرانی، ہندو یا یہودی کا۔ کیونکہ کفر ایک ملت ہے۔ اسی کے مطابق امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ، امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے فتویٰ دیا ہے۔

مفسر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایک قول امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا یہ بھی ہے کہ جیسے مسلمان، کافر کا وارث نہیں بن سکتا تو کافر بھی مسلمان کا وارث نہیں بن سکتا۔ اسی طرح یہودی، نصرانی کا اور نصرانی، یہودی کا وارث نہیں بنے گا۔ ہر آدمی اپنی اپنی ملت کا وارث بنے گا۔ یعنی ائمہ ثلاثہ فرماتے ہیں کہ کفار سب ایک ملت ہیں، جبکہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے ایک

قول کے مطابق کفر ہر قسم کے اعتبار سے علیحدہ علیحدہ ہیں۔

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ یہ آیت ان اہل کتاب کے بارے میں ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ماننے والے، ان کی بات پر عمل کرنے والے مومن۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور انجیل کو ماننے والے مومن اور پھر اہل کتاب میں سے جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے سعادت عطا فرمائی، وہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ابھی ایمان لے آئے، قرآن پر بھی ایمان لے آئے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کو دوہرا اجر عطا فرمایا: ﴿أُولَٰئِكَ يُؤْتَوْنَ أَجْرَهُم مَّرَّتَيْنِ بِمَا صَبَرُوا وَيَدْرَءُونَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ﴾ [القصص: ۵۴] ایک اپنی کتاب پر عمل کرنے کا اور ایک اللہ کے قرآن پر عمل کرنے کا۔

اور بعض علماء فرماتے ہیں کہ اس آیت کا اہل کتاب سے تعلق نہیں ہے، بلکہ اس آیت کا تعلق اصحاب محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وہ لوگ جن کو ہم نے قرآن عطا فرمایا، وہ اس کو ویسا ہی پڑھتے ہیں جیسا کہ پڑھنے کا حق ہے۔ اس کے کیا معنی ہیں؟ بعض علماء نے فرمایا کہ اس کا معنی یہ ہے کہ جب قرآن پڑھے تو قرآن پاک کے مخارج کی قراءت میں لحن اور الفاظ کی ادائیگی کا خیال رکھے، کہیں غلط نہ پڑھے اور کوئی رحمت کی آیت آجائے تو اللہ سے رحمت مانگے اور جب عذاب کی آیت آجائے تو اللہ تعالیٰ سے پناہ مانگے اور جہاں کوئی تسبیح کی آیت آجائے تو اللہ تعالیٰ کی تسبیح و تقدیس بیان کرے، جہاں استغفار کی آیت آئے تو استغفار کرے اور جہاں دعائیں آئیں تو وہاں اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگے۔ یہ ہے قرآن کی تلاوت کا حق۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: مجھے قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے! قرآن کو صحیح پڑھنے کا معنی یہ ہے کہ جن چیزوں کو قرآن حلال کہتا ہے ان کو حلال سمجھے اور جن کو حرام کرتا ہے ان کو حرام سمجھے۔ اور قرآن اسی طرح پڑھے جس طرح اللہ تعالیٰ نے اُتارا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے قرآن میں کوئی بھی تحریف نہ کرے، نہ لفظی اور نہ معنوی۔ اللہ کے قرآن کے ترجمے میں بھی کوئی تبدیلی نہ کرے۔ جو اللہ پاک نے فرمایا، اسی پر قائم رہے۔

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے تھے: قرآن صحیح معنی میں پڑھنے کا مطلب یہ ہے کہ جو قرآن کی محکم آیات ہیں ان پر ایمان لے آئے اور جو متشابہ آیات ہیں ان کو محکمات کے تابع کر دے اور اگر مشکلات القرآن آجائیں اور سمجھ نہ آئیں تو کسی قرآن کے عالم کے پاس چلا جائے، اس سے سمجھے اور اس کے مطابق چلے۔

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ جو قرآن کی پیروی کرے گا اس کا دامن پکڑے گا تو قرآن اس کو ریاض الجنۃ میں پہنچائے گا۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جب تم قرآن پڑھو تو جب رحمت کی آیت آئے تو اللہ تعالیٰ سے رحمت کا سوال کرو اور جب کوئی عذاب کی آیت آئے تو اللہ تعالیٰ کے عذاب سے پناہ پکڑو۔ ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم جب قرآن پڑھتے اور رحمت کی آیت پر آتے تو اللہ تعالیٰ سے رحمت کا سوال کرتے اور عذاب کی آیت پر آتے تو اللہ تعالیٰ سے پناہ طلب کرتے۔

صحیح حدیث میں ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"مَا مِنْ أَحَدٍ يَسْمَعُ بِيْ مِنْ هٰذِهِ الْأُمَّةِ وَ لَا يَهُوْدِيٌّ، وَ لَا نَصْرَانِيٌّ وَ لَا يُؤْمِنُ بِيْ إِلَّا دَخَلَ النَّارَ."

[مستدرک الحاکم، رقم:۳۳۰۹]

خدا کی قسم! جس شخص نے میری نبوت کے بارے میں سنا، چاہے وہ یہودی ہے یا نصرانی ہے، اس کو میری نبوت کی اطلاع مل گئی، پھر وہ مجھ پر ایمان نہیں لایا تو وہ جہنم میں داخل ہوگا۔ کیونکہ جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم آ گئے تو پہلے والے تمام ادیان، کتابیں اور تمام شریعتیں منسوخ ہوگئیں۔ کوئی یہ کہے کہ میں یہودی بن کر نجات پا جاؤں گا یا میں نصرانی بن کر نجات پا جاؤں گا، یہ نہیں ہوسکتا۔ اب نجات کا صرف ایک ہی راستہ ہے اور وہ ہے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا۔ واللہ اعلم۔

﴿يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَي الْعٰلَمِيْنَ ۝ وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـــًٔا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ۝﴾

[البقرۃ:۱۲۲، ۱۲۳]

"اے بنی اسرائیل! میرے احسان کو یاد کرو جو میں نے تم پر کیا تھا اور اس کو کہ میں نے زمانہ والوں پر تمہیں بڑائی دی تھی۔ اور اس دن سے ڈرو جس دن کوئی شخص کسی کے کوئی کام نہ آئے گا اور نہ اس سے فدیہ وصول کیا جائے گا اور نہ اس کی سفارش کام آئے گی اور نہ ان کو مدد پہنچے گی۔"

بنی اسرائیل کو تذکر بآلاء اللہ:

اللہ تعالیٰ نے کلام مقدس کی ان آیات میں بنی اسرائیل کو خطاب فرمایا ہے۔ اور مفسرین کرام نے لکھا ہے کہ خداوند قدوس نے پورے قرآن میں تین مقامات پر بنی اسرائیل سے خطاب فرمایا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی قوم کو خطاب فرمانا اتنا بڑا اعزاز وشرف ہے کہ جس کا اندازہ اہل علم ہی کر سکتے ہیں۔ ورنہ اللہ تعالیٰ کی سنت تو یہ ہے کہ پروردگارِ عالم اپنے انبیاء اور رسولوں کو خطاب فرماتے ہیں اور انبیاء ورسل کو خطاب کے بعد حکم ہوتا ہے کہ اپنی اپنی امتوں کو یہ ہدایات پہنچادیں۔

خاص طور پر جتنی سابقہ کتب گزری ہیں، تورات وانجیل اور صحائف، ان میں تو سارا خطاب ہی انبیاء اور رسولوں کو ہے، البتہ یہ شان اور عظمت آپ کی اُمت کو ملی ہے کہ اللہ پاک نے اُمت محمد یہ ﷺ کو بھی کئی جگہ خطاب فرمایا، جیسے: ﴿يَاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا﴾ [البقرۃ:۲۱]، ﴿يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ [البقرۃ:۱۰۴]... یہ ایک بہت بڑا شرف ہے کہ اللہ کسی قوم کو خطاب فرمائے۔ کسی کو بادشاہ خود خط لکھ کر خطاب فرمائیں تو وہ خوشی سے اُچھلتا پھرے گا اور سب کو دکھاتا پھرے گا کہ مجھے بادشاہ سلامت نے خط لکھا ہے اور جو بادشاہوں کا بادشاہ اور ساری کائنات کے ذرہ ذرہ کا مالک ہے، وہ جب کسی کو خطاب فرمائے تو کتنا بڑا اعزاز ہے!! اور پھر خطاب بھی اتنے عظیم انداز میں فرمایا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے بنی اسرائیل! اے اولادِ یعقوب! تو اللہ تعالیٰ نے خطاب میں بھی ایک نسبت فرمائی کہ تم تو میرے ایک نبی کی اولاد ہو۔

پہلے دو خطاب اسی سورت میں گزر چکے ہیں۔ ان تین خطابات کے بعد اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو پھر کہیں مخاطب نہیں فرمایا؛ کیونکہ وہ اپنے اعمال، احوال کی وجہ سے اس اعزاز سے محروم ہو گئے، وہ تو اس قابل بھی نہ تھے کہ اللہ تعالیٰ دوبارہ ان کو خطاب فرمائے۔

بنی اسرائیل کو اللہ تعالیٰ نے جو خطاب فرمایا، مفسرین کی اصطلاح میں اس کو ''اَلتَّذْكِيْرُ بِنِعَمِ اللّٰهِ'' کہتے ہیں۔ اسی طرح کبھی ''اَلتَّذْكِيْرُ بِاَيَّامِ اللّٰهِ'' ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو خاص خاص دنوں کا ذکر کر کے ڈراتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو پہلے ''اَلتَّذْكِيْرُ بِنِعَمِ اللّٰهِ'' کے ساتھ مخاطب فرمایا، پھر اس کے بعد بنی اسرائیل کے احوال آئے۔ بنی اسرائیل نے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا حق نہیں ادا کیا اور پھر ان کے احوال ذکر کرنے کے بعد

"اَلتَّذْکِیْرُ بِنِعَمِ اللّٰهِ" پر اللہ تعالیٰ نے خطاب کو ختم فرمایا کہ جب تفصیلی نعمتوں کا ذکر اور ان کے احوال کا ذکر آ گیا، پھر اجمالی طور پر اللہ تعالیٰ نے دوبارہ مخاطب فرمایا، تا کہ شاید وہ پھر بندے بن جائیں اور ان کو ہدایت مل جائے۔ بنی اسرائیل پر اللہ تعالیٰ نے جو نعمتیں فرمائی ہیں، ان کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔

جنت میں حضور اکرم ﷺ کی اُمت کی کثرت:

حضور پاک ﷺ نے فرمایا کہ سب سے پہلے بھی ہم ہوں گے اور سب سے آخر میں بھی ہم ہیں۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے کہا: یارسول اللہ! اوّلون اور آخرون سے کیا مراد ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: باعتبار دخول جنت کے؛ کیونکہ جنت میں سب سے پہلے میری امت داخل ہوگی، لہٰذا ہم اوّل ہو گئے اور بعثت کے اعتبار سے میری اُمت سب سے آخر میں آئی تو سب سے آخر میں بھی ہم اہل جنت ہو گئے۔ یہ شرف میری اُمت کو ملا۔

اسی طرح ایک حدیث مبارکہ میں بھی آتا ہے کہ حضور پاک ﷺ نے ارشاد فرمایا: تم چوتھا حصہ ہو گے، یعنی تمام جنت والوں کا ایک چوتھائی ہوں گے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کچھ اُداس ہونے لگے تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ آدھے تم ہو گے اور آدھا سارا جہان ہوگا۔ اور ایک حدیث مبارکہ میں آیا ہے کہ تم دو حصے ہو گے، یعنی اگر جنت میں کل افراد کو لیا جائے تو دو حصے اُمت محمدیہ ﷺ کے ہوں گے اور باقی سارے جہاں سے ایک حصہ ہوگا۔

شرک کی مذمت:

حضور پاک ﷺ نے فرمایا کہ مومن ہر حال میں نفع میں ہے۔ اس پر مصیبت پڑے اور صبر کرے تب بھی درجہ ملے گا، نعمت ملے اور شکر کرے تب بھی درجہ ملے گا۔ مومن کے لیے توحید کتنی بڑی نعمت ہے!! لیکن جن لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی توحید کی نعمت کو چھوڑ دیا، نتیجہ کیا نکلا کہ غیروں سے اولادیں مانگ رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے وہ نعمت ہی چھین لی۔ ورنہ آخر آپ خود عقل والے لوگ ہیں، خود سمجھ سکتے ہیں کہ ایک چلتا پھرتا انسان جو زندہ ہے، چل رہا ہے، پھر رہا ہے، دوڑ رہا ہے، کام کر رہا ہے، وہ ان لوگوں کے پاس جا کر کھڑا ہوتا ہے جو فارغ ہو گئے اور اس دنیا سے بھی چلے گئے اور عالم بالا میں پہنچ گئے۔ ان سے جا کر کہتا ہے کہ آپ میری حاجت پوری کریں۔ ہم نے ایک سجدہ کا انکار کیا تو اللہ تعالیٰ نے ہمیں ہزاروں دروازوں پر گھما دیا، بس ٹھوکریں کھاتے رہو، پھرتے رہو۔ باقی دنیا کے کام ہیں وہ تو ہوتے رہیں گے۔ بچے تیرے بھی ہوتے ہیں، بچے یہودی کے بھی ہوتے ہیں۔ بیماری، دولت ہندو کو بھی ملتی ہے اور تجھے بھی ملتی ہے۔ یہ تو

نظامِ عالم ہے، اس میں تو ہندو، مسلم اور کافر کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ کی بادشاہی میں سب نے رہنا ہے، سب نے جینا ہے، سب نے کھانا ہے اور نظامِ عالم کو چلنا ہے۔ رات، دن، سورج، چاند، دریا، گرمی سب کچھ ہندو کے لیے بھی ہے اور مسلمانوں کے لیے بھی ہے۔ یہ تو نظام عالم ہے، یہ تو چلتا رہے گا۔ فرق اتنا ہے کہ جو میرا ہے وہ ہر بات کو میری طرف منسوب کرتا ہے اور جو میرا نہیں ہے وہ غیروں میں اٹک جاتا ہے۔

اتحادِ اُمت کی اہمیت:

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اتحاد و اتفاق کی نعمت سے نوازا کہ میرے پاک نبی ﷺ آئے کہ جس نے دشمنوں کو بھائی بنا دیا۔ اور اوس و خزرج جیسے قبائل جن میں بات بات پر قتل ہوتے تھے، جو لوگ اپنی بچیوں کو زندہ درگور کر ڈالتے تھے، جو لوگ شراب پینے کو فخر سمجھتے تھے، جو لوگ عصمتیں لوٹنے کو اپنی عزت جانا کرتے تھے، میرے مدنی آقا ﷺ نے ان کی ایسی تصویر بنا دی کہ اللہ تعالیٰ نے فرما دیا: ﴿رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ﴾ وہ تو آپس میں شیر و شکر ہیں۔ میرے مدنی کی جماعت کو دیکھو گے تو کبھی رکوع میں ہوں گے، کبھی سجدے میں ہوں گے، اللہ تعالیٰ کا فضل اور رضا طلب کرنے والے ہوں گے اور رات کی عبادت کی وجہ سے ان کی پیشانیوں پر نورِ عبادت چمکتا ہوگا۔

اللہ تعالیٰ نے جتنے قبائل بنائے ہیں، یہ قبیلے اور شاخیں صرف تمہاری پہچان کے لیے ہیں۔ کہاں بلال حبشی رضی اللہ عنہ اور کہاں سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ! لیکن حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ جب حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو پکارتے تو سیدنا بلال کہہ کر پکارتے تھے، بلال! تم تو ہمارے سردار ہو۔ اللہ تعالیٰ نے اس پاک نبی ﷺ کی نعمت سے عربی، عجمی، فارسی سب کو ایک بنا دیا اور حضور پاک ﷺ نے فرمایا کہ آج کے بعد کسی عربی کو عجمی پر فضیلت نہیں، کسی گورے کو کالے پر فضیلت نہیں۔

ہم نے جب اس نعمت اسلام کی قدر چھوڑی تو قوموں میں بٹ گئے۔ کہیں مہاجر، کہیں پختون، کہیں پنجابی اور کہیں لسانی جھگڑے ہیں۔ یہ کون کرنے والے ہیں؟ جو سب پڑھتے ہیں، ''لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ'' یہ کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے یہ نعمت چھین لی۔ جب ہم نے اس نعمت کی قدر نہ کی تو ہم صوبائیت، لسانیت اور قوموں میں بٹ گئے۔ وہ اسلام والی وحدت، اجتماعیت، اُخوت، ﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ﴾ کہ تمام کلمہ پڑھنے والے بھائی بھائی ہیں۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: مومن ایسے ہیں جیسے ایک عمارت ہوتی ہے۔ اور کہیں فرمایا: جیسے ایک جان ہوتی

ہے کہ پاؤں میں کانٹا لگے تو سب بدن کو تکلیف پہنچتی ہے۔ مومن مشرق، مغرب، شمال اور جنوب جہاں بھی ہیں، سب ہمارے بھائی ہیں۔

لیکن جب ہم نے اس نعمت اتحاد کی ناقدری کی تو اس کا نتیجہ کیا نکلا؟ ہر آدمی جب اخبار پڑھتا ہے تو کہتا ہے کہ یہ تو دوسرے علاقے کی بات ہے، میرا گھر تو ابھی محفوظ ہے۔ وہ نہیں سمجھتا کہ یہ تو آگ ہے، چل پڑی ہے، پھیلتے پھیلتے ایک وقت وہ بھی آئے گا کہ تیرا گھر بھی بھسم ہو جائے گا۔ اب ہم لوگوں کے بچوں کو مرتا ہوا دیکھتے ہیں، میں نے خود اندازہ لگایا ہے کہ مسلمان اتنا بے حس ہو گیا ہے، اخبار میں پڑھیں کہ آج اتنے مسلمان مر گئے، اِنَّا لِلّٰہِ بھی زبان سے نہیں نکلتا۔ اتنا بھی نہیں کہتا کہ مسلمان تھے، اِنَّا لِلّٰہِ پڑھ لیں، چلو کوئی بھی تھے، تھے تو مسلمان ناں؟ تھے تو آخر ہمارے بھائی! وجہ کیا ہے؟ جب بھی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی ناقدری اور عقیدے میں ناقدری کرو گے تو اللہ تعالیٰ وہ نعمت چھین لیں گے۔

اب اسی حکم میں ایک نماز کو دیکھ لیں! اس سے بڑی دنیا میں کوئی عبادت نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پانچ وقت مسلمانوں کو جمع ہونے کا حکم دیا۔ ورنہ کیا ہے کہ سب کو حکم ملتا کہ جہاں اپنے گھر میں نماز پڑھ لو۔ لیکن جماعت کا یہ جو اسلام نے سلسلہ بنایا کہ آدمی محلے کی مسجد میں آئے اور جمعہ کے دن تمام محلے والے ایک جامع مسجد میں آئیں، عید والے دن تمام جامع مساجد والے بھی ایک مقام پر آئیں۔ پانچ وقت میں ایک امام کے پیچھے اُمت محمد مصطفیٰ ﷺ کو اتحاد و اتفاق کا سبق ملتا ہے کہ ایک امام کے پیچھے اللہ اکبر اللہ اکبر۔ امام نے حکم دیا کہ رکوع میں چلے جاؤ تو سب رکوع میں چلے گئے۔ بوڑھے، امیر، غریب، عورت، مرد، جاہل اور عالم بھی، تا کہ ان میں ایک وحدت پیدا ہو، اجتماعیت پیدا ہو اور دن میں پانچ وقت ان سب کو یہ پڑھاؤ۔ نیند سے اُٹھیں تو جماعت کا سبق پڑھاؤ۔ کام میں مشغول ہو گئے، اب ظہر آ گئی ہے۔ سارا دن دماغ دوسری طرف چلا گیا، پھر اتحاد کا درس پڑھایا، فرمایا: عصر کی نماز میں ان کو پھر اجتماعیت کا سبق پڑھاؤ۔ وہ دن گزرنے والا ہے، رات آنے والی ہے، پھر مغرب میں ان کو اجتماعیت کا سبق پڑھاؤ۔ سونے کا وقت آ گیا، غفلت کا دور شروع ہو گیا، فرمایا کہ ایک بار پھر ان کو اکٹھا کرو، قرآن بھی سنا دو اور ایک امام کے پیچھے کھڑا بھی کر دو۔ امام نہ ہو تو آپ کو پتہ ہے کہ کیا نتیجہ ہوگا؟ کہ کوئی سجدے میں ہے تو کوئی رکوع میں پڑا ہوگا۔ جب ہم علیحدہ علیحدہ نمازیں پڑھتے ہیں تو آپ دیکھتے ہیں کہ ہر آدمی اپنی اپنی کیفیت میں ہے، کوئی رکوع میں ہے تو کوئی سجدے میں ہے اور کوئی التحیات میں ہے، لیکن جب ہم ایک امام کے پیچھے ہوتے ہیں تو

ہمارے اندر ایک اجتماعیت، ایک وحدت اور اتفاق۔ اور پھر صفوں کا بنانا، برابر کھڑے ہونا، صفوں کی ترتیب کہ علم والوں کو آگے جگہ دو، دین کی سمجھ والوں کو آگے جگہ دو، اس کے بعد عورتوں اور بچوں کو جگہ دو۔ صفیں بالکل برابر کرلو، کندھے سے کندھا ملا ہوا ہو۔ یہاں سے اجتماع کا درس حاصل ہوتا ہے۔

سارا جو سبق ایک نماز کی برکت سے ملا اور جب ہم نے اس نعمت کو ٹھکرا دیا تو نتیجہ کیا نکلا کہ آپ نے پڑھا ہوگا حدیث مبارکہ میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ نماز میں صفیں سیدھی کیا کرو۔ اگر نماز میں صفیں ٹیڑھی کرو گے تو اللہ تمہارے دل بھی ٹیڑھے کردے گا۔ نماز اور دل کا کیا مسئلہ تھا؟ اللہ کے نبی ﷺ نے ہمیں ایک اشارہ دے دیا کہ جب دل ٹیڑھا ہو جائے تو آپ نے دیکھا ہے ناں! آدمی کہتا ہے کہ میرا دل نہیں مان رہا، بس میرے دل میں اس آدمی سے نفرت آگئی ہے۔ میاں، بیوی کی زندگی گزرتی ہے، سالہا سال جھگڑا ہوتا ہے، اب سارا خاندان اکٹھا ہوتا ہے کہ مہربانی کرو، صلح کرلو۔ میاں بیوی ہو، اتنا عرصہ اکٹھے رہے ہو، کہتے ہیں کہ اب دل پھر گیا، اب نہیں جڑتا جی۔ دل تو شیشہ ہوتا ہے، ٹوٹ گیا تو پھر کیسے جڑے؟ اللہ پاک نے اپنے نبی کے ذریعے فرمایا: میں نے تمہیں اکٹھے ہونے کا حکم دیا ہے۔ اگر تم یہاں اکٹھے نہ ہوئے تو پھر پورے عالم میں بھی ہم تمہیں ٹیڑھا کردیں گے۔ پھر نتیجہ یہ نکلے گا کہ تمہارے دل ٹیڑھے ہو جائیں گے اور جب دل ٹیڑھے ہوں گے تو پھر جھگڑے ہوں، اختلاف ہوں گے۔

اب اس آیت کو سمجھیں، پھر تمہیں سمجھ آئے گی کہ کیا فرمایا؟ فرمایا کہ کیا ضرورت تھی بنی اسرائیل کو مخاطب کیا جاتا؟ ایک تو یہود، حضور اکرم ﷺ کے زمانے میں موجود تھے، دوسرا وہ اہل کتاب تھے اور اللہ تعالیٰ نے ان میں ہزاروں نبی بھیجے تھے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میری نعمتوں کو یاد کرو، جب میں نے تمہیں جہان والوں پر فضیلت دی، لیکن تم نے اس کے بعد کفرانِ نعمت کیا۔ فرمایا: ڈرو۔

سب سے بڑی چیز ڈرنا ہے۔ جب ڈر آگیا تو سب کچھ آگیا۔ ڈرو اس دن سے جس دن کوئی کسی کے کام نہیں آسکے گا، کوئی کسی کو ذرہ برابر نفع نہیں پہنچا سکے گا اور جس دن کوئی عذر بھی قبول نہیں کیا جائے گا، کوئی فدیہ بھی قبول نہیں کیا جائے گا، اور نہ ہی کسی کی شفاعت نفع پہنچائے گی اور نہ ہی وہ مدد کیے جائیں گے۔ لیکن کیا معنی یاد رکھو کہ اگر تم کفر پر مر گئے، اگر تم شرک پر مر گئے، اگر تم اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی ناشکری پر مر گئے تو آخرت کا عذاب بھگتنا پڑے گا۔ اور اگر تم ایمان پر مرو گے تو اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو فائدہ پہنچائیں گے۔ ایمان والوں کا تو جو چھوٹا بچہ بھی فوت ہو جاتا ہے، وہ بھی قیامت کے دن اپنے والدین کی شفاعت کا ذریعہ بن جائے گا۔ یعنی ایک چھوٹا بچہ جو پیدا ہونے کے فوراً

بعد مر گیا، چاہے ولادت کے کچھ عرصہ سال بعد یا پھر بلوغت سے پہلے مر جائے تو وہ بھی والدین کی شفاعت کا ذریعہ بن جائے گا، حتیٰ کہ کچا ضائع ہونے والا بچہ بھی نفع پہنچائے گا۔

قیامت کے دن بچہ کا والدین کے لیے شفاعت کرنا:

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ جس نے اس بچے پر صبر کیا، قیامت کے دن وہ بچہ اپنے والدین کی شفاعت کرے گا۔ اور قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو جن کی ایمان پر موت آئی، لیکن گنہگار تھے، ان کے بارے میں انبیاء کی شفاعت قبول فرمائیں گے۔ لیکن جو والدین کفر و شرک پر مر گئے، ان کو کسی قسم کا فائدہ نہیں پہنچا سکے گا۔ اور اگر وہ یہ کہیں کہ میری وجہ سے میرے بیٹے کو جہنم میں ڈال دو تو فرمایا کہ وہاں بدلہ بھی قبول نہیں ہوگا، ہر کسی نے اپنی سزا خود بھگتنی ہے۔ اور ان کو کسی کی سفارش بھی نفع نہیں دے گی، کافر کے لیے شفاعت نہیں ہوگی۔ شفاعت تو ان لوگوں کے لیے ہوگی جن کا خاتمہ ایمان پر ہوا ہوگا، اگرچہ وہ ہوں گنہگار۔ ﴿مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ۭ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ﴾ [البقرۃ:۲۵۵] اجازت کے بغیر کون ہے جو سفارش کر سکے؟ فرمایا: ﴿يَوْمَ يَقُوْمُ الرُّوْحُ وَالْمَلٰۗىِٕكَةُ صَفًّا ڼ لَّا يَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَقَالَ صَوَابًا﴾ [النبا:۳۸] کہ قیامت کے دن جس دن جبرائیل علیہ السلام اور ملائکہ بھی صف میں ہوں گے، کسی کو جرأت نہیں ہوگی کہ بات کر سکے، جب تک کہ اللہ تعالیٰ اذن نہ دیں۔ اللہ تعالیٰ کے اذن کے بعد بات کریں گے اور بات بھی وہ کریں گے جو حق ہوگی۔

اللہ تعالیٰ نے ان آیات مبارکہ میں بنی اسرائیل کو خطاب کیا اور یہ قرآن میں ان کا نام لے کر آخری خطاب ہے، اس کے بعد وہ اس خطاب کے مستحق نہ رہے۔ تین مقامات پر اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے خطاب فرمایا، لیکن جب وہ اعراض میں آ گئے، کفرانِ نعمت میں آ گئے تو نتیجتاً فرمایا: ﴿وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ﴾ [آل عمران:۱۱۲] یعنی ان پر مسکنت ذلت پھینک دی گئی۔

یاد رکھو! یہ جملہ تمام قوموں کے ساتھ ہوتا ہے۔ اگر محمد مصطفیٰ ﷺ کی اُمت نے بھی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی قدر نہ کی تو نتیجہ یہ نکلے گا کہ جس طرح اُس اُمت کو نعمتوں سے محروم کر دیا گیا، اسی طرح اس اُمت کو بھی محروم کر دیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب پر رحم فرمائیں اور ہمیں اپنی رحمتوں سے محروم نہ فرمائیں۔

﴿وَإِذِ ابْتَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ رَبُّهُ بِكَلِمَاتٍ فَأَتَمَّهُنَّ ۖ قَالَ إِنِّي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَامًا ۖ قَالَ وَمِن ذُرِّيَّتِي ۖ قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظَّالِمِينَ ﴿١٢٤﴾﴾ [البقرة:۱۲۴]

''اور جب ابراہیم کو ان کے رب نے چند باتوں میں آزمایا تو انہوں نے وہ پوری کیں (اس کے انعام کے طور پر اللہ نے) فرمایا: میں تمہیں لوگوں کے لیے امام بناؤں گا۔ عرض کیا: اور میری اولاد سے بھی؟ فرمایا: میرا عہد (ان میں سے) ظالموں کو حاصل نہ ہوگا۔''

یہود و نصاریٰ کا ملتِ ابراہیمی پر ہونے کا دعویٰ اور اس کی تردید:

ان آیاتِ مبارکہ میں سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا قصہ ذکر کیا گیا ہے۔ گزشتہ آیات میں بنی اسرائیل کو خطاب تھا، اس کے بعد سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا ذکر آیا۔ اس کی مناسبت یہ ہے کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام پر تمام مذاہب کے لوگ ایمان، اتباع اور محبت کا دعویٰ کرتے ہیں۔ یہود و نصاریٰ اور مشرکین مکہ کا دعویٰ بھی یہی ہے کہ ہم ملت ابراہیمی پر ہیں، اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ ذکر فرما کر دو چیزوں کی طرف اشارہ کیا ہے:

ایک تو یہ کہ اگر تم واقعی سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی ملت پر ہونے کا دعویٰ کرتے ہو تو حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہی تو ملت ابراہیمی پر ہیں۔ اگر تم دعویٰ میں سچے ہو کہ تم ابراہیم علیہ السلام کے پیروکار اور ان کی اتباع کرنے والے ہو تو خاتم الانبیاء سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی تو ولد ابراہیم اور ولد اسماعیل میں سے ہیں، پھر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کیوں کرتے ہو؟

اور دوسرا اشارہ یہ کیا کہ تم دعویٰ کرتے ہو ملتِ ابراہیمی پر ہونے کا، جبکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تو حقیقتاً ملتِ ابراہیمی پر ہیں۔ اب حق کو پہچاننے کی یہ صورت ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کے دین، شریعت، عمل، سیرت و صورت اور طریقہ کار کو دیکھ لو اور اس کے بعد پھر تم لوگ اپنے اپنے طریقے کو بھی دیکھ لو اور پھر سب مل کر حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے نمونے کو دیکھو اور خود فیصلہ کر دو کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ملت پر ہونے کے دعویٰ میں سچا کون ہے؟

ہر ادنیٰ علم والے شخص کو بھی پتہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بتوں کو توڑ ڈالا تو جس پیغمبر نے بتوں کو توڑ ڈالا اور بتوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے اور اسی بت پرستی کی بناء پر اپنے والد کی جدائی کو برداشت کیا، اپنا ملک چھوڑ گئے

اور ہجرت فرمائی، جبکہ تم تین سو ساٹھ بتوں کی پوجا بھی کر رہے ہو اور کہتے ہو کہ ہم ملت ابراہیمی پر ہیں۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے توتوحید کے لیے اپنے آپ کو آگ میں ڈال دیا اور نصرانی خدا کا بیٹا بنا کر بھی کہتے ہیں کہ ہم ملت ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ یہودیوں نے بھی اللہ تعالیٰ کا بیٹا بنا کر کہا کہ ہم ملت ابراہیم علیہ السلام پر ہیں۔

اس لیے اللہ تعالیٰ نے کئی مقامات پر سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے قصے کو بیان فرمایا اور دعوت دی کہ آنکھیں کھول کر سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا طریقہ دیکھو کہ ملت ابراہیم علیہ السلام پر تو صرف حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اگر تم اپنے دعویٰ میں سچے ہو تو پھر میرے پاک پیغمبر کی اتباع کرو۔

اہل سنت والجماعت کی پہچان:

اسی طرح ہر جماعت کا یہ دعویٰ ہوتا ہے کہ ہم حق پر ہیں۔ مثلاً اہل سنت والجماعت میں جتنی جماعتیں ہیں، ان سب کا یہ دعویٰ ہے کہ ہم اہلسنت والجماعت ہیں اور ہم صحیح راستے پر ہیں۔ ان سب کو حق راستے پر ماننے کا طریقہ یہ ہوگا کہ ان کو قرآن وسنت کی کسوٹی پر پرکھا جائے گا، جن کے عقائد واعمال اور سیرت وصورت حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان اور قرآن سے اور عمل صحابہ سے ملتی ہو، وہ اہلسنت والجماعت ہیں۔ صرف زبانی کہلانے سے ہر آدمی اہلسنت والجماعت میں سے نہیں بن جاتا اور جن لوگوں کا عمل قرآن وسنت اور عمل صحابہ کے مخالف ہوگا، اس کا اہلسنت والجماعت سے کوئی تعلق نہیں ہوگا کیونکہ بچہ پیدا ہونے سے لے کر موت تک جتنے احکام ہیں وہ سب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کھول کر بیان کر دیئے ہیں، ان کے اندر کوئی شبہ نہیں۔ جوانی اور بڑھاپا، دن اور رات کیسے گزارے؟ نکاح، شادی، موت، غسل، کفن، دفن اور قبر وغیرہ غرض ہر ایک مسئلہ سنت میں موجود ہے۔ جس آدمی کا عمل قرآن وسنت اور عمل صحابہ کے مطابق نہیں ہے، اس کا اہلسنت والجماعت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

امامت سے کیا مراد ہے؟

﴿قَالَ إِنِّي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَامًا﴾ [البقرۃ: ۱۲۴]

ان آیات میں ''امامت'' کا لفظ آیا ہے۔ کبھی ''امامت'' سے ''نبوت'' مراد ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ جن کو خود نبی بناتے ہیں بلاشک وشبہ وہ امام بھی ہوتے ہیں۔ اور ایک امامت انبیاء کے بعد یعنی خلافت کے معنی میں آتی ہے اور اس میں بھی اہلسنت والجماعت کے نزدیک معصوم صرف نبی کی ذات ہوتی ہے، یعنی جتنے انبیاء اور رسل ہیں وہ

معصوم ہیں۔ انبیاء کے بعد صحابہ کا درجہ، پھر تابعین کا، پھر اللہ کے اولیاء صالحین کا درجہ ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم معصوم تو نہیں، البتہ محفوظ ضرور ہیں کہ اللہ تعالیٰ انہیں گناہوں سے بچاتے ہیں اور کوئی غلطی ہو تو فوراً توبہ کی توفیق عطا فرما دیتے ہیں۔ توبہ کے بعد اس گناہ کو ختم کر دیتے ہیں۔ لیکن معصومیت کا درجہ صرف نبی کا ہوتا ہے، برخلاف ایک گمراہ فرقہ کے، ان کے نزدیک امام بھی معصوم عن الخطا ہوتا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اہلسنت والجماعت کے عقیدہ میں اللہ تعالیٰ جس کو چاہتے ہیں نبوت عطا فرما دیتے ہیں۔ نبوت کسی کو محنت، عبادت، ریاضت و مجاہدہ سے نہیں ملتی۔ نبوت خالصتاً اللہ تعالیٰ کے ارادے، قضا و منشا سے ملتی ہے۔ میرے اللہ نے اس کا سلسلہ حضرت آدم علیہ السلام سے شروع فرمایا اور حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم پر آ کر ختم کر دیا۔

نبی کے مخصوص من اللہ ہونے کا معنی:

نبی کے لیے مخصوص من اللہ ہونا ضروری ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جن کو نبوت تو اللہ تعالیٰ نے اپنے ارادے سے عطا فرمائی، لیکن دعا حضرت موسیٰ علیہ السلام کی منظور فرمائی کہ موسیٰ علیہ السلام نے جب اپنے بھائی کے لیے عرض کیا تو اللہ تعالیٰ نے دعا منظور فرمائی اور ان کو نبی بنا دیا، ورنہ یہ نہیں ہو سکتا کہ کسی کو محنت و ریاضت اور عبادت سے نبوت مل جائے، ﴿اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ﴾ [الانعام: ۱۲۴] اللہ تعالیٰ جانتے ہیں کہ میری رسالت کا تاج پہننے کے لائق کون ہے؟ وہ جس کو چاہتے ہیں پہناتے ہیں۔ لیکن ایک فرقہ کے نزدیک امامت بھی مخصوص من اللہ ہوتی ہے، وہ کہتے ہیں کہ امام بھی اللہ تعالیٰ کے حکم سے بنتا ہے۔ ان کا یہ دعویٰ ایسا ہے کہ آج تک وہ اس کی دلیل پیش نہیں کر سکے۔

امامت کا انتخاب کیسے ہوتا ہے؟

نبوت، اللہ تعالیٰ کی طرف سے مخصوص ہوتی ہے، جبکہ نبوت کے بعد خلافت مخصوص من اللہ نہیں ہوتی، بلکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مقدس میں انبیاء کی خلافت کے لیے کچھ صفات رکھی ہیں، کچھ شرائط رکھی ہیں، وہ صفات جن پر منطبق ہوتی رہیں، انہی شرائط وصفات کے مطابق صحیح خلفاء بنتے ہیں اور جن میں یہ صفات نہ پائی جائیں، وہ خلیفہ حق نہیں کہلاتے۔ نشانیاں اللہ نے عطا فرما دیں، جیسے اللہ تعالیٰ نے مومنین کی نشانیاں بیان کر دیں کہ مومنوں کی صفت ایمان بالغیب، نماز قائم کرنا، انفاق فی سبیل اللہ، نماز میں خشوع اختیار کرنا، زکوٰۃ کا ادا کرنا، اپنی شرمگاہوں

کی حفاظت کرنا، اپنے وعدوں کو پورا کرنا اور امانتوں کی حفاظت کرنا وغیرہ۔ اب جن جن میں یہ صفات پائی جائیں گی، ہم کہیں گے کہ الحمدللہ ایمان والا ہے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے منافقوں کی صفات کا بھی ذکر فرما دیا کہ جب ایمان والوں کو ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم مومن ہیں، جب اپنے شیاطین کو ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم تو مذاق ٹھٹھا کرنے گئے تھے، ہم تو تمہارے ساتھ ہیں۔ آج ہم اگر کسی میں یہ علامت پائیں گے تو کہیں گے کہ منافق ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ منافق کی تین بڑی نشانیاں ہیں: جب بات کرے تو جھوٹی کرے، امانت رکھی جائے تو خیانت کرے، وعدہ کرے تو خلاف ورزی کرے۔ یہ منافق کی علامات ہیں۔ اب اگر یہ نشانیاں پائی جائیں گی تو کہا جائے گا کہ یہ منافق ہے۔

اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم ﷺ کی خلافت کے لیے بھی قرآن میں ایک وعدہ فرما دیا: ﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۠ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ۭ يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَـيْـــًٔـا ۭ وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴾[النور:۵۵] اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہمارا وعدہ ہے کہ تم میں سے جو ایمان والے ہیں، ہم ان کو دنیا میں اپنی خلافت عطا فرمائیں گے۔ (اب سب سے پہلے تو یہ دیکھنا ہوگا) کہ جب یہ آیت اُتری تو اس وقت ایمان والے کون کون تھے؟ میرے مدنی ﷺ کے پاس کون لوگ موجود تھے؟ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ زمین کے اندر حکومت دیں گے اور تمہارا کام کیا ہوگا؟ تم پسندیدہ دین کو قائم کروگے، امن قائم کروگے۔

دنیا کے اندر جب ہم یہ علامات دیکھتے ہیں تو وہ ہمیں سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ، عمر فاروق رضی اللہ عنہ، عثمان غنی رضی اللہ عنہ اور علی رضی اللہ عنہ میں نظر آتی ہیں، اسی طرح حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ تک اور ان کے بعد عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ تک اور پھر ان کے بعد دنیا میں بادشاہ بھی گزرے ہیں، جن میں وہ نشانیاں ملتی گئیں وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق ہوئے اور جن میں دین کے خلاف باتیں ملتی گئیں، وہ دین سے ہٹتے گئے۔ ہر چیز کے لیے علامات ہیں اس لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قصہ ذکر فرمایا۔

﴿وَاِذِ ابْتَلٰٓى﴾ میں ابتلاء کے معنی:

آیت میں ﴿ابْتَلٰٓى﴾ کا معنی امتحان ہے، یعنی اپنے بندے ابراہیم کا امتحان لیا چند چیزوں کے ساتھ۔ سیدنا

ابراہیم علیہ السلام اس امتحان میں پورے اُترے تو اس کامیابی کے بعد سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے دعا مانگی، اللہ تعالیٰ نے انعام دیا اور فرمایا: اے میرے خلیل! اگر آپ امتحان میں پورے ہوگئے تو ہم تمہیں لوگوں کے لیے امام بنائیں گے۔ جب اللہ تعالیٰ نے اتنا بڑا مرتبہ بخشا تو ابراہیم علیہ السلام نے دعا کی کہ اے اللہ! آپ مجھے جو امامت کا مقام دیں گے وہ مقام میری ذرّیت میں بھی رکھیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ابراہیم! ہم تیری دعا کو قبول کرتے ہیں اور تیری اولاد میں بھی امامت آئے گی، لیکن جو ظالم ہیں، ان کو میرا عہد نہیں پہنچے گا۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ جو ظالم ہوگا، وہ امامت وخلافت کا مستحق نہیں ہوگا۔ خلافت کے لیے عدالت اور تقویٰ کا ہونا ضروری ہے۔ جو آدمی عادل اور متقی ہوگا وہ امامت وخلافت کا مستحق ہوگا اور جو عادل اور متقی نہیں ہے، اس کا حق نہیں بنتا، نہ خلافت کا اور نہ ہی امامت کا۔

﴿لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ﴾ کی تفسیر:

ظلم کا لفظ عدل کے مقابلے میں آتا ہے۔ پورے قرآن مقدس میں جہاں بھی آپ نظر ڈالیں گے، جیسے کذب کے مقابلے پر صدق آئے گا، باطل کے مقابلے میں حق آئے گا، اسی طرح ظلم کے مقابلے میں عدل آئے گا۔ کسی بھی جگہ قرآن میں ظلم کے مقابلے میں عصمت کا لفظ نہیں۔ اس لیے اگر امامت سے مراد نبوت لیں تو پھر وہ معصوم ہیں، اور اگر امام سے غیر نبی مراد لیں تو اس کے لیے عدالت وتقویٰ ضروری ہے، لیکن عصمت ضروری نہیں، یعنی خطا تو اس سے بھی ہوسکتی ہے۔

وہ کلمات کیا تھے جن سے اللہ کے نبی حضرت ابراہیم علیہ السلام کا امتحان لیا گیا؟ اس سے قبل یہ جان لیں کہ یہ سنت اللہ ہے کہ ہر چیز کو جاننے کے باوجود امتحان لیتے ہیں، تاکہ اس شخص کو دنیا، ملائکہ اور اس زمانے کے لوگوں پر بھی واضح کردیں کہ یہ امتحان میں کامیاب ہے اور یہ ناکام ہے اور پھر ہر ایک کے ساتھ اس کی صورت حال کے مطابق فیصلہ فرمائیں، ورنہ تو ہر چیز اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے۔

﴿رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ﴾ کی وضاحت:

﴿بِكَلِمٰتٍ﴾ سے کیا مراد ہے؟ مفسرین نے لکھا ہے کہ کلمات سے مراد وہ امتحانات ہیں جو سیدنا ابراہیم علیہ السلام پر گزرے۔ جیسے سب سے بڑا امتحان یہ گزرا کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈالا گیا اور اس سے بڑا امتحان کیا

ہوسکتا ہے؟

سیدنا ابراہیم علیہ السلام اپنے بڑے امتحان میں ثابت قدم نکلے کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو خود اجازت دے دی.....

اگر ظاہری طور پر آپ فرشتوں سے مدد بھی پکڑیں تو کوئی شرک نہیں تھا۔ مثلاً میں مریض ہوگیا، کمزوری ہوگئی، کسی طالب دوست سے میں نے کہا کہ مجھے گھر پہنچادو، میری مدد کرو اور میرے لیے دوا لادو۔ یہ شرک نہیں ہے، بلکہ یہ تو نظام عالم ہے۔ شرک تو تب ہوتا ہے جب کسی غائب کو حاضر اور نفع ونقصان کا مالک جان کر پکارا جائے، وہ شرک ہے۔ جیسے ابھی کوئی جبرائیل علیہ السلام کو پکارے کہ یا جبرائیل! یہ شرک ہوگا، کیونکہ جبرائیل علیہ السلام کون سا موجود ہے یا تمہارے سامنے بیٹھا ہوا ہے جو ہماری بات سُن یا سمجھ رہا ہے؟ جب ہم اس غائب کو حرفِ ندا سے اس کو حاضر سمجھ رہے ہیں اور یہ بھی سمجھ رہے ہیں کہ جبرائیل ہماری بات بھی سمجھتا ہے، ہم جو زبان بول رہے ہیں، مثلاً انگریزی، اُردو وغیرہ وہ سب جانتا ہے تو اب شرک آئے گا۔ اگر حاضر آدمی کو کہیں کہ مجھے پانی پلادو تو یہ شرک نہیں ہوتا...... اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو خود بھیج دیا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس آئے کہ حکم دیں، ابھی ہم بادل برسا دیتے ہیں آگ ختم، ابھی ہمیں حکم دیں ہم پہاڑوں کو یوں ملا دیتے ہیں اور آگ ختم۔ ابھی ہمیں حکم دیں اس آگ کو تیرے دشمنوں کے اوپر پلٹ دیں، وہ جل کر راکھ ہوجائیں گے، لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ مجھے تمہاری کوئی ضرورت نہیں۔ حالانکہ اگر فرما دیتے تو (نعوذ باللہ!) یہ توحید کے خلاف بات نہیں تھی۔ آخر حضرت خلیل علیہ السلام کے پاس جب جبرائیل علیہ السلام آئے تو انہوں نے ابراہیم علیہ السلام سے کہا: چلو ہمیں نہ کہو، اپنے اللہ سے تو دعا مانگو کہ آپ کو بچادے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا مانگنے میں تو کوئی حرج نہیں ہے۔ کہتے ہیں کہ خلیل مسکرائے اور فرمایا کہ جبرائیل! مجھے ایک بات بتاؤ۔ جبرائیل علیہ السلام نے کہا: فرمائیں۔ انہوں نے کہا کہ یہ جو آگ جل رہی ہے، کیا یہ اللہ کے علم میں ہے، اللہ تعالیٰ کو اس کا پتہ ہے؟ انہوں نے کہا: پتہ ہے۔ خلیل بولے: کیا اللہ تعالیٰ کو یہ بھی پتہ ہے کہ مجھے جلانے کے لیے جلائی گئی ہے؟ بولے: یہ بھی پتہ ہے۔ فرمایا کہ جب پتہ ہے تو یاد دلانے کی کیا ضرورت ہے؟ کیونکہ یاد تو اس کو دلایا جائے جس کو پتہ نہ ہو، ہم کہیں کہ شاید اللہ تعالیٰ کو پتہ نہ ہو اور میں بتادوں کہ میں جل رہا ہوں۔ جب ان کو پتہ ہے اور ان کی منشاء کے خلاف آگ جل نہیں سکتی۔ جب وہ سب جانتے ہیں، اگر وہ اپنے خلیل کو جلانے پر راضی ہیں تو ہم بھی راضی ہیں۔ پھر مانگنے کا کیا مطلب؟

بعض مفسرین نے فرمایا کہ جب بیٹے کے ذبح کا حکم دیا گیا، یہ دوسرا امتحان تھا۔ اپنے بچے کی گردن پر چھری

رکھنا، اس سے بڑا کوئی امتحان ہوسکتا ہے؟

اور بعض علماء نے فرمایا کہ پوری قوم حتیٰ کہ اپنے والد سے بھی ٹکراؤ ہوگیا۔ یہ بھی امتحان تھا کہ اپنا وطن اور ماں باپ سب کو اللہ تعالیٰ کی توحید کے لیے علاقے کو چھوڑا اور پھر جہاں ہجرت کی، وہاں نہ کوئی مقام، یہ وطن اور نہ گھر ہے نہ جگہ ہے۔

بعض مفسرین نے فرمایا کہ ﴿بِكَلِمٰتٍ﴾ میں یہ چیزیں داخل ہیں اللہ تعالیٰ نے داڑھی رکھنے، مونچھیں کاٹنے، بغل صاف کرنے، زیر ناف بالوں کو صاف کرنے اور جوڑوں کی صفائی کرنے کا حکم دیا، اسی طرح ختنہ کا حکم ملا۔ یہ سب امتحان تھے اور سب سے پہلے یہ ابراہیم علیہ السلام پر آئے۔ سب سے پہلے ختنہ ابراہیم علیہ السلام سے شروع ہوا اور قیامت تک تمام انبیاء کی سنت رہا ہے۔ اسی لیے علماء نے فرمایا ہے کہ ختنہ گویا ایک داغ اور علامت ہے، جس طرح جانوروں کے ریوڑ میں ہر شخص اپنے جانور کی شناخت کے لیے ایک علامت مقرر کر دیتا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے ایمان والوں کے لیے ختنہ ایمان کی علامت بنایا ہے۔

اور بعض علماء نے یہ بھی لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس عضو کے کاٹنے کا حکم دیا، تاکہ تنبیہ ہوجائے کہ میں نے اس عضو کی حفاظت کرنی ہے، میں نے اس کو غیر شرعی مقام میں کبھی استعمال نہیں کرنا اور پھر ابراہیم علیہ السلام پر یہ ابتلاء بڑی عمر میں آئی، یہ بھی سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی آزمائش تھی۔

سنت نبوی پر عمل، مہلک وموذی امراض کا علاج ہے:

چودہ سو سال تو میرے مدنی سرکار ﷺ کی شریعت کے گزر گئے اور سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے زمانے کو تقریباً چار ہزار سال گزر گئے، واللہ اعلم! آج سے چار ہزار سال کے بعد دنیا کی جدید سائنس اور جدید ڈاکٹر، پروفیسر جو کروڑوں روپے خرچ کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اگر کسی نے کینسر جیسے موذی مرض سے بچنا ہے، ایڈز اور وہ گندی بیماریاں جن کا دنیا کے اندر علاج ہے، اس کو چاہیے کہ اسلام کے حکم پر عمل کرے۔ یعنی آج جو دنیا خود اس بات پر آگئی، ورنہ پہلے سکھ بال نہیں کاٹتے تھے، بغلوں اور بدن کے دیگر حصوں کے بال کتنے ہی بڑے ہوجائیں۔ اسی طرح سکھوں سے ہندوؤں اور انگریزوں کے اندر اور پھر انگریزوں سے مسلمانوں کے اندر بھی یہ بلا آگئی۔ اب وہ مسلمان جو زیادہ ماڈرن لوگ ہیں، ان کے بال ایسے بڑھے ہوئے ہوتے ہیں کہ کپڑے اُتاریں تو

گویا جانور نظر آئیں۔

اسی طرح اسلام نے جو حکم دیا تھا کہ آپ کی مونچھیں کٹی ہوئی ہوں تو یہ بال پانی کے اندر داخل نہیں ہوں گے، آپ کی بغلیں صاف ہوں گی تو ان کے اندر کوئی بدبو اور گندگی پیدا نہیں ہوگی، اسی طرح زیرِ ناف کا مسئلہ ہے۔

اسلام کتنا عظیم ہے کہ چودہ سو سال پہلے عورت کو جو حکم دیا گیا کہ عورت جب حیض کے ایام سے فارغ ہو جائے تو اس کے لیے مستحب یہ ہے کہ وہ کوئی کپاس کی کوئی چیز اندر رکھ لے، تا کہ تسلی ہو جائے کہ خون کا داغ نہیں لگا تو وہ صاف ہو جائے گی۔ دوسرا اس کے لیے یہ بھی ضروری تھا کہ خوشبودار چیز اپنے بدن کے اندر رکھے کہ اندر کی گندگی اور نجاست خوشبو کی وجہ سے نچڑ جائے اور کوئی بیماری پیدا نہ ہو۔ یہ بھی ایک رواج ہوتا تھا کہ جیسے عود کی لکڑی اور لوبان وغیرہ وہ انگارے پر ڈال دی اور کپڑوں کے ساتھ عورت اوپر کھڑی ہوگئی، تا کہ دھوئیں سے پورے بدن کی نجاست دھل جائے اور جب تک ان چیزوں پر عمل رہا تو کامیابی رہی۔

ماں کا بچے کو دودھ پلانے کی حکمتیں:

اسلام نے حکم دیا کہ ہر عورت اپنے بچے کو دودھ پلائے، حتیٰ کہ اسلام یہ کہتا ہے کہ اگر میاں بیوی میں طلاق ہوگئی تو آپ ظلم نہ کریں اور بچے کو نہ چھینیں، ماں کو دودھ پلانے دیں اور اسلام نے اتنی بڑی پابندی بھی لگائی، مثلاً بیوی بچے کو دودھ نہیں پلانا چاہتی اور وہ کہتی ہے کہ میں تو دودھ پلانے کے پیسے لوں گی تو جو تم دایہ عورت کے دودھ پلانے پر خرچ کرو گے وہی اس کی ماں کو دے دو اور وہی دودھ پلا دے۔

اس دودھ میں کتنی حکمتیں تھیں؟ آج جدید سائنس کہتی ہے کہ ڈبہ کا دودھ نہ پلانا، اپنا دودھ پلاؤ، کیونکہ جن عورتوں نے دودھ پلانا چھوڑ دیا، ان کے سینے میں کینسر ہو گیا۔ کیونکہ جس چیز کو نکلنا تھا، وہ آپ نے روک دی۔ جب راستہ رک جائے تو تکلیف ہوتی ہے اور آپ دیکھیں گے کہ دودھ کتنی پاکیزہ چیز ہے کہ برتن میں بند کر کے رکھ دو تو پھٹ جائے گا، خراب ہو جائے گا اور جب بچہ دودھ پیتا ہے تو خدا کی قدرت یہ ہے کہ فلٹر کے ساتھ اس کے سینے کو بھی صاف کر دیتا ہے اور وہاں کسی قسم کا کینسر نہیں ہوتا۔ عورتوں میں جو سب سے زیادہ کینسر ہے وہ سینے کا ہے۔ وجہ کیا ہے کہ ہم نے دودھ پلانے والی سنت سے انکار کیا اور پھر جو بچوں کے اندر بیماریاں آئیں، اس کی ذمہ دار مائیں ہیں۔ اگر بچہ ماں کا دودھ پیتا تو یہ بیماریاں نہ آتیں۔

اچھا پھر اللہ کا نظام دیکھیں! جب عورت کو آپ نے گھی، دودھ اور گوشت کھلایا، پلایا تو ساری قوت جو اس دودھ کے ذریعے بچے کے اندر منتقل ہوگئی اور جب ہم نے اس کو دودھ سے ہٹا دیا تو نتیجہ یہ نکلا کہ دودھ ڈبے کا ہے اور تعلیم سرکار کی۔ نتیجہ آپ کے سامنے ہے، اکبرالہٰ آبادی اسی لیے رویا تھا کہ کیسے اب بُو آئے بچے سے ماں باپ کے اطوار کی؟ کہ پہلے اولاد بھی ماں باپ کے نقش قدم پر ہوتی تھی، اب والدین کے نقش قدم پر کیسے چلے؟ پھر جو دودھ ڈبے میں آرہا ہے، یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ خنزیر کا ہو، یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کسی حرام جانور کا ہو، یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس کو محفوظ رکھنے کے لیے کسی حرام چیز کا کُور دیا گیا ہو، جس کی وجہ سے وہ سالہا سال تک خراب نہ ہو۔ بہر حال اسلام نے جو احکام رکھے ہیں، ان میں بہت ساری حکمتیں ہیں۔

﴿بِكَلِمٰتٍ﴾ کی تفسیر:

جامع قول مفسرین کا یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام پر جتنے بھی امتحان گزرے ہیں، وہ سب کلمات میں شامل ہیں۔ آگ میں ڈالا جانا، بیٹے کو ذبح کرنا، اہل وعیال کو مکہ کے وادیٔ غیر ذی زرع میں اکیلا چھوڑ دینا، وقت کے بادشاہوں سے ٹکرا جانا، اپنے باپ سے جدا ہو جانا، اپنے گھر کو چھوڑنا، ختنہ اور اپنے بدن کی صفائی کرنا وغیرہ۔ یہ سب امتحان ہیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ایک جامع لفظ فرما دیا: ﴿بِكَلِمٰتٍ﴾ پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿فَاَتَمَّهُنَّ﴾ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تمام کو پورا کر دیا، یعنی تمام آزمائشوں کے ساتھ اللہ کے تمام اوامر کو پورا کیا۔

جب ابراہیم نے آزمائش کو پورا کر دیا تو ہم نے انعام دیا۔ میرے خلیل! اب ہم تمہیں دنیا والوں کے لیے امام بنا دیں گے، تمام دنیا تیری امامت کو مانتی ہے، چاہے عمل نہ کریں، لیکن دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم ملت ابراہیمی پر ہیں اور قیامت تک آپ کی امامت ہے اور پھر اس امامت کو اللہ تعالیٰ نے ایسا پکا کیا کہ آخری نبوت اور ختم نبوت کا جو مرتبہ تھا، وہ بھی سیدنا محمد عربی ﷺ کو دیا، جو ولد اسماعیل میں سے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے قیامت تک کے لیے کعبہ بھی مقرر کیا جو ابراہیم علیہ السلام نے بنایا تھا۔ ہر لحاظ سے امامت کا مرتبہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو عطا فرما دیا اور اُمت محمد مصطفیٰ ﷺ جب تک قیامت تک نمازیں پڑھے گی تو درودِ ابراہیمی پڑھے گی۔ اتنا بڑا انعام ملا!!

یہ دیکھ کر خلیل علیہ السلام نے فوراً دعا کی کہ اے اللہ! میری اولاد کو بھی محروم نہ کرو، میری اولاد میں بھی یہ شرف امامت رکھو۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تیری ذریت میں رکھیں گے، لیکن تیری ذریت میں جو ظالم ہوں گے، ان کو یہ مرتبہ

امامت نہیں ملے گا۔ ان کو ملے گا جو عادل، متقی ہیں۔ اللہ نے اس آیت سے ایک بات کو واضح فرما دیا کہ اے بنی اسرائیل! تم کیسے فخر میں مبتلا ہو؟ تم ظالمین بنو گے تو پھر مرتبہ امامت ختم۔ اس لیے کہ ہم نے تو ابراہیم سے وعدہ کیا ہے کہ صرف متقین کو امامت ملے گی۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ایک قول مبارک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو مناسک حج کے امتحان میں ڈالا۔ طواف، صفا و مروہ، منیٰ، مزدلفہ، عرفات، ان سب مناسک کے پورا پورا ادا کرنے کا امتحان تھا۔

ایک قول حضرت ابن عباس کا یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دس چیزوں کا حکم دیا۔ پانچ کا تعلق سر سے ہے اور باقی پانچ کا تعلق سارے بدن کے ساتھ ہے۔ سر کی مونچھیں کٹوانا، کلی کرنا، ناک میں پانی ڈالنا، مسواک کرنا اور بالوں کو تقسیم کر کے سیدھی مانگ نکالنا۔ یہ پانچ چیزیں ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے سر کے ساتھ خاص رکھا ہے اور باقی پانچ چیزیں بدن سے متعلق ہیں۔ ناخنوں کا کاٹنا، زیر ناف بالوں کا صاف کرنا، ختنہ کرانا، بغلوں کے بال نکالنا، اگر قضائے حاجت کے لیے جائے تو پانی کے ساتھ صفائی کرے۔ ان دس چیزوں کے امتحان میں اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو ڈالا۔ یہ تمام سنن الانبیاء والمرسلین ہیں، کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں ہزاروں انبیاء آئے۔ اس لیے آدمی ان کا پورا پورا خیال رکھے، کیونکہ ایک حدیث میں آیا ہے کہ ان کا تعلق فطرتِ انسانی کے ساتھ ہے۔

داڑھی کی سنت:

(حدیث) حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں معراج کی رات بیت المعمور کے ساتھ پشت لگا کر خوبصورت شکل والا انسان بیٹھا ہوا دیکھا ان کی داڑھی مبارک سینے تک ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اتنا خوبصورت ہے اور اتنا جمال ہے کہ ان کی شکل میرے ساتھ ملتی تھی۔ میں نے جبرائیل علیہ السلام سے پوچھا: یہ کون ہے؟ تو انہوں نے کہا کہ یہ تو آپ کے ابا سیدنا ابراہیم علیہ السلام ہیں۔

اسی طرح حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب میں نے معراج کی رات ہارون علیہ السلام کو دیکھا تو ان کی داڑھی مبارک تو ناف سے بھی نیچے تھی، یعنی اتنی لمبی تھی۔ اس لیے قرآن پاک میں آپ نے پڑھا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو توحید کے مقابلے میں غصہ آ گیا تو جلال والے تھے اور مسئلہ اللہ تعالیٰ کی توحید کا تھا تو موسیٰ علیہ السلام سب کچھ بھول گئے اور پکڑ لیا بھائی کو اور مارنے لگے۔ بھائی نے کہا کہ بھائی! میری داڑھی پکڑ کر مجھے مت مارو کہ دشمن ہنسیں گے کہ

موسیٰ اپنے بھائی کو مار رہا ہے۔ تو اس کی دلیل موجود ہوئی تو ہارون علیہ السلام کی اتنی لمبی داڑھی تو تھی کہ موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ میں آ گئی (اور اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ داڑھی کم از کم اتنی ہو کہ ہاتھ میں آ سکے اور وہ ایک مشت ہے)۔

حضور پاک ﷺ کی داڑھی مبارک کے بارے میں بھی آتا ہے کہ سینہ مبارک بھر دیتی تھی اور ایک حدیث مبارک میں یہ بھی آتا ہے کہ حضور پاک ﷺ کی داڑھی مبارک کا حلقہ اتنا گول تھا جیسے چاند کا حلقہ ہو۔ اتنا خوبصورت جمال اور سینہ بھرا ہوا اور پھر جمیع انبیاء المرسلین اور جمیع صحابہ، جمیع تابعین، جمیع ائمہ مجتہدین، فقہاء، قراء کرام اور اللہ کے اولیاء، یعنی ایک بندہ ایک مثال بھی نہیں دے سکتا کہ عالم انسانیت میں نبی یا ولی ایسا گزرا ہے کہ جس کی داڑھی نہ تھی۔ لیکن دشمن نے ایسے راستے پر لگا دیا ہے کہ آج داڑھی رکھنا ایسے معلوم ہوتا ہے (اللہ تعالیٰ معاف فرمائے) کہ آدمی بڑا عجیب کام کر رہا ہے! یعنی داڑھی والا آدمی اب مسلمان معاشرے میں ایسے لگتا ہے جیسے کوئی اجنبی آدمی آ گیا ہو۔

اچھا پھر دلیل دیتے ہیں کہ دیکھو جی! داڑھی والے بھی گناہ کرتے ہیں۔ خدا کے بندے! تم نے کلمہ نبی ﷺ کا پڑھا ہے یا داڑھی والوں کا پڑھا ہے؟ یہ تو ایک شیطانی حملہ ہے کہ دیکھو جی! داڑھی والا بھی گناہ کرتا ہے۔ اس طرح تو کپڑے پہننے والا بھی گناہ کرتا ہے، لہٰذا کپڑے بھی نہ پہنو، شادی والا بھی گناہ کرتا ہے تو شادی بھی نہ کرو، کھانے کھانے والا بھی گناہ کرتا ہے، لہٰذا کھانا بھی نہ کھاؤ۔ یہ کوئی دلیل ہے؟ عقل ہے، منطق ہے کہ ایک آدمی داڑھی نہ رکھے اور دوسرا الزام بھی لگائے کہ داڑھی والے گناہ نہیں کرتے؟ داڑھی رکھنے سے کوئی آدمی پاک ہو جاتا ہے؟ کتنے داڑھی والوں کو ہم نے جھوٹ بولتے، بے ایمانی کرتے، سمگلنگ کرتے دیکھا ہے، سود کھاتے ہوئے دیکھا ہے۔ یہ کوئی دلیل نہ ہوئی۔ اللہ کے بندو! داڑھی رکھنا سنت الانبیاء والمرسلین ہے اور نہ رکھنا سنت شیطان ہے۔ اب آپ کی مرضی جس کے راستے پر چلیں۔ شیطان کی داڑھی نہیں ہے، البتہ آپ مجھے داڑھی والا شیطان نہیں دکھا سکتے۔ اگر کسی نے دیکھا ہو تو مجھے دکھائے۔

قاعدہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دو جماعتیں بنائیں: ایک رحمان والی اور ایک شیطان والی۔ حزب الرحمان یا حزب الشیطان، دو جماعتیں ہیں۔ حزب الرحمٰن والوں کی داڑھی ہے تو صاف ظاہر ہے کہ حزب الشیطان والوں کی نہیں ہے۔ حزب الرحمٰن والے سچ اور حق پر ہیں اور حزب الشیطان والے جھوٹ اور باطل پر ہیں۔ یہ تو واضح سی بات ہے، لیکن یاد رکھو کہ دشمن نے سب سے پہلے اس سنت پر حملہ کیا کہ جس کی ابتداء سیدنا ابراہیم علیہ السلام سے ہوئی۔

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ میرے دادا کو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ داڑھی بڑھاؤ اور مونچھیں کٹواؤ۔

دوسرا حکم یہ ملا تھا کہ جب وضو کرو تو کلی کرو، تا کہ آپ کے منہ کے اندر کی صفائی ہو جائے۔ تیسرا یہ کہ جب وضو کرو تو ناک میں پانی کھینچو۔ یاد رکھو کہ ہمارے ہاں جو لوگ وضو کرتے ہیں، ناک کو پانی سونگھاتے ہیں، یہ ٹھیک نہیں ہے، بلکہ پانی کھینچے۔ اس کا معنی یہ ہوتا ہے کہ پانی اتنا کھینچو کہ ناک کی نرم ہڈی تک چلا جائے یعنی پانی آپ باقاعدہ کھینچیں، ناک میں پانی جائے، ناک کو صاف کریں اور ناک کی نرم ہڈی تک جا پہنچے۔ جیسے سجدہ کرتے ہیں اسی طرح وضو کرتے ہیں، وہاں بھی ٹھونگیں اور یہاں بھی ٹھونگیں۔ اسی طرح سے فرض غسل نہیں ہوگا جب تک ناک میں پانی اچھی طرح سے نہیں ڈالے گا۔ استنشاق کا لغت میں بھی یہی معنی ہے کہ پانی کو کھینچ کر ناک میں چڑھانا۔ یہ سنت الانبیاء والمرسلین ہے۔ اچھا اسی پر آپ عمل کریں۔ اسی پر مجھے ایک دوست نے قصہ سنایا۔

ایک انگریز کا واقعہ:

ایک انگریز افسر تھا۔ اس کا کھانا پکانے والا بابو جو مسلمان تھا...... چونکہ ہم لوگوں نے تو یہی کام سیکھا ہے تا کہ مالی بن گئے یا کھانا پکانے کے لیے بابو یا چپڑاسی بن گئے؛ کیونکہ اس سے بڑے کام تو کافر کرتے ہیں، وہ صاحب ہوگا اور ہمارا مسلمان چپڑاسی ہوگا...... خیر اس نے چھٹی مانگی کہ مجھے نزلہ اور زکام ہو گیا، لہٰذا مجھے چھٹی دے دی جائے۔ اسے بلایا اور کہا: چھٹی تو میں تمہیں دیتا ہوں، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ تم نام کے مسلمان ہو، نماز نہیں پڑھتے ہو۔ اس نے کہا: سر! اس نے کہا: سر کی کیا بات ہے؟ سیدھی بات کرو، تم نماز نہیں پڑھتے ہو۔ اس نے کہا کہ کبھی کبھی پڑھتا ہوں۔ اس نے کہا: جھوٹ بولتے ہو، اگر تم مسلمان ہوتے اور اپنے مذہب کے مطابق فجر کی نماز کے لیے وضو کرتے، تین دفعہ ناک میں پانی کھینچتے اور نماز پڑھتے تو کبھی بھی تم کو نزلہ نہ ہوتا۔ تم نماز نہیں پڑھتے ہو، نہ وضو کرتے ہو۔ تم تو اپنے مذہب میں بھی سچے نہیں ہو۔ اس نے کہا: ہاں یہ ہو سکتا ہے وائرس لگ جائے، کسی دوسرے سے لگ جائے ہم مکمل مسلمان بنیں ناں۔ مکمل نہیں بنیں گے تو ہمارے ساتھ ایسا ہی ہوگا، دوسرے سے رگڑا لگتا رہے گا۔

دس چیزیں فطرت میں سے ہیں:

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''عَشْرٌ مِنَ الْفِطْرَةِ: قَصُّ الشَّارِبِ وَ إِعْفَاءُ اللِّحْيَةِ وَ السِّوَاكُ وَ اسْتِنْشَاقُ الْمَاءِ وَ قَصُّ الْأَظْفَارِ وَ

غَسْلُ الْبَرَاجِمِ وَ نَتْفُ الْإِبِطِ وَ حَلْقُ الْعَانَةِ وَ انْتِقَاصُ الْمَاءِ...قَالَ زَكَرِيَّا: قَالَ مُصْعَبٌ: وَ نَسِيتُ الْعَاشِرَةَ إِلَّا أَنْ تَكُونَ الْمَضْمَضَةَ." [صحیح مسلم، رقم:۲۶۱]

دس چیزیں فطرت کے ساتھ تعلق رکھتی ہیں: مونچھوں کا کٹوانا، داڑھی کا بڑھانا، مسواک کرنا، ناک میں پانی کھینچنا، ناخنوں کا کاٹنا اور جوڑوں کے اندر جو چیز رہ جاتی ہے اس کو دھونا صاف کرنا اور بالوں کا صاف کرنا، بغلوں کا صاف کرنا اور زیر ناف بالوں کو حلق کرنا اور پانی کے ساتھ پاکی حاصل کرنا۔ حدیث کے راوی کہتے ہیں کہ میں دسویں چیز بھول گیا، شاید مضمضہ یعنی کلی کرنا ہو۔

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ پانچ چیزوں کا فطرتِ انسانی سے تعلق ہے: ختنہ کرانا، زیر ناف بالوں کا استرے سے صفائی کرنا، مونچھوں کا کاٹنا اور ناخنوں کا کاٹنا اور بغلوں کے بالوں کو نوچنا۔ یہ سنت الانبیاء بھی ہے اور سنت محمد مصطفیٰ ﷺ بھی ہے۔ ان سب کا فطرت سے تعلق ہے۔

ایک قول یہ ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ دس چیزوں میں سے چھ چیزوں کا تعلق انسان سے ہے اور چار چیزوں کا تعلق مشاعر سے ہے۔ انسان کے اندر کی جو چیزیں ہیں، وہ یہ ہیں: زیر ناف بالوں کا صاف کرنا، بغلوں کے بالوں کو نوچنا، اور ختنہ۔ ابن بصیرہ فرماتے ہیں کہ اگر غور کرو تو یہ تینوں ایک چیزیں ہیں۔ ناخنوں کا کاٹنا، مونچھوں کا کاٹنا، مسواک کرنا، جمعہ کے دن غسل کرنا، ساری چیزیں بدن کی صفائی کے ساتھ تعلق رکھتی ہیں اور چار مشاعر ہیں: طواف کرنا، صفا و مروہ پر دوڑنا، کنکریاں مارنا اور طوافِ افاضہ کرنا۔

ایک قول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا یہ بھی آتا ہے کہ دین کے متعلق جب کسی سے امتحان لیا گیا اور وہ امتحان میں پورا پورا اُترا ہو تو اس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام اُترے ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے میں نے پوچھا: اس کا سائل کون؟ کہ وہ کون سے کلمات ہیں جن کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آزمایا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ قرآن میں غور کرو تو تیس صفات ہیں، ان تیس صفات پر عمل کرنے والا انسان پورا پورا مومن کہلانے کا حق دار بنتا ہے۔ دس اللہ نے سورۃ براءۃ میں ذکر کیے: ﴿اَلتَّآىِٕبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ السَّآىِٕحُوْنَ الرّٰكِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ ؕ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ [التوبۃ:۱۱۲]

اور دس صفات سورۃ مومنون میں موجود ہیں: ﴿قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۙ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ

هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۝ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۝ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْوٰرِثُوْنَ ۝﴾ [المومنون: ۱ تا ۱۰] اور دس سورۃ احزاب میں ہیں: ﴿اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْقٰنِتٰتِ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالصّٰدِقٰتِ وَالصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰبِرٰتِ وَالْخٰشِعِيْنَ وَالْخٰشِعٰتِ وَالْمُتَصَدِّقِيْنَ وَالْمُتَصَدِّقٰتِ وَالصَّآئِمِيْنَ وَالصّٰٓئِمٰتِ وَالْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ وَالذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّالذّٰكِرٰتِ ۙ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا ۝﴾ [الاحزاب: ۳۵] ابراہیم علیہ السلام ان تیس صفات پر پورے پورے اُترے اور ان سب چیزوں پر عمل کر کے دکھایا تو اللہ تعالیٰ نے بھی ان کو اتنا بڑا مقام عطا کیا۔

ایک قول یہ ہے کہ آپ کو سخاوت اور مہمان نوازی کا حکم دیا کہ اپنا مال، اپنی ہر چیز اللہ کی راہ میں قربان کر دیجیے۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی مہمان نوازی پورے عالم میں ضرب المثل ہے۔ آپ کے کرم اور سخاوت کا یہ عالم تھا کہ اگر کبھی کھانے کے وقت کوئی مہمان نہ آتا تو حضرت باہر تشریف لے جاتے، مہمان کو ڈھونڈ کر لے آتے کہ میرے ساتھ کھانا کھائے اور اگر کوئی نہ ملتا تو ابراہیم علیہ السلام بھی بھوکے سو جاتے تو یہ بھی ایک امتحان تھا۔

ابن ابی حاتم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: وہ ابتلاء یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو ستاروں کے ساتھ آزمائش میں ڈالا تو ابراہیم علیہ السلام پورے نکلے، یعنی اللہ تعالیٰ کو راضی کر لیا۔ قرآن مجید میں اس واقعہ کی تفصیل موجود ہے۔

سدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: سب سے پہلا ابتلاء جو ابراہیم علیہ السلام پر آیا، وہ ختنے کا تھا۔ یہ سنت ان سے شروع ہوئی۔ اس کے ساتھ مہمان نوازی کی سنت، ناخنوں کا کاٹنا اور مونچھوں کا کاٹنا۔

سب سے پہلے سفید بال بھی ابراہیم علیہ السلام کی داڑھی مبارک میں آئے۔ آپ نے جب دیکھا کہ داڑھی مبارک میں سفید بال آئے ہوئے ہیں تو پوچھا کہ میرے اللہ! یہ تبدیلی کیوں ہو رہی ہے؟ یہ سفیدی کیوں آئی ہے؟ فرمایا: یہ وقار ہے، اس سے انسان کی عزت و عظمت میں اضافہ ہوتا ہے جب عمر زیادہ ہوگی تو عزت میں اضافہ ہوگا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعا مانگی: یا اللہ! اگر یہ باعث وقار ہے تو میرے وقار و عزت میں اضافہ فرما۔

سب سے پہلے منبر پر کھڑے ہو کر خطبہ دینے کی ابتداء بھی ابراہیم علیہ السلام سے ہوئی۔ برید کا تیز کرنا، یہ بھی سنت

ابراہیم سے ہے۔ اس سے مراد کاٹنے والی چیزوں کو تیز کرنا ہوتا ہے اور تلوار کے ساتھ جہاد کرنا یہ سنت ابراہیم ہے اور مسواک کی سنت بھی ابراہیم علیہ السلام سے شروع ہوئی اور پانی سے استنجے کی سنت بھی ابراہیم علیہ السلام سے شروع ہوئی اور شلوار کا استعمال ہمارے ہاں تو شلوار ایک خاص طرز ہے ورنہ عرب پاجامہ کو بھی شلوار کہتے ہیں، اس کی ابتداء بھی سیدنا ابراہیم علیہ السلام سے ہوئی۔

اصل بات یوں سمجھیں کہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت ابراہیم علیہ السلام تک چند ہزار سال کا وقفہ ہے۔ یہ چیزیں پہلے باعتبار شریعت سنت نہیں تھیں، یعنی ہر آدمی اپنے اپنے طرز پر عمل کرتا تھا۔ منہ صاف کیا، کسی نے مسواک کیا اور کسی نے نہ کیا۔ یعنی یہ چیز شریعت میں سنت بن کر جب آئی جب سب سے پہلے ابراہیم علیہ السلام سے اس سنت کا اجراء ہوا اور پھر وہ سنت الانبیاء والمرسلین بن گئی۔ ورنہ یہ تو نہیں کہ آدم علیہ السلام سے لے کر ابراہیم علیہ السلام تک کسی نے مسواک بھی نہ کی ہو۔ یہ تو ناممکن سی بات ہے، آخر کوئی نہ کوئی طریقہ تو ہوگا ناں۔ ہاں جہاں ختنے کے بارے میں آتا ہے تو اس سے پہلے ختنہ کا رواج ہی نہیں تھا۔ اچھا! اسی طرح بالوں میں سفیدی کا نہ آنا۔ اس کا معنی یہ ہے کہ بال سفید ہی نہیں ہوتے تھے۔ اللہ کی قدرت تھی، اور یہ بات کوئی بعید بھی نہیں۔ اب دیکھیں ناں! آج سے پچاس یا سو سال پہلے کے لوگ ہیں، ان کے بال پچاس یا ساٹھ سال کی عمر میں سفید ہوتے تھے، اب بیس سال کے جوان بچے کے بال بھی سفید ہو جاتے ہیں تو اللہ بہتر جانتا ہے اس زمانے میں کیا عالم تھا اور کیا تقاضے تھے؟ اس لیے ابراہیم علیہ السلام سے یہ اُمور باعتبار شریعت کے سنت کے جاری ہوئے۔ ورنہ تلواریں پہلے بھی ہوتی ہوں گی اور کاٹنے والی چیزیں پہلے بھی ہوتی ہوں گی، لیکن ان کو باعتبار شریعت کے استعمال کرنا حضرت ابراہیم علیہ السلام سے شروع ہوا۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا لباس:

بعض روایات میں آتا ہے کہ شلوار، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خریدی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پسند بھی آئی۔ فرمایا کہ یہ بڑا اچھا لباس ہے کہ آدمی کے ستر کی ضمانت ہے۔ لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے استعمال نہیں کی، زندگی میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف چادر مبارک استعمال فرمائی۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نیچے چادر مبارک پہنتے تھے اور اوپر لمبا کرتا پہنتے تھے اور اس کرتے کی طرز مبارک جو ہمیں حدیث مبارک سے ملتی ہے وہ یہ نہیں ہے جو آج کل ہم لوگ عرب میں پہنتے ہیں، بلکہ جیسے تبلیغی علماء لمبا کرتا پہنتے ہیں، ان سے ملتا جلتا، سو فیصد تو یہ بھی نہیں کہا جا سکتا اور اسی طرح حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے

زمانے میں یہاں آپ نے دیکھا ہوگا کہ بعض بدو لوگوں کے بازو بڑے لمبے ہوتے ہیں، اسی میں سامان بھی باندھ لیتے ہیں۔ یہ بھی حضور اکرم ﷺ کے زمانے میں لباس تھا اور زیادہ تر لباس دو چادریں ہوتی تھیں۔ ایک چادر نیچے باندھ لی اور ایک اوپر ڈال لی اور زیادہ مشہور چادریں بردیمانی کہلاتی تھیں، جو یمن کے علاقوں سے آتی تھیں۔

بہرحال حضور پاک ﷺ کو شلوار پسند تھی؛ اس لیے کہ اس میں بدن چھپ جاتا ہے اور آدمی رات کو سوتا ہے تو بدن کھلتا نہیں ہے۔ اصل مقصود تو ستر عورت ہے کہ ناف سے لے کر گھٹنوں تک چھپا رہے، یہ مرد کے لیے ستر ہے۔ اور عورت کا سر سے لے کر پاؤں تک ہے۔ لہٰذا آدمی اپنے گھر میں بھی سوئے تو ایسا کپڑا ہونا چاہیے کہ جس سے ستر نہ کھلے؛ کیونکہ انسان کو سب سے پہلے تو اللہ تعالیٰ سے حیا کرنی ہے، اس کے بعد ملائکہ سے حیا کرنی ہے اور ہر گھر میں الحمد للہ! ملائکہ اور کراماً کاتبین تو موجود ہوتے ہی ہیں۔ اس لیے آدمی کوشش یہ کرے کہ جتنا ہو لباس ایسا پہنے کہ ستر قائم رہے۔

آج کل تو ہم لوگ مصیبت اور ابتلاء میں آ گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ ہدایت فرمائے۔ ایسا رواج آ گیا ہے کہ عربی توپ بھی بالکل باریک کپڑے کا ہوتا ہے اور نیچے ان لوگوں نے انڈر رویئر پہنا ہوتا ہے۔ آپ نماز پڑھ رہے ہیں، رکوع میں ہیں، آپ کے سامنے بالکل ننگا پورا بدن نظر آ رہا ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ ہم نے تو کپڑا پہنا ہوا ہے۔ کپڑے پہننے کا معنی ہے: ستر چھپانا۔ جو کپڑا ستر چھپانے میں کام نہ آئے، اس کا پہننا اور نہ پہننا برابر ہے۔ اس لیے حضور پاک ﷺ نے فرمایا کہ بہت سی عورتیں ایسی ہوں گی جو کپڑے پہنے ہوئے ہوں گی، لیکن ننگی ہوں گی۔ یعنی کپڑا تو ان پر بھی ہوگا، لیکن وہ ننگی کہلائیں گی۔ مطلب یہ کہ باریک کپڑا پہنا ہوگا کہ بدن نظر آئے یا کپڑا تو موٹا ہوگا، لیکن بدن پر ایسا ٹائٹ ہے کہ ہر عضو محسوس ہو رہا ہے جیسے وہ بھی اس نے نہیں پہنا ہوا۔ یہ بھی اسی حکم میں آئے گا کہ کپڑا تو پہنا ہوا ہے، لیکن ہے ننگی۔

لہٰذا ستر کا معنی ہے کہ بدن کے وہ حصے جن کا شریعت نے چھپانے کا حکم دیا ہے کہ ایسا ڈھیلا ڈھالا لباس پہنے کہ بندہ کا پتہ نہ چلے کہ اس کے اعضاء کیسے ہیں؟ اگر وہ ہر عضو پر ٹائٹ ہے جیسے ہمارے ہاں بعض لوگ چوڑی دار پاجامے پہنتے ہیں، پورا بدن کا بدن ہی نظر آ رہا ہے تو اس کو ستر نہیں کہا جائے گا۔ ہاں اس کے اوپر کرتا ہے تو ٹھیک ہے۔

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ''إِنْ أَتَّخِذِ الْمِنْبَرَ فَقَدِ اتَّخَذَهُ أَبِي إِبْرَاهِيمُ، وَ إِنْ أَتَّخِذِ الْعَصَا فَقَدِ اتَّخَذَهَا أَبِي إِبْرَاهِيمُ'' میں نے جو منبر اختیار فرمایا، میرے ابا ابراہیم علیہ السلام نے بھی منبر پر خطاب فرمایا اور میں نے عصا ہاتھ میں لیا

تو میرے ابا ابراہیم علیہ السلام بھی عصا ہاتھ میں رکھتے تھے۔ لیکن مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث ثابت نہیں۔ (جبکہ یہ حدیث باسند اخبار مکہ للفاکہی: ۳/۱۷۸، مسند بزار: ۷/۸۱، مسند شاشی: ۳/۲۶۷، معجم کبیر طبرانی: ۲/۱۶۷، جزء ابی سعید الاشج: ۲۵، اتحاف الزائر لابن عساکر: ۱/۸۳، الجامع الصغیر للسیوطی: ۸۶۳۸، فتح الباری لابن حجر: ۸/۲۴۲، جامع المسانید والسنن لابن کثیر: ۷/۲۷۷، ۹۷، مجمع الزوائد: ۲/۱۰۱ وغیرہ میں موجود ہے۔ انور)۔

ابو جعفر ابن جریر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جو کلمات کے متعلق یہ تمام اقوال نقل کیے گئے ہیں، ممکن ہے کہ یہ سب کے سب مراد ہوں، یا ممکن ہے کہ بعض مراد ہوں اور بعض نہ ہوں۔ لیکن اگر ہم خود سے متعین کریں کہ کلمات سے مراد یہ ہیں اور یہ نہیں ہیں تو ٹھیک نہیں، جب تک کہ کسی حدیث مبارک یا اجماع سے اس کی تائید نہ ہو جائے۔ اس لیے اس کو عام رکھنا چاہیے اور قرآن مقدس نے بھی ایک عام لفظ فرمایا ہے، تعیین نہیں فرمائی۔

ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ابن جریر رحمہ اللہ کی یہی رائے ہے کہ تعیین نہ کرو کہ یہ دس مراد ہیں، جبکہ ہوسکتا ہے کہ بعض مراد ہوں اور بعض نہ ہوں اور ایسی کوئی متواتر روایت یا خبر واحد بھی نہیں ملی کہ جس کا ماننا بھی ضروری ہو، جس کی وجہ سے ہم کہیں کہ یہی متعین ہے۔

ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ہمیں حضور پاک ﷺ سے اس بارے میں دو روایات ملی ہیں۔ سہل بن معاذ بن انس رضی اللہ عنہ نقل فرماتے ہیں کہ حضور پاک ﷺ نے ارشاد فرمایا: کیا میں تم لوگوں کو خبر نہ دوں کہ میرے پاک رب نے ابراہیم علیہ السلام کو یہ مرتبہ کیوں بخشا؟ پھر آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام صبح کو بھی اور شام کو بھی یہ کلمات پڑھتے تھے: ﴿فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ حِيْنَ تُمْسُوْنَ وَحِيْنَ تُصْبِحُوْنَ۝ وَلَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَعَشِيًّا وَّحِيْنَ تُظْهِرُوْنَ۝﴾ [الروم: ۱۸] یعنی ایک تو ان آیات کا پڑھنا بھی فضیلت والا ہے کہ آدمی صبح و شام ان آیات کو پڑھا کرے۔

اور دوسری بات یہ ہے کہ انبیاء کا پڑھنے کا معنی یہ ہوتا ہے کہ اس پر عمل پیرا ہوتے تھے۔ اس طرح نہیں کہ ہماری طرح ایک آیت پڑھ لیں، لیکن عمل نہ کریں۔ وہ تو جب بھی کوئی اللہ تعالیٰ کا حکم آتا، اس پر باقاعدہ عمل کرتے تھے، اللہ تعالیٰ کی تقدیس و تسبیح اور حمد و ثنا صبح و شام اُٹھتے بیٹھتے کرتے تھے۔ اس لیے انسان کو چاہیے کہ ہر وقت کوشش کرے کہ اللہ کے ذکر سے اس کی زبان تر رہے۔

دوسری روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے دریافت کیا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ﴿وَاِبْرٰهِيْمَ الَّذِيْ وَفّٰٓى﴾ کا

مرتبہ کیوں ملا؟ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ اللہ اور اس کے رسول جانیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ابراہیم علیہ السلام روزانہ دن میں چار رکعت ادا فرماتے تھے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ابراہیم نے میرا پورا پورا حق ادا کر دیا۔

اب بھی اگر دیکھیں تو کوئی مشکل مسئلہ نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرمائے۔ ایک تو فرائض ہیں، وہ تو پڑھنے ہی پڑھنے ہیں۔ آدمی جب صبح کی نماز کے لیے اُٹھتا ہے، مثال کے طور پر چار بج کر دس یا بارہ منٹ پر صبح کی اذان ہوتی ہے، اور جس نے نماز پڑھنی ہے وہ چار بجے اُٹھے گا، تب ہی اتنا بڑا اجر حاصل ہوگا۔ نماز تو پڑھنی ہی ہے، اگر آپ چار بجے سے صرف دس منٹ پہلے اُٹھ جائیں کہ وضو بھی کر لیا اور دو رکعت تہجد بھی گھر میں پڑھ لی۔ نماز پڑھ کر گھر سے نکل آیا۔

اسی طرح حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب گھر سے نکلے تو پڑھے: اگر آدمی تین دفعہ یا سات دفعہ یہ پڑھ لے تو اللہ تعالیٰ کی حفاظت اور پناہ میں آ جاتا ہے اور شیطان کے حملوں سے بچ جاتا ہے اور مسجد میں آ گئے، اب اذان ہوگئی اور آدمی نے دو رکعت سنت پڑھ لی۔ اس کے بعد آپ نے فجر پڑھ لی۔

اب اگر آپ کی ڈیوٹی ہے اور آپ نے جانا ہے تو آپ جائیں، غسل کریں اور تیاری و ناشتہ کریں۔ جاتے جاتے اشراق کا وقت ہو جائے گا تو اگر آپ وضو کر کے گھر میں کھڑے کھڑے دو رکعت نماز اشراق پڑھ لیں، چار نہ سہی تو یہ کون سا مشکل مسئلہ ہے؟ اگر آدمی رات کو دیر سے سوئے تو ڈیوٹی کے لیے تیار ہوتا ہے یا نہیں؟ اگر آدمی ایک انسانی ڈیوٹی کے لیے اتنی محنت کرتا ہے تو کیا اپنے اللہ کو راضی کرنے کے لیے دس منٹ کی قربانی نہیں دے سکتا؟ صرف دس منٹ پہلے اُٹھ جائے، اس میں تہجد کی نعمت بھی مل گئی، فجر کی نماز بھی نصیب ہوگئی۔

دو رکعتیں جو پڑھی جاتی ہیں، اس کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ اگر یہ ساری دنیا اور جو کچھ اس کے اندر موجود ہے، کسی شخص کو دیتے ہیں تو یہ دو رکعتیں اس سے بہتر ہیں۔ آپ اندازہ کریں کہ ہم تو دو ہزار ریال کے لیے بھاگتے رہتے ہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ ساری دنیا اور جو کچھ اس کے اندر ہے اور پھر وہ ایسا وقت ہوتا ہے کہ اللہ پاک دنیا کے آسمان پر نزولِ رحمت فرماتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ ہے کوئی مانگنے والا کہ میں اس کا سوال پورا کروں؟ اس لیے آپ تھوڑی سی ہمت کر لیا کریں۔

ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ دو احادیث نقل کرنے کے بعد ابن جریر رحمہ اللہ نے بحث کی ہے کہ یہ دونوں احادیث ضعیف ہیں۔

اُردو میں حدیث کی تصانیف لکھنے والوں کا حال:

ہمارے ہاں یہ رواج اور بہت بڑی کوتاہی ہے...... میں اعتراض تو نہیں کر سکتا علماء پر۔ علماء تو آخر علماء ہیں، ہم تو طالب علم ہیں...... لیکن ہمارے ملک میں ایک بہت بڑی غلط بات ہے، اور وہ یہ کہ جو بھی کتاب لکھیں گے اور اس میں حدیث نقل کریں گے تو کہیں گے کہ یہ حدیث پاک ہے۔ آگے یہ نہیں لکھیں گے کہ یہ حدیث صحیح ہے یا حسن ہے یا ضعیف ہے۔ یہ حدیث آپ نے بخاری شریف سے یا ترمذی شریف سے یا کس کتاب سے نقل کی ہے۔ یہ ہمارے ہندو پاک میں ایک بہت بڑی مصیبت ہے، لیکن الحمدللہ! یہ بات عرب میں نہیں ہے، عرب میں آپ جتنی کتب دیکھیں گے چاہے متقدمین نے لکھی ہوں یا متاخرین نے، باقاعدہ حدیث کا حوالہ، اس کا مرتبہ اور کتاب کا حوالہ ہوگا اور اس کتاب کی جلد صفحہ نمبر ہوگا اور ساتھ یہ بھی ہوگا کہ طبع کس نے کی اور کب کی۔ اگر ایک آدمی کتاب کا حوالہ تو دیتا ہے، لیکن کتاب دوسرے ملک میں طبع ہوئی تو اس صورت میں وہ حوالہ تو نہیں ملے گا۔ اس لیے یہ پوری وضاحت کے ساتھ لکھتے ہیں۔ جبکہ ہمارے اندر یہ بہت بڑا نقص اور غلطی کی بات ہے۔

اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ہمارا اُردو والا بھائی جب پڑھتا ہے تو کہہ دیتا ہے کہ یہ حدیث شریف ہے۔ اب وہ کہاں جائے؟ اب اس بیچارے کو تو یہ پتہ ہی نہیں ہے کہ حدیث مبارک میں بھی مراتب ہیں... حدیث متواتر، حدیث صحیح، حدیث حسن یا حدیث ضعیف۔ مرسل ہے یا منقطع ہے اور اگر ضعیف ہے تو ضعف متن میں ہے یا سند میں ہے اور اگر متواتر ہے تو تواتر طبقات میں ہے یا اسناد میں ہے، کس چیز میں تواتر ہے۔ ان چیزوں کا ہر آدمی کو تو پتہ نہیں ہوتا۔ اس کے دماغ میں تو بس ایک بات آجاتی ہے کہ ایک کتاب میں نے پڑھی تھی اور فلاں بزرگ نے لکھی تھی۔ اس میں لکھا ہے کہ حضور پاک ﷺ کی حدیث مبارک ہے۔ اب وہ غریب کہاں جائے؟ اس کو آپ یہ کہیں کہ یہ بات غلط ہے تو وہ کہے گا کہ عجیب بات ہے! فلاں بزرگ نے لکھا ہے کہ یہ حدیث مبارک ہے اور تم کہتے ہو کہ غلط ہے!!

حدیث کی تصنیف کے اُصول:

ہمارے ہاں شاید جدید طبقے میں تو کچھ رجحان پیدا ہو رہا ہے۔ مجھے خود ایک آدمی نے رسالہ بھیجا۔ وہ میرے اپنے تعلق والے لوگ ہیں، ماشاءاللہ! بڑے صحیح العقیدہ لوگ ہیں اور بڑی خدمت اور دین کا بڑا کام کر رہے ہیں اور مدرسے چلا رہے ہیں۔ انہوں نے چہل حدیث کے نام سے ایک پمفلٹ شائع کیا اور مجھے بھیجا۔ اب میں دیکھ رہا

ہوں کہ آدمی احادیث اس میں غلط ہیں، ان کو ایک ایک کر کے حدیث پر نشان لگا کر بھیجا کہ یہ کیا بات ہے؟ انہوں نے بھی بس ایک کتاب سے دیکھا، دین کی بات سمجھی اور شائع کر دی۔ لکیر کے فقیر تو ہم لوگ ہیں ہی، جیسے کسی نے لکھا، ہم نے بھی لکھ دیا۔ ایک دوسرے کو دیکھ کر لکھتے چلے گئے، تحقیق کسی نے نہیں کی۔

اس لیے مفسر رحمہ اللہ نے فرمایا کہ لازمی بات ہے کہ جب حدیث پاک آئے تو آدمی یہ ضرور بیان کرے کہ اس حدیث کا مرتبہ کیا ہے، یہ حدیث کس کتاب میں ہے اور اس کا درجہ کیا ہے اور اس کے بارے میں محدثین کا فیصلہ کیا ہے؟ تاکہ کسی کو کسی قسم کا شبہ نہ رہے، جیسے مفسر رحمہ اللہ نے دو احادیث تو نقل کر دیں، لیکن ساتھ بیان بھی فرمادیا کہ یہ احادیث ضعیف ہیں، ان کے متن میں بھی ضعف ہے اور بعض راوی بھی ایسے پائے گئے ہیں جو ضعیف ہیں۔

ابن جریر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: کلمات سے مراد یہی ہے جو بعد میں موجود ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کو کعبۃ اللہ کی بناء کا حکم دیا اور کعبۃ اللہ کی پاکی کا حکم دیا، جس کو انہوں نے پورا کیا۔

تفسیر:

﴿وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ ۚ قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ﴾

اللہ نے فرمایا: جو تیری ذرّیت میں ظالم لوگ ہوں گے، ان کو میرا عہد نہیں پہنچے گا۔ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ سورۃ عنکبوت، آیت ۲۷ میں آتا ہے: ﴿وَجَعَلْنَا فِيْ ذُرِّيَّتِهِ النُّبُوَّةَ وَالْكِتٰبَ﴾ ابراہیم علیہ السلام نے جو دعا مانگی، اللہ تعالیٰ نے وہ قبول فرمائی کہ جو ظالم نہیں ہوں گے ان کو کتاب اور نبوت ملے گی۔ چنانچہ اس کے بعد ہر کتاب اللہ نے ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں ہی نازل فرمائی۔

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ اس کا معنی یہ تھا کہ ہم امامت تو آپ کی ذرّیت میں رکھیں گے، لیکن آپ کی ذرّیت میں ظالم بھی ہوں گے۔ بعض نے فرمایا کہ نہیں، آپ کی ذرّیت میں امامت تو ہوگی، لیکن یہ مرتبۂ امامت ان لوگوں کو نہیں ملے گا جو ظالم ہوں گے؛ کیونکہ ظالم کی کیسے اقتداء کی جائے؟ سفیان رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ظالم شخص مرتبۂ امامت کا مستحق نہیں ہوتا۔ لیکن اگر کوئی ظالم حاکم بن جائے تو وہ امامت کا حق دار نہیں ہو جاتا۔

ایک بات یاد رکھیں کہ ایسے بڑے بڑے لوگ بھی آ گئے جو بادشاہ بھی بنے، حکومت پہ آئے جب وہ ظالم تھے۔ اس کا مطلب دراصل یہ ہے کہ شریعت اسلام کی نظر میں جو ظالم ہو، وہ امام بننے کا حق دار نہیں۔ شریعت کا تقاضا یہ

ہے کہ اس کو حکمران نہ بنایا جائے، مثلاً مسجد کا امام عالم ہو، اللہ کے قرآن وسنت کو جاننے والا ہو اور متقی، علم رکھنے والا ہو اور اگر دو ہوں تو جو عمر میں زیادہ بڑا ہو، لیکن کبھی کبھی ایسے لوگ بھی دیکھے ہیں جو مصلائے امامت پر کھڑے ہو جاتے ہیں اور انہیں نہ دین کا پتہ اور نہ قرآن کا پتہ، حتیٰ کہ ان کو نماز کے فرائض، واجبات اور مستحبات کا بھی پتہ نہیں ہوتا۔ ایک ہے مصلے پر کھڑے ہو جانا اور ایک ہے شریعت کا حکم ہونا۔

اس لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا ہے: ﴿اَلْخَبِيْثٰتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ وَالْخَبِيْثُوْنَ لِلْخَبِيْثٰتِ ۚ وَالطَّيِّبٰتُ لِلطَّيِّبِيْنَ وَالطَّيِّبُوْنَ لِلطَّيِّبٰتِ ۚ اُولٰٓئِكَ مُبَرَّءُوْنَ مِمَّا يَقُوْلُوْنَ ۭ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ۝﴾ [النور:٢٦] پاک باز مردوں کے لیے پاک باز بیویاں اور خبیث مرد جو ہیں ان کے لیے خبیث عورتیں۔ یہ ایک عمومی قاعدہ ہے۔ ورنہ ایسا بھی ہوتا ہے مرد جو ہیں وہ بڑے فاسق وفاجر ہوتے ہیں اور ان کی بیویاں نیک ہوتی ہیں۔ بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ مرد عالم، متقی اور زاہد ہوتے ہیں بیوی پلید آجاتی ہے گھر میں۔ معنی یہ ہے کہ عموم اغلب یہ ہے، قاعدہ یہ ہے کہ پاک، پاک کو ملتی ہے، لیکن کبھی کبھی اس کے برعکس بھی ہو جاتا ہے دنیا میں۔ لہٰذا اصل یہ ہے کہ جو ظالم ہو وہ مرتبۂ امامت کا حق دار نہیں ہو سکتا۔ البتہ اگر کوئی زبردستی یا دھوکے سے حکومت یا مصلائے امامت پر آجائے تو اس کی اقتداء کی جائے گی۔

سعید بن جبیر رحمہ اللہ اور دیگر مفسرین نے فرمایا کہ ظالمین سے مراد مشرک ہیں کہ آپ کی ذرّیت میں جو مشرک ہوں گے، وہ مقامِ امامت پر نہیں ہوں گے؛ کیونکہ سب سے بڑا ظلم شرک ہے۔

﴿عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ﴾ ابن جریج رحمہ اللہ نے فرمایا کہ عہد سے مراد یہ ہے کہ میرا امر اور میرا حکم امامت ظالموں کو نہیں ملے گا۔

ابن جریر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ کسی ظالم سے کوئی عہد نہیں ہوتا۔ اگر ہو تو اس کو ختم کر دو۔ باقی دنیاوی معاہدات اور معاملات جو کفار سے کیے گئے ہوں تو ان کا حکم یہ ہے کہ وہ پورے کیے جائیں۔

حضرت قتادہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس آیت کا معنی یہ ہے کہ اللہ کے عہد کے حق دار آخرت میں ظالم نہیں ہوں گے۔ باقی دنیا میں تو بڑے ظالم بڑے حاکم بن جاتے ہیں، لیکن آخرت میں ان کو یہ مرتبہ حاصل نہیں ہوگا۔

''عہد'' سے مراد: دین اسلام ہے۔ جو ظالم ہے، وہ اسلام پر کیسے پابند رہے گا؟ بعض حضرات نے فرمایا: اس میں اشارہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کی تمام اولاد حق پر نہ ہوگی، بلکہ ان میں محسن بھی ہوں گے اور ظالم بھی ہوں گے۔

ابو العالیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: مقامِ اطاعت، اللہ کے ولیوں کو حاصل ہوتا ہے، ظالموں کو نہیں۔
سدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ''عہد'' سے مراد ''نبوت'' ہے کہ آپ کے خاندان میں نبوت تو رکھیں گے، مگر نبوت کسی ظالم کو نہیں مل سکتی۔
مفسرین کے یہ اقوال ابن جریر رحمہ اللہ اور ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے نقل فرمائے ہیں۔
ابن خویز منداد المالکی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ظالم، مسلمانوں کا خلیفہ اور حاکم نہیں بن سکتا اور وہ مفتی بھی نہیں بن سکتا اور ظالم گواہ بھی نہیں بن سکتا اور روایت بھی نہیں کر سکتا، اس کی روایت کا اعتبار بھی نہیں ہوتا۔

﴿وَإِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَأَمْنًا وَاتَّخِذُوا مِن مَّقَامِ إِبْرَاهِيمَ مُصَلًّى ۖ وَعَهِدْنَا إِلَىٰ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ أَن طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّائِفِينَ وَالْعَاكِفِينَ وَالرُّكَّعِ السُّجُودِ﴾ [البقرۃ: ۱۲۵]

''اور جب ہم نے کعبہ کو لوگوں کے لیے اجتماع کی اور امن کی جگہ بنایا اور بنالو مقامِ ابراہیم کو نماز کی جگہ اور ہم نے ابراہیم و اسماعیل کو حکم دیا میرے گھر کو پاک رکھو طواف کرنے والوں اور اعتکاف کرنے والوں اور رکوع کرنے والوں کے لیے۔''

پہلا قبلہ:

سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی مناسبت سے ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے اس گھر یعنی بیت اللہ کی عظمت اور شان کو ذکر فرمایا ہے؛ کیونکہ اس کی بناء کے ساتھ ابراہیم علیہ السلام کا تعلق ہے۔
جب سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا ذکر آیا کہ ہم نے ان کو مرتبۂ امامت عطا فرمایا اور امامت بھی اتنی بڑی کہ ﴿إِنِّي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَامًا﴾۔ اسی ضمن میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جب ہم نے ان کو مرتبۂ امامت ﴿لِلنَّاسِ﴾ سے سرفراز فرمایا تو ہم نے ان کو ایسے کعبہ کا بانی بنایا جو ﴿وُضِعَ لِلنَّاسِ﴾... ﴿مَثَابَةً لِّلنَّاسِ﴾ ہے؛ کیونکہ امامت کے لیے ایک مرکز اور دار الخلافہ بھی ضروری ہے۔ سب سے پہلا کعبہ بھی یہی ہے اور سب سے آخری قبلہ بھی یہی ہے تمام مسلمانوں کے لیے، زندہ ہوں تب بھی اور مر جائیں تب بھی یہی قبلہ ہے قیامت تک۔ نصوص سے ثابت ہے کہ سب سے پہلے بھی یہی قبلہ بنایا گیا، بیت المقدس بعد میں بنا۔ بیت المقدس کو ہم قبلہ اول اس اعتبار سے کہتے ہیں کہ حضور

اکرم ﷺ کے زمانے میں اسلام کی ابتداء میں وہ قبلہ تھا، پھر اس کعبہ کا حکم آیا۔ اس اعتبار سے وہ قبلہ اوّل ہے، ورنہ اوّلیتِ حقیقیہ اسی قبلہ کو حاصل ہے، جیسا کہ قرآن پاک میں بھی اللہ تعالیٰ نے نص فرمائی ہے: ﴿إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ مُبَارَكًا وَهُدًى لِّلْعَالَمِينَ ۝٩٦﴾ [آل عمران:۹۶]

بیت اللہ کی تاریخ:

میرے نبی! ہم نے آپ کی بات سمجھ لی۔ آپ بار بار جو تمنا کرتے ہیں کہ آپ کا قبلہ ابراہیمی ہو۔ ہم آپ کو اب اسی قبلے کی طرف پھیر رہے ہیں جو آپ کا پسندیدہ قبلہ ہے۔ پہلا قبلہ بیت اللہ ہی میں تھا، اگر اس کو قبلہ بعد میں بنایا گیا تو پہلے تو قبلہ کہنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ دوسری یہ ہے جب اللہ تعالیٰ نے اس کعبہ کو بنایا تھا اس وقت تو بیت المقدس کا زمین پر وجود تک نہیں تھا۔ اوّل بیت المقدس یہی کعبۂ ابراہیمی ہے۔

اسی لئے علماء نے لکھا ہے کہ سب سے پہلے جب اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو بنایا تو پہلے یہاں پانی تھا۔ پھر اس پانی کے اوپر جہاں اب کعبۃ اللہ کی عمارت ہے ایسے ہے جیسے ایک بلبلہ، لہٰذا سب سے پہلے یہاں پانی آیا، پھر اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کے ساتھ اس پانی کو گاڑھا کیا، پھر قدرت نے اس کو اسی حال میں چھوڑ دیا اور آسمان بنا دیئے۔ آسمان بنانے کے بعد پھر زمین کو پھیلا دیا گیا۔ ﴿وَالْأَرْضَ بَعْدَ ذَٰلِكَ دَحَاهَا ۝٣٠﴾ [النازعات:۳۰] یوں سمجھیں کہ جیسے ہم گھروں میں روٹی پکاتے ہیں، پہلے آٹا گوندھتے ہیں۔ آٹا گوندھنے کے بعد جب روٹی پکنے کے قابل ہو جاتی ہے تو پھر گول گول پیڑے بنا لیتے ہیں، پیڑے بنا کر رکھ دیئے جاتے ہیں، پھر جب روٹی پکانے کا وقت آتا ہے تو پیڑوں کو پھیلا دیا جاتا ہے۔ پہلے یہ پانی تھا، پھر اس میں زمین کا مادہ تیار کر کے اس میں رکھ دیا گیا کہ گوندھ کر یہ خمیر اپنے اپنے مقام پر پہنچ جائے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے آسمانوں کو اسی طرح پیدا فرمایا۔ اس کے بعد چونکہ اس کا خمیر تیار ہو چکا تھا تو اللہ تعالیٰ کی قدرت سے اس کو پھیلا دیا، لہٰذا جب زمین بھی نہیں بنی تھی، اس وقت بھی قبلہ موجود تھا تو اس کی اوّلیتِ حقیقیہ میں کسی کو شبہ نہیں ہو سکتا۔

پھر جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کیا اور آسمانوں سے اُتارا اور زمین پر تشریف لائے تو ان کو بھی حکم ہوا کہ اسی کعبہ کا طواف کریں۔ ان کو بیت المقدس کا حکم نہیں ملا تھا۔ آدم علیہ السلام نے جب سب سے پہلے کعبہ کا طواف کیا تھا، دل میں خوشی تو ہوئی ہوگی کہ میں سب سے پہلا انسان ہوں جو کعبہ کا طواف کر رہا ہوں۔ اس لیے اللہ

تعالیٰ نے فرمایا کہ اے جبرائیل! آدم کو بتادو کہ آپ ابھی پیدا بھی نہیں ہوئے تھے کہ ملائکہ اللہ تعالیٰ کے گھر کا طواف کرتے تھے، گویا کہ پیدائش آدم سے پہلے بھی یہ کعبہ تھا۔

آپ زمین کے نیچے تک چلے جائیں تب بھی یہ کعبہ ہوگا اور آسمانوں تک چلے جائیں گے تب بھی یہ کعبہ ہوگا اور بیت المعمور ساتویں آسمان کا قبلہ ملائکہ ہے، وہ عین اسی کعبۃ اللہ کے اوپر ہے۔ اگر آج اللہ تعالیٰ اپنی قدرت سے اس آسمانی قبلے کو اُتار دیں تو عین اسی کعبہ کے اوپر آکر عمارت بیٹھ جائے گی، آسمانوں پر قبلہ اسی کعبہ کے اوپر ہے، بیت المقدس کے اوپر نہیں ہے۔

پھر کعبہ اوّل تعمیر آدم علیہ السلام اور پھر حضرت ادریس علیہ السلام کے زمانے میں تعمیر ہوئی۔ پھر اللہ تعالیٰ کی قدرت سے طوفانِ نوح آیا تو کعبۃ اللہ بہہ گیا، صرف ایک جگہ اونچا سا ٹیلہ بچ گیا۔ طوفانِ نوح کے بعد پھر اس پر مدارج آئے، لیکن سب سے زیادہ اہمیت جس تعمیر کی ہوئی، وہ تعمیر بنائے ابراہیمی ہے، اس سے پہلے کی تعمیر کا ذکر قرآن میں نہیں ملتا۔ اتنا ملتا ہے کہ ﴿إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ﴾ [آل عمران:۹۶] اور سیدنا آدم علیہ السلام کے زمانے میں جو تعمیر ہوئی اس کا ذکر نہیں ملتا، اور جس کا ذکر ملتا ہے: ﴿وَإِذْ يَرْفَعُ إِبْرَٰهِيمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَإِسْمَٰعِيلُ﴾ [البقرۃ:۱۲۷]

اور اسی سے ایک بات معلوم ہوئی کہ سب سے پہلے ناخن کاٹنے، ختنہ، بغلوں کی اور زیر ناف بالوں کی صفائی وغیرہ یہ تمام چیزیں پہلے بھی کسی شکل میں موجود تھیں، لیکن اس کا ذکر حضرت ابراہیم علیہ السلام سے آکر شروع ہوا۔ اور پھر اس میں ایک حکمت یہ بھی ہے کہ آج اگر نوح علیہ السلام کے زمانے کی بات شروع کی جائے تو حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے کی تو کوئی قوم موجود ہی نہیں ہے، اگرچہ ان کی ذرّیت، اولادوں کی اولادیں ہیں، لیکن وہ لوگ جو حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے میں تھے، وہ تو نہیں ہیں۔ اس لیے بہت ساری آیات میں اللہ تعالیٰ نے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ کو زیادہ ذکر فرمایا؛ کیونکہ مشرکین مکہ، یہود و نصاریٰ سب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو مانتے تھے۔ اس لئے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر تم مانتے ہو، سچے ہو تو سب سے پہلے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کلمہ پڑھو۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی ذرّیت ابراہیم پر اور ملت ابراہیم پر ہیں، توحید و عقائد سے لے کر بغلوں اور زیر ناف بالوں کی صفائی، ناخنوں کا کاٹنا، مونچھوں کا کاٹنا اور داڑھی بڑھانا وغیرہ، یہ سب حضرت ابراہیم علیہ السلام کے طریقے تھے اور یہ سب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت میں بھی موجود ہیں۔

ابوجہل کا کفر، فرعون کے کفر سے زیادہ سخت تھا:

جیسے ابراہیم علیہ السلام نے وقت کے نمرود سے ٹکر کھائی، اسی طرح میرے مدنی آقا ﷺ نے بھی وقت کے ابوجہل کو للکارا اور آپ ﷺ نے فرمایا کہ میرے زمانے کا فرعون ابوجہل، موسیٰ علیہ السلام کے فرعون سے بھی زیاد سخت ہے۔ فرمایا کہ موسیٰ علیہ السلام کا فرعون بڑا مضبوط تھا اور کئی صدیوں تک اس نے حکومت کی، لیکن جب پانی میں غوطہ لگا تو کہا کہ میں موسیٰ اور ہارون کے رب پر ایمان لایا۔ اس نے تو فوراً مان لیا۔ غوطہ کھانے کے بعد اس کا نشہ ٹوٹ گیا اور ساری اکڑ ختم ہوگئی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: بدبخت! اب مانتے ہو، پہلے نافرمانیاں کرتے اور فساد پھیلاتے رہے، میرے انبیاء کے مقابلے پر خدائی کے دعوے دار بن بیٹھے۔ اب جب مرنے لگے تو مجھے مان رہے ہو، تمہارے ایمان کا کوئی اعتبار ہے!؟؟

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ دیکھو! موسیٰ علیہ السلام کا فرعون تو ڈر گیا، لیکن میرا فرعون ابوجہل اتنا بدبخت ہے کہ مقام بدر میں گردن کٹی ہوئی ہے، ستر ستون کفر کے مارے گئے (یعنی بڑے بڑے سردار)، ساری عزت خاک میں مل گئی، بس ابوجہل کی چند رگیں بچی ہوئی ہیں، اس وقت بھی ایک صحابی نے ٹھوکر ماری تو کہنے لگا کہ کیا ہوگیا؟ کونسی بڑی بات ہے؟ تم نے مکہ تھوڑا فتح کرلیا کہ تم نخرے کررہے ہو۔ بس ایک لڑائی تھی اور ہم ہار گئے، بس بات ختم۔ اس دن فخر کرنا جب مکہ فتح کرلو۔

جب حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے ارادہ فرمایا۔ بس ان کو غصہ تھا کہ اس بدبخت نے ان کو مارا تھا۔ جب وہ قتل کرنے کے لئے آئے تو ابوجہل اس حالت میں بھی ان سے کہتا ہے کہ ٹھہرو! تم بکریاں چرانے والے لوگ ہو، تمہیں کیا پتہ کہ سردار کی گردن کیسے کٹتی ہے؟ تمہاری تلوار سے میری گردن نہیں کٹے گی، میری تلوار نکال کر گردن کاٹو۔ ابوجہل کی آخری سانسیں تھیں، لیکن اس وقت بھی اس کو خیال نہیں آیا کہ فرعون کی طرح ڈر کر کلمہ پڑھ لے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میرے مدنی پاک کی شکل بھی ابراہیم علیہ السلام سے ملتی ہے، اس لئے کفر سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم تو ہر چیز میں ابراہیم علیہ السلام کے مخالف ہو اور یہ تو نہیں ہوسکتا کہ اس وقت ابراہیم علیہ السلام اور اسماعیل علیہ السلام کعبہ بنارہے ہوں اور اس وقت کے لوگوں نے ان کی مدد نہ کی ہو۔ حالانکہ اس وقت قبیلہ عمالقہ اور جرہم بھی مکہ میں آباد ہو چکا تھا تو اس کے بعد جب قریش کے زمانے میں جو تعمیر ہوئی، اس تعمیر میں سرکار مدینہ ﷺ بھی شامل ہیں۔

حضور اکرم ﷺ کی تمنا کے مطابق عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے بھی اپنے زمانہ میں پھر سے تعمیر کرائی، یہ حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہ بی بی اسماء رضی اللہ عنہا کے بیٹے ہیں اور بی بی اسماء رضی اللہ عنہا اور بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا بہنیں ہیں۔ انہوں نے یہ حطیم والا حصہ بھی کعبہ میں شامل کر دیا اور جس دیوار میں میزاب رحمت ہے وہ دیوار آگے لے آئے، تا کہ یہ سات ہاتھ کا حصہ بھی اندر آ جائے۔ کعبۃ اللہ کے دروازے بھی دو رکھے: ایک دروازہ جہاں اب موجود ہے اور ایک دروازہ بالکل اس کے سامنے رکن یمانی کے نزدیک رکھا اور دروازے بھی دونوں نیچے زمین پر رکھے، تا کہ اس دروازے سے آدمی اندر داخل ہوں، اندر دو رکعت نماز پڑھیں اور دوسرے دروازے سے نکل جائیں۔ دراصل میرے آقا ﷺ کی تمنا تھی کہ کعبہ کے باہر کا حصہ بھی اندر آ جائے اور دروازے بھی نیچے رکھے جائیں اور اونچے نہ ہوں، تا کہ جس کو چاہیں آنے دیں اور جس کو چاہیں دھکا دے دیں۔ نیچے دروازے ہوں گے تو ہر آدمی آرام سے داخل ہو جائے گا، لیکن عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی تعمیر کے بعد حجاج کا دور آ گیا۔ چونکہ وہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کا قاتل ہے اور پھانسی چڑھانے والا ہے، حجاج بن یوسف کے دماغ میں یہ بات آ گئی کہ اگر یہ کعبہ اسی طرح عبداللہ بن زبیر کی بنا پر قائم رہ گیا تو ایک تو عبداللہ بن زبیر کا نام قیامت تک زندہ رہے گا، دوسرا یہ کہ لوگ اس کو یاد کریں گے اور میرا نام ونشان مٹ جائے گا۔

چونکہ حجاج بن یوسف اس اُمت کا ظالم مشہور تھا، اس نے حضرت عبداللہ بن زبیر کو جب سولی پر لٹکا دیا تو اس وقت بھی جواُن کی لاش کو دیکھتا تو کہتا کہ اے عبداللہ بن زبیر! اللہ تعالیٰ تجھ پر کروڑوں رحمتیں کرے اور تیرے قاتل پر لعنتیں کرے۔ چونکہ حجاج بن یوسف کے ظلم کے بارے میں وہ کھل کر تو نہیں کہہ سکتے تھے۔ اب عبداللہ بن زبیر کے بارے میں یہ بات پہنچی اور آپ کی والدہ بی بی اسماء رضی اللہ عنہا نے جو کمال دکھایا، جس کا عبداللہ بن زبیر جیسا بیٹا ہو اور اس کو حرم کے باہر سولی پر لٹکا دیا گیا ہو تو اندازہ کریں! ان کے صبر کا کیا عالم ہوگا!! بی بی صاحبہ وہاں آئیں، بیٹے کو دیکھا اور فرمایا کہ میرا سوار ابھی تک سواری پر سوار ہے، ابھی تک سواری سے نہیں اُترا۔ اس کے بعد دعائیں دے کر چلی گئیں۔

حجاج کو جب پتہ چلا کہ ماں کے صبر کا یہ عالم ہے اور جو گزرتا ہے مجھ پر لعنتیں بھیجتا ہے تو اس نے کہا کہ جلدی اُتار دو اور دفن کر آؤ۔ اس نے فوراً یہ فیصلہ کر دیا کہ کعبۃ اللہ جس طرح حضور پاک ﷺ کے زمانے میں تھا، اس کو اسی طرح لوٹا دیا جائے۔ پھر اسی طرح تعمیر کرا دیا، جیسا کہ قریش اور مدنی پاک ﷺ کے زمانے میں تھا، تا کہ عبداللہ

بن زبیر کی بناء باقی نہ رہے اور باقی تعمیر یا مرمت کا معاملہ ہے کہ اندر چھت مبارک بدلی گئی، وہ ہر دور میں بدلتے رہے۔ موجودہ حکومت نے بھی (اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے) جو تعمیرات ضروری تھیں، وہ بھی کرائیں، دروازے پر سونا بھی لگوایا۔ لہٰذا کعبۃ اللہ میں پہلی صفت تو یہ ہے کہ یہ سب سے پہلا قبلہ بنا اور دوسری یہ ہے کہ اسے لوگوں نے ٹھکانہ بنایا کہ بار بار لوٹ کر ادھر آئیں۔

ابراہیم علیہ السلام کے زمانے میں جب اس کی عمارت مکمل ہوئی تو کچھ عرصہ اس طرح رہا کہ دیواریں تھیں اور چھت مبارک نہ تھی۔ بیت اللہ کے اندر ایک چھوٹا سا کنواں بنا ہوا تھا، لوگ آتے تھے وہ سونا، چاندی یا پیسہ جو بھی دیتے تھے وہ اسی میں پھینک دیا جاتا تھا۔ اسی طرح سب سے پہلا غلاف کعبہ یمن کا بادشاہ گزرا تھا، اس نے دیا تھا اور اس کے بعد پھر ہر دور میں غلاف چڑھتا رہا۔ میرے مدنی سرکار ﷺ کے دور میں بھی قریش چڑھاتے تھے اور حضور پاک ﷺ نے بھی اس کو باقی رکھا۔ اگر منع ہوتا تو حضور اکرم ﷺ اُتار دیتے۔ حضور اکرم ﷺ کے سامنے جو بات کی جائے اور اللہ کے نبی اس کو نہ بدلیں تو وہ بھی اللہ کے حکم کے مطابق ہے؛ کیونکہ اگر کوئی چیز اللہ تعالیٰ کے حکم کے خلاف ہو تو اللہ کے نبی فوراً بدل دیتے ہیں، وہ باقی نہیں رکھتے۔

اور غلاف بھی مختلف ہوتے تھے، کبھی سبز، کبھی سفید، کبھی سرخ اور کبھی مختلف چادریں باندھ کر غلاف بنا دیتے تھے۔ مختلف رنگ برنگ اور بڑی بڑی چادریں رسیوں سے باندھ دیتے تھے۔ بعد میں اس کی مکمل طور پر تدوین خلافت عمر فاروق رضی اللہ عنہ میں شروع ہوئی اور باقاعدہ غلاف بنتا رہا۔ اب اللہ تعالیٰ نے اس کی یہ خدمت خادم حرمین سے لی۔ (اللہ تعالیٰ قبول و منظور فرمائے) اب غلاف تیار بھی یہیں ہوتا ہے اور کعبۃ اللہ پر بھی یہیں چڑھایا جاتا ہے۔

ایک صفت کہ ﴿وَأَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَأْتُوكَ رِجَالًا وَعَلَىٰ كُلِّ ضَامِرٍ يَأْتِينَ مِن كُلِّ فَجٍّ عَمِيقٍ ﴿٢٧﴾﴾ [الحج:٢٧] دیکھو کہ اللہ تعالیٰ نے مسجد اقصیٰ میں کوئی حج نہیں رکھا۔ حج تو اللہ تعالیٰ نے اسی کعبہ کا رکھا کہ جب تک تم اس گھر میں نہیں آؤ گے تو حج ہو ہی نہیں سکتا۔ فرمایا: ابراہیم! تم ندا کرو، پھر دیکھو تو سہی کہ دنیا میرے گھر کی طرف کیسے آتی ہے؟ اطراف عالم سے دنیا کھچی چلی آئے گی۔ پھر اس زمانے کا اندازہ کریں! جب لوگ مہینوں اور سالوں کے سفر کر کے کعبہ میں پہنچتے تھے۔ حقیقت میں حج بھی انہی لوگوں کا تھا۔ دراصل جو چیز محنت کے بعد ملتی ہے، اس کی قدر بھی زیادہ ہوتی ہے۔ ہمیں چونکہ محنت نہیں کرنی پڑتی، اس لئے اللہ تعالیٰ کے گھر کی قدر بھی نہیں رہی کہ تین چار گھنٹے میں ہم کعبہ پہنچ جاتے ہیں۔ اب تو لوگ کہتے ہیں کہ سفر میں جدہ وغیرہ کے ہمیں کئی کئی گھنٹے لگ جاتے ہیں، مشکلات اُٹھانا پڑتی

ہیں، لہٰذا مولوی اکٹھے ہوں اور حج کے مسائل تبدیل کریں۔ آپ ان لوگوں کا اندازہ کریں جو ایک ایک سال پیدل چل کر یا بحری جہازوں میں دو دو ماہ، چھ چھ ماہ لگا کر بھی بمشکل پہنچ پاتے تھے۔ اب اللہ تعالیٰ کے انعامات دیکھو کہ چھ دن میں بحری جہاز سے کنارے پر اُترتا ہے اور چار گھنٹے ہوائی جہاز میں لگتے ہیں۔ اب اگر تم نے ایک ہزار آدمیوں کو سنبھالنا ہو تو خود بڑے بن کر سنبھال لو تو آپ کو پتہ لگ جائے پھر اعتراض کرو۔

اب مختلف زبان اور مختلف قلم کے لکھے ہوئے نام ہوتے ہیں، پھر ماشاء اللہ! ہمارے نام بھی ایسے ہوتے ہیں کہ جنگل خان۔ ایک عربی کو یہ نام پڑھنا ہو تو اس کا دماغ اُڑ جاتا ہے۔ حالانکہ بڑا ایئرکنڈیشنڈ ویٹنگ روم اور بسیں ہیں اور احرام بغیر میلے ہوئے ہم کعبۃ اللہ میں آجاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے اس کعبۃ اللہ کی صفات رکھی ہیں کہ اسے قبلۃ للناس بنایا ہے۔ کعبہ بھی ایک مکان ہی ہے، لیکن جس کے دل میں ایمان ہوگا، وہ کعبہ کے ایک ایک پتھر کی قدر کرے گا۔

اسی لئے محدثین نے لکھا ہے کہ حضور اکرم ﷺ کے زمانے سے لے کر صحابہ، تابعین، تبع تابعین، ائمہ محدثین، فقہاء، ائمہ مجتہدین اور اولیاء اللہ نے جتنی کتابیں لکھی ہیں، سب میں یہی لکھا ہے کہ ملتزم پر ہم نے جو دعائیں مانگی ہیں، کبھی خالی نہیں گئیں۔ وجہ یہ تھی کہ جتنا ایمان قوی اور مضبوط ہوگا اتنا ہی اس کا اثر ہوگا۔ اسی لئے قرآن کہتا ہے:
﴿فَإِنَّهَا لَا تَعْمَى الْأَبْصَارُ وَلَٰكِن تَعْمَى الْقُلُوبُ الَّتِي فِي الصُّدُورِ ۝﴾ [الحج:۴۶] اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں، اصل اندھا پن تو دل کا ہے۔ جب دل اندھا ہو جائے تو پھر کیا نظر آئے گا؟ اسی لئے روایات میں آیا ہے کہ آدمی کی جب پہلی نظر کعبۃ اللہ پر پڑتی ہے تو جو دعا کرے، وہ منظور ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلے جو تڑپ ہوتی ہے وہ بعد میں نہیں رہتی۔

میں اگلے دن پڑھ رہا تھا کہ ایک دوست نے لکھا۔ مجھے اتفاق سے ایک مرتبہ افغانستان میں دورانِ جنگ ایک پہاڑ کے دامن میں نماز کا وقت آیا تو میں نے ایک افغان مجاہد کے پیچھے نماز پڑھی۔ اللہ کی قسم! اس نماز کا مزہ مجھے آج تک پھر کبھی نہیں ملا۔ ایک تو قالینوں پر نماز پڑھنا ہے اور ایک پتھروں پر نماز پڑھنا اور اوپر گولیوں کی بمباری کا ڈر۔

علماء نے فرمایا ہے کہ جیسے اللہ تعالیٰ نے مقناطیس بنایا ہے کہ جو لوہے کو کھینچتا ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے کعبہ کو دلوں کا مقناطیس بنایا ہے کہ ایمان والوں کا دل کعبے سے بھرتا ہی نہیں اور اس کی ایک صفت یہ بھی فرمائی کہ اس کو امن والا گھر بنا دیا۔ واللہ اعلم۔

﴿وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَیْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ﴾... ''مَثَابَۃ'' کا ایک ترجمہ ہے: اجتماع کی جگہ۔ مطلب یہ کہ اللہ تعالیٰ نے کعبۃ اللہ کو تمام لوگوں کے لیے ایک اجتماع کی جگہ بنایا۔ اور بعض علماء فرماتے ہیں کہ ''مثابة''، ''ثوب'' سے ہے اور ''ثوب'' کا معنی ہے: کسی چیز کی طرف بار بار لوٹ کر آنا۔ اور ''ثوب'' اور ''ثواب'' کا مادہ بھی ایک ہے، یعنی بار بار لوٹ کر آنا اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول مبارک بھی یہی ہے کہ لوگ بار بار اپنے مقصد براری کے لئے آتے ہیں۔ ایسا نہیں ہوتا کہ بس ایک مرتبہ کعبہ کو دیکھ لیا اب اس کا دیکھنے کو دل نہ کرے، بلکہ اس کے برعکس ایسا ہوتا ہے کہ جن کو ایک مرتبہ اللہ نے کعبۃ اللہ نصیب کر دیا، ان کا دل تو بھرتا ہی نہیں۔

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے اس کو اجتماع کی اور امن کی جگہ بھی بنایا۔ امن کی جگہ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے گھر میں آدمی اپنے دشمن پر بھی حملہ نہیں کرتا، حتیٰ کہ زمانہ جاہلیت کے اندر بھی حرم کے باہر تو لوگ ایک دوسرے کو قتل کرتے، ڈاکہ بھی مارتے تھے، لیکن حرم میں جو داخل ہو جاتا وہ امن میں آجاتا، حتیٰ کہ حرم میں آکر ہتھیار بھی پھینک دیتے تھے؛ کیونکہ حرم، امن کی جگہ ہے۔

اسی طرح مفسرین کرام نے بہت ساری روایات نقل کی ہیں کہ بعض لوگ اپنے والد کے قاتل کو بھی حرم میں دیکھتے تو کچھ نہیں کہتے تھے۔

اسی طرح بعض مفسرین کرام نے فرمایا کہ ایک ظاہری امن ہے کہ آدمی دشمن سے محفوظ ہو گیا اور ایک آدمی جو صحیح معنی میں اللہ کے حرم میں صحیح عقیدہ کے ساتھ آتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے گھر میں آکر اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتا ہے تو گویا اللہ تعالیٰ اس کو جہنم کی آگ سے بھی امن میں لے آتے ہیں۔ اس لئے علماء نے فرمایا کہ کعبہ میں باطنی امن بھی نصیب ہوتا ہے، ظاہری اور باطنی امن دونوں اللہ کے کعبے میں نصیب ہوتے ہیں۔

اور حجاج بن یوسف نے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو اس میں شہید کیا، اسی طرح اور بھی کئی حادثات مکہ مکرمہ میں ہوئے، تو ان حادثات اور اتفاقیہ واقعات کا اس مسئلہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا، اعتبار اغلب اور اکثری احوال کا ہوتا ہے اور اللہ کے کعبہ میں امن کا معاملہ ہی اغلب الاحوال ہے کہ پھر جس نے اس امن کو توڑنے کی کوشش کی تو یہ اس کی اپنی بدنصیبی ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمادیا کہ لوگو! سن لو اور سمجھ لو کہ اللہ کا حرم امن کی جگہ ہے، اس کے اندر قتال حرام ہے اور اللہ تعالیٰ نے فتح مکہ کے موقع پر چند گھنٹوں کے لئے مجھے رخصت عطا فرمائی اور اس کے بعد پھر اس کی حرمت کو ہمیشہ

کے لئے قائم ودائم فرمادیا۔اور اگر انصاف کی نظر سے دیکھا جائے تو اس میں بھی اللہ کی قدرت ہے کہ اللہ نے اپنے نبی ﷺ کو رخصت عطا فرمائی، لیکن کچھ ایسا قتال نہیں ہوا، اللہ تعالیٰ نے مکہ حضور اکرم ﷺ اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے رعب اور غلبہ سے عطا فرمایا۔

﴿وَإِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ﴾ میں ''بیت'' سے مراد ''کعبہ'' ہے؛ کیونکہ ''الف لام'' یہاں عہد ذہنی کے لئے ہے، جیسے ''البیت'' سے مراد اللہ تعالیٰ کا گھر ہے تو مقصد صرف کعبہ شریف کی عمارت نہیں، بلکہ اس سے مراد سارا حرم ہے؛ کیونکہ دوسری آیت میں فرمایا ہے: ﴿حَرَمًا آمِنًا﴾ [العنکبوت:٦٧] کہ ان کے لئے ہم نے حرم کو امن والا بنایا کہ وہاں اللہ تعالیٰ نے پورے حرم کو امن والا قرار دیا۔جیسے حکم ہے کہ اگر کوئی حج پر آتا ہے اور اس کے ذمہ تمتع یا قران کی ہدی یا کوئی اور ہدی ہے تو وہ کہاں ذبح ہوگی؟ فرمایا: ﴿هَدْيًا بَالِغَ الْكَعْبَةِ﴾ [المائدۃ:٩٥] کہ ہدی کا جانور کعبہ میں پہنچایا جائے۔اب یہ معنی تو نہیں ہوتا کہ کعبہ کے اندر جا کر جانور ذبح کیا جائے۔

امن والے سے کیا مراد ہے؟ بعض علماء نے فرمایا کہ اللہ، یہاں کے رہنے والوں کو بھوک اور قحط سے امان میں رکھیں گے، جیسے فرمایا کہ ہم تمام دنیا کی مصنوعات اور پھل کھینچ کھینچ کر اس گھر میں پہنچادیں گے۔اللہ تعالیٰ تمہیں اس گھر کی عزت کرنے کے بدلے میں دو چیزیں عطا فرمائیں گے: ایک تو اللہ تعالیٰ تمہاری بھوک مٹادیں گے، یعنی قحط نہیں ہوگا اور دوسری بات اللہ تعالیٰ تمہیں خوف سے امن والا بنادیں گے کہ ساری دنیا میں خوف ہوگا، لیکن حرم کو اللہ تعالیٰ نے امن والا بنایا۔

حرم کی خصوصیت کہ وہاں کوئی بھوکا نہیں رہتا:

علماء کرام نے لکھا ہے کہ کوئی چاہے دنیا میں کہیں بھی ہو، ایسے حالات بھی دیکھے گا کہ اپنے گھر میں آئے تو رات کو بھوکا سوجاتا ہے، لیکن علماء نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے گھر کی ایک خصوصیت رکھی ہے کہ باہر سے آنے والا کسی وقت بھی حرم میں آجائے تو اللہ اس کو بھوکا نہیں رکھتے، کوئی نہ کوئی نعمت اسے مل ہی جاتی ہے۔اگر کوئی اور نعمت نہ بھی ہے تو زمزم سے بڑی نعمت کیا ہوسکتی ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ زمزم ایک ایسی نعمت ہے جو کھانے کا فائدہ بھی پہنچاتی ہے اور بیماریوں سے شفاء کا فائدہ بھی پہنچاتی ہے۔اسی طرح آپ مشاہدہ کرکے دیکھیں کہ حرم کا ایک مزدور بھی دنیا کے دوسرے ممالک کے بڑے بڑے صنعتکار، تاجر اور زمیندار سے زیادہ آرام سے رہتا ہے، حالانکہ قرآن مقدس

کو نازل ہوئے چودہ سو سال گزر گئے، لیکن ابھی تک حرم میں ایک مزدور اور غریب کو امن وسکون ملتا ہے۔

سارا حرم امن کی جگہ ہے:

بعض علماء نے فرمایا: امن کا معنی یہ ہے کہ یہاں جنگ وقتال حتیٰ کہ جانور کا مارنا بھی منع فرما دیا گیا، تاکہ اللہ کے حرم کے اندر ایک امن کی فضاء قائم رہے۔ بعض ائمہ جن میں امام شافعی رحمہ اللہ کا قول بھی ہے کہ اگر کوئی مجرم جرم کے بعد حرم میں آجائے تو فرماتے ہیں: اس کو تنگ کر دیا جائے کہ مجبور ہو کر باہر نکلے اور پکڑا جائے اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ بھی یہی فرماتے ہیں کہ اسے حد حرم کے باہر سزا دی جائے؛ کیونکہ ظاہر آیات میں اللہ نے اس کو امن والا فرما دیا ہے۔

حرم میں قتال حرام ہے:

دنیا میں حادثات اور لڑائیاں ہوتی رہتی ہیں، حتیٰ کہ اللہ نے خود بھی قتال کا حکم دیا ہے: ﴿وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ وَاَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ حَيْثُ اَخْرَجُوْكُمْ وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ ۚ وَلَا تُقٰتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى يُقٰتِلُوْكُمْ فِيْهِ ۚ فَاِنْ قٰتَلُوْكُمْ فَاقْتُلُوْهُمْ ۗ كَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ﴾ [البقرة:۱۹۱] اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ مسجد حرام میں کسی کے ساتھ قتال نہ کرو، لیکن اگر وہ تم سے قتال کریں تو پھر تمہیں بھی قتال کرنا جائز ہے۔ اگر کوئی حرم میں آکر فساد کرے گا تو اس کے ساتھ قتال کیا جائے گا؛ کیونکہ اس کو اللہ کے حرم سے نکالنا تو ہے۔ اور حضور پاک ﷺ نے بھی ارشاد فرمایا: لوگو! سن لو! اللہ کا حرم، حرم ہے اور قیامت تک حرم رہے گا، اللہ نے فتح مکہ کے موقع پر مجھے چند گھنٹوں کے لئے حرم میں جنگ کرنے کی اجازت دی تھی، اس کے بعد پھر اس کو حرام کر دیا اور اس کی حرمت قیامت تک رہے گی۔ اسی لیے کہا ہے کہ جو اللہ تعالیٰ کے گھر کی حرمت کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کی حرمت کریں گے اور جو اللہ تعالیٰ کے گھر کی حرمت کو توڑ دے گا تو اللہ تعالیٰ اس کی حرمت کو ختم کر دیں گے۔

اور اسی طرح بعض کتب سابقہ کی روایات میں بھی آتا ہے کہ جب آدم علیہ السلام زمین میں اُتارے گئے تو آدم علیہ السلام پوری زمین پر صرف اکیلے تھے؛ کیونکہ بیوی حوا تو دوسرے مقام پر اُتاری گئیں۔ حضرت آدم علیہ السلام بڑے پریشان تھے، کوئی بات کرنے والا، انس والا نہیں تھا تو اللہ سے درخواست کی تو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا: آدم! میرے گھر کے اندر آؤ۔ میں نے دنیا میں اپنا ایک ایسا گھر رکھا ہے جس کو میں نے نسبت دی ہے کہ وہ میرا گھر ہے اور اس گھر کے اندر میں ایسے لوگ پیدا کروں گا جو قیامت تک میرے ذکر کو بلند کریں گے۔ میں تیری اولاد میں ایسے انبیاء پیدا

کروں گا جو میرے ذکر کو بلند اور کعبے کی عمارت کو بلند کریں گے اور تیری اولاد میں جو اس کو آباد کرنے والا ہوگا، وہ خاتم الانبیاء ہوں گے۔

آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ پانچ میقات ہیں، میری اُمت یاد رکھ لے: یلملم، جحفہ، ذوالحلیفہ، قرن المنازل اور ذات عرق۔ آپ ﷺ نے فرمایا: جب تم ان حدوں پر آجاؤ یا ان کے حدوں کے برابر جگہوں پر آجاؤ تو بغیر احرام باندھے ہوئے اللہ کے گھر میں داخل نہ ہو، ان کی حد سے آگے نہ بڑھو۔ وہاں سے آپ غسل کریں اور اپنے لباسِ فخر کو اُتار ڈالیں اور اب آپ کفن والی دو چادریں باندھ لیں اور دو رکعت سنت الاحرام پڑھیں اور اس کے بعد لبیک پڑھتے ہوئے اپنے آپ کو تیار کریں کہ اب آپ اللہ تعالیٰ کے کعبے میں داخل ہونے والے ہیں، اس گھر کے لئے یہ آداب مقرر کئے گئے ہیں۔

اسی طرح یہ بھی احادیث میں ثابت ہے کہ ایک صحابی نے حضور پاک ﷺ سے پوچھا: یارسول اللہ! سب سے اوّل گھر کونسا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: کعبۃ المشرفی۔ پوچھا: اس کے بعد کونسا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: المسجد الاقصیٰ۔ حتیٰ کہ ایک حدیث مبارک میں ہے کہ صحابی نے پوچھا: ان کے درمیان کتنی مدت ہے؟ یعنی کعبے کے کتنے عرصہ بعد مسجد اقصیٰ بنی؟ چالیس سال بعد مسجد اقصیٰ کا وجود ہوا۔ لیکن یاد رکھیں! یہ چالیس سال سے مراد مسجد اقصیٰ کی تعمیر نہیں، بلکہ مرمت ہے۔ ورنہ اصل بنائے کعبہ جو ہے وہ تو اللہ تعالیٰ نے ابھی زمین نہیں بنائی تھی، پانی ہی پانی تھا تو وہاں بھی اللہ تعالیٰ کے کعبے کا مقام موجود تھا۔

بعض علماء نے کہا ہے کہ مقامِ ابراہیم حطیم ہے کہ جہاں ابراہیم علیہ السلام نوافل پڑھا کرتے تھے اور بعض نے کہا کہ تعمیر کعبہ کے وقت جس پتھر پر ابراہیم علیہ السلام کھڑے ہوئے تھے اور وہ پتھر حسب ضرورت اونچا بھی ہوتا تھا اور نیچے بھی ہوتا تھا اور اسی پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاؤں بھی آگئے۔ یہی علماء کا راجح قول ہے اور اس کی تائید حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے گزشتہ واقعہ سے ہوتی ہے اور ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے اس جگہ کی تائید کے لئے متعدد روایات نقل کی ہیں۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانے میں جب اللہ تعالیٰ نے اسلام کو فتوحات عطا فرمیں، بیت المال دولت سے بھر گئے تو صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ حضرت! اب تو مہربانی فرما کر مسجد نبوی کی تعمیر کروا دیں، پکی مسجد اور چھت بن جائے تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں اس مقام کو بدلنے کی جرأت نہیں کرسکتا جس کو حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے بنایا ہے۔ حالانکہ مسجد کی تعمیر کرنا کوئی گناہ نہیں تھا، لیکن انہوں نے یہ کام نہ کیا۔

مفسر رحمہ اللہ بیان فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے ان آیت مبارکہ میں اس گھر کا شرف بیان فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس گھر کو ایسا بنایا کہ ارواح کا تعلق اس کے ساتھ ہے۔ مومنین کے دلوں کا تعلق اسی کے ساتھ ہے، جیسے جانور، شفقت اور محبت سے اپنے گھر کی طرف دوڑتا ہے تو اللہ تعالیٰ نے اس کی محبت بھی ایسے ہی ڈال دی ہے کہ لوگ دور دور سے اس کی طرف آتے اور میلان کرتے ہیں۔

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ بیان فرماتے ہیں کہ حرم کو اللہ تعالیٰ نے امن والا بنایا۔ اس لئے اگر حدود اللہ کا اجراء کسی پر کرنا ہے، ہاتھ کاٹنا یا قصاص وغیرہ تو اس کو حدودِ حرم سے باہر کیا جائے۔ لیکن باقی ائمہ فرماتے ہیں کہ اگر کسی نے حرم کے اندر قتل کیا ہے تو اس کو سزا دینا بھی جائز ہے۔ وہ حضرات دلیل دیتے ہیں کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے سب سے پہلے حرم میں مکان خریدا اور قید خانہ بنایا، تاکہ جو لوگ زیادتی کریں، ان کو سزا دی جاسکے۔ لیکن امام صاحب رحمہ اللہ کی فقہ کا ایک خاص انداز ہے کہ وہ سب سے پہلے اللہ کے قرآن پر نظر ڈالتے ہیں، اگر قرآن مقدس میں کوئی بات نہ ملے تو پھر سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اس کے بعد اگر کوئی چیز نہ ہو تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، اگر ان سے نہ ملے تو پھر اجتہاد کا مرتبہ آتا ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: خدا نہ کرے، اگر لوگ اللہ کے کعبہ کا حج چھوڑ دیں تو اللہ تعالیٰ آسمانوں کو زمین پر گرا دیں گے، یعنی قیامت قائم ہو جائے گی۔

مقامِ ابراہیم کون سی جگہ ہے؟

اسی آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے شرف کو مزید بلند فرما دیا اور حکم دیا کہ تم بھی اس جگہ جا کر نماز پڑھو، عبادت کرو، جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام کھڑے ہوتے تھے۔ اس پتھر کو ''مقامِ ابراہیم'' کہا جاتا ہے۔ صحیح روایات میں آتا ہے کہ اسی پتھر پر کھڑے ہو کر ابراہیم علیہ السلام نے کعبہ کی تعمیر کی تھی اور ابراہیم علیہ السلام کے پاؤں کے نشانات بھی اسی پتھر پر موجود ہیں، اب وہ کم ہو گئے ہیں۔

اور صحیح روایات میں ہے کہ مقام ابراہیم کا پتھر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانے میں کعبہ کی دیوار کے ساتھ تھا۔ دروازہ مبارک کے ساتھ مقامِ ابراہیم تھا، پھر سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانے میں بہت بڑا سیلاب اور بارشیں آئیں۔ پھر یہاں کی بارشوں میں تو پہاڑوں سے پانی گرتے ہیں تو وہاں سے بارش نے اس پتھر

کو ہٹا دیا تو وہ کعبۃ اللہ سے دور ہوگیا۔ اور اب جس جگہ ہے، اس جگہ جا پہنچا تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جہاں وہ پانی کی وجہ سے چلا گیا، اب وہیں رہنے دو اور اسی جگہ اس کے گرد پتھروں کی ایک دیوار بھی بنا دی، تا کہ اگر دوبارہ کوئی سیلاب آئے تو اس پر زیادہ اثر نہ ہو سکے۔

مفسر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب کعبۃ اللہ کی دیوار اونچی کی گئی تو آپ کا اب پتھر لگانا مشکل ہوا تو آپ اسی پتھر پر کھڑے ہوتے اور حضرت اسماعیل علیہ السلام پتھر اُٹھا کر دیتے اور آپ اسی طرح رکھتے آئے۔ جب ایک جانب کی دیوار مکمل ہوگئی تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس پتھر کو دوسری جانب منتقل کیا۔ پھر جب وہ دیوار مکمل ہوگئی تو پھر تیسری جانب مکمل کیا، جب وہ دیوار کمل ہوگئی تو پھر چوتھی جانب مکمل کیا، حتیٰ کہ کعبۃ اللہ کی دیواریں پوری ہوگئیں اور یہی واقعہ مفسر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ آپ ان شاء اللہ! مفصل پڑھیں گے، جب ہم حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کی بناء کا ذکر کریں گے۔ اب مفسر رحمۃ اللہ علیہ کے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ مقامِ ابراہیم میں جو اقوال آئے تھے کہ مقامِ ابراہیم سے مراد حطیم یا حرم یا پورے مشاعر ہیں، یعنی جتنی روایات آئی ہیں، تمام روایات نے یہ بات ثابت ہوگئی کہ مقامِ ابراہیم اسی پتھر کا نام ہے جس پر آپ علیہ السلام نے بنائے کعبہ کی تھی۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے مقامِ ابراہیم کو دیکھا، وہاں ابراہیم علیہ السلام کی انگلیوں کے آثار بھی تھے۔ آپ کے پاؤں کے نیچے یہ درمیانی جگہ ہے، اس کا نشان بھی موجود تھا، ساری انگلیوں کے نشان بھی جو زیادہ واضح نشان تھے اور لوگوں کے ہاتھ لگانے سے ختم ہوگئے۔

حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مقامِ ابراہیم کے پیچھے کھڑے ہو کر نماز پڑھنے کا حکم دیا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ حکم نہیں دیا کہ تم مقامِ ابراہیم کے پتھر کو ہاتھ لگاؤ، اس کو مس کر دیا چومو یا اس کو بوسہ دو۔

مقامِ ابراہیم کا مصداق:

مفسر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مقامِ ابراہیم کے بارے میں مفسرین کا اختلاف ہے۔ بعض فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے پورے حرم کو مقامِ ابراہیم فرمایا ہے۔ میں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے سنا کہ مقامِ ابراہیم تو یہی ہے جو اس مسجد کے اندر ہے، لیکن مقامِ ابراہیم کا اطلاق اور بھی بہت ساری چیزوں پر ہوتا ہے، حتیٰ کہ تمام مناسک پر مقامِ ابراہیم کا اطلاق ہوجاتا ہے۔ اس کے بعد فرماتے ہیں کہ عرفات کے اندر دو نمازوں کا پڑھنا، مزدلفہ، منیٰ، طواف

اور صفا و مروہ کے درمیان میں دوڑنا، سب مقامِ ابراہیم کہلاتا ہے۔ میں نے یہ پوچھا کہ کیا یہ تفسیر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کی تھی؟ انہوں نے کہا کہ نہیں، انہوں نے تو بیان نہیں کی، لیکن حضرت نے جب یہ فرمایا کہ حج سارا کا سارا مقامِ ابراہیم ہے تو حج کے اندر پھر تمام مناسک ہیں۔ فرمایا: یہ میں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے سنا ہے کہ ان تمام چیزوں پر حج کا اطلاق ہوتا ہے۔

سدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مقامِ ابراہیم سے مراد وہ پتھر ہے کہ اسماعیل علیہ السلام کی بیوی اور ابراہیم علیہ السلام کی بہو نے آپ کے لئے یہ پتھر رکھا کہ آپ اس پر بیٹھ جائیں اور آپ کا سر مبارک دھو لے؛ کیونکہ وہ سفر سے تشریف لائے تھے۔

قرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: یہ قول بھی ضعیف ہے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا حج مبارک بیان فرماتے ہیں، اس کے بعد آتا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے طواف فرمالیا تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! یہ پتھر وہی جگہ ہے جہاں ہمارے ابا ابراہیم علیہ السلام کھڑے ہوئے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں! یہ وہی پتھر ہے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: کیا ہم اس کو نماز پڑھنے کی جگہ نہ بنائیں؟ یعنی ہم یہاں نماز پڑھیں۔

اب مفسر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بعض سند میں یوں بھی آتا ہے کہ جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے، آپ نے جب عمرہ کا پہلا طواف فرمایا تو پہلے تین چکروں میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے رمل فرمایا۔ رمل کا معنی ہوتا ہے کہ جیسے پہلوان اکھاڑے میں اپنی قوت کا مظاہر کرتے ہیں تو اکڑ کر چلتے ہیں اور چار چکروں میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے چل کر چکر مکمل فرمائے۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سات چکر مکمل کر لیے تو مقام ابراہیم کی طرف تشریف لائے۔ آپ کے لیے وہاں دو رکعت نماز ادا کی اور یہ آیت پڑھی۔

اب مفسر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے۔ آپ نے حجر اسود کو استلام فرما کر تین چکروں میں رمل کیا اور چار چکر چل کر مکمل کئے اور اس کے بعد آپ مقام ابراہیم پر تشریف لے گئے اور دو رکعت نماز کے بعد یہ آیت پڑھی۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز اس طرح پڑھی کہ کعبہ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان مقامِ ابراہیم تھا اور یہ طویل حدیث میں سے ایک حصہ ہے، جسے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے نقل فرمایا ہے۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس سند میں یہ ذکر بھی فرمایا کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

تشریف لے آئے اور آنے کے بعد آپ ﷺ نے سات چکر پورے فرمائے اور بعد میں مقامِ ابراہیم کے پیچھے آ کر دو رکعات نماز پڑھی۔

اب مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ایک تو ساری احادیث مبارکہ سے یہ بات ثابت ہوئی کہ مقامِ ابراہیم سے وہ پتھر مراد ہے جس پر کھڑے ہو کر ابراہیم ﷺ نے کعبہ بنایا اور اس پر ابراہیم علیہ السلام کے پاؤں کے نشانات بھی بڑے ظاہر تھے۔ حتیٰ کہ زمانہ جاہلیت میں بھی لوگ جانتے تھے کہ یہ ابراہیم علیہ السلام کے پاؤں ہیں۔ اسی لئے ابوطالب نے جو قصیدہ لکھا تھا، اس میں اس نے کہا کہ وہ جگہ جہاں ابراہیم علیہ السلام کے قدم رکھے ہوئے ہیں، آج تک باقی ہیں۔ اور ابراہیم علیہ السلام نے اس پتھر پر جو قدم رکھے ہیں، وہ بغیر جوتے کے ہیں۔ اس لئے وہ نشان بھی ننگے پاؤں کے ہیں۔

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ تمام اسناد اور تمام روایات مبارکہ دلالت کرتی ہیں کہ مقامِ ابراہیم سے مراد وہی پتھر ہے جس پر بنائے کعبہ کے لئے ابراہیم علیہ السلام کھڑے ہوئے۔

شبہ اور اس کا ازالہ:

ہمارے بعض لوگ مسلمانوں کے عقیدوں کو خراب کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ ایک پتھر پر اللہ تعالیٰ کے نبی کھڑے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے اس کو بھی سجدہ گاہ بنا دیا تو نبی کی قبر پر ہم سجدہ کیوں نہ کریں؟ لوگوں کو اللہ پاک ہدایت دے۔ یہ تو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ مقامِ ابراہیم کو مصلیٰ بناؤ۔ اگر اللہ کسی نبی کی قبر کا حکم دیا تو ہم بھی مان لیتے، اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا:

"لَعْنَةُ اللهِ عَلَى الْيَهُودِ وَ النَّصَارَى، اتَّخَذُوا قُبُورَ أَنْبِيَائِهِمْ مَسَاجِدَ." [صحیح بخاری، رقم: ۴۳۵]

"اللہ تعالیٰ یہود و نصاریٰ پر لعنت کرے کہ جنہوں نے انبیاء کی قبروں کو سجدہ گاہ بنالیا۔"

وہاں تو حضور اکرم ﷺ نے لعنت فرمائی اور فرمایا کہ یا اللہ! میری قبر کو سجدہ گاہ نہ بنا دینا کہ لوگ وہاں چومتے رہیں اور رکوع، سجود کرتے رہیں۔ اے اللہ! میری قبر کو محفوظ رکھنا۔ اللہ نے حضور اکرم ﷺ کی دعا قبول فرما کر آپ ﷺ کی قبر کو ایسا محفوظ فرما دیا کہ شرک کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

دوسرا شبہ یہ کرتے ہیں کہ اصحاب کہف اللہ کے ولی تھے، ان کی قبروں پر مسجد بنائی گئی تو ہم بھی تو ولیوں کی قبروں پر مسجد بنواتے ہیں۔

جواب: سب سے پہلے تو یہ دیکھیں کہ اصحابِ کہف کا غار جہاں ان کی وفات ہوئی، وہاں مسجد بنانے والے کیا انبیاء تھے یا اس مسجد کے بنانے کا حکم اللہ تعالیٰ نے دیا تھا؟ پھر اس مسجد کی عبادت کا کوئی حکم ہوتا تو اللہ تعالیٰ منع فرماتے کہ وہاں دیکھنے کی ضرورت کیا ہے۔ آپ دیکھیں! حضور اکرم ﷺ اور خلفاء راشدین کا زمانہ بھی گزر گیا اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور میں صحابہ کا لشکر وہاں سے گزرا تو کچھ صحابہ نے کہا کہ ہم اس جگہ سے گزر رہے ہیں، وہ غار ہے جس میں اصحابِ کہف دفن ہیں، چلو وہ جگہ تو ہم دیکھیں تو اس وقت بھی صحابہ نے منع کیا کہ مت جاؤ، دیکھنے کا حکم نہیں ہے؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں خود فرما دیا ہے کہ دیکھو گے تو تم ڈر جاؤ گے، ہم نے وہاں ایسی ہیبت طاری کر دی۔ صحابہ نے منع کیا، لیکن کچھ صحابہ وہاں دیکھنے کے لیے چلے گئے۔ خدا کی شان ہے! وہ کہتے ہیں کہ ابھی ہم پہاڑ کے نزدیک نہیں پہنچے تھے کہ شدید آندھی کا طوفان آیا، ہم خود گم ہو گئے اور بڑی مشکل سے ہم واپس قافلے میں پہنچے۔ واپس آئے تو صحابہ نے پوچھا: کیا ہوا؟ ہم نے کہا: آندھی آگئی۔ تو انہوں نے کہا کہ ہم نے تو کہا تھا کہ مت جاؤ۔ اب اس کے لیے یہ دلیل جائز نہیں کہ اصحابِ کہف اولیاء اللہ تھے، لہٰذا اولیاء اللہ کے مزار پر مسجد بنانا جائز ہے۔

اب اس گھر کے طواف کا حکم اللہ تعالیٰ نے دیا اور اگر اللہ تعالیٰ کا حکم نہ ہوتا تو کبھی کوئی نبی طواف نہ کرتے۔ اب کعبہ کو کوئی دیکھ کر یہ کہے کہ کعبہ تو اندر سے خالی ہے، اس کے اندر تو خدا نہیں بیٹھا۔ یہ کعبہ تو اس لئے ہے کہ یہ میرے اللہ کا گھر ہے، اس کا طواف ہو سکتا ہے تو محمد مصطفیٰ ﷺ تو روضۂ اقدس کے اندر موجود ہیں، اس کا طواف کیوں نہ کریں؟ ایسا کہنا اور کرنا جاہلیت ہے۔

باطنیہ فرقے کا نظریہ:

عقل لڑانا تو ایسا ہے جیسے فرقہ باطنیہ تھا اور اس کا بہت بڑا سربراہ تھا۔ فرقہ باطنیہ بھی شیعہ کا ایک فرقہ ہے۔ انہوں نے سب سے پہلے اپنے مریدین کو ایک فتویٰ جاری کیا۔ اگر عقل سے سوچنا ہے تو عقل کے مطابق اس کی بات بھی ٹھیک معلوم ہوتی ہے کہ ہمارے گھر میں دو لڑکے اور دو لڑکیاں ہیں تو ہم ان دو بہنوں کے لئے غیروں کا رشتہ ڈھونڈتے ہیں، اپنے دو لڑکوں کے لئے ہم لوگوں کی لڑکیاں ڈھونڈتے ہیں جن کا ہمیں پتہ ہوتا اور ہماری لڑکیوں کو بھی ان لڑکوں کا پتہ نہیں ہوتا۔ حالانکہ یہ گھر میں پلے اور ایک ماں کے پیٹ سے نکلے ہیں، پھر جتنے یہ ایک دوسرے کے ہمدرد ہو سکتے ہیں، باہر کے لوگ اتنے ہمدرد نہیں ہو سکتے۔ لہٰذا آج کے بعد بہن، بھائیوں کی آپس میں

شادیاں کر دیا کرو۔ اس نے کہا: سب سے زیادہ بہن کا حق دار اس کا بھائی ہے، ایک گھر میں پیدا ہوئے، پھر بہن اس کا کھانا پکاتی، کپڑے دھوتی ہے، باقی اگر ایک جنسی فائدہ اپنے بھائی کو پہنچا دے گی تو کیا فرق پڑے گا؟ اور پھر معاملہ گھر کا گھر میں رہے گا۔ رشتے ڈھونڈنے اور دولت بھی خرچ نہیں کرنا پڑے گی۔ تو اب عقل تو یہی کہتی ہے کہ ٹھیک ہے۔ حالانکہ دین کہتا ہے کہ جہاں ہماری عقل کی حدیں ختم ہوتی ہیں وہاں سے اللہ کی وحی اور دین شروع ہوتا ہے۔ جب اللہ نے خود قرآن میں ماں، بہن اور بیٹی سے نکاح حرام کر دیا تو اس کے اندر لازماً کوئی حکمت ہے۔ اب جدید سائنس بھی یہی کہتی ہے کہ زیادہ آپس میں رشتے نہ کیا کرو؛ کیونکہ بعض بیماریاں موروثی ہوتی ہیں کہ آدمی ان سے بچ نہیں سکتا۔

دوسری بات یہ کہ اللہ تعالیٰ نے جو ماں کو عزت دی ہے، اگر ماں، بیوی بن جائے تو پھر عزت کہاں جائے گی؟ اسی طرح بہن کے ساتھ احترام وانساب ختم ہو کر رہ جائے گا، آنے والے چند سالوں کے بعد پھر تو کوئی نسل ہی نہیں ہوگی؛ کیونکہ جتنا عقل کا اندھا ہو وہ پتھر کو نفع ونقصان کا مالک نہیں سمجھ سکتا۔ لیکن اگر کوئی ولی کی قبر ہوگی تو لازماً نفع ونقصان کی طرف ذہن جائے گا، پھر شرک آئے گا۔ اور جہاں بھی شرک کا شائبہ آئے گا وہاں اللہ تعالیٰ منع فرمادیں گے۔ مقامِ ابراہیم کے پیچھے تو رکوع کرتے ہو، لیکن اگر میت سامنے ہو تو رکوع کرنا منع ہے۔ پھر بعض کہتے ہیں کہ دین عقل کے خلاف تو نہیں ہو سکتا تو پھر عقل کس کی ہو؟ مکہ والوں کی یا مدینہ والوں کی؟ عرب والوں کی یا عجم والوں کی؟ کس کی عقل کو ہم پہلے معیار بنائیں؟ یہ فیصلہ پہلے کریں۔ پھر عقل میں تو جنون بھی آجاتا ہے جس سے عقل ختم ہو جاتی ہے۔

خلفائے راشدین کی اتباع کا حکم:

ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہ بھی روایات میں ہے کہ یہ پتھر کعبۃ اللہ کی دیوار کے ساتھ تھا، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے کعبہ کی دیوار سے ہٹا کر دور کیا اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ ان لوگوں میں سے ہیں جن کے بارے میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ ان کی اتباع کرو۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے میری اُمت! میرے بعد ابو بکر اور عمر فاروق کی پیروی کرنا، ان کے نقش قدم پر چلنا۔ اس لیے کسی نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے پتھر کو ہٹانے پر انکار نہیں کیا۔

ایک روایت یہ بھی ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانے میں لوگ بڑھ گئے تھے اور مقام ابراہیم کی وجہ سے



ان کو طواف میں تکلیف ہوئی تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اس کی اصل جگہ سے جہاں اب ہے، اس جگہ پر رکھ دیا۔

آج کل خود کو اہلسنت والجماعت کہلانے کے باوجود بعض لوگ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے فرمان کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ حالانکہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی کوئی بات رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مخالف نہیں ہو سکتی اور یہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ جیسا رعب والا شخص بھی اپنی خلافت کے دوران صحابہ سے پوچھے کہ تم لوگ کب تک میری اتباع کرو گے؟ صحابہ رضی اللہ عنہم نے کہا کہ جب تک آپ قرآن وسنت پر چلیں گے۔ اگر تم نے قرآن وسنت سے اِدھر اُدھر قدم رکھا تو ہم تیری تلوار سے تجھے سیدھا کر دیں گے۔ اس لئے اگر کسی وجہ سے کسی صحابی کے قول پر کوئی شخص عمل نہ کرے تو اس کی گنجائش ہے، لیکن ایسا لفظ تو نہ کہے جس سے دشمن کو فائدہ ہو۔

صحابہ رضی اللہ عنہم کا باہمی احترام:

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا فتویٰ تھا اور ایک حضرت زید رضی اللہ عنہ کا فتویٰ تھا، آپس میں دونوں فتاویٰ متعارض تھے۔ کسی نے جا کر حضرت زید رضی اللہ عنہ سے کہا تو وہ ناراض ہو گئے۔ لیکن ایک دن جناب کیا دیکھا کہ حضرت زید رضی اللہ عنہ سوار ہو رہے ہیں تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے آگے سے رکاب پکڑ لی، سواری کی رکاب پکڑ کر سوار کرایا۔ حضرت زید رضی اللہ عنہ نے فرمایا: کیا کر رہے ہو؟ عرض کیا کہ ہمیں یہی حکم دیا گیا ہے کہ اپنے علماء کی عزت کرو۔ تم صحابہ میں عالم ہو، میں کیسے آپ کا احترام نہ کروں؟ اسی طرح کتابوں میں موجود ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے رکاب پکڑا اور احترام کیا تو حضرت زید رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اچھا ابن عباس! اپنا ہاتھ مجھے دکھاؤ۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ہاتھ دکھایا تو انہوں نے فوراً حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے ہاتھ پر بوسہ دیا۔ انہوں نے کہا کہ یہ کیا کر رہے ہو؟ انہوں نے کہا کہ مجھے بھی یہی حکم ہے کہ جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نسبت رکھے، اس کا احترام کرو۔

اب مسئلہ میں دونوں ایک دوسرے کے خلاف کھڑے ہیں، لیکن وہ رکاب پکڑ رہے ہیں اور وہ ہاتھ کو بوسہ دے رہے ہیں۔ اسی طرح زبیر رضی اللہ عنہ اور طلحہ رضی اللہ عنہ، حضرت بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا کو دیکھ لیں۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ جب اپنی مجلس میں ہوتے اور کوئی مجلس میں آتا تو کہتے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی کوئی بات سناؤ، ان کا خطبہ سناؤ اور جب صحابہ سنانا شروع کرتے تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ رونا شروع کر دیتے۔

موافقاتِ عمر رضی اللہ عنہ:

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے تین باتوں میں میری بات کی لاج رکھ لی اور میری بات کو منظور

فرمالیا: ایک تو میں نے حضور اکرم ﷺ سے عرض کیا تھا: یارسول اللہ! آپ مقام ابراہیم کو مصلی بنالیں۔ حضور اکرم ﷺ پر اللہ تعالیٰ نے آیت نازل کی۔

دوسرا میں نے یہ عرض کیا تھا کہ آپ کے پاس ہر قسم کے لوگ حاضر ہوتے ہیں، اگر آپ اپنی بیویوں کو پردے کا حکم دے دیں تو زیادہ بہتر ہوگا۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس کے مطابق قرآن میں پردہ کی آیت اُتار دی۔

اور تیسرا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب حضور اکرم ﷺ اپنی بیویوں سے ناراض ہو گئے تو میں نے جا کر حضور اکرم ﷺ کی بیویوں سے کہا کہ تم کیوں ایسی باتیں کرتی ہو کہ حضور اکرم ﷺ ناراض ہو جاتے ہیں؟ خبردار! خیال رکھو! حضور اکرم ﷺ کو راضی رکھا کرو، ایسا نہ ہو کہ کہیں اللہ تعالیٰ حکم دے دیں کہ ان کو طلاق دے دو۔ پھر اللہ تعالیٰ ان کو تم سے بہتر بیویاں عطا فرما دیں۔ بیویوں نے فرمایا کہ حضور اکرم ﷺ ہمیں نصیحت فرماتے ہیں، وہ کافی ہے، تم ہمیں وعظ نہ کرو۔ تم کیا حضور اکرم ﷺ سے بہتر ہمیں نصیحتیں کر سکتے ہو؟ اس پر اللہ تعالیٰ نے قرآن نازل فرمادیا۔

اسی طرح بدر کے قیدیوں کے متعلق حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے موافق فیصلہ کیا گیا۔

امام احمد رحمہ اللہ نے یہ بات باسند نقل کی ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ تین چیزوں میں میرے رب نے میری موافقت فرمائی۔

ویسے ان احادیث مبارکہ میں تو تین چیزوں کا ذکر ہے، اصل میں محدثین اور علماء کرام نے تمام روایات کو جب جمع کیا ہے پندرہ مقامات تقریباً ایسے ہیں کہ جہاں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی رائے کو اللہ تعالیٰ نے منظور فرمایا اور اس کے مطابق حکم جاری فرمادیا۔

یہ بہت بڑی عظمت اور شرف کی دلیل ہے کہ جس کی رائے کو اتنی اہمیت ملے کہ اللہ قبول فرما کر اس کے مطابق قرآن نازل فرمادیں اور اس پر پھر قیامت تک عمل باقی رہے۔

ان پندرہ مقامات میں سے ایک یہ ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے مقامِ ابراہیم کو مصلی بنانے کا کہا تھا اور یہ آیت نازل ہوئی۔ اس لئے حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اگر کسی آدمی نے دنیا میں اچھے کام کی ابتداء کی اور اس کام کو اللہ تعالیٰ نے منظور فرمایا اور وہ قیامت تک کام ہوتا رہے گا تو اس بنیاد رکھنے والے کو ثواب ملتا رہے گا۔ آپ نے ایک مدرسہ، ہسپتال یا اچھی جماعت کی بنیاد رکھی تو جب تک وہ رہے گا، آپ کو ثواب ملتا رہے گا۔ یہی مثال مقامِ

ابراہیم پر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی ہے۔ اسی طرح حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ (نعوذ باللہ) اگر کسی نے برائی کی بنیاد رکھی اور جوں جوں وہ لعنت پھیلتی چلی گئی تو اس کا گناہ پہلے شخص کو بھی ملے گا۔ جیسے قابیل نے اپنے بھائی ہابیل کو قتل کر کے قتل کی بنیاد رکھی تو قیامت تک جتنے ناحق قتل ہوں گے، قابیل پر بھی ان کا گناہ لکھا جائے گا۔

اسی طرح حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ جس دن اسلام لائے، فرمایا: یارسول اللہ! کیا ہم حق پر نہیں ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: بالکل ہم حق پر ہیں۔ عرض کیا: حضور! میرا ضمیر یہ برداشت نہیں کرتا کہ بتوں کے پجاری کعبے میں جا کر عبادت کریں اور ہم سچے خدا کو ماننے والے چپ کر کے بیٹھے رہیں۔ چلیں! آج ہم اللہ کے کعبے میں کھلی عبادت کریں گے، جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے مقامِ ابراہیم پر جو رائے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی منظور کی، وہ اس کا صلہ تھا۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب عبداللہ بن اُبی رئیس المنافقین مر گیا تو حضور اکرم ﷺ نے اس کا جنازہ پڑھانے کا ارادہ کیا تو میں نے عرض: یارسول اللہ! آپ اس کافر اور منافق کا جنازہ پڑھا رہے ہیں؟ جس نے ساری زندگی اسلام کو نقصان پہنچایا۔ یہ دشمن اسلام ہے، آپ اس کا جنازہ نہ پڑھائیں۔ حضور اکرم ﷺ نے میری بات نہ مانی اور جنازہ پڑھا دیا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے قرآن نازل کر دیا کہ میرے نبی! ان منافقین کا کبھی آپ جنازہ نہ پڑھیں، اگر ان میں سے کوئی مر جائے اور اس کی قبر پر آپ کھڑے بھی نہ ہوں۔ یہ آپ کے جنازہ پڑھنے کے مستحق نہیں ہیں۔ اس میں بھی اللہ تعالیٰ نے میری رائے کو منظور فرمالیا۔

یہ پانچ مقامات ہو گئے۔ اس لیے مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ ساری روایات ٹھیک ہیں اور کسی جگہ کوئی تعارض نہیں ہے۔

لیکن یاد رکھو کہ علماء فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن نازل فرمایا، لیکن حضور اکرم ﷺ کی بیویوں کو بدلنے کا حکم نہیں دیا تو معلوم ہوا کہ ان سے بہتر کوئی بیوی دنیا میں تھی ہی نہیں، اگر کوئی ہوتی تو اللہ تعالیٰ بدل دیتے۔ اس لئے یہ معنی ہوا کہ حضور اکرم ﷺ کے لیے خیر ہیں۔ اور یہ بات یاد دیکھیں کہ وہی ترتیب اسلام والی، ایمان والی، عبادت والی، توبہ کرنے والی، روزہ رکھنے والی، عورتیں ایسی بھی ہوں گی کہ بیوہ اور شادی شدہ بیوہ بیوی کا ذکر پہلے اور کنواری کا ذکر بعد میں ہے۔ وہی ترتیب ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے پہلے شادی بی بی خدیجہ رضی اللہ عنہا سے کی اور کنواری سے شادی بعد میں کی۔ اس لئے فرمایا کہ حضور اکرم ﷺ کی بیویوں کی ساری صفات اللہ تعالیٰ نے ذکر

فرمادیں۔ واللہ اعلم۔

قیامت کے دن سب سے پہلے لباس کسے پہنایا جائے گا؟

ایک حدیث مبارک ہے کہ حضور پاک ﷺ نے فرمایا کہ قیامت کے دن جب سارے لوگ قبروں سے اُٹھیں گے تو سب سے پہلے جنت کی پوشاک اور جوڑا میرے ابا ابراہیم علیہ السلام کو پہنایا جائے گا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے پوچھا: یارسول اللہ! آپ سے بھی پہلے؟ حالانکہ آپ کی شان تو ان سے زیادہ بلند ہے؟ آپ ﷺ نے موالانا: ہاں! مجھ سے بھی پہلے ملے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ کے راستے میں دنیا میں سب سے پہلے ان کا لباس اُتارا گیا۔ واقعہ یہ ہوا کہ ان کو جب آگ میں ڈالا گیا تھا تو اللہ کی توحید کے لئے ان کے کپڑے تو جل گئے تھے، اللہ تعالیٰ اس کا بدلہ دیں گے کہ آج سارے میدانِ حشر میں تمام انبیاء میں کھڑے ہیں، لیکن ابراہیم علیہ السلام کو سب سے پہلے لباس پہنایا جائے گا۔

﴿لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ﴾ کی تفسیر:

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَعَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ﴾ [البقرۃ: ۱۲۵] حضرت ابراہیم علیہ السلام نے چونکہ بتوں کو توڑا اور مندر کو برباد کیا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تُو نے شرک کو برباد کیا تھا، اس لیے تیری عظمت کے لیے میں کعبے کی بناء تیرے سپرد کرتا ہوں، تاکہ توحید کا گھر بنانے والا بھی میرا ابراہیم بنے۔

اس گھر کو پاک کرنے کا کیا مطلب ہے؟ بعض علماء نے فرمایا کہ حکم یہ تھا کہ گندگی اور نجاست سے پاک کرو، لیکن یہ قول بھی راجح نہیں ہے، کیونکہ جب ابراہیم علیہ السلام نے نیا گھر بنادیا تو اب گندگی کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اس لئے علماء نے فرمایا کہ معنی یہ تھا کہ اب توحید کا ڈنکا بجائیں، اس کو معنوی طور پر بھی پاک کردیں، تاکہ لوگ شرک اور شرک والے عقیدوں سے پاک ہوں۔

''طائفین'' اور ''عاکفین'' کے درمیان میں ''واؤ'' سے معلوم ہوا کہ طواف علیحدہ عبادت ہے اور وقوف علیحدہ عبادت ہے۔ ''عاکفین'' سے مراد علماء نے وہ لوگ لئے ہیں جو مستقل مکہ میں رہتے ہیں، اور بعض علماء کے نزدیک ''طائفین'' سے مراد طواف کرنے والے ہیں، ''عاکفین'' سے مراد حرم میں بیٹھنے والے ہیں۔ ''وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ''

نماز پڑھنا ایک علیحدہ عبادت ہے، رکوع اور سجود سے مراد نمازی ہیں۔

"طائفین" سے مراد طواف کرنے والوں کے لئے۔ بعض علماء نے فرمایا کہ ﴿لِلطَّآىِٕفِيْنَ﴾ سے مراد باہر سے آنے والوں کے لیے اور ﴿وَالْعٰكِفِيْنَ﴾ سے مراد مکہ میں رہنے والوں کے لئے۔ اصل میں "عاکفین" کا معنی ہے: بیٹھنے والے۔ لیکن بعض علماء نے کہا کہ طواف کرنے والے اور نماز پڑھنے والے مراد ہیں۔

دوسری جگہ قرآن میں ارشاد ہے کہ یہاں باہر سے آنے والا اور اندر رہنے والا سب برابر ہیں۔ سعید بن جبیر ﷫ نے فرمایا کہ جو بھی مکہ میں بیٹھا ہو، وہ "عاکفین" کے معنی میں داخل ہے۔

جب اللہ تعالیٰ کی خاص رحمتیں ہوتی ہیں تو ساٹھ رحمتیں طواف والوں کو اور چالیس رحمتیں نماز پڑھنے والوں کو ملتی ہیں اور بیس رحمتیں بیٹھ کر اللہ کے کعبے کو نظر کرنے والوں کو ملتی ہیں۔

﴿وَعَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ﴾ حضرت حسن بصری، ابن جریج اور عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم بھی ﴿عَهِدْنَآ﴾ کا معنی "اَمرنا" فرماتے ہیں۔ مفسر ﷫ فرماتے ہیں کہ ظاہر یہ بات ہے کہ یہ حرف متعدی ہے "اِلٰی" کے ساتھ، جس کا معنی یہ ہوتا ہے کہ اللہ نے ابراہیم علیہ السلام اور اسماعیل علیہ السلام کی طرف وحی نازل فرمائی۔

حضرت سعید بن جبیر ﷫ فرماتے ہیں: ﴿اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّآىِٕفِيْنَ﴾ کے معنی ہیں کہ اس گھر کو ایسا پاکیزہ بناؤ کہ اس کے اندر شرک، بت پرستی، شہوت کی باتیں اور بد نظری کرنا، ان تمام چیزوں اور نجاسات باطنیہ اور ظاہریہ سب دور ہو جائیں اور اس گھر کی عظمت لوگوں کے دلوں میں بٹھا دو۔

ایک روایت میں آتا ہے: ہم نے عبداللہ بن عمیر سے کہا کہ ہم اُمید کرتے ہیں کہ تم امیر سے یہ بات کرو کہ لوگوں میں بات کہلوائیں کہ اللہ کے گھر (مسجد حرام) میں نہ سویا کریں، کیونکہ سونے کی حالت میں آدمی کو جنابت بھی ہو جاتی ہے، احتلام ہو سکتا ہے اور وضو بھی ٹوٹ جاتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ نہیں، ایسا نہ کریں۔ "عاکفین" میں تو سب آجاتے ہیں اور یہ صحیح حدیث سے ثابت ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما جب غیر شادی شدہ تھے تو آپ مسجد الحرام میں سوتے تھے۔ جو اللہ کے گھر میں نماز پڑھنے والے ہیں، ﴿الرُّكَّعِ السُّجُوْدِ﴾ سے مراد وہی ہیں۔

ابن کثیر ﷫ فرماتے ہیں کہ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ بتوں سے پاک کرو۔ اس کا کیا معنی کہ ابراہیم علیہ السلام کی بناء سے پہلے یہاں کوئی بت پرستی ہوتی تھی؟ اس کا جو حکم دیا گیا ہے تو اس کے انہوں نے دو جواب دیئے ہیں۔

پہلا جواب: یہ حکم دیا گیا کہ اس گھر کو پاک کر دو، کیونکہ قوم نوح کے زمانے سے بت پرستی ہوتی تھی، حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس کا حکم اس لیے دیا، تا کہ ابراہیم علیہ السلام کا یہ عمل بعد والوں کے لیے ایک طریقہ اور سنت بن جائے اور وہ بھی بت پرستوں کے ساتھ ایسا سلوک کریں جیسا سلوک ابراہیم علیہ السلام نے کیا۔ دوسرا یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو امام بنایا تھا، تا کہ لوگ آپ کی اقتداء کریں، یعنی ان بتوں سے اس گھر کو پاک کریں جن کی مشرکین عبادت کرتے تھے۔

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس جواب کو تو ہم مان لیتے ہیں، لیکن اس پر کوئی دلیل ہونی چاہیے؛ کیونکہ ابراہیم علیہ السلام سے پہلے جب یہاں گھر ہی نہیں تھا تو کوئی ایسی قوم تھی جو بتوں کی عبادت کرتی تھی۔ تو اس کے لیے دلیل ہو اور دلیل بھی حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہو۔

دوسرا جواب ابن جریر رحمہ اللہ نے یہ نقل فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میرے گھر کو پاک کرو، یعنی خالص اللہ تعالیٰ کے لیے گھر کو بناؤ، اس میں کسی قسم کا شرک نہ ہو۔

دراصل اللہ تعالیٰ کا یہ حکم انبیاء کو ہوتا ہے اور امت کو ہدایت ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے نبی کو فرما رہے ہیں، تا کہ بعد میں مسلمان مساجد بنائیں تو وہ بھی اللہ تعالیٰ کے لیے بنائیں، مسجدوں میں بدعات نہ ہوں اور صحابہ رضی اللہ عنہم اس بارے میں بہت احتیاط کرتے تھے۔

ایک مرتبہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ایک مسجد میں دیکھا کہ مؤذن اذان دے کر آیا تو اس نے مسجد کی دیوار کے ساتھ لکڑی مار کر اُٹھانا شروع کیا، انہوں نے کہا کہ یہ کیا ہے؟ اس مؤذن نے کہا کہ جو غفلت میں بیٹھے یا لیٹے ہوتے ہیں، ان کو جگا رہا ہوں، تا کہ لوگ اُٹھ جائیں۔ انہوں نے کہا کہ بس جب اذان ہوگئی تو اس کے بعد اور اعلان کی کیا ضرورت ہے؟ اگر اذان کے بعد ان لوگوں کو احساس نہیں ہے تو پھر اُٹھانے کی کیا وجہ؟

جماعت سے پہلے مسجد میں اجتماعی ذکر:

اسی طرح حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے دیکھا کہ ایک مسجد میں امام صاحب بیٹھ گئے، لوگوں نے کچھ پڑھنا شروع کیا۔ امام صاحب اور لوگ پڑھ رہے ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یہ کیا ہے؟ انہوں نے کہا کہ یہ اللہ تعالیٰ کا ذکر کر رہے ہیں، امام صاحب کلمہ پڑھتے ہیں اور تمام مقتدی ان کے ساتھ مل جاتے ہیں، یہ اللہ تعالیٰ کا ذکر ہے،

کوئی غلط چیز نہیں ہے۔ فرمایا: یہ تو بدعت ہے۔ آپ کی آنکھیں مبارک اس وقت چلی گئی تھیں، آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ مجھے جلدی اس مسجد سے نکالو، یہ تو بدعتی ہیں، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ایسا نہیں ہوتا تھا۔ اور اگر صحابہ رضی اللہ عنہم کے دور میں فروعی مسائل میں اختلاف ہوا ہے تو وہ بھی اس لئے کہ دو روایات مل گئیں۔ کسی نے ایک روایت پر عمل کیا اور کسی نے دوسری روایت پر عمل کیا؛ یہ اس لئے ہوا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دو عمل مل گئے۔

کیونکہ ابراہیم علیہ السلام اور اسماعیل علیہ السلام تو نبی ہیں اور شرک سے پاک ہیں۔ ان کو حکم دیا کہ خالص میری عبادت کے لئے گھر بناؤ، اس میں صرف میری عبادت ہو، کسی اور کا ذکر نہ ہو۔ جیسے دوسری آیت میں فرمایا: ﴿وَإِذْ بَوَّأْنَا لِإِبْرَاهِيمَ مَكَانَ الْبَيْتِ أَنْ لَا تُشْرِكْ بِي شَيْئًا وَطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّائِفِينَ وَالْقَائِمِينَ وَالرُّكَّعِ السُّجُودِ﴾ [الحج:۲۶]

مفتی صاحب کا واقعہ:

پچھلے سفر میں سردیوں کے دن تھے اور صبح کی نماز کا ٹائم ہوگیا۔ میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ مسجد دیکھیں اور نماز پڑھیں کہ کہیں فجر کا وقت ہی نہ نکل جائے۔ خیر سڑک کے کنارے مسجد آگئی۔ ہم رُکے، مسجد میں داخل ہوئے تو امام صاحب نے سلام پھیر دیا تھا۔ ہم ساتھیوں نے برآمدے میں اپنی جماعت شروع کردی تو کچھ لوگ کہنے کہ دیکھو جی! یہ مولوی کی ہے، دوسرے نے کہا: وہابی ہماری مسجد میں کیسے آگئے؟ اور ایک صاحب نے کہا کہ زور زور سے صلوٰۃ وسلام پڑھ کر انہیں جلاؤ، ستاؤ۔ جب تک ہم نماز پڑھتے رہے تو وہ بھی زور زور سے صلوٰۃ وسلام پڑھتے رہے۔ میں نے نماز کے بعد امام صاحب سے سلام ودعا کی اور پوچھا کہ آپ کہاں سے اور کس مدرسے سے پڑھے ہیں اور کون کون سی کتابیں پڑھی ہیں؟ وہ امام صاحب تو بُرا مان گئے۔ میں نے کہا: میں تو صرف تعارف پوچھ رہا ہوں کہ آپ بھی مولوی ہیں اور ہم بھی مولوی ہیں۔ لیکن پھر ہم نے ان سے بحث ہی نہ کی کہ ایسے آدمی کو بندہ کیا نصیحت کرے؟

طواف افضل ہے یا نماز؟

اس میں اختلاف ہے کہ کعبۃ اللہ میں نفل نماز افضل ہے یا طواف؟ اور یہ اختلاف نفل عبادت میں ہے، فرض نماز میں نہیں۔ اگر فرض نماز ہو رہی ہو اور ایک آدمی یہ کہے کہ میں طواف کروں تو یہ غلط بات ہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ باہر سے آنے والوں کے لئے طواف افضل ہے اور مکہ میں جو مستقل رہنے والے ہیں ان کے لئے نفلی

نماز افضل ہے؛ کیونکہ باہر والوں نے تھوڑے دن رہنا ہے اور پھر چلے جانا ہے، انہیں پھر طواف کی عبادت تو میسر نہیں آسکتی۔ مکہ والا آدمی تو کر ہی لیتا ہے، لیکن باہر سے آنے والے کے لیے طواف افضل ہے، لیکن جمہور کے نزدیک مطلقاً طواف افضل ہے، چاہے مکہ میں رہنے والا ہے یا باہر سے آنے والا۔ اس لیے ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جہاں بنائے کعبہ کا ذکر آیا، وہاں حج، طواف، نماز اور رکوع وسجود کا ذکر آیا۔ اس میں جہاں مشرکین کا ردّ ہے وہاں یہود ونصاریٰ کا بھی ردّ ہے۔

اتباعِ سنت کا واقعہ:

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کا دعویٰ تو کرتے ہیں، لیکن عمل نہیں ہے تو یہ دعویٰ کیسے سچا ہوسکتا ہے؟ اگر لوگ اپنے پیر کی محبت میں اس جیسا لباس، پگڑی اور ٹوپی استعمال کر سکتے ہیں تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جیسی شکل کیوں اختیار نہیں کرتے؟ اور زندگی کا ہر عمل حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے مطابق کرے۔

صحابہ رضی اللہ عنہم کے اندر یہ بات تھی کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما حج کے دوران عرفات سے آرہے تھے، عرفات اور مزدلفہ کے درمیان آپ نے اپنی اونٹنی روک دی، پانی لیا اور وہاں سے ہٹ کر تھوڑا دور چلے گئے۔ وہاں ایسے بیٹھ گئے جیسے آدمی رفع حاجت کے لئے بیٹھتا ہے اور کچھ دیر بعد اُٹھ کر آ گئے۔ جو خادم دیکھ رہا تھا، اس نے کہا کہ حضرت! ہمیں تو آج مسئلہ سمجھ نہیں آیا۔ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: کیا بات ہے؟ خادم نے عرض کیا کہ آپ تو پیشاب کے لیے گئے اور آپ نے پانی بھی لیا، لیکن وہاں جا کر آپ بیٹھ گئے اور رفع حاجت کے لیے کپڑے بھی نہیں ہٹائے اور اُٹھ گئے تو بیٹھنے کی کیا ضرورت تھی؟ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ بات یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب حج کر کے آرہے تھے تو اسی جگہ میرے مدنی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے سواری روکی اور قضائے حاجت کے لیے اُترے تھے۔ مجھے ضرورت تو نہ تھی، لیکن محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتداء میں ایسا کیا۔

کیونکہ یہود ونصاریٰ جانتے ہیں کہ یہ گھر ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے حکم پر بنایا تھا کہ اس گھر کا حج، عمرہ اور اعتکاف کیا جائے اور نماز پڑھیں اور یہود ونصاریٰ تو ان میں کچھ بھی نہ کرتے تھے تو وہ کیسے دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم ابراہیم علیہ السلام کے مقتدی ہیں؟ حالانکہ ابراہیم علیہ السلام کی لائی ہوئی شریعت پر عمل بھی نہیں کرتے۔ اس گھر کا حج تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی کیا ہے، اگر تم یہودی موسیٰ علیہ السلام کے دین پر چلتے ہو تو تم حج کیوں نہیں کرتے ہو؟

﴿وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ قَالَ وَمَنْ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ قَلِيْلًا ثُمَّ اَضْطَرُّهٗۤ اِلٰى عَذَابِ النَّارِ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۱۲۶﴾ وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمٰعِيْلُ ؕ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۱۲۷﴾ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَاۤ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ۪ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۲۸﴾﴾ [البقرۃ:۱۲۶تا۱۲۸]

"اور جب عرض کیا ابراہیم نے: اے میرے پروردگار! اس (مکہ) کو امن کا شہر بنا اور اس کے رہنے والوں کو پھلوں سے رزق دے جو اِن میں سے اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان لائے۔ (اللہ نے) فرمایا: اور جو کافر ہوگا میں اس کو بھی اس کی زندگی میں دنیا کا فائدہ دوں گا، پھر اس کو جہنم کے عذاب کی طرف کھینچوں گا اور وہ بُرا ٹھکانہ ہے۔ اور یاد کیجیے! جب ابراہیم خانہ کعبہ کی بنیادیں اُٹھا رہے تھے اور اسماعیل (بھی، انہوں نے دعا کی) اے ہمارے رب! ہماری طرف سے قبول فرما، بے شک تُو ہی سننے والا جاننے والا ہے۔ اے ہمارے رب! ہمیں اپنا فرمانبردار بنا اور ہماری اولاد میں سے بھی ایک جماعت کو اپنا تابعدار کردے اور ہمیں اپنی عبادت کے طریقے سکھا اور ہمیں معاف کر، بے شک تُو ہی توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے۔"

ربطِ آیات:

ان آیات مبارکہ سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے جتنے گھر ہیں، ان کو ظاہراً بھی پاک ہونا چاہیے اور باطناً بھی پاک ہونا چاہیے۔ باطناً پاکی یہ ہے کہ جب بھی اللہ تعالیٰ کا گھر بنایا جائے تو خاص اللہ تعالیٰ کے لیے ہو، اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لیے ہو۔ دوسرا اس کے اندر جو مال خرچ کیا جائے، وہ خالص حلال ہو؛ کیونکہ وہ بھی پاکی کا سب سے بڑا حصہ ہے۔ مسجد کے اندر کوئی پیسہ حرام، چوری یا سود کا نہ لگایا جائے۔ اسی طرح وہ زمین جس پر مسجد بنائی جائے، خالص حلال پیسے سے شرعی طریقہ سے خریدی جائے یا کوئی آدمی اللہ کے لیے وقف کرے اور وہ زمین غصب کی نہ ہو، زبردستی چھینی ہوئی نہ ہو۔

ظاہری پاکی یہ ہے کہ مسجد کو صاف رکھیں، مسجد کے اندر کوئی ناک صاف نہ کرے، کوئی تھوک نہ ڈالے۔ یہ بہت

بڑا گناہ ہے اور اس کا حکم یہ ہے کہ فوراً اس کا ازالہ کیا جائے۔ مساجد کے اندر خوشبو کرنا سنت ہے، مساجد میں روشنی کا انتظام کرنا، مساجد کے لیے غسل خانے، وضو خانے اور ان کی باقاعدہ صفائی کا اہتمام کرنا چاہیے؛ کیونکہ اگر ان کی صفائی نہیں کریں گے تو وہ قابلِ استعمال ہی نہیں رہیں گے۔ ان تمام چیزوں کا خیال رکھا جائے۔ الغرض ہر لحاظ سے مساجد کو پاک رکھنا ضروری ہے۔

کعبہ کی سب سے پہلی تعمیر:

اس میں اختلاف پایا جاتا ہے کہ سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کا کعبہ کس نے بنایا؟ بعض علماء فرماتے ہیں کہ سب سے پہلے ملائکہ نے بنایا۔ یاد رکھیں! یہ اختلاف ایسا نہیں کہ اس پر جھگڑا کیا جائے؛ کیونکہ آدم علیہ السلام سے لے کر آج تک کسی کے پاس تاریخ ہے؟ لازمی بات ہے کہ کئی کتابیں لکھی گئی ہیں، کچھ مٹ گئیں، کسی کو کوئی روایت ملی اور کسی کو کوئی روایت ملی۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اللہ کے کعبہ ہونے میں کسی کو کوئی شک نہیں ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ سب سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام نے بنایا اور ان پانچ پہاڑوں سے ان پر پتھر لگائے... حراء، طور سینا، طور زیتا، جبل لبنان اور جبل جودی، لیکن یہ روایت بھی ضعیف ہے۔ ایک روایت یہ ہے کہ سب سے پہلے حضرت شعیب علیہ السلام نے کعبہ بنایا۔

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ ساری روایات اسرائیلیہ ہیں جو سابقہ کتابوں سے لی گئی ہیں۔ اور سابقہ کتابوں کا حال یہ ہے کہ ہم نہ ان کی تصدیق کر سکتے ہیں اور نہ تکذیب کر سکتے ہیں اور نہ ان پر کوئی اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ ہاں! اگر اس کے بارے میں کوئی صریح حدیث مل جائے تو سر آنکھوں پر ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ یا اللہ! اس شہر کو امن والا بنا اور اس میں رہنے والوں کو پھلوں سے رزق عطا فرما، جو تجھ پر ایمان لانے والے ہیں اور یوم آخرت پر ایمان لانے والے ہیں۔

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

"إِنَّ إِبْرَاهِيمَ حَرَّمَ بَيْتَ اللهِ وَ أَمَّنَهُ، وَ إِنِّي حَرَّمْتُ الْمَدِينَةَ، فَحَرَامٌ مَا بَيْنَ لَابَتَيْهَا، لَا يُصْطَادُ صَيْدُهَا، وَ لَا يُقْطَعُ عِضَاهُهَا." [السنن الکبریٰ للنسائی، رقم: ۴۲۸۴]

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مکہ کے حرام ہونے کے لئے دعا کی اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں مدینہ پاک

کے حرم ہونے کی دعا کرتا ہوں کہ اے اللہ اس کے دونوں کناروں کے درمیان کو حرم بنا دے۔ لہٰذا یہاں کوئی اشکال نہ کرے، یہاں حد حرم میں درخت کی کوئی ٹہنی نہ کاٹی جائے۔

ائمہ کرام نے فرمایا: اس میں تو اتفاق ہے کہ مکہ کے حرم ہونے میں کسی کا اختلاف نہیں ہے؛ کیونکہ قرآن میں آ گیا: ﴿وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا﴾ [آل عمران: ۹۷] البتہ مدینہ منورہ کے حرم ہونے کے بارے میں اختلاف ہے۔ بعض ائمہ فرماتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ کا حرم بنانا اللہ تعالیٰ کے حکم سے تھا، اس لئے اس کا بھی وہی حکم ہے جو حرم کا حکم ہے، جبکہ بعض ائمہ کرام فرماتے ہیں: اس کا ادب و احترام بھی اس طرح کیا جائے گا جیسا کہ حرم کا ہے، لیکن اس پر احکام اس طرح مرتب نہیں ہوں گے جو حرم مکہ میں مرتب ہوتے ہیں۔

یہاں اس میں کوئی شبہ نہیں کہ روایات کثیرہ میں ہے کہ پورے حرم مکہ میں ایک نماز کے بدلے ایک لاکھ نمازوں کا ثواب ملتا ہے، جبکہ مدینہ منورہ میں یہ فضیلت مسجد نبوی کے ساتھ خاص ہے۔ اگر مسجد نبوی کے علاوہ مدینہ کی کسی جگہ نماز پڑھی تو وہ فضیلت حاصل نہیں ہوگی۔ نیز یہ فضیلت بھی پچاس ہزار نمازوں کے ثواب ملنے کی ہے، نہ کہ ایک نماز کی۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:

"اِنَّ اِبْرَاهِيْمَ كَانَ عَبْدُاللّٰهِ وَ خَلِيْلَهٗ وَ اِنِّيْ عَبْدُاللّٰهِ وَ رَسُوْلُهٗ وَ اِنَّ اِبْرَاهِيْمَ حَرَّمَ مَكَّةَ وَ اِنِّيْ حَرَّمْتُ الْمَدِيْنَةَ مَا بَيْنَ لَابَتَيْهَا عِضَاهَهَا وَ صَيْدَهَا لَا يُحْمَلُ فِيْهَا سِلَاحٌ لِقِتَالٍ وَ لَا يُقطع مِنْهَا شَجَرَةٌ اِلَّا لِعَلَفِ بَعِيْرٍ." [تفسیر طبری، رقم: ۲۰۳۰/ کنز العمال، رقم: ۳۸۱۵۶]

حضرت ابراہیم علیہ السلام اللہ کے بندے اور اللہ کے خلیل ہیں اور میں بھی اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہوں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مکہ کو حرم بنایا، میں مدینہ منورہ کے بارے میں کہتا ہوں کہ یہ بھی حرم ہے دونوں کناروں کے درمیان میں۔ یہاں بھی شکار نہ کھیلا جائے اور یہاں بھی کسی کے قتل کے لئے ہتھیار نہ اُٹھایا جائے، یہاں بھی کوئی درخت نہ کاٹا جائے۔ ہاں! اگر کوئی ایسے چھوٹے درخت ہیں جو جانوروں کے گھاس کے لئے ضروری ہیں تو اس کے کاٹنے کی اجازت ہے۔ جیسا کہ حرم مکہ کے بارے میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ یہاں کوئی ہتھیار نہ اُٹھائے، کوئی قتال نہ کرے؛ کیونکہ یہ امن کی جگہ ہے۔ اور یہاں نہ کوئی شکار کھیلے اور یہاں نہ کوئی لقطہ کا مال اُٹھائے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یا رسول اللہ! اذخر، جو چھوٹا سا درخت ہے، یہ تو ہر وقت ہمارے استعمال میں آتا ہے؟ تو آپ ﷺ نے



اس کے استعمال کی اجازت دے دی۔

مکہ کی طرح مدینہ میں بھی برکتیں ہیں:

اگر کسی آدمی نے حرم میں خود گھاس لگایا ہے تو اس کا کاٹنا جائز ہے، اسی طرح اس نے حد حرم میں کوئی درخت لگایا ہے تو اس کا پھل توڑنا بھی جائز ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ قدرت کی طرف سے جو خود رو چیزیں ہیں، ان میں کوئی تصرف نہ کرے۔

مسلم کے اندر صحیح حدیث مبارک ہے، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جو نیا پھل آتا تھا صحابہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے آتے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس پھل کو لے کر یوں دعا فرماتے تھے:

"أَللّٰهُمَّ! بَارِكْ لَنَا فِي ثَمَرِنَا، وَ بَارِكْ لَنَا فِي مَدِينَتِنَا، وَ بَارِكْ لَنَا فِي صَاعِنَا، وَ بَارِكْ لَنَا فِي مُدِّنَا، أَللّٰهُمَّ! إِنَّ إِبْرَاهِيمَ عَبْدُكَ وَ خَلِيلُكَ وَ نَبِيُّكَ، وَ إِنِّي عَبْدُكَ وَ نَبِيُّكَ، وَ إِنَّهُ دَعَاكَ لِمَكَّةَ، وَ إِنِّي أَدْعُوكَ لِلْمَدِينَةِ بِمِثْلِ مَا دَعَاكَ لِمَكَّةَ، وَ مِثْلِهِ مَعَهُ." [صحیح مسلم، رقم:۱۳۷۳]

"یا اللہ! ہمارے پھلوں میں برکت عطا فرما، اے اللہ! ہمارے مدینہ میں برکت عطا فرما، ہمارے صاع میں برکت عطا فرما، ہمارے مُد میں برکت عطا فرما، اے اللہ! سیدنا ابراہیم علیہ السلام تیرا بندہ اور تیرا خلیل تھا، اس نے مکہ کے لئے دعا مانگی تھی، میں مدینہ منورہ کے لئے دعا کرتا ہوں۔ یا اللہ! جو تُو نے مکہ میں برکتیں رکھی ہیں، مدینہ میں بھی وہی برکتیں عطا فرما، اے اللہ! اس کے ساتھ اتنی اور برکتیں بھی عطا فرما۔"

اس کے بعد وہ پھل کسی چھوٹے بچے کو دے دیتے تھے۔ یہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا تفاؤل خیر تھا کہ ادھر پھل نیا ہے اور ادھر بچہ بھی نئی نئی زندگی لے کر آیا ہوتا ہے، جیسے وہ پھل مبارک ہے، اس طرح یہ بچہ بھی مبارک ہے اور معصوم ہے۔

مسلم شریف میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

"قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِأَبِي طَلْحَةَ: اِلْتَمِسْ لِي غُلَامًا مِنْ غِلْمَانِكُمْ يَخْدُمُنِي، فَخَرَجَ بِي أَبُوطَلْحَةَ يُرْدِفُنِي وَرَاءَهُ، فَكُنْتُ أَخْدُمُ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كُلَّمَا نَزَلَ، وَ قَالَ فِي الْحَدِيثِ: ثُمَّ أَقْبَلَ حَتَّى إِذَا بَدَا لَهُ أُحُدٌ، قَالَ: هٰذَا جَبَلٌ يُحِبُّنَا وَ نُحِبُّهُ، فَلَمَّا أَشْرَفَ عَلَى الْمَدِينَةِ، قَالَ: أَللّٰهُمَّ! إِنِّي أُحَرِّمُ مَا بَيْنَ جَبَلَيْهَا مِثْلَ مَا حَرَّمَ بِهِ إِبْرَاهِيمُ مَكَّةَ، أَللّٰهُمَّ بَارِكْ لَهُمْ فِي مُدِّهِمْ وَ صَاعِهِمْ."

[صحیح مسلم، رقم:۱۳۶۵]



حضور اکرم ﷺ نے حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا: تم اپنے لڑکوں میں سے کوئی لڑکا تلاش کرو جو میری خدمت میں رہے اور میرے کام کرے۔ ابوطلحہ اپنی سواری کے پیچھے مجھے بٹھا کر حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں لے آئے اور عرض کیا: یہ خادم قبول فرمائیں۔ جب بھی حضور اکرم ﷺ سفر میں راستے میں اُترتے تو میں آپ کی خدمت کرتا۔ جب حضور اکرم ﷺ کی دور سے جبل اُحد پر نظر پڑتی تو آپ ﷺ فرماتے تھے: یہ وہ پہاڑ ہے جو ہمیں دوست رکھتا ہے اور ہم اسے محبوب رکھتے ہیں۔ اور جب حضور اکرم ﷺ مدینہ آجاتے تو یہ فرماتے تھے: یااللہ! ان دو پہاڑوں کے درمیان جو جگہ ہے میں اس کو حرم قرار دیتا ہوں، جیسا کہ ابراہیم علیہ السلام نے مکہ کو حرم قرار دیا۔ اور فرماتے: اے اللہ! ان کے کیل میں، ان کے مد میں اور ان کے صاع کے اندر برکت عطا فرما۔ حضور اکرم ﷺ یہ بھی فرماتے: اے اللہ! تُو نے جتنی مکہ کے حرم میں برکت رکھی ہے، مدینہ میں اس سے دوگنی عطا فرما۔

محدثین وعلماء نے لکھا ہے کہ ہمارا تجربہ ہے کہ اگر مکہ میں دو کلو سے ایک گھرانے کا گزر ہوتا ہے تو مدینہ میں ایک کلو سے گزارا ہو جاتا ہے، یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ نے واقعی اس کے اندر دوگنی برکتیں رکھی ہیں۔

مکہ ومدینہ کے پہاڑ سرسبز کیوں نہیں؟

مکہ اور مدینہ کے پہاڑ خشک ہیں۔ علماء نے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس بات پر قادر تھے کہ وہ مکہ ومدینہ کے پہاڑوں کو سرسبز بنا دیتے، ان پر باغات اور پھول کھل جاتے، ٹھنڈا موسم بن جاتا، لیکن پروردگار عالم یہ چاہتے ہیں کہ جو میرے گھر میں آئے تو خالص میرے گھر کے لئے آئے، اس کا کوئی دوسرا ارادہ نہ بن سکے۔

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: یہاں کا کانٹے دار درخت بھی نہ کاٹا جائے، یعنی کانٹے دار درخت کو تو کوئی بھی نہیں کاٹتا، ثمر دار درخت کو کاٹتے ہیں، لیکن جب کانٹے دار کا کاٹنا منع ہے تو ثمر دار کا بطریق اولیٰ منع ہو گیا۔

مکہ اور مدینہ میں کون افضل ہے؟

مکہ افضل ہے یا مدینہ افضل ہے؟ مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: جمہور ائمہ کی رائے یہ ہے کہ مکہ افضل ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ اور ان کے ماننے والوں کا یہ عقیدہ ہے کہ مدینہ افضل ہے۔

بعض جاہل لوگ یہ کہہ دیتے ہیں کہ یہ لوگ مدینہ کی فضیلت کو نہیں مانتے۔ مکہ بھی اللہ تعالیٰ کا گھر ہے اور مدینہ میں اللہ کے حبیب اور رسول ﷺ مدفون ہیں۔ علمی اعتبار سے بحث ہے کہ افضلیت کا مرتبہ کس کو ملا ہے؟ جیسا کہ

حضرت آدم علیہ السلام بھی افضل ہیں اور حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی افضل ہیں، لیکن سب سے افضل کون ہیں؟ سب سے افضل محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اب بعض لوگ کہیں گے کہ باپ سے بھی افضل ہیں تو ہم کہیں گے کہ ہاں! کبھی بیٹا باپ سے بڑھ جاتا ہے، اس طرح مدینہ بھی شان والا اور مکہ بھی شان والا ہے، باقی سب سے افضلیت کس کی ہے؟ تو جمہور کی رائے ہے کہ مکہ افضل ہے۔

﴿وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا﴾ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعا مانگی: اے اللہ! اس بلد کو امن والا بنا، اس میں رہنے والوں کو کوئی ڈرائے نہیں اور وہ امن وعزت سے رہیں۔ مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا قبول فرمائی کہ حرم کو عزت کے لحاظ سے بھی امن والا بنایا اور شرف کے لحاظ سے بھی امن والا بنایا۔

اشکال:

کسی کے دماغ میں اب اشکال آرہا ہوگا کہ یہاں تو پولیس والے ہتھیار لے کر کھڑے ہوتے ہیں۔ یہ قرآن و حدیث کے خلاف ہے۔

جواب:

یہ غلط بات ہے۔ حدیث میں جو ہتھیار اُٹھانے سے منع فرمایا گیا ہے، اس کا مطلب ہے کہ فساد کی نیت سے نہ چلے، امن کے لیے جو ہتھیار لے کر پھرے وہ تو اُلٹا ثواب میں آئے گا، تاکہ کوئی ڈاکو ڈاکہ نہ مار سکے اور کوئی چور چوری نہ کر سکے۔

اللہ کی طرف سے مکہ کی آبادی کا انتظام:

﴿هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا﴾ اس پر ''الف لام'' نہیں ہے، آگے ایک جگہ اس جگہ کا ذکر کیا تو وہاں ﴿هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا﴾ فرمایا، اس پر ''الف لام'' ہے۔ اس سے معلوم سے ہوتا ہے کہ ایک کعبہ کے بننے سے پہلے کی دعا ہے اور ایک کعبہ تعمیر ہوجانے کے بعد کی دعا ہے۔ بعد کی دعا میں آپ نے اللہ تعالیٰ سے عرض کی: اے اللہ! اس گھر کو اور اس کے اندر رہنے والوں کو قرار اور امن عطا فرما۔ اور یہ اس وقت کی دعا ہے جب حضرت اسحاق علیہ السلام پیدا ہوگئے تھے تو حضرت اسحاق علیہ السلام، حضرت اسماعیل علیہ السلام سے چھوٹے ہیں۔ اس وجہ سے دعا میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا:



﴿الحمد لله الذي وهب لي على الكبر إسمٰعيل وإسحٰق ۚ إن ربي لسميع الدعاء﴾ [ابراہیم: ۳۹] اے اللہ! تمام شکر ہے کہ مجھے بڑھاپے میں اولاد عطا فرمائی، اسماعیل بھی عطا فرمائے اور اسحاق بھی عطا فرمائے۔

﴿وارزق أهله من الثمرات من آمن منهم بالله واليوم الآخر﴾ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعا مانگی۔ گویا کہ وہ رزق اور نعمتیں مومن کے ساتھ خاص کرنا چاہتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے قرآن نازل فرمایا کہ دنیا کی نعمتیں تو ہم کافروں کو بھی دیتے ہیں، جبکہ آپ جو دعا مانگ رہے ہیں کہ جو مومن ہوں، ان کو رزق ملے۔ کافر بھی تو میری مخلوق ہیں، ان کو بھی میں نے پیدا کیا ہے، ان کو بھی تو میں رزق دوں گا، پھر ہم ان کو جہنم میں ڈالیں گے۔

﴿وإذ يرفع إبرٰهم القواعد من البيت وإسمٰعيل ۖ ربنا تقبل منا ۖ إنك أنت السميع العليم﴾

[البقرۃ: ۱۲۷]

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''القواعد''، قاعدۃ کی جمع ہے، یعنی بنیادیں جن پر عمارت بنائی جاتی ہے۔ ان آیات میں ہمیں یہ سبق مل رہا ہے کہ اگر آدمی اچھے کام کر رہا ہے، نماز پڑھ رہا ہے، روزہ رکھ رہا ہے اور خیرات کر رہا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ سے دعا مانگے: اے اللہ! اس کو قبول فرمالے؛ کیونکہ کوئی نہ کوئی کمی تو ضرور ہوتی ہے، وہ بادشاہوں کے بادشاہ ہیں، انہیں کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے، اگر وہ ساری دنیا کی دعائیں رد کر دیں تو کون پوچھ سکتا ہے؟ اور اگر قبول فرمانے پر آئیں تو ہماری ایک معمولی سی بات بھی قبول فرمالیں۔ اس لئے اس سے سبق ملتا ہے کہ انسان کوئی بھی کام کرے تو اللہ تعالیٰ سے دعا کرے کہ اے اللہ! اس کو قبول فرما، تو ہی ہماری دعاؤں کو سننے والا ہے۔ دوسرا اس سے یہ سبق ملا کہ اچھے کام کے بعد دعائیں جلد قبول ہوتی ہیں۔ اس لئے ترغیب ہے کہ نماز کے بعد دعا کرو، اذان اور اقامت کے درمیان دعا کرو۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت میں ہے کہ سب سے پہلے منطق (چادر اس طرح باندھنا کہ پاؤں کے نشانات مٹ جائیں) بی بی صاحبہ نے اختیار کیا تھا، تاکہ دوسری بی بی کو پتا نہ چلے۔ اس کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے بیٹے کو لے آئے اور گھر کے قریب جہاں زمزم ہے، اس مقام پر اپنے بیٹے اور بیوی کو اُتارا۔

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہ اس زمانہ کی بات ہے جب مکہ میں کوئی بندہ بھی نہیں تھا اور گھر بھی نہیں تھا اور پانی بھی نہیں تھا اور ایک چھوٹی بوری جس میں کھجوریں اور ایک مشکیزہ پانی کا تھا، وہاں رکھ دیا، اس کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام واپس چل پڑے۔ آپ کی بیوی آپ کے پیچھے چلیں اور کہہ رہی تھیں: آپ ہمیں یہاں چھوڑ کر کہاں

جارہے ہیں؟ ایک ایسی وادی میں ہمیں چھوڑ کر جارہے ہیں جہاں کوئی انسان بھی نہیں، کوئی آبادی بھی نہیں ہے۔ بی بی صاحبہ نے یہ بات کئی دفعہ کہی اور حضرت ابراہیم علیہ السلام مڑ کر پیچھے بھی نہیں دیکھ رہے تھے۔ بی بی نے پوچھا: کیا یہ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے؟ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: ہاں! اللہ تعالیٰ کا حکم ہے۔ بی بی نے کہا: اگر اللہ تعالیٰ کا حکم ہے تو اللہ ہمیں ضائع نہیں فرمائیں گے۔ اس کے بعد بی بی صاحبہ واپس آ گئیں۔ جب حضرت ابراہیم مقامِ ثنیہ پر پہنچے تو رخ قبلہ کی طرف کر کے ہاتھ اُٹھائے اور اللہ تعالیٰ سے دعا فرمائی: ﴿رَبَّنَآ إِنِّيٓ أَسۡكَنتُ مِن ذُرِّيَّتِي بِوَادٍ غَيۡرِ ذِي زَرۡعٍ عِندَ بَيۡتِكَ ٱلۡمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِيُقِيمُواْ ٱلصَّلَوٰةَ فَٱجۡعَلۡ أَفۡـِٔدَةٗ مِّنَ ٱلنَّاسِ تَهۡوِيٓ إِلَيۡهِمۡ وَٱرۡزُقۡهُم مِّنَ ٱلثَّمَرَٰتِ لَعَلَّهُمۡ يَشۡكُرُونَ ۝٣٧﴾ [ابراہیم: ۳۷] بی بی صاحبہ اس مشکیزہ کے پانی سے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو بھی پانی دیتیں اور خود بھی پیتی رہیں۔

جب پانی ختم ہوگیا تو بی بی صاحبہ بھی پیاسی ہوگئیں اور بچہ بھی پیاسا ہوگیا۔ بچہ تڑپنے لگا تو بی بی صاحبہ نے دیکھا کہ قریبی پہاڑ صفا ہے۔ اس پر چڑھیں کہ شاید کوئی پرند کسی جگہ نظر آجائے، کوئی آدمی یا کوئی آبادی نظر آئے، کوئی پانی کا نشان ملے، اللہ تعالیٰ پانی کا کوئی ذریعہ بنادیں۔ بی بی صاحبہ صفا سے اُتریں، وادی کے اندر اُتریں، کپڑے اونچے کیے اور تیز تیز چلیں، تاکہ اونچائی پر چڑھوں، تو مروہ پر چڑھیں۔ اس طرح بی بی صاحبہ سات دفعہ صفا اور مروہ کے درمیان دوڑیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے صفا ومروہ کی سعی کو لازمی قرار دیا۔

بی بی صاحبہ جب مروہ پر چڑھیں تو آواز سنی تو اپنے آپ سے کہنے لگیں: کیا ہے؟ یہ آواز کہاں سے آئی ہے؟ اس کے بعد جب دوبارہ آواز آئی تو فرمایا: کون ہے جو آواز دے رہا ہے؟ تمہارے پاس کوئی مدد کا ذریعہ ہے تو ہماری مدد کرو۔ تم ایسے آواز دے رہے ہو اور نظر نہیں آتے ہو۔ دیکھا اللہ تعالیٰ نے ایک فرشتہ جہاں حضرت اسماعیل علیہ السلام کی ایڑیاں تھیں وہاں اپنا پر مارا تو وہاں سے اللہ تعالیٰ نے پانی ظاہر فرمادیا۔ بی بی صاحبہ اس پانی کو روکنے اور بھرنے لگیں، لیکن نیچے سے پانی اور نکل آتا تھا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ اسماعیل علیہ السلام کی والدہ پر رحمت فرمائے، اگر وہ پانی نہ روکتیں تو اللہ تعالیٰ اس کو جاری ہونے والا چشمہ بنادیتے۔

اس کے بعد اس فرشتے نے کہا: بی بی! مت گھبرائیں، یہاں اللہ تعالیٰ کا ایک گھر ہے، یہی لڑکا بڑا ہو کر اور اس کا ابا اس گھر کو بنائیں گے اور اللہ تبارک وتعالیٰ اس کو ضائع نہیں کریں، ان کی حفاظت فرمائیں گے، آپ فکر نہ کریں۔

کعبۃ اللہ اس وقت ایک ٹیلہ کی شکل میں تھا، جب بارشوں کی وجہ سے سیلاب آتا تو پانی اس سے اِدھر اُدھر بہہ

جاتا اور یہ جگہ باقی رہتی تھی۔

کعبہ کے قریب قبیلہ جرہم کا پڑاؤ:

اس کے بعد قبیلہ جرہم کے لوگوں نے اسفل مکہ کداء کے مقام پر اتر کر دیکھا کہ وہاں پرندہ اڑ رہا ہے۔ یہ علامت ہوتی تھی کہ پرندہ کسی پانی والی جگہ پر ہی ہوگا۔ انہوں نے کہا کہ لازمی بات ہے کہ یہ پرندہ کسی پانی کے چکر لگا رہا ہے۔ ہمیں تو ایک زمانہ گزر گیا، لیکن ہم نے کبھی اس وادی میں پرندہ نہیں دیکھا۔ الغرض انہوں نے ڈول کھینچنے والوں کو بھیجا، انہوں نے پانی دیکھا۔ بی بی صاحبہ بھی وہاں موجود تھیں، وہ ان کے پاس آئے اور کہا: اگر آپ اجازت دیں تو ہم اس پانی کے قریب اپنا پڑاؤ ڈال دیں۔ بی بی صاحبہ نے کہا: رہنے سے کوئی منع نہیں، لیکن پانی پر تمہاری ملکیت نہیں ہوگی۔ انہوں نے کہا: ٹھیک ہے۔ اور سب آکر وہیں ٹھہر گئے۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام کی پہلی شادی اور ابراہیم علیہ السلام کی ملاقات کا واقعہ:

حضرت اسماعیل علیہ السلام بھی جوان ہونے لگے تو قبیلہ جرہم سے انہوں نے عربی سیکھی۔ جب حضرت اسماعیل علیہ السلام جوان ہوئے تو بڑے خوبصورت تھے، قبیلہ جرہم کے لوگوں نے اپنے قبیلے کی ایک عورت سے آپ کی شادی کر دی۔ اُمّ اسماعیل فوت ہوگئیں (اور حطیم میں مدفون ہیں)۔

مدتوں کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام آئے، تاکہ اپنے بچوں کی خبر معلوم کریں۔ جب آپ آئے تو اس وقت حضرت اسماعیل علیہ السلام اپنے گھر میں نہیں تھے، آپ کی بیوی موجود تھیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس سے پوچھا کہ اسماعیل کہاں ہیں؟ اس نے کہا: وہ شکار کرنے گئے ہیں، تاکہ کچھ کھا سکیں۔ ان کی بیوی نے کہا: ہم بڑے برے حال میں ہیں، بس ایک پانی ہے یا کوئی پرندہ کھا لیا، اور تو کوئی چیز ملتی نہیں ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: اچھا! میں تو جا رہا ہوں، لیکن جب تیرا خاوند آجائے تو ان کو کہنا کہ ایک بزرگ آئے تھے، آپ کو سلام کہتے تھے اور یہ بھی کہتے تھے کہ اپنے دروازے کی چوکھٹ بدل ڈالو۔ نبی کے گھر میں ایسی عورت کیسے زیب دے سکتی ہے جو اللہ کا شکر نہ کرے؟ جب حضرت اسماعیل علیہ السلام آئے تو ان کو بھی لگا کہ گھر میں کوئی آیا ہے۔ اس لیے آپ نے پوچھا کہ گھر میں کوئی آیا تھا؟ ان کی بیوی نے کہا: ایک بزرگ آئے تھے اور ان کی ایسے ایسے شکل تھی، انہوں نے آپ کے بارے میں پوچھا تو میں نے بتا دیا۔ انہوں نے پوچھا کہ تمہارا گزر اوقات کیسے ہے؟ میں نے ان کو بتایا کہ ہم تو بڑی تنگی



میں ہیں۔آپ نے فرمایا: پھر انہوں نے کچھ حکم بھی دیا؟ ان کی بیوی نے کہا: انہوں نے آپ کو سلام کہا تھا اور کہا تھا کہ دروازے کی چوکھٹ بدل ڈالو۔حضرت اسماعیل علیہ السلام نے فرمایا: وہ آنے والے میرے ابا ابراہیم علیہ السلام تھے اور وہ مجھے حکم دے گئے ہیں کہ میں تجھے چھوڑ دوں۔ چنانچہ اسماعیل علیہ السلام نے اس عورت کو طلاق دے دی۔

اس کے بعد حضرت اسماعیل علیہ السلام نے دوسری شادی کرلی۔ پھر دوبارہ حضرت ابراہیم علیہ السلام آئے، انہوں نے اسماعیل علیہ السلام کی بیوی سے پوچھا کہ تمہارا کیا حال ہے؟ بیوی نے کہا: ہم تو بڑے مزے میں ہیں، اللہ تعالیٰ کا شکر ہے۔حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: تم کیا کھاتے ہو؟ اس نے کہا: گوشت کھاتے ہیں۔ پوچھا: تمہارا پینا کیا ہے؟ کہا: پانی ہے۔آپ نے دعا فرمائی: اے اللہ! ان کے گوشت اور پانی میں برکت دے......حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس زمانے میں دانے تو نہیں ہوتے تھے، اگر ہوتے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام اس کے لیے بھی دعا فرمادیتے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا کی برکت ہے کہ آدمی مکہ میں جتنا گوشت کھاتا ہے، اس کو نقصان نہیں دیتا۔ورنہ اگر اتنا گوشت دوسری جگہ کھائے تو کبھی اس کے موافق نہ آئے اور کوئی نہ کوئی نقصان ہو جائے......حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کی بیوی سے فرمایا: جب تمہارے خاوند آئیں تو ان کو میرا اسلام کہنا اور یہ بھی کہنا کہ اپنے گھر کے دروازے کی چوکھٹ کو ثابت قدم رکھو۔اتنا کہہ کر آپ چلے گئے۔ جب اسماعیل علیہ السلام آئے تو پوچھا: کچھ لوگ آئے تھے؟ بیوی نے کہا: بڑے خوبصورت چہرے والے ایک بزرگ آئے تھے۔آپ نے فرمایا: وہ میرے ابا تھے اور دروازے کی چوکھٹ تم ہو۔وہ مجھے حکم دے گئے ہیں کہ میں تمہیں اپنے نکاح میں برقرار رکھوں۔

کچھ مدت بعد زمزم کے چشمے کے قریب حضرت اسماعیل علیہ السلام اپنے تیروں کو ٹھیک کر رہے تھے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام تشریف لے آئے۔ جب حضرت اسماعیل علیہ السلام کو دیکھا، اُٹھے اور ایک دوسرے کو ملے، جیسا کہ باپ بیٹا ملتے ہیں۔حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: بیٹا! اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم دیا ہے۔حضرت اسماعیل علیہ السلام نے عرض کیا: جو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے، اس کو پورا کریں۔حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا کہ کیا تم میری مدد کرو گے؟ کہا: میں آپ کی مدد کروں گا۔فرمایا: اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ یہاں گھر بناؤ۔ یہ جو ٹیلہ ہے، اس جگہ اللہ تعالیٰ کا گھر بنانا ہے۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام پتھر اُٹھا کر لا رہے ہیں اور حضرت ابراہیم علیہ السلام تعمیر کر رہے ہیں۔ جب بنیادیں بن گئیں تو (مقامِ ابراہیم والے) پتھر کو لا رہے ہیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام اس پر کھڑے ہو گئے۔حضرت اسماعیل علیہ السلام پتھر

دیتے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام لگاتے تھے اور دونوں اس وقت دعائیں بھی مانگ رہے تھے: ﴿رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ۖ إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ﴾ [البقرۃ: ۱۲۷]

ایک روایت میں ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام مکہ میں آئے تو جس جگہ اللہ تعالیٰ کا کعبہ ہے، یہاں ایک بدلی دیکھی۔ اس سے آواز آئی کہ اے ابراہیم! جہاں سایہ ہے وہاں نشان لگا کر اللہ کا گھر بناؤ، نہ بڑھاؤ اور نہ گھٹاؤ۔ اس روایت میں ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اللہ تعالیٰ کا گھر ہی بنانے آئے تھے۔ جب اللہ تعالیٰ کا گھر بنا تو بیوی اور بیٹے کو چھوڑ گئے۔ اور پہلی روایت میں پڑھا کہ پہلے بیوی کو چھوڑ گئے، پھر بعد میں اللہ کا کعبہ بنایا۔ پہلی روایات صحیح ہیں، ان کو امام بخاری رحمہ اللہ نے ترجیح دی ہے۔ مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ان دونوں اقوال جو اس طرح جمع کیا جا سکتا ہے کہ پہلے آپ نے پتھر پر رکھ کر نشان بنا لیا اور باقی عمارت بعد میں آکر بنائی۔

ایک آدمی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں آیا اور پوچھا: یہ خانہ کعبہ پہلا گھر ہے جو زمین پر مکرر کیا گیا؟ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: برکت کے اعتبار سے یہ پہلا گھر ہے اور میں تجھے بتاؤں، واقعہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حکم دیا کہ جا کر میرا گھر بنائیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو تنگی ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے سکینت اُتاری، جو ایک ہوا کی شکل میں تھی اور اس کے دو سر بھی تھے، وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس آکر اس گھر کے اوپر کھڑی ہو گئی کہ جہاں سایہ ہے، اس جگہ بناؤ۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام تعمیر کر رہے تھے حجر اسود والی جگہ باقی تھی۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام تلاش کرنے کے لیے گئے۔ جب واپس آئے تو دیکھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام حجر اسود اس مقام پر لگا چکے تھے۔ انہوں نے پوچھا: ابا جان! میں تلاش کرتا رہا، مجھے تو نہیں ملا۔ انہوں نے کہا: یہ میرے پاس جبرائیل علیہ السلام لائے ہیں۔

قاعدہ ہے کہ جو واقعات ہزاروں سال قبل پیش آئے ہیں، ان میں محدثین، مفسرین کو جتنی زیادہ معلومات مل سکیں، وہ سب جمع کر دی ہیں، تاکہ آدمی کو کامل معلومات مل جائیں۔ باقی جتنی صحیح روایات میں ہوں، ان کو آدمی لے لے اور جتنی غلط ہوں، ان کو چھوڑ دے۔

حضرت کعب الاحبار سے روایت ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے پانی پیدا فرمایا تو زمین، پانی کے اوپر جھاگ جیسی تھی، اسی جگہ سے زمین کو بچھایا اور پھیلایا گیا۔

کعبہ کے بناء کے پتھر بڑے بڑے تھے:

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ارمینیہ سے کعبہ شریف بنانے کے لئے یہاں تشریف لے آئے تو آپ کے ساتھ سکینہ (بادل کا ٹکڑا) بھی آیا، جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بتاتا تھا کہ اس جگہ اللہ تعالیٰ کا گھر بناؤ، جیسا کہ عنکبوت (مکڑی) اپنا جال بناتی ہے۔ جب آپ نے اس جگہ کو کھولا تو ایسے بڑے بڑے پتھر پائے گئے کہ ایک پتھر کو تیس تیس آدمی اُٹھا سکتے تھے۔ راوی کہتے ہیں کہ میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ قرآن میں تو آیا ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام اس کی تعمیر کر رہے تھے، جبکہ آپ فرمار ہے ہیں کہ اس کا ایک ایک پتھر اتنا بھاری تھا کہ اس کو تیس آدمی بھی نہیں اُٹھا سکتے تھے؟ آپ نے فرمایا: یہ تو بعد کی تعمیر ہے، لیکن جو پہلے تعمیر تھی، اس کے پتھر اتنے بڑے تھے۔ یا پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء کے لئے پتھروں کا معجزۃً اُٹھانا آسان کر دیا ہو تو کوئی بعید بات نہیں ہے۔

کعبہ کی جگہ کا تعین کیسے ہوا؟

حضرت سدی رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کو حکم دیا کہ میرا گھر بناؤ طائفین کے لیے، رہنے والوں کے لئے اور نماز پڑھنے والوں کے لئے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام چل پڑے۔ جب مکہ آئے تو آپ نے پھاوڑا (کَسّی) ساتھ لیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام دونوں کو علم نہیں تھا کہ اللہ کے گھر کا طول وعرض کتنا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے ایک ہوا بھیجی، اس کا نام خجوج تھا، اس کے دو پَر اور ایک سر تھا۔ سانپ کی شکل میں وہ آئی اور اس نے آ کر وہ جگہ بتائی کہ جہاں آج کعبۃ اللہ کی بنیاد ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام نے اپنے اوزاروں کے ساتھ وہاں کھدائی شروع کی، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کے گھر کی بنیادیں کھودی گئیں، اس کی دیواریں اُٹھالیں اور اس مقام پر پہنچ گئے جہاں حجر اسود نصب کیا گیا ہے۔

اسماعیل علیہ السلام کو حجر اسود کی تلاش کا حکم:

جب حجر اسود کی جگہ دیواریں تعمیر کر لیں تو انہوں نے حضرت اسماعیل علیہ السلام سے فرمایا: جا کر کوئی خوبصورت پتھر لے آؤ۔ انہوں نے کہا: اب مجھ میں جانے کی ہمت نہیں ہے۔ آپ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کا حکم ہے، اس کو پورا کرنا ہے، تم جا کر تلاش کرو۔ جب حضرت اسماعیل علیہ السلام تلاش کرنے کے لیے نکلے تو اتنی دیر میں حضرت جبرائیل علیہ السلام

حجر اسود ہندوستان سے لے آئے۔ حجر اسود کو اصل میں جنت سے اُتارا گیا تھا۔ اس کے اندر سفیدی تھی، لوگوں کے ہاتھ لگانے اور ان کے گناہوں کی وجہ سے سیاہی آگئی، ورنہ یہ بے حد روشن تھا۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام آئے اور دیکھا کہ بڑا خوبصورت پتھر لگ گیا ہے۔ انہوں نے پوچھا کہ یہ کون لے کر آیا ہے؟ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: وہ لے آیا ہے جو بہت زیادہ نشاط والا ہے، اس کو تھکن نہیں ہوتی۔

کعبہ کی بنیادیں:

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ان روایات کو اگر سامنے رکھیں تو یہ بات سمجھ آتی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے پہلے بھی کعبہ کی بنیاد موجود تھی۔ حضرت عبدالرزاق کی روایت میں ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو زمین پر اُتارا تو ان کو اتنا طول عطا فرما دیا کہ آپ کا سر آسمانوں میں تھا اور پاؤں زمین میں تھے، آپ ملائکہ کی دعائیں اور ان کی تسبیحات سنتے تھے تو آپ کو تسلی اور اطمینان رہتا تھا، لیکن ملائکہ پر ایک قسم کی ہیبت اور خوف طاری رہتا تھا۔ انہوں نے اللہ تبارک وتعالیٰ سے دعا مانگی کہ ہمارے اس خوف کو زائل کر دیں۔ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کے قد کو کم کر دیا، جس کی وجہ سے فرشتوں کا ذکر نہیں سن سکتے تھے۔ اب آدم علیہ السلام اُداس ہو گئے کہ دنیا میں اکیلے ہیں اور کسی سے بات نہیں ہے۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ اب میں اکیلا ہوں تو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ میرے گھر کی طرف آؤ اور وہاں آکر میرا گھر بناؤ۔ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو ساٹھ ہاتھ کا اتنا بڑا قد عطا فرمایا تھا کہ بہت جلد زمین کا فاصلہ طے کر لیتے تھے۔ اس طرح آپ چلتے چلتے مکہ مکرمہ تشریف لے آئے اور اللہ کے گھر کی تعمیر فرمائی۔ اللہ تعالیٰ نے جنت سے ایک یاقوت بھی اُتارا جو اس گھر میں رکھا گیا۔ حضرت آدم علیہ السلام کے زمانہ سے اس گھر کا طواف ہوتا رہا، حتیٰ کہ جب طوفانِ نوح آیا تو یہ گھر بہہ گیا اور اس میں حجر اسود بھی بہہ گیا، وہاں ایک ٹیلہ سا رہ گیا، پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حکم دیا اور انہوں نے کعبہ بنایا۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا: میری قوم نے کعبۃ اللہ کو چھوٹا کر دیا، بنائے ابراہیمی پر نہیں رکھا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا: آپ پھر بنائے ابراہیمی پر کعبہ بنا دیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"لَوْلَا حَدَاثَةُ عَهْدِ قَوْمِكِ بِالْكُفْرِ لَنَقَضْتُ الْكَعْبَةَ، وَ لَجَعَلْتُهَا عَلَى أُسَاسِ إِبْرَاهِيمَ، فَإِنَّ قُرَيْشًا حِينَ بَنَتِ الْبَيْتَ اسْتَقْصَرَتْ، وَ لَجَعَلْتُ لَهَا خَلْفًا." [صحیح مسلم، رقم: ۳۲۳۳]

یعنی تیری قوم ابھی نئی نئی اسلام میں آ رہی ہے، اگر میں نے کعبۃ اللہ کو توڑ کر ردّ و بدل کیا تو ان کے لیے فتنہ اور امتحان نہ بن جائے، لوگ کہنے لگ جائیں کہ دیکھو! اللہ تعالیٰ کے نبی نے کعبہ توڑ دیا۔ اس لیے علماء اور فقہاء نے لکھا ہے کہ بعض اوقات ایک مسئلہ صحیح ہوتا ہے، لیکن بیان کرنے میں فتنہ کا اندیشہ ہو تو آدمی بیان نہ کرے، بلکہ چپ کر جائے اور آہستہ آہستہ لوگوں کو سمجھانے کی کوشش کرے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے یہ بھی روایت ہے کہ تیری قوم ابھی جاہلیت سے نکل کر اسلام میں آ رہی ہے، اگر ایسی بات نہ ہوتی تو اللہ کے کعبہ کے اندر جو خزانہ ہے، اس کو میں اللہ تعالیٰ کے راستے میں لٹا دیتا...... پہلے زمانہ کے اندر کعبہ شریف کے اندر کنویں کی طرح ایک جگہ بنی ہوئی تھی، جو لوگ صدقہ کرتے تھے تو درہم، دینار، سونا، چاندی اس میں ڈال دیتے تھے، اس طرح خزانہ جمع ہوتا رہتا تھا...... لیکن لوگ ابھی نئے نئے اسلام میں آئے ہیں، اعتراض کریں گے اور پھر سے کفر میں مبتلا نہ ہو جائیں۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ بھی میرا ارادہ ہے کہ میں کعبۃ اللہ کو بنائے ابراہیم پر بناؤں کہ حطیم کا حصہ بھی اندر داخل کر دوں اور کعبۃ اللہ کا دروازہ زمین پر رکھوں۔

حضرت اسود رضی اللہ عنہ سے حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا آپ سے بڑی راز کی باتیں کہتی تھیں، بتاؤ انہوں نے کعبہ کے بارے میں کیا فرمایا؟ انہوں نے کہا کہ آپ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارادہ تھا کہ اس کے دو دروازے رکھے جائیں اور دونوں دروازے زمین پر ہوں، تاکہ لوگ ایک دروازے سے داخل ہوں اور دوسرے دروازے سے آسانی سے نکل جائیں۔

اب آگے ان روایات و واقعات کا بیان ہے۔ قریش نے جو کعبۃ اللہ کی تعمیر کی تھی، اس کا ذکر ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے ساتھ مل کر کعبہ کے پتھر بھی اُٹھائے ہیں، اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر پینتیس سال تھی...... اللہ تعالیٰ کے آپ پر کروڑوں صلوٰۃ و سلام ہوں...... جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر پینتیس سال تھی، قریش اکٹھے ہوئے، تاکہ اللہ تعالیٰ کے کعبہ کو بنائیں اور اس کے اوپر چھت بھی ڈالیں؛ کیونکہ پہلے چھت بھی نہیں تھی۔ لیکن وہ ڈرتے تھے کہ اس کو کیسے توڑیں!؟ اس وقت انسان کے قد کے برابر دیواریں تھیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس زمانے میں کسی نے اللہ کے کعبہ کے خزانے سے مال چوری کر لیا تھا، اس لیے انہوں نے سوچا کہ اس طرح تو کوئی بھی دیوار پھلانگ کر چوری کر لیتا ہے تو یہ چوری کرنے والا دویک تھا جو بنو ملیح کا غلام تھا جو قبیلہ خزاعہ کی شاخ تھا۔ وہ پکڑا گیا تو قریش نے اس کا ہاتھ کاٹ دیا۔ حالانکہ اس وقت اسلامی قوانین نازل نہیں ہوئے تھے، لیکن قریش کو بھی سمجھ تھی کہ

جو ہاتھ اتنا لمبا ہو جائے کہ جو اپنے گھر کی بجائے دوسرے کے گھر میں داخل ہو جائے، اپنی جیب کی بجائے دوسرے کی جیب میں داخل ہو جائے تو اس کو چھوٹا کر دو، تا کہ اپنی حد پر آ جائے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ اصل وجہ یہ تھی کہ چوری تو کسی اور نے کی تھی اور چوری کے بعد وہ دو یک کے پاس چھوڑ آئے۔ تجار روم میں سے کوئی تاجر تھا، اس کا کشتی پر سامان جا رہا تھا، دریا میں جوش آیا تو اس طوفان نے اس کشتی کو جدہ کے کنارے پٹخ ڈالا، وہ کشتی ٹوٹ پھوٹ گئی۔ قریش مکہ نے اس کشتی کی لکڑی خریدی، تا کہ کعبۃ اللہ کی چھت ڈالی جائے۔ مکہ میں قبط کے علاقہ کا ایک ترکھان بھی تھا، اس کو تیار کیا گیا کہ ان لکڑیوں کو ٹھیک کرے۔

کعبۃ اللہ کے خزانے کے اندر ہر دن ایک سانپ نکل آتا تھا، وہاں رہتا اور چکر لگاتا تھا اور کبھی کبھی وہ کعبہ کی دیوار کے اوپر چڑھ جاتا تھا۔ قریش اس کو دیکھ کر ڈرتے تھے۔ اگر کوئی آدمی اس کے قریب جانے کی کوشش کرتا یا خزانے کے قریب جانے کی کوشش کرتا تو وہ سانپ اپنا منہ کھولتا اور اس پر حملہ کرتا۔ قریش نے ایک دن دیکھا کہ وہ سانپ اللہ کے کعبہ کی دیوار پر بیٹھا ہے، اللہ نے ایک بڑا پرندہ بھیجا، وہ سانپ کو اُٹھا کر لے گیا۔ قریش کہنے لگے: معلوم ہوتا ہے کہ اللہ راضی ہو گیا ہے ہم جو کعبہ بنانا چاہتے ہیں، ہمارے پاس ایک ترکھان بھی ہے اور ہمارے پاس لکڑی بھی جمع ہے اور اللہ تعالیٰ نے سانپ کو بھی ہٹا دیا ہے۔ یہ ساری اس بات کی علامات ہیں کہ اب ہم اللہ کا کعبہ بنائیں۔

جب انہوں نے تیاری کر لی کہ کعبۃ اللہ کی دیوار کو گرانے کے بعد بنائیں تو ابو وہب بن عمرو بن عائذ بن عبد بن عمران بن مخزوم کا ایک آدمی تھا، اس نے کعبہ شریف کا ایک پتھر اُٹھایا تو پتھر اس کے ہاتھ سے نکل کر وہاں لگ گیا جہاں سے اس نے اُٹھایا تھا۔ اس نے کہا: قریشیو! ٹھہر جاؤ، پہلے تم یہ فیصلہ کر لو کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے کعبہ میں کوئی حرام کا پیسہ نہیں لگاؤ گے، خالص حلال کا پیسہ لگاؤ گے، ورنہ تم کعبہ نہیں بنا سکتے۔ انہوں نے کہا: یہ بات ٹھیک ہے۔

جب کعبۃ اللہ کو بنانے کے لیے قریش جمع ہوئے تو انہوں نے کہا کہ کعبۃ اللہ کو بنانے کے لیے سب قبائل کو تقسیم کر لو، تا کہ سب شریک ہو جائیں۔ دروازے والی جانب بنو عبد مناف اور زہرہ کے حصہ میں آئی، حجر اسود سے لیکر رکن یمانی تک بنو مخزوم اور قریش کے دیگر قبائل کے حصے میں آئی، کعبہ کی پشت بنو جمح اور بنو سہم کے حصہ میں آئی، حطیم والی دیوار بنو عبد الدار بن قصی اور بنو اسد بن عبد العزیٰ بن قصی اور بنو عدی بن کعب بن لوی کے حصہ میں آئی۔

اب لوگ ڈرے کہ اللہ کے کعبہ کو کیسے گرائیں؟ ولید بن مغیرہ کہنے لگا: میں ابتداء کرتا ہوں۔ تاریخ مکہ میں ہے کہ ولید بن مغیرہ جب توڑنے کے لیے کھڑا ہوا تو اس نے کہا: اے اللہ! ہمیں ڈرانا نہیں، یا اللہ! ہم بھلائی کا کام کرنا

چاہتے ہیں، تُو جانتا ہے کہ ہم تیرا گھر بنانا چاہتے ہیں، ورنہ ہمارا کوئی توہین کا ارادہ نہیں ہے۔ اور اس نے رکنین کی جانب سے توڑا اور کہا: اب رات کا انتظار کرو، اگر رات کو کوئی عذاب آ گیا تو پھر ہم کعبہ کو نہیں توڑیں گے، جو توڑا ہے اس کو پھر بنا دیں گے اور اگر عذاب نہ آیا تو ہم سمجھیں گے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے کعبہ کے بنانے پر راضی ہے۔

دوسرے دن پھر تیار ہو کر آ گیا۔ لوگوں نے دیکھ لیا کہ اس کو کچھ نہیں ہوا تو لوگ بھی اس کے ساتھ مل گئے کہ ہم بھی توڑتے ہیں اور اس کو بناتے ہیں۔ توڑتے توڑتے وہ اس بنیاد پر پہنچے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے رکھی تھی۔ دیکھا کہ سبز رنگ کے پتھر ہیں جیسے انہوں نے ایک دوسرے کو پکڑا ہوا ہے۔

بعض لوگوں نے یہ روایت کی کہ ایک آدمی نے لوہے کا کدال اس پر مارا، تاکہ پتھر علیحدہ ہو جائیں تو پورا مکہ ہل گیا، وہ ڈر گئے اور انہوں نے کہا: اب اس میں اور کچھ نہ کرو۔ پھر انہوں نے اس سے نیچے جانے کی کوشش نہیں کی۔ قریش کے سب قبائل نے علیحدہ علیحدہ پتھر اکٹھے کیے اور بنیادیں تعمیر کرتے رہے۔

جب حجر اسود کے مقام پر آ گئے تو حجر اسود کے لگانے میں اختلاف ہو گیا، ہر قبیلہ کی خواہش تھی کہ میں لگاؤں، تاکہ قیامت تک میرا نام زندہ رہے۔ اس کا نتیجہ لڑائی تک آ گیا کہ جو جیت جائے گا وہی حجر اسود کو رکھے گا۔ بنو عبد الدار نے ایک بڑا تھال خون کا بھرا اور بنو عدی بن کعب بن لوی کو بلایا کہ آ کر اس خون میں ہاتھ ڈال کر وعدہ کرو کہ ہم مر جائیں گے، لیکن حجر اسود کو ہم رکھیں گے۔ چار پانچ راتوں تک یہ جھگڑا چلتا رہا، پانچ راتوں کے بعد مسجد الحرام میں اکٹھے ہوئے اور مشورہ کیا کہ اس وقت ان سب سے عمر میں بڑا ابواُمیہ بن المغیرہ بن عبداللہ بن عمر بن مخذوم تھا، جو اُن میں سب سے بڑی عمر کا تھا، اس نے کہا: اے بنو قریش! لڑائی نہ کرو، اس دروازے سے جو آدمی سب سے پہلے داخل ہوگا، اس کو تم اپنا حاکم بنا لو، وہ جو فیصلہ کرے اس کو تم قبول کر لینا۔

چنانچہ سب سے پہلے جو داخل ہوئے، وہ سیدنا محمد مصطفیٰ ﷺ تھے۔ جب قریش نے آپ ﷺ کو دیکھا تو سارے خوش ہو گئے اور کہا: یہ امانت والا ہے، اس کے فیصلے پر ہم سب راضی ہیں۔ اس طرح انہوں نے حضور اکرم ﷺ کو فیصل بنا لیا۔ حضور اکرم ﷺ نے ان سے فرمایا: ایک کپڑا لے آؤ۔ وہ کپڑا لے آئے تو حضور اکرم ﷺ نے اپنے ہاتھ مبارک سے حجر اسود کو اس کپڑے میں رکھا اور فرمایا: جتنے قبیلے والے سردار ہیں، وہ سب کپڑے کو پکڑ لیں اور اس کو لے چلیں۔ سب قبیلے والوں نے پکڑ لیا اور کعبۃ اللہ کے قریب آ گئے تو حضور اکرم ﷺ نے اپنے ہاتھ سے حجر اسود کو اُٹھا کر وہاں لگا دیا، جہاں آج موجود ہے۔ وحی اُترنے سے پہلے قریش، آپ ﷺ کو

امین کہتے تھے۔ جب آپ ﷺ نے ان کو دین کی دعوت دی تو پھر دشمنی پر اُتر آئے۔

کعبۃ اللہ کو بنانے کے وقت جو سانپ کا واقعہ پیش آیا اور جو حالات پیش آئے، اس کے بارے میں حضرت زبیر بن عبدالمطلب نے ایک قصیدہ لکھا تھا:

عَجِبْتُ لِمَا تَصَوَّبَتِ الْعُقَابُ
إِلَى الثُّعْبَانِ وَ هِيَ لَهَا اضْطِرَابُ
وَ قَدْ كَانَتْ يَكُوْنُ لَهَا كَشِيْشٌ
وَ أَحْيَانًا يَكُوْنُ لَهَا وِثَابُ
إِذَا قُمْنَا إِلَى التَّأْسِيْسِ شَدَّتْ
تُهَيِّبُنَا الْبِنَاءَ وَ قَدْ تُهَابُ
فَلَمَّا أَنْ خَشِيْنَا الزَّجْرَ جَاءَتْ
عُقَابٌ تَتْلَئِبُّ لَهَا انْصِبَابُ

(اس قصیدے کے مزید چھ اشعار بھی مفسرین نے کرام نے اپنی تفاسیر میں شامل کیے ہیں۔ انور)

میں نے اس وقت بہت تعجب کیا تھا جب عقاب نے آکر اس سانپ کو اُٹھالیا اور وہ تڑپ رہا تھا، حالانکہ وہ اس سے پہلے دانت پیستا تھا اور لوگوں کی طرف جھپٹتا تھا اور جب ہم کعبہ کو بنانے کا ارادہ کرتے تھے تو وہ ہمیں ڈراتا تھا۔ جب ہم اس سے ڈر گئے تو اللہ تعالیٰ نے عقاب کو بھیجا، اس نے آکر اس سانپ کو اپنے جبڑوں میں لیا اور اس کو اُٹھا کر لے گیا۔ اب ہمیں کعبہ بنانے میں درمیان میں رکاوٹ باقی نہ رہی۔ اس کے بعد ہم تیار ہو کر اس بناء کی طرف بڑھے، اس کے بعد ہم نے اس کی مٹی، اس کی بنیاد کو ٹھیک کیا، ہم صبح کو آئے اور اس کی بناء میں شریک ہوئے اس عالم میں کہ ہم پر کوئی کپڑا نہیں تھا اور ہم پتھر اُٹھا رہے تھے۔ سب سے بڑا شرف بنولؤی کو ملا، ان کی ایسی بنیاد ہے جو نہ مٹنے والی ہے۔ بنوعدی، بنومرہ اور بنوکلاب سب اس میں شریک تھے، اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس گھر کو بنانے کا ہمیں شرف بخشا اور اللہ تعالیٰ سے ہی ہم اس کے ثواب کی امید کرتے ہیں کہ وہ ہمیں ثواب عطا فرمائیں گے۔

حضور اکرم ﷺ کے زمانہ میں کعبۃ اللہ کی بلندی اٹھارہ ہاتھ تھی اور قباطی کپڑے کا غلاف ڈالا جاتا تھا، اس کے برود کا غلاف ڈالا گیا، ریشم کا غلاف سب سے پہلے حجاج بن یوسف نے ڈالا۔

قریش نے جیسے کعبۃ اللہ کی بناء کی تھی، اسی پر بناء قائم رہی، حتیٰ کہ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے اوّل زمانہ میں جب وہ امیر بنے (اوران کی امارت کے مقابلے میں یزید کی ملک شام میں امارت وحکومت قائم تھی)، اس نے حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہ کے خلاف لڑنے کے لیے مکہ میں فوج بھیجی، جس نے جبل ابوقبیس پر چڑھائی کردی، وہاں سے منجنیق کے ذریعے پتھر پھینکے، جن سے کعبہ شریف کی دیواریں بھی گرگئیں اور کعبہ بھی جل گیا۔ اتنے میں یزیدی لشکر کو یزید کی ہلاکت کی خبر پہنچی تو اس نے جنگ بندی کردی، بلکہ امیر لشکر نے حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہ کے لیے بیعت کا ہاتھ بڑھایا، مگر انہوں نے خدشہ کی بنیاد پر قبول نہ کیا۔

پھر خلیفہ عبدالملک بن مروان کے زمانہ میں حجاج بن یوسف نے حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہ کے خلاف مکہ میں جنگ کی اور حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہ کو شہید کردیا اور ابن زبیر رضی اللہ عنہ کے تعمیر کیے ہوئے کعبے کو شہید کرکے قریش کی تعمیر کے مطابق دوبارہ تعمیر کیا، اب کی تعمیر کعبہ قریش کی تعمیر کے مطابق ہے۔ (انور)

جب ابن الزبیر رضی اللہ عنہ کی حکومت تھی تو انہوں نے پورے کعبۃ اللہ کی عمارت کو گرایا اور پھر اس بناء پر قائم کیا جو سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے کی تھی اور حطیم کے حصے کو کعبۃ اللہ کے اندر داخل کیا اور کعبۃ اللہ کے دو دروازے رکھے: ایک مشرق کی جانب اور دوسرا مغرب کی جانب اور یہ دونوں دروازے زمین کے ساتھ رکھے، جیسا کہ انہوں نے اپنی خالہ بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا سے سنا تھا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ تمنا تھی کہ کعبۃ اللہ کو بنائے ابراہیم پر بنایا جائے۔ اس لئے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تمنا کو پورا کیا۔

جب تک حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ امیر رہے، کعبۃ اللہ کی بناء اسی طرح قائم رہی، پھر حجاج بن یوسف نے آپ کو شہید کیا، عبدالملک بن مروان کی اس وقت حکومت تھی۔ حجاج نے اس سے اجازت لے کر کعبۃ اللہ کو پہلے کی طرح بنادیا۔ خانہ کعبہ کے غلاف کا جو حصہ جل گیا تھا، حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے اسی حالت میں رہنے دیا کہ جب لوگ موسم حج میں آئیں گے اور وہ دیکھیں گے کہ اللہ کے گھر کے ساتھ اس طرح زیادتی ہوئی ہے۔ اس کے بعد حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے خطبہ دیا اور لوگوں کو جمع کرکے کہا کہ اے لوگو! مجھے مشورہ دو کہ میں اللہ کے کعبہ کی پوری عمارت کو گرا کر نئی عمارت بناؤں یا جو عمارت موجود ہے اس کی اصلاح کردوں اور اس کو قائم رہنے دوں؟ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: میری رائے یہ ہے کہ اس کی اصلاح کردو؛ کیونکہ یہ وہ پتھر ہیں جو حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں لگے ہیں اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس عمارت کے بنانے میں شریک تھے۔ اس لیے

اس کو اسی طرح رہنے دو، اس کی اصلاح کر دو۔ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ راضی نہ ہوئے اور فرمایا کہ دیکھو! اگر کسی آدمی کا گھر جل جاتا ہے تو وہ گھر کو توڑ کر از سرِ نو بناتا ہے اور یہ تو اللہ تعالیٰ کا گھر ہے۔ اس کے بعد انہوں نے کہا کہ میں استخارہ کرتا ہوں اور جو اللہ تعالیٰ کو منظور ہوگا اس پر عمل کیا جائے گا۔

جب تین راتیں گزر گئیں تو ان کے ذہن میں یہی بات آئی کہ کعبۃ اللہ کو از سرِ نو تعمیر کیا جائے گا۔ آپ رضی اللہ عنہ نے لوگوں سے کہا، لیکن لوگ اس بات سے ڈرنے لگے کہ ہم اللہ کے کعبہ کو توڑنے میں شریک ہوں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی عذاب آ جائے۔ بہرحال ایک آدمی نے جا کر کعبۃ اللہ کا پتھر توڑا اور لوگ انتظار کرتے رہے۔ جب اس آدمی کو کوئی نقصان نہ ہوا تو لوگوں کو یقین ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ کی رضا اسی میں ہے کہ کعبۃ اللہ کو دوبارہ بنایا جائے۔

سارے لوگوں نے جمع ہو کر کعبۃ اللہ کی بناء کو ختم کر دیا اور زمین تک آ گئے اور اس کے بعد جدید تعمیر کی اور جو ستون کھڑا ہو جاتا، حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ اس پر پردہ لٹکاتے جاتے اور بناتے گئے اور حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا سے سنا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر یہ قوم نئی نئی جاہلیت سے نہ نکلی ہوتی اور میرے پاس کچھ دولت بھی ہوتی تو میں کعبہ کو از سرِ نو بناتا اور حطیم کی طرف جو پانچ ہاتھ کا حصہ ہے، اس کو بھی کعبہ میں داخل کرتا اور دو دروازے رکھتا، تاکہ لوگ ایک دروازے سے داخل ہوں اور دوسرے دروازے سے نکلا کریں۔

حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: الحمدللہ! اب اللہ تعالیٰ نے مجھے اتنا پیسہ بھی دیا ہے کہ میں اس کی عمارت بنا سکتا ہوں اور اب لوگوں کا کوئی ڈر نہیں کہ وہ اس کو غلط سمجھیں۔ چنانچہ انہوں نے حطیم کی جانب کو بنیاد تک کھود کر پانچ ہاتھ کعبہ میں شامل کیے اور کعبہ کا طول اٹھارہ ہاتھ رکھا۔ جب آپ نے دیکھا کہ اونچائی کم ہے تو فرمایا: دس ہاتھ مزید اونچا کیا جائے اور اس کے دو دروازے رکھے۔

جب ابن زبیر رضی اللہ عنہ کو حجاج بن یوسف نے شہید کیا اور اس نے عبدالملک بن مروان کو لکھا کہ کعبۃ اللہ کی موجودہ بناء عبداللہ بن زبیر نے کی ہے، مکہ کے بہت سے عادل اور ثقہ لوگ اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ عبداللہ بن زبیر نے جو حطیم کی جانب بڑھائی ہے اور اساسِ ابراہیمی لوگوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے، اب آپ بتائیں کہ میں کیا کروں؟ اس کو ایسے رہنے دوں یا اس میں ردّ و بدل کر دوں؟ عبدالملک بن مروان نے لکھا کہ ہم عبداللہ بن

زبیر کی بناء کو قائم نہیں رکھنا چاہتے۔ لہٰذا جو اس نے اونچائی کی ہے اس کو ختم کردو اور حطیم والی جانب کو پھر باہر نکال دو۔ تو حجاج بن یوسف نے اس کو قریش والی بناء پر کر دیا۔

سنت یہی بناء تھی، جو عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے کی؛ کیونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہی تمنا تھی کہ کعبۃ اللہ اس طرح بنایا جائے اور یہ بناء ابراہیمی بھی تھی، لیکن شاید عبدالملک بن مروان کو اس حدیث اور اس سنت کی خبر نہ ہوئی ہو۔ اس لئے روایات میں آتا ہے کہ جب دوبارہ اس نے کعبہ بنا دیا تو اس کو بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا والی روایت پہنچی تو اس نے کہا: کاش! ہم اس پر رہنے دیتے، لیکن اب تو ہم نے تبدیلی کر دی ہے۔

روایات میں آتا ہے کہ بادشاہوں نے امام مالک رحمہ اللہ سے پوچھا کہ اب دولت، پیسہ اور ذرائع بہت ہو گئے ہیں، کیا ہم اللہ تعالیٰ کے کعبہ کو دوبارہ تعمیر کریں اور بڑے اعلیٰ انداز میں تعمیر کریں؟ امام مالک رحمہ اللہ نے فرمایا: یہ اللہ تعالیٰ کا گھر ہے، اس کو بادشاہوں کے لئے کھیل نہ بنادو، اس کی جو تعمیر ہے اس کو رہنے دو اور اس کے اندر ہی اللہ تعالیٰ کی حکمتیں ہیں۔

مرمت کی ضرورت تو ہوتی رہے گی، لیکن روزانہ ردّ و بدل نہ کیا جائے۔ اس لئے ہر سال حسب ضرورت کعبۃ اللہ میں ترامیم ہوتی رہتی ہیں، کبھی چھت تبدیل ہوئی، کبھی اس کے شہتیر تبدیل ہوئے، اسی طرح کبھی اندر کچھ چیزوں کی اصلاح کی ضرورت پیش آئی، کبھی دروازہ نیا لگا دیا گیا۔ ترمیم اور اصلاح کا سلسلہ الحمدللہ! ہر دور میں رہا، لیکن جہاں تک بناء کا تعلق ہے تو پہلے بناء ابراہیم تھی، اس کے بعد بناء قریش تھی، اس کے بعد بناء عبداللہ بن زبیر تھی، اس کے بعد عبدالملک بن مروان کے حکم سے اسی طرح ہو گئی جیسا کہ قریش کے زمانہ میں تھی۔ اللہ کو یہی منظور تھا اور یہی بناء آخر تک رہے گی، حتیٰ کہ وہ وقت آئے گا جس کے بارے میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"یُخَرِّبُ الْكَعْبَةَ ذُو السُّوَيْقَتَيْنِ مِنَ الْحَبَشَةِ." [صحیح بخاری، رقم:۱۵۹۱]

دو باریک پنڈلیوں والا، حبشہ کے علاقہ کا سیاہ فام ایک بادشاہ ہوگا، اس کی زبان ایسی ہوگی جو سمجھ میں نہ آنے والی ہوگی، وہ آکر اللہ کے اس کعبہ کو گرائے گا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: گویا وہ منظر میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں جو کعبہ کو پتھر پتھر کر کے گرا دے گا۔

والد کے ایمان کے سوا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سب دعائیں قبول:

﴿رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ أُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ وَأَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا ۚ إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ

الرَّحِيْمُ ﴿١٢٨﴾ [البقرة:١٢٨]

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بنائے کعبہ کے وقت جو دعائیں مانگی تھیں، ان کا بیان ہو رہا ہے۔ قرآن مقدس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جتنی دعائیں اللہ تعالیٰ سے مانگیں، اللہ تعالیٰ نے ان کو قبول فرمایا۔ صرف ایک دعا کے بارے میں آتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے منظور نہیں فرمائی، وہ یہ کہ ابراہیم علیہ السلام نے اپنے والد کے لئے ایک وقت تک بخشش مانگی، لیکن جب اس کی موت کفر و شرک پر آگئی اس کے بعد دعا کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے لئے دائمی جہنم ہے، اس کی نجات کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا تو دعا سے روک دیئے گئے اور اس کے اندر اللہ تعالیٰ کی کروڑوں حکمتیں ہیں۔ کسی کے دل کو پھیر دینا میرے اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔

مسند احمد میں ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بنو آدم کے دل اللہ کی انگلیوں کے درمیان ہیں، وہ جدھر چاہیں پھیر دیں، چاہیں تو ہدایت دے دیں یا ہدایت نہ دیں۔ اگر اللہ تعالیٰ چاہتے تو ابراہیم علیہ السلام کے ابا آزر کو بھی ہدایت دے سکتے تھے، لیکن اس کے اندر حکمتیں ہیں:

ایک تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر کے فیصلے کبھی بدلا نہیں کرتے، اللہ تعالیٰ کی تقدیر جب یہ فیصلہ کر چکی تھی کہ آزر کی موت کفر و شرک پر ہوگی تو اب اس میں تبدیلی کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ جس تقدیر کے بدلنے کے بارے میں باتیں آتی ہیں، وہ دراصل لوحِ محفوظ میں شرط کے ساتھ معلق ہوتی ہیں کہ اگر میرے بندے نے یہ کام کیا تو میں دوں گا اور اگر یہ کام نہ کیا تو نہیں دوں گا۔

دوسرا سبق اللہ تعالیٰ نے یہ دیا کہ کسی کا ایمان یا کفر میرے ہاتھ میں ہے کہ ابراہیم نے شرک مٹا ڈالا، لیکن اپنے ابا آزر کو ہدایت نہ دے سکے۔ اس لئے اللہ پاک نے ایک فیصلہ فرما دیا کہ ہدایت میرے ذمہ ہے، انبیاء کے ذمہ، صحابہ کے ذمہ، اولیاء کے ذمہ اور علماء کے ذمہ دعوت ہے کہ تبلیغ کرتے رہیں۔

بعض علماء نے یہاں ایک نکتہ لکھا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام تو ابو الانبیاء والمرسلین اور امام الموحدین ہیں، آزر کو ہدایت نہ ملنا اور اللہ تعالیٰ کا ابراہیم علیہ السلام کی اس دعا کو قبول نہ کرنا۔ اس سے توحید کا سبق ملتا ہے۔ اگر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ہر دعا قبول ہو جاتی اور کوئی دعا بھی خالی نہ جاتی تو ایک وہم ہو سکتا تھا کہ شاید اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی دعا کو نہیں ٹالتے اور ضرور قبول کرتے ہیں، جیسا کہ ہمارے بعض جہلاء کا یہی عقیدہ ہے کہ ہمارے پیر و مرشد کا کہنا اللہ تعالیٰ نہیں موڑ سکتے۔ یہی شرک ہے۔

اسی طرح علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے والد ابوطالب جو حضور اکرم ﷺ کے چچا تھے، ایمان نہ لائے، حالانکہ وہ آپ ﷺ پر قربان ہوجاتے تھے، آپ کے لئے پورے قبائل سے ٹکر لے لی اور پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے والد ہیں، لیکن ایمان نہ ملا۔

﴿رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ﴾ کی تفسیر:

حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہ السلام نبی ہیں، لیکن پھر بھی دعا مانگ رہے ہیں کہ اے اللہ! ہمیں مسلمان بنا۔ بعض علماء نے فرمایا: اس مطلب یہ ہے کہ اے اللہ! ہمیں اپنے حکم کا ہمیشہ کے لئے تابع بنا اور اس پر استقامت نصیب فرما، جیسا کہ فرمایا: ﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا آمِنُوا﴾ [النساء: ۱۳۶] اے ایمان والو! ایمان لاؤ، اس کا مطلب ہے کہ ایمان پر ثابت قدم رہو۔ اور جیسا کہ نمازی کہتا ہے: ﴿اهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ ۝﴾ یا اللہ! ہمیں صراطِ مستقیم کی ہدایت عطا فرما، حالانکہ نماز پڑھ رہا ہے، صراطِ مستقیم پر کھڑا ہے۔ اس لیے معنی یہ ہوتا ہے کہ یا اللہ! جیسے تُو نے ہدایت دی ہے، اس پر ہمیشہ ثابت قدم فرما۔

بعض علماء نے فرمایا کہ انبیاء کی دعاؤں میں اُمت کے لئے سبق ہوتا ہے کہ ہم نبی ہوکر جب یہ دعا مانگ رہے ہیں تو تم بھی اللہ تعالیٰ سے مانگو۔ ﴿مُسْلِمَيْنِ﴾، استسلام سے ہے کہ بندہ اپنے آپ کو اللہ کے سپرد کردے، جیسے مرنے کے بعد مردہ غسل کرانے والے کے ہاتھ میں ہوتا ہے، اس کی مرضی ہے اس کو اِدھر کرے یا اُدھر کرے۔ اسلام کا معنی بھی یہی ہے کہ جب تم مسلمان ہوگئے تو تم نے اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کردیا، اس کا جو حکم ملے گا اس کی تعمیل کرنی ہے۔

﴿رَبَّنَا﴾: روایت کے اندر آتا ہے: جب آدمی گھٹنے ٹیک کر تین دفعہ دل سے رَبَّنَا، رَبَّنَا، رَبَّنَا کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی دعا منظور کرلیتے ہیں، لیکن شرط یہ ہے کہ (دل سے) دعا نکلے۔ پورے قرآن کی دعاؤں پر غور کریں، ربوبیت ایسی صفت ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے خود بیان فرمایا: ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝﴾ وہ سارے جہانوں کا پالنے والا ہے، اور جو پالنے والا ہوتا ہے اس کو کتنا رحم ہوتا ہے۔ اس لئے مسلمان جب اس کی صفت ربوبیت کا ذکر کرتا ہے تو اس کی رحمت جوش میں آجاتی ہے۔

﴿رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ﴾ اے ہمارے رب! ہمیں صحیح معنی میں اپنے امر پر چلنے والا بنا اور اخلاص والا

بنا۔ اور اس سے آگے یہ سبق دیا کہ جب دعا مانگو تو صرف اپنے لئے نہ مانگو، بلکہ دوسرے مسلمانوں کو شریک کرو۔ اس لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے آگے دعا مانگی: ﴿وَمِن ذُرِّيَّتِنَآ أُمَّةً مُّسۡلِمَةً لَّكَ﴾ اے اللہ! میری ذریت میں ایک ایسی اُمت پیدا فرما جو تیری فرمانبردار ہو۔ اس لئے جب بھی دعا کریں تو سارے عالم کے مسلمانوں کے لئے کریں۔ جب ایک عاجز بندہ سب کے لئے دعا کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی رحمت جوش میں آتی ہے کہ میرا بندہ میرے بندوں کے لئے رحمت طلب کر رہا ہے، اس پر ہم رحمت کر دیتے ہیں۔

ایک بدوی (دیہاتی) صحابی نے اپنی نماز میں یہ دعا مانگی: "أَللّٰهُمَّ ارْحَمْنِي وَ مُحَمَّدًا، وَ لَا تَرْحَمْ مَعَنَا أَحَدًا" [صحیح بخاری، رقم: ۶۰۱۰] (اے اللہ! مجھے بخش دے اور میرے مدنی پاک کو بخش دے اور کسی کو نہ بخشنا)۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز سے سلام پھیرا تو فرمایا: تُو نے اللہ تعالیٰ کی وسیع رحمت کو چھوٹا کر دیا۔

﴿وَأَرِنَا مَنَاسِكَنَا﴾ یا اللہ! اس بیت اللہ کے جو مناسک ہیں، وہ ہمیں سکھا دے، ﴿وَتُبۡ عَلَيۡنَا﴾ اور ہماری توبہ قبول فرما اور رحم فرما؛ کیونکہ توبہ قبول کرنے والی بھی تیری ذات ہے اور رحم کرنے والی بھی تیری ذات ہے۔ اے اللہ! ہم پر بھی رحم فرما اور عالم اسلام کے تمام مسلمانوں پر رحمت فرما۔

مفسر ابن جریر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس دعا کا مقصد یہ تھا کہ اے پروردگار عالم! ہمیں اپنے حکم کو ماننے اور اس پر اپنے آپ کو سونپنے والا بنا دے کہ جہاں تیرا حکم آجائے، ہمہ تن ہم اس کے سپرد ہو جائیں اور تیری فرمانبرداری کے آگے جھکنے والے ہو جائیں اور تیری اطاعت میں کسی کو شریک نہ کریں اور نہ تیری عبادت میں کسی غیر کو شریک کریں۔ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کو شرک سے محفوظ رکھا، لیکن وہ ایسی دعائیں مانگتے ہیں، جن میں اُمت کے لیے ایک بہت بڑا درس ہوتا ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا استغفار کرنے کی وجوہ:

حدیث مبارک میں آتا ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میں ایک دن میں ستر مرتبہ استغفار کرتا ہوں۔ حالانکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم گناہوں سے پاک ہیں، لیکن اس کے باوجود استغفار کرنے کی دو وجہ ہیں: ایک وجہ اس کا رفع درجات کا باعث ہے؛ کیونکہ جب گناہ نہ ہوں اور آدمی پھر بھی استغفار کرے تو اللہ تعالیٰ اس کے درجات کو بلند فرما دیتے ہیں۔

حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس کو اخلاص کے ساتھ عرفات کی حاضری نصیب کردی تو اللہ تعالیٰ اس کے سارے گناہ معاف کردیتے ہیں۔ اسی طرح جب طوافِ زیارت کرے، جب رمیٔ جمار کرے تو سارے گناہ معاف ہوجاتے ہیں۔ جب ایک مرحلے میں سارے گناہ معاف ہوگئے تو دوسرے مرحلے جب طے کریں گے تو قاعدہ یہ ہے کہ اگر گناہ ہیں تو اللہ تعالیٰ گناہوں کو مٹادیتے ہیں، اگر گناہ نہیں ہیں تو اللہ تعالیٰ درجات کو بلند فرمادیتے ہیں۔

حضور اکرم ﷺ کے استغفار فرمانے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ اُمت کو سبق مل گیا کہ میں معصوم ہوکر اللہ تعالیٰ کے آگے استغفار کرتا ہوں اور تم خطاوار ہوکر بھی استغفار نہیں کرتے ہو؟ نبی ہونے کے باوجود آپ ﷺ دعا کہہ رہے ہیں، ہمیں تو اور زیادہ استغفار کا اہتمام کرنا چاہیے۔

﴿رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ﴾ اس کا معنی یہ ہے کہ اے اللہ! ہمیں خالص اپنی بندگی کرنے والا بنادے، ﴿مُسْلِمَةً لَّكَ﴾ اور ہماری اولاد میں سے بھی ایک اُمت پیدا فرما، جو مخلص ہو اور خالص تیری عبادت کرنے والی ہو۔

سلام بن مطیع رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ وہ تو پکے مسلمان، بلکہ اللہ کے نبی ہیں، لیکن بار بار یہ دعا مانگتے ہیں: ﴿وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ﴾ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اے اللہ! ہمیں اسلام پر قائم فرما اور اس پر دوام نصیب فرما۔

حضرت عکرمہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعا کی: ﴿رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ﴾ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ہم نے تمہاری دعا منظور کرلی۔

حضور اکرم ﷺ کی دعا سے بارش:

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کئی واقعات ذکر فرمائے ہیں، جیسا کہ ایک مرتبہ حضور اکرم ﷺ مسجد نبوی میں جمعہ کا خطبہ ارشاد فرما رہے تھے کہ ایک صحابی کھڑے ہوکر عرض کرنے لگے: یا رسول اللہ! ہمارے تو مال برباد ہوگئے، ہمارے تو جانور مرنے والے ہیں، مدتوں سے بارش نہیں ہوئی۔ مہربانی فرما کر اللہ تعالیٰ سے دعا فرمائیں کہ اللہ رحمت کی بارش عطا کرے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کہتے ہیں: اس وقت آسمان پر بادل کا کوئی نام ونشان نہیں تھا، لیکن جب حضور اکرم ﷺ نے دعا فرمائی تو بادل آنے شروع ہوگئے۔ ہم جمعہ کی نماز سے فارغ ہوئے تو بارش شروع ہوگئی اور پانی میں چل کر ہم اپنے گھروں میں پہنچے۔

کبھی انبیاء کی دعائیں منہ سے نکلیں اور منظور ہوگئیں اور کبھی ایسے ہوتا ہے کہ انبیاء مدتوں دعا کرتے ہیں اور

منظور ہونے کا اثر عرصہ بعد ظاہر ہوا؛ کیونکہ سارا نظام اللہ تبارک وتعالیٰ کے ہاتھ میں ہے، جیسا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے فراقِ یوسف میں دعائیں کیں۔

حضرت سدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ﴿أُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ﴾ سے مراد صرف عرب ہیں، لیکن ابن جریر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ لفظ عرب اور غیر عرب دونوں کو شامل ہے۔

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ابن جریر کا حضرت سدی کی تردید کرنا ٹھیک نہیں ہے؛ کیونکہ حضرت سدی رحمہ اللہ نے عرب کا لفظ نقل کیا ہے، اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ باقی کی نفی ہوگئی۔ حضرت سدی رحمہ اللہ نے عرب کا ذکر اس لئے فرمایا کہ سیاق وسباق کا تقاضا یہی تھا؛ کیونکہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام مکہ میں تشریف لائے تو قوم جرہم یہاں آباد تھی۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی ان میں شادی ہوئی۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کا کعبہ یہاں پھر سے تعمیر کیا گیا۔ اس کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعائیں مانگیں۔ اس سارے سیاق کا تقاضا عرب تھا۔ اس لئے دونوں حضرات کے اقوال صحیح ہیں، ایک دوسرے کا رد کرنا ٹھیک نہیں ہے۔

تین اعمال صدقہ جاریہ ہیں:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''إِذَا مَاتَ الْإِنْسَانُ انْقَطَعَ عَنْهُ عَمَلُهُ إِلَّا مِنْ ثَلَاثَةٍ: إِلَّا مِنْ صَدَقَةٍ جَارِيَةٍ، أَوْ عِلْمٍ يُنْتَفَعُ بِهِ، أَوْ وَلَدٍ صَالِحٍ يَدْعُو لَهُ۔'' [صحیح مسلم، رقم: ۱۶۳۱]

جب انسان مرجاتا ہے تو اس کے ذاتی عمل رُک گئے، مگر تین چیزیں ایسی ہیں جو مرنے کے بعد بھی اس کے لئے باعث نفع ہیں۔ ایسا خیراتی ادارہ بنوا گیا جو اس کے بعد بھی جاری ہے، کوئی مسجد، مدرسہ یا ہسپتال بنا گیا یا کسی کو علم پڑھا گیا، اس سے لوگ نفع اُٹھا رہے ہیں یا نیک بیٹا چھوڑ گیا جو باپ کے مرنے کے بعد بھی اس کے لئے دعائیں کر رہا ہے۔

حضرت جبرائیل علیہ السلام کا حضرت ابراہیم علیہ السلام کو مناسکِ حج سکھانا:

﴿وَأَرِنَا مَنَاسِكَنَا﴾ یا اللہ! ہمیں قربانی کی جگہ اور قربانی کا طریقہ سکھا۔ حضرت جبرائیل علیہ السلام، حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بیت اللہ کی جگہ لے آئے اور کہا: یہاں اللہ کے گھر کی تعمیر کرو۔ اس کے بعد صفا ومروہ پر لے گئے اور کہا: یہ شعائر میں سے ہے۔ منیٰ میں لے گئے تو وادی عقبہ میں ابلیس، ایک درخت کے قریب راستہ روکنے کے لئے

کھڑا تھا، حضرت جبرائیل علیہ السلام نے کہا: "بِسْمِ اللهِ، اَللهُ أَكْبَرْ" کہہ کر اس کو پتھر ماریں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس کو مارا تو وہ بھاگ گیا۔ ابلیس چاہتا تھا کہ میں حج کے مناسک میں بھی کوئی غلط چیز داخل کر دوں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت میں ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یہ جگہیں دکھائی گئیں تو صفا پر بھی شیطان نے کوشش کی، پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حضرت جبرائیل علیہ السلام نے منیٰ میں لے جا کر بتایا کہ یہ منیٰ ہے، یہاں لوگ آ کر قیام کریں گے۔ وہاں بھی شیطان نے "جمرة العقبة" کے موقع پر آپ کا راستہ روکا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس کو سات کنکریاں "بِسْمِ اللهِ، اَللهُ أَكْبَرْ" کہہ کر ماریں، پھر اس نے "جمرة الوسطیٰ" کے مقام پر آ کر راستہ روکا تو آپ نے پھر اس کو سات کنکریاں ماریں، پھر وہ "جمرة الصغریٰ" کے مقام پر آیا، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس کو سات کنکریاں ماریں تو وہ وہاں سے ہٹ گیا۔ اس کے بعد حضرت جبرائیل علیہ السلام آپ کو مزدلفہ میں مشعر الحرام لے کر آئے اور پھر عرفات کے میدان میں لے کر آئے اور وہ دکھایا۔ اس کے بعد حضرت جبرائیل علیہ السلام نے کہا: اب آپ سمجھ گئے کہ کہاں کہاں حج کے احکام ادا ہوں گے؟ آپ نے فرمایا: جی ہاں۔

﴿رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ ۚ إِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿١٢٩﴾﴾ [البقرة:١٢٩]

"اے ہمارے رب! اور ان بیت اللہ والوں میں ایک رسول انہی میں سے بھیج دے جو ان پر تیری آیات پڑھے اور ان کو کتاب (قرآن) کی اور حکمت کی تعلیم دے اور ان کو پاک کرے، بے شک تُو ہی غالب دانشور ہے۔"

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جہاں دوسری دعائیں مانگیں، ان میں سے ایک یہ بھی دعا مانگی: ﴿رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا﴾ صحیح احادیث میں ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"أَنَا دَعْوَةُ إِبْرَاهِيمَ، وَ بُشْرَى عِيسَى، وَ رُؤْيَا أُمِّيَ الَّتِي رَأَتْ." [مجمع الزوائد، رقم:١٣٨٢٥]

میں ابا ابراہیم علیہ السلام کی دعا ہوں اور اپنے بھائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی خوشخبری ہوں اور اپنی ماں کا خواب ہوں جو انہوں نے دیکھا تھا۔ ایک حدیث میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ جتنے انبیاء گزرے ہیں، ان کی ماؤں کو اللہ تعالیٰ انبیاء کی

ولادت سے پہلے ایک خواب دکھاتے ہیں۔

مسئلہ تقدیر کے متعلق کچھ وضاحت:

حضور اکرم ﷺ کا یہ فرمانا کہ میں اپنے ابا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا ہوں۔ اس سے یہ نہ سمجھیں کہ آدمی دعاؤں سے مقامِ نبوت تک پہنچ جاتا ہے۔ بلکہ نبوت وہبی چیز ہے، اللہ جس کو چاہیں عطا فرمائیں۔ محنت اور مانگنے سے کوئی اس مقام تک نہیں پہنچ سکتا۔

دوسری بات یہ کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے آپ ﷺ کی بعثت، آپ کی نبوت، رسالت، آپ کا وقت بعثت، ختم نبوت یہ ساری باتیں تو اس وقت لکھ دی تھیں جب آسمان وزمین بھی نہیں بنے تھے اور وہ لوحِ محفوظ میں محفوظ ہوگئیں۔ اس سے عام طور پر مغالطہ لگتا ہے کہ جب یہ سارا کچھ لکھا جا چکا تو دعا کا کیا معنی ہے؟

یاد رکھیں! یہ جتنے فیصلے ہو چکے اللہ کے علم میں ہیں اور کسی کے علم میں یہ بات نہیں ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے عالم ارواح میں ارواح سے اپنی ربوبیت کا اقرار لیا تھا، اسی طرح انبیاء علیہم السلام سے حضور اکرم ﷺ کی اعانت، اتباع اور آپ پر ایمان لانے کا عہد لیا گیا۔ اس کا تو کسی کو پتہ نہیں تھا کہ آپ کب آئیں گے؟ اس لیے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی دعا اپنی جگہ دعا ہے۔ جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام کے لیے نبوت کی دعا کی۔ لیکن اللہ کے علم میں یہ فیصلہ پہلے ہو چکا تھا، موسیٰ علیہ السلام کو اس فیصلے کا علم نہ تھا۔ انہوں نے اپنے عجز کا اعتراف کیا کہ پروردگار عالم! زمانہ کے فرعون سے میرا مقابلہ ہے اور پہلے اس کے ساتھ اختلافات بھی ہیں، آپ میرے بازو کو مضبوط کریں اور میرے بھائی کو بھی نبی بنا دیں۔ اللہ تعالیٰ نے دعا منظور کر لی۔ لیکن اللہ کے علم میں یہ سب کچھ پہلے سے تھا۔

بعض لوگ اس پر اعتراض کرتے ہیں کہ جب سب کچھ پہلے سے ہے کہ ایک یہ کافر ہے اور یہ مسلمان، آدمی چوری کرے گا، ڈاکہ مارے گا تو پھر ہمیں سزا کیوں ملتی ہے؟ سب سے پہلے مسئلہ سمجھ لیں کہ جب بھی تقدیر کا کوئی معاملہ ہو تو آدمی بحث نہ کرے، بس ''آمَنَّا وَ صَدَّقْنَا'' کہے، جو اللہ و رسول کا حکم ہے، اس پر ہمارا ایمان ہے۔

دوسری بات یہ سمجھیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے علم محیط کے باعث جو کچھ لکھا ہے وہ حق ہے کہ یہ بندہ مومن بنے گا اور یہ بندہ کافر بنے گا۔ یہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جبراً لکھ دیا ہے اور بندوں کو مجبور کر دیا ہے کہ ایسے بنو۔ اگر اس

طرح ہو تو پھر جزاء وسزا کا کوئی مسئلہ باقی نہیں رہتا۔ اگر اللہ تعالیٰ نے بندوں کو مجبور کر دیا ہو تو انبیاء ورسولوں کو بھیجنے کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ کتابیں اُتارنے کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔

فرق صرف اتنا ہے کہ جب وہ اسلام لاتا ہے تو ہمیں اس وقت پتہ چلتا ہے کہ فلاں مسلمان ہو گیا، لیکن اللہ تعالیٰ کے علم میں یہ سب کچھ پہلے سے ہوتا ہے۔ جو لکھا ہے وہ بالکل حق اور عدل وانصاف ہے جو اس نے کرنا ہے وہ پہلے سے ہے اور بندہ اسے اپنے اختیار سے کرتا ہے، اسی کرنے اور نہ کرنے پر جزا وسزا مرتب ہوگی۔

مثلاً مشتری ستارے پر بڑے حوادث کا اظہار ہو رہا ہے، ہمیں پتہ نہیں ہے، لیکن جن کے پاس آلاتِ رصد ہیں، دور بین ہیں، وہ دیکھ رہے ہیں۔ اگلے دن جب اخبار میں آ گیا تو ہمیں کچھ معلومات حاصل ہو گئیں۔ اس سے اندازہ لگائیں کہ خداوند قدوس کتنا بڑا عالم ہے کہ اتنی بڑی دنیا کے لئے تو ایک چاند ہے اور اس کرہ کے اوپر کئی چاند ہیں تو وہ کرہ کتنا بڑا ہوگا۔

تمام انبیاء ورسول انسان کیوں ہیں؟

﴿رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ﴾ مسئلہ سمجھ لیں! اگر اللہ کے رسول بشر نہ ہوتے، اولادِ آدم نہ ہوتے تو کیا جنوں میں سے آتے؟ جبکہ جنات کا اتنا مرتبہ نہیں کہ ان کو نبوت دی جائے، باقی فرشتے رہ گئے تو اللہ تعالیٰ ان کو بھیجتے تو نوری رسول بھیجتے۔ اس میں دو صورتیں تھیں: ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ حضرت جبرائیل علیہ السلام کو بھیجتے اور وہ اپنی اصلی حالت وصورت میں آتے تو کوئی بندہ ان کو دیکھنے کی طاقت نہ رکھتا۔

اندازہ کریں کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء نے بھی حضرت جبرائیل علیہ السلام کو ان کی اصلی صورت میں نہیں دیکھا، مگر حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبرائیل علیہ السلام کو اصلی حالت میں دیکھا اور حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی خوف کی وجہ سے غشی طاری ہوگئی۔ حدیث پاک میں موجود ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم زمین پر بیٹھ گئے تو حضرت جبرائیل علیہ السلام نے جلدی جلدی اپنی شکل بدلی اور عرض کیا: حضور! آپ گھبرا رہے ہیں؟ آپ اللہ کے رسول ہیں، میں جبرائیل ہوں۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں نے جب حضرت جبرائیل علیہ السلام کو دیکھا کہ ان سے سارا اُفق بھر گیا۔ اور فرمایا: ان کے چھ سو پَر تھے، جب اللہ کے نبی نے دیکھا تو اغماء ہو گیا، دوسروں کی کیا طاقت ہے۔ لہٰذا یہ بات طے ہوگئی کہ اگر اللہ تعالیٰ نوری نبی بھیجتے تو کوئی دیکھنے کی طاقت ہی نہ رکھتا۔

دوسرا یہ کہ وہ فرشتہ اگر انسان کی شکل میں آتا تو پھر بھی لوگ دھوکہ میں پڑ جاتے، جیسا کہ بی بی مریم علیہا السلام نے دیکھا کہ ایک انسان آرہا ہے تو کہنے لگیں: میں تو رحمٰن کے نام کے ساتھ پناہ پکڑتی ہوں، اگر تم اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والے مرد ہو۔ میرے پاس کیوں آرہے ہو؟ دور ہو جاؤ۔ حضرت جبرائیل علیہ السلام نے وضاحت کر دی کہ خدا کی بندی! میں تو خدا کا بھیجا ہوا قاصد ہوں، تمہاری طرف خوشخبری دینے آیا ہوں کہ اللہ پاک تجھے ایک پاکیزہ بچہ عطا فرمائیں گے۔ جب بی بی مریم علیہا السلام نہ پہچان سکیں تو عام آدمی کی کیا طاقت ہے؟

یاد رکھیں! اللہ تعالیٰ نے تمام نبی جنس بشر سے بھیجے، اولادِ آدم سے بھیجے۔ وہ کھانے والے، پینے والے، دکھ، تکلیف، بخار اُٹھانے والے اور شادی کرنے والے تھے، موت وحیات ان پر آنے والی، لیکن اس کے باوجود بھی لوگوں نے ان کو خدا بنا ڈالا۔ اگر نبی فرشتہ ہوتا اور وہ کھاتا پیتا بھی نہ اور نہ ہی شادی کرتا تو لوگ اس کو پہلے دن ہی خدا بنا لیتے۔ یا پھر وہی اعتراض کرتے کہ نبی ہم میں سے کیوں نہیں بھیجا؟

نبی کا کام قرآن کی وضاحت:

سب سے بڑی نعمت یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے رسول بھیجے اور جنس آدم سے بھیجے جس کی ہدایت مطلوب ہے۔ اس لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعا مانگی: ﴿رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ﴾ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے وہ اُمور مانگے جو انبیاء کے ذمہ ہوتے ہیں اور وہ چار فریضے ہیں: ایک یہ کہ تیرا قرآن پڑھ پڑھ کر اُمت کو سنائے۔ لفظ قراءت عام ہے کہ آپ کچھ بھی پڑھیں، لیکن لفظ تلاوت کا اطلاق صرف اس وقت ہوتا ہے جب کوئی مقدس کتاب پڑھی جائے، جس کے پڑھنے پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ثواب مرتب ہو۔ تلاوت کرنا بھی فریضۂ نبوت ہے۔ خوش قسمت ہیں وہ لوگ جو قرآن پڑھ رہے ہیں اور وہ نبی کے ایک وظیفہ پر عمل پیرا ہیں۔

نبی کا دوسرا وظیفہ ﴿وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ﴾ کہ قرآن کی ان کو تعلیم دے۔ یہ نہیں کہ وہ خود عربی لوگ ہیں، سمجھ لیں گے۔ بلکہ جب تک اللہ کا نبی قرآن نہیں پڑھائے گا، اس وقت تک قرآن سمجھ نہیں آئے گا۔ اس لئے جو لوگ قرآن کو اپنی عقل سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں تو وہ ہمیشہ اُلجھ جاتے ہیں اور ٹھوکریں کھاتے ہیں، ان کے لئے حقیقت تک پہنچنا مشکل ہو جاتا ہے۔ حالانکہ قرآن بھی عربی اور مکہ والے بھی عربی ہیں اور قرآن لغت قریش میں نازل ہوا ہے، لیکن ان کے لئے بھی نبی کا ہونا لازم ہے، جو اُن کو بتائے کہ قرآن کیا کہتا ہے؟

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے قرآن بھی سن لیا، جیسا کہ آیا: ﴿وَكُلُوا وَاشْرَبُوا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ۖ ثُمَّ أَتِمُّوا الصِّيَامَ إِلَى اللَّيْلِ﴾ [البقرۃ: ۱۸۷] رمضان میں اس وقت تک کھاتے پیتے رہو، جب تک سفید دھاگہ سیاہ دھاگے سے علیحدہ نہ ہوجائے۔ ایک صحابی نے اپنے تکیہ کے نیچے دو دھاگے رکھ لیے۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو جب پتہ لگا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تمہارا سرہانہ بڑا لمبا چوڑا ہے کہ سیاہ دھاگہ بھی اس کے نیچے آگیا اور سفید دھاگہ بھی اس کے نیچے آگیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سیاہ ڈورے سے مراد رات ہے اور سفید دھاگے سے مراد صبح صادق ہے۔ یہ مقصد نہیں کہ سیاہ اور سفید دھاگے رکھ لو اور انہیں دیکھتے رہو۔ بہر حال یہ مسئلہ اس وقت سمجھ آیا، جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سمجھایا۔

اسی طرح نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کو دیکھ لیں۔ ان کی ساری تفصیل ہمیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سکھائی۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ اعمال صحابہ نے پہنچائے، ان کے بعد تابعین نے، پھر تبع تابعین، محدثین اور علماء نے پہنچائے۔ اس لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''إِنَّ الْعُلَمَاءَ وَرَثَةُ الْأَنْبِيَاءِ'' [سنن ابی داود، رقم: ۳۶۴۱] (علماء، انبیاء کے وارث ہیں)۔ اس کا یہ معنی نہیں ہے کہ ان کو جائیداد ملے گی، بلکہ معنی یہ ہے کہ وہ علم کے وارث ہیں۔

حکمت کی تفسیر:

علماء نے فرمایا: ﴿الْحِكْمَةَ﴾ سے مراد سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔

بعض علماء نے فرمایا: حکمت سے مراد فہم دین ہے کہ اس نبی کو دین کی فہم عطا فرما، جس سے دین کا سمجھنا آسان ہو۔

بعض علماء نے فرمایا: حکمت سے مراد خیر کے کام ہیں، یعنی اللہ کا نبی اُمت کو بتادے اور سمجھادے کہ یہ کام کرنے والے ہیں، اور جو شر کے کام ہیں ان سے منع فرمادیں کہ یہ کام نہ کریں۔ یہ سارے اقوال متقاربۃ المعنی ہیں۔

﴿وَيُزَكِّيهِمْ﴾ تزکیہ کا معنی ہے: مانجھنا۔ جیسے کسی چیز پر زنگ لگ جائے تو ہم اس کو مانجھتے ہیں، صاف کرتے ہیں، اسی طرح دلوں پر گناہوں کا زنگ لگ جاتا ہے، کفر کا زنگ لگ جاتا ہے، اس لئے قرآن میں آتا ہے کہ کافروں کے دل پتھروں سے بھی زیادہ سخت ہیں، اسی طرح آیا کہ ان کافروں کے دلوں پر پردہ ہے۔ یہ کافروں کا حال ہے۔ کبھی کبھی ایمان والوں کے دلوں پر بھی معاصی کا اور اللہ کے ذکر سے غفلت کا اثر آجاتا ہے، اس لئے دعا فرمائی کہ اللہ کے نبی ان کا تزکیہ کریں۔

تزکیہ نفس بالسنۃ معتبر ہے:

جن صوفیاء کرام کا کردار اور عمل سنت کے مطابق ہے، سبحان اللہ! ان کے اندر سنت بھی آ گئی اور تزکیہ والا عمل بھی سنت کی روشنی میں آ گیا۔ ایک یہ ہوتا ہے کہ دل کی صفائی تو کر رہے ہیں، لیکن طریقہ کتاب وسنت والا نہیں ہوتا۔ جیسے بڑے بڑے جوگی مجاہدے کرتے ہیں، بڑے بڑے پنڈت مجاہدے کرتے ہیں، ہندو بیس بیس سال تک گوشت نہیں کھاتے، اچھی غذائیں نہیں کھاتے، بیس بیس اور پچاس پچاس سال تک جنگل میں بیٹھے رہتے ہیں اور چلے کاٹتے رہتے ہیں، لیکن وہ منزل پر نہیں پہنچتے؛ کیونکہ ان کا تزکیہ قرآن وسنت کی روشنی میں نہیں ہوتا۔

مثلاً آپ نے مدینہ منورہ جانا ہو اور آپ جدہ والی سڑک پکڑ لو۔ اب آپ گاڑی دوڑا رہے ہیں، بھگا رہے ہیں، محنت کر رہے ہیں، راستے میں آرام نہیں کر رہے، کھانا نہیں کھا رہے، چائے نہیں پی رہے اور زیادہ سے زیادہ تیز چل رہے ہیں کہ میں نے مدینہ جانا ہے۔ اس طرح آپ مدینہ سے دور تو ہوتے چلے جائیں گے، لیکن مدینہ نہیں پہنچیں گے؛ کیونکہ آپ سیدھے راستے پر نہیں چلے۔

یہی وجہ ہے کہ جو لوگ قرآن وسنت کی روشنی سے ہٹ جاتے ہیں، وہ بجائے منزل مقصود پر لے جانے کے اپنے مریدوں کو دوزخ کے گڑھے میں ڈال دیتے ہیں۔ ورنہ ان بیچاروں کا مقصد بھی تزکیہ ہوتا ہے۔ لیکن کتاب وسنت کی روشنی نہیں ہوتی، جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جب کوئی ایسی بات کہہ دی جو (نعوذ باللہ!) کفر تک لے گئی۔ جیسے بعض لوگ کہہ دیتے ہیں کہ چھوڑو، اب کیا نماز پڑھنی ہے؟ اللہ سے تو مل گئے۔ اسی طرح بعض لوگ کہتے ہیں کہ گناہ اور ثواب کا کوئی فلسفہ نہیں ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ جو بانسری سے آواز آ رہی ہے، تم سمجھ رہے ہو کہ یہ بانسری سے آواز آ رہی ہے، حالانکہ آواز تو اسی کی ہے۔ وہ اس دھوکے کے اندر گمراہ ہو جاتے ہیں۔

نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ بجائے منزل مقصود پر پہنچنے کے راستے سے ہٹ جاتے ہیں۔ مثلاً اللہ پاک نے کسی بزرگ پر اپنی رحمت سے کوئی بات واضح کر دی تو لوگ کہتے ہیں کہ ہمارے بزرگ کو تو ہر چیز کا پتہ ہے۔ آپ جا کر بیٹھیں، وہ آپ کے بارے میں سب کچھ بتا دیں گے۔

تزکیہ نفس کے مراتب:

پہلے تلاوتِ کتاب، پھر تعلیم کتاب، پھر حکمت اور پھر تزکیہ ہے۔ تزکیہ تب حاصل ہوگا جب پہلی تین چیزیں موجود

ہوں گی۔ اگر یہ نہیں ہوں گی تو تزکیہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اگر آپ مقامِ احسان پر پہنچنا چاہتے ہیں تو اس کا طریقہ تلاوتِ کتاب، تعلیم کتاب، تعلیم حکمت اور اللہ تعالیٰ کے فرائض بجالائیں۔

اس لئے جو صحیح بزرگ ہوتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ روزانہ دس پارے قرآن شریف پڑھو، نماز کی تکبیر اُولیٰ تمہاری نہیں چھوٹنی چاہیے، تمہاری تہجد، اوّابین، اشراق نہ چھوٹنے پائے اور تیری زبان اللہ کے ذکر سے ہر وقت تر رہنی چاہیے۔ جب وہ اس طرح محنت کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ دلوں کی اصلاح فرمادیتے ہیں۔

تزکیہ نفس کرنے والے صوفیاء کی اقسام:

اس لئے بڑے بڑے علماء، علم حاصل کرنے کے بعد ایسے بزرگوں کی خدمت میں چلے جاتے تھے جو علم کے اندر رسوخ پیدا کریں، کتاب وسنت کی روشنی میں چلا کر ان کا تزکیہ کریں اور مقامِ احسان تک پہنچائیں۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ ایک صوفی وہ ہوتے ہیں جن کا دل صاف ہوتا ہے اور صوفی کا معنی ہوتا ہے: قرآن وسنت کا پیروکار۔ ایک ہاتھ میں قرآن اور دوسرے ہاتھ میں سنت ہوتی ہے، اس کا کوئی قدم سنت کے خلاف نہیں اُٹھتا، اصل میں یہ صوفیاء کرام ہیں۔

اور بعض صوف والے صوفی ہوتے ہیں، یعنی گرم اور موٹے کپڑے پہن لیے، موٹی تسبیح گلے میں ڈال لی، ایک دو عصا اپنے ہاتھ میں رکھ لئے۔

اور بعض صوفی صفا سے ہوتے ہیں، یعنی نہ شریعت ہے، نہ قرآن ہے اور نہ حکمت ہے۔ وہ بھی صوفی کہلاتے ہیں۔

اصل صوفی وہ ہے جو قرآن وسنت کا پابند ہو، قرآن وسنت پر چلنے والا ہو۔

حضرت امداد اللہ مہاجر مکی رحمہ اللہ کی عاجزی:

حضرت امداد اللہ مہاجر مکی رحمہ اللہ بڑے بزرگ گزرے ہیں۔ علماء دیوبند ان کے مرید تھے۔ اگر ان سے کوئی مسئلہ پوچھنے کے لئے آتا تو فرماتے: مسئلہ رشید احمد سے پوچھو، محمد قاسم سے پوچھو۔ کسی نے کہا کہ وہ آپ کے مرید ہیں۔ فرمایا: وہ علماء ہیں، شریعت کا مسئلہ وہ جانتے ہیں، ہم تو ''اللہ اللہ'' کرنا سکھاتے ہیں، ہمیں کیا پتہ کہ شریعت کے احکام کیا ہیں؟

اس لیے یاد رکھیں! تزکیہ اس وقت تک حاصل نہیں ہوگا جب تک پہلی تین چیزیں نہیں ہوں گی۔ سب سے بہتر

عمل یہ ہے کہ قرآن پڑھا کرو، کوشش کرو اگر اللہ نے علم دیا تو الحمد للہ! نہیں دیا تو صرف تلاوتِ قرآن بھی بڑی چیز ہے۔ تلاوتِ قرآن صحیح لفظوں کے ساتھ کرو، اگر کہیں غلطی ہوتی ہے تو کسی قاری سے ٹھیک کرا لو۔ اگر اللہ نے علم دیا تو قرآن میں تدبر بھی کرو۔ جہاں مسئلہ سمجھ نہ آئے، وہاں ہلکی پنسل سے نشان لگا لو، پھر کسی عالم کے پاس جا کر بات سمجھ لو۔

اللہ تعالیٰ کی صفات اور ان کی حکمتیں:

﴿اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ﴾ اے پروردگارِ عالم! غالب بھی تُو ہے اور حکمت والا بھی تُو ہے۔ علماء نے لکھا ہے کہ اگر قرآن میں اوّل سے لے کر آخر تک اللہ کی جن صفات کا قرآن میں ذکر آیا ہے، ان پر غور کرو تو حیران ہو جاؤ گے کہ اس میں کیا کیا حکمتیں ہیں؟ جہاں اللہ تعالیٰ کی یہ صفات آئیں، اس سے پہلی آیات پر غور کریں اور بعد والی آیات پر غور کریں تو بات سمجھ آئے گی کہ یہاں ان صفات کا ذکر کیوں کیا گیا ہے۔ انہی دو صفات پر جو آئی ہیں، غور کریں۔

﴿الْعَزِيْزُ﴾ کا معنی ایسا غالب کہ جس کو کوئی طاقت مغلوب نہ کر سکے، جس کے حکم کو کوئی ٹال نہ سکے، جس کے فیصلے کو کوئی بدل نہ سکے۔ عزیز وہ عزت والا غلبہ والا ہے۔ میرے مولا! اگر تُو ان میں اپنا رسول بھیجے تو تُو غالب ہے، تیرے حکم کو یہ بدل نہیں سکتے، تیرے حکم کو یہ ٹال نہیں سکتے۔

﴿الْحَكِيْمُ﴾ کا معنی ہے کہ جس کا ہر قول و فعل حکمت سے خالی نہ ہو۔ مثلاً کسی شخص کے پیٹ میں درد ہو، آپ نے کہا: سونٹھ لے کر کھا لیں۔ اس نے کھا لیا اور وہ ٹھیک ہو گیا تو آپ کو حکیم نہیں کہیں گے؛ کیونکہ یہ تو آپ نے سن رکھا تھا اور بتا دیا تو وہ ٹھیک ہو گیا۔ اسی طرح کوئی چیز اتفاق سے صادر ہو جائے تو وہ حکیم نہیں کہلاتا، بلکہ حکیم یہ ہے کہ ہر چیز جیسے وہ چاہے اس کے علم کے مطابق بنے۔ پھر جب وہ بنے تو اس کے علم کے عین مطابق ہو، ذرہ بھر اختلاف نہ ہو۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام فرماتے ہیں: اے اللہ! اس وادی غیر ذی زرع میں تیرا کعبہ بنانا اور پھر میرے بچوں کا یہاں بھیجنا اور پھر مجھے یہاں بھیجنا، مجھے معمارِ کعبہ بنانا اور مجھے حکم دینا کہ اس گھر کو آباد کرنے کے لئے لوگوں کو بلاؤ اور مجھے مناسکِ حج کی تعلیم دینا، یہ ساری چیزیں حکمت سے خالی نہیں ہیں۔ تُو بڑا حکمت والا ہے، لہٰذا اگر میری



دعائیں بھی قبول فرمالے تو کوئی مشکل نہیں، کیونکہ تُو عزیز ہے۔ پھر جو تیرا حکم ہوگا وہ حکمت سے خالی نہیں ہوگا، کیونکہ تو حکیم ہے۔ آدمی اگر اللہ تعالیٰ کی ان صفات میں غور کرے تو علم کا ایک سمندر ہے جو اس میں چھپا ہوا ہے۔

آپ قرآن مقدس میں موجود تمام دعاؤں پر غور کرلیں۔ آدم علیہ السلام سے لے کر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تک اللہ تعالیٰ نے جتنے پیغمبر بھیجے، انہوں نے جب بھی دعا مانگی تو صرف اللہ تعالیٰ سے مانگی ہے۔ اس لئے مسلمانوں کو اپنا عقیدہ صحیح کرنا چاہیے کہ غیر سے دعا مانگنا شرک ہے۔

قبر پر مٹھی بھر مٹی ڈالنے سے بخشش کا واقعہ:

صحیح حدیث میں آتا ہے کہ ایک آدمی کے نامہ اعمال کو جب تولا گیا تو اس کی نیکیوں کا پلڑا ہلکا اور گناہوں کا پلڑا بھاری تھا۔ اس آدمی کے دل میں یہ گمان اور یقین پیدا ہوگیا کہ میرا فیصلہ تو ہوگیا چونکہ میزان میں اللہ نے ایک نظام رکھا ہے تو اس سے بات صاف ہے کہ مجھے جہنم میں ڈال دیا جائے گا؛ کیونکہ گناہوں کا پلڑا بھاری ہے۔ بندہ اسی خوف و دہشت میں مبتلا تھا کہ اوپر سے ایک چھوٹی سی تھیلی کو آتے دیکھا کہ میری نیکیوں کے پلڑے میں گرگئی، اس سے نیکیوں کا پلڑا بھاری ہوگیا اور گناہوں کا پلڑا ہلکا ہوگیا۔ اللہ پاک نے فرمایا: میرے بندے کو جنت میں داخل کردو۔ اس بندے نے کہا: مولا! تیرا بڑا کرم ہے، میں تیرے کرم کا شمار بھی نہیں کرسکتا۔ اس تھیلی میں کیا چیز تھی؟ اللہ پاک نے فرمایا: میرے بندے! دیکھ لو۔ جب اس نے جاکر دیکھا تو اس کے اندر مٹی ہے۔ بندے نے کہا: میرے مولا! تیری قدرت کے عجیب فیصلے ہیں، مجھے بات سمجھ نہیں آرہی ہے کہ اس کے اندر تو مٹی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: ایک مومن فوت ہوگیا، تُو نے اس کا جنازہ پڑھا اور جنازے کے ساتھ قبر تک گیا اور اس کی قبر پر مٹی ڈالی تھی۔ میں نے تیرا وہی عمل قبول کرلیا اور آج اسی وجہ سے تیرا پلڑا بھاری ہوگیا ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ اتنے کریم اور اتنے رحیم ہیں کہ ہمارے معمولی سے عمل کو قبول کرنے کے بعد اتنے بڑے انعام سے نواز دیتے ہیں، جس کا آدمی تصور بھی نہیں کرسکتا۔

ایمان کی مٹھاس پانے کا واقعہ:

صحیح حدیث مبارک میں آتا ہے کہ ایک آدمی بازار، شہر یا کسی مقام پر گزر رہا تھا، سامنے سے کچھ عورتیں آرہی تھیں تو اس نے فوراً اپنی نظر نیچے کرلی کہ کسی غیر محرم کے چہرے پر میری نظر نہ پڑے۔ بظاہر یہ عمل اتنا بڑا نہیں ہے،

لیکن حدیث پاک میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو اس عمل کے بدلے ایک ایسی نعمت عطا فرمائیں گے کہ اس کے دل میں حلاوتِ ایمان پیدا ہو جائے گی۔ مُلّا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ اس حلاوتِ ایمان کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اللہ اس بندے کا خاتمہ ایمان پر فرما دیتے ہیں۔

اللہ کی رحمت بندوں کے گناہوں سے زیادہ وسیع ہے:

ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: انسان کے بدن کے اندر دل بادشاہ کی مانند ہے، اس کے حکم پر جوارح کام کرتے ہیں۔ دل نے چاہا کہ میں عورت کا جمال دیکھوں، لیکن جب اس بادشاہ (دل) نے اپنے غلام (آنکھ) کو حکم دیا کہ دیکھو، لیکن اس نے آنکھ موڑ دی اور بادشاہ کی بات کو ٹھکرا دیا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں تمہارا خاتمہ ایمان پر کر کے اپنے قریب لے آؤں گا۔

جو مولا اتنا بڑا رحیم و کریم ہو، اس کے بارے میں آدمی یہ عقیدہ رکھے کہ وہ ہماری دعائیں تو سنتا نہیں ہے، اس لئے ہم بزرگوں کے مزاروں پر جاتے ہیں، ان بڑے بڑے قبر والوں کے دربار پر حاضر ہوتے ہیں تو اللہ تعالیٰ پھر بھی ان کی بات کو موڑتا نہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ آدمی کفر تک پہنچ جاتا ہے، ورنہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿إِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ ؕ ذٰلِكَ ذِكْرٰى لِلذّٰكِرِيْنَ ﴾ [ھود: ۱۱۴] کہ تم سے کوئی غلطی ہو جائے تو اس کے بعد فوراً نیکی کر لو، کیونکہ نیکی گناہوں کو مٹا دیتی ہے۔ اس لئے روایات میں آتا ہے کہ آدمی جب وضو کرتا ہے اور ہاتھ دھوتا ہے تو اس سے ہاتھ کے گناہ جھڑ جاتے ہیں اور جب چہرہ دھوتا ہے تو چہرے کے گناہ دھل جاتے ہیں۔ اس طرح پورے وضو کو دیکھ لیں۔ پھر جب وہ نماز پڑھتا ہے تو اگلی نماز تک صغیرہ گناہ دھل جاتے ہیں، ایک عمرہ کرتا ہے تو دوسرے عمرہ کے درمیان تک کے گناہ جھڑ جاتے ہیں۔

''نیکیاں گناہوں کو مٹا دیتی ہیں'' کا مطلب:

بعض محدثین و علماء نے لکھا ہے کہ نامۂ اعمال میں جو گناہ لکھے جا چکے ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کو مٹا دیتے ہیں۔ حدیث میں آتا ہے کہ گناہوں کو مٹا کر نیکیاں لکھ دی جاتی ہیں اور کراماً کاتبین فرشتوں کو بھی اس کے وہ گناہ بھلوا دیئے جاتے ہیں۔ مثلاً ایک تحریر ہو، وہاں سے آپ کوئی چیز مٹا دیں تو دیکھنے والے کو شبہ ہوتا ہے کہ یہاں کوئی چیز تھی، لیکن اس کو مٹا دیا گیا ہے۔ اللہ اتنا بڑا رحیم و کریم ہے کہ ملائکہ کے سامنے اپنے بندے پر پردہ ڈال رہے ہیں

کہ میرے بندے کا جب نامۂ اعمال دیکھیں تو یہ نہ کہیں کہ یہاں کچھ تھا اس لیے وہاں نیکیاں لکھ دو۔

بعض محدثین کرام نے فرمایا: گناہوں کو مٹا دینے کا مطلب ہے کہ گناہ معاف ہو گئے اور آگے مستقبل میں جو اس نے نیکیاں کرنی ہیں، وہاں لکھ دی جاتی ہیں۔ مثلاً ایک آدمی گانے کا رسیا ہے، فلموں اور وی سی آر کا رسیا (عادی) ہے، اللہ نے اس کو اعمالِ صالحہ کی اور توبہ کی توفیق دی۔ اس نے ارادہ کیا کہ میں حج کروں گا تو اس کے گناہوں کو مٹا دیا گیا اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: وہاں اس کی اگلی نیکیاں لکھ دو، اس نے کرنی ہیں۔

بعض محدثین نے فرمایا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ پہلے اس کے اندر گناہ کرنے کا ملکہ تھا کہ غیر عورت کو دیکھا تو اس کو رام کر دیا، کسی غیر لڑکے سے باتیں کیں اور اسے پھانس لیا، کسی شریف آدمی کو دیکھا تو اس سے میٹھی میٹھی باتیں کر کے پیسے ہڑپ کر لئے۔ اب جب وہ نیکی کا ارادہ کرتا ہے تو اللہ برائی کا ملکہ مٹا کر نیکی کا ملکہ پیدا کر دیتے ہیں، اس میں اعمالِ صالحہ کا ملکہ آ جاتا ہے۔

بعض علماء فرماتے ہیں کہ حدیث مبارک کا ظاہری معنی یہ ہے کہ ایک بندہ اللہ تعالیٰ کے دربار میں پیش ہوگا، اللہ تعالیٰ حکم فرمائیں گے کہ اس کے گناہ مٹا دو۔

دوسری حدیث میں تفصیل ہے کہ اس نے جو چھوٹے چھوٹے گناہ کئے تھے، وہ سارے اس کو دکھاؤ۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: میرے بندے! یہ گناہ تُو نے کئے تھے؟ وہ اقرار کرے گا۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے حکم دیں گے کہ اس کے گناہ مٹا دو اور ہر گناہ کے بدلے ایک نیکی لکھ دو۔ پھر اس کو دوبارہ نامۂ اعمال دکھایا جائے گا اب پڑھو۔ وہ جب دیکھے گا کہ میرے گناہ بھی ختم ہو گئے اور گناہوں کے بدلے میں بھی نیکیاں لکھی ہوئی ہیں تو وہ خوش ہو جائے گا اور عرض کرے گا: اے اللہ! میرے تو اور بڑے بڑے گناہ تھے، وہ تو یہاں نہیں لکھے ہوئے۔ حضور اکرم ﷺ ہنس پڑے اور فرمایا: دیکھو! بندہ کتنا عجلت پسند ہے!!!

جو اللہ اتنا رحیم و کریم ہو، آدمی اس سے دعا نہ مانگے، بلکہ غیر اللہ سے مانگے تو یہ شرک ہے، اور یہ ایسا گناہ ہے جس کی سزا جہنم ہے۔

اعمالِ صالحہ کرنے کے بعد دعائیں قبول ہوتی ہیں:

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خانہ کعبہ کی تعمیر کے بعد دعائیں کی ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ اعمالِ صالہ کرنے کے

بعد دعائیں جلد قبول ہوتی ہیں۔اس لیے حکم ہے کہ نماز کے بعد دعا مانگا کرو، اذان اور تکبیر کے درمیان جو وقت ہے اس میں دعا مانگا کرو، قرآن مقدس پڑھنے کے بعد دعا کرو۔حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جو یہ دعائیں مانگی ہیں، ان کے اندر پوری اُمت کے لئے بھلائی ہے۔اس سے سبق ملا کہ آدمی جب دعا مانگے تو صرف اپنے لئے نہ مانگے، بلکہ اپنے لئے، بچوں کے لئے، والدین اور عالم اسلام کے لئے بھی مانگے۔

آپ ﷺ سب سے پہلے نبی بنے اور آخر میں مبعوث ہوئے:

بعض لوگ جب ایسی احادیث مبارکہ پڑھتے ہیں تو وہ غلط فہمی یا محبت کے غلو میں ایسے آگے بڑھ جاتے ہیں اور کہنے لگ جاتے ہیں کہ حضور پاک ﷺ تو حضرت آدم علیہ السلام سے بھی پہلے نبی ہیں، لہٰذا آپ ﷺ کا آدم علیہ السلام کی جنس سے (نعوذ باللہ!) تعلق نہ رہا۔یہ بات شانِ پیغمبر میں گستاخی اور بے ادبی ہے، کیونکہ حضور اکرم ﷺ نے فرما دیا: "أَنَا سَيِّدُ وُلْدِ آدَمَ" میں آدم علیہ السلام کی اولاد ہوں اور تمام اولاد کا سردار ہوں۔اسی طرح حضور اکرم ﷺ کا سلسلۂ نسب مبارک ہے۔آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں آدم علیہ السلام سے پہلے تھا، جب آسمان وزمین بھی نہیں بنے تھے۔اس فرمان کا یہ مطلب نہیں کہ جنس آدم علیہ السلام یا جنس بشریت سے تعلق نہیں ہے، بلکہ آپ سید البشر اور افضل البشر ہیں، آپ امام الانبیاء اور خاتم الانبیاء ہیں۔

اگر ہمیں کوئی مشکل یا کوئی حاجت میں پیش آگئی اور ہم نے کسی بزرگ یا کسی عالم یا کسی متقی، پرہیزگار انسان سے کہا کہ میری یہ مشکل ہے، آپ میرے لئے دعا کردیں۔اس نے دعا کردی۔ہم کہتے ہیں: فلاں بزرگ نے دعا کی اور اللہ تعالیٰ نے میری مشکل حل کردی۔ورنہ اللہ کے قضاء وقدر میں تو ابھی ہم پیدا نہیں ہوئے تھے اور لکھا جاچکا تھا کہ میرے بندے کو یہ مشکل پیش آئے گی، یہ فلاں کے پاس جاکر دعا کرائے گا، اس کے بعد ہم اس کی مشکل کو آسان کردیں گے۔اور ہم جو کررہے ہیں، یہ اس کی عین قدرت اور منشاء کے مطابق ہے۔باقی یہ نہیں کہ ہم ہاتھ جوڑ کر بیٹھ جائیں، بلکہ اللہ تعالیٰ نے جس آدمی کو توفیق دی ہے، اگر وہ اہل جنت میں سے ہے تو جنت کے اعمال کی طرف جائے گا، اگر وہ نااہل ہے تو جہنم کے اعمال کی طرف جائے گا اور دونوں شخص اعمال اپنے اختیار سے کریں گے، اللہ کی طرف سے کوئی بھی مجبور محض نہیں ہے۔

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: جتنے انبیاء علیہم السلام کی مائیں ہیں، ان سب کو اللہ تعالیٰ خواب دکھاتے ہیں؛ کیونکہ اللہ

تعالیٰ ان کی ماؤں کو ذہنی طور پر تیار کرتے ہیں کہ تمہارے ہاں جس بچہ کی ولادت ہونے والی ہے، وہ شان والا بچہ ہوگا۔ حضور پاک ﷺ کی والدہ نے فرمایا کہ آپ ﷺ کی ولادت سے پہلے ایسے ایسے عجیب واقعات میرے سامنے آئے کہ میں حیران ہوتی تھی کہ اس قسم کے واقعات تو پہلے کبھی پیش نہیں آئے۔

''أَوَّلُ بَدْءٍ'' کی تفسیر:

امام احمد رحمہ اللہ نے ابواُمامہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضور اکرم ﷺ سے عرض کیا کہ آپ ہمیں اپنے ابتداء امر کے بارے میں ذکر فرمائیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: میں اپنے ابا ابراہیم علیہ السلام کی دعا ہوں اور عیسیٰ علیہ السلام کی بشارت ہوں۔

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اوّل بدء کا معنی ہے کہ جس نے دنیا میں حضور اکرم ﷺ کے تعارف کو زیادہ کھولا۔ وہ ابراہیم علیہ السلام ہیں، ورنہ آپ ﷺ کی نبوت کے فیصلے پہلے ہو چکے تھے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جو بنی اسرائیل کے آخری نبی ہیں، ان کے بارے میں ذکر کیا کہ میں تمہاری طرف اللہ کا رسول ہوں، میں اپنے سے پہلی والی کتاب یعنی تورات کی تصدیق کرنے والا ہوں اور ایک رسول پاک کی بشارت دینے والا ہوں، ان کا نام احمد ہوگا علیہ الصلوٰۃ والسلام۔

مفسر رحمہ اللہ بیان فرماتے ہیں: جب حضور پاک ﷺ کے حمل نے قرار پکڑا اور آپ اپنی اماں مبارک کے پیٹ میں آئے تو آپ کی والدہ نے ایک خواب دیکھا اور اس کو اپنی قوم سے ذکر کیا کہ میں نے ایسا خواب دیکھا ہے۔ یہ بات پھیل گئی اور مشہور ہوگئی۔ گویا یہ حضور پاک ﷺ کی ولادت کی تمہید تھی۔ یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت ہے کہ آپ ﷺ کی والدہ کو اس نور کی روشنی میں شام کے محلات کیوں دکھائے، کوئی دوسرا علاقہ نہیں دکھایا گیا؟ مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس سے اشارہ تھا کہ آپ کا دین اور نبوت شام کے اندر بھی قرار پکڑے گا، اور یہ بھی اشارہ تھا کہ یہی شام آخری زمانہ میں اسلام کا مرکز اور ٹھکانہ بنے گا۔ بعض روایات میں ہے کہ میدانِ حشر بھی شام میں بنے گا، نزولِ عیسیٰ بھی وہیں ہوگا، کیونکہ آپ دمشق کی جامع مسجد کے مشرقی مینار پر اُتریں گے۔

بخاری و مسلم میں ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے پیشین گوئی فرمائی کہ میری اُمت میں ہمیشہ ایک جماعت رہے گی جو ہمیشہ حق کے اوپر ثابت قدم رہے گی، جو اُن کی مخالفت کرے گا ان کو نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔ بخاری شریف کے الفاظ ہیں کہ وہ جماعت شام کے اندر ہوگی۔ لہٰذا شام، اسلام اور مسلمانوں کا مرکز ہوگا۔ حدیث میں آتا ہے کہ

سانپ اپنے بل سے جیسے نکل جاتا ہے پھر سارا دن پھرتے پھرتے اپنی بل میں آ جاتا ہے، اسی طرح اسلام پوری دنیا پر پھیلے گا، لیکن پھر لوٹتے لوٹتے مدینہ منورہ کی طرف آ جائے گا۔

﴿وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ ؕ وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا ۚ وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗۤ اَسْلِمْ ۙ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ وَوَصّٰى بِهَاۤ اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهِ وَيَعْقُوْبُ ؕ يٰبَنِيَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝﴾ [البقرۃ: ۱۳۰ تا ۱۳۲]

''اور ابراہیم کے مذہب سے نہیں پھرتا، مگر وہی جس نے اپنے آپ کو احمق بنایا۔ بے شک ہم نے ابراہیم کو دنیا میں چن لیا تھا اور وہ آخرت میں صالحین میں سے ہیں۔ یاد کرو جب ان سے ان کے رب نے کہا: تابع فرمان ہو جا۔ عرض کیا: میں سب جہانوں کے رب کا فرمانبردار ہوں۔ اور ابراہیم نے اپنی اولاد کو اور یعقوب نے بھی وصیت کی تھی اے میری اولاد! اللہ نے تمہارے لیے دین اسلام پسند کیا ہے، پس تم نہ مرنا، مگر حالت اسلام میں۔''

آیات کا ربط:

ان آیاتِ مبارکہ میں مشرکین مکہ، یہود و نصاریٰ یا دیگر کفار جو قیامت تک ان لوگوں کے طریقے پر چلنے والے ہیں، سب کا اللہ تعالیٰ نے ردّ فرمایا ہے۔ یہودیوں کا یہ زعم تھا کہ ہم ملت ابراہیمی پر ہیں؛ کیونکہ ہم حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد ہیں اور وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد ہیں۔ نصاریٰ کہتے تھے کہ ہم ملت ابراہیمی پر ہیں؛ کیونکہ ہم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ماننے والے ہیں، حضرت عیسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کے آخری نبی ہیں۔ مشرکین مکہ کہتے تھے کہ ہم ملت ابراہیمی پر ہیں؛ کیونکہ کعبہ انہوں نے بنایا اور ہم اس کے مجاور ہیں، اس کی حفاظت کرنے والے، زمزم پلانے والے، کعبۃ اللہ کے دروازے کے کلید بردار، کعبہ کا طواف کرنے والے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے طریقہ کے مطابق حج کرنے والے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں سب کا ردّ فرمایا ہے کہ اے یہود! اگر تم ملت ابراہیمی پر ہوتے تو حضرت عزیر کو خدا کا بیٹا قرار نہ دیتے۔ اے نصاریٰ! اگر تم ملت ابراہیمی پر ہوتے تو عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا قرار نہ دیتے۔ اے مشرکین مکہ! اگر تم ملت ابراہیمی پر ہوتے تو بتوں کو خدا نہ بناتے؛ کیونکہ ابراہیم تو

بتوں کو توڑنے والے تھے۔ وہ اللہ تعالیٰ کی توحید پر اتنے ثابت قدم تھے کہ پہاڑ تو ہل سکتا تھا، مگر وہ نہیں ہلے۔ لہٰذا تم میں سے کوئی بھی ملت ابراہیم پر نہیں۔

کلمہ پڑھنے کے ساتھ ساتھ آلہہ باطلہ کی تردید ضروری ہے:

علماء نے لکھا ہے کہ جب آدمی کلمہ ''لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ'' پڑھتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس نے تمام فرق باطلہ کی نفی کردی اور ایک اللہ کی ذات کا اثبات۔ دنیا کیا ہے؟ جس میں سارے دعوے مثبت ہوتے ہیں، مثلاً یہ کتاب میری ہے، یہ زمین میری ہے، یہ مکان میرا ہے... لیکن دعویٰ توحید کی ابتداء نفی سے ہے۔ اس سے یہ سبق پڑھایا کہ اگر خدا کو بھی مانتے رہو اور غیروں کو بھی مانتے رہو تو کام نہیں چلے گا، بلکہ پہلے آلہہ باطلہ کی نفی کرو، ورنہ اثبات کا جو صحیح مقصد ہے وہ حاصل نہیں ہوگا۔ ایمان کی حلاوت، روشنی اس وقت تک حاصل نہیں ہوگی جب تک لا الٰہ سے آلہہ باطلہ کی نفی نہ کرو گے۔ توحید کا معنی یہ ہے کہ خدا کو بھی مانو اور خدا کے غیر سے براءت کا کھلا اعلان کرو۔ اسی طرح جب اللہ تعالیٰ کو مانو تو اللہ سے سب سے زیادہ محبت ہو اور غیر اللہ سے نفرت ہو۔ یہ دھوکہ ہے کہ ہمیں اللہ تعالیٰ سے بھی محبت ہے اور غیر اللہ سے بھی محبت ہے۔ یہ توحید نہیں ہے۔

''لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ'' علماء نے لکھا ہے کہ باہ کی نفی کرو اور جاہ کی بھی نفی کرو۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں فرمایا: ﴿أَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلٰهَهُۥ هَوٰىهُ ۚ أَفَأَنْتَ تَكُوْنُ عَلَيْهِ وَكِيْلًا ﴿٤٣﴾﴾ [الفرقان: ۴۳] آپ نے اس شخص کو دیکھا ہے جس نے اپنی خواہش کو خدا بنا رکھا ہے؟ جیسے طبیعت میں خیال آ گیا تو اسی طرف چل پڑے۔ بعض آدمی اپنی خواہش نفسانی کے تابع ہو کر کسی عورت سے محبت کر بیٹھے ہیں، اس کی محبت میں سرگردان پھرتے ہیں۔

علماء نے فرمایا: غیر کی محبت سے توحید باقی نہیں رہتی، بلکہ یہ شرک ہے؛ کیونکہ محبت کا مقام الٰہ کا تھا۔ اس لئے جو لوگ اس دھوکے میں پڑے ہیں کہ عشق مجازی سے عشق حقیقی کی طرف جاتے ہیں یہ چیزیں قرآن وحدیث کے خلاف ہیں۔ (نعوذ باللہ) کیا غیر لڑکی سے عشق کرنے کی بھی شریعت اجازت دیتی ہے؟ تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ حرام کے راستے سے خدا ملے؟ جب غیر پر نظر ڈالنا، اس کے ساتھ علیحدہ بیٹھنا اور اس سے ملنا حرام ہے تو اس سے عشق کرنا کیسے ٹھیک ہوگا؟ ''الٰہ'' کا معنی ہوتا ہے جس کو آدمی اپنے نفع ونقصان کا مالک سمجھے۔ چاہے اگر وہ انسان کو یا بزرگ مالک کو سمجھے گا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس کا اللہ پر ایمان نہیں ہے۔

سائنسدانوں نے کہا ہے کہ مشتری پر دھماکے ہوں گے اور وہ اتنے شدید ہوں گے۔ مسلمانوں نے اذانیں دینا

شروع کر دیں کہ قیامت آگئی ہے۔ اس سے اندازہ فرمائیں۔ ان کو کہا جاتا ہے تم مسلمان کلمہ پڑھنے والے ہو، تمہیں تو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی بات پر ایمان رکھنا چاہیے۔ پیغمبر اسلام نے قیامت کی آخری نشانیاں اور علامات بتائی ہیں کہ دابۃ الارض کا خروج ہوگا، یاجوج و ماجوج کا خروج ہوگا، دجال کا خروج ہوگا، عیسیٰ بن مریم کا نزول ہوگا، وہ دجال کو قتل کریں گے۔ جب تک یہ علامات پوری نہیں ہوں گی، اس وقت تک قیامت نہیں آئے گی۔ لیکن جیسے کسی نے کچھ کہہ دیا مسلمان اُدھر چل پڑے۔

ہم یہ نہیں کہتے ہیں کہ مشتری کا ٹکراؤ نہیں ہوگا، وہ تو کروڑوں میل آپ کے کرہ سے دور ہے۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کا ایک نظام ہے۔ جیسے آپ کا علم بڑھتا جا رہا ہے ویسے اللہ تعالیٰ کے کمالات اور قدرت کی نشانیاں نظر آتی جا رہی ہیں۔ آپ حیران ہوں گے کہ سب سے بڑی دُوربین جو ان سیارات کے دیکھنے کے لیے بنائی گئی ہے، وہ پوری تصویریں مہیا کرتی ہے، اس کا نام "ہُبَل" رکھا ہے؛ کیونکہ کافروں کا بت تھا اور تم بھی اس کی رپورٹ پر اعتبار کرو۔ حالانکہ اس کا کوئی اور نام بھی رکھا جا سکتا تھا، لیکن کفر ہر بات میں آپ کو کفر کی تعلیم دینا چاہتا ہے اور ہم اپنے عقیدے سے اتنے بے بہرہ ہیں کہ کسی ایک عالم نے بھی نہیں کہا کہ یہ چیزیں قرآن و حدیث کے خلاف ہیں، بلکہ اس کے ساتھ قیامت کا تعلق ہے۔

پتہ نہیں ہم کیوں ان چیزوں سے مرعوب ہو گئے ہیں؟ حالانکہ دعویٰ اسلام نے کیا ہے اور ہم پہنچتے پہنچتے اس دعویٰ کے قریب پہنچ گئے اور اسلام کی بتائی ہوئی باتوں کی تصدیق کر رہے ہیں۔ ان کا تو کوئی نیا انکشاف نہیں ہے، بلکہ دعویٰ تو ہمارا تھا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کو تخت اُڑاتا تھا۔ اتنا بڑا تخت تھا کہ اس کے اوپر چار لاکھ کرسیاں رکھی جاتی تھیں اور درمیان میں حضرت سلیمان علیہ السلام کی کرسی ہوتی تھی اور آپ اپنے پاؤں دو شیروں کے اوپر رکھتے تھے اور آپ کے اوپر سایہ کرنے کے لیے پرندے ہوتے تھے۔ انسانوں، وزراء کی کرسیاں ہوتی تھیں، ان کے بعد جنات کی کرسیاں ہوتی تھیں۔ وہ (تخت) پہلے دن میں ایک مہینے کا سفر کرتا اور شام سے لے کر صبح تک ایک مہینے کا سفر کرتا تھا۔ اسلام نے ہمیں بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو تخت دیا تھا۔ آج اگر طیارے بن گئے، اس طرح وہ ہمارے اس دعویٰ کی تصدیق کر رہے ہیں۔ یہ نہیں کہ تمہارا دعویٰ ہو اور ہم اس پر چل رہے ہوں۔

اسلام نے ہمیں بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پرندے بھیجے تھے، ان کی چونچ میں تین پتھر تھے، جب وہ ڈالتے تھے تو وہ ہاتھی اور ہاتھی پر سوار سب کو برباد کر دیتے تھے اور ان کو ایسے بنا ڈالا، جیسے جانوروں کے پاؤں کے نیچے

روندا ہوا گھاس ہو اور سائنسدان اب اس ذرّے پر پہنچ رہے ہیں۔اس کے اندر ان کا کوئی کمال نہیں۔

اسلام نے ہمیں بتایا کہ حضور اکرم ﷺ رات کے بعض حصہ میں مکہ سے مسجد اقصیٰ پہنچے اور اس کے بعد سات آسمانوں پر تشریف لے گئے اور اسلام نے ہمیں بتایا کہ اس سفر سے پہلے حضور اکرم ﷺ کا سینہ مبارک کھولا گیا۔ اگر تم آج دل کے آپریشن کر رہے ہو تو یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ چودہ سو سال پہلے ہمیں اسلام نے بتا دیا ہے۔اس لیے ان کی خبر سے مرعوب ہو جانا کہ انہوں نے خبر دی ہے، ٹھیک نہیں۔

ایک ماہر فلکیات کا دینی مدرسہ کا سائنس کا سبق سننا:

ایک ماہر فلکیات ہندوستان میں آیا، اس کے دل میں خیال آیا کہ یہاں ایک دیوبند مدرسہ ہے، چلو اس مدرسہ کو دیکھ لیں۔ وہ مدرسہ میں آیا، ایک نابینا عالم تھے، اتفاق کی بات ہے کہ وہ اپنے طلبہ کو فلکیات کا سبق پڑھا رہے تھے، ان کے سامنے نہ دنیا کا نقشہ ہے، نہ آلات ہیں اور نہ رصد گاہیں ہیں۔ انہوں نے ہاتھ کی مٹھی بند کی ہوئی ہے اور طلبہ کو کہا: یوں سمجھ لو کہ یہ دنیا ہے اور اس پر وہ بحث کر رہے تھے۔

اس پر اس ماہر فلکیات نے کہا: خدا کی قسم ہے! جب میں نے اس عالم کی بحث سنی تو میں نے محسوس کیا کہ میں نے جو کچھ پڑھا ہے، میں بالکل جاہل ہوں، مجھے علم تو آج حاصل ہوا ہے۔ نابینا مولوی جو پڑھا رہا تھا وہ تو ہماری کتابوں میں بھی نہیں ہے۔ وہ اس عالم سے جا کر بعد میں ملا اور کہا: آپ کے اسلامی علوم میں بھی یہ کتابیں پڑھائی جاتی ہیں؟ ان عالم نے فرمایا: بالکل پڑھائی جاتی ہیں، یہ تو ہماری ابتدائی کتاب ہے، اس علم پر تو سینکڑوں کتابیں موجود ہیں، اگر تم نے پڑھنی ہیں تو آؤ دیکھو۔

لیکن آج کا مسلمان ان سے اتنا مرعوب ہو جائے اور اپنے بیان میں وضاحت بھی نہ کرے کہ حقیقت حال کیا ہے؟ یہ افسوس کی بات ہے۔ علامہ اقبال ؒ نے کہا:

؎ خیرہ نہ کرسکا مجھے جلوہ دانش فرنگ
سرمہ ہے میری آنکھ کا خاک مدینہ و نجف

ان انگریزوں کے جلوے مجھے نابینا اور مرعوب نہیں کر سکتے، میں نے تو مدینہ کی مٹی کا سرمہ پہنا ہوا ہے، یعنی میرے سامنے تو حضور اکرم ﷺ کی سنت، دنیا جہان کی دانش، اہلبیت، رسول کے جہاد، ان کی قربانیاں، ان کی کرامات ہیں۔ جب میں معجزات اور کرامات کو ماننے والا بندہ ہوں تو ان کے جلوے مجھے کیا خیرہ کریں؟

توحید اس وقت آئے گی جب تمام معبودانِ باطلہ کی نفی کرو اور اپنی خواہش کی بھی نفی کرو، غیر اللہ کی محبت کی بھی نفی کرو، اللہ کے سوا جس جس کی بھی عبادت کی جائے، سب کی نفی کرو اور سب سے براءت کا اعلان کرو کہ ﴿إِنَّنِي بَرِيءٌ مِّمَّا تُشْرِكُونَ﴾ [الانعام:۱۹] یہ نہیں کہ دل میں تو نفی کرتے رہو، لیکن کھل کر بات نہ کرو، جیسا کہ جن لوگوں کا ہندوؤں سے تعلق ہے، ماشاء اللہ! ویسے تو پکے مسلمان ہیں، لیکن کبھی کبھی ان کے مندر کا پرشاد بھی کھا لیتے ہیں، اسی طرح جو لوگ یہود و نصاریٰ کے ساتھ رہتے ہیں وہ ان جیسا لباس بھی پہن لیتے ہیں اور ان کے گرجا گھر میں بھی چلے جاتے ہیں۔

اگر ان کو کوئی سمجھائے تو کہتے ہیں کہ اسلام وسیع مذہب ہے، وہ ہمیں منع نہیں کرتا، ہمیں جانا چاہیے، تاکہ دیکھیں کہ وہ کیا کرتے ہیں؟ ضرور دیکھو! لیکن یہ نہیں کہ دیکھتے دیکھتے تم ان کے تابع بن جاؤ، تم ان کا ایک آدمی بھی کبھی راہِ راست پر نہیں لے آئے۔ دیکھیں! انہوں نے سگریٹ شروع کی اور تم سب کے ہاتھ میں سگریٹ پکڑوا دی، انہوں نے چائے شروع کی اور ہر آدمی کو چائے کا رسیا کر دیا۔ اس لئے ان سے پوری براءت بھی ہو۔

ہاں! دنیاوی لین دین علیحدہ بات ہے، وہ جائز ہے، بشرطیکہ جو تمہارا تعلق اللہ تعالیٰ اور اللہ کے رسول ﷺ سے ہے، اس کے اندر کوئی کمی نہ آئے۔ ایسے نہ ہو جیسے اللہ تعالیٰ نے ان مشرکین کو فرمایا کہ میرے کعبہ کے اندر تین سو ساٹھ بتوں کو رکھا ہوا ہے اور پھر کہتے ہو: ہم ملت ابراہیمی پر ہیں۔ ابراہیم علیہ السلام تو امام الحنفاء تھے۔ بعض لوگوں نے جو لکھا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام آہستہ آہستہ ترقی کرتے ہوئے ایمان کے مراحل میں پہنچے، ان کو دھوکہ لگا ہے۔ بڑے سے بڑے عالم کو بھی غلطی ہو سکتی ہے۔

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ نے وضاحت کر دی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پیدا ہونے کے بعد سے وفات تک پلک جھپکنے کے برابر بھی شرک نہیں کیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم، برادری اور ابا سے کہا: ﴿إِنَّنِي بَرَاءٌ مِّمَّا تَعْبُدُونَ﴾ [الزخرف:۲۶] جن کی تم عبادت کرتے ہو اور ان کو حاجت روا اور مشکل کشا جانتے ہو، میں ان سے بَری ہوں۔ میں تو صرف اسی کو حاجت روا، مشکل کشا اور نفع ونقصان کا مالک مانتا ہوں جس نے مجھے پیدا کیا ہے اور وہی مجھے راستہ دکھانے والا ہے۔

ابراہیم علیہ السلام اللہ تعالیٰ کا شکر کرنے والے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو چن لیا اور صراط مستقیم کی ہدایت دی اور ہم نے دنیا میں بھی ابراہیم کو اچھائی دی کہ ان کی ذریت سے انبیاء پیدا کئے، ان کو عظمت والا بنایا، ان کو معمار کعبہ بنایا اور ان کی شان کو بلند کیا اور آخرت میں بھی وہ صالحین میں سے ہوں گے۔ صلاح کے کئی مراتب ہیں، اللہ کے نیک

بندے بھی صالحین ہوتے ہیں، لیکن جب اللہ تعالیٰ کے انبیاء کو "عبادی الصالحین" میں شمار کیا تو معلوم ہوا کہ صلاح کے سب سے اعلیٰ مقام پر صرف نبی پہنچتے ہیں اور کوئی نہیں پہنچتا۔

﴿إِذْ قَالَ لَهُ رَبُّهُ أَسْلِمْ ۖ قَالَ أَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِينَ ﴾ [البقرة:١٣١] اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اسلام، استسلام اور انقیاد کا حکم دیا۔ اس کا معنی یہ ہے کہ اپنے آپ کو اللہ کے سپرد کر دیں۔ ابراہیم علیہ السلام نے اس کو قبول کیا اور اللہ تعالیٰ نے جیسے حکم فرمایا اس کی تعمیل فرمائی۔

﴿وَوَصّٰى بِهَآ إِبْرٰهٖمُ بَنِيهِ وَيَعْقُوبُ ۖ يٰبَنِيَّ إِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴾
[البقرة:١٣٢]

جو آیات شروع میں تلاوت کی گئیں، ان کا مقصد اثباتِ رسالت اور حقانیت اسلام ہے اور مشرکین و یہود و نصاریٰ کا رد ہے۔ یہ لوگ حضور اکرم ﷺ کے زمانہ میں موجود تھے اور ان تمام کا دعویٰ تھا کہ ہم ملت ابراہیمی پر ہیں تو ہم اپنے دین کو کیوں چھوڑیں؟ مگر اللہ تعالیٰ نے واضح بیان فرما دیا کہ ملت ابراہیمی پر اگر کوئی جماعت قائم ہے تو وہ اُمت محمد یہ ہے۔

یہودی یہ بہانہ بھی بناتے تھے کہ ہم تو حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد میں سے ہیں، انہی کو نبی مانتے ہیں اور ان کی شریعت پر قائم ہیں۔ ہمیں تو یعقوب علیہ السلام نے کی وصیت فرمائی تھی کہ ہمارے دین کو نہ چھوڑنا تو ہم کیوں چھوڑیں؟ اللہ تعالیٰ نے ان کا رد فرمایا کہ اگر تم وصیت پر قائم ہو تو ابراہیم اور یعقوب کی وصیت ہم تمہیں سناتے ہیں کہ انہوں نے اپنی اولاد اور اپنی اولاد کی اولاد سب کو یہ وصیت کی تھی کہ اسی ملت ابراہیمی پر اور دین اسلام پر قائم رہنا، اللہ کے سوا کسی کو الٰہ نہ ماننا، اللہ تعالیٰ کی عبادت کے سوا کسی غیر کی عبادت نہ کرنا۔ اس وصیت پر تو محمد رسول اللہ ﷺ قائم ہیں، تم نے اس وصیت کو چھوڑ دیا۔ انہوں نے فرمایا تھا: ایک الٰہ کی عبادت کرنا، جبکہ عیسائیوں نے تین خدا بنا لئے اور تثلیث کے قائل ہو گئے، انہوں نے تو وصیت کی تھی کہ اللہ تعالیٰ کو اس کی تمام صفات کے ساتھ ماننا اور اس کی صفت ﴿لَمْ يَلِدْ ۙ وَلَمْ يُوْلَدْ ﴾ [الاخلاص:٣] ہے، جبکہ تم نے اللہ کے بیٹے بنا ڈالے۔

یاد رکھیں! جو بھی نبی اپنے زمانہ میں آئے وہ لازماً یہ وصیت فرما گئے کہ میرے دین پر جمے رہو، اس کو نہیں چھوڑنا۔ ان کے بعد جو اللہ کے نبی آئیں گے تو ان کی بھی تو وہی دعوت ہے جو پہلے نبی کی دعوت ہے، جیسا کہ ہمارا ایمان حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ پر ہے، لیکن ہم تمام انبیاء پر بھی ایمان رکھتے ہیں، ﴿لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّنْهُمْ ۖ وَنَحْنُ

لَہٗ مُسْلِمُوْنَ﴾ [البقرۃ:۱۳۶] حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضور اکرم ﷺ تک جتنے انبیاء گزرے ہیں سب پر ہمارا ایمان ہے کہ سب انبیاء برحق ہیں، سب رسول برحق ہیں، ان کی شریعتیں اپنے اپنے زمانہ کے لئے برحق تھیں۔ اس لئے ہر نبی جو وصیت کرے، اس کی وصیت کا یہ معنی نہیں ہوتا کہ اس نبی کے بعد جو نبی آئے اس پر ایمان نہ لے آؤ۔ باقی مشرکین مکہ کے پاس تو کوئی چھوٹی سی دلیل بھی نہیں ہے: ﴿وَمَآ اٰتَیْنٰھُمْ مِّنْ کُتُبٍ یَّدْرُسُوْنَھَا وَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلَیْھِمْ قَبْلَکَ مِنْ نَّذِیْرٍ﴾ [سبا:۴۴] کیونکہ ان جاہلوں کو تو ہم نے پہلے کوئی کتاب نہیں دی کہ یہ پڑھیں، اور نہ ہم نے پہلے ان کے پاس کوئی رسول یا نبی بھیجا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے لے کر حضور اکرم ﷺ تک چھ سو سال تک کوئی پیغمبر بھی نہیں آیا تو یہ مشرکین کس کی وصیت پر قائم ہیں؟ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی وفات کے بعد یہاں کوئی نبی نہیں آیا، یہ تو عناداً اور جہلاً اپنے آباء کی محض تقلید جامد کر رہے ہیں کہ ہمارے باپ دادا اسی طریقہ پر تھے۔

اس لیے اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان آیاتِ مبارکہ میں اس وصیت کا ذکر فرمایا، تا کہ یہود ونصاریٰ کا رد ہو جائے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ملت اسلام کی وصیت کی تھی کہ تم اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے تابع کر دو۔

﴿وَوَصّٰی بِھَآ﴾ میں ضمیر لفظ ''اللہ'' کی طرف راجع ہے یا پھر ماقبل والی آیات کی طرف راجع ہے کہ ﴿اِذْ قَالَ لَہٗ رَبُّہٗٓ اَسْلِمْ ۙ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾ یعنی میں نے اپنے آپ کو اللہ کے تابع کر دیا، اللہ کے حکم کے بعد چوں چرا کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ اگر ایک آدمی دعویٰ کرے کہ میں مسلمان ہوں تو اب اللہ کا جو حکم ہو گا، اس کے سامنے سر تسلیم خم کرنا ہو گا۔ یہ نہیں کہ آدمی اسلام کا دعویٰ کرے اور صرف ان احکام پر عمل کرے جو اس کے مفاد میں ہوں۔

کعب بن اشرف یہودی کے قتل کا واقعہ:

کعب بن اشرف جو معاہدے میں شریک تھا، اس نے کوئی ایسی دشمنی نہیں چھوڑی جو اس نے حضور اکرم ﷺ کے خلاف نہ کی ہو، حتیٰ کہ ایک جگہ حضور اکرم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک یہودیہ عورت سے چکی کا پتھر ایک صحابی پر گرا کر انہیں شہید کر دیا۔ اللہ کے نبی جیسی ذات کو بھی آخر یہ کہنا پڑا کہ کون ہے جو اس بدبخت (کعب بن اشرف) سے میرا بدلہ لے؟ محمد بن مسلمہ اُٹھ کھڑے ہوئے اور کہا: میں بدلہ لوں گا۔ آپ مجھے اجازت دیں کہ اس سے ایسی باتیں کروں کہ جس سے اس کو اپنی دوستی کا اعتماد دلاؤں۔ آپ ﷺ نے اجازت دے دی۔

محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ دو تین آدمیوں کو لے کر کعب بن اشرف سے ملے اور کہا: جب سے حضور اکرم ﷺ آئے ہیں ہمارا تو کوئی نام نہیں رہا۔ اس نے کہا: تم تو مسلمان ہو۔ انہوں نے کہا: جان بچانے کے لیے ملے ہوئے ہیں، تم



ہماری امداد کرو، تاکہ ہم لوگ اپنے پاؤں پر کھڑے ہوں۔اس نے کہا: میں امداد کرنے کے لئے تیار ہوں، لیکن ایک شرط پر قرض دوں گا کہ تم میرے پاس رہن رکھو۔محمد بن مسلمہ نے کہا: ہم تیار ہیں، کیا چیز رہن رکھیں؟ یہودی نے کہا: اپنی عورتیں میرے پاس رہن رکھ دو۔محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: مجھے جوش تو بڑا آیا، لیکن میں نے صبر کے ساتھ کہا: ہم عورتیں رہن نہیں رکھ سکتے، اس لیے کہ تم بڑے خوبصورت جمال والے ہو، ہماری عورتیں فتنہ میں مبتلا ہوجائیں گی، تم پر عاشق ہوجائیں گی تو ہم لوگ مصیبت میں آجائیں گے۔اس نے کہا: یہ بات ہے تو تم اپنے لڑکے میرے پاس رہن رکھ دو۔محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ نے کہا: آپ سردار آدمی، دولت مند آدمی ہو، ہم نے تمہارے پاس بچے رہن رکھ دیئے تو ساری دنیا ہمارے بچوں کو طعنے دے گی کہ تمہارے باپ دادا نے پیسوں کے لیے تمہیں رہن رکھا تھا۔اس نے کہا: بات تو تمہاری ٹھیک ہے، پھر تم کیا چیز رہن رکھو گے؟ ایسے تو میں تمہیں قرض نہیں دیتا۔محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ نے کہا: ہم تمہارے پاس اپنے ہتھیار رکھ دیتے ہیں۔اس نے کہا: ٹھیک ہے......وہ صحابہ کرام کو سمجھ نہ سکا؛ کیونکہ انہوں نے سوچا کہ اگر ہم ایسے اسلحہ لے کر آئیں تو یہ بدبخت ہمیں کہاں چھوڑیں گے؟ اب یہ خود کہہ رہا ہے، اس لئے ہتھیاروں کے ساتھ اندر پہنچ جائیں گے۔آگے دیکھا جائے گا......محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ نے پوچھا: کس وقت لے آئیں؟ اگر ہم دن کو ہتھیار رکھیں تو بے عزتی ہے، رات کا کوئی وقت دے دو، ہم چوری چوری لے آئیں گے۔کعب بن اشرف نے کہا: ٹھیک ہے، رات کو آجانا۔

محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ نے اپنے ساتھیوں سے کہا: بات سنو! یہ بڑا بدبخت ہے، یاد رکھو! جب میں اس سے ملنے کے بہانے ماتھے پر بوسہ دوں گا تو میں اس کو قابو کرلوں گا، تم اس کو نیچے سے کاٹ دینا، اس کو چھوڑنا نہیں ہے۔رات کے وقت سب ہتھیار لے کر پہنچ گئے۔کعب بن اشرف اپنے محل میں تھا، انہوں نے جاکر آواز دی۔ملازمین نے پوچھا: کیا بات ہے؟ محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ نے کہا: اس نے ہمیں خود بلایا ہے۔ملازمین اسی شش وپنج میں تھے کہ محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ نے اس کو زور سے آواز دی کہ ہم تمہارے دروازے پر کھڑے ہیں۔وہ آواز سن کر نیچے اُترنے لگا تو بیوی نے کہا: مت جاؤ، اس آواز سے خون کی بُو آتی ہے۔کعب بن اشرف نے کہا: یہ تو محمد بن مسلمہ ہے، میرا دوست ہے، وہ رہن رکھنے کے لئے سامان لایا ہے، ہم ان کے ہتھیار لے لیں گے، پھر ان کو ذلیل کریں گے۔بیوی نے کہا: تمہاری مرضی ہے۔

کعب بن اشرف باہر آیا اور صحابہ نے ہتھیار نیچے رکھے ہوئے تھے۔جب قریب آیا تو محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ نے کہا:

آج تجھ سے ایسی عطر کی خوشبوئیں آرہی ہیں کہ ایسا عطر تو میں نے کبھی نہیں سونگھا۔ اس نے کہا: تمہیں پتہ نہیں کہ میری بیوی عرب قبائل میں سب سے زیادہ عطر استعمال کرنے والی عورت ہے۔ جب میرے گھر میں ایسی بیوی ہوگی تو میں بھی عطر استعمال کروں گا۔ محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں اس کے سر پر بوسہ دے کر ہٹ گیا اور پھر کہا: اگر مجھے اجازت دو تو میں ایک دفعہ پھر خوشبو سونگھ لوں۔ اس نے کہا: کوئی بات نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اس کے بعد میں نے اس کو پکڑ لیا اور ساتھی نے حملہ کر دیا اور اس کو مارنے کے بعد میرے ساتھی بھاگ گئے۔ میں نے اس بد بخت کو اس وقت تک قابو رکھا جب تک وہ زمین پر نہیں گر گیا اور پھر میں قلعہ کی اوٹ میں بیٹھ گیا، تاکہ میں سن لوں کہ وہ مر گیا ہے۔ کچھ دیر گزری تو اس قلعہ پر نوحہ، رونا، چیخنا پکارنا شروع ہو گیا کہ کعب بن اشرف قتل ہو گیا۔

ہر شخص اپنی اولاد کو عقیدہ کی وصیت کرے:

﴿وَوَصّٰى بِهَآ اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهِ وَيَعْقُوْبُ﴾ اس آیت میں ذکر کیا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی اولاد کو وصیت کی اور یعقوب علیہ السلام کو بھی وصیت کی، جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پوتے ہیں۔ راجح قول یہی ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام بھی وصیت میں موجود تھے۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ موجود نہیں تھے، لیکن یہ قول راجح نہیں ہے؛ کیونکہ قرآن مقدس میں جب موجود ہے: ﴿وَامْرَاَتُهٗ قَآئِمَةٌ فَضَحِكَتْ فَبَشَّرْنٰهَا بِاِسْحٰقَ ۙ وَمِنْ وَّرَآءِ اِسْحٰقَ يَعْقُوْبَ﴾ [ہود:۷۱] ہم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خوشخبری دی کہ آپ کو ایسا بیٹا ملے گا اور پھر بیٹے کا بیٹا بھی ملے گا۔ لہٰذا حضرت یعقوب علیہ السلام بھی پیدا ہو چکے تھے۔

اس سے ہمیں یہ سبق بھی ملتا ہے کہ ہر مسلمان کو چاہیے کہ وہ اپنی اولاد کے لئے عقیدہ کی وصیت کرے۔ توحید پر رہنا، شرک نہ کرنا، بدعت میں نہ پڑنا، صحابہ رضی اللہ عنہم کی دشمنی نہ کرنا، قادیانی نہ بن جانا، فرقِ باطلہ سے بچنا اور دین اسلام پر قائم رہنا۔

دوسری وصیت اپنے مال کی کرے کہ میں نے فلاں کا قرضہ دینا ہے اور فلاں سے قرضہ لینا ہے۔ میرے بعد جائیداد وصیت کے احکام کے مطابق تقسیم ہو۔ اس لئے حکم ہے کہ آدمی نہ سوئے جب تک وصیت لکھی ہوئی اس کے سرہانہ کے نیچے موجود نہ ہو؛ کیونکہ موت کا کوئی پتہ نہیں ہے۔

﴿وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ ؕ وَيَعْقُوْبَ نَافِلَةً ؕ وَكُلًّا جَعَلْنَا صٰلِحِيْنَ﴾ [الانبیاء:۷۲]

ہم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اسحاق عطا فرمایا اور ان کے بعد پوتا یعقوب بھی عطا فرمایا۔ آدمی کو اولاد بڑی

پیاری ہوتی ہے، لیکن جب اولاد کی اولاد ہو جائے تو وہ اور زیادہ پیاری لگتی ہے۔ ان کے لئے آدمی پھر رہا ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آدمی کو نفع پیارا ہوتا ہے؛ کیونکہ اولاد تو اصل ہوئی۔

اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام حضرت ابراہیم علیہ السلام کی حیات میں پیدا ہو چکے تھے۔ پہلی کتابوں میں ہے کہ بیت المقدس کے بانی بھی وہی تھے۔

سب سے پہلے کون سی مسجد کی بنیاد رکھی گئی؟

صحیحین کی حدیث میں موجود ہے، ابوذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا: یارسول اللہ! اللہ نے سب سے پہلے کس مسجد کی بنیاد رکھوائی؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اَلْمَسْجِدُ الحَرَامُ، قَالَ: قُلْتُ: ثُمَّ أَيٌّ؟ قَالَ: اَلْمَسْجِدُ الأَقْصَى، قُلْتُ: كَمْ كَانَ بَيْنَهُمَا؟ قَالَ: أَرْبَعُونَ سَنَةً." [صحیح بخاری، رقم:۳۳۶۶]

مسجد حرام۔ میں نے کہا: مسجد حرام کے بعد پھر دوسری مسجد کون سی ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بیت المقدس۔ میں نے کہا: مسجد حرام کے بعد بیت المقدس کی بنیاد کے درمیان کتنی مدت ہے؟ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: چالیس سال ہے۔

ابن حبان رحمہ اللہ فرماتے ہیں: حضرت ابراہیم علیہ السلام بیت المقدس کے بانی ہیں کہ انہوں نے اس کی دوبارہ تعمیر کی اور حضرت سلیمان علیہ السلام اس کے مجدد ہیں۔ لیکن ابن حبان کی یہ بات کوئی مضبوط نہیں ہے۔ علماء نے فرمایا: ان کے درمیان تو ہزاروں سال کا فاصلہ ہے، نہ کہ چالیس سال کا۔

﴿يٰبَنِيَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ﴾ [البقرۃ:۱۳۲] حضرت ابراہیم علیہ السلام نے وصیت فرمائی کہ اپنی زندگی میں اچھے اچھے کام کرو، تمہیں نہ موت آئے مگر اس حال میں کہ تم اسلام پر ہو۔ یعنی اچھے کام کرتے رہو، تاکہ موت بھی اچھے کاموں پر آئے؛ کیونکہ عموماً آدمی جس لائن پر پڑا ہوا ہو، موت بھی اسی حال میں آتی ہے۔

یہود و نصاریٰ کا دین یعقوبی پر قائم رہنے کا دعویٰ:

اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل کی بہت بڑی نعمت عطا فرمائی ہے۔ انسان اپنی عقل سے خیر اور شر میں امتیاز کرتا ہے

اور یہ فیصلہ کرتا ہے کہ یہ چیز مجھے نفع پہنچانے والی ہے اور یہ چیز نقصان پہنچانے والی ہے۔ آپ آگ میں پاؤں نہیں ڈالتے، کانٹے کے اوپر پاؤں نہیں رکھتے، کوئی تیز ندی بہہ رہی ہو تو اس میں نہانے کی کوشش نہیں کرتے؛ کیونکہ عقل منع کرتی ہے کہ ڈوب جاؤ گے، جل جاؤ گے اور جہاں تمہیں صاف راستہ ملتا ہے وہاں قدم رکھتے ہو۔ عقل، اللہ کی عظیم نعمت ہے، آپ ان لوگوں کو دیکھیں جن سے اللہ تعالیٰ نے یہ نعمت چھین لی ہے۔ خوبصورت نوجوان ہوتے ہیں، صحت وتندرستی بھی ہوتی ہے، چلتے پھرتے ہیں، لیکن عقل نہیں ہوتی۔ اس لئے قاعدہ ہے کہ تو عقل سے دلائل دے گا آدمی جب بھی دعویٰ کرتا ہے، مثلاً غلاف کعبہ کالا ہے تو اس کی دلیل یہ ہے کہ سامنے ہے، دیکھ لو۔ آپ نے دعویٰ کیا کہ رات ہے۔ دلیل یہ ہے کہ چاند، تارے نکلے ہوئے ہیں۔ یا پھر نقل سے دلیل دے گا، یعنی کسی کتاب کا حوالہ ہوگا۔ جب یہود ونصاریٰ نے دعویٰ کیا کہ ہمیں حضرت یعقوب علیہ السلام نے وصیت کی ہے کہ تم میرے دین پر قائم رہو اور میرے سوا کسی کا دین قبول نہ کرنا۔ اس دعویٰ پر وہ بھی کوئی دلیل تو دیں۔ ہم عقل کے اعتبار سے دیکھتے ہیں تو بھی ہمیں یہ بات غلط لگتی ہے؛ کیونکہ اگر ایک پیغمبر کا زمانہ ختم ہوا تو دوسرے پیغمبر آ گئے۔ ایسا تو نہیں تھا کہ ایک کے بعد اللہ دوسرا پیغمبر بھیجیں تو اس کی بات کو نہ مانو۔ یہ ایک واضح بات ہے کہ کوئی عقل والا اس بات کو تسلیم نہیں کر سکتا۔ بادشاہ نے اگر ایک سفیر کے بعد دوسرا سفیر بنایا ہے تو ہم نے اس سفیر کا حکم بھی ماننا ہے۔ جب ہم نقل کی طرف آئیں تو قرآن مقدس کے اندر یہ بات موجود ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے تمام انبیاء اور رسولوں سے یہ عہد لیا تھا کہ محمد مدنی کا زمانہ ملے تو ان پر ایمان لے آنا۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کو پتہ تھا کہ ان انبیاء کو حضور اکرم ﷺ کا زمانہ ملنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس کا مطلب صرف یہ تھا کہ اپنی اپنی امتوں کو کہتے جاؤ، تاکہ شانِ مصطفیٰ ﷺ کا اظہار ہو کہ اتنی شان والا نبی آ رہا ہے کہ اللہ نے تمام نبیوں سے پابندی اور عہد لے لیا: ﴿لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ ۭ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰي ذٰلِكُمْ اِصْرِيْ﴾ [آل عمران:۸۱] حالانکہ اللہ تعالیٰ کے علم میں تھا کہ ہم نے ان کو آخر میں بھیجنا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا دور گزرے ہوئے چھ سو سال گزر گئے اور عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ نے آسمان پر اُٹھا لیا۔ جب تمام انبیاء یہ بات کہتے چلے آئے تو یہ دعویٰ کرنا کہ یعقوب علیہ السلام نے وصیت کی تھی کہ میرے بعد کسی کو نہ ماننا، یہ نقل کے خلاف ہے؛ کیونکہ یعقوب علیہ السلام، حضرت اسحاق علیہ السلام کے بیٹے ہیں اور وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بیٹے ہیں اور حضرت ابراہیم علیہ السلام تو حضور اکرم ﷺ کی بعثت کے لیے دعائیں مانگ رہے ہیں اور ان کی دعاؤں کا اللہ نے اظہار فرمایا اور تم اس کا انکار کر رہے ہو اور دعویٰ کرتے ہو کہ یعقوب علیہ السلام نے وصیت کی تھی۔ یہ ایسی بات تھی کہ ان

کے پاس نہ عقلاً دلیل تھی اور نہ نقلاً دلیل تھی۔ (اور اگر ایسی ہی بات ہے جیسے یہودی کہتے ہیں تو وہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے بعد حضرت موسیٰ، حضرت یوشع، حضرت سموئیل، حضرت داؤد علیہم السلام کو کیوں مانتے ہیں)؟

﴿اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ حَضَرَ یَعْقُوْبَ الْمَوْتُ ۙ اِذْ قَالَ لِبَنِیْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِیْ ؕ قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَ اِلٰهَ اٰبَآىٕكَ اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِیْلَ وَ اِسْحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۖۚ وَّ نَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ۝ تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَ لَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَ لَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ۝﴾ [البقرۃ: ۱۳۳، ۱۳۴]

”کیا تم موجود تھے جب یعقوب کی موت کا وقت آیا؟ جب انہوں نے اپنی اولاد سے کہا: میرے بعد کس کی عبادت کرو گے؟ کہا: ہم آپ کے معبود اور آپ کے آباء ابراہیم، اسماعیل اور اسحاق کے معبود کی عبادت کریں گے، جو تنہا معبود ہے اور ہم اس کے تابعدار رہیں گے۔ یہ ایک جماعت تھی جو گزر گئی، اس کے لیے وہ ہے جو اس نے (عمل) کیا اور تم (یہودیوں) کے لیے وہ ہے جو تم نے کیا اور تم سے نہیں پوچھا جائے گا کہ وہ کیا عمل کرتے تھے۔“

حضرت یعقوب علیہ السلام کا وفات کے وقت وصیت کرنا:

جب حضرت یعقوب علیہ السلام پر وفات کا وقت قریب آیا تو انہوں نے ایک ہی وصیت فرمائی کہ خالص اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو، اللہ کا شریک نہ بناؤ۔ اور اس بات کو مزید پکا اور مستحکم کرنے کے لئے یعقوب علیہ السلام نے ان سے ایک سوال کیا: ﴿مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِیْ﴾ کہ تم میری وفات کے بعد کس دین پر قائم رہو گے؟ کس کی عبادت کرو گے؟

ان کے بیٹوں نے جواب میں کہا: ﴿نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَ اِلٰهَ اٰبَآىٕكَ اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِیْلَ وَ اِسْحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا﴾ [البقرۃ: ۱۳۳]

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: حضرت یعقوب علیہ السلام، حضرت اسحاق علیہ السلام کے بیٹے تھے، حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بیٹے نہیں تھے اور حضرت اسماعیل علیہ السلام ان کے چچا ہیں۔ یہ تغلیب کے طور پر ہے کہ تغلیباً ”عم“ پر ”اب“ کا اطلاق بھی کر دیا جاتا ہے، یعنی چچا باپ کی جگہ ہے اور دادا بھی باپ ہے، کیونکہ وہ باپ کا باپ ہے۔ بعض صحابہ نے اس سے یہ بھی استدلال کیا ہے کہ دادا وہ بھی گویا باپ ہے۔ اگر دادا موجود ہے تو بھائی وراثت نہیں لیں گے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا رجحان اسی قول پر تھا۔ اس کی مزید تفصیل اپنی جگہ پر آئے گی۔

اللہ کے علاوہ کوئی عبادت کا مستحق نہیں ہے۔ اصل تو یہی توحید اُلوہیت ہے؛ کیونکہ توحید ربوبیت کے تو سب قائل ہیں کہ اللہ ہی پالنے والے، کھلانے والے، آسمان وزمین پیدا کرنے والے ہیں۔ توحید کا اصل مقام یہ ہے کہ عبادت خالص اسی کی ہو۔ عبادت میں کسی کو اس کا شریک نہ بناؤ اور اس سے بڑا کوئی شرک نہیں ہے کہ آدمی اللہ کے سوا غیر کو پکارے، اس سے استغاثہ کرے۔ ﴿وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ۝﴾ [البقرۃ:۱۳۳] اور ہم اسی کے سامنے جھکنے والے اور اسی کی اطاعت کرنے والے ہیں۔ ﴿اِلَیْهِ یُرْجَعُوْنَ۝﴾ [الانعام:۳۶] لاکھ انکار کریں، لیکن مرنے کے بعد اللہ کے دربار میں جانا پڑے گا۔

ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: جتنے انبیاء ورسل گزرے، ان سب کی ملت اسلام تھی۔ ہاں! شریعت مختلف تھی، یعنی بعض فروعی احکام مختلف تھے، مثلاً ہم پر پانچ نمازیں ہیں، موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں تین نمازیں تھیں، ہمارے لئے ایک مہینہ کے روزے ہیں، کسی شریعت میں دو مہینے کے روزے تھے، رات کو کھانا ناجائز تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ہر اُمت کو علیحدہ علیحدہ ان کے حالات کے مطابق شریعت دی، لیکن عقیدہ اور اسلام ایک ہی تھا۔ جیسا کہ فرمایا: ﴿وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِیْٓ اِلَیْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ۝﴾ [الانبیاء:۲۵] اس بارے میں قرآن کی متعدد آیات اور کثیر احادیث موجود ہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہم سب نبی علاتی بھائی ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر کسی کا زمانہ علیحدہ بنایا، شریعتیں الگ الگ بنائیں، لیکن عقیدہ، اُصول سب کا ایک ہے۔

﴿تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَلَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ۝﴾ [البقرۃ:۱۳۴] اس آیت میں پھر مشرکین اور کفار کا رد فرمایا کہ اے مشرکین مکہ! اے یہود ونصاریٰ! اگر تم پہلی اُمتوں کی باتیں کرتے ہو تو وہ اُمتیں تو گزر گئیں۔ اس اُمت نے جو کیا ہے اس کو اس کا پھل ملے گا اور تم جو کرو گے تمہیں اس کا پھل ملے گا۔ تو تم کیوں بلاوجہ یہ دعویٰ کرتے ہو کہ ہم نے پہلے دین ہی پر رہنا ہے۔ تم یہ دعویٰ نہ کرو کہ ہم انبیاء کی اولاد ہیں، ہم یعقوب علیہ السلام کی اولاد ہیں۔ یہ نسبت تم کو کوئی فائدہ نہیں پہنچائے گی، جب تک تم خود کوئی بھلائی کا کام نہ کرو۔ اگر صرف رشتہ داری بچا سکتی تو نوح علیہ السلام کا بیٹا اور لوط علیہ السلام کی بیوی جہنم میں نہ جاتی۔

﴿وَقَالُوْا كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰی تَهْتَدُوْا ۭ قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ حَنِیْفًا ۭ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ۝﴾
[البقرۃ:۱۳۵]

''اور کہتے ہیں کہ یہودی بن جاؤ یا عیسائی، ہدایت پا جاؤ گے۔ آپ (ان سے) کہہ دیجیے: بلکہ ہم ملت ابراہیم کی اتباع کریں گے جو موحد تھے اور ابراہیم مشرکین میں سے نہیں تھے۔''

شانِ نزول:

عبداللہ بن سوریا حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں آیا اور کہنے لگا: ہم یہود ہدایت پر ہیں۔ اے محمد! آپ بھی ہماری اتباع کریں اگر آپ ہدایت چاہتے ہیں۔ اور نصاریٰ کہتے: ہمارے دین پر آ جاؤ۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے میرے نبی! یہ یہود و نصاریٰ آپ سے کبھی بھی راضی نہ ہوں گے، چاہے آپ ان کے ساتھ تعلقات رکھ لیں جب تک کہ آپ یہودی یا نصرانی نہ بن جائیں۔

﴿حَنِيفًا﴾ کی مختلف تفاسیر:

1 ..... بعض علماء نے فرمایا: ''حَنِيفًا'' کا معنی ''مُسْتَقِيمًا'' ہے، یعنی بالکل سیدھا چلنے والا۔

2 ..... بعض علماء نے فرمایا: ''حَنِيفًا'' کا معنی ہے کہ خالص اللہ کی عبادت کرنے والا۔

3 ..... بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے اللہ کے لئے حج کرنے والا۔

4 ..... ابوالعالیہ رحمہ اللہ نے فرمایا: ''حنیف'' اس کو کہتے ہیں جو نماز میں اللہ کے کعبہ کی طرف رخ کرنے والا ہو اور اگر اللہ مال دے تو اس کے گھر کا حج بھی کرے۔

5 ..... حضرت مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''حنیف'' کا معنی ہے: اللہ کی اتباع کرنے والا۔

6 ..... حضرت ابوقلابہ رحمہ اللہ نے فرمایا: ''حنیف'' کا معنی ہے کہ اللہ کے تمام رسولوں پر ایمان لے آئے، جو پہلے آئے یا بعد میں آئے۔

7 ..... حضرت قتادہ رحمہ اللہ نے فرمایا: ''حنیف'' کا معنی ہے اللہ کی توحید کا اقرار کرنے والا، تمام آلہہ باطلہ کی نفی کرے اور جب وہ اللہ کی اطاعت کرنے والا ہے تو اللہ نے ماں، بیٹی، خالہ، بہن کے ساتھ نکاح حرام کیا ہے اور جو چیزیں اللہ تعالیٰ نے حرام کی ہیں ان کو حرام جانے اور اللہ نے ختنے کا حکم دیا ہے، اس کی بھی تعمیل کرے۔

یہ سارے اقوال متقاربۃ المعنی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں حضور اکرم ﷺ سے فرمایا کہ آپ اعلان کر دیں کہ ہم ملت ابراہیم پر ہیں۔ وہ توحید پر تھے، ہم بھی توحید پر ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا کعبہ بیت اللہ تھا اور

ہمارا کعبہ بھی وہی ہے۔ ان کے بھی مناسک حج تھے، ہمارے بھی مناسک حج ہیں۔ اصل ملت پر تو ہم ہیں، تم نہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ملت پر ہو اور نہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے دین پر ہو، بلکہ تم صرف اپنی خواہشات کی پیروی کر رہے ہو۔

﴿قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۖ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ﴾
[البقرۃ:۱۳۶]

”(اے مومنو! تم) کہہ دو ہم ایمان لائے اللہ پر اور اس پر جو ہم پر اُترا اور جو ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب اور اس کی اولاد پر اُترا اور جو موسیٰ اور عیسیٰ کو ملا اور جو دوسرے انبیاء کو ان کے رب کی طرف سے ملا، ہم ان میں سے کسی ایک کے درمیان بھی فرق نہیں کرتے اور ہم اسی پروردگار کے تابعدار ہیں۔“

ربط آیات:

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے گزشتہ بات کو دوسرے انداز میں بیان فرمایا ہے کہ تم اُمت مصطفیٰ کا اعلان کر دو کہ ہم حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لاتے ہیں، اجمالاً و تفصیلاً۔ اجمالاً جتنے پہلے اللہ کے نبی اور رسل گزرے ہیں ان پر ہمارا ایمان ہے اور تفصیلاً ہمارا عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم الانبیاء بنا کر بھیجا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت ختم ہوگئی، اب قیامت تک کوئی نبی و رسول نہیں ہوگا، شریعت نہیں ہوگی، صرف شریعت اسلام ہوگی، دین اسلام ہوگا۔ جیسا کہ قرآن میں بیان فرما دیا: ﴿مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ۗ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا﴾ [الاحزاب:۴۰] میرے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم سب سے آخری نبی ہیں۔

نبوت عام ہے اور رسالت خاص ہے۔ ہر رسول، نبی ہوتا ہے، لیکن ہر نبی، رسول نہیں ہوتا۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم النبیین بنا دیا گیا تو جو نبوت عام تھی، وہ ختم ہوگئی تو رسالت خود بخود ختم ہوگئی؛ کیونکہ جب خاتم عموم کے لیے آ جائے تو خصوص اس میں خود بخود داخل ہو گیا۔ لہٰذا اب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت قیامت تک کے لیے ہے۔

اسلام کو کھوکھلا کرنے والی دیمک:

بعض گمراہ لوگ اسلام کو نقصان پہنچانے میں یہود و نصاریٰ سے کسی طرح کم نہیں ہیں، بلکہ ان سے زیادہ

ہیں۔ مثال کے طور پر اگر آپ کو پتہ ہے کہ فلاں یہودی ہے یا نصرانی ہے تو آپ اس سے بچتے ہیں، لیکن کتنے مسلمان ہیں؟ جو یہودیوں کے عبادت خانے میں جاتے ہیں، بلکہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا الا یہ کہ جو صرف نام کے مسلمان ہیں، ان کا مذہب وغیرہ کوئی نہیں ہوتا وہ چلا جائے تو اور بات ہے، لیکن ان یہود و نصاریٰ سے زیادہ اسلام کو نقصان پہنچانے والے وہ گمراہ فرقے ہیں جو اسلام کا نام لے کر اسلام کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ وہ یہود و نصاریٰ سے بھی بدتر ہیں۔

بہرحال ہم مسلمانوں کا عقیدہ یہ ہے کہ تمام انبیاء برحق ہیں، تمام رسول برحق ہیں۔ ہمارا اُن پر اجمالاً ایمان ہے اور ہمارا عقیدہ ہے کہ خاتم الانبیاء سیدنا محمد مصطفیٰ ﷺ ہیں، ہمارا مفصل ایمان شریعت محمد مصطفیٰ ﷺ پر ہے، ان کے آنے سے پہلی شریعتیں بھی ختم، پہلی کتابیں بھی ختم، پہلے احکام بھی ختم ہو گئے۔ اب قیامت تک کتاب شریعت وہ حضور اکرم ﷺ کی ہے۔

تمام آسمانی کتابوں پر ایمان لانا ضروری ہے:

ہمارا تو اس کتاب پر بھی ایمان ہے جو ہماری طرف اُتاری گئی اور جو حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت اسماعیل علیہ السلام، حضرت اسحاق علیہ السلام، حضرت یعقوب علیہ السلام اور ان کی اولاد پر اُتارا گیا، سب پر ہمارا ایمان ہے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے جو موسیٰ علیہ السلام کو عطا فرمایا ہمارا اس پر بھی ایمان ہے، جو اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو عطا فرمایا ہمارا اس پر بھی ایمان ہے۔ ہم نبیوں میں فرق نہیں کرتے کہ اس کو مانتے ہیں اور اس کو نہیں مانتے، بلکہ ہم سب کو مانتے ہیں اور حضور اکرم ﷺ کی شریعت کے تابع ہیں۔

حضور اکرم ﷺ کی ختم نبوت:

''خاتم'' میں دو قراءتیں ہیں: ایک زبر کے ساتھ اور ایک زیر کے ساتھ۔ دونوں صورتوں میں معنی میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔

''خاتَم'' کا معنی مہر ہے، یعنی جیسے ساری درخواست لکھ کر، خط لکھ کر اس کے اوپر مہر کر کے سیل لگا دیتے ہیں کہ اب اندر کی چیز باہر نہ آئے اور باہر کی چیز اندر نہ داخل ہو سکے تو معنی ہوا کہ انبیاء اور رسولوں پر حضور اکرم ﷺ مہر ہیں، اب سلسلہ نبوت کے اندر نہ کوئی چیز کم ہوگی اور نہ زیادہ ہوگی اور اگر ''خاتِم'' بمعنی مہر لگائی جائے تو معنی ہوگا کہ



حضور اکرم ﷺ انبیاء پر گویا مہر لگانے والے ہیں۔

''خاتم'' بمعنی آخری۔ یعنی حضور اکرم ﷺ آخری نبی ہیں اور یہ ترجمہ حضور پاک ﷺ نے خود فرمایا کہ اے میری اُمت! تمام انبیاء پر اللہ تعالیٰ نے مجھے فضیلت دی ہے اور کچھ چیزیں مجھے ایسی ملی ہیں جو اور کسی کو نہیں ملیں۔ فرمایا: مجھے اللہ نے جوامع الکلم عطا فرمائے، یعنی ایسے کلمات عطا فرمائے جن کے لفظ تھوڑے ہیں، لیکن ان میں معانی کے سمندر بہہ رہے ہیں۔ میں جب دشمن کے خلاف قتال کروں تو دو مہینہ کی مسافت سے اللہ دشمنوں کے دلوں کے اندر میرا رعب ڈال دیتے ہیں اور تمام سرزمین اللہ نے میرے لیے پاک بھی کر دی اور مسجد بھی بنا دی۔ آخری یہ کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے نبیوں کو ختم کرنے والا بنایا ہے، میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے۔

حضور اکرم ﷺ نے واضح طور پر فرمادیا:

''أَنَا خَاتَمُ النَّبِيِّينَ لَا نَبِيَّ بَعْدِي.'' [جامع ترمذی، رقم:۲۲۱۹]

میں خاتم النبیین ہوں، میرے بعد کوئی نبی نہیں۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دور میں جو صحابہ کا اجماع ہوا، سارے صحابہ متفق ہوئے، یہی ختم نبوت کا مسئلہ تھا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اسی پر مسیلمہ کذاب کے خلاف لڑائی لڑی اور اس فتنہ کو ختم کیا۔

''خاتم'' کا ایک معنی یہ بھی ہے جس پر کمالات کی انتہاء ہو جائے۔ قادیانی مسلمانوں کے عقیدے کو توڑنے کے لئے کبھی ''مثنوی'' کے شعر لے آتے ہیں اور کبھی ''تحذیر الناس'' لے کر آتے ہیں کہ مولانا قاسم نانوتوی رحمہ اللہ نے یہ بات لکھی ہے کہ ''خاتم'' کا معنی کمالات اور شرف کی جامعیت ہے۔ حالانکہ یہ ان کی جہالت ہے اور یہ ان کی بات کو سمجھ نہیں سکے۔ مولانا قاسم نانوتوی رحمہ اللہ کے کہنے کا مقصد یہ تھا کہ ''خاتم'' کا ایک معنی ''مہر'' ہے اور ایک معنی ''آخر'' آتا ہے، آخر اور مہر کے معنی میں کوئی تعارض نہیں ہے۔ اسی طرح اس کا ایک معنی جامعیت باعتبار انتہاء کمال کے آتا ہے، لیکن نبوت کے اندر جتنے کمالات ہو سکتے تھے، اللہ تعالیٰ نے تمام کمالات کی حضور اکرم ﷺ پر انتہاء کر دی۔ مثال کے طور پر یوں سمجھیں کہ نبوت کے کمالات سو تھے، اللہ تعالیٰ نے کسی پیغمبر کو دس دیئے، کسی کو پندرہ دیئے۔ جب حضور اکرم ﷺ آئے تو آپ پر تمام کمالات کی انتہاء ہوگئی، شاہکار نبوت مکمل ہو گیا، اس میں کوئی نقص نہ رہا اور کمی باقی نہ رہی۔ انہوں نے فرمایا ہے کہ آپ ﷺ خاتم ہیں باعتبار زمانہ کے کہ جس طرح آپ ﷺ آخری نبی ہیں، آپ کے بعد کوئی نبی نہیں۔ اسی طرح آپ رُتبہ میں بھی ایسے نبی ہیں جن سے اوپر کسی کا رُتبہ نہیں ہے۔ ان

کا مقصد تو یہ تھا، لیکن قادیانیوں نے ختم نبوت کا اپنی مرضی والا معنی کر کے مسلمانوں کو غلطی میں ڈالنے کی کوشش کی۔

یاد رکھیں! ایک چیز کا ظاہر ہے اور ایک باطن ہے۔ ظاہر ہوگا تو باطن رہے گا۔ اسی طرح اگر ''خاتم'' کا ظاہری معنی اُڑا دیں تو معنی باقی نہیں رہے گا۔ بعض لوگوں کو سمجھ نہیں ہوتی تو باتیں کرتے ہیں، جیسا کہ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: خواب نبوت کا چھیالیسواں جزء ہے۔ قادیانی نے یہ بہانہ بنا کر کہہ دیا کہ خواب باقی ہے، لہٰذا نبوت بھی باقی ہے۔ یہ بھی ایک دھوکہ ہے۔ سمجھیں کہ ہاتھ، ٹانگ انسان کے جزو ہیں، اگر ہاتھ کو کاٹ کر کہیں ڈال دو گے تو کہیں گے: ہاتھ پڑا ہے، یہ نہیں کہیں گے کہ بندہ پڑا ہے یا کہو گے: بندے کا ہاتھ پڑا ہے۔ یہ نہیں کہہ سکتے کہ بندہ پڑا ہے؛ کیونکہ ایک جزء ہے۔ انبیاء علیہم السلام کو نبوت ملنے سے پہلے اللہ تعالیٰ خواب دکھاتے ہیں۔ خواب رحمانی بھی ایک مقام ہے اللہ تعالیٰ نے مؤمنین، متقین کے جو خواب باقی رکھے تو گویا انبیاء علیہم السلام کے ایک جزء علم کو باقی رکھا گیا۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ کل یعنی نبوت بھی باقی ہے۔ اگر کسی کی ایک آنکھ نہ ہو تو تم اس کو کانا کہتے ہو، دونوں نہ ہوں تو اندھا کہتے ہو۔ ٹانگیں نہ ہوں تو لنگڑا کہتے ہو، جبکہ ادھر ایک جزء کی وجہ سے والے کو نبی مان لو گے۔ یہ ایک دھوکہ ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ ہر مسلمان کو اس سے محفوظ فرمائے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ارشاد فرماتے ہیں: اہل کتاب، تورات کو عبرانی لغت میں پڑھتے تھے اور اس کا ترجمہ عربی میں کرتے تھے۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ''لَا تُصَدِّقُوا أَهْلَ الْكِتَابِ وَ لَا تُكَذِّبُوهُمْ'' [صحیح بخاری، رقم: ۴۴۸۵] (نہ تم ان کی بات کو سچا سمجھو اور نہ ان کی بات کو جھوٹا جانو، بلکہ کہو ہمارا اللہ تعالیٰ پر ایمان ہے اور اللہ نے جو اُتارا ہے، اس پر ہمارا ایمان ہے)۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: حضور اکرم ﷺ صبح کی نماز سے پہلے جو دو رکعتیں پڑھتے تھے اور آپ ﷺ زیادہ تر ان کی پہلی رکعت میں ﴿قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ﴾ پڑھتے تھے۔ [صحیح مسلم، رقم: ۷۲۷] حضور اکرم ﷺ کو صبح کی یہ دو رکعتیں بڑی محبوب تھیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ یہ بھی علامتِ قیامت ہی ہے کہ وقت گزرتے ہوئے پتہ ہی نہیں چلتا رات ختم ہوگئی اور صبح ہوگئی، دن ختم ہوگیا اور رات آگئی۔ اس لیے حضور اکرم ﷺ نے اس پر زور دیا کہ کفر سے براءت کا اعلان اور اللہ کی توحید کا اعلان کرو۔

آپ تمام احادیث مبارکہ پر نظر ڈالیں کہ جو جو آیات جہاں جہاں حضور اکرم ﷺ نے نماز میں پڑھی ہیں



مناسبت کے ساتھ پڑھی ہیں، ورنہ آپ کہیں سے بھی تین آیات پڑھ لیں تو نماز ہو جائے گی، لیکن وہ سورتیں جو حضور پاک ﷺ نے پڑھی ہیں، اگر ان کی اتباع کی جائے تو نور علی نور ہے۔ اس میں قرآن بھی پڑھا جائے گا اور سید الانام کی اتباع بھی ہو جائے گی۔

قرآن پڑھنے کا ذوق رکھنے والے شخص کا واقعہ:

ہمارے ہاں ایک شخص تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کو قرآن پر ایسا عبور دیا تھا کہ جب بھی کوئی بات ہوتی تو فوراً اسی کے مطابق قرآن کی آیت پڑھتے تھے۔ ایک آدمی نے ان کو ہاتھ والا پنکھا جھلنا شروع کیا، انہوں نے منع کیا تو قاضی صاحب نے کہا: "لَا بَأْسَ بِهٖ" (اس میں کوئی حرج نہیں)۔ انہوں نے کہا: ﴿فِيْهِ بَأْسٌ شَدِيْدٌ﴾ [الحدید:۲۵] اس طرح انہوں نے فوراً قرآن پاک کے لفظ سے جواب دے دیا۔

اللہ تعالیٰ بعض آدمیوں کو اس طرح کا ذوق نصیب فرماتے ہیں۔ آپ بھی اپنے اندر ایسا ذوق پیدا کریں کہ اگر آپ حج کرنے کے لیے آئے ہیں، لوگوں کو نماز پڑھا رہے ہیں اور آپ عالم ہیں تو حج والی آیات کی تلاوت کریں تو حج کے احکام تازہ ہوتے رہیں گے۔

﴿وَالْاَسْبَاطِ﴾ کی مختلف تفسیریں:

1 ...... حضرت ابو العالیہ رحمہ اللہ، حضرت ربیع رحمہ اللہ اور حضرت قتادہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ﴿اَلْاَسْبَاط﴾ حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد میں سے بارہ آدمی تھے، جیسے بنی اسماعیل میں بڑے بڑے قبیلے ہیں، اسی طرح وہ بھی قبیلے تھے۔

2 ...... زمخشری رحمہ اللہ نے لکھا ہے: ﴿اَلْاَسْبَاط﴾ سے مراد یعقوب علیہ السلام کے پوتے اور ان کی اولاد کی اولاد جو اُن بارہ سے پیدا ہوئی۔ امام رازی رحمہ اللہ نے بھی اسی کو نقل کیا اور کوئی رد نہیں کیا۔

3 ...... امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ﴿اَلْاَسْبَاط﴾ سے مراد بنی اسرائیل کے قبائل ہیں۔

4 ...... مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ﴿اَلْاَسْبَاط﴾ سے مراد بنی اسرائیل کے قبائل اور شاخیں ہیں جو بنی اسرائیل میں پیدا ہوئیں، جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: ﴿يٰقَوْمِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْۢبِيَآءَ وَجَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا ۖۗ وَّاٰتٰىكُمْ مَّا لَمْ يُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ﴾ [المائدۃ:۲۰] جرحم نے ان کو بارہ قبائل میں تقسیم کیا تھا۔

5 ...... قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "سبط" کا معنی ایک دوسرے کے پیچھے آنے والے۔

6 ......بعض نے کہا: اس کا معنیٰ ''درخت'' ہے۔ جیسے ایک درخت ہوتا ہے اور اس کی کئی شاخیں ہوتی ہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ تمام انبیاء بنی اسرائیل سے آئے، مگر دس پیغمبر بنی اسرائیل سے نہیں تھے۔ حضرت نوح علیہ السلام، حضرت ھود علیہ السلام، حضرت صالح علیہ السلام، حضرت شعیب علیہ السلام، حضرت ادریس علیہ السلام، حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت اسحاق علیہ السلام، حضرت یعقوب علیہ السلام، حضرت اسماعیل علیہ السلام اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم۔

[ابن کثیر: ۱۷۸]

﴿فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا هُمْ فِيْ شِقَاقٍ ۚ فَسَيَكْفِيْكَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿١٣٧﴾ صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً ۫ وَّنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ ﴿١٣٨﴾ قُلْ اَتُحَآجُّوْنَنَا فِي اللّٰهِ وَهُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ۚ وَلَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ۚ وَنَحْنُ لَهٗ مُخْلِصُوْنَ ﴿١٣٩﴾﴾

[البقرۃ: ۱۳۷ تا ۱۳۹]

''پس اگر (یہود و نصاریٰ) بھی ایمان لاتے جس طرح سے تم ایمان لائے ہو تو ہدایت پاتے اور اگر انہوں نے اعراض کیا تو پھر وہی ضد پر ہیں، پس اب آپ کی طرف سے بھی ان کو اللہ کافی ہے اور وہی سننے والا جاننے والا ہے۔ ہم نے اللہ کا رنگ قبول کیا اور اللہ کے رنگ سے زیادہ کس کا رنگ بہتر ہے؟ ہم تو اسی کی بندگی کرتے ہیں۔ کہہ دیجیے: کیا تم ہمارے ساتھ اللہ کے متعلق جھگڑتے ہو؟ حالانکہ وہ ہمارا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے، ہمارے لیے ہمارے اعمال اور تمہارے لیے تمہارے اعمال اور ہم تو خالص اسی کے لیے ہیں۔''

آیتِ مبارکہ سے یہود و نصاریٰ کا ردّ:

ان آیاتِ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے ملت ابراہیم کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے اور قرآن پاک نے یہ بات واضح بیان فرما دی ہے کہ ملت ابراہیمی صلی اللہ علیہ وسلم اور ملت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم ایک ہیں۔ اور واضح دلائل کے ساتھ مشرکین، یہود و نصاریٰ کا بھی رد فرما دیا۔ وہ دعویٰ کرتے تھے: ہم ملت ابراہیمی پر ہیں۔ چونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا واسطہ مشرکین اور یہود و نصاریٰ سے تھا، اس لیے ان کا نام لے لیا جاتا ہے، ورنہ کفر سے سارے کفار مراد ہوتے ہیں۔ چاہے وہ ہندو ہوں، بدھ مت ہوں، سکھ ہوں، مجوسی ہوں یا دہریے ہوں؛ کیونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے فرمان

میں وضاحت فرمادی ہے: "اَلْكُفْرُ مِلَّةٌ وَّاحِدَةٌ" کفر ایک ہی ملت ہے، چاہے وہ کسی شکل میں ہو۔ اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں ارشاد فرمایا: اے میرے نبی! آپ یہود و نصاریٰ، مشرکین اور پورے عالم کے کافروں کو بتادیں کہ تم ایمان لے آؤ اس طرح جس طرح میرے صحابہ مومنین کی جماعت ایمان لائی ہے، تم ہدایت کو پالو گے۔ ایمان کا نمونہ محمد رسول اللہ ﷺ اور اصحاب رسول اللہ رضی اللہ عنہم ہیں۔

چار بڑے بتوں کا ذکر:

حرم میں چار بڑے بت تھے: اساف، نائلہ، ہبل اور لات۔ کتابوں میں ان کا ذکر موجود ہے۔ لات ایک بندہ تھا، وہ ستو بنا کر حاجیوں کی خدمت کرتا تھا۔ جب وہ مرگیا تو اس کا بت بنا دیا گیا۔ بعض لوگوں نے فرشتوں کی شکل پر بت بنائے تھے۔ ان کے دماغ میں یہ تھا کہ (نعوذ باللہ) فرشتے اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں۔ اس لیے آج بھی مندروں کے اندر کچھ بت مردوں کی شکل میں ہوتے ہیں اور کچھ عورتوں کی شکل میں ہوتے ہیں؛ کیونکہ ان کا عقیدہ تھا کہ ملائکہ اللہ کی بیٹیاں ہیں، اس لیے اللہ نے ان کو آسمانوں میں چھپا کر رکھا ہے۔ اگر لڑکے ہوتے تو سب کے سامنے آتے، لیکن لڑکیاں ہونے کی وجہ سے اللہ نے پردے میں رکھا ہوا ہے۔

حضور اکرم ﷺ کے زمانہ میں جس طرح صحابہ کرام ایمان لائے، تم بھی اسی طرح ایمان لاؤ تو ہدایت پا جاؤ گے۔ اگر یہ اس طرح ایمان نہ لے آئیں اور اعراض کریں تو ان کو چھوڑ دیں۔ یہ جھگڑے میں پڑے ہوئے ہیں۔ آپ میری توحید کو لے کر جب مشرکین سے اور یہود و نصاریٰ سے ٹکرائیں گے تو دل میں خیال آئے گا کہ مسلمانوں کی جماعت کمزور ہے، وہ ان کا مقابلہ کیسے کرے گی؟ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: آپ بالکل غم نہ کریں، آپ کا رب آپ کو کافی ہے، وہی آپ کی نصرت و مدد کرے گا، آپ کو عزت دے گا۔ ساری دنیا میں شرک ہو، لیکن آپ توحید پر ثابت قدم رہیں، اللہ تعالیٰ ہی دعاؤں کو سننے والا اور جاننے والا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا رنگ سب سے بہترین رنگ ہے:

﴿صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً ۫ وَّنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ﴾ [البقرۃ:۱۳۸]

نصرانیوں کے اندر ایک رسم تھی کہ جب ان کا کوئی بچہ پیدا ہوتا تو وہ ایک حوض بنا کر اس کے پانی میں رنگ ڈال دیتے اور بچے کو اس کے اندر غوطہ دیتے تھے۔ آج بھی ان میں یہ رسم باقی ہے، اس کو وہ "بپتسمہ" کہتے ہیں۔ آج

بھی اگر کوئی نصرانی ہو جائے تو اس کو گرجا گھر میں لے جاتے ہیں اور پادری اس پر پانی چھڑکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ان کو کہو کہ رنگ دینے سے رنگ چڑھ جاتے ہیں، اصل رنگ تو توحید کا رنگ ہے جو اللہ تعالیٰ نے ہم پر اسلام کا رنگ چڑھایا ہے، اگر رنگ دینا ہے تو جو رنگ کا خالق ہے، اس سے بہتر رنگ دینے والا کون ہوسکتا ہے اور اسی رنگ کا اثر ہے کہ ہم تو صرف اسی کی عبادت کرتے ہیں اور کسی کی عبادت نہیں کرتے۔ اگر پھر بھی یہ جھگڑا کریں تو ان کہہ دیں کہ ہم تو صرف اس ہی کی عبادت کرنے والے ہیں۔

اس سے سمجھ آیا کہ مسلمان آدمی تب بنے گا جب خالص اللہ تعالیٰ کی عبادت کرے گا، اسلام تب آئے گا جب خالص اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرے گا۔

﴿فَاِنۡ اٰمَنُوۡا بِمِثۡلِ مَاۤ اٰمَنۡتُمۡ بِهٖ فَقَدِ اهۡتَدَوۡا﴾ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تم ایمان والے تب بنو گے جب اپنے ایمان کو صحابہ کے ایمان والی کسوٹی پر پرکھ لو۔ اگر ان کی کسوٹی پر تمہارا ایمان پورا اُترتا ہے تو الحمدللہ! اور اگر ان کی طرح ایمان نہیں ہے تو تم ہدایت پر نہیں ہو۔

اب جو لوگ صحابہ رضی اللہ عنہم کو نہیں مانتے یا ان کے اعداء ہیں، وہ چاہے لاکھ کہتے پھریں کہ ہم حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو مانتے ہیں؛ کیونکہ جو حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو مانے وہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا دشمن نہیں ہوسکتا؛ کیونکہ آپ رضی اللہ عنہ محسن بلال ہیں، انہوں نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو غلامی سے چھڑوایا۔ اسی طرح اگر کوئی حضرت سلمان رضی اللہ عنہ پر ایمان رکھتا یا حضرت مقداد رضی اللہ عنہ پر ایمان رکھتا ہے یا اہل بیت رسول پر ایمان رکھتا ہے تو ناممکن ہے کہ وہ دوسرے اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہ رکھے؛ کیونکہ اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ پر ایمان ہے تو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ، عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ پر بھی ایمان رکھنا پڑے گا؛ کیونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ان سب سے محبت کا تعلق ہے۔

عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کا گواہ:

ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے نافع بن نعیم رحمہ اللہ سے روایت نقل کی ہے کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا جو مصحف تھا، جس میں وہ تلاوت فرماتے تھے، وہ ہمیں مل گیا۔ جب میں نے اس بات کا ذکر کیا تو لوگوں نے کہا: ہم نے سنا ہے کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی گود میں قرآن تھا، جب ان کو شہید کیا گیا وہ تلاوت فرما رہے تھے، ان کا خون قرآن مقدس کے صفحات پر گرا تھا۔ یہ بات کس حد تک صحیح ہے؟ حضرت نافع رحمہ اللہ نے فرمایا: اللہ کی قسم ہے! میں نے وہ خون اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے جب مجھے وہ مصحف بھیجا گیا میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا، یہی آیت ﴿فَسَيَكۡفِيۡكَهُمُ اللّٰهُ﴾

﴿وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ﴾ تھی جس پر آپ رضی اللہ عنہ کو شہید کیا گیا اور آپ رضی اللہ عنہ کا خون مبارک اس آیت پر گرا تھا۔

شبہ اور اس کا ازالہ:

بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ ان کو کافی تھے تو وہ کیوں شہید ہوئے؟ کافی ہونے کا معنی یہ ہے کہ ان کو مرتبہ شہادت نصیب کیا۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ اصل کامیابی آخرت کی کامیابی ہے، دنیا تو عارضی ٹھکانا ہے۔ اس سے بڑی کامیابی کیا ہوگی کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو کامیاب فرمایا، وہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان پر قائم رہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بشارت دی تھی کہ اے عثمان! تم بھی اللہ تعالیٰ کے راستے میں شہید کیے جاؤ گے۔

اُحد پہاڑ کا خوشی سے جھومنا:

حدیث مبارکہ میں آتا ہے کہ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ، سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی اُحد پہاڑ پر موجود تھے، پہاڑ میں زلزلہ آنے لگا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قدم مبارک کو اُحد پہاڑ پر مارا اور فرمایا: تمہیں کیا ہوگیا ہے؟ حالانکہ تمہارے اوپر ایک اللہ کا نبی ہے، ایک صدیق ہے اور دو شہید ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو بشارت دی کہ عثمان! تجھے جنت کی مبارک دیتا ہوں، لیکن تم پر ایک امتحان آئے گا، ایک مصیبت آئے گی، جس میں تم آزمائے جاؤ گے۔

حدیث مبارک میں ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے عثمان! اللہ تجھے جو قمیص پہنائیں گے، اس کو لوگ اُتارنے کی کوشش کریں گے، لیکن تم خیال رکھنا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ آپ کو جو خلافت کی قمیص پہنائیں گے، لوگ اس کو اُتارنے کی کوشش کریں گے اور لوگوں نے اُتارنے کی کوشش کی بھی، لیکن حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ آخری وقت تک اپنے مقام (اپنی خلافت) پر قائم ودائم رہے۔

﴿صِبْغَةَ اللّٰهِ﴾ کی تفسیر:

﴿صِبْغَةَ اللّٰهِ﴾ سے مراد اللہ کا دین ہے۔ جب آدمی کسی کا تبع ہو جائے، کسی کی اطاعت کے اندر پورا پورا داخل ہو جائے تو کہتے ہیں: ''فلاں پر فلاں کا رنگ چڑھ گیا ہے۔'' ﴿صِبْغَةَ اللّٰهِ﴾ منصوب ہے اور اس کا عامل ناصب محذوف ہے، یعنی ''اِلْزَمُوْا صِبْغَةَ اللّٰهِ'' کہ اللہ کے رنگ کو لازم پکڑو۔ بعض نے کہا: یہ ﴿مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ﴾ کا بدل ہے، اس وجہ سے منصوب ہے، اور بعض حضرات نے فرمایا: مصدر ہے، اس لیے منصوب مؤکدہ ہے۔

ابن ابی حاتم اور ابن مردویہ نے ایک روایت نقل کی ہے، حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: بنی اسرائیل نے اپنے زمانہ میں موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ کیا تمہارے رب بھی تمہیں اللہ دیں گے؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: اللہ تعالیٰ سے ڈرو، کیا کہہ رہے ہو؟ اللہ پاک نے فرمایا: ان کو کہو: بالکل تمام رنگوں کو حقیقت میں رنگ دینے والا میں ہوں۔

﴿أَمْ تَقُولُونَ إِنَّ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطَ كَانُوا هُودًا أَوْ نَصَارَىٰ ۗ قُلْ أَأَنتُمْ أَعْلَمُ أَمِ اللَّهُ ۗ وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّن كَتَمَ شَهَادَةً عِندَهُ مِنَ اللَّهِ ۗ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ﴿١٤٠﴾ تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۖ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُم مَّا كَسَبْتُمْ ۖ وَلَا تُسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿١٤١﴾﴾ [البقرۃ: ۱۴۰، ۱۴۱]

کیا تم کہتے ہو کہ ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب اور یعقوب کی اولاد یہودی تھے یا عیسائی؟ آپ کہہ دیجیے: کیا تمہیں زیادہ خبر ہے یا اللہ کو؟ اس سے بڑا کون ظالم ہے جو اس گواہی کو چھپائے جو اس کے پاس (تورات میں) اللہ کی طرف سے ثابت ہو چکی ہے؟ اور اللہ تمہارے کاموں سے غافل نہیں ہے۔ وہ ایک اُمت تھی جو گزر چکی، اس کے لیے وہ ہے جو اس نے کمایا اور تم (یہودیوں) کے لیے وہ ہے جو تم نے کیا۔ اور تم سے نہیں پوچھا جائے گا ان اعمال کے بارے میں جو وہ کیا کرتے تھے۔"

ان آیات میں تفصیل کے ساتھ مشرکین اور یہود و نصاریٰ کا ردّ ہے؛ کیونکہ اس وقت حضور اکرم ﷺ کے مخاطب مشرکین اور یہود و نصاریٰ تھے۔ یہ اصول اور قاعدہ ہے کہ جو آدمی اللہ تعالیٰ کے سوا کسی غیر کی عبادت کرے، چاہے بت کی عبادت کرے یا چاند سورج کی عبادت کرے، اللہ کے فرشتوں کی عبادت کرے، اللہ کے انبیاء و اولیاء کی عبادت کرے یا زندہ و مردہ کی عبادت کرے، ایک ہی بات ہے اور سب شرک میں داخل ہے۔ فرق اتنا ہوتا ہے کہ جن علماء کا مقابلہ مثلاً ہندوؤں سے ہے، وہ بت پرستی کے خلاف زیادہ زور دیں گے اور جن علماء کا مقابلہ آتش پرستوں کے ساتھ ہوتا ہے وہ ان کا زیادہ رد کریں گے اور جن علماء کا مقابلہ ان لوگوں سے ہوا جو چاند، سورج، سیارات کو نظام عالم کا چلانے والا سمجھتے ہیں، وہ اس کا زیادہ رد کریں گے۔ ورنہ بات ایک ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کو چھوڑ کر کسی غیر کی عبادت کرنا شرک ہے۔

حضور اکرم ﷺ ان کا مقابلہ ان تینوں کے ساتھ تھا اور ان سب کا دعویٰ تھا کہ ہم ملت ابراہیمی پر ہیں اور انہوں

نے چند رسومات کو ادا کرنے کا نام ملت ابراہیمی رکھ دیا تھا اور عقیدہ کی پرواہ نہ کی۔ اور یہی وہ بنیادی دھوکہ ہے جس میں آج مسلمان بھی مبتلا ہیں کہ عقیدے کی اصلاح کی طرف متوجہ نہیں ہوتے۔

﴿سَيَقُولُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِيْ كَانُوْا عَلَيْهَا ۚ قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿١٤٢﴾ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ۚ وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِيْ كُنْتَ عَلَيْهَآ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ ۚ وَاِنْ كَانَتْ لَكَبِيْرَةً اِلَّا عَلَى الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ ۚ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ ۚ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿١٤٣﴾﴾ [البقرة: ۱۴۲، ۱۴۳]

''عنقریب بیوقوف لوگ کہیں گے کہ کس چیز نے مسلمانوں کو ان کے قبلہ (بیت المقدس) سے پھیر دیا جس پر وہ تھے؟ آپ کہہ دیجیے: مشرق و مغرب (سب جہتیں) اللہ کی ہیں۔ وہ جس کو چاہے سیدھی راہ چلائے۔ اور اسی طرح ہم نے اے اُمت (محمدیہ)! تمہیں معتدل اُمت بنایا ہے، تاکہ تم لوگوں پر گواہ بنو (کہ انبیاء نے تبلیغ کر دی تھی) اور رسول تم پر گواہی دینے والا ہو۔ اور ہم نے وہ قبلہ جس پر آپ تھے اس کو مقرر نہیں کیا تھا، مگر اس لیے کہ ہم جان لیں کہ کون رسول کا تابعدار رہے گا اور کون اُلٹے پاؤں پھر جائے گا؟ اور یہ قبلہ (کعبہ) کی طرف پھیرنا بھاری ہے، مگر ان پر جن کو اللہ نے ہدایت دی اور اللہ ایسا نہیں کہ تمہارا ایمان (نمازیں) ضائع کر دے۔ بے شک اللہ لوگوں پر بہت شفیق، نہایت مہربان ہے۔''

تحویل کعبۃ اللہ:

ان آیات مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے تحویل قبلہ کا مسئلہ ذکر فرمایا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے پوری زمین اور پوری کائنات پیدا فرمائی تو تمام زمین میں افضل حصہ کعبۃ اللہ تھا۔ جب اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان کو حکم دیا کہ تم میری اطاعت کرو، چاہے تم میری اطاعت اپنی رضا سے کرو یا جبر سے کرو تو سب سے پہلے کعبۃ اللہ کی زمین کے ٹکڑے نے جواب دیا کہ یا اللہ! ہم آپ کے ہر حکم کی اطاعت کرنے کے لئے تیار ہیں۔ اسی طرح یہ بھی ثابت ہے کہ جب زمین کو بچھایا گیا تو کعبہ والی جگہ سے بچھایا اور پھیلایا گیا۔ گویا یہ پوری زمین کا مرکزی نقطہ ہے، کیونکہ ہر دائرے

کے لئے ایک مرکز کی ضرورت ہوتی ہے، مرکز کے بغیر دائرہ نہیں بنتا اور وہی مرکز اصل ہے، اس کے ذریعے سے آپ کو معلوم ہوگا کہ دائرہ غلط ہے یا صحیح ہے۔ دائرہ تب مکمل ہوتا ہے جب اس کے دونوں سرے برابر ہوں۔ اگر ایک خط بڑا اور ایک چھوٹا ہو تو دائرہ مکمل نہیں ہوگا اور اگر وہ آپس میں نہ ملیں تو تب بھی دائرہ مکمل نہیں ہوگا۔ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا تو ان کا قبلہ بھی یہی کعبہ بنایا۔ لوگوں کے ہاں جو مشہور ہے کہ قبلہ اوّل مسجد اقصیٰ ہے، یہ درست نہیں، بلکہ قبلہ اوّل یہی اللہ کا کعبہ ہے۔ جب آدم علیہ السلام کو زمین پر اُتارا گیا تو انہوں نے سب سے پہلے اسی کعبہ کا حج کیا، اسی کعبہ میں حاضر ہوئے اور اسی کعبہ کی طرف رخ کر کے نمازیں پڑھیں اور پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے تک قبلہ یہی کعبہ رہا۔ قرآن میں آتا ہے: ﴿إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَهُدًى لِّلْعٰلَمِينَ ﴿٩٦﴾﴾ [آل عمران: ۹۶] سب سے پہلا گھر جو لوگوں کی عبادت کے لئے بنایا گیا، کعبۃ اللہ ہے۔

علماء نے اس کی تاریخ میں لکھا ہے کہ ابھی زمین بھی نہیں بنی تھی، صرف پانی ہی پانی تھا، پانی کے اوپر کعبۃ اللہ والی اسی جگہ پر بلبلہ پہلے بھی موجود تھا، جو اس بات کی علامت تھی کہ یہیں اللہ کا گھر کعبہ ہوگا۔ اللہ کے حکم سے اس کعبہ کو ملائکہ نے حضرت آدم علیہ السلام کے آسمانوں سے اُترنے سے ایک ہزار سال پہلے بنایا تھا؛ کیونکہ حضرت آدم علیہ السلام سے پہلے زمین پر جنات آباد تھے۔ یہی وہ کعبۃ اللہ ہے جو عین اس کعبہ کے نیچے ہے جو ساتویں آسمان پر ہے۔

بعض علماء نے یہ بھی لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان بنائے، ساتویں آسمان پر بیت المعمور ہے اور ساتویں آسمان کے اوپر کرسی ہے جو سات آسمانوں کو بھی اپنی لپیٹ میں لئے ہوئے ہے، اور اس کرسی کے اوپر عرش ہے۔ علماء نے فرمایا: کرای اور عرش بھی اسی کے اوپر ہے۔

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کا زمانہ آیا۔ چونکہ انبیاء کا مولد اور مرکز شام تھا، یہ ایسی جگہ تھی جہاں اللہ تعالیٰ نے ظاہری اور باطنی برکتیں رکھی تھیں، اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس جگہ کو میدانِ حشر کا بھی شرف بخشا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس جگہ کو تمام انبیاء علیہم السلام کے جمع ہونے کی جگہ بھی بنانا تھا، اس لئے کچھ عرصے کے لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ کے بعد بنی اسرائیل کو حکم ہوا کہ تم بیت المقدس کی طرف نمازیں پڑھو۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو کیسے اختیار کیا؟ یہ بحث آگے ذکر ہوگی۔ بہر حال آپ صلی اللہ علیہ وسلم کافی عرصہ بیت المقدس کی جانب رخ کر کے نماز پڑھتے رہے۔ بعض رُواۃ نے فرمایا کہ سولہ مہینے اور بعض علماء نے فرمایا: سترہ مہینے بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نمازیں پڑھتے رہے اور دل میں اللہ پاک سے تمنا بھی کرتے رہے کہ قبلہ تحویل ہو جائے۔ آخر اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی

آرزو کو پورا فرمایا اور اللہ تعالیٰ نے حکم دے دیا کہ اب مسجد اقصیٰ کی طرف سے اپنا رخ مبارک پھیر لیں، اب آپ مسجد الحرام کی طرف رخ کر کے نمازیں پڑھیں۔ اب قیامت تک یہی قبلہ رہے گا جو حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قبلہ تھا۔ درمیان میں جو مسجد اقصیٰ کا عارضی حکم تھا، اس کو ہم نے منسوخ کر دیا ہے۔ جیسے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت قیامت تک ہے، اللہ تعالیٰ کی کتاب قرآن مجید قیامت تک ہے، اسی طرح اب یہ قبلہ بھی مسلمانوں کے لئے قیامت تک ہے۔

ان آیات میں یہودیوں، نصرانیوں اور مشرکین مکہ کا رد فرمایا گیا کہ ہر مذہب والے اپنے مذہب کی تائید میں اسلام کے خلاف اعتراض کرتے تھے، بیت اللہ المقدس کا احترام کرتے ہیں اور کرتے رہیں گے۔ نصرانی اور یہودی، لوگوں کے دلوں میں شکوک ڈالتے تھے کہ اصل چیز عبادت ہے اور اللہ کے نبی ہمارے قبلہ کی طرف رخ کر کے عبادت کرتے ہیں۔ لہٰذا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہمارے دین کو اچھا سمجھتے ہیں، لیکن قبول نہیں کر رہے، ظاہر نہیں کر رہے۔

میاں بیوی کے درمیان شیطان کا مکر:

اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کی عزت کو محفوظ رکھے۔ مثال کے طور پر آپ کی شادی کو دس یا پندرہ سال گزر گئے، آپ اور آپ کی بیوی بچے سب اطمینان سے زندگی گزار رہے ہیں، لیکن ایک شیطان آ کر رخنہ ڈال دیتا ہے۔ خاوند سے کہتا ہے کہ میں نے آپ سے ایک بات کہنی تھی۔ وہ کہے گا: بتائیں۔ یہ کہے گا: چھوڑیں آپ ناراض ہو جائیں گے۔ تو اب اس آدمی کو اُلجھن میں ڈال دیا، اب یہ آدمی اس سے ضرور پوچھے گا کہ مجھے بتاؤ! میں ناراض نہیں ہوں گا۔ کئی دن تک اس کے دماغ کو الجھن میں مبتلا کرنے کے بعد وہ کہے گا کہ آپ نے یہ بات ظاہر نہیں کرنی۔ جب بات پکی ہو جائے گی تو وہ کہے گا: کل میں نے دیکھا تھا کہ جب تم نوکری پر چلے جاتے ہو تو تیری بیوی دروازہ کھول کر پتہ نہیں کس کس کو دیکھتی رہتی ہے۔ اس طرح خاوند کے دماغ میں ایک شکوک کا گھیرا ڈال دیتا ہے اور بیوی کے دماغ میں بھی کیڑا ڈال دیا کہ آپ میری بہن ہیں، ہم آپ کے گھر میں کھانا کھاتے ہیں اور شرم آتی ہے۔ میں کیا کروں! تمہارا خاوند بھی میرا بھائی ہے، وہ بڑی مہربانی کرتا ہے، میں آپ سے کہنا تو نہیں چاہتا تھا، لیکن میں مجبور ہو گیا ہوں، تمہارے خاوند کو چھٹی چھ بجے ہوتی ہے، یہ آٹھ بجے آتا ہے، یہ دو گھنٹے آپ کو پتہ نہیں کہاں رہتا ہے؟ اس نے فلاں جگہ معاشقہ کیا ہوا ہے۔ اس طرح بیوی کے دماغ میں بھی خلل ہو گیا۔ اب اس نے دیکھنا شروع کیا کہ میرا خاوند کہاں جاتا ہے؟ اس طرح وہ اس کو دیکھنے کے لئے دروازہ تو کھولے گی ادھر خاوند نے بھی دیکھنا شروع کر دیا کہ

کھڑکی، دروازہ کھلا ہے یا بند ہے؟ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہنستا بستا گھر برباد ہوگیا اور درمیان میں ایک شیطانی کر کے چلا گیا اور وہ اپنی جگہ ان دونوں کا خیر خواہ بھی بنا رہا، لیکن اس کا انجام یہ ہوا کہ لڑائیاں ہوئیں، طلاقیں ہوگئیں، بچے برباد ہوگئے۔

باطل بھی اسی طرح دلوں میں فتنہ اور خلل ڈالتا ہے کہ آپ سچ کہتے ہیں، آپ کا عقیدہ بھی ٹھیک ہے، قرآن شریف بھی برحق ہے، اللہ کے نبی بھی برحق ہیں، صحابہ رضی اللہ عنہم بھی برحق ہیں، لیکن بات یہ ہے کہ اگر آپ کی لڑکی کی کوئی جائیداد چھین لے آپ کو اچھا نہیں لگے گا۔ آپ کی ساری باتیں ٹھیک ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ پہلے ایمان لے آئے، اسلام کے لئے بہت خرچ کیا، لیکن انہوں نے نبی کی بیٹی کو میراث سے محروم کر دیا۔ اس طرح دل کے اندر سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے خلاف کیڑا ڈال دیا۔ اب تو کوئی علم والا عالم ہی اس مسئلہ کو حل کر سکتا ہے۔ پہلے یہ تو سوچیں کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جائیداد کتنی تھی؟ اور دوسرا یہ کہ باغ فدک حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ملکیت میں بھی تھا یا نہیں تھا؟ خمس تھا، مالِ غنیمت تھا یا حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خیبر میں خریدا تھا۔ یہ عالم کا کام ہے، لیکن ایک جاہل کے دماغ میں اتنا کیڑا کافی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیٹی کو محروم کر دیا۔

یہود ونصاریٰ کے اعتراضات اور ان کے جوابات:

یہودی اور نصرانی بھی کہتے اسی طرح تھے کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ملت ابراہیمی پر ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں، جبکہ ان کا قبلہ تو انہوں نے چھوڑا ہوا ہے اور بیت المقدس کی طرف نماز پڑھتے ہیں۔ اس طرح انہوں نے لوگوں کے دماغ میں ایک شبہ ڈال دیا۔ دوسرا شبہ یہ ڈالا کہ اگر ہم غلط ہیں تو ہمارا کعبہ بھی غلط ہے تو پھر اس کی طرف رخ کر کے نماز کیوں پڑھتے ہیں؟

﴿سَيَقُولُ السُّفَهَاءُ﴾... ''س'' اور ''سَوْفَ'' کا استعمال، استقبال کے لیے ہوتا ہے۔ یعنی زمانہ مستقبل میں کہیں گے۔ اس لیے بعض علماء نے فرمایا: ابھی قبلہ کے بدلنے کا حکم نہیں آیا تھا اور اللہ تعالیٰ نے یہ آیت پہلے اُتار دی تھی اور اپنے پیغمبر علیہ السلام کو فرما دیا کہ تمہاری تمنا کو بھی ہم جانتے ہیں، ہم تمہیں قبلہ کی طرف بھی پھیر دیں گے، لیکن جب ہم پھیر دیں گے تو یہ جاہل کہیں گے کہ اب کیوں پھیرا ہے؟ اللہ کے علم میں تھا کہ انہوں نے یہ کہنا ہے، اس لیے تحویل قبلہ کے حکم سے پہلے اپنے پیغمبر علیہ السلام کو خبر دے دی۔

علماء نے فرمایا: کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ زمانہ مستقبل کی بات ہوتی ہے، لیکن قرآن میں اس کو ماضی کے صیغہ کے

ساتھ ذکر فرما دیتے ہیں۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَنَادَىٰ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ أَصْحَابَ النَّارِ﴾ [الاعراف:۴۴] جنت والوں نے پکارا دوزخ والوں کو۔ حالانکہ جنت والے تو اس وقت پکاریں گے جب جنت میں چلے جائیں گے اور دوزخ والے دوزخ میں چلے جائیں گے، لیکن ماضی کا صیغہ اس لئے استعمال کیا، کیونکہ یہ خبر اتنی پکی ہے کہ گویا جنت والے جنت میں چلے گئے اور جہنم والے جہنم میں چلے گئے۔

بعض علماء نے فرمایا: یہاں ﴿سَيَقُولُ السُّفَهَاءُ﴾ میں صیغہ مضارع کا استعمال کیا گیا، لیکن مراد ماضی ہے، یعنی کہا ان لوگوں نے جو بے وقوف تھے۔ اور یہ آیت تحویل قبلہ کے بعد اُتری ہے۔

اعتراض: ان کو کس چیز نے مسجد اقصیٰ سے پھیر کر مسجد حرام کی طرف کر دیا؟ اللہ تعالیٰ نے اس کے دو جواب دیئے ہیں:

پہلا جواب: حاکمانہ ہے کہ مالک الملک اللہ کی ذات ہے، اس لئے فرمایا: ﴿قُل لِّلَّهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ﴾ ان کو کہہ دو کہ مشرق بھی میرا ہے، مغرب بھی میرا ہے، تم اعتراض کرنے والے کون ہو؟ میں چاہوں تو مشرق کی طرف پھیر دوں اور چاہوں تو مغرب طرف پھیر دوں۔

دوسرا جواب: حکیمانہ کہ ﴿يَهْدِي مَن يَشَاءُ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ ۝﴾ مقصد صراطِ مستقیم تک پہنچانا ہے۔ اب مالک کی مرضی ہے جس راستے سے چاہے صراطِ مستقیم تک پہنچا دے۔ ﴿وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا﴾ اس آیت میں دوسرا حکیمانہ جواب ہے کہ جیسے کعبہ ساری دنیا کی زمین سے افضل ہے، جیسا کہ حضور اکرم ﷺ نے قسم کھا کر فرمایا: مجھے اللہ کی قسم ہے! اے سرزمین کعبہ! تو اللہ کی زمین میں سب سے افضل اور بہتر ٹکڑا ہے۔ اسی طرح یہ اُمت بھی تمام اُمتوں سے افضل ہے، اس لیے افضل سرزمین کی طرف رخ کرنے کا حکم دیا گیا۔

کعبہ پر اللہ کی رحمتوں کا نزول:

حدیث مبارک میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ایک سو چالیس رحمتیں اس کعبہ پر نازل ہوتی ہیں: ساٹھ رحمتیں ان کو ملتی ہیں جو اللہ کے کعبہ کا طواف کر رہے ہوتے ہیں اور چالیس رحمتیں جو نوافل میں مشغول ہوتے ہیں ان کو ملتی ہیں اور بیس رحمتیں ان کو ملتی ہیں جو کعبہ شریف کو دیکھ رہے ہوتے ہیں۔

﴿وَسَطًا﴾ کی تفسیر:

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جس طرح کعبہ زمین کا وسط ہے، اسی طرح میں نے آپ کی اُمت کو بھی وسط بنایا ہے۔ وسط

کا معنی ''درمیان'' ہے، نہ حد سے زیادہ تجاوز کرنے والے اور نہ حد سے زیادہ نیچے گرنے والے، نہ افراط میں پڑنے والے اور نہ تفریط میں پڑنے والے۔ کیونکہ یہ دونوں چیزیں بربادی کا باعث بن جاتی ہیں۔ اس لئے وسط اُمت وسط زمین کی طرف رخ کرنے کا حکم دیا گیا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی عداوت اور محبت میں دو گروہ:

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا: میرے بارے میں دو جماعتیں برباد ہو جائیں گی: ایک میری محبت میں بہت آگے بڑھ جانے والے، یہ بھی برباد ہوں گے اور ایک میری عداوت میں بڑھ جانے والے، یہ بھی برباد ہوں گے اور کامیاب وہ ہوں گے جو اعتدال پر رہیں گے۔ بعض لوگوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اتنا بڑھایا کہ ان کو خدا بنا دیا، بعض نے کہا: اللہ تعالیٰ حضرت علی رضی اللہ عنہ میں اُتر آیا، بعض نے کہا: بادلوں میں بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں، بعض نے کہا: اللہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مرتبہ امامت دیا تھا، ایک لاکھ چوبیس ہزار نبی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی امامت کی بیعت کریں گے، یعنی وہ نبیوں سے بھی افضل ہیں اور ان میں کئی قسمیں بن گئیں، کوئی امامی، کوئی آغا خانی، کوئی اسماعیلی اور کوئی بہائی کہلائے۔ یہ سب غلو کرنے والوں کی قسمیں ہیں پھر ان کے اندر تقسیم ہے۔ دوسری طرف خوارج اور نواصب تفریط میں پڑ گئے اور کہا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ (نعوذ باللہ!) مسلمان ہی نہیں ہیں۔ ان کی قوم میں جب کوئی خوبصورت لڑکی ہوتی اور لوگ اس کا رشتہ مانگتے کہ میں شادی کرنا چاہتا ہوں تو وہ کہتی: ایک شرط ہے کہ حضرت علی کا سر کاٹ کے لے آؤ تو میں شادی کروں گی۔

اُمت وسط کا معنی:

یعنی یہ اُمت اعتدال والی ہے۔ توحید، رسالت اور حقانیت پر قائم ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے یہ اعزاز اس لئے دیا کہ اس امت کو اللہ تعالیٰ نے ساری دنیا پر گواہ بنانا ہے اور گواہ کے لئے ضروری ہے کہ وہ دیانت، صداقت اور اعتدال والا ہو۔ ایسا گواہ نہ ہو جو چھوٹی سی بات پر ناراض ہو کر گواہی کو بڑھا دے یا گھٹا دے۔ جب قیامت والے دن سارے انبیاء آئیں گے، اللہ تعالیٰ اُن سے پوچھیں گے کہ تم نے اپنی اپنی اُمت کو تبلیغ کر دی تھی؟ حالانکہ اللہ تعالیٰ تو جانتے ہیں، لیکن اس کا دنیا والوں پر اظہار کرنے کے لئے ایسا کریں گے۔ اس وقت یہ امتیں انکار کریں گی تو اُمت محمد یہ اُن (انبیاء) کے حق میں گواہی دینے والی ہوگی اور اس اُمت کی امانت، دیانت، صداقت کے گواہ

حضور اکرم ﷺ ہوں گے۔

﴿وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنْتَ عَلَيْهَا إِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَتَّبِعُ الرَّسُولَ مِمَّنْ يَنْقَلِبُ عَلَى عَقِبَيْهِ﴾ [البقرۃ:۱۴۳]

بندے کا کام یہ ہے کہ جونہی حکم دیں اس کی اطاعت کرے؛ کیونکہ وہ حکم اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ کے پیغمبر اپنی طرف سے کوئی حکم نہیں دیتے۔ جب اس کا حکم ہوا کہ مسجد اقصیٰ کی طرف نماز پڑھو تو آپ ﷺ نے اس حکم کی اتباع کی اور جب حکم آیا کہ کعبہ کی طرف نماز پڑھو تو آپ ﷺ نے اس حکم کی بھی اتباع کی۔ لہٰذا ہندوؤں کو بھی اسی طرح اتباع کرنی چاہیے۔

﴿السُّفَهَاءُ﴾ سے مراد کون ہیں؟

''سُفَهَاء''، ''سفیہ'' کی جمع ہے، اس کا معنی بے وقوف اور کم عقل ہے۔ بعض مفسرین نے فرمایا: اس سے مشرکین عرب مراد ہیں، اور بعض نے فرمایا: یہود مراد ہیں کہ ان کو تورات کا علم تھا، اس کے باوجود وہ اعتراض کرتے تھے۔ بعض مفسرین نے فرمایا: اس سے مراد منافق ہیں۔ لیکن آیت میں عموم ہے کہ ''سُفَهَاء'' چاہے مشرکین عرب ہوں یا احبار یہود ہوں یا منافقین ہوں، جو بھی آدمی اللہ تعالیٰ کے اوامر اور احکام پر اعتراض کرتا ہے اور جو بھی تحویل قبلہ پر اعتراض کرتا ہے، اس کی سفاہت میں کوئی شبہ نہیں ہے۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے حضرت براء رضی اللہ عنہ سے روایت فرمائی ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے بیت المقدس کی طرف سولہ یا سترہ مہینے نماز پڑھی اور حضور پاک ﷺ کو یہ بات پسند تھی کہ آپ کا قبلہ بیت اللہ ہو اور جب اللہ تعالیٰ نے قبلہ ابراہیمی کا حکم عطا فرمایا تو سب سے پہلی نماز جو اس طرف پڑھی گئی، وہ عصر کی نماز تھی۔ ایک صحابی جس نے حضور اکرم ﷺ کے ساتھ نماز پڑھی تھی، وہ جب وہاں سے روانہ ہوئے تو ایک مسجد پر ان کا گزر ہوا، اس میں لوگ عصر کی نماز پڑھ رہے تھے اور وہ رکوع کی حالت میں تھے۔ اس صحابی نے کہا: میں گواہی دیتا ہوں اللہ تبارک وتعالیٰ کے نام کے ساتھ کہ میں نے خود حضور اکرم ﷺ کے ساتھ کعبہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھی ہے، یعنی قبلہ کا حکم بدل گیا ہے، اب قبلہ کعبۃ اللہ ہے۔ وہ صحابہ کرام رکوع کی حالت میں ہی کعبہ کی طرف پھر گئے۔ جب اللہ تعالیٰ کا حکم آ گیا اور خبر دینے والے صحابی ہیں اور سارے حساب عدول ہیں، سچے ہیں، اس لئے صحابہ نے رکوع کی حالت میں ہی قبلہ کا رخ بدل لیا۔

شریعت کے کسی حکم پر عمل سے ثواب ضائع نہیں ہوتا:

صحابہ رضی اللہ عنہم کہتے تھے کہ ہمیں ان لوگوں کے بارے میں فکر لاحق ہوگئی جو تحویل قبلہ سے پہلے فوت یا شہید ہو گئے تھے؛ کیونکہ انہوں نے نمازیں مسجد اقصیٰ کی طرف پڑھیں، کعبہ کی طرف نمازیں نہیں پڑھیں تھیں تو اللہ تبارک و تعالیٰ نے یہ آیت مبارکہ نازل فرمائی: ﴿وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ﴾ اللہ تبارک وتعالیٰ تمہاری عبادت اور تمہاری نمازوں کو ضائع نہیں فرمائیں گے، اللہ تعالیٰ تو بندوں پر رحمت فرمانے والے ہیں۔

مسلم شریف میں حضرت براء رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بیت المقدس کی طرف نماز پڑھتے تھے اور آسمان کی طرف نظریں اُٹھاتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کا حکم آجائے اور میں اس قبلہ کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھوں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ حکم نازل فرمایا:

﴿قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَاۗءِ ۚ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىھَا ۠ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ﴾ [البقرۃ:۱۴۴]

صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے بعض آدمیوں نے کہا: کاش! ہمیں یہ پتہ چل جاتا کہ جو لوگ بیت المقدس کی طرف نماز پڑھتے رہے اور ان کی وفات ہوگئی اور جو نمازیں ہم نے بیت المقدس کی طرف پڑھی ہیں، ان کے بارے میں کیا ہوگا؟ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ﴾ اللہ پاک تمہاری وہ نمازیں ضائع نہیں فرمائیں گے۔

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اس بارے میں اختلاف ہے کہ بیت المقدس کے بارے میں جو حکم ہے، وہ قرآن میں آیا تھا یا اللہ تعالیٰ نے ویسے حکم فرمادیا اور قرآن پاک میں نازل نہیں فرمایا۔

امام قرطبی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں حضرت عکرمہ رحمہ اللہ، حضرت ابو العالیہ رحمہ اللہ اور حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کا قول نقل فرمایا ہے کہ یہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا اجتہاد تھا، یعنی اللہ تعالیٰ نے آپ کو بیت المقدس کا حکم نہیں دیا تھا، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا اجتہاد تھا، تاکہ یہ کعبہ بھی درمیان میں آجائے اور بیت المقدس کی طرف رخ بھی ہو جائے۔ چونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت موسیٰ و عیسیٰ علیہما السلام کا قبلہ بیت المقدس تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں رہتے ہوئے دونوں کعبوں کی طرف رخ فرما رہے تھے۔ صرف بیت المقدس کی طرف نماز پڑھنا ہجرت کے بعد ہوا، کیونکہ اب یہ قبلہ

سامنے نہیں تھا۔ آپ ﷺ نے سولہ یا سترہ ماہ بیت المقدس کی طرف نماز پڑھی، لیکن آپ ﷺ کثرت سے دعائیں فرماتے، اللہ تعالیٰ کے آگے تضرع فرماتے کہ اللہ تعالیٰ قبلہ ابراہیمی کا حکم دیں۔ آخر اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی دعا منظور فرمائی اور حکم آ گیا کہ کعبہ کی طرف رخ کرو۔ جب اللہ تعالیٰ کا حکم آیا تو آپ ﷺ نے خطبہ دیا اور لوگوں کو اس کی خبر دی۔ حضور اکرم ﷺ نے مدینہ میں سب سے پہلے جو نماز اس کعبہ کی طرف پڑھی، وہ عصر کی نماز تھی، جیسا کہ پہلے حضرت براء رضی اللہ عنہ کی روایت گزر چکی ہے۔ امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک روایت یہ بھی نقل کی ہے کہ تحویل قبلہ کا حکم حضور ﷺ پر اس وقت نازل ہوا جب آپ ظہر کی دو رکعتیں مسجد بن سلمہ میں پڑھ چکے تھے، اب جب حکم آیا تو باقی دو رکعتیں بیت اللہ طرف پڑھیں۔ اس لئے اس مسجد کو "مسجد قبلتین" بھی کہا گیا ہے۔

نویلہ بنت مسلم سے روایت ہے کہ وہ ظہر کی نماز میں تھیں کہ ان کو تحویل قبلہ کی خبر پہنچی۔ جب لوگوں نے رخ بدلا تو عورتیں پہلے پیچھے تھیں، مرد آگے تھے۔ اب جب قبلہ بدلا تو عورتیں مردوں کی جگہ پر آ گئیں اور مرد عورتوں کی جگہ پر آ گئے۔ اہل قباء کو اس دن خبر نہیں پہنچی، ان کو دوسرے دن صبح کی نماز کے وقت خبر پہنچی۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ لوگ مسجد قباء میں صبح کی نماز پڑھ رہے تھے، ایک آنے والے نے آ کر خبر دی کہ اللہ تعالیٰ کے رسول پر قرآن اُترا ہے اور اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ مکہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھیں۔ انہوں نے اس طرف رخ پھیر دیا۔

ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے یہاں ایک فقہی مسئلہ ذکر کیا ہے کہ حضور پاک ﷺ کو قبلہ کا حکم ملا اور آپ ﷺ نے پہلی نماز عصر کی بیت اللہ کی طرف رخ کر کے پڑھی، لیکن قبا والوں کو فجر کی نماز میں حکم پہنچا تو اس سے یہ مسئلہ معلوم ہوا کہ اگر حکم ناسخ بھی آ چکا ہو، لیکن جب تک ہمیں اس کی اطلاع نہ ملے، اس وقت تک ہم ناسخ حکم پر عمل کرنے کے مامور نہیں، کیونکہ حضور اکرم ﷺ نے کبھی قبا والوں کو نماز لوٹانے کا حکم نہیں دیا۔

جب یہ حکم اُترا تو یہود اور منافقوں کے دلوں میں شکوک اور اعتراضات بڑھتے گئے کہ دیکھیں! کبھی یہ قبلہ ہے اور کبھی وہ قبلہ ہے۔ (نعوذ باللہ!) جب چاہتے ہیں اُدھر رخ کر کے نماز پڑھتے ہیں اور جب چاہتے ہیں ادھر رخ کر کے نماز پڑھتے ہیں اور ساتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے وہ کعبہ چھوڑ دو۔ لیکن جو ایمان والے لوگ تھے، ان کا ایمان اور بڑھتا گیا کہ حضور پاک ﷺ نے جب اللہ پاک سے دعا کی تو اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی دعا منظور فرمائی اور کعبہ شریف کو قبلہ بنانے کا حکم دے دیا گیا۔

یہودی اُمتِ محمدیہ پر تین چیزوں میں حسد کرتے ہیں:

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضور پاک ﷺ نے فرمایا: اہل کتاب ہمارے ساتھ تین چیزوں پر حسد کرتے ہیں:

1 ......ایک اللہ پاک نے ہمیں جمعہ کا دن عطا فرمایا، جو سید الایام ہے۔

2 ......دوسرا ان کو بڑا حسد یہ ہے کہ مسلمانوں کو اشرف کعبہ ملا اور ہمیں نہ ملا۔

3 ......اور تیسرا جب ہم امام کے پیچھے آمین کہتے ہیں تو اس پر بھی وہ بڑا حسد کرتے ہیں کہ ایک آدمی تو ساری دعا مانگتا رہے اور ایک آدمی اس کے پیچھے آمین کہہ دے تو وہ بھی اس کے ساتھ شریک ہو گیا۔

اُمتِ محمدیہ سابقہ اُمتوں کی گواہی دے گی:

﴿لِيَكُونَ الرَّسُولُ شَهِيدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُونُوا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ﴾ [الحج:۷۸]

جب آپ ﷺ کی اُمت گواہی دے گی تو پہلے والی اُمتیں اعتراض کریں گی: یا اللہ! ان لوگوں نے تو ہمیں دیکھا بھی نہیں تو یہ کیسے گواہ بن گئے؟ تو اُمت محمدیہ کے لوگ جواب میں کہیں گے: یا اللہ! ہمیں ہمارے پاک نبی ﷺ نے بتایا ہے، جب ہمیں حضور اکرم ﷺ نے خبر دی تو ہم ان کے فرمان پر گواہی دے رہے ہیں۔ ہمارا نبی سچا ہے، انہوں نے فرمایا تھا کہ تمام انبیاء نے دعوتِ توحید دی ہے، اس لئے ہم اپنے پیغمبر کی گواہی پر گواہی دے رہے ہیں۔ یہ شرف حضور اکرم ﷺ کی اُمت کو ملا ہے۔

حدیث مبارک میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت والے دن حضرت نوح علیہ السلام کو پکاریں گے اور ان سے فرمائیں گے: کیا تُو نے میری دعوتِ توحید پہنچا دی تھی؟ وہ عرض کریں گے: اے میرے اللہ! میں نے دعوتِ توحید پہنچا دی تھی۔ ان کی قوم کو بلایا جائے گا، ان سے پوچھا جائے گا کہ نوح علیہ السلام نے تمہیں دین پہنچایا تھا؟ وہ کہیں گے: ہمارے پاس تو کوئی بھی ڈرانے والا نہیں آیا تھا۔ اللہ تعالیٰ حضرت نوح علیہ السلام سے فرمائیں گے: تمہاری گواہی کون دے گا؟ وہ فرمائیں گے: میری گواہی اُمت محمد مصطفیٰ ﷺ دے گی۔

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:

"أَنَا وَ أُمَّتِي يَوْمَ الْقِيَامَةِ عَلَى كُوْمٍ مُشْرِفِيْنَ عَلَى الْخَلَائِقِ، مَا مِنَ النَّاسِ أَحَدٌ إِلَّا وَدَّ أَنَّهُ مِنَّا وَ مَا مِنْ

نَبِيٍّ كَذَّبَهٗ قَوْمُهٗ إِلَّا وَ نَحْنُ نَشْهَدُ أَنَّهٗ قَدْ بَلَّغَ رِسَالَةَ رَبِّهٖ عَزَّوَجَلَّ۔" [تفسیر ابن کثیر:۱/ ۲۷۹، در منثور:۱/ ۱۴۴]

میں اور میری اُمت قیامت والے دن ایک ٹیلہ کے اوپر ہوں گے، ساری مخلوقات کو دیکھنے والے ہوں گے، قیامت والے دن کوئی بندہ بھی ایسا نہیں ہوگا جو یہ تمنا نہ کرے کہ کاش! میں بھی اُمت محمد مصطفیٰ ﷺ میں ہوتا۔ اور کوئی نبی، پیغمبر ایسا نہیں گزرا جس کی قوم نے اس کو جھٹلایا نہ ہو، قوم اس کی تکذیب کرنے والی ہوگی اور میں اور میری اُمت اس کی گواہی دیں گے کہ یااللہ! تیرے یہ نبی سچے ہیں، انہوں نے تیرا دین، تیری توحید پہنچائی، لیکن یہ قوم جھوٹی ہے، انہوں نے پیغمبروں کی بات پر لبیک نہ کہا، ان کی بات کو تسلیم نہیں کیا۔

ہاتھ نہ پھیلانے والے شخص کو جنت کی بشارت:

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ بنو سلمہ میں ایک آدمی کے جنازے پر تشریف لے گئے۔ جب آپ ﷺ جنازے سے فارغ ہوئے تو ایک صحابی نے کہا: حضور! آپ نے جس کا نماز جنازہ پڑھا ہے، اس نے کبھی کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلایا اور اس کی لوگوں نے بڑی تعریف کی تو حضور اکرم ﷺ نے اس آدمی سے پوچھا کہ جو کچھ بھی تم تعریف کر رہے ہو، کیا یہ ٹھیک ہے؟ اس نے عرض کیا: ظاہر بات تو اسی طرح ہے، دلوں کا مالک تو اللہ ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: "وَجَبَتْ" یعنی اس کے لیے جنت واجب ہوگئی۔ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: حضور اکرم ﷺ ایک دوسرے جنازے پر تشریف لائے، میں حضور اکرم ﷺ کے بالکل قریب کھڑا تھا۔ لوگوں نے کہا: یہ آدمی بڑا بدگو تھا، بدزبان تھا، اور ان لوگوں نے اس کے بارے میں بیان کیا کہ بُرا آدمی تھا۔ حضور اکرم ﷺ نے ان سے فرمایا: تم جو کچھ کہہ رہے ہو، کیا ٹھیک ہے؟ انہوں نے کہا: ظاہر میں تو وہ بُرا تھا، لیکن باطن کا اللہ تعالیٰ کو پتہ ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: "وَجَبَتْ" یعنی (نعوذ باللہ) اس کے لئے جہنم واجب ہوگئی ہے۔ [مستدرک الحاکم، رقم: ۳۰۶۱]

محمد بن کعب رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے بعد قرآن کی یہ آیت مبارکہ تلاوت کی: ﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا﴾ [البقرۃ: ۱۴۳] اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم ﷺ کی اُمت کو لوگوں پر گواہ بنایا ہے۔ جب اُمت کے اتنے آدمی گواہی دیں تو سمجھ لو کہ وہ اچھا ہے اور اگر کسی کی برائی کی گواہی دیں تو سمجھ لو کہ یہ بُرا ہے۔

علماء نے لکھا ہے کہ جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو بچہ روتا ہے اور عالم ہنستا ہے کہ مبارک ہو، بچہ ہو گیا اور جب تمہاری

موت کا وقت آئے تو ایسے حالات پیدا کرو کہ عالم رو رہا ہو اور تم ہنس رہے ہو۔

تاریخ عالم اُٹھا کر دیکھ لیں! کروڑ ارب پتی مر گئے، کوئی ان کا نام لینے والا نہیں ہے اور امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کو دیکھیں! جب فوت ہوئے تو کچھ میسر نہیں، ایک بستی میں فوت ہوئے، لیکن ایک دن کے اندر کتنے لاکھ لوگ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا نام لیتے ہیں۔ اسی طرح امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی موت جیل میں ہوئی۔ بعض حضرات نے کہا کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو زہر دیا گیا۔ حجۃ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کو قید خانہ میں موت آئی۔ اور محدثین میں بعض ایسے بھی گزرے ہیں کہ ایک وقت کھانا ہوتا تھا اور دوسرے وقت کا نہیں ہوتا تھا۔ اور بعض ایسے بھی گزرے ہیں جو دو دو، تین تین دن تک فاقے سے رہتے تھے، لیکن آج کروڑوں آدمی ان کے لئے رحمۃ اللہ علیہ کی دعا کر رہے ہیں۔

جنتی اور دوزخی کی پہچان:

حضرت ابوالاسود رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ میں مدینہ منورہ میں حاضر ہوا اور میں ایسے موقع پر آیا کہ مدینہ منورہ میں ایک بیماری پھیلی ہوئی تھی۔ اس بیماری کی وجہ سے لوگ کثرت سے مر رہے تھے۔ میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی خدمت میں بیٹھا ہوا تھا۔ ایک آدمی کا جنازہ گزرا، لوگوں نے تعریف کی کہ ماشاء اللہ! بڑا اچھا آدمی تھا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''وَجَبَتْ''۔ اس کے بعد دوسرا جنازہ گزرا، لوگوں نے کہا: یہ بُرا آدمی تھا تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''وَجَبَتْ''۔ میں نے پوچھا: امیر المومنین! کیا واجب ہوا؟ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں نے تو وہ بات کی جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کوئی مسلمان بندہ مر جائے اور لوگ اس کے بارے میں بہتری اور خیر کی گواہی دیں تو سمجھ لو کہ ان شاء اللہ! وہ جنت میں داخل ہوگا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: اگر تین آدمی گواہی دے دیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر تین بھی گواہی دے دیں تو اللہ تعالیٰ قبول فرمائیں گے۔ صحابہ نے عرض کیا: اگر دو آدمی گواہی دے دیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ دو کی بھی قبول فرمائیں گے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی جگہ آدمی کم ہوتے ہیں اور کہیں لاکھوں لوگ گواہی دیتے ہیں۔

قاضی احسان احمد شجاع آبادی رحمۃ اللہ علیہ کا بار بار کلمہ پڑھنے کا واقعہ:

بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ جب حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا جنازہ جیل سے اُٹھا تو ساٹھ یا نوے ہزار کے قریب کافروں نے کلمہ پڑھا۔ انہوں نے لکھا کہ ایک عالم کے اتنے جنازہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا مذہب بھی

اللہ کو قبول تھا۔ حضرت قاضی احسان احمد شجاع آبادی رحمہ اللہ فرماتے تھے: میں چھوٹا سا بچہ تھا، قاعدہ پڑھ کر جب گھر آتا تو ماں کہتی تھی: بیٹا! کلمہ پڑھو: "لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰہُ" اور جب میں سونے لگتا تو ماں کہتی: کلمہ پڑھو، میں کلمہ پڑھتا تھا۔ جب نیند سے اُٹھتا تو کہتی: کلمہ پڑھو، میں کلمہ پڑھتا تھا۔ اس طرح دو چار دن میں نے برداشت کیا، اس کے بعد اپنی امی سے کہا: آپ ہر وقت کہتی ہیں: کلمہ پڑھو۔ میں مسلمان ہوں اور مسلمان کا بیٹا ہوں۔ انہوں نے کہا: بیٹا! ناراض نہ ہو، جس بات کی عادت ہو جاتی ہے، پھر وہی بات زبان سے نکلتی ہے۔ جب کلمہ پڑھنے کی عادت ہو جائے گی اور موت والی نیند آئے گی تو زبان پر کلمہ ہوگا۔ اس لئے میں چاہتی ہوں کہ تیری زبان پر یہ کلمہ چڑھ جائے۔ اُٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے، ہر وقت زبان پر کلمہ ہو۔ کیا پتہ انسان بیمار ہو جائے اور زبان بند ہو جائے۔ اگر عادت ہوگی تو دل میں پڑھ رہے ہوں گے، اللہ تو جانتے ہیں۔

اعمال کا دارومدار خاتمہ پر ہے:

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالْخَوَاتِيمِ." [صحیح بخاری، رقم: ٦٦٠٧]

آدمی کے اعمال کا دارومدار خاتمہ پر ہے۔ ایک آدمی بڑے اچھے کام کرتا ہے، یہاں تک کہ جنت ایک ہاتھ کے فاصلے پر رہ جاتی ہے، قدرت کی تقدیر یہاں تک غالب آتی ہے کہ اس سے کوئی ایسا کام ہو جاتا ہے کہ سیدھا جہنم میں چلا جاتا ہے اور بعض آدمی ایسے ہوتے ہیں کہ بُرے کام کرتے رہتے ہیں کہ جہنم ایک ہاتھ رہ جاتی ہے، لیکن اللہ کی تقدیر کے فیصلے آتے ہیں، وہ اپنے کسی عمل کے ذریعہ جنت میں چلا جاتا ہے۔ اس پر صحابہ رضی اللہ عنہم نے کہا: حضور! کیا ہم عمل نہ کریں جو تقدیر میں ہوگا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: آدمی عمل جو کر رہا ہے، سمجھ لے کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے اسی راستے کے لئے پیدا کیا ہے۔

کسی مقام پر اللہ تعالیٰ تقدیر کا مظاہرہ فرماتے ہیں، ورنہ جو صراطِ مستقیم پر چل رہا ہے، یقینی بات ہے کہ وہ منزلِ مقصود پر پہنچ جائے گا۔ اللہ تعالیٰ سب کا خاتمہ ایمان پر فرمائے۔

کسی کے اچھے بُرے کا اندازہ کیسے ہوگا؟

حضرت ابوبکر بن ابی زہیر الثقفی اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک مقام پر

یہ فرماتے ہوئے سنا:

''يُوْشِكُ أَنْ تَعْلَمُوْا خِيَارَكُمْ مِنْ شِرَارِكُمْ، قَالَ: بِمَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ؟ قَالَ: بِالثَّنَاءِ الْحَسَنِ وَالثَّنَاءِ السَّيِّءِ أَنْتُمْ شُهَدَاءُ اللّٰهِ فِي الْأَرْضِ.'' [درمنثور:۱/۳۵۱/تفسیر ابن کثیر:۱/۲۷۷]

قریب ہے کہ تم لوگوں میں سے اچھے اور بُروں کی پہچان کرلو۔ صحابہ ﷢ نے عرض کیا: یارسول اللہ! کیسے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: لوگوں کی تعریف کرنے سے کہ جس کو لوگ اچھا کہیں تو سمجھ لو وہ اچھا ہوگا اور جس کو لوگ بُرا کہیں گے تو سمجھ لو وہ بُرا ہوگا، تم زمین پر اللہ کے گواہ ہو۔

کس کی تعریف اور مذمت معتبر ہے؟

آج سب گانے والوں کو اچھا کہتے ہیں، اگر وہ مرجائیں تو کئی لوگ ان کے فراق میں مرجاتے ہیں۔ یاد رکھیں! اسلام اور کفر کے نظام میں یہی فرق ہے کہ کفر میں عدد گنا جاتا ہے، جبکہ اسلام میں تولا جاتا ہے، گنا نہیں جاتا۔ ورنہ فاسق، فاسق کی تعریف کرے گا، خبیث خبیث کی تعریف کرے گا، زانی زانی کی تعریف کرے گا، شرابی شرابی کی تعریف کرے گا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ جنت میں چلے جائیں گے۔ ورنہ آپ جمہوریت کے اصولوں کو سامنے رکھیں تو سب سے زیادہ کرسی پر بیٹھنے کا حق دار یزید تھا؛ کیونکہ سب سے زیادہ ووٹ یزید نے حاصل کیے تھے، تمام علاقے والوں نے یزید کی بیعت کرلی تھی، لیکن اس کی خلافت کو اس لیے نہیں مانا گیا کہ مکہ اور مدینہ والوں نے اس کی بیعت نہیں کی تھی اور اربابِ حل وعقد کے مکہ اور مدینہ کے لوگ تھے۔ اس لیے عامۃ الناس کی بیعت کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔

﴿قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ ۚ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا ۪ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ؕ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ ۝﴾ [البقرة:۱۴۴]

''ہم آپ کے چہرے کا بار بار آسمان کی طرف اُٹھنا دیکھ رہے ہیں، ہم آپ کو اس کی طرف ضرور پھیریں گے جس قبلہ کی طرف آپ راضی ہیں۔ اب آپ (نماز میں) مسجد حرام کی طرف رخ کرلیں اور (اے اُمت محمدیہ!) تم جہاں بھی ہو اپنے رخ (نماز میں) اس کی طرف کرلو اور جن لوگوں کو کتاب (تورات یا انجیل) ملی ہے وہ جانتے ہیں کہ یہ (کعبہ کا قبلہ ہونا) ان کے رب کی طرف سے حق ہے اور اللہ غافل نہیں ہے جو وہ کرتے ہیں۔''

﴿فَوَلِّ وَجۡهَكَ شَطۡرَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ﴾ ظاہری طور پر یہ حکم خاص حضور اکرم ﷺ کے لئے ہے کہ آپ نے اپنے چہرے کو پھیر لیں، لیکن یہی حکم قیامت تک آپ کی اُمت کے لئے بھی ہے، کیونکہ جدھر آپ ﷺ رخ فرمائیں گے، ہم نے بھی اسی طرف کرنا ہے۔

صحیحین کی حدیث مبارک میں ہے کہ سب سے پہلے جب یہ حکم نازل ہوا تو پہلی نماز عصر کی تھی جو آپ ﷺ نے بیت المقدس کے بجائے کعبہ شریف کی طرف پڑھی۔ (خدا کی قدرت دیکھیں کہ یہ اُمت وسطاً ہے اور کعبہ بھی پورے روئے زمین کے وسط میں ہے اور عصر کی نماز بھی صلوٰۃ وسطیٰ ہے)۔ اور یہ عصر کی نماز آپ ﷺ نے مدینہ منورہ میں اور مسجد نبوی میں پڑھی تھی، قبا اور مسجد قبلتین میں نہیں پڑھی تھی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: سب سے پہلا نسخ والا حکم یہی تحویل قبلہ والا ہے۔

بعض علماء نے فرمایا: اس آیت سے اشارہ ہوتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے حکم دیا: ﴿فَوَلِّ وَجۡهَكَ شَطۡرَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ﴾ یعنی جب ادھر سے مڑنے کا حکم دیا گیا تو مسجد اقصیٰ کا حکم خود بخود معلوم ہوگیا، کیونکہ انبیاء علیہم السلام اپنی خواہش سے قبلہ نہیں بناتے، بلکہ وہ ہر حال میں اللہ تعالیٰ کے حکم کے پابند ہوتے ہیں۔ اس حکم سے ہمیں معلوم ہوگیا کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے سراسی کی طرف نمازیں پڑھی جاتی تھیں۔

تدریجاً اسلام میں نرمی آگئی:

پہلے دو رکعت کا حکم ملا، اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے چار رکعت کا حکم عطا فرمایا اور پھر فیصلہ فرمادیا کہ اگر تم سفر میں ہو تو دو رکعت پڑھو اور اگر تم حضر میں ہو تو چار رکعت پڑھو۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے جبرائیل علیہ السلام کو بھیج کر ہر نماز کے دو وقت بتادیئے کہ ایک اوّل وقت ہے، دوسرا آخری وقت ہے۔ دونوں حدیث رسول پاک ﷺ سے ثابت ہیں،

اس کے اندر اُمت کے لئے کتنی بڑی رعایت ہے؟

اسی طرح روزے کے احکام دیکھ لیں! پہلے حکم تھا کہ جب آدمی رات کو سو جائے تو کھانا پینا منع ہو جاتا تھا، چاہے وہ مغرب کے بعد سو جاتا یا عشاء کے بعد سو جاتا، تھوڑی نیند سو جاتا یا لمبی نیند سو جاتا تو کھانا پینا بند ہو جاتا تھا۔ اسی طرح روزہ کی راتوں میں میاں بیوی کا مباشرت کرنا منع تھا، لیکن اللہ تعالیٰ نے رحمت فرما کر یہ حکم ارشاد فرمایا کہ رات کو کھاؤ پیو، جب صبح صادق ہو جائے تو رُک جاؤ اور نیز اس کے ساتھ رات کو میاں بیوی کو ملنے کی اجازت بھی مل گئی۔

احکامات کی تبدیلی کی حکمتیں:

احکامات میں جتنی تبدیلیاں ہوئی ہیں، ان میں ایک تو اللہ تعالیٰ کی رحمت ہوتی ہے دوسرا بندوں کی آزمائش ہوتی ہے کہ وہ شکوک وشبہات کا شکار ہو جاتے ہیں یا میرے احکام کی تعمیل کرتے ہیں؟ تحویل قبلہ کے اندر یہ بات بھی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم ﷺ کی عظمت کا اظہار کر دیا کہ اے میرے نبی! آپ کے چہرے کا آسمانوں کی طرف اُٹھنا اور پھر جھک جانا ہم نے دیکھ لیا ہے اور ہم نے آپ کی آرزو پوری کر دی۔ اس سے اندازہ لگالیں کہ اللہ تعالیٰ کو میرے نبی پاک ﷺ کتنے محبوب ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب کے لیے قبلہ کا حکم بدل دیا۔

چونکہ تحویل قبلہ کا حکم مدینہ میں نازل ہوا تو یہودیوں نے شور مچانا شروع کر دیا کہ انہوں نے ہماری دشمنی میں آکر قبلہ بیت المقدس کو چھوڑ دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یہ جاہل ہیں۔ حالانکہ ان کی کتابوں میں یہ لکھا ہوا ہے کہ جب نبی آخر الزمان پیدا ہوں گے تو ان کا قبلہ ابراہیمی ہوگا، اس لئے ان لوگوں کو بلاوجہ اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔

اگر آدمی مسجد حرام میں ہے تو اس کا رخ عین کعبہ کی طرف ہونا ضروری ہے، ورنہ اس کی نماز نہیں ہوگی۔ اس لئے حرم کے اندر گول صفیں بنائی جاتی ہیں، تا کہ ہر بندے کا رخ کعبہ کی جانب ہو اور جو لوگ مکہ شہر کے اندر رہنے والے ہیں، ان کے لئے مسجد الحرام قبلہ ہے، اور جو لوگ دوسرے ملکوں میں رہنے والے ہیں ان کے لئے پورا حرم قبلہ ہے۔

بیت اللہ میں آنے کے آداب:

جب آپ مسجد حرام میں آئیں تو اس کے کچھ احکامات ہیں۔ جب اللہ تعالیٰ کے کعبہ پر نظر پڑے تو جو دعا کریں، وہ منظور ہوتی ہے۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ صحابہ کی جب کعبۃ اللہ پر نظر پڑتی تو ''اللہ اکبر، اللہ اکبر'' کہتے تھے اور بعض روایات میں آتا ہے کہ جب کعبہ پر نظر پڑے تو دعا کریں: ''اَللّٰھُمَّ زِدْ بَیْتَکَ ھٰذَا تَشْرِیْفًا وَّ تَکْرِیْمًا وَ

تَعْظِيْمًا وَّ مَهَابَةً وَّ بِرًّا وَّ تَقْوٰى " اگر عربی میں دعا یاد نہ ہو تو آپ اپنی زبان میں کہہ سکتے ہیں: یا اللہ! اس گھر کی عظمت میں، اس گھر کی کرامت میں، اس گھر کی شرافت میں، اس گھر کی عزت و ہیبت میں، اس کی تکریم میں اضافہ فرما اور اے اللہ! جو اس کی عزت کرے، اس کو عزت عطا فرما اور جو کعبہ کی اہانت کرے، یا اللہ! اپنی قدرت سے اس کو دفع فرما۔

جب آپ کسی بھی مسجد میں داخل ہوں تو دو رکعت نماز پڑھیں، جسے "تحیۃ المسجد" کہتے ہیں، البتہ وہ اوقات جن میں نماز نہیں پڑھی جاتی تو اس میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب یہ ہے کہ آپ اگر اوقاتِ مکروہہ میں مسجد میں داخل ہوتے ہیں تو تحیۃ المسجد نہ پڑھیں۔ لیکن بعض ائمہ اُس حدیث مبارک کو لیتے ہیں کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں جب کوئی مسجد میں آئے تو اس وقت تک نہ بیٹھے جب تک کہ دو رکعت نہ پڑھ لے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: جب حدیث پاک میں ان اوقات میں نماز پڑھنے سے ممانعت آگئی ہے تو آپ باقی اوقات میں تحیۃ المسجد پڑھیں، ان اوقات میں نہ پڑھیں، تاکہ اس حدیث پر بھی اور اُس حدیث مبارک پر بھی عمل ہو جائے۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ یہ کوشش کرتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام احادیث پر عمل ہو جائے اور تمام فرامین پاک جمع ہو جائیں، تاکہ کسی دشمن کو اعتراض کرنے کا موقع نہ مل سکے اور فرمانِ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم میں بھی کوئی تعارض نہ رہ سکے۔

مسجد حرام میں ایک لاکھ نماز کا ثواب:

لیکن اس مسجد حرام کے لئے علیحدہ حکم ہے، اور وہ یہ کہ جب اللہ تعالیٰ آپ کو اس میں داخل ہونے کی توفیق دیں تو طواف کریں، اس کا تحیہ طواف ہے۔ اگر کوئی آدمی طواف نہیں کر سکتا تو پھر وہ دو رکعت تحیۃ المسجد ادا کرے۔ اگر آپ نے نماز سے پہلے سنت مؤکدہ پڑھنی ہیں، اگر وہ پہلے پڑھیں تو اس میں تحیۃ المسجد خود بخود ادا ہو جائے گا اور اگر آپ کے پاس وقت ہے تو تحیۃ المسجد بھی پڑھ لیں اور چار رکعت مؤکدہ بھی پڑھ لیں تو سبحان اللہ! جتنی زیادہ عبادت کریں، اتنا آپ کو زیادہ ثواب ملے گا۔

پوری روئے زمین کے اندر کوئی جگہ ایسی نہیں ہے جس میں ایک نماز کا بدلہ ایک لاکھ نمازوں کے ثواب کے برابر ملتا ہو، صرف مسجد حرام کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہاں جب تم ایک نماز پڑھتے ہو تو ایک لاکھ نماز کا

ثواب لکھا جاتا ہے، یعنی ایک لاکھ نماز کے ثواب جتنا ثواب ہے۔ یہ مطلب نہیں ہوتا کہ ایک نماز پڑھنے سے ایک لاکھ نماز ادا ہو جائے گی۔ جیسا کہ قرآن مقدس میں آتا ہے کہ لیلۃ القدر کی رات ایک ہزار مہینے سے بہتر ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جب لیلۃ القدر کی رات آئے تو تمہارا ایک ہزار مہینہ گزر جاتا ہے۔ اس طرح تو کوئی بندہ زندہ بھی نہ رہے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہزار مہینے میں عبادت کر کے جتنا ثواب ملتا ہے، اتنا اللہ تعالیٰ تمہیں ایک لیلۃ القدر میں عطا فرما دیتے ہیں۔

بعض علماء نے فرمایا: مسجد الحرام میں ایک لاکھ کی فضیلت صرف نماز کے لئے ہے۔ روزہ، حج، زکوۃ اور نفقات کے بارے میں یہ حکم نہیں ہے، لیکن جمہور ائمہ فرماتے ہیں کہ قاعدہ یہ ہے کہ جب ایک عبادت کو ذکر کر دیا جاتا ہے تو باقی عبادات اس کے ضمن میں آجاتی ہیں۔ ان لوگوں کے لئے جو اپنی نمازوں سے غافل ہیں، ان کو آگاہ کرنے کے لئے صرف نماز کا ذکر کیا۔ یہاں تو نماز کا ذکر آیا ہے، اگر کوئی روزے سے غافل ہے یا کوئی شخص صاحب استطاعت ہونے کے بعد حج سے غافل ہے تو یہ بھی اس میں داخل ہے۔ جب قیامت والے دن پوچھا جائے گا: ﴿مَا سَلَكَكُمْ فِي سَقَرَ ۝﴾ [المدثر: ۴۲] آج کون سی چیزیں تمہیں جہنم میں لے جارہی ہیں؟ وہ کہیں گے: ﴿لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّينَ ۝﴾ [المدثر: ۴۳] ہم ان لوگوں میں سے نہیں تھے جو نماز پڑھنے والے تھے، ﴿وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِينَ ۝ وَكُنَّا نَخُوضُ مَعَ الْخَائِضِينَ ۝﴾ [المدثر: ۴۴، ۴۵] ان آیات میں روزے اور حج کا ذکر نہیں ہے، لیکن وہ بھی اس کے اندر داخل ہیں۔ اس لئے راجح قول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کا ثواب ایک لاکھ نمازوں کے برابر بھی عطا فرماتے ہیں اور دوسری ساری عبادتوں پر بھی ایسا ہی ثواب عطا فرماتے ہیں۔

کعبۃ اللہ کے شرف میں علماء نے یہ بات بھی لکھی ہے کہ اگر آپ اکیلے مسجد حرام میں نماز پڑھیں گے تو آپ کو ایک لاکھ گنا ثواب ملے گا اور اگر محلے کی مسجد میں نماز پڑھیں گے تو ایک کا پچیس درجہ ثواب ملے گا اور اگر آپ مسجد حرام میں جماعت کے ساتھ پڑھیں گے تو ستائیس درجہ ثواب بڑھ جائے گا، ایک کا ستائیس لاکھ ملے گا۔

بعض محدثین نے فرمایا: آپ ﷺ کا فرمان ہے کہ جو مسجد اقصیٰ میں نماز پڑھے، اس کو پانچ سو نمازوں کا ثواب ملتا ہے، جو مسجد نبوی ﷺ میں نماز پڑھے، اس کو ایک ہزار نماز کا ثواب ملتا ہے اور جو مسجد حرام میں نماز پڑھے، اس کو ایک لاکھ کا ثواب ملتا ہے۔ اس لیے بعض علماء نے فرمایا: یہاں ایک لاکھ بمقابلہ ایک ہزار ہے۔ ان کو ضرب دو تو جو عدد نکلے گا، وہ یہاں ایک نماز پڑھنے کا ثواب ہوگا۔



اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کعبہ میں داخل ہونے والوں کو امن کی بشارت سنائی ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: ظاہری امن بھی ہے کہ اس کو قتل نہیں کیا جاتا اور اس سے مراد باطنی امن بھی ہے کہ اگر وہ ایمان سے داخل ہوگا تو اللہ تبارک و تعالیٰ اس کو جہنم کے عذاب سے امان عطا فرمائیں گے۔ آپ ﷺ نے حلف اُٹھا کر کعبۃ اللہ کے بارے میں فرمایا کہ اے سرزمین حرم! مجھے اللہ کی قسم ہے! تمام دنیا کی زمین میں سب سے بہتر زمین تم ہو اور فرمایا: اے سرزمین حرم! اگر میری قوم نے ہجرت کے لیے مجبور نہ کیا ہوتا تو میں تمہیں چھوڑ کر کبھی نہ جاتا۔

حضور اکرم ﷺ کا مقام ادب:

﴿قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ﴾ آپ کے چہرے کا اُٹھنا اور جھکنا ہم نے دیکھ لیا ہے۔ حضور ﷺ کی زبان سے حرف نہیں نکلے، یہ بھی مقام ادب ہے۔ حضور اکرم ﷺ مانگنا چاہتے ہیں، دل میں آرزو ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کی عظمت و ہیبت کا تقاضا ہے کہ ان کے سامنے سوال نہیں کرنا چاہتے۔ یہ مقامِ ادب ہے، اللہ تعالیٰ انبیاء علیہم السلام کو سب سے زیادہ ادب والا بناتے ہیں۔

حضور اکرم ﷺ زبان سے نہیں، بس دل سے تمنا کر رہے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ دلوں کے بھید جاننے والا اللہ ہے، حضور اکرم ﷺ کے دل کے بھید کا جاننے والا بھی اللہ ہے اور اپنے بندوں کے دلوں کے بھید جاننے والا بھی اللہ ہے، ﴿اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝﴾ [لقمان: ۲۳] بے شک اللہ تعالیٰ سینوں کی باتوں کو جاننے والا ہے۔

علامہ اقبال نے بڑی عجیب بات کہی ہے کہ اے میرے اللہ! مجھے پتہ ہے کہ آپ سب سے بڑے غنی ہیں اور میں سب سے بڑا فقیر ہوں، اللہ! مجھے پتہ ہے کہ آپ گناہوں سے پاک اور منزہ ہیں اور میں سراپا گناہ گار ہوں، اے میرے اللہ! اگر قیامت میں بغیر حساب کے بخش دیں تو تیرا کرم ہے، لیکن اگر حساب لینا ضروری ہے تو کم سے کم حضور اکرم ﷺ کے سامنے میرا حساب نہ لینا، کیونکہ میں ان کو کیا منہ دکھاؤں گا کہ تیرا اُمتی ہو کر کیا عمل کر کے لایا ہوں۔ یہ مقامِ ادب ہے۔

کعبہ کے قبلہ ہونے کی حضور اکرم ﷺ کی تڑپ:

﴿فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا﴾ ہم آپ کو پھیریں گے اس عظمت والے قبلہ کی طرف جو آپ کا پسندیدہ اور محبوب ہے۔ یہاں خداوند قدوس کا مقامِ رحمت ہے۔ نبی کا مقامِ ادب یہ تھا کہ دل کے اندر ایک بات تھی، لیکن زبان پر

نہیں لائے کہ شاید اللہ ناراض نہ ہو جائیں۔ اور یہاں مقامِ رحمت ہے کہ میرے مدنی! ہم آپ کو اس کعبہ کی طرف پھیر دیں گے جو تیرا پسندیدہ۔ حالانکہ یہ کعبہ میرے اللہ کا بھی محبوب ہے اور اس کا اپنا گھر ہے۔ اللہ کی رحمت دیکھیں! یہ نہیں فرمایا کہ ہم آپ کو اس قبلہ کی طرف پھیر دیں گے جو ہمارا اول گھر ہے یا ہمارا پسندیدہ کعبہ ہے، بلکہ فرمایا: اس کی طرف پھیر دیں گے جو آپ کو پسند ہے اور فوراً فرمایا: ﴿فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ﴾ اس سے باقی امت کو بھی حکم ہو گیا کہ تم بھی اپنا رخ کعبہ کی طرف پھیر دو۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی خاص رحمت ہے کہ آپ نے تو قبلہ مانگا تھا اور ہم نے پوری مسجد حرام کو آپ کے لیے قبلہ بنا دیا ہے۔ اس میں کتنی بڑی رحمت ہے کہ قیامت تک اُمت محمد یہ پریشان نہ ہو۔

﴿وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ﴾ یہ حکم صرف مدینہ والوں کے لیے نہیں ہے، بلکہ جہاں کہیں بھی ہو گے تو نماز اسی قبلہ کی طرف پڑھو گے، چاہے بیت المقدس کے اندر ہی موجود ہوں۔ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اے میری اُمت! زندوں کے لیے بھی یہی کعبہ ہے اور مرنے کے بعد بھی یہی کعبہ ہے۔ اس لیے حکم ہے کہ قبر میں میت کا رخ بھی کعبہ کی طرف کرو۔

حضرت ابوسعید بن المعلیٰ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم دن میں حضور اکرم ﷺ کی مسجد میں آجاتے تھے، اللہ تعالیٰ نے حکم دے دیا کہ آپ کعبہ کی طرف رخ کریں تو میں نے اپنے ساتھی سے کہا: جلدی کرو، جب حضور اکرم ﷺ منبر سے اُترتے ہیں ہم دو رکعت کعبہ کی طرف پڑھ لیں، تاکہ ہم سب سے پہلے تعمیل کرنے والوں میں سے ہو جائیں تو ہم نے علیحدہ ہو کر دو رکعت پڑھ لیں۔ اس کے بعد ہم نے حضور اکرم ﷺ کے ساتھ ظہر کی نماز کعبہ کی طرف رخ کر کے پڑھی۔ (ابن کثیر: ۱۸۳)

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اب آدمی چاہے مشرق میں ہو یا مغرب میں ہو، جہاں کہیں بھی ہو کعبہ کی طرف رخ کرے گا۔ ہاں اگر اس کو کعبہ کا پتا نہیں کہ کس طرف ہے اور اپنے اندازے سے نماز پڑھ لے تو اس کی نماز ٹھیک ہو جائے گی۔

ہوائی جہاز میں نماز:

ایک بات یاد رکھیں! بعض حضرات ہوائی جہاز میں سفر کر رہے ہوتے ہیں تو کرسی پر بیٹھے بیٹھے نماز پڑھ لیتے ہیں

یہ مسئلہ نہیں ہے، بلکہ اگر آدمی کھڑے ہونے پر قدرت رکھتا ہے تو اس کے لئے کھڑا ہونا ضروری ہے اور اگر کھڑا نہیں ہوسکتا تو معذور ہے۔

اسی طرح اگر جہت قبلہ معلوم ہونے کا ذریعہ موجود ہے تو وہ معلوم کریں، جیسے جہازوں کے اندر آسانی ہے، خاص طور پر سعودی جہازوں کے اندر کمپاس لگا ہوتا ہے، ان کو کہیں تو چالو کردیتے ہیں، اس سے قبلہ معلوم ہوجاتا ہے اور اگر جہازوں میں نہ بھی ہو تو لوگ مسلمان ہوتے ہیں تو پائیلٹ کے آگے کمپاس لگا ہوا ہوتا ہے تو کسی واسطہ سے معلوم کرسکتے ہیں کہ کعبہ شریف کس طرف ہے؟ لہٰذا جب قبلہ معلوم ہوسکتا ہے تو معلوم کریں۔ (لیکن یہ نمازی کے لئے کسی سے قبلہ کا معلوم کرنا ضروری نہیں، اگر بغیر پوچھے کوئی اپنی سمجھ کے مطابق کسی غلط سمت کو قبلہ سمجھ کر نماز میں رخ کرلے تو اس کی نماز ہوجائے گی اور اگر کوئی نماز میں درست سمت معلوم ہو تو نماز میں ہی نمازی اپنا رخ بدل لے، ورنہ اس کی نماز نہ ہوگی)۔ دوسرا اگر آپ کھڑے ہوکر نماز پڑھ سکتے ہیں تو بلاوجہ سیٹ پر بیٹھ کر نماز نہ پڑھیں، بلکہ کھڑے ہوکر پڑھیں۔ ٹرین میں، بحری جہاز میں ہیں تو قبلہ کی سمت معلوم کریں اور نماز پڑھیں۔ بعض ائمہ فرماتے ہیں کہ نفل نماز کے اندر اتنی وسعت ہے کہ سواری جدھر جارہی ہے، آپ اسی طرف رخ کرکے نماز پڑھ سکتے ہیں۔ اسی طرح اگر دشمن کے سامنے آپ کی صفیں ہیں تو اب آپ یہ تو نہیں کرسکتے کہ دشمن کو پشت دے دیں، بلکہ اس موقع پر جیسے بھی رخ ملتا ہے نماز اس حالت میں ادا کرنا چاہیے۔ اسی طرح جس کو قبلہ کا پتا نہ چلے تو وہ اپنی طرف سے کوشش کرے، نماز پڑھ لے تو جائز ہے، چاہے اس نے غلط سمت پڑھ لی ہو۔

مالکیہ نے اس آیت سے یہ استدلال کیا ہے کہ مصلّی سامنے دیکھے، سجدے والی جگہ کو نہ دیکھے۔ اگر سجدے والی جگہ دیکھے گا تو لازمی بات ہے کہ گردن نیچے کرے گا، جبکہ حکم ہے: ﴿فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ﴾

قاضی شریح رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اگر کھڑا ہے تو سجدے والی جگہ نظر ڈالے۔ جمہور بھی اس کے قائل ہیں، کیونکہ یہی بات حدیث مبارک میں موجود ہے اور اسی کے اندر خشوع وخضوع ہے۔ اصل حکم جہت کا ہے، یہ ضروری نہیں کہ آدمی گردن اُٹھالے، بلکہ اگر وہ نظر نیچی کرے گا تو اس کے اندر زیادہ عاجزی ہے۔ اگر آپ رکوع کے اندر ہیں تو پاؤں والی جگہ پر نظر ڈالیں اور اگر سجدے میں ہیں تو ناک پر نظر ڈالیں اور ''اَلتَّحِیَّات'' میں بیٹھے ہیں تو گود میں نظر ڈالیں۔

﴿وَلَىِٕنْ اَتَیْتَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ بِكُلِّ اٰیَةٍ مَّا تَبِعُوْا قِبْلَتَكَ ۚ وَمَاۤ اَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ ۚ وَمَا بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ ؕ وَلَىِٕنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِیْنَ ۝ اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ یَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ؕ وَاِنَّ فَرِیْقًا مِّنْهُمْ لَیَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَهُمْ یَعْلَمُوْنَ ۝﴾ [البقرۃ:۱۴۵،۱۴۶]

''اور اگر آپ اہل کتاب کے پاس سب نشانیاں بھی لائیں (تب بھی) یہ آپ کے قبلہ کو نہ مانیں گے اور نہ آپ ان کے قبلہ کو مانیں گے اور ان میں سے بعض ایک دوسرے کے قبلہ کو نہیں مانتے اور اگر (بالفرض) آپ ان کی خواہشات پر چلیں بعد اس کے آپ کے پاس علم آ چکا تھا تو آپ بھی بے انصافوں میں سے ہوں گے۔ وہ لوگ جن کو ہم نے کتاب (تورات اور انجیل) دی ہے وہ آپ ﷺ کو پہچانتے ہیں جس طرح وہ اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں اور ان میں سے ایک فریق جان کر حق چھپاتا ہے۔''

بیت المقدس کی طرف رُخ کرنے سے یہودی مسلمان ہو سکتے تھے؟

دل میں خیال آتا ہے کہ وہ بھی بیت المقدس کی طرف نماز پڑھتے تھے تو ہو سکتا تھا کہ یہودی اسی وجہ سے ایمان لے آتے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ہم جانتے ہیں کہ یہ اہل کتاب ضدی اور خودسر ہیں۔ یہ حسد، بغض اور عناد میں مبتلا ہو چکے ہیں۔ آپ ان کے پاس بڑی سے بڑی نشانی لے آئیں، لیکن یہ آپ کے قبلہ کی اتباع نہیں کریں گے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جب ہم نے بیت المقدس کو منسوخ کر کے آپ کے لیے کعبہ کو قبلہ بنا دیا ہے اب آپ بھی ان کے قبلہ کی اتباع نہیں کریں گے اور یہ آپ کے قبلہ کی اتباع نہیں کریں گے ضد کی بناء پر اور آپ حق کی بناء پر نہیں کریں گے۔ اور ان یہود و نصاریٰ کی یہ حالت ہے کہ یہ ایک دوسرے کے قبلہ کی بھی اتباع نہیں کرتے۔ پھر یہودیوں اور نصرانیوں میں کئی جماعتیں ہیں، یہ آپس میں ایک دوسرے کے دشمن ہیں بظاہر آپ کو کتنے ہی اکٹھے نظر آئیں، اسلام کی دشمنی میں یہ کافر اگرچہ آپ کو اکٹھے نظر آتے ہیں، مگر یہ آپس میں بھی ایک دوسرے کے دشمن ہیں۔

﴿وَلَىِٕنْ اَتَیْتَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ بِكُلِّ اٰیَةٍ مَّا تَبِعُوْا قِبْلَتَكَ ۚ وَمَاۤ اَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ﴾ اگر آپ ان کی

خواہشات کی اتباع کریں علم آنے اور حق پہنچنے کے بعد تو آپ بھی ان لوگوں میں سے ہو جائیں گے جو اپنی جانوں پر ظلم کرنے والے ہیں۔ اس آیت میں خطاب تو حضور اکرم ﷺ کو ہے، لیکن مقصود ساری اُمت ہے۔ اسی طرح کبھی کبھی مقصود اُمت کو تنبیہ ہوتی ہے، لیکن بظاہر خطاب اللہ کے نبی کو ہوتا ہے۔ ورنہ اللہ کے نبی کریم ﷺ تو کبھی یہود و نصاریٰ کی خواہشات کی پیروی نہیں کرتے، وہ تو اللہ کے رسول اور معصوم ہیں۔

مسیلمہ کذاب کا آپ ﷺ سے خلافت کا تقاضا:

مسیلمہ کذاب نے حضور پاک ﷺ سے ایک مطالبہ کیا (اس وقت اس کے پاس ستر ہزار فوج تھی) کہ میں آپ کی نبوت اور ختم نبوت کا اقرار کرتا ہوں، اسلام لے آتا ہوں، آپ کے تابع بن جاتا ہوں، آپ صرف اتنی مہربانی کریں کہ اپنی وفات کے بعد مجھے خلافت دے دیں۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: تم کیسی باتیں کر رہے ہو؟ میرے ہاتھ میں جو چھڑی ہے، اگر یہ تم مانگنا چاہو تو میں یہ بھی اللہ تعالیٰ کے حکم کے بغیر تمہیں نہیں دے سکتا اور تم خلافت کی بات کر رہے ہو۔ کیونکہ جو آدمی حضور اکرم ﷺ کی اہانت کرے، وہ مرتد اور واجب القتل ہے۔

حضور اکرم ﷺ سے مشرکین نے کہا: ہم آپ سے سمجھوتہ کرنا چاہتے ہیں کہ ایک سال ہم آپ کے طریقے پر چلتے ہیں اور ایک سال کے لئے آپ ہمارے طریقے پر چلیں۔ آپ ﷺ نے واضح فرمادیا: ﴿يَٰٓأَيُّهَا ٱلۡكَٰفِرُونَ ① لَآ أَعۡبُدُ مَا تَعۡبُدُونَ ②﴾ [الکافرون:۱،۲] آدمی کی حق والوں کے ساتھ صلح ہو سکتی ہے، باطل والوں کے سامنے آدمی کبھی نہیں جھک سکتا۔ کفر کے ساتھ معاملات میں صلح ہو سکتی ہے، لیکن یہ توہین ہے کہ ایک سال کے لئے اپنا دین چھوڑ دیں اور ان کے دین پر چلیں۔ یہ تو دین نہ ہوا، بلکہ مذاق ہو گیا۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: آپ یہ نہ سمجھیں کہ ان کو آپ کا پتہ نہیں ہے یا آپ کی نبوت و رسالت میں ان کو شبہ ہے، بلکہ یہ تو آپ کو اس طرح پہچانتے ہیں جیسے کسی بندے کو اپنی اولاد کو پہچاننے میں شبہ نہیں ہوتا کیونکہ اس نے اپنی اولاد کو بچپن سے لے کر جوانی تک تمام اَدوار میں دیکھا ہوتا ہے تو وہ کیسے غلطی کر سکتا ہے؟ اسی طرح یہ لوگ آپ کو جانتے ہیں کہ آپ سچے نبی ہیں، ان کو کوئی شبہ نہیں۔

﴿لَا تَتَّخِذُوا ٱلۡيَهُودَ﴾ کی تفسیر:

پورے قرآن میں غور کریں! اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو جو ہدایات دی ہیں آج ہم نے ان کو چھوڑ دیا، اسی وجہ سے

ہم ذلیل ہو رہے ہیں۔ فرمایا: اے نبی! اگر آپ نے ان یہود و نصاریٰ کی اتباع کی تو آپ ظالمین میں سے ہو جائیں گے۔ اگر نبی کے لئے اتنا تشدیدی حکم ہے تو ہم اگر یہود و نصاریٰ کی پیروی کریں گے تو ہم کیا ہو جائیں گے؟

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے فرمادیا: ﴿لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُودَ وَالنَّصَارَىٰ أَوْلِيَاءَ ۘ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ﴾ [المائدۃ:۵۱] اے ایمان والو! تم کبھی بھی یہود و نصاریٰ کو اپنا دوست مت بناؤ۔ یہ تو ایک دوسرے کے دوست و مددگار بن سکتے ہیں۔ آج چودہ سو سال کے بعد اللہ کے قرآن کا حکم کیسے سامنے آ گیا ہے؟ ورنہ یہود و نصاریٰ کی آپس میں عداوت ضرب المثل ہے کہ ایک ایک دن میں لاکھوں یہودیوں کو انہوں نے قتل کیا، ٹکڑے ٹکڑے کیا، چھ لاکھ یہودیوں کو قیدی بنایا، یہودیوں اور ان کی عورتوں کو اپنی کنیزیں بنایا اور ان کو زنجیریں ڈال کر اور کھینچ کھینچ کر اپنے ملکوں تک لے گئے۔ اور یہودیوں کی عداوت کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنے کی سازش کی۔ آج اسلام کے ساتھ ان دونوں کی عداوت واضح ہے کہ اس کے پوپ نے باقاعدہ اعلان کیا کہ یہودیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو پھانسی دینے کا جرم کیا تھا، ہم نے ان کو معاف کر دیا۔ اب ان کی دوستی اور محبت کا یہ عالم ہو گیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قتل کا جرم بھی معاف کر دیا۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ اتنی جہالت ہے کہ جرم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ہو اور معاف کرنے والا پوپ ہو؟ نہ یہ انجیل میں ہے نہ کتب سابقہ میں ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت میں عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کا موقف:

﴿وَإِنَّ فَرِيقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُونَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُونَ﴾ [البقرۃ:۱۴۶]

ان میں سے ایک جماعت ایسی ہے جو حق کو چھپانے والے ہیں حالانکہ جانتے ہیں کہ یہ حق ہے۔

روایات میں آتا ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ اللہ فرماتے ہیں: ﴿يَعْرِفُونَهُ كَمَا يَعْرِفُونَ أَبْنَاءَهُمْ﴾ تم مجھے بتاؤ کہ کیا یہ حقیقت ہے کہ تم محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسے پہچانتے تھے؟ حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اولاد میں تو شک ہو سکتا ہے کہ شاید بیوی نے خیانت کی ہو، کوئی گناہ کیا ہو، لیکن اللہ تعالیٰ کے نبی میں کوئی شک نہیں ہو سکتا، کیونکہ ان کی ساری نشانیاں تورات میں موجود ہیں۔

حدیث مبارک میں آیا ہے کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک آدمی کو دیکھا، اس کے ساتھ ایک چھوٹا سا بچہ ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اِبْنُكَ هٰذَا؟ قَالَ: نَعَمْ يَارَسُوْلَ اللهِ! أَشْهَدُ بِهٖ، قَالَ: أَمَا أَنَّهٗ لَا يَخْفٰى عَلَيْكَ وَ لَا تَخْفٰى عَلَيْهِ."

[تفسیر ابن کثیر: ۲/۴۲۶]

یہ تمہارا بیٹا ہے؟ اس نے کہا: ہاں! یہ میرا بیٹا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: یہ بات بڑی واضح ہے، نہ تجھ پر چھپتی ہے اور نہ اس پر چھپتی ہے۔

﴿اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ۝ وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ؕ اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يَاْتِ بِكُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَاِنَّهٗ لَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝ وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ۙ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ ۙ اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ ۚ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِيْ ۚ وَلِاُتِمَّ نِعْمَتِيْ عَلَيْكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۝﴾ [البقرة: ۱۴۷ تا ۱۵۰]

"حق وہی ہے جو آپ کا رب کہے، آپ شک کرنے والوں میں سے نہ ہوں۔ اور ہر (اُمت) کے لیے ایک قبلہ تھا جس کی طرف وہ رخ کرتی تھی پس تم نیکیوں میں سبقت کرو، جہاں بھی ہو گے اللہ تم سب کو (قیامت میں) جمع کرے گا، بے شک اللہ ہر شے پر قادر ہے۔ اور آپ جہاں سے بھی نکلیں اپنا رُخ مسجد حرام کی طرف پھیر لیں اور یہی آپ کے رب کی طرف سے حق ہے اور اللہ غافل نہیں ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔ اور آپ جہاں سے نکلیں اپنا رخ مسجد حرام کی طرف کر لیں اور (اے مسلمانو!) تم جہاں (بھی) ہو اپنے رخ اس کی طرف پھیر لیا کرو، تا کہ لوگوں کے لیے تم پر جھگڑے کی کوئی صورت باقی نہ رہے۔ مگر وہ لوگ ان میں سے ظالم ہوئے ان سے نہ ڈرنا، بلکہ مجھ سے ڈرنا، تا کہ میں تم پر اپنی نعمت پوری کروں اور تا کہ تم ہدایت پاؤ۔"

کعبہ کے متعلق یہود کے شبہات:

اس آیت میں یہود و نصاریٰ کے شکوک و شبہات کا دوسرے انداز سے جواب دیا گیا ہے کہ اے میرے نبی! ہر کسی کے لئے ایک جہت ہے، اس نے کسی نہ کسی طرف رخ کرنا ہے۔ بعض نے بیت المقدس کی طرف رخ کر لیا،

بعض نے کعبہ شریف کی طرف رخ کرلیا۔ اصل بات اس جہت کی طرف رخ کرنا نہیں ہے، اصل چیز تو نماز، روزہ، عبادات ہیں۔ کسی طرف رخ کرنا یہ تو عبادت کو ادا کرنے کا ایک ذریعہ ہے، ورنہ صرف جہت اپنے اندر کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ مثلاً اگر ایک آدمی ہر وقت صرف کعبہ کی طرف منہ کرکے کھڑا رہے، نماز نہ پڑھے تو اس کی نماز نہیں ہوگی۔ لہٰذا عبادت کا ذریعہ اللہ چاہیں تو بیت المقدس کو بنادیں اور چاہیں تو کعبہ شریف کو بنادیں۔

آگے فرمایا: ﴿وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ﴾ جدھر بھی تم نکلو، اللہ تعالیٰ کے اس گھر کی طرف رخ کو پھیرو اور جہاں بھی تم ہو اپنے چہرے کو اسی کعبہ کی طرف پھیردو، تاکہ لوگوں کے لئے تم پر کوئی الزام باقی نہ رہ جائے۔ یعنی جب اللہ کے نبی بیت المقدس کی طرف رخ کرکے نماز پڑھتے تھے تو مشرکین مکہ الزام دیتے کہ اللہ کے نبی مکہ میں پیدا ہوئے اور اولادِ اسماعیل سے ہیں اور خود فرماتے ہیں کہ میں ملت ابراہیم پر ہوں، لیکن کعبہ ابراہیمی کی طرف رخ کرکے نماز نہیں پڑھتے، بلکہ بیت المقدس کی طرف نماز پڑھتے ہیں۔ جب اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضور پاک ﷺ کی تمنا پوری فرمادی اور اکمل نبی کو اکمل قبلہ کی طرف بھی پھیردیا تو اب یہود اعتراض کرنے لگ گئے کہ دیکھو! پہلے تو ہمارے قبلہ کی طرف نماز پڑھ رہے تھے، اب ہمارے ساتھ جھگڑے کی وجہ سے ہمارا قبلہ چھوڑ دیا ہے اور اسی قبلہ کی طرف پھر گئے ہیں جو مکہ والوں کا قبلہ ہے۔ اس طرح یہودیوں کا الزام تھا۔

اللہ تعالیٰ نے قیامت تک کے لیے قبلہ کعبہ کو قرار دے دیا تو دونوں کا الزام ختم ہوگیا کہ ہم تو کسی کے گھر کے تابع نہیں، بلکہ ہم تو اللہ کے حکم کے تابع ہیں۔ جب اللہ تعالیٰ ہمیں بیت المقدس کا حکم دیتے ہیں تو ہم اس کی تعمیل کرتے ہیں اور جب اللہ تعالیٰ قبلہ ابراہیمی کا حکم دیتے ہیں تو ہم اس کی تعمیل کرتے ہیں۔ اصل میں ہم اپنے اللہ کے حکم کے پابند ہیں، کسی مکان اور جہت کے پابند نہیں۔ اگر ہم کسی ایک مکان کے پابند ہوتے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ (نعوذ باللہ!) ہم ان پتھروں کو سجدہ کرتے ہیں اور خدانہ کرے کعبہ شریف کی عمارت نہ ہو تو کیا ہمارے سجدے بھی ختم اور ہماری عبادت بھی ختم؟ بلکہ ہم تو اپنے اللہ کو سجدہ کرتے ہیں۔ ہاں! اگر وہ لوگ جو کافر ہیں وہ تو پھر اعتراض سے باز نہیں آئیں گے، وہ ہمیشہ شبہات پیدا کرتے رہیں گے۔ آپ ان ظالموں کے اعتراض سے کبھی نہ گھبرائیں، آپ میری ذات سے ڈریں، دنیا تو کہتی رہتی ہے۔

﴿وَلِأُتِمَّ نِعْمَتِي عَلَيْكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ﴾ اس تحویل قبلہ میں اللہ کی رحمت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ جب میں نے دین کو کامل کردیا، نبوت کو مکمل کردیا تو اب میرا یہ فیصلہ ہے کہ میں تم پر کعبہ کی یہ نعمت بھی پوری کردوں، تاکہ

سب سے افضل نبی کا کعبہ بھی سب سے افضل ہو، اس کا دین بھی سب سے افضل ہو اور جو اُن پر کتاب اُتاری، وہ بھی سب سے افضل ہو اور اس کی شریعت بھی سب سے افضل ہو۔ اس حکم میں تکرار اس لئے ہے کہ یہ سب سے پہلا نسخ والا حکم تھا، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کو بار بار بیان فرمایا، کیونکہ لوگوں کو پتہ نہیں تھا کہ اللہ تعالیٰ کے احکام میں بھی تبدیلی ہوگی۔ بار بار اس لئے فرمایا، تاکہ مومنوں کے دلوں میں ایمان وایقان بڑھ جائے اور دشمنوں کو کسی قسم کا شبہ نہ رہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ احوال مختلف ہیں کہ بعض اوقات آدمی کعبہ کے سامنے کھڑا ہے اور بعض اوقات مکہ میں کعبہ نظر نہیں آرہا اور بعض اوقات دوسرے علاقوں میں ہے تو اللہ تعالیٰ نے تین دفعہ بیان فرمایا کہ سب کا حکم ایک ہے، مکہ کے اندر ہیں تو یہی قبلہ ہے، مکہ سے باہر ہیں تو بھی یہی قبلہ ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ہم نے آپ کو اس قبلہ کا اس لئے حکم دیا ہے: ﴿لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ﴾ تاکہ لوگوں کا تم پر کوئی الزام باقی نہ رہے، کیونکہ تورات اور سابقہ کتابوں میں لکھا ہوا تھا کہ حضور اکرم ﷺ کی اُمت کعبہ ابراہیمی کی طرف نماز پڑھے گی۔ اللہ تعالیٰ یہ قبلہ نہ بناتے تو وہ کہتے: یہ تو وہ نبی نہیں ہے، کیونکہ ہماری کتابوں میں ان کی صفات میں لکھا ہوا ہے کہ وہ قبلہ ابراہیمی کی طرف توجہ کرے گا، جبکہ یہ نبی تو بیت المقدس کی طرف رخ کرتے ہیں تو تحویل قبلہ کے حکم نے ان کے الزام کو ختم کردیا۔

﴿كَمَآ أَرْسَلْنَا فِيكُمْ رَسُولًا مِّنكُمْ يَتْلُوا عَلَيْكُمْ آيَاتِنَا وَيُزَكِّيكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُم مَّا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ ۝ فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوا لِي وَلَا تَكْفُرُونِ ۝﴾ [البقرۃ: ۱۵۱، ۱۵۲]

”جس طرح ہم نے تم میں ایک رسول (محمد ﷺ) تمہیں میں سے بھیجا جو تمہیں ہماری آیات سناتا ہے اور تمہیں پاک کرتا ہے اور تمہیں کتاب اور احکام کی تعلیم دیتا ہے اور تمہیں وہ باتیں سکھاتا ہے جو تم نہیں جانتے تھے۔ پس تم مجھے یاد کرو، میں تمہیں یاد کروں گا اور تم میرا شکر کرو اور ناشکری نہ کرو۔“

انسان کی مجموعی قوتیں اور نبوت کی اہلیت:

تحویل قبلہ کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا کے بارے میں ذکر فرمایا کہ اس اُمت کو جیسے ہم نے عظیم کعبہ دیا جو ”ھدی للعالمین“ ہے، ان کو پیغمبر بھی ”رحمۃ للعالمین“ دیا، فرمایا: ہم نے تمہارے پاس رسول

بھیجا جو تم میں سے ہے۔ یہ اللہ پاک کا انعام ہے کہ اللہ نے جو نبی بھیجے وہ انسانوں میں سے بھیجے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جو بشر کے اندر قوتیں رکھی ہیں وہ کسی اور مخلوق میں نہیں رکھیں۔ فرشتوں کے اندر اللہ تعالیٰ نے قوائے عقلیہ اور قوائے ملکیہ رکھی ہیں، لیکن قواتِ شہوانیہ وحیوانیہ سے وہ پاک ہیں، وہ اللہ تعالیٰ کی تسبیح وتحمید اور اللہ کے حکم کی اطاعت میں ہمہ تن مشغول رہتے ہیں۔ حیوانات کے اندر قوتِ شہوانیہ تو ہے لیکن قوت عقلیہ نہیں ہے۔ اللہ نے یہ شرف صرف بشر کو دیا ہے کہ اس کے اندر تمام قوتیں قوتِ ملکیہ، قوتِ عقلیہ، قوتِ شہوانیہ اور غضبیہ وغیرہ رکھی ہیں تو ان تمام قوتوں کے مجموعے کا نام انسان ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک جتنے رسول بھیجے، وہ سب بشر اور سید البشر تھے، اولادِ آدم میں سے تھے، اس لئے حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فخر سے فرمایا: ''أَنَا النَّبِيُّ لَا كَذِبْ، أَنَا ابْنُ عَبْدِالْمُطَّلِبْ'' میں عبدالمطلب کا بیٹا ہوں اور فرمایا: ''أَنَا سَيِّدُ وُلْدِ آدَمَ'' میں آدم علیہ السلام کی اولاد کا سردار ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سید البشر ہیں، اگر کوئی آپ کی بشریت کا انکار کرے تو وہ اللہ کے قرآن اور اللہ کے نبی کے فرمان کا منکر ہو جاتا ہے۔ انسانیت کو حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے شرف ملا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ہمارا احسان مانو کہ ہم نے تمہارے پاس تم میں سے رسول بھیجا ہے، لیکن تم پھر بھی میرا احسان نہیں مانتے ہو۔ اگر اللہ پاک فرشتوں کو نبی بنا کر بھیجتے اور وہ تمہیں روزہ کا حکم دیتے تو لوگ کہتے کہ تمہیں تو بھوک نہیں لگتی۔ وہ کہتے: خبردار! غیر محرم عورت پر نظر نہ ڈالنا تو لوگ کہتے آپ کو گناہوں سے پاک ہیں، تمہارے اندر تو مادہ شہوانیت نہیں ہے، اگر تمہارے اندر مادہ شہوانیت ہوتا تو پھر ہم دیکھتے کہ کیسے بچا جاتا ہے؟ اور اللہ تعالیٰ اگر فرشتوں کو نبی بنا کر بھیجتے تو وہ دو حالتوں میں سے ایک حالت پر آتے یا اپنی اصلی حالت پر آتے تو کس کے اندر ان کو دیکھنے کی طاقت ہوتی؟ اور اگر انسان کی شکل میں آتے تو لوگ کہتے لباس بشر کا پہنا ہوا ہے، لیکن کھاتا پیتا نہیں ہے، شادی نہیں کرتا، اولاد نہیں ہے۔

آگے فرمایا: میرے رسول کا وظیفہ یہ ہے کہ تم کو میرا قرآن پڑھ پڑھ کر سنائے۔ اور دوسرا وظیفہ یہ ہے کہ تمہیں پاکیزہ بنا دے گا، تمہیں مرتبۂ احسان پر پہنچائے گا۔ تزکیہ کا مقصد ہوتا ہے انسان کامل، مکمل، پاک اور اندر باہر سے ٹھیک ہو کر اللہ تعالیٰ کا مطیع بن جائے اور تمہارے اخلاق کی اصلاح کر دے، تمہیں طمع سے بچائے، حرص سے بچائے، گناہوں سے بچائے اور تمہارے اندر قوئی ملکیہ پیدا کر دے۔ اور تیسرا وظیفہ یہ ہے کہ تمہیں میرے قرآن کی تعلیم دے، دانائی اور حکمت کی باتیں تم کو سکھائے اور تم کو ان چیزوں کی تعلیم دے جو تم نہیں جانتے اور تمہیں دنیا کے اندر جینے

کے سلیقے سکھائے، تمہیں حلال وحرام کی تعلیم دے اور وہ مسائل جن کو تم نہیں جانتے، ان کی تعلیم دے۔

کثرتِ ذکر اللہ کا حکم:

میری اتنی بڑی نعمتوں کا تقاضا یہ ہے کہ تم مجھے یاد کرو، میں تمہیں یاد کروں گا۔ فرشتوں سے کہوں گا کہ دیکھو! مجھے میرے بندے نے یاد کیا ہے۔ نماز، قرآن، تسبیح، تحمید کرو، تکبیر سب اللہ کا ذکر ہے تم مجھے ہر وقت یاد رکھو کیونکہ ہر عمل کی حد ہے، لیکن میرے ذکر کی کوئی حد نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: تم میرا ذکر بندوں میں کرتے ہو تو میں تمہارا ذکر ملائکہ میں کرتا ہوں کہ دیکھو! میرا بندہ ہر وقت میری تسبیح وتہلیل میں مشغول ہے۔ حدیث میں آتا ہے: اتنا ذکر کرو کہ لوگ کہیں یہ دیوانہ ہو گیا ہے، اس کو نہ کھانے کا ہوش ہے نہ پینے کا ہوش ہے۔ جب تک انسان اپنے مشن کے ساتھ اس حد تک مخلص نہ ہو جائے اس وقت تک ترقی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: جب آدمی غافل ہو جاتا ہے تو اس سے نماز چھوٹ گئی، اللہ کا ذکر چھوٹ گیا، تلاوت قرآن چھوٹ گئی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ شیطان دل پر ڈیرہ ڈال لیتا ہے۔ بعض احادیث میں آیا ہے کہ جب ذکر کرنے والے کا جہنم سے گزر ہوگا تو جہنم چیخ پڑے گی کہ مومن! جلدی کرو، گزر جاؤ، ورنہ میں تو بجھ جاؤں گی۔ حدیث میں آتا ہے کہ حشر کے میدان میں جب پچاس ہزار سال یا ایک ہزار سال کا دن ہوگا تو مومن پر یہ عرصہ کیسے گزرے گا جیسے اس نے عصر کی نماز سے مغرب تک کا وقت گزارا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مومن اللہ کے ذکر میں ایسا مستغرق ہوگا کہ اسے پتہ ہی نہیں لگے گا اور کافروں کے لئے پچاس ہزار سال بڑا اس لئے ہوگا کیونکہ جتنا عذاب بڑا، اتنا بڑا دن محسوس ہوگا۔

اللہ کا شکر کیسے کیا جائے؟

﴿وَاشْكُرُوا لِي وَلَا تَكْفُرُونِ﴾ [البقرۃ:۱۵۲]

''تم میری نعمتوں کا شکر کرو اور کفر نہ کرو۔''

سب سے پہلا شکر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ پر ایمان لے آؤ۔ قرآن نے دوسری جگہ فرمایا: ﴿إِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيلَ إِمَّا شَاكِرًا وَإِمَّا كَفُورًا﴾ [الدھر:۳] ہم نے کھلا راستہ دیا ہے، اب بندے یا تو شکر والے مومن بندے بنیں گے یا کافر بنیں گے۔

دوسرا شکر یہ ہے کہ اللہ کے احکام پر چلو۔ اللہ نے جو نعمتیں دی ہیں، انہیں اسی کام میں صرف کرو۔ مثلاً کان کا

کام سننا ہے، آنکھوں کا کام دیکھنا ہے، ناک کا کام سونگھنا ہے، پاؤں کا کام چلنا ہے، ہاتھوں کا کام پکڑنا ہے۔ ہر عضو اپنی اپنی ڈیوٹی میں لگا ہوا ہے، دوسری ڈیوٹی نہیں کرسکتا تو اے انسان! تجھے میں نے جس ڈیوٹی کے لئے پیدا کیا ہے تم اگر وہ ڈیوٹی نہ کرو تو تمہارے جیسا دنیا میں کوئی حیوان نہیں ہے تو شکر کا دوسرا درجہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے جو اعضاء دیئے ہیں، ان کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں لگائیں۔ زبان کا شکر یہ ہے کہ زبان سے کہو: "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ، سُبْحَانَ اللهِ، لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ" ورنہ اصل شکر دل کا شکر ہے۔

"مَنْ لَمْ يَشْكُرِ النَّاسَ لَمْ يَشْكُرِ اللّٰهَ." [جامع ترمذی، رقم:۱۹۵۵]

جو آدمی کسی بندے کا شکر نہیں کرتا وہ اللہ تعالیٰ کا بھی شکر نہیں کرتا۔ حضور اکرم ﷺ نے حکم دیا ہے کہ اگر کوئی آدمی تمہیں ہدیہ دیتا ہے، کوئی چیز لے کر آیا ہے تو اس کا بدلہ دو۔ اگر امیر ہو تو تم بھی اس کے لیے ہدیہ بھیجو اور غریب ہو تو اپنی زبان سے بدلہ ادا کرو، "جَزَاكَ اللّٰهُ خَيْرًا" کہو، اس کے لیے دعا کرو۔

حضرت زید بن اسلم رحمہ اللہ کی روایت میں ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے عرض کیا: یا اللہ! آپ نے جو حکم دیا ہے کہ میرا شکر کرو تو ہم تیرا شکر کیسے کریں؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے موسیٰ! جب تم مجھے یاد کرو گے تو گویا تم نے میرا شکر کیا اور جب تم مجھے بھول گئے تو گویا تم نے میری نعمتوں کی ناشکری کی۔ شکر کرنے کا مطلب یہ نہیں کہ صرف زبان سے "سبحان اللہ" یا "اللہ اکبر" کہہ دیا، بلکہ شکر یہ ہے کہ ہر وقت اللہ تعالیٰ اور اللہ تعالیٰ کے احکامات کو یاد رکھے اور ان پر عمل کرے۔ اگر احکامات پر عمل نہیں کرتا تو درحقیقت اس نے یاد بھی نہیں کیا، کیونکہ جو اللہ تعالیٰ کو یاد کرے گا وہ نافرمانی نہیں کرسکتا۔ اگر کوئی غلطی ہوگئی تو توبہ کرکے اللہ کے دروازے پر رونے لگ جائے تو اللہ تعالیٰ بھی معافی دے دیتے ہیں۔ جب اس مقام پر انسان آجاتا ہے تو پھر وہ زبان سے بھی شکر اور دل سے بھی شکر بجالاتا ہے۔

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ، حضرت ابو العالیہ رحمہ اللہ، حضرت سدی رحمہ اللہ، حضرت ربیع بن انس رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ اس کو یاد فرماتے ہیں جس نے اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا اور اللہ تعالیٰ اس کی نعمتوں میں اضافہ فرماتے ہیں اور جو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرے، شکر بجا نہ لائے تو اللہ اس کو عذاب دیتے ہیں۔

شکر نعمتوں میں اضافے کا سبب ہے:

سابقہ روایات میں آتا ہے کہ ایک آدمی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا: آپ اللہ کے

رسول ہیں، اللہ تبارک وتعالیٰ نے مجھے اتنی نعمتیں دی ہیں، صحت وعافیت بھی دی ہے، فرمانبردار بیوی بچے بھی دیئے ہیں، اللہ نے دولت سے بھی نوازا ہے، اللہ کی اتنی ساری نعمتیں ہیں، اب میں ان کا متحمل نہیں ہوں، اللہ پاک سے عرض کریں کہ اللہ پاک مجھے اور نعمتیں نہ دے، یہی کافی ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام نے اللہ سے عرض کیا: مولا! تیرے بندے کو وہ نعمتیں کافی ہیں اور وہ کہتا ہے کہ مجھے اور نعمتیں نہیں چاہئیں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میرے بندے کو کہہ دو، تم میرا شکر کرنا بند کردو، میں بھی نعمتیں دینا بند کردوں گا، اگر میرا شکر کرنا بند نہیں کرے گا تو میں نعمتیں دینا بند نہیں کروں گا۔ میرا وعدہ ہے جو شکر کرے گا اس کو دیتا چلا جاؤں گا۔

قرآن پاک میں ہے: ﴿وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَهُوَ يُخْلِفُهٗ ۚ وَهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ﴾ [سبا:۳۹] جو تم اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرتے ہو، اللہ تعالیٰ اس کو لوٹاتے ہیں۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: کبھی کسی انسان کا مال خیرات کرنے سے کم نہیں ہوتا۔ بظاہر تو لگتا ہے کہ کم ہوگیا، مگر اللہ تعالیٰ اس میں برکتیں عطا فرماتے ہیں اور اس تھوڑے کو اتنا بڑھا دیتے ہیں کہ تم سمجھ نہیں سکتے۔

گناہ کرنے والے کا شکر قبول نہیں کیا جاتا:

حضرت مکحول الازدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ مجھے ایک بات سمجھ نہیں آتی کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں فرمایا: تم مجھے یاد کرو، میں تمہیں یاد کروں گا۔ آپ مجھے یہ بتائیں کہ ایک آدمی جو خودکشی کرنے والا، ایک آدمی کسی بندے کو قتل کرنے والا، ایک آدمی شراب پینے والا، ایک آدمی چوری کرنے والا، ایک آدمی زنا کرنے والا وہ بھی اللہ تعالیٰ کو یاد کرتا ہے تو کیا اللہ تعالیٰ اس کو بھی یاد کرتے ہیں؟ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اللہ کا حکم بالکل ٹھیک ہے، لیکن جب یاد کرتا ہے تو اللہ اس کو اپنی لعنت سے یاد کرتے ہیں کہ تم میرا نام بھی لیتے ہو اور گناہ بھی کرتے ہو، ﴿فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِيْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ﴾ [البقرۃ:۱۵۲] جب تک وہ ان گناہوں کو نہیں چھوڑے گا، اللہ بھی اس کو لعنت سے یاد کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ بندے کو کیسے یاد کرتا ہے؟

حضرت سعید بن جبیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿فَاذْكُرُوْنِيْٓ﴾ مجھے یاد کرو، یعنی میری فرمانبرداری کرو، ﴿اَذْكُرْكُمْ﴾ میں تمہاری مغفرت کرکے تمہیں یاد کروں گا۔ حدیث قدسی ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

''فَإِنْ ذَكَرَنِي فِي نَفْسِهِ ذَكَرْتُهُ فِي نَفْسِي، وَ إِنْ ذَكَرَنِي فِي مَلَإٍ ذَكَرْتُهُ فِي مَلَإٍ خَيْرٍ مِنْهُمْ.''

[صحیح بخاری، رقم: ۷۴۰۵]

اگر بندہ مجھے تنہا یاد کرتا ہے تو میں بھی اسے تنہا یاد کرتا ہوں اور اگر وہ مجھے جماعت میں یاد کرتا ہے میں اس کو اس سے بہتر جماعت یعنی ملائکہ کی جماعت میں یاد کرتا ہوں۔ اس لئے بعض علماء جماعت کے ذکر کو افضل قرار دیتے ہیں۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

''يَا ابْنَ آدَمَ! إِنْ ذَكَرْتَنِي فِي نَفْسِكَ ذَكَرْتُكَ فِي نَفْسِي وَ إِنْ ذَكَرْتَنِي فِي مَلَإٍ ذَكَرْتُكَ فِي مَلَإٍ مِنَ الْمَلَائِكَةِ أَوْ فِي مَلَإٍ خَيْرٍ مِنْهُمْ.'' [مسند احمد بن حنبل، رقم: ۱۲۴۰۵]

اگر تم مجھے دل میں یاد کرو گے تو میں تمہیں دل میں یاد کروں گا اور اگر تم مجھے جماعت میں یاد کرو گے تو میں تمہیں ملائکہ کی جماعت میں یاد کروں گا۔

اگر تم میری طرف ایک بالشت بڑھو گے تو میں ایک ہاتھ بڑھوں گا اور اگر تم ایک ہاتھ بڑھو گے تو میں ایک گز سے بھی زیادہ بڑھوں گا اور اگر تم چل کر آؤ گے تو میں دوڑ کر آؤں گا، یعنی تم میری اطاعت کرو گے تو میری مغفرت تمہارے لئے آئے گی۔ (بخاری)

حضرت ابو رجاء العطاردی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ ہمارے پاس آئے، انہوں نے ریشمی کپڑے کا عبا یا پہنا ہوا تھا، ایسی قیمتی چیز ہم نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ اس لئے ہم دیکھ کر حیران ہو گئے تو انہوں نے فرمایا: کیوں حیران ہوتے ہو؟ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''مَنْ أَنْعَمَ اللهُ عَزَّوَجَلَّ عَلَيْهِ نِعْمَةً فَإِنَّ اللهَ عَزَّوَجَلَّ يُحِبُّ أَنْ يُرِىٰ أَثَرَ نِعْمَتِهِ عَلَىٰ خَلْقِهِ.''

[مسند احمد بن حنبل، رقم: ۱۹۹۳۴]

اگر اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے کسی بندے پر نعمت کریں تو اللہ کو یہ محبوب ہے کہ اس نعمت کا اثر اس بندے پر بھی ظاہر ہو، یعنی اگر اللہ نے تم کو نعمت دی ہے تو اچھا پہنا کرو، اچھا لباس رکھو، تا کہ اللہ کی نعمتوں کا اثر تم پر ظاہر ہو۔ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو استعمال کرنا بھی اللہ تعالیٰ کا شکر ہے۔

﴿يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ ٱسْتَعِينُوا۟ بِٱلصَّبْرِ وَٱلصَّلَوٰةِ ۚ إِنَّ ٱللَّهَ مَعَ ٱلصَّٰبِرِينَ ۝ وَلَا تَقُولُوا۟ لِمَن يُقْتَلُ فِى سَبِيلِ ٱللَّهِ أَمْوَٰتٌۢ ۚ بَلْ أَحْيَآءٌ وَلَٰكِن لَّا تَشْعُرُونَ ۝﴾ [البقرۃ: ۱۵۳، ۱۵۴]

''اے ایمان والو! مدد حاصل کرو صبر اور نماز کے ساتھ بلاشبہ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ اور ان کو جو اللہ کی راہ میں مارے گئے، مردہ نہ کہو، بلکہ وہ زندہ ہیں، تم نہیں جانتے۔''

اتباعِ شریعت اور مصائب پر صبر کی تلقین:

گزشتہ آیات میں حکم تھا کہ تم مجھے یاد کرو میں تمہیں یاد کروں گا۔ دوسرا حکم تھا میرے شکرگزار بندے بنو، کفرانِ نعمت نہ کرو۔ اللہ تعالیٰ کو یاد کرنے کا مطلب یہ ہے کہ جن چیزوں کو کرنے کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا، اس پر عمل کرے اور جن چیزوں سے اللہ تعالیٰ فرمایا ہے، ان سے رک جائے۔ حضور اکرم ﷺ سے محبت کرنے کا مطلب ہے کہ آپ ﷺ کی سنت کے مطابق زندگی گزارے، اسی طرح اولیاء اللہ سے محبت کا مطلب یہ ہے کہ زندگی میں انہوں نے اپنا جو مشن رکھا ہے اور جس طرح انہوں نے عبادت کی ہے، حرام کو چھوڑا، دنیا کی شہوات کو ترک کر کے اپنی زندگی کو اللہ تعالیٰ و رسول ﷺ کے راستہ پر لگایا۔ اگر کوئی آدمی اس طرح اپنی زندگی گزارتا ہے تو یہ یاد کرنے والوں میں شمار ہوگا، ورنہ بے ادبی اور توہین کرنے والوں میں شمار ہوگا۔ چونکہ اس زندگی کو حاصل کرنا مشکل ہے تو ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو علاج بتایا ہے کہ تم میرا شکر کرنا چاہو، میرے احکام پر عمل کرنا چاہو اور برائیوں سے بچنا چاہو، میری توحید لے کر کھڑے ہو جاؤ، مشرکین ستائیں گے، جب سنت پر عمل پیرا ہو گے تو بدعت والے آپ کے مخالف بنیں گے، جب آپ صحابہ و اہل بیت کے طرزِ زندگی کو اپناؤ گے تو ان کے مخالفین آپ کے دست و گریبان ہوں گے۔ جب آپ حلال پر چلیں گے تو حرام والے آپ کے مخالف ہوں گے، جب یہ مقابلہ ہوگا تو تکلیفیں اور پریشانیاں آئیں گی اللہ تعالیٰ نے اس آیت مبارکہ میں ان سب تکالیف کا علاج بتا دیا ہے۔

اگر تم واقعی ایمان والے ہو اب کفر تمہارے مقابلے پر ہے کفر کے ساتھ جو مل جائیں اور مصالحت کر کے زندگیاں گزاریں تو سمجھ لو کہ ایمان نہیں ہے کیونکہ ایمان کی قوت ہو تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ کفر کے ساتھ ایک لمحہ کے لئے بھی چل سکے۔ حضور اکرم ﷺ نے جب سرزمین مکہ میں کفر کو چیلنج کیا تو ایک منٹ کے لئے بھی کفر نے

آپ ﷺ کا ساتھ نہیں دیا، بلکہ وہ لوگ جو حضور اکرم ﷺ پر جان نچھاور کرتے تھے، جو آپ ﷺ کو صادق و امین کہتے تھے، سب دشمن بن گئے۔ آپ ﷺ کے راستے میں کانٹے بچھاتے، آپ ﷺ کے اوپر کوڑا کرکٹ پھینکتے، آپ ﷺ کے صحابہ کو گلیوں کے اندر گھسیٹتے، انگاروں پر لٹاتے۔ بالآخر ان کو مکہ سے نکالا گیا کیونکہ یہ لوگ ایمان لے آئے ہیں تو اب کفر کے ساتھ انہوں نے ٹکرانا ہوگا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے ایمان والو! اگر تم ایمان والے بن گئے ہو کیا تمہارے اندر ایمان والی صفات آ گئی ہیں؟

مسلمانوں کی حالت زار دیکھ کر نصرانی عورت کا اسلام قبول نہ کرنا:

ایک نصرانی لڑکی نے کتاب لکھی اور اس میں تحریر کیا کہ میں نے تمام مذاہب کا مطالعہ کیا ہے، سب سے کامل مکمل اور سچا مذہب اسلام ہے، اسلام کے اندر اتنا کمال ہے کہ وہ ہر آنے والے دور کے چیلنجوں کا مقابلہ کرتا ہے، ہر آنے والی مشکلات کا حل بتاتا ہے، اسلام کے مقابلہ پر دنیا کا کوئی مذہب نہیں ہے، لیکن میں نے اسلام اس لیے قبول نہیں کیا کہ جب میں کتابوں میں پڑھتی ہوں تو اسلام جیسا مجھے سچا مذہب نظر نہیں آتا لیکن جب مسلمانوں پر نظر دوڑاتی ہوں تو ان میں ایک بھی مجھے مسلمان نظر نہیں آتا، ان میں مومنین و متقین کی صفات نظر نہیں آتیں۔ اس لئے میں اس نتیجہ پر پہنچی ہوں کہ یا تو اسلام پر عمل کرنا مشکل ہے جو یہ مسلمان نہیں کر سکتے یا یہ سارے لوگ اسلام سے دھوکہ کر رہے ہیں تو میں اسلام لا کر کیا کروں گی؟ کیونکہ اسلام لانے کے بعد میں نے انہی کے ساتھ رہنا ہے تو میں بھی ایک منافق کی زندگی اختیار کروں گی اور اسلام کے اندر منافق کی سزا کافر سے بھی زیادہ ہے لہٰذا اس نفاق سے بہتر ہے کہ میں جس حالت پر ہوں اس پر اپنے آپ کو رکھوں۔

اس کا جواب واضح ہے کہ انسان سے اس کے اعمال کے بارے میں پوچھا جائے گا، نہ کہ دوسروں کے اعمال کے بارے میں۔ اگر لوگوں میں بد دیانتی ہے تو وہ اسلام قبول کر کے ان خامیوں کو دور بھی کر سکتے ہیں، اسلام نہ لانا ہو تو اس کے لئے کئی بہانے ہیں۔ ﴿وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝﴾ [البقرۃ: ۲۱۳]

قرآن کس کس پر لعنت کرتا ہے؟

جب قرآن پڑھیں تو اس میں غور و فکر کریں۔ یہ نہیں کہ قرآن ختم کر کے دعا کر لی کہ اے اللہ! اس کا ثواب فلاں کو پہنچا دے۔ کیونکہ پہلے تو یہ دیکھیں کہ ثواب ملا بھی ہے یا نہیں؟ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: میری اُمت میں

ایسے لوگ آئیں گے، قرآن پڑھنے والے ہوں گے، لیکن اللہ تعالیٰ کا قرآن ان پر لعنت کر رہا ہوگا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یارسول اللہ! وہ کس طرح؟ آپ ﷺ نے فرمایا: قرآن میں ﴿لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ﴾ [ھود:۱۸] آیا ہے، اگر وہ قرآن پڑھتا ہے اور ظلم بھی کرتا ہے تو قرآن اس پر لعنت کر رہا ہے، اسی طرح اگر وہ جھوٹ بولتا ہے تو قرآن فرماتا ہے: "لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ" جھوٹ بولنے والا قرآن پڑھے تو گویا قرآن لعنت کر رہا ہے، اس لئے جہاں قرآن میں خطاب آئے: ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ تو پہلے اپنے گریبان میں جھانکے، مولوی اپنے گریبان میں جھانکے، عام آدمی اپنے گریبان میں جھانکے، کیا ہمارے اندر وہ ایمان والی صفات موجود ہیں یا نہیں؟ اگر ہیں تو کتنی ہیں؟ یا بالکل صفر ہیں، اگر نہیں ہیں تو نہ ہونے کی وجہ کیا ہے؟

﴿اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ﴾ اگر ہمارے اندر ایمان صحیح ہے اور ہمارے اوپر مشقت آجائے یا مصیبت آجائے تو اس کا علاج یہ ہے کہ صبر کرنے کے ساتھ اور نماز پڑھنے کے ساتھ مدد پکڑیں۔

صبر کا معنی:

﴿بِالصَّبْرِ﴾ صبر کہتے ہیں: اللہ تعالیٰ کے فرمان پر عمل کرنا اور حرام سے رک جانا۔ صبر کا مشہور معنی یہ ہے کہ اگر کوئی غم اور مصیبت آئے تو اپنے آپ کو غیر شرعی فعل کرنے سے روکنا۔ اسی طرح گناہوں سے بچنے کا نام بھی صبر ہے۔

ایک صحابیہ کے صبر کا واقعہ:

ایک صحابی سفر پر تشریف لے گئے۔ جس دن واپس آرہے تھے ان کا چھوٹا لڑکا اس دن فوت ہوگیا۔ بیوی نے سوچا بچہ مر گیا، اتنا بڑا صدمہ آگیا اور اتنی مدت اور سفر کے بعد میرا خاوند گھر واپس آرہا ہے تو بیوی نے بچے کو نہلایا اور کفن دے کر ایک کمرے میں لٹادیا۔ اس کے بعد اس نے خود غسل کیا، کپڑے پہنے اور تیار ہو کر بیٹھ گئی۔ جب خاوند آیا تو بڑے خوش ہو کر اس کا استقبال کیا۔ خاوند نے پوچھا: بچے کا کیا حال ہے؟ اس نے کہا: الحمد للہ! بچہ مکمل خیر میں ہے (کیونکہ خیر حقیقی یہی ہے کہ وہ سارے دُکھوں سے بچ گیا، دنیا کے غموں سے دور ہوگیا)۔ بہر حال رات کو میاں بیوی نے حقوقِ زوجیت ادا کیے۔ پھر صبح کی نماز کے بعد بیوی نے خاوند سے کہا: میں نے آپ سے ایک بات پوچھنی تھی۔ اس نے کہا: کیا بات ہے؟ اس نے کہا: اگر کوئی آدمی امانت دے اور پھر کہے کہ میری امانت واپس کردو تو وہ امانت واپس کردینی چاہیے یا اسے واپس کرنے میں دُکھ ہونا چاہیے؟ خاوند نے کہا: واپس کرنی چاہیے، وہ اپنی چیز



لے گیا ہماری چیز نہیں لے گیا۔ بیوی نے کہا: اللہ تعالیٰ نے جو بچہ ہمیں امانت دیا تھا، وہ اللہ نے واپس لے لیا ہے، اب تمہاری مرضی ہے، اللہ سے ناراض ہو جاؤ یا صبر کرو۔ انہوں نے کہا: ﴿اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ﴾۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام، بی بی سارہ رضی اللہ عنہا اور ظالم بادشاہ کا واقعہ:

نیکی پر جے رہنا بھی صبر ہے، جیسے سردی میں ہاتھ پاؤں ٹھٹھر رہے ہوں، فجر کی اذان ہوگئی تو جلدی سے نماز کی تیاری کرنا وغیرہ۔ اگر مصیبت پڑے تو دوسرا نسخہ نماز ہے۔ نماز، ہر غم کا علاج ہے، بارش نہ ہو، قحط پڑ جائے تو حکم ہے صلوٰۃ الاستقاء پڑھو، نماز پڑھو گے تو اللہ تعالیٰ کی رحمتیں آئیں گی۔ اگر کوئی پریشانی آجائے تو صلوٰۃ الحاجت پڑھو، دو رکعت نفل پڑھ لو اور نیت یہ کرو کہ اے میرے اللہ! جو میرے اوپر پریشانی ہے، اس کو ختم کر دے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کہتے ہیں کہ جب بھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی پریشانی آتی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھتے تھے۔

صحیح احادیث میں مروی ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام اور بی بی سارہ رضی اللہ عنہا سفر کر رہے تھے تو راستے میں ایک ظالم بادشاہ تھا اور وہ عجیب تھا کہ اگر کوئی آدمی اپنی بیوی کے ساتھ سفر کر رہا ہوتا تو اس کی بیوی کو چھین لیتا، اس کی عصمت دری کرتا تھا اور اگر بہن یا بیٹی ساتھ ہوتی تو اس کو نہیں چھیڑتا تھا۔ بہر حال سیدنا ابراہیم علیہ السلام جا رہے تھے اور آپ کی بی بی ساتھ تھی۔ آپ کو پکڑ لیا، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کو جواب سکھایا کہ اگر بادشاہ تم سے پوچھے کہ تم میری کیا لگتی ہو؟ تو تم کہہ دینا بہن ہوں، تاکہ عزت و عصمت بچ جائے۔ جب ان کو پکڑ کر لے گئے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نماز پڑھنے لگے کہ یا اللہ! میں تجھ سے نماز ہی کے ذریعہ سے مدد مانگ سکتا ہوں۔ میں اکیلا آدمی تو بادشاہ سے نہیں لڑ سکتا تو اللہ پاک نے مہربانی کی کہ جب بی بی صاحبہ وہاں پہنچیں تو بادشاہ نے اپنے حرم سرا میں بلا لیا۔ اپنے کمرے میں جب انہیں بلایا اور وہ بری نیت سے بڑھنے لگا تو اللہ پاک نے اس کے ہاتھ پاؤں وہیں شل کر دیئے اور ایسا تین بار ہوا۔ وہ سمجھ گیا کہ اس بی بی پر میں حملہ نہیں کر سکتا تو اس نے ان کو عزت کے ساتھ واپس کر دیا۔ واقعہ لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام پر مصیبت آئی تو نماز کے ذریعے اللہ تعالیٰ سے مدد حاصل کی۔

حضرت جریج رحمۃ اللہ علیہ پر تہمت کا واقعہ:

حضرت جریج رحمۃ اللہ علیہ اللہ تعالیٰ کے عبادت گزار بندے تھے، ان پر زنا کی تہمت لگائی گئی۔ قوم نے ان کو گھیر لیا، انہوں نے فوراً نماز شروع کر دی۔ ہر دکھ کا علاج نماز کے اندر موجود ہے، کیونکہ نماز کے اندر ذکر بھی ہے، قرآن بھی

ہے، نماز کے اندر معراج بھی ہے، نماز کے اندر بندے کا اللہ تعالیٰ سے تعلق بھی ہے، نماز کے اندر اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع بھی ہے، دعا بھی ہے، تسبیح و تقدیس بھی ہے، نماز جامع عبادت ہے، اس لئے حکم ہے کہ اگر تم پر کوئی بھی مصیبت آجائے، کوئی مشکل آجائے، کوئی پریشانی آجائے تو دو ہتھیار مضبوطی سے پکڑ لو، ﴿اِسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ﴾ صبر اور نماز۔

جب اللہ تعالیٰ کے دروازے پر آگئے، جس کی شان یہ ہے ﴿اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَیْـًٔا اَنْ یَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ﴾ [یٰسین:۸۲] کہ اللہ ﴿كُنْ فَیَكُوْنُ﴾ سے سارے مسئلے حل کر دیتے ہیں۔ اگر کبھی دیر ہو جائے تو اس میں ہمارے گناہ حائل ہوتے ہیں، کیونکہ ہمارے اعمال خراب ہیں، ورنہ نماز ایک اکسیری نسخہ ہے۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ﴾ اللہ تعالیٰ کے صابرین کے ساتھ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ہر چیز اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے یہ معیت علم ہوتی ہے اور کبھی معیت نصرت ہوتی ہے کہ اس بندے کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی مدد آجاتی ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ (نعوذ باللہ!) اللہ اس بندے میں آجاتے ہیں، جیسے بعض جاہل کہتے ہیں یہ فناء ہو گیا، خدا خود اس کے اندر آگیا۔ یہ کفر و شرک ہے۔

حضرت عبدالرحمٰن بن زید اسلم رحمہ اللہ فرماتے ہیں یا تو صبر ان چیزوں میں ہوتا ہے جو اللہ کو محبوب ہیں، وہ چاہے بدن پر کتنی بھاری ہوں، لیکن آدمی برداشت کرے اور صبر کرے، جیسا کہ جہاد کرنا اللہ کو محبوب ہے، اس میں آدمی جان کو ختم کر دیتا ہے، اللہ کے لئے جان بھی قربان کر دیتا ہے۔ اسی طرح اگر ایک ملک میں ہم دین پر قائم نہیں رہ سکتے، نماز نہیں پڑھ سکتے، شعائر اسلام پر قائم نہیں رہ سکتے تو ہجرت کریں۔ اپنے وطن کو چھوڑنا کوئی آسان بات نہیں، لیکن اللہ تعالیٰ کا حکم ہے اور ایک ان چیزوں پر صبر ہوتا ہے جن کو اللہ تعالیٰ ناپسند کرتے ہیں۔ ہماری خواہش کہتی ہے کہ میں بھی اس طرح دولت مند بن جاؤں، لیکن اس سے رک جانا بھی صبر ہے۔ جس آدمی نے صبر کے ان دروازوں پر صبر کر لیا تو (ان شاء اللہ!) اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے سلامتی اور رحمت ہے۔

صبر کرنے والوں کے لیے بلا حساب جنت کا انعام:

حضرت علی بن حسین زین العابدین رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اللہ تبارک و تعالیٰ قیامت کے دن تمام مخلوقات کو جمع کر دیں گے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اعلان کرنے والا اعلان کرے گا کہ صبر کرنے والے کہاں ہیں؟ تو بڑے لوگ

اُٹھیں گے، ان سے کہیں گے: کہاں جارہے ہو؟ وہ کہیں گے: جنت کی طرف جارہے ہیں۔لوگ کہیں گے: حساب سے بھی پہلے جارہے ہو؟ وہ کہیں گے: اللہ تعالیٰ نے ہمیں حکم دیا ہے کہ تمہارا کوئی حساب نہیں، جاؤ جنت میں داخل ہوجاؤ۔لوگ پوچھیں گے: یہ بدلہ تمہیں کس نعمت پر ملا ہے؟ وہ کہیں گے: ہمیں صبر پر یہ بدلہ ملا ہے۔ہم نے اپنے آپ کو گناہوں سے روکا، صبر کیا اور اللہ تعالیٰ کے احکامات کی فرمانبرداری کی، آج اسی صبر کا بدلہ اللہ تعالیٰ نے عطا فرمایا ہے کہ لوگ ابھی حساب کتاب کی طرف متوجہ ہیں اور اللہ نے ہمیں جنت میں جانے کا حکم دیا ہے۔

صبر کے انعام کی کوئی حد نہیں:

دوسری حدیث میں آتا ہے کہ قیامت کے دن ہر نیکی کے بدلے کی کوئی نہ کوئی حد ہے، لیکن صبر ایسی چیز ہے جس کا بدلہ اللہ تعالیٰ دیں گے اور اس کی کوئی حد بھی نہیں ہوگی اور حکم ہوگا کہ صبر کرنے والوں کو بلاؤ اور اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: میری نعمتوں کے دروازے ان پر کھول دو۔

ایک روایت میں یہ بھی آتا ہے کہ جب صبر کرنے والوں کو یہ بدلہ ملے گا تو وہ کہیں گے: کاش! دنیا میں ہمارے اوپر اللہ کے راستے میں اور مصیبتیں آتیں، ہمارے بدن کے چمڑوں کو قینچیوں سے کاٹا جاتا اور ہم صبر کرتے تو آج ہمیں اس سے بھی زیادہ بدلہ ملتا۔

حضرت سعید بن جبیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: صبر کا معنی ہے بندہ اعتراف کرلے کہ اے اللہ! میں تیرا بندہ ہوں اور تیرا فیصلہ میرے حق میں بہتر ہے اور اسی پر اللہ تعالیٰ سے ثواب کی اُمید رکھے۔بعض اوقات قوی لوگ ہوتے ہیں، لیکن وہ غم میں بہت جزع فزع کرتے ہیں، حالانکہ وہ صبر کرنے پر قادر ہوتے ہیں، لیکن پھر بھی صبر نہیں کرتے۔

صبر کی آخری حد اللہ کے راستے میں شہید ہوجانا ہے:

﴿وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتٌ﴾ اس آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے شہید کی حیاتِ برزخی کا ذکر فرمایا ہے۔صبر کی آخری حد یہ ہے کہ انسان اللہ کے راستے میں اپنی جان دے دے۔علماء نے لکھا ہے کہ آج ہمارے اندر صورتِ اسلام تو ہے، لیکن حقیقت اسلام نہیں ہے۔جب حقیقت اسلام ہو تو ہر چیز کو برداشت کرنا، اللہ تعالیٰ کے راستہ میں جہاد کرنا، اللہ تعالیٰ کے راستہ میں قربانی دینا آسان ہوتا ہے۔جیسے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور سلف صالحین میں حقیقت اسلام موجود تھی۔

ایک صحابی کا آپ ﷺ کے ساتھ محبت کا واقعہ:

ایک صحابی کو مشرکین مکہ لے گئے۔ انہیں پھانسی پر لٹکانے کے لئے کھڑا کر دیا۔ کسی کافر کو خیال آیا اور اس نے صحابی سے پوچھا: کیا تم اس بات کو پسند کرتے ہو (جیسے اب ہم آپ کو نیزوں سے چھلنی کر دیں گے اور پھانسی پر لٹکا دیں گے) اس جگہ تمہارے نبی ہوں، ہم تمہیں چھوڑ دیں اور ان کو قتل کر دیں؟ صحابی نے فرمایا: تم کیا کہہ رہے ہو؟ میرا اس پھانسی پر چڑھ جانا، نیزوں سے چھلنی ہو جانا بڑا آسان ہے، لیکن میں حضور اکرم ﷺ کے پاؤں کے تلوے پر ایک کانٹا بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کے اندر حقیقت تھی، صرف شکل وصورت نہیں تھی۔

جس آدمی کے اندر حقیقت اسلام آگئی اور وہ اسلام کے لئے جان کی بازی لگا گیا، قرآن ان کے بارے میں ہمیں بتاتا ہے کہ ایسے لوگوں کا مرتبہ یہ ہے: ﴿وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ﴾ [البقرة: ١٥٤] حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: مسلمان ہر حالت میں نفع میں ہے۔ صحابہ ﷺ نے پوچھا: یا رسول اللہ! وہ کیسے؟ فرمایا: اگر اس پر مصیبت آئے تو صبر کرتا ہے اور اگر اس کو خوشی ملتی ہے تو شکر کرتا ہے، وہ دونوں حالتوں میں کامیاب ہے۔ فرمایا: نہ زندگی میں نقصان ہے اور نہ موت میں نقصان ہے۔ زندہ رہا تو غازی اور مجاہد اور اگر مارا گیا تو اللہ کے راستے میں شہید ہے۔

شہید کے درجات:

شہید کے بڑے درجات ہیں۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: میں نے حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کو دیکھا ہے، وہ ملائکہ کے ساتھ اُڑتے ہوئے جا رہے تھے اس لئے ان کا لقب جعفر طیار بن گیا۔ شہید کا سب سے پہلا درجہ یہ ہے کہ جو صحیح معنوں میں بادشاہِ اسلام کی قیادت میں کفار کے ساتھ جنگ کرے اور اس کا مقصد اللہ تعالیٰ کا کلمہ بلند کرنا ہو، اس حالت میں جو فوت ہو جائے وہ شہید ہے۔

سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے خلیفہ بننے کے بعد خطبہ ارشاد فرمایا: اے مسلمانو! میں جب تک اللہ و رسول کا فرماں بردار رہوں تو میری فرمانبرداری کرنا، اگر میں اس سے ہٹ جاؤں تو میری کوئی فرمانبرداری نہیں۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنے خلیفہ بننے کے بعد یہی بات سوالیہ انداز میں کہی تھی کہ اے لوگو! اللہ نہ کرے، اگر میں اللہ و رسول کے حکم سے ہٹ جاؤں تو کیا کرو گے؟ صحابہ رضی اللہ عنہم کھڑے ہو گئے، انہوں نے کہا: جب تک تم اللہ اور اللہ کے



رسول کے حکم پر چلو گے اس وقت تک تم ہمارے امیر اور خلیفہ ہو، ہم تمہارے حکم کے پابند ہوں گے اور اگر تم اللہ اور رسول کے حکم سے ہٹ گئے تو تیری تلوار سے تجھے سیدھا کر دیں گے۔

دوسرا شہید وہ ہے کہ اس کے گھر میں کوئی بد بخت آدمی گھس آئے وہ اپنی بیوی، بہن، بیٹی کی عزت بچانے کے لیے ان سے لڑا اور مارا گیا تو یہ بھی شہید ہے۔

اسی طرح حضور اکرم ﷺ فرمایا: کوئی آدمی کسی کے گھر میں ڈاکہ مارنے کے لئے گیا۔ اب گھر والا اپنے مال کے تحفظ کے لیے لڑا اور مارا گیا تو وہ بھی شہید ہے۔

سب سے بڑا شہادت کا مرتبہ وہ ہے جو جہاد کرتے ہوئے شہید ہو جائے۔ لیکن ان لوگوں کو بھی حضور پاک ﷺ نے شہادت کا مرتبہ دے دیا۔ گو اس مرتبہ پر نہ پہنچیں، لیکن ان پر بھی شہید کا اطلاق ہوتا ہے۔

اسی طرح اسلامی حکومت کا کوئی سپاہی ڈیوٹی پر مارا گیا، وہ بھی شہید ہے۔

کوئی مسلمان سپاہی بارڈر پر پہرہ دے رہا تھا، دشمن نے گولی ماردی تو وہ بھی شہید ہے۔

شہید حقیقی کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جو میرے راستے میں شہید ہو جائیں، تم ان کو مردہ مت کہو، وہ زندہ ہیں، تمہیں ان کی حیات کا شعور نہیں ہے۔ وہ بظاہر دنیا والوں کو مردہ و بے حس نظر آتے ہیں، جبکہ وہ حقیقت میں زندہ ہیں۔ اور حضرات انبیائے کرام علیہم السلام کی حیات، شہداء کی حیات سے افضل ہے، جیسا کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: میں نے موسیٰ علیہ السلام کو قبر میں دیکھا کہ وہ نماز پڑھ رہے تھے۔ اسی طرح دوسرے انبیاء بھی اپنی قبور میں نماز پڑھتے ہیں۔ مسند ابو یعلیٰ کی حدیث میں ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ''اَلْأَنْبِيَاءُ أَحْيَاءٌ فِي قُبُورِهِمْ يُصَلُّونَ'' علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے اس کی سند کو صحیح قرار دیا ہے۔

﴿بَلْ أَحْيَآءٌ وَلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ﴾ بلکہ وہ زندہ ہیں، لیکن ان کی زندگی کو تم سمجھ نہیں سکتے ہو۔ کیونکہ وہ ایسے عالم کی زندگی ہے جس کو تم نے نہیں دیکھا ہے۔ ایک آسان سی بات یاد رکھ لیں تو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مسئلے میں غلطی نہیں ہوگی۔ وہ یہ کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے جو ہمیں جسم دیا ہے، اس کے اندر روح ہے دنیا میں جتنے احکام ہوں گے جسد پر مرتب ہوں گے، مثلاً کسی نے چوری کی تو اس کا ہاتھ کٹے گا، کسی نے زنا کیا تو اس کے بدن پر کوڑے لگیں گے، شادی شدہ نے زنا کیا تو رجم ہوگا۔ یہ ساری سزائیں بدن پر جاری ہوں گی، لیکن روح خود بخود متاثر ہوتی ہے جو ہمیں نظر نہیں آتی ہے۔ کیونکہ ہمیں جسد نظر آتا ہے، روح نظر نہیں آتی۔ جبکہ مرنے کے بعد تمام احکام روح پر

مرتب ہوں گے اور جسد اس سے متاثر ہوتا ہے چاہے ہمیں نظر نہ آئے جیسے خوشبو کے لیے آپ نے پھول توڑا اور اس کو سونگھا تو کہا: یہ اعلیٰ قسم کا گلاب ہے، اس سے بڑی پیاری خوشبو آرہی ہے۔ اب آپ خوشبو سونگھ تو رہے ہیں، لیکن اس کو دیکھ نہیں سکتے۔

شہداء کی اَرواح جنت میں کہاں ہوں گی؟

مسلم شریف میں ہے:

"أَنَّ أَرْوَاحَهُمْ فِي طَيْرٍ خُضْرٍ تَسْرَحُ فِي الْجَنَّةِ حَيْثُ شَاءَتْ، وَ تَأْوِي إِلَى قَنَادِيلَ مُعَلَّقَةٍ بِالْعَرْشِ."

[جامع ترمذی، رقم:٣٠١١]

یعنی شہداء کی اَرواح سبز پرندوں کے پپوٹوں کے اندر ہوتی ہیں، وہ جنت میں جہاں چاہتے ہیں کھاتے پھرتے ہیں، پھر آکر ان قنادیل میں آجاتے ہیں جو عرش کے نیچے معلّق ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی طرف توجہ فرماتے ہیں اور پوچھتے ہیں: کیا چاہتے ہو؟ وہ کہتے ہیں: مولا! ہم اور کیا مانگیں؟ کون سی نعمت ہے جو ہمارے پاس نہیں؟ ہم جہاں چاہتے ہیں جنت میں سیر کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ تین مرتبہ پوچھتے ہیں، مانگو کیا مانگتے ہو؟ وہ کہیں گے: اللہ! اگر آپ ضرور دینے پر آئے ہیں تو ہمیں دنیا کی طرف لوٹا دیں، تاکہ آپ کے راستہ میں ہم پھر جہاد کریں، پھر شہید ہوجائیں۔ جب دیکھیں گے کہ ان کی کوئی حاجت نہیں ہے تو اللہ ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیں گے۔

امام احمد رحمہ اللہ نے روایت نقل کی ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"إِنَّمَا نَسَمَةُ الْمُسْلِمِ طَيْرٌ تَعْلَقُ فِي شَجَرِ الْجَنَّةِ حَتَّى يُرْجِعَهَا اللهُ عَزَّوَجَلَّ إِلَى جَسَدِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ."

[مسند احمد بن حنبل، رقم:١٥٧٧٦]

اللہ تعالیٰ مومن کی روح کو ایک پرندے کی شکل دے دیتے ہیں اور وہ جنت کے درختوں کے اندر رہتی ہے، جب قیامت کا دن ہوگا تو اس کو اس کے بدن میں لوٹا دیں گے۔

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس آیت اور اس حدیث سے ہمیں یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ جو عام مومن ہے اللہ تعالیٰ اس کو بھی یہ عظمت دیں گے، باقی مومن کی روح علیین میں چلی جاتی ہے اور کافر کی روح سجین میں چلی جاتی ہے۔

سوال: جب روح علیین میں یا سجین چلی گئی تو قبر میں حساب کتاب کا کیا معنی ہے؟



جواب: اللہ تعالیٰ اس روح کا تعلق جوڑ دیتے ہیں، جیسے سورج اپنے مقام پر ہے، لیکن حرارت پہلی زمین پر موصول ہوتی ہے۔ چاند اپنی جگہ پر ہے، لیکن روشنی یہاں محسوس ہوتی ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے آگے کوئی بعید نہیں ہے کہ روح اپنے مقام پر ہو اور اس کا جسد کے ساتھ تعلق بھی قائم رہے۔

﴿وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ؕ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۟ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ۝﴾ [البقرة: ۱۵۵ تا ۱۵۷]

''اور ہم تمہارا امتحان لیں گے کچھ (دشمن کے) خوف، اور مالوں اور جانوں اور پھلوں کے نقصان سے اور صابرین کا بشارت سنا دیجیے کہ جب ان کو کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو کہتے ہیں ہم اللہ ہی کے لیے ہیں اور ہم سب اسی کی طرف جانے والے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن کے لیے ان کے رب کی طرف سے مغفرت اور رحمت ہے اور یہی لوگ بدایت یافتہ ہیں۔''

صبر کا امتحان:

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو کبھی خود آزماتے ہیں، تا کہ واضح ہو جائے کہ کون صبر کرنے والے ہیں؟ اور کون ناشکرے ہیں؟ بہت ساری آیات میں اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد فرمایا ہے کہ ہم اپنے بندوں کا امتحان لیتے ہیں۔

قیامت کے دن انسان کے اعضاء اس کے خلاف گواہی دیں گے:

قیامت میں سب کو صحیفۂ اعمال دیا جائے گا اور ان کا وزن کیا جائے گا، پھر بھی اگر کوئی انکار کرے تو اس پر گواہ لائے جائیں گے۔ گواہوں کے بعد آدمی انکار کرے تو اللہ تعالیٰ اس کی زبان پر مہر لگا دیں گے اور اس کے بدن کے اعضاء گواہی دیں گے کہ میں نے یہ یہ کام کیا ہے یا نہیں؟ لیکن اللہ تعالیٰ نے یہ اس لیے کیا تا کہ کسی بندے کو میرے انصاف پر اعتراض کی گنجائش باقی نہ رہے۔ اگر اللہ تعالیٰ اپنے علم سے فیصلہ فرماتے تو مومن مان لیتے اور کافر اعتراض کرتے کہ یہ اس کی مرضی ہے جس کو چاہیں جہنم میں داخل کریں اور جس کو چاہیں جنت میں داخل کریں۔

صحابہ رضی اللہ عنہم کا ایمان لانے میں اخلاص:

بندے کو اپنے مخلص دوست اور منافق دوست کا پتہ اس وقت چلتا ہے جب بندے پر کوئی مصیبت آجائے، مقروض ہوجائے، کھانے کے لئے کچھ نہ ہو تو وہ اپنے دوستوں کے پاس جائے گا۔ اس وقت پتہ چلے گا کہ کون مخلص دوست ہے؟ اور کون مخلص نہیں ہے؟ حضور اکرم ﷺ کی مکی زندگی ایسی تھی کہ جو لوگ کھرے تھے وہ آپ ﷺ کے ساتھ تھے کیونکہ وہ ایسا دور تھا جو بھی کلمہ پڑھتا تو مار کھانے کے لئے تیار ہوجائے، اپنے بیوی بچوں کو علیحدہ کرنے کے لئے تیار ہوجائے، آپ ﷺ کی اس زندگی میں کسی کھوٹے کے آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوسکتا۔ اس لئے اہلسنت والجماعت کا عقیدہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ کے بعد اگر کوئی سب سے افضل ہے تو سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں، کیونکہ انہوں نے آپ ﷺ کا سب سے پہلے ساتھ دیا۔ اس وقت آپ ﷺ کی کوئی مکہ پر حکومت نہیں تھی، آپ ﷺ تخت پر تشریف فرما نہیں تھے، آپ ﷺ کے راستے میں پھول نہیں بچھائے جاتے تھے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے ﴿وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ﴾ [التوبۃ:١٠٠] میں سب سے پہلے ان مہاجرین کا ذکر فرمایا جنہوں نے میرے نبی کے لئے مکہ چھوڑا۔ جب حضور اکرم ﷺ مدینہ تشریف لے آئے تو اللہ تعالیٰ نے اسلام کو عزت وغلبہ دیا، غزوۂ بدر کی کامیابی ملی اور مشرکین مکہ کا زور ٹوٹ گیا۔ اب اسلام کی بڑھتی ہوئی قوت کو دیکھ کر لوگوں کے اندر خوف وہراس پیدا ہوگیا تو بعض لوگ اسلام میں منافقانہ طور پر بھی داخل ہوگئے کہ ظاہری طور پر کلمہ پڑھ لیا، لیکن اندر اسی طرح کفر رہا۔ اگر اللہ تعالیٰ آپ کو بتادیتے کہ فلاں منافق ہے، اس کو ماردو اور آپ ﷺ اس کو قتل کرادیتے تو ساری دنیا یہی کہتی کہ جس کو چاہتے ہیں ماردیتے ہیں، حالانکہ وہ ان کے ساتھ نمازیں پڑھتا تھا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے امتحان بھیجے کہ جنگ اُحد آگئی اور کفر اپنے پورے لاؤ لشکر کو لے کر بدر کا بدلہ لینے کے لئے اُحد آپہنچا۔ حضور اکرم ﷺ کو مدینہ سے نکل کر دفاعی جنگ لڑنا پڑی تو منافقوں کا بھرم کھل گیا، انہوں نے کہا: ہم تو نہیں لڑتے اور وہ راستے سے واپس ہوگئے، اس طرح کھرے اور کھوٹے علیحدہ ہوگئے۔ غزوۂ تبوک کا وقت آیا تو آزمایا گیا اور پھر کھرے کھوٹے علیحدہ ہوگئے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ہم اپنے بندوں کا امتحان لیتے ہیں، تاکہ واضح ہوجائے کہ کون سچا ہے اور کون جھوٹا ہے؟

انسانی فیصلے غلط بھی ہوتے ہیں:

انسان جتنے قانون بناتا ہے وہ پانچ سال، چھ سال، اور دس سال کے بعد ناکام ہوجاتا ہے، کیونکہ بنانے والے



ناقص ہیں، ان کو آنے والے حالات کا پتہ نہیں ہوتا، جبکہ میرے اللہ کا قانون کبھی غلط نہیں ہوتا۔ وہ جو فرماتے ہیں علم کی بنیاد پر فرماتے ہیں، نہ کہ گمان کی بنیاد پر۔ جیسا کہ جدید ملک کہہ رہے ہیں کہ اگر آبادی کی رفتار یہی رہی تو تیس سال کے بعد آبادی کا کیا حال ہوگا؟ اب ہم اتنی گندم پیدا کر رہے ہیں اور پوری نہیں ہو رہی تو جب آبادی بڑھ جائے گی تو پھر ہم کیا کریں گے؟ ہم تو مر جائیں گے، بھوک وافلاس ہوگا۔ اس لئے انہوں نے کہہ دیا کہ بچے جننا بند کرواوران کو زیادہ خطرہ مسلمانوں سے ہے کہ یہ زیادہ بچے جنتے ہیں۔ یہ عقل کے جتنے فیصلے ہیں، ان کے پس پردہ شیطانی قوتیں ہیں۔ جب آدمی دلائل ڈھونڈنا شروع کرتا ہے تو عقل عیار ہے، سو بھیس بنا لیتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے چودہ سو سال پہلے فیصلہ فرمادیا: ﴿وَلَا تَقْتُلُوٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ ۭ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ ۭ اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا ۝﴾ [الاسراء:۳۱] خبردار! اپنی اولادوں کو بھوک کی وجہ سے قتل نہ کرو، ان کو بھی میں رزق دیتا ہوں اور تمہیں بھی رزق دیتا ہوں۔ اس لیے انسانوں کے فیصلے غلط ہو سکتے ہیں، لیکن میرے اللہ کے فیصلے غلط نہیں ہو سکتے، کیونکہ اس کو ذرّے ذرّے کا علم ہے۔ فرعون موسیٰ علیہ السلام کو گولی اور طاقت سے نہیں روک سکا۔ جب سے تم نے بھی منصوبہ بندی شروع کی ہے تو ایک عورت چار پانچ بچے پیدا کر رہی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ ان کافروں کو مسلمانوں کی کثرت کا خوف ہے تم جس نئی تہذیب کو اپنا رہے ہو اندازہ کرو یورپ کی باقاعدہ رپورٹ موجود ہے کہ بارہ فیصد لڑکیوں کے ساتھ ریپ ان کے باپ نے کیا۔ کیا تم بھی اسلام میں ایسا معاشرہ پیدا کرنا چاہتے ہو اور تہذیب اپنانا چاہتے ہو جس میں باپ اور بیٹی کا کوئی تصور نہیں، بہن اور بھائی کا کوئی تصور نہیں، جہاں اولاد کو اپنے صحیح النسل ہونے کا کوئی پتہ نہیں ہے۔ ان ملکوں میں جو مسلمان رہتے ہیں، وہ مجھے ملے اور کہا: ہم نے بہت کچھ کما لیا ہے، ہم نے کوٹھیاں بنالیں، لیکن ہمارا کچھ بھی نہیں رہا، ہم برباد ہو گئے۔ میں نے ان سے وجہ پوچھی تو انہوں نے کہا کہ جس معاشرے میں نوجوان لڑکی اپنے باپ کو آکر کہہ دے کہ آج فرینڈ کے ساتھ رات گزاروں گی، میرا انتظار نہیں کرنا تو اس معاشرے کا کیا حال ہوگا؟ میں نے ان کو کہا: اب تمہیں ہوش آرہا ہے؟ اس نے کہا: جس معاشرہ میں ہم رہتے ہیں وہاں بیوی کو یہ نہیں کہہ سکتے کہ چائے بنا کر دے۔ اور کہنے لگا: ہماری کوئی زندگی نہیں ہے، ہم تو اللہ کے عذاب میں آ گئے اور ہم اس زمانہ کو ترستے ہیں جب بیوی اپنے خاوند کو سرتاج سمجھتی تھی، اس کے لیے آنکھیں بچھاتی تھی۔ اور کہنے لگا: یہ مولوی جو مسجد میں امام ہے، یہ اس وقت تک ہے جب تک اس کو نیشنلٹی نہیں ملتی، جب وہ مل جائے تو یہ بھی چلا جائے گا۔ اس لیے یاد رکھیں! جتنے انسانی فیصلے ہوں گے، وہ غلط ہو سکتے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ کا کوئی فیصلہ غلط نہیں ہو سکتا۔

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے امتحان کیسے لیتا ہے؟

اللہ کے راستے میں جان دے دینا سب سے بڑی آزمائش ہے، لیکن اس سے کم درجہ کی بھی کچھ آزمائشیں ہیں کہ انسان کو قبل از وقت آنے والی مصیبت سے آگاہ کر دیا جائے تو مصیبت کچھ ہلکی ہو جاتی ہے۔ اگر اچانک مصیبت آ جائے تو بہت بڑا صدمہ ہوتا ہے اور یہ بھی قاعدہ ہے کہ جتنی کسی کی شان بڑی ہوتی ہے، اتنا امتحان بھی بڑا ہوتا ہے۔ اس لئے سب سے زیادہ امتحان اللہ کے نبیوں پر آئے ہیں، کیونکہ انبیاء کی شان سب سے بڑی ہے۔ تمام انبیاء میں بڑی شان ہمارے آقا ﷺ کی ہے، اس لئے حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اللہ کے راستے میں جتنی مجھے تکلیفیں دی گئیں، مجھ سے پہلے کسی نبی پر اتنی تکلیفیں نہیں آئیں۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: سب سے زیادہ امتحان اللہ کے نبیوں کے ہوتے ہیں، انبیاء کے بعد درجہ بدرجہ امتحان ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ہم اپنے بندوں کی آزمائش خوف سے کرتے ہیں کہ ان کو دشمن کا خوف لاحق کر دیتے ہیں اور کبھی اللہ تعالیٰ فقر و فاقہ مسلط کر دیتے ہیں کہ آسمانوں سے بارشیں بند کر دیتے ہیں، زمین غلے اُگانا بند کر دیتی ہے۔ فصلات، کھیتیاں نہیں ہوتیں۔ یہ بھی بہت بڑی آزمائش ہے۔

مکہ والوں پر قحط کا واقعہ:

حضور اکرم ﷺ کے زمانہ میں جب مشرکین مکہ نے حضور اکرم ﷺ کو ستایا تو آپ ﷺ نے ان کے لیے بددعا کی: اے اللہ! ان مکہ والوں پر اسی قسم کا قحط نازل کر دے جیسا کہ یوسف علیہ السلام کے زمانہ میں نازل کیا تھا تو ان پر ایسا قحط نازل ہوا کہ پرانے جوتوں کے چمڑے اُبال اُبال کر پیا کرتے تھے، لوگ مجبور ہو گئے اور ابوسفیان کو مدینہ منورہ بھیجا کہ حضور پاک ﷺ سے جا کر کہو کہ خدا کے لیے ہمیں معاف کر دیں، اب ہماری قوت طاقت جواب دے چکی ہے۔ ابوسفیان نے مدینہ منورہ آ کر حضور اکرم ﷺ سے کہا کہ یہ بات تو ٹھیک ہے کہ ہمارا دین کا جھگڑا ہے، لیکن ہم آپ کے رشتے دار ہیں، مکہ والے قحط کی وجہ سے اتنا پریشان ہو گئے ہیں کہ اب انہیں دھواں ہی دھواں نظر آتا ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے ان کی امداد کی اور مختلف علاقوں سے انہیں غلہ بھجوایا۔ کسی کو قحط میں ڈالنا، یہ بھی بہت بڑا امتحان ہے۔

مجاہدین صحابہ کا مجاہدہ:

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اپنے واقعات کے اندر یہ بھی واقعہ ذکر فرمایا ہے کہ بعض اوقات ہم جہاد کے لئے جارہے ہوتے تو ہماری خوراک فی آدمی ایک یا دو کھجور کے دانے ہوتی تھی۔ ایک آدمی نے عرض کیا کہ آپ لوگ سارا دن ایک کھجور کے دانے پر کیسے گزارا کر لیتے تھے؟ تو انہوں نے کہا: ہمیں کھجور کے دانے کی اس دن قدر معلوم ہوئی جب کھجوریں کم ہوگئیں اور ہمیں آدھی آدھی کھجور ملتی تھی۔ ایک دوسرے سے گٹھلی لے کر منہ میں رکھ لیتے تھے اور اس کو چوس لیتے تھے، تاکہ ذہن کو تسلی ہو جائے کہ کچھ غذا ملی ہے۔

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: خیبر فتح ہونے سے پہلے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر والوں نے کبھی پیٹ بھر کر کھجوریں نہیں کھائیں، فتح خیبر کے بعد کھجور پیٹ بھر کر کھانے کو مل جاتی تھی۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی گھی لگی ہوئی روٹی نہیں کھائی تھی۔

﴿وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ﴾ (اموال، جانوں اور پھلوں میں کمی کے ذریعے آزمائش)۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: کبھی اس طرح امتحان لیتے ہیں کہ ان کو مال میں گھاٹا دے دیتے ہیں، ﴿وَالْاَنْفُسِ﴾ اور کبھی جانوں میں نقصان دے دیتے ہیں کہ کبھی بھائی مر گیا، کبھی چچا مر گیا۔ ﴿وَالثَّمَرٰتِ﴾ اور کبھی پھلوں کے اندر نقصان دیتے ہیں، کبھی باغات کے پھل لدے ہوئے ہوتے ہیں اور کبھی ایک پھل بھی نہیں لگتا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جو ان تمام آزمائشوں میں پورا اُترے اور صبر کرے، اس کے لئے خوشخبری ہے اور صابرین وہ لوگ ہیں جن کو مصیبت پیش آئے تو وہ ﴿اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ﴾ کہہ کر خود کو تسلی دیتے ہیں کہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے لئے ہے، جب سب کچھ اسی کا ہے تو وہ جب چاہے اپنی چیز لے لے۔

﴿وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ﴾ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اس آیت کی تفسیر میں عجیب بات لکھی ہے کہ ﴿اَلْخَوْف﴾ سے مراد خوف خدا ہے، جس کے دل میں خوف خدا ہوگا وہ ڈرے گا کہ اگر میں نے نافرمانی کی تو اللہ مجھے سزا دیں گے، مجھے پکڑ لیں گے۔ ﴿اَلْجُوْع﴾ سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لئے روزے فرض قرار دیئے ہیں۔ گھر کے اندر ہر قسم کے کھانے اور ٹھنڈے مشروبات موجود ہیں، لیکن وہ چیزوں کو ہاتھ نہیں لگاتا کہ اللہ تعالیٰ ناراض ہو جائیں گے۔ بعض اوقات اتنی پیاس لگتی ہے کہ آدمی کے ہونٹ خشک ہو جاتے ہیں اور چپک

جاتے ہیں، سامنے ٹھنڈا پانی موجود ہے، لیکن نہیں پیتا کہ میرا اللہ پاک ناراض ہو جائے گا۔

بعض علماء نے فرمایا: ﴿وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ﴾ سے مراد زکوٰۃ ہے، ﴿وَالْأَنفُسِ﴾ سے مراد شہادت ہے اور ﴿وَالثَّمَرَاتِ﴾ سے مراد عشر ہے۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے امتحان ہے۔

ایک یہودی نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے سوال کیا کہ آپ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ جس کو چاہتے ہیں عزت دیتے ہیں اور جس کو چاہتے ہیں ذلت دیتے ہیں۔ ایک آدمی کو اللہ نے بڑی صحت دی، حسن و جمال دیا کہ لوگ مڑ مڑ کر اس کو دیکھتے ہیں اور دوسرے آدمی کو دیکھیں اللہ تعالیٰ نے اس کو لولا، لنگڑا بنا دیا، لوگ اس سے نفرت کر کے دور ہو کر گزرتے ہیں کہ خدا نہ کرے مجھے بھی یہ بیماری لگ جائے تو اس نے کیا نیکی کی؟ اور اس نے کیا برائی کی؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: مجھے بتاؤ، اللہ تعالیٰ نے سب کچھ اپنے مِلک میں کیا ہے یا تمہارے مِلک میں کیا ہے؟ یہودی نے کہا: مِلک تو اللہ تعالیٰ کی ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جب ساری مِلک اللہ تعالیٰ کی ہے تو تم اعتراض کرنے والے کون ہو؟ اور طبعی تسلی کے لئے اللہ تعالیٰ نے ہمیں سبق دیا: ﴿إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ﴾ کہ ہم سب نے بھی اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے اور اصل ٹھکانہ جنت ہے جو ہمارے باپ حضرت آدم علیہ السلام کا گھر ہے۔

﴿الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُم﴾ اس سے معلوم ہوا کہ مصیبت کے بعد جو صبر کیا جائے، وہ حقیقی صبر ہے، بعد میں تو ہر کوئی صبر کر لیتا ہے۔ ﴿إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ﴾ کلمہ اس اُمت کی شان ہے، پہلی اُمتوں میں سے کسی کو یہ کلمہ نہیں ملا۔ لہٰذا جب بھی کوئی مصیبت آئے، بڑی مصیبت آئے یا چھوٹی مصیبت آئے، خوف آئے، ڈر آئے، مال میں نقصان آئے، جانوں میں نقصان آئے، کانٹا چبھ جائے، جوتی گم ہو جائے، کوئی چیز ٹوٹ جائے تو فوراً ﴿إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ﴾ پڑھیں۔

صحیح مسلم میں حضرت اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا: ''مَا مِنْ عَبْدٍ تُصِيبُهُ مُصِيبَةٌ، فَيَقُولُ: ﴿إِنَّا لِلَّهِ وَ إِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ﴾ اللَّهُمَّ أْجُرْنِي فِي مُصِيبَتِي، وَ أَخْلِفْ لِي خَيْرًا مِنْهَا، إِلَّا أَجَرَهُ اللَّهُ فِي مُصِيبَتِهِ، وَ أَخْلَفَ لَهُ خَيْرًا مِنْهَا'' [صحیح مسلم، رقم: ۹۱۸] اے اللہ! جو چیز تو نے مجھ سے لے لی، اس کا بہتر سے بہتر بدلہ اپنی رحمت سے عطا فرما۔

صبر کرنے والوں کے لیے تین انعامات:

﴿أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُونَ﴾ صبر کرنے والوں کے لئے تین

انعامات ہیں: صلوات، رحمت اور ہدایت۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے: صبر کرنے والو! تمہارے کیا کہنے؟ تمہیں اللہ تعالیٰ نے تین نعمتوں سے نوازا ہے۔ ''صَلَوٰتٌ'' سے مراد، عنایاتِ خاصہ ہیں کیونکہ رحمت تو سب پر ہوتی ہے مثلاً ہوا چلے تو یہ نہیں کہ آپ کو لگے اور کافر کو نہ لگے، بلکہ کافر تو دنیا کی نعمتوں سے سب سے زیادہ فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ جو لوگ صبر کرتے ہیں وہی ہدایت والے ہیں کہ بڑی سے بڑی مصیبت پر صبر کرتے ہیں۔ خدا نہ کرے آدمی مصیبت کے وقت میں کبھی کبھی بہک جاتا ہے اور منہ سے ایسے کلمات نکل جاتے ہیں جو کفر تک پہنچانے والے ہوتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میرے ایمان والے بندوں کو دیکھو کہ جیسے ہی کوئی مصیبت آتی ہے تو بہکنے کی بجائے ان کے منہ سے ﴿إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّآ إِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ﴾ نکلتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میں نے ان کو ہدایت عطا کی ہے۔ یاد رکھیں! اصل مدار نیت پر ہے اگر مصیبت آئی اور زبان سے کوئی غلط لفظ نکل گیا، لیکن نیت نہیں تھی تو اللہ تعالیٰ نیتوں کو جانتے ہیں۔ ایک آدمی نے خوشی میں ایک ایسا لفظ کہا کہ وہ اگر کسی اور کے لئے کہتا تو کافر ہو جاتا، مثلاً واقعہ آتا ہے کہ ایک آدمی اونٹ پر سفر کر رہا تھا، ایک جگہ پر سویا تو اس کا اونٹ بھاگ گیا اور گم ہو گیا۔ اس بدو کا سارا سامان کھانا، پانی اونٹ پر تھا۔ جب وہ اُٹھا اور اِدھر اُدھر نظر دوڑا کر تنگ آ گیا جب اس پر گرمی اور پیاس کی شدت ہو گئی تو واپس آکر اسی درخت کے نیچے سو گیا، اس کی آنکھ لگ گئی۔ خدا کی قدرت ہے جب آنکھ کھلی تو دیکھا کہ اونٹ پاس کھڑا ہے، بدو خوش ہو کر کہنے لگا: تُو میرا بندہ اور میں تیرا خدا ہوں۔ حالانکہ اس کو کہنا یوں چاہیے تھا کہ اے اللہ! تُو میرا خدا ہے اور میں تیرا بندہ ہوں، لیکن خوشی میں بہک کر یہ بات نکل گئی۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ یہ شخص جتنا اس وقت خوش ہوتا ہے، اس سے زیادہ اللہ تعالیٰ اپنے بندہ کی توبہ سے خوش ہوتے ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: گناہ گار بندہ جس کی ساری زندگی گناہوں میں گزری ہو، لیکن جب اس کو راستہ ملتا ہے اور وہ گڑگڑا کر سجدے میں گر جاتا ہے اور توبہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کو اس سے بھی زیادہ خوشی ہوتی ہے کہ میرا بھٹکا ہوا بندہ پھر میرے دروازے پر آ گیا ہے۔ آخرت میں اللہ تعالیٰ نے صبر والوں کے بارے میں فرمایا: ﴿إِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ أَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۱۰﴾﴾ [الزمر: ۱۰] قیامت کے دن ہم صبر کرنے والوں کو بے حساب اجر دیں گے۔

حدیث میں ہے جب اللہ تعالیٰ اوّلین و آخرین کو حشر کے میدان میں جمع کریں گے اور منادی آواز دے گا: ''أَيْنَ الصَّابِرُوْنَ؟'' صبر کرنے والے لوگ کہاں ہیں؟ وہ لوگ حاضر ہوں گے تو اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: لوگوں کا

حساب ہوتا رہے گا، ان کو حساب سے پہلے جنت میں پہنچا دو۔

آپ نے بعض لوگوں کو دیکھا ہوگا کہ وہ بڑے عبادت گزار ہوتے ہیں، لیکن ان کو بیماریاں لگی ہوتی ہیں، کوئی نابینا ہوگیا، کوئی لنگڑا ہوگیا، کوئی دونوں ٹانگوں سے معذور ہوگیا، ان کے شاگرد اُن کو ریڑھیوں پر اُٹھا کر پھرتے ہیں، حالانکہ وہ ایسے لوگ ہوتے ہیں جن کی ساری زندگی میں تہجد بھی قضا نہیں ہوتی، جنہوں نے زندگی میں کبھی حرام نہیں کھایا، جنہوں نے زندگی میں کبھی جھوٹ نہیں بولا، جب ان پر مصیبتوں کو دیکھتے ہیں تو بعض کم ایمان والے لوگ حیران ہوجاتے ہیں کہ دیکھو! اللہ کا بڑا پیارا ہے، لیکن مصیبت میں مبتلا ہے۔ فلاں آدمی فاسق فاجر ہے، دولت کے مزے لے رہا ہے، اس کے گھر کے معاملات بھی درست ہیں، باہر کے معاملات بھی درست ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہماری ایمان والی عینک نہیں، جب نظر والی عینک نہ ہو تو ایک لفظ نہیں پڑھ سکتے، اسی طرح جب ایمان والی عینک کمزور ہو تو ان تکلیفوں اور مشقتوں کو کیسے سمجھیں گے؟ حالانکہ اصل وجہ یہ ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان صالحین کے لئے بلند مرتبہ کا فیصلہ فرمایا ہوتا ہے، لیکن وہ اپنے عمل کے ذریعہ وہاں نہیں پہنچ سکتے تو اللہ تعالیٰ ان پر مصیبت ڈال دیتے ہیں کہ صبر کریں اور اپنی منزل کو پالیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں حضور اکرم ﷺ سے فرمایا: آپ دنیا کی زندگی اور اس کی ٹھاٹھ کو دیکھ کر تعجب نہ کریں، مجھے اگر اپنے بندوں کے بے ایمان ہونے کا ڈر نہ ہوتا تو کافروں کو اتنا دیتا کہ کافر کے گھر کی چھت، سیڑھیاں، دروازے، پلنگ اور کرسیاں چاندی کی ہوتیں کیونکہ دنیا بڑی مبغوض چیز ہے اور دشمنوں کو مبغوض چیز ہی دی جاتی ہے۔

دنیا حقیر چیز ہے:

حدیث مبارک میں آتا ہے کہ اگر اس دنیا کی قیمت اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایک مچھر کے پَر کے برابر بھی ہوتی تو اللہ تعالیٰ کافروں کو ایک گھونٹ بھی پانی کا نہ دیتا۔ [جامع ترمذی، رقم: ۲۳۲۰] حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: دنیا کی مثال ایسے ہے جیسے کوئی جانور مرجائے اور وہ گل سڑ جائے اور اس کو حاصل کرنے والوں کی مثال ایسے ہے جیسے اس مردار جانور پر کتے اکٹھے ہوتے ہیں۔ اس دنیا کے طلبگار کتے ہوتے ہیں۔ جو اللہ کے بندے ہوتے ہیں وہ دنیا اس لئے حاصل کرتے ہیں کہ دین کے کام آئے، حج، عمرہ کے کام آجائے، مساجد و مدارس کے کام آجائے، ایسے ادارے بنادیں جس کے ذریعے لاکھوں لوگ قرآن سے استفادہ کریں۔ وہ دنیا اللہ تعالیٰ کے ہاں باعث اجر ہوتی ہیں، لیکن جو

دنیا آدمی کو برباد کرنے اور کفر کا ذریعہ بن جائے اور بے حیائی کا ذریعہ بن جائے، اس سے بُری چیز کی کوئی مثال نہیں دی جا سکتی۔ اللہ تعالیٰ دونوں طرح سے آزماتے ہیں۔ علماء نے لکھا ہے کہ اگر تم سے گناہ ہو جائے اور اس کے بعد تمہیں پیسہ ملنا شروع ہو جائے تو سمجھ لو کہ اب میری پکڑ کا وقت قریب آ چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو محفوظ فرمائے۔

سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ اگر اللہ تعالیٰ مجھے لیلۃ القدر کی رات نصیب کر دے تو میں اللہ تعالیٰ سے کیا مانگوں؟ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ دعا مانگو:

''اَللّٰهُمَّ إِنَّكَ عُفُوٌّ تُحِبُّ الْعَفْوَ فَاعْفُ عَنِّي.'' [جامع ترمذی، رقم: ۳۵۱۳]

اے اللہ! آپ معاف کرنے کو پسند کرتے ہیں، پس آپ مجھے بھی معاف کر دیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ کبھی کوئی مصیبت نہیں اُتارتے، مگر کسی گناہ کی وجہ سے۔ اور وہ مصیبت بغیر توبہ کے نہیں ٹل سکتی۔ آج مشکل یہ ہے کہ ہمارے اوپر مصیبتیں آ رہی ہیں، ہم یہ نہیں سوچتے کہ ہمارے کون کون سے گناہ ہیں؟ جن کی وجہ سے یہ مصیبت پڑ رہی ہے اور اسباب کے اندر لگے ہوئے ہیں۔ اگر کسی نے بتا دیا کہ یہ مصیبتیں ہمارے گناہوں کی وجہ سے آ رہی ہیں تو پھر وہ علاج نہیں کرتے جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا ہے۔

جنت والوں کو اللہ کی رضا و دیدار نصیب ہوگا:

حدیث مبارک میں ہے کہ اللہ تعالیٰ اچھے کام کرنے والوں کو جنت دیں گے اور جنت سے بھی زیادہ نعمت عطا فرمائیں گے۔ علماء سلف صالحین نے لکھا ہے کہ زیادہ کا معنی یہ ہے کہ جب جنت والے جنت میں چلے جائیں گے تو اللہ تبارک وتعالیٰ ان سے مخاطب ہو کر فرمائیں گے: میرے بندو! تمہیں اور کچھ چاہیے؟ جنت والے کہیں گے: آپ کا اتنا بڑا اکرم اور رحمت ہے، کیا اور نعمت ہے جو ابھی ہمیں نہ ملی ہو؟ آپ نے تو ہمیں ایسی ایسی نعمتیں دے دی ہیں کہ جن کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے تھے، اتنی بڑی جنت آپ نے ہمیں عطا فرمائی ہے، اس کے علاوہ ہم آپ سے اور کیا مانگیں؟ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: آج تمہیں ایسی نعمت دیتا ہوں جو تمہیں ابھی نہیں ملی۔ اللہ پاک فرمائیں گے: میں تم پر آج اپنی رضا نازل کرتا ہوں کہ جس کے بعد کبھی تم پر میری ناراضگی نہیں ہوگی۔ بعض سلف وصالحین نے لکھا ہے کہ وہ زیادہ یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ مومنین کو اپنا دیدار کروائیں گے تو جنت کی ساری نعمتیں اللہ تعالیٰ کے دیدار میں کچھ بھی نہیں ہیں۔

حدیث مبارک میں ہے کہ ایک دفعہ حضور اکرم ﷺ صحابہ کے ساتھ تشریف فرما تھے اور چودھویں کا چاند سامنے دکھائی دے رہا تھا۔آپ ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے پوچھا کہ اس چودھویں کے چاند کے دیکھنے میں تمہیں کوئی شک ہے؟ صحابہ نے عرض کیا: پہلی کے چاند تو شک ہوسکتا ہے کہ کسی کو نظر آیا اور کسی کو نظر نہ آیا، لیکن چودھویں کے چاند میں کس کو شبہ ہوسکتا ہے؟ اس کو تو کمزور آنکھوں والا بھی دیکھ سکتا ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: میرے صحابہ! خوش ہو جاؤ، تم قیامت میں اپنے رب کا دیدار کرو گے جیسے آج تمہیں اس چاند کو دیکھنے میں کوئی شک نہیں ہے یعنی تمہیں یقینی اللہ تعالیٰ کا دیدار نصیب ہوگا۔

احادیث میں یہ بھی آتا ہے کہ بعض خوش نصیب ایسے ہوں گے جنہیں مہینہ میں ایک بار زیارت ہوگی اور بعض خوش نصیب ایسے ہوں گے جنہیں ہفتہ میں ایک بار زیارت ہوگی اور بعض خوش نصیب ایسے ہوں گے جنہیں روزانہ زیارت نصیب ہوگی اور بعض خوش نصیب ایسے ہوں گے جن کو صبح وشام زیارت ہوگی اور بعض خوش نصیب ایسے بھی ہوں گے جنہیں ہر وقت اپنے اللہ کے دیدار کی اجازت ہوگی۔ اس سے بڑا اکرام اور نعمت بندہ نہیں سوچ سکتا۔

﴿الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ﴾ جو لوگ مصیبت کے وقت ﴿اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ﴾ پڑھتے ہیں، بہت ساری احادیث میں ان کے لئے بڑا ثواب اور بڑی فضیلت آئی ہے۔

حضرت اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا کا صبر کا جملہ اور اس کا انعام:

امام احمد رحمہ اللہ نے روایت نقل فرمائی ہے کہ بی بی اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک دن میرے شوہر ابو سلمہ رضی اللہ عنہ حضور پاک ﷺ کی خدمت سے لوٹ کر آئے اور فرمانے لگے: میں نے آج حضور پاک ﷺ کا ایک قول مبارک سنا ہے جس سے مجھے بڑی خوشی ہوئی ہے۔ میں نے کہا: وہ کیا ہے؟ کہا کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ کسی مسلمان پر کوئی مصیبت پیش آئے تو فوراً اس کی زبان سے یہ کلمہ نکلے: ''﴿اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ﴾ اَللّٰهُمَّ أْجُرْنِي فِي مُصِيبَتِي، وَ أَخْلِفْ لِي خَيْرًا مِنْهَا'' یا اللہ! اس مصیبت میں تو مجھے ثواب اور اجر عطا فرما اور جو چیز میری ضائع ہوگئی، اس سے مجھے بہتر نعمت عطا فرما۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: جو آدمی یہ پڑھتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو اس سے بہتر نعمت عطا فرماتے ہیں۔

حضرت اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے یہ حدیث مبارک یاد کرلی۔ جب میرے خاوند حضرت ابو سلمہ رضی اللہ عنہ کی

وفات ہوئی تو میں نے ان کی موت پر یہ پڑھا: ''﴿إِنَّا لِلّٰهِ وَ إِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ﴾ اَللّٰهُمَّ أْجُرْنِي فِي مُصِيبَتِي، وَ أَخْلِفْ لِي خَيْرًا مِنْهَا'' پھر میں نے اپنے دل میں سوچا کہ میں نے دعا تو مانگی ہے، لیکن میرے شوہر ابوسلمہ سے اچھا شوہر کہاں ملے گا؟ وہ تو بڑے اچھے تھے۔ لیکن حضور اکرم ﷺ کا فرمان تھا، میں نے عمل کر لیا۔

جب میری عدت کے دن پورے ہو گئے تو حضور پاک ﷺ نے میرے گھر میں آنے کی اجازت چاہی، میں نے حضور پاک ﷺ کو اجازت دی۔ میں اس وقت کیکر کی چھال سے چمڑا رنگ رہی تھی، میں نے ہاتھ دھوئے اور ایک چمڑے کا گدا جس کے اندر کھجور کے پتے بھرے ہوئے تھے، حضور اکرم ﷺ کے لئے بچھایا، آپ اس پر بیٹھ گئے تو حضور پاک ﷺ نے فرمایا: میں تم سے شادی کرنے کی رغبت رکھتا ہوں۔

جب آپ فارغ ہوئے تو میں نے کہا: آپ نے مجھے خطبہ تو دیا ہے، لیکن یہ ہو سکتا ہے کہ میری بات سننے کے بعد آپ کو خواہش نہ رہے تو میں آپ کو اپنا نقص بتا دیتی ہوں۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ میں بڑی غیرت والی عورت ہوں، کہیں ایسا نہ ہو میں نبی کے گھر میں ہو کر کوئی ایسی بات کہہ بیٹھوں۔ دوسری بات یہ کہ میں ایسی عورت ہوں کہ بڑھاپے کی منزل میں داخل ہو گئی ہوں۔ تیسری بات یہ ہے کہ میری ایک بچی بھی ہے۔

آپ ﷺ نے فرمایا: جہاں تک تمہارا غصہ والا مسئلہ ہے، میں دعا کروں گا تو اللہ تعالیٰ اس کو نکال دیں گے اور بچی کو تم سے مستغنی کر دیں گے۔ حضرت اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ اگر آپ کو یہ باتیں منظور ہیں تو مجھے بھی منظور ہے۔ بی بی صاحبہ کہتی ہیں کہ مجھے یاد آیا کہ یہ سارا بدلہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اس دعا کی وجہ سے دیا ہے۔

اپنی مخطوبہ کو کس حد تک دیکھنا جائز ہے؟

اگر کوئی آدمی کسی عورت سے یا لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہے تو وہ مخطوبہ کو دیکھ سکتا ہے، تاکہ ابتداء میں ہی عورت یا لڑکی اس کو گوارا نہیں ہوئی یا لڑکی کو لڑکا پسند نہ آئے تو بات ختم کر دی جائے، کل کو جو فتنے ہیں وہ پیدا نہ ہوں اور صرف اتنی اجازت ہے۔

باقی جو آج کل کے رواج ہیں، اللہ پاک ان سے محفوظ فرمائے کہ ابھی خطبہ (پیغام) نہیں ہوتا، صرف تجاویز ہوتی ہیں یا خطبہ ہو جاتا ہے اب وہ آتا ہے تو کہتا ہے اب تو میری بیوی ہے، باہر ہوٹلوں میں جا رہے ہیں کہ آپس میں ایک دوسرے کی انڈر اسٹینڈنگ ہو رہی ہے، یہ سب باتیں غلط ہیں۔ شریعت میں یہ ہے کہ جب نکاح ہو جائے،

قاضی خطبہ پڑھے، باقاعدہ گواہ ہوں، لوگوں کے اندر مشتہر ہو جائے کہ یہ نکاح ہو گیا تو اب یہ خاوند اس کا حقدار ہے یہ عورت اس کی بیوی ہے چاہے رخصتی ہو یا نہ ہو، شرعاً اس کی بیوی بن گئی۔ اس سے پہلے ہمارے ہاں جو رواج ہے، مثلاً منگنی ہو گئی کہ لڑکے نے لڑکی کو انگوٹھی پہنا دی تو سب کچھ ہو گیا۔ صرف انگوٹھی پہنانے سے بیوی نہیں بن جاتی۔

عدت کے اندر صراحتاً خطبہ نہ دے:

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ عدت گزرنے سے پہلے آدمی کسی عورت کو خطبہ نہیں دے سکتا۔ مثلاً ایک عورت کا خاوند فوت ہو گیا، ابھی چار ماہ دس دن نہیں گزرے خطبہ دینا درست نہیں۔ کوئی آدمی اس سے شادی کرنا چاہے اور اس کی عدت کے اندر پیغام بھیجے، یہ شریعت کے اندر ناجائز ہے جب تک اس کی عدت نہ گزر جائے۔

کسی کی منگنی پر منگنی جائز نہیں:

یہ مسئلہ بھی سمجھ لیں کہ ایک عورت کا خاوند فوت ہو گیا، اس کی عدت گزر گئی اور اس کو ایک آدمی نے خطبہ دیا ہوا ہے کہ میں آپ سے شادی کرنا چاہتا ہوں تو اسلام کہتا ہے کہ اب دوسرے کو حق نہیں پہنچتا کہ تم بھی پیغام بھیج دو جب تک کہ اس کا پہلا رشتہ طے نہ ہو جائے یا انکار ہو جائے۔ خطبہ کے اندر انسان کو حق ہے کہ عورت بیوہ ہے اس کا کوئی وارث نہیں تو براہ راست بات کر سکتا ہے اور اگر کنواری لڑکی ہے اور اس کے ولی موجود ہیں تو آپ ولی سے بات کر لیں۔

ایک محدث کے چہرے کے مسخ ہونے کا واقعہ:

ایک بہت بڑے محدث تھے، درس میں اپنے چہرے کو چھپا رکھتے تھے۔ بعض طلبہ نے بڑی کوشش کی، لیکن انہوں نے موقع نہ دیا کہ کوئی ان کا چہرہ دیکھ سکے۔ ایک طالب کو بڑی جستجو ہوئی کہ اتنے بڑے عالم ہیں، لیکن کیا بات ہے کہ ان کے چہرے پر ہر وقت پردہ ہوتا ہے۔ اس نے موقع ڈھونڈا اور ان سے عرض کیا کہ حضرت! کیا بات ہے تو انہوں نے بتایا کہ ایک حدیث مبارک میں آتا ہے کہ جو بندہ رکوع میں امام سے پہلے سر اُٹھائے تو اللہ تبارک وتعالیٰ اس کے چہرے کو گدھے کے چہرے سے بدل دیں۔ جب میں نے یہ حدیث مبارک پڑھی تو میرے دل میں بدقسمتی سے خیال آ گیا کہ کیا اتنی چھوٹی سی غلطی سے انسان کا چہرہ گدھے کا چہرہ بن جائے گا تو میں نے جان بوجھ کر غلطی کی تو اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اللہ تعالیٰ نے میرا چہرہ بدل دیا۔ اب میں اپنا چہرہ کسی کو دکھانے کے قابل نہیں ہوں، اب توبہ کر رہا ہوں، معافیاں مانگ رہا ہوں۔

اس لئے کبھی دل کے اندر یہ خیال نہ لائیں کہ دیکھیں ہمیں حضور اکرم ﷺ نے حمام میں داخل ہونے کی بھی دعا سکھائی ہے اب وہاں جاتے ہوئے بھی دعا پڑھیں؟ ایسی بات دل کے اندر نہ لائیں، ورنہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عذاب آجاتا ہے۔

اس طرح کہا کہ میرا باپ فوت ہوگیا، اگر میں ﴿اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ﴾ پڑھوں گا تو کیا مجھے دوسرا باپ مل جائے گا؟ یہ جہالت ہے۔ اللہ تعالیٰ تو باپ سے بھی بہتر نعمت عطا فرما سکتے ہیں۔ جب بھی کسی سنت مبارک کا بیان آئے تو ادب واحترام اور یقین کے ساتھ اس پر عمل کرنا چاہیے۔

دعائیں قبول کیوں نہیں ہوتیں؟

اگر ہم کوئی عمل کریں اور وہ پورا نہ ہو تو اس میں بھی یہ سمجھیں کہ میری کوتاہی تھی۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی خدمت میں ایک آدمی آیا، اس نے کہا: آپ کے ابا کے زمانہ میں جب ہمیں کوئی تکلیف ہوتی تو سورۃ فاتحہ پڑھ کر دم کرتے تھے تو آدمی ٹھیک ہوجاتا تھا۔ اب ہم ایک پارہ پڑھ کر دم کرتے ہیں، لیکن آدمی ٹھیک نہیں ہوتا۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اللہ کا قرآن بھی وہی ہے، سورۃ فاتحہ بھی وہی ہے، لیکن وہ پڑھنے والی زبان کہاں سے لے آئیں جو اللہ نے ان کو دی تھی؟ حضور اکرم ﷺ کے زمانہ سے لے کر اس زمانہ تک جتنے محدثین گزرے ہیں، سب نے احادیث لکھیں اور اپنا تجربہ لکھا، مثلاً ملتزم پر ہم نے جو دعا مانگی وہ ضرور منظور ہوئی لیکن ہم مانگیں منظور نہیں ہوتی تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ (نعوذ باللہ!) ملتزم کی برکت ختم ہوگئی یا (نعوذ باللہ!) اللہ کے کعبہ کے اثرات ختم ہوگئے۔ اصل وجہ یہ ہے کہ مانگنے والی زبان ٹھیک نہیں ہے، ہمارا کھانا حرام کا ہے، کپڑے حرام کے ہیں۔ اور قاعدہ ہے کہ جب بدن کے اندر حرام کا رزق چلا جائے تو پھر جتنی دعائیں مانگتے رہو، قبول نہیں ہوں گی۔

بُرانی یاد آنے پر ﴿اِنَّا لِلّٰہِ﴾ کہنے کا اجر:

بی بی فاطمہ بنت حسین رضی اللہ عنہما نے اپنے ابا حضرت حسین بن علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:

''مَا مِنْ مُسْلِمٍ وَ لَا مُسْلِمَةٍ يُصَابُ بِمُصِيبَةٍ فَيَذْكُرُهَا وَ إِنْ طَالَ عَهْدُهَا، قَالَ عَبَّادٌ: قَدُمَ عَهْدُهَا، فَيُحْدِثُ لِذٰلِكَ اسْتِرْجَاعًا إِلَّا جَدَّدَ اللّٰهُ لَهُ عِنْدَ ذٰلِكَ فَأَعْطَاهُ مِثْلَ أَجْرِهَا يَوْمَ أُصِيبَ بِهَا.''

[مسند احمد بن حنبل، رقم: ۱۷۳۴]

کوئی مسلمان مرد ہو یا کوئی مسلمان عورت، اس کو کوئی مصیبت آئی۔ پھر اس نے اس کو یاد کیا، اگرچہ وہ پرانی مصیبت تھی، اس نے اس وقت بھی پڑھا: ﴿إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رٰجِعُونَ﴾، اس مصیبت کو مدت گزر گئی، لیکن اس کو وہ مصیبت دوبارہ یاد آ گئی تو اس نے دوبارہ بھی پڑھا، اس وقت اس کو اتنا ہی اجر عطا فرماتے ہیں، جتنا مصیبت والے دن ﴿إِنَّا لِلّٰهِ﴾ پڑھنے پر عطا کیا تھا۔

بچے کی وفات پر صبر کرنے کا اجر:

حماد بن سلمہ ابو سنان رحمۃ اللہ علیہ سے روایت فرماتے ہیں کہ میرا بیٹا فوت ہو گیا، میں اس کو قبر میں دفن کر رہا تھا تو ابو طلحہ نے میرا ہاتھ پکڑا اور قبر سے نکالا اور کہا: میں تجھے خوشخبری نہ دوں؟ تجھے حضور اکرم ﷺ کی حدیث مبارک نہ سناؤں؟ میں نے کہا: مجھے سناؤ۔ انہوں نے کہا: حضور پاک ﷺ نے فرمایا: کسی کی اولاد فوت ہوتی ہے تو جب ملک الموت اللہ کی دربار میں جاتے ہیں، اللہ تعالیٰ اس سے فرماتے ہیں: اے میرے فرشتے! آج تُو نے میرے بندے کا جگر نکال لیا، اس کا جو پھل تھا، وہ تم نے لے لیا۔ وہ کہتے ہیں: ہاں میرے اللہ! آپ کا حکم تھا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: میرے بندے نے بچے کی موت پر کیا کہا؟ ملک الموت کہتے ہیں: اے اللہ! اس نے ﴿إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رٰجِعُونَ﴾ پڑھا اور تجھ سے دعا مانگی۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: میرے اس بندے کے لیے جنت میں ایک گھر بنا دو اور اس پر لکھ دو کہ یہ شکر کرنے والے کا گھر ہے۔

﴿إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ أَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ أَنْ يَطَّوَّفَ بِهِمَا ۚ وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا ۙ فَإِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِيمٌ ۝﴾ [البقرۃ:۱۵۸]
”بلاشبہ صفا اور مروہ (دونوں پہاڑ) اللہ کی نشانیاں ہیں پس جس نے بیت اللہ کا حج کیا یا عمرہ کیا اس پر کوئی گناہ نہیں کہ وہ ان کا طواف (سعی) کرے اور جس نے نفلی سعی کی تو بھی اللہ قدردان ہے، خبردار ہے۔“

آیات کا ماقبل سے ربط:

گزشتہ آیات میں صبر کا ذکر تھا، ان آیات میں صفا و مروہ کا ذکر ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے ایک سبق دیا ہے کہ



اے صبر کرنے والو! ذرا ان پہاڑوں پر نظر ڈالو، ان کی تاریخ پر نظر ڈالو، جب یہاں حضرت اسماعیل علیہ السلام اور ان کی والدہ نے تڑپ تڑپ کر صبر کیا تھا۔ اللہ نے ان کی یادگاروں کو کیسے زندہ رکھا ہے؟ یہ صبر کا انعام ہے، ورنہ یہ تو صرف پہاڑ ہیں اور مکہ میں پہاڑوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔

آیت کا شانِ نزول:

امام قرطبی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول نقل فرمایا ہے کہ شیاطین صفا و مروہ کے درمیان ہوتے تھے کیونکہ وہاں بت رکھے ہوتے تھے۔ جب اسلام آیا تو لوگوں نے وہاں سعی کرنے میں حرج محسوس کیا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی کہ صفا و مروہ کی سعی میں کوئی حرج نہیں۔

امام شعبی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ صفا پر اِساف بت رکھا ہوا تھا اور مروہ پر نائلہ بت تھا۔ مفسرین نے لکھا ہے کہ اِساف مرد تھا اور نائلہ عورت تھی، ان دونوں بدبختوں نے اللہ کے کعبہ کے اندر داخل ہو کر زنا کیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو پتھر بنا دیا تو مکہ والوں نے ان کو کعبہ کے ساتھ رکھ دیا، تاکہ لوگ عبرت حاصل کریں کہ جو بھی اللہ تعالیٰ کے گھر میں بدکاری کرے گا، اس کا یہ نتیجہ نکلے گا۔

لوگ عبرت پکڑتے رہے۔ جب کافی زمانہ گزر گیا تو لوگ بھول گئے اور کہنے لگے: کعبہ کے سامنے یہ جو بت رکھے ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی خدا ہیں۔ پھر ان بتوں کو صفا پر رکھ دیا گیا جب لوگ صفا و مروہ پر دوڑنے جاتے تو پہلے ان کو چومتے تھے۔ جب اسلام آیا تو صحابہ رضی اللہ عنہم کو یہ بات گراں گزری کہ یہاں بت تھے اور کافر دوڑتے اور پوجا کرتے تھے تو ہم یہاں پر سعی کیسے کریں؟ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت ہاجرہ علیہا السلام کا واقعہ:

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ اپنی بیوی اور بچے کو ﴿بِوَادٍ غَيْرِ ذِي زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ﴾ اس وادی میں چھوڑ دیں جہاں نہ پانی تھا، نہ آبادی تھی، نہ کھیتیاں تھیں اور نہ کوئی درخت تھا۔ اللہ نے ان کے صبر کا امتحان لیا کہ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا بچوں کو وہاں اُتار دو، لیکن بات نہیں کرنی۔ اس سے بڑا بھی کوئی صبر ہے کہ بیوی کو جنگل میں بٹھا کر آجاؤ اور ان سے بات بھی نہ کرو۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام جب چھوڑ کر جانے لگے تو بی بی ہاجرہ علیہا السلام ان کے پیچھے دوڑیں کہ یہ تو بتائیں کہ کیوں چھوڑ کر جا رہے ہیں؟ حضرت ابراہیم علیہ السلام خاموش رہے۔ اللہ تعالیٰ نے

حضرت جبرائیل علیہ السلام کو بھیجا کہ اتنا بولنے کی اجازت ہے کہ بیوی کو جواب دیں۔ تب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی بیوی کو کہا کہ اللہ کا حکم ہے، اس لیے چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ جب یہ بات سنی تو بیوی کے وہیں قدم رُک گئے اور کہا: ﴿حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ﴾ [آل عمران: ۱۷۳] اللہ کا حکم ہے تو آپ جائیں، ہمارا اللہ کافی ہے۔

اب پانی ختم ہو گیا، بیٹا پیاس سے نڈھال ہے، ماں کے سامنے سانس نکلنے والی ہے، ماں دوڑتی ہے، کبھی صفا پر چڑھ جاتی ہے اور کبھی مروہ پر چڑھ جاتی ہے، تا کہ کوئی پرندہ اُڑتا ہوا نظر آ جائے اور میں اندازہ کروں کہ وہاں پانی ہو گا، یا کوئی قافلہ گزرتا ہوا نظر آ جائے۔ جب آپ پہاڑی کے اوپر چڑھتیں تو بیٹے پر نظر رہتی اور جب نیچے اُترتیں تو نظر نہ آتے تو بی بی جلدی جلدی دوڑ کر اونچائی پر چڑھتیں، تا کہ بیٹے کو دیکھتی رہیں...... اب جہاں سبز بتیاں لگی ہوئی ہیں اور حکم ہے کہ تیز جھپٹ جھپٹ کر چلو، یہ وہی جگہ ہے جہاں حضرت ہاجرہ علیہا السلام تیز چلی تھیں...... اللہ کی قدرت ہے کہ انہوں نے صفا سے پانی کی تلاش شروع کی تھی اور مروہ پر ختم ہوئی تو وہاں فرشتے کی آواز آئی تھی کہ اے اُمّ اسماعیل! گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے، انتظام ہو گیا ہے۔ بی بی ہاجرہ علیہا السلام نے فرمایا: تم کون ہو؟ سامنے آ کر بات کرو۔ پھر دوبارہ آواز آئی۔ بی بی ہاجرہ نے پوچھا کہ کون ہو؟ اور کیا انتظام ہو گیا ہے؟ بی بی واپس آئیں تو دیکھا کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام جس جگہ لیٹے ہوئے ہیں اور پاؤں رگڑ رہے ہیں، وہاں حضرت جبرائیل علیہ السلام نے پَر مارا تو زم زم کا چشمہ نکلا۔

زم زم کے معنی میں غور کرو تو اس میں بھی صبر کا معنی معلوم ہوتا ہے۔ صبر کا معنی ہے: اپنے آپ کو روک دینا۔ بی بی صاحبہ نے دیکھا کہ پانی نکل رہا ہے، انہوں نے پتھر رکھنا شروع کر دیئے، تا کہ پانی بہہ نہ جائے۔ اس چشمہ کے اردگرد دیوار بنانے لگیں، جب پتھر رکھتیں تو کہتیں: زم، زم، زم (ٹھہر جا، ٹھہر جا)۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اماں پر رحمت کرے، اگر وہ پانی نہ روکتیں تو پوری دنیا میں ایک دریا جاری ہو جاتا۔ یہ دونوں آیات میں ربط ہے۔

آبِ زم زم کا واقعہ:

علماء نے لکھا ہے کہ حوضِ کوثر سے زمزم کا پانی افضل ہے۔ محدثین نے اس کی وجہ یہ بیان فرمائی ہے کہ جس دن معراج کی رات تھی، حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا سینہ مبارک کھولا گیا، جبرائیل امین جنت سے سارا سامان لے کر آئے، نور

سے بھرا ہوا طشت جنت سے لے آئے اور دھاگہ جس کے ساتھ سلائی کی گئی، وہ بھی جنت سے لائے..... صحابہ رضی اللہ عنہم کہتے ہیں: وہ ٹانکے بھی ہم نے دیکھے جو حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے سینہ مبارک پر لگے ہوئے تھے..... لیکن پانی جنت سے نہیں لائے، بلکہ حضرت جبرائیل علیہ السلام نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سینہ مبارک کو زمزم کے پانی سے دھویا۔

اس سے محدثین نے مسئلہ نکالا کہ جب جبرائیل علیہ السلام جنت سے ہر چیز لا سکتے ہیں تو پانی حوضِ کوثر سے کیوں نہیں لا سکتے تھے؟ لہٰذا اللہ نے حکم دیا تھا کہ زمزم کے پانی سے دھونا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ زمزم کا پانی حوضِ کوثر کے پانی سے افضل ہے۔ حدیث میں واضح الفاظ میں یہ نہیں ہے، لیکن ان موتیوں کو حدیث سے نکالنے والے کا نام فقیہ ہے۔

آج دنیا اپنے اوپر بڑا ناز کرتی ہے کہ اب بڑی ترقی ہوگئی ہے، لیکن ایسی سرجری کوئی کر سکتا ہے جو جبرائیل علیہ السلام نے کی ہے، جو اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہوئی ہے۔ ایسا سرجن پیدا نہیں ہوا جو ایک سیکنڈ کے اندر آپریشن کر دے اور جس کا آپریشن ہو، اس کے بے ہوش بھی نہ کیا جائے اور اندر سے سب کچھ نکال کر دھو یا جائے، پھر سیا جائے اور پتہ بھی نہ ہو کہ کیا ہو گیا ہے۔ اقبال نے کہا تھا:

؎ خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوۂ دانش فرنگ
سرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ و نجف

کہ جب میں نے آنکھوں میں مدینہ کی مٹی کا سرمہ پہنا ہے تو ان انگریزوں کے جلوے مجھے کیا دکھائیں گے؟ میرے ساتھ تو محمد مدنی صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات ہیں۔ یہ تو ان کو بیوقوف بنا سکتے ہیں جنہوں نے انگریزوں سے پڑھا ہو اور کبھی قرآن کھول کر نہ دیکھا ہو کہ ان کے دماغوں میں کبھی بٹھا دیتے ہیں کہ زمین گھومتی ہے اور کبھی کہتے ہیں کہ سورج گھومتا ہے اور کبھی کہتے ہیں کہ دونوں گھومتے ہیں۔

میں ایک دفعہ لاہور کانفرنس کے لیے گیا۔ وہاں پانی لائے تو وہ گندا تھا۔ جب ان سے پوچھا تو انہوں نے کہا کہ آج کل عوام کا رش ہے، جس کی وجہ سے پانی کنویں سے نیچے چلا گیا ہے اور بڑی مشکل سے یہ پانی ملا ہے۔ میں نے کہا: تم لوگ دریاؤں پر رہتے ہو اور یہ حال ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ہم نے صبر کرنے والوں کو جو کنواں دیا، وہ دیکھ لو! ہزاروں سال گزر گئے، لوگ پی بھی رہے ہیں اور لے کر بھی جا رہے ہیں، لیکن زمزم ختم نہیں ہوتا۔ جیسے یہ پانی ختم نہیں ہوتا، ایسے صبر کرنے والوں کا ثواب بھی ختم نہیں ہوگا۔

بعض لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ زمزم کے اندر انہوں نے دوسرا پانی ملایا ہوا ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے

زمانہ میں کون سے پانی ملائے جاتے تھے؟ چلو اب تو ہم کہہ دیں کہ انڈر گراؤنڈ پائپ چھپا دیا ہوگا جو تمہیں نظر نہیں آتا، لیکن حضور اکرم ﷺ کے زمانہ میں پائپ کس نے ڈالا؟ یہ زمزم تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ سے چلا آرہا ہے اور یہ کئی دفعہ گم ہوگیا، کنواں بند ہوگیا، پھر اللہ کی شان کہ زمزم ظاہر تو وہاں ہو رہا ہے جہاں کنواں ہے، لیکن اس کا مرکز اصلی عین خانہ کعبہ ہے کہ اس کے نیچے سے پانی کی ایک چادر جاری ہے۔ اللہ تعالیٰ نے صفا و مروہ کو شعائر بنایا۔ شعائر، شعار کی جمع ہے، بمعنی نشانی۔ اسلام میں شعائر اس کو کہتے ہیں جو کفر اور اسلام کے درمیان واضح نشانی بن جائیں۔

زم زم پینے کے فوائد:

زمزم کے بارے میں حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:

''طَعَامُ طُعْمٍ وَ شِفَاءُ سُقْمٍ.'' [السنن الکبریٰ للبیہقی، رقم: ۹۹۳۹]

زمزم کا پانی غذا کا کام بھی دیتا ہے اور بیماریوں سے شفا کا کام بھی دیتا ہے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم فرماتے ہیں: ابتداء اسلام میں جب ہم پر غربت کا عالم تھا، کھانے کو کوئی چیز نہیں ہوتی تھی تو ہم صرف زمزم کا پانی پیتے تھے تو ہم موٹے ہوگئے۔ زمزم کو آپ جس نیت کے لیے پئیں گے، وہی حاجت پوری ہوگی۔

سفیان بن عیینہ رحمہ اللہ جو امام بخاری رحمہ اللہ کے استاد ہیں، وہ جب زمزم پینے کے لئے آئے تو کہا: اے میرے اللہ! تیرے نبی کا فرمان سچا ہے کہ جس غرض سے زمزم پیو گے، وہ اللہ تعالیٰ پوری کرے گا۔ اے اللہ! میں اس لئے پی رہا ہوں کہ قیامت کے دن حشر کے میدان میں مجھے پیاس سے بچالینا۔ ان بزرگوں کی نظر آخرت پر ہوتی تھی اور ہماری نظر دنیا پر ہوتی ہے کہ جب ہم زمزم پیتے ہیں تو یہ دعا کرتے ہیں: اے اللہ! پیسے عطا فرما، میرے رزق میں زیادہ برکتیں دے دے۔ ہماری ہر وقت درہم، دینار، روپیہ، ریال کی سوچ ہوتی ہے اور دنیا اللہ تعالیٰ کی مبغوض چیز ہے، اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں۔ جبکہ ہم اللہ تعالیٰ سے وہی چیز مانگتے ہیں۔ دنیا کے بارے میں بہت سخت الفاظ آئے ہیں۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اس کی مثال ایسے ہے جیسے مردار جانور پڑا ہو اور اس کے کھانے والے کتے ہوتے ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول ہے:

''اَلدُّنْيَا جِيفَةٌ فَمَنْ أَرَادَهَا فَلْيَصْبِرْ عَلَى مُخَالَطَةِ الْكِلَابِ.'' [حلیۃ الاولیاء: ۸/۲۳۸]

اصل انعام آخرت کا ہے۔اس لئے بزرگ دعا کرتے تھے:اے اللہ! ایمان پر خاتمہ ہو جائے۔اے اللہ! قبر کے عذاب سے بچانا، حشر کے عذاب سے بچانا، اے اللہ! ہمیں آخرت کی نعمتیں نصیب فرمانا، جو ختم ہونے والی نہیں ہیں۔

صبر کرنے والوں کو آخرت میں اجر ملے گا:

صبر کرنے والوں کو اصل بدلہ اللہ تعالیٰ آخرت میں دیں گے کیونکہ دنیا دار العمل ہے اور آخرت دار الجزاء ہے۔ لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ کبھی اپنے نیک لوگوں کو ان کے اعمالِ حسنہ کا بدلہ دنیا میں بھی عطا فرما دیتے ہیں، جیسے کبھی کبھی اپنے مخالفین کو دنیا میں عذاب بھی دے دیتے ہیں۔ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام، بی بی ہاجرہ رضی اللہ عنہا اور حضرت اسماعیل علیہ السلام نے صبر کیا اور ہجرت کی مشقت برداشت کی اور اپنا وطن چھوڑا، اس وادی بے آب وگیاہ میں ایک عورت اور ایک چھوٹے بچے نے وقت گزارا تو اللہ تعالیٰ نے ان کو صبر کا اس طرح بدلہ عطا فرمایا کہ اگر زمزم پر نظر پڑے تو حضرت اسماعیل علیہ السلام کی یاد آئے گی اور صفا ومروہ پر نظر دوڑائیں تو بی بی ہاجرہ رضی اللہ عنہا کے دوڑنے کی یاد آئے گی اور قیامت تک اللہ تعالیٰ نے اس کو عمل خیر بنا دیا کہ انبیاء نے بھی سعی کی اور اولیاء اور جتنے لوگ قیامت تک دوڑیں گے، اس کا ثواب بی بی ہاجرہ کو بھی جائے گا، کیونکہ ابتداء انہوں نے کی تھی۔

صفا ومروہ کی سعی کے مسائل:

امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک جیسے طواف فرض ہے اسی طرح ایک قول کے مطابق صفا ومروہ کے درمیان دوڑنا بھی فرض ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ سے ایک روایت بھی امام شافعی رحمہ اللہ کی طرح ہے اور امام مالک رحمہ اللہ بھی صفا ومروہ کی سعی کو حج کا رکن سمجھتے ہیں۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک صفا ومروہ پر دوڑنا واجب ہے، رکن نہیں ہے اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک جو واجب کو چھوڑے گا، اس کو دَم دینا ہوگا۔ امام احمد رحمہ اللہ کا یہی ایک قول ہے اور اسی طرح ایک جماعت نے کہا ہے۔

بعض علماء فرماتے ہیں کہ یہ مستحب ہے، جیسا کہ امام ثوری رحمہ اللہ اور امام شعبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

یاد رکھیں! ابن کثیر رحمہ اللہ نے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی طرف صفا ومروہ کے درمیان سعی کو مستحب قرار دینے کی نسبت کی ہے، جو درست نہیں۔

امام شافعی رحمہ اللہ ایک یہ دلیل دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو شعائر اللہ فرمایا ہے، دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ذٰلِكَ ۥ وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَي الْقُلُوْبِ﴾ [الحج:۳۲] لہٰذا یہ فرض ہے۔

امام شافعی رحمہ اللہ نے ان روایات سے استدلال فرمایا کہ صفا و مروہ کے درمیان دوڑ نا حج کا رکن ہے، لہٰذا اگر یہ نہ ہو تو حج مکمل نہیں ہوگا۔

ایک امام احمد رحمہ اللہ نے حضرت بی بی حبیبہ بنت تجراۃ رضی اللہ عنہا سے روایت نقل فرمائی ہے کہ میں نے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم صفا و مروہ کے درمیان دوڑ رہے تھے اور لوگ بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے آگے تھے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اتنی شدت سے چل رہے تھے کہ چادر آپ کے مبارک گھٹنوں کے اردگرد گھوم رہی تھی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے تھے: تیز چلو، اللہ تعالیٰ نے اس جگہ سعی کرنے کا حکم دیا ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ نے دوسری روایت حضرت صفیہ بنت شیبہ سے نقل کیا ہے کہ ایک عورت سے سنا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب صفا و مروہ پر دوڑ رہے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ پاک نے صفا و مروہ پر دوڑنے کا حکم دیا ہے، لہٰذا دوڑو۔

جن حضرات نے فرمایا کہ صفا و مروہ پر دوڑنا مستحب ہے، ان کی دلیل ﴿فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا﴾ یعنی ان لوگوں پر کوئی حرج نہیں جو صفا و مروہ پر دوڑیں تو ﴿فَلَا جُنَاحَ﴾ کا مطلب ہے کہ دوڑیں تو بھی کوئی حرج نہیں اور اگر نہ دوڑیں تو کوئی حرج نہیں۔ لہٰذا صفا و مروہ کے درمیان دوڑنا مستحب ہے۔

حضرت عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا﴾ [البقرۃ:۱۵۸] اس کا معنی تو یہی ہوا کہ جو دوڑے تو دوڑے اور جو نہ دوڑے تو نہ دوڑے۔ بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: تم کیا کہہ رہے ہو؟ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم دوڑے ہیں، تم نے آیت کو سمجھا نہیں ہے۔ یہ آیت اس لئے نازل ہوئی تھی کہ زمانہ جاہلیت میں لوگوں نے اپنے بت تقسیم کئے ہوئے تھے، بعض قبائل لات کے پجاری تھے، بعض منات کے پجاری تھے، بعض عزیٰ کے پجاری تھے اور بعض ھبل کے پجاری تھے، اسی طرح انہوں نے دو بت صفا و مروہ پر بھی رکھ چھوڑے تھے، جب صفا و مروہ پر دوڑنے کے لیے آتے تو پہلے ان بتوں کو ہاتھ لگاتے، ان کا تبرک حاصل کرتے اور پھر صفا و مروہ پر دوڑتے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے مہربانی فرمائی اور اسلام کو فتح مکہ کے ساتھ غلبہ نصیب فرمایا تو اللہ تعالیٰ نے صفا و مروہ پر دوڑنے کا حکم فرمایا تو صحابہ رضی اللہ عنہم کو یہ بات بڑی عجیب معلوم ہوئی کہ یہ تو وہ جگہ ہے جہاں آ کر مشرکین بتوں کی پوجا کرتے تھے، اگر ہم بھی اس جگہ دوڑیں گے تو لوگ کہیں گے کہ یہ بھی تو اسی جگہ دوڑ رہے ہیں۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے حضور

اکرم ﷺ کی خدمت میں یہ اشکال پیش کیا، اللہ تعالیٰ نے قرآن نازل کیا کہ آپ ان کو بتائیں، یہ صفا و مروہ میرے شعائر ہیں، اگر لوگوں نے وہاں کچھ دنوں کے لیے بت رکھ دیئے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ میرے شعائر ختم ہو گئے۔ آپ اپنے صحابہ کو حکم دیں کہ وہ دوڑیں، کیونکہ وہ میرے حکم پر دوڑے ہیں۔ اگر ایسی بات کریں تو پھر مشرکین کعبہ کا طواف بھی کرتے تھے تو پھر کیا کعبہ کا طواف بھی چھوڑ دو گے؟ مشرکین تو منیٰ اور مزدلفہ بھی جاتے تھے، احرام بھی باندھتے تھے تو یہ ساری چیزیں ہم اس لیے چھوڑ دیں کہ یہ کام مشرکین کرتے تھے؟ بلکہ ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ ان میں کون سی ایسی چیزیں ہیں جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے، وہ باقی رہیں گی اور جو چیزیں لوگوں نے خود بنائی تھیں، ان کو اسلام مٹا دے گا۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے صفا و مروہ کی سعی کو واجب قرار دیا ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ یہ ایسا عمل ہے جو حضور اکرم ﷺ نے کبھی اور کسی حالت میں نہیں چھوڑا اور حضور اکرم ﷺ نے بھی فرمایا:

''نَبْدَأُ بِمَا بَدَأَ اللّٰهُ بِهٖ، إِنَّ الصَّفَا وَ الْمَرْوَةَ مِنْ شَعَائِرِ اللّٰهِ.'' [مسند ابی یعلی: ۲/ ۳۶۲]

اس لئے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ایک حکم جو نص قطعی میں آجائے وہ اگر فرض کے مقام پر نہ پہنچے تو وہ واجب ہے۔ اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جب ہم چاہیں صفا و مروہ پر نہیں دوڑ سکتے، جیسا کہ ہم طواف کر سکتے ہیں۔ اس لئے کہ شرط لگائی گئی ہے: ﴿فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ أَوِ اعْتَمَرَ﴾ جس نے حج اور عمرہ کا احرام باندھا، وہ صفا و مروہ پر دوڑے۔

اس میں ائمہ کا وہ اختلاف ہے جس کو عالم لوگ پڑھ کر دعائیں دیتے ہیں اور جاہل اعتراض کرتے ہیں۔ اسی لئے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا قول ہے: ''لَا خَيْرَ فِيْ عَمَلٍ لَا عِلْمَ فِيْهِ وَ لَا خَيْرَ فِيْ عِلْمٍ لَا عَمَلَ عَلَيْهِ'' عمل میں خیر نہیں جب تک علم نہ ہو، کیونکہ علم کے بغیر عمل کیسے کریں گے؟ اور اس علم میں بھی خیر نہیں جس پر عمل نہ ہو۔ اسی طرح یہ بھی فرماتے تھے کہ اس عمل میں بھی خیر نہیں جس میں تفقہ اور سمجھ نہ ہو۔ اور فرماتے تھے: اس قرآن و حدیث کے پڑھنے میں بھی خیر نہیں جس میں تدبر نہ کیا ہو۔ جاہل لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اگر یہ امام نہ ہوتے تو جھگڑے نہ ہوتے۔ ان سے پوچھا جائے کہ ان اماموں سے پہلے جو اتنے بڑے بڑے جھگڑے ہوئے اور صحابہ شہید ہوئے، اس وقت کس امام نے جھگڑا کروایا تھا؟

ایک اور مسئلہ کہ صفا و مروہ کی سعی بھی بغیر طواف کے نہیں ہو سکتی، کسی طواف سے قبل صفا و مروہ کی سعی نہیں ہوگی۔ جیسے حج کرنے کے لیے آپ آئیں تو پہلے طواف زیارت کریں گے، اس کے بعد صفا و مروہ پر دوڑیں گے اور اگر آپ عمرہ کے لئے آئے ہیں تو پہلے آپ اللہ تعالیٰ کے گھر کا طواف کریں گے، اس کے بعد صفا و مروہ پر دوڑیں گے۔ اس لئے اگر کوئی آدمی ذوالحلیفہ سے یا جدہ سے یا طائف یا تنعیم سے احرام باندھ کر اللہ تعالیٰ کے حرم میں آ گیا، طواف نہیں کیا اور صفا و مروہ کے درمیان دوڑ لگا دی تو اس کا صفا و مروہ میں دوڑنا بیکار ہے۔ اب اس کے لئے یہ حکم ہے کہ وہ پہلے طواف کرے، پھر دوبارہ صفا و مروہ پر دوڑے۔

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ ایک آدمی نے احرام باندھا، طواف بھی کر لیا، صفا و مروہ پر دوڑنے کے لئے گیا تو اس نے مروہ سے سعی شروع کر دی اور پورے سات چکر لگا لیے تو اس کی سعی ادا نہیں ہوئی، اس کو دوبارہ دوڑنا پڑے گا۔ کیونکہ جب تک ابتداء صفا سے نہ ہو اور انتہاء مروہ پر نہ ہو تو سعی ادا نہیں ہوتی۔ اگر ہم صفا سے سعی شروع کر کے صفا پر ختم کریں تو سات چکر نہیں بن سکتے۔ اس لیے صفا سے شروع کریں گے اور جب مروہ پر جائیں گے تو ہمارا ایک چکر پورا ہو گیا اور پھر مروہ سے صفا پر آئیں گے تو یہ دوسرا چکر ہو گیا۔ اس طرح صفا سے ابتداء ہو اور انتہاء مروہ پر ہو تو ٹھیک ہے۔

ایک آدمی نے مجھے خود بتایا کہ میں نے طواف کیا، پھر حجر اسود پر گیا، پھر صفا پر گیا اور پھر مروہ پر گیا، پھر صفا پر آیا، صفا سے پھر میں حجر اسود پر آیا، حجر اسود سے پھر میں صفا پر گیا۔ میں نے اس سے کہا: کچھ نہیں ہوا، الحمد للہ! ٹانگیں بھی ٹوٹ گئیں اور ادا بھی نہ ہوا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارا حاجی حج والا ہو یا عمرہ والا ہو، دین سیکھ کر نہیں آتا، صرف اعتراض کرنے کے لیے آتا ہے کہ یہاں بڑی گرمی ہے، بڑی تکلیف ہے۔ ہم عمرہ پر ایک سیر کرنے کے لیے آتے ہیں یہ تو ایسے ہو گیا جیسے ایک آدمی شادی نہ کرے اور کہے کہ اللہ قادر ہے، بچہ دے گا۔ اسی طرح ایک آدمی زمین میں ہل بھی نہ چلائے اور بیج بھی نہ ڈالے اور اس کے بعد کہے: مولوی صاحب! دعا کریں، اس دفعہ مجھے ایک ایکڑ سے پچاس من گندم ملے۔ اس سے پوچھیں کہ کیا تُو نے ہل چلائے؟ پھر وہ کہے کہ اللہ تو قادر ہے، بغیر ہل چلانے کے بھی دے سکتے ہیں۔ یہ جہالت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جو اسباب پیدا کیے ہیں، ان پر عمل کرو اور پھر اللہ تعالیٰ سے مانگو۔ حضور اکرم ﷺ براق پر جب گئے، حضرت جبرائیل علیہ السلام نے اپنی انگلی سے پتھر میں سوراخ کر کے اس پتھر کے ساتھ اس کو باندھا۔ اس سے محدثین کرام نے مسئلہ نکالا ہے کہ انسان پہلے اسباب پر عمل کرے، پھر اللہ تعالیٰ پر

توکل کرے۔

صفا و مروہ کے درمیان مردوں اور عورتوں کے لئے دوڑنے کا حکم نہیں، بلکہ جہاں سبز بتی ہے وہاں تیز چلیں۔ صفا پر اتنا چڑھو کہ تمہیں اللہ تعالیٰ کا کعبہ نظر آ جائے۔ یہ نہیں کہ پہاڑ کی آخری چوٹی پر چڑھ جاؤ۔ بعض بڑے خوش ہوتے ہیں کہ ہم چوٹی پر چڑھ گئے تھے۔ یہ نہیں سوچتے کہ ہم نے سنت رسول اللہ ﷺ کی مخالفت کی ہے۔

جوان سے زیادہ شریف آدمی ہوتے ہیں فوٹو بھی کھنچواتے ہیں، تاکہ اس جگہ کا ذرہ ذرہ ہماری اس لعنت کا گواہ بن جائے کہ وہ کام کیا جس پر اللہ کے نبی نے لعنت بھیجی ہے۔

بعض لوگ اپنا عمرہ پورا کر لیتے ہیں، لیکن اس کے بعد بھی اپنا کندھا ننگا رکھا ہوا ہوتا ہے۔ حالانکہ کندھا ننگا رکھنا صرف طواف کے پہلے تین چکروں میں ہوتا ہے۔

اسی طرح بعض حاجی حضرات نے احرام کو بکسوئے کے ساتھ یا لوہے کے بٹن کے ساتھ باندھا ہوا ہوتا ہے اور ان کے ذہن میں یہ بات ہوتی ہے کہ اگر ہمارا احرام نیچے گر گیا تو ہمارا حج، عمرہ ختم ہو جائے گا۔ حالانکہ اس طرح کرنا احرام کی چادر کو سینے کے مترادف ہے، جس سے دَم واجب ہو جاتا ہے۔

بعض ایسے ہوتے ہیں جو ملتزم پر کھڑے ہو کر کہہ رہے ہوتے ہیں محبوب سبحانی! تیری مہربانی کہ تُو نے ہمیں کعبہ دکھا دیا۔ وہاں کھڑے ہو کر بھی شرک کر رہے ہوتے ہیں۔ پھر ہمارا مکہ کے اندر آنے کا کیا فائدہ ہوا؟ جس سے ہماری بدعت اور شرک نہ چھوٹے۔ جب تک تم کھیتی کے کانٹے وغیرہ صاف نہ کر لو، کھیتی صحیح نہیں اُگتی۔ اسی طرح جب تک تم شرک و بدعت کے کانٹے صاف نہیں کرو گے، اس وقت تک توحید والا درخت پیدا نہیں ہوگا۔

﴿وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا﴾ سے کیا مراد ہے؟

﴿وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا﴾ بعض علماء فرماتے ہیں کہ کسی نے سات چکروں کی بجائے آٹھ چکر کر لیے تو یہ بہتر ہے اور بعض علماء نے فرمایا: زندگی میں حج ایک دفعہ فرض ہے، لیکن جو آدمی ہر سال نفلی حج یا عمرہ کرتا ہے، صفا و مروہ پر دوڑتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو زیادہ ثواب عطا فرماتے ہیں۔ ﴿فَإِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِيْمٌ﴾... ''شَاكِرٌ'' کا معنی تھوڑی چیز پر زیادہ بدلہ دینے والا کہ زندگی بھی اور عمل بھی ہمارا تھوڑا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ اس کا بدلہ جنت کی صورت میں دیں گے جو ہمیشہ رہنے والی ہے اور اللہ تعالیٰ کامل علم والے ہیں۔ ﴿عَلِيْمٌ﴾ جتنا بدلہ بنتا ہے ہماری تھوڑی اس سے کم نہیں دیں

گے اس سے، بلکہ زیادہ ثواب دیں گے۔ ایک کا دس گنا یا سات سو گنا دیں گے۔

﴿إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنَاتِ وَالْهُدَىٰ مِنْ بَعْدِ مَا بَيَّنَّاهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتَابِ ۙ أُولَٰئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللَّهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللَّاعِنُونَ ۝ إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا وَأَصْلَحُوا وَبَيَّنُوا فَأُولَٰئِكَ أَتُوبُ عَلَيْهِمْ ۚ وَأَنَا التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ۝ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَمَاتُوا وَهُمْ كُفَّارٌ أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ ۝ خَالِدِينَ فِيهَا ۖ لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُونَ ۝﴾ [البقرۃ:۱۵۹ تا ۱۶۲]

''بے شک جو لوگ ان صاف احکام اور ہدایت کو چھپائیں جسے ہم نے نازل کیا ہے اس کے بعد ہم نے اس کو لوگوں کے لیے کتاب (تورات) میں واضح کر دیا تھا ان پر اللہ بھی لعنت کرتا ہے اور لعنت کرنے والے بھی لعنت کرتے ہیں۔ مگر وہ لوگ جو (اس حرکت سے) باز آئے اور درست ہو گئے اور حق بات کو بیان کر دیا، میں ان کو معاف کرتا ہوں، اور میں بڑا معاف کرنے والا مہربان ہوں۔ بلاشبہ وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا اور کفر کی حالت میں مر گئے، ان پر اللہ کی اور فرشتوں کی اور تمام لوگوں کی لعنت ہے۔ (یہ) اس لعنت میں رہیں گے، ان سے عذاب کو ہلکا نہیں کیا جائے گا، نہ ان کو مہلت دی ملے گی۔''

ان آیاتِ مبارکہ میں ان لوگوں کے لیے وعید شدید ہے جو اللہ تعالیٰ کے پیغمبر کی ان تعلیمات کو چھپائیں جو وہ لے کر آئے۔ جن کی تعلیمات میں دلوں کو نفع دینے والی ہدایات ہیں۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے ان چیزوں کو ان کتابوں کے اندر کھول کر بیان فرمایا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں پر اُتاری ہیں۔

دینِ حق کو چھپانا یا بدلنا موجبِ لعنت اور عذاب ہے:

حضرت ابو العالیہ رحمۃ اللہ علیہ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں: یہ آیت اہل کتاب کے بارے میں نازل ہوئی جنہوں نے تورات میں حضور اکرم ﷺ کی صفت کو چھپایا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جو لوگ حق کو چھپانے والے ہیں ان پر صرف اللہ تعالیٰ کی لعنت نہیں ہوتی، بلکہ دنیا کی ہر چیز ان پر لعنت کرتی ہے۔ جو لوگ حق کو چھپالیں، ان کے بارے میں وعید ہے۔ وہ حق اُمتوں کے پاس پیغمبروں کے ذریعہ سے آیا ہو یا علماء کے ذریعہ سے، کیونکہ حضور اکرم ﷺ کے بعد اللہ تعالیٰ نے نبوت کا سلسلہ ختم فرما دیا ہے، اب قیامت تک دین کی بات علماء کے ذریعے سے پہنچے گی۔

حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: جب زمینوں میں قحط پڑتا ہے، بارشیں نہیں ہوتیں تو زمین پر جتنی اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے، وہ کہتی ہے کہ پانی اس لیے بند ہوا کہ انسانوں نے گناہ شروع کر دیئے ہیں اور وہ کہتے ہیں کہ اے اللہ تعالیٰ! بنو آدم کے ان انسانوں پر لعنت کر، جن کی وجہ سے ہم تیری رحمت سے محروم ہو گئے۔

حدیث مبارک میں آیا ہے: ''إِنَّ العَالِمَ لَيَسْتَغْفِرُ لَهُ مَنْ فِي السَّمٰوَاتِ وَ مَنْ فِي الأَرْضِ حَتَّى الحِيتَانُ فِي المَاءِ'' [جامع ترمذی، رقم: ۲۶۸۲] عالم دین کے لیے ہر چیز اللہ سے بخشش مانگتی ہے حتیٰ کہ سمندر کی مچھلیاں بھی عالم کے لیے معافی مانگتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جو آدمی علم رکھنے کے باوجود حق بات کو چھپاتا ہے تو اللہ اس پر لعنت کرتے ہیں، ملائکہ بھی اس پر لعنت کرتے ہیں، مخلوق بھی اس پر لعنت کرتی ہے، ہر چیز بولنے والی اور نہ بولنے والی سب لعنت کرتے ہیں، چاہے وہ قول سے لعنت کرتے ہیں یا ان کی جو حالت ہے، لعنت پر دلالت کر رہی ہوتی ہے۔

اسی حدیث مبارک میں آتا ہے: ''إِنَّ الْعُلَمَاءَ وَرَثَةُ الأَنْبِيَاءِ'' اگر کوئی عالم حالات کو شکار ہو کر یا اپنی خواہشات نفسانی کا شکار ہو کر حق کو چھپائے اور اس میں ایسی تاویلات کرے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام اور حضور اکرم ﷺ کے فرامین بدل جائیں تو ایسے لوگوں پر دنیا میں بھی لعنت ہے اور آخرت میں بھی لعنت ہے۔ ایک ہے حق کو چھپانا، جیسے اہل کتاب کو پتہ تھا کہ حضور اکرم ﷺ اللہ کے سچے نبی ہیں، لیکن جب ان سے کوئی پوچھتا کہ تمہاری کتابوں میں حضور اکرم ﷺ کا ذکر آیا ہے یہ وہی نبی ہیں تو کہہ دیتے کہ ان میں فرق ہے۔ اسی طرح مسئلہ کو چھپایا جاتا ہے۔

یہود کا رجم کا حکم چھپانے کا واقعہ:

جیسا کہ حضور اکرم ﷺ نے رجم کا فیصلہ فرمایا اور یہود کے علماء سے پوچھا کہ تمہاری کتاب تورات میں زانی کی کیا سزا ہے؟ انہوں نے کہا: ہماری کتابوں میں بس اتنی سزا ہے کہ اس کا منہ کالا کر کے اس کو گدھے پر بٹھا کر بازار میں پھرا دیں۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: تورات اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے، اس میں بھی رجم کا حکم ہے، لیکن یہودیوں نے انکار کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: کتاب لے آؤ۔ وہ جب کتاب لے آئے تو اس حکم پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئے چونکہ تورات عبرانی زبان میں تھی، اس کو ہر آدمی نہیں پڑھ سکتا تھا تو عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: حضور! اس کو فرمائیں یہ ہاتھ اُٹھائے۔ جب اس یہودی عالم نے ہاتھ اُٹھایا تو آیت رجم چمکنے لگی۔ یہ مسئلہ کو چھپانا ہے۔

جیسا کہ ہمارے ملک میں جب عورتوں کے زبردست احتجاجات ہوئے، انہوں نے مردوں کے ساتھ مساوات کے نعرے بلند کیے تو اس دور میں بھی کچھ ایسے لوگ تھے جنہوں نے اللہ کے قرآن کو بدل کر کہا کہ کوئی مرد چار

شادیاں نہیں کرسکتا۔ کیونکہ جب اللہ تعالیٰ نے کہہ دیا کہ تم جتنا بھی زور لگاؤ، بیویوں میں عدل نہیں کرسکتے۔ اس لیے چار شادیاں نہیں کرسکتے۔

دوسرا مسئلہ یہ نکالا کہ اگر دوسری شادی کرنی ہے تو پہلی بیوی سے اجازت لو، کیونکہ دوسری بیوی کی زندگی اس پہلی بیوی کے ساتھ ہی گزرنی ہے۔ اگر وہ اجازت نہ دے تو آپ دوسری شادی نہیں کرسکتے۔ اس طرح لوگوں کو خوش کردیا کہ بعض اوقات اولاد نہیں ہوتی تو پہلی بیوی دوسری شادی کی اجازت دے دیتی ہے یا پہلی بیوی اتنی بیمار ہوجاتی ہے کہ خاوند کے حقوقِ زوجیت ادا کرنے سے قاصر ہے تو اجازت دے دیتی ہے۔ اس کو انہوں نے اسلامی قوانین کے نام سے نافذ کیا۔ اس سے بڑا دکھ ہوتا ہے کہ آدمی کفر کی بات کرے اور اس پر اسلام کا پردہ ڈالے اور اللہ تعالیٰ کے قرآن کو بدل دے۔ حضور اکرم ﷺ پر قرآن نازل ہوا، آپ ﷺ نے ایک سے زیادہ شادیاں کیں اور کسی حدیث میں یہ نہیں آتا کہ آپ ﷺ نے پہلی بیوی سے اجازت لے کر دوسری شادی کی ہو۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی ایک سے زائد شادیاں کیں، کسی صحابی سے یہ بات ثابت نہیں کہ اس نے پہلی بیوی سے اجازت لی ہو۔ قرآن کے اندر تو اللہ تعالیٰ نے تنبیہ فرمائی تھی کہ اگر دو شادیاں کرنی ہیں تو عدل کرو۔ لباس، خرچ، رہائش اور وقت میں عدل کرو، سب کے برابر حقوق ادا کرو۔ باقی دل کا معاملہ ہے کہ کسی طرف میلان زیادہ ہوتا ہے تو تم اس میں نہیں پکڑے جاؤ گے، جیسا کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اے اللہ! میں عدل کرتا ہوں جو میرے بس میں ہے اور جو میرے بس میں نہیں ہے اس کا میں عدل نہیں کرسکتا۔

اطاعتِ رسول میں تمام مشکلات کا حل:

آپ ایک اُصولی بات سمجھ لیں تو ساری مشکلات حل ہوجائیں گی کہ اگر ہم نے قرآن کو اپنے عقل سے سمجھنا ہوتا تو اللہ تعالیٰ حضور اکرم ﷺ کو نہ بھیجتے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جس نے میرے نبی ﷺ کی اطاعت کی اس نے میری اتباع کی اور جو آپ ﷺ کی زبان سے لفظ نکلے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وہ اُمت کے لئے قانون ہے، آپ ﷺ کا ہر قول، فعل اور عمل قانون ہے اور اسی طرح دوسرے آدمی نے حضور پاک ﷺ کے سامنے کوئی کام کیا، آپ ﷺ نے منع نہ فرمایا تو وہ بھی قانون ہے، کیونکہ اگر وہ کام غلط ہوتا تو اللہ کے نبی ﷺ اسے ضرور روک دیتے۔

منصوبہ بندی کا حکم:

ایک ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے کہ منصوبہ بندی یعنی بچوں کی پیدائش کو روکنا ٹھیک ہے، کیونکہ بخاری شریف میں

ہے کہ حضور اکرم ﷺ کے زمانہ میں یہ چیز موجود تھی اور آپ ﷺ نے منع نہیں فرمایا کیونکہ صحابہ کہتے ہیں: ہم عزل کیا کرتے تھے حضور اکرم ﷺ کا زمانہ تھا، اس سے اشارہ ہوا کہ اگر یہ چیز منع ہوتی تو آپ ﷺ روک دیتے۔ (عزل کہتے ہیں میاں بیوی ملیں، آخری وقت میں پانی باہر ضائع کر دیا جائے، تاکہ حمل نہ ٹھہرے)۔ ڈاکٹر صاحب نے لکھا کہ اب اس کی جدید شکل یہ ہے کہ عورت سے اندر ٹیوب رکھ دیتے ہیں یا مردوں کے لیے کچھ چیزیں بنائی ہیں، مقصد وہی عزل ہے۔ لہٰذا یہ ٹھیک ہے۔ اس ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے کہ امام شافعی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ:
﴿ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَلَّا تَعُوْلُوْا﴾ [النساء: ۳] اگر تم زیادہ بچے نہیں پیدا کرنا چاہتے تو ایک شادی کرو۔

اب جب ایک غریب آدمی اخبار یا کسی کتاب کے اندر یہ مضمون پڑھے تو اس بے چارے کو کیا پتہ کہ بخاری شریف کی اس حدیث کا کیا مطلب ہے؟ اور یہ عزل آزاد عورتوں سے تھا یا باندیوں سے تھا؟ ایک خاص ضرورت کے تابع تھا یا مطلق اجازت تھی؟ یہ کسی کو پتہ نہیں کہ وہ خاص ضرورت تھی، جس میں صحابہ نے عزل کیا کہ جنگ میں ان کو باندیاں ملیں۔ انہوں نے کہا: اگر ہم نے عزل نہ کیا تو ان کو حمل ٹھہر جائے گا اور پھر ان کو فروخت کرنا چاہیں گے تو قیمت نہیں ملے گی اور اگر ہم فروخت نہ بھی کرنا چاہیں تو پھر ہماری خدمت بھی نہیں کرسکتیں، کیونکہ وہ تو بچے کو سنبھالیں گی۔ دوسرا یہ تھا کہ اگر یہ ہمارے بچے کی ماں بن گئی تو یہ اُمّ ولد ہو جائے گی، اس کو آزاد کرنا ہوگا۔ اس کے علاوہ ایک حدیث مبارک میں عزل سے منع بھی آیا ہے، حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: خبردار! جو نطفہ اللہ تعالیٰ نے مقدر کیا ہے وہ پیدا ہو کر رہے گا۔ لہٰذا جب حضور پاک ﷺ سے نہی آگئی تو مسئلہ ہی ختم ہوگیا۔ اب سابقہ حدیث کا حوالہ دے کر مسلمانوں کو گمراہ کرنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی یہ حدیث بیان کرے کہ سیدنا حمزہ رضی اللہ عنہ شراب پی کر نشہ کی حالت میں بیٹھے ہوئے تھے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اونٹنیاں کاٹ ڈالیں۔ یہ واقعہ بالکل ٹھیک ہے اور حدیث میں موجود ہے، لیکن یہ اس زمانہ کی بات ہے جب شراب حرام نہیں ہوئی تھی۔ اسی طرح کوئی آدمی یہ حدیث سنا دے کہ جب صحابہ رضی اللہ عنہم مدینہ منورہ آئے تو کسی کے گھر میں دس بیویاں تھیں اور کسی کے گھر میں آٹھ بیویاں تھیں اور کہے کہ چار سے زیادہ شادیاں جائز ہیں۔ حالانکہ یہ اس وقت تھا جب چار سے زیادہ شادیوں کو منع نہیں کیا گیا تھا۔ جب منع ہوگیا تو حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: جتنی عورتیں تمہارے گھروں میں ہیں، ان میں سے چار رکھ لو، باقیوں کو طلاق دے دو۔ ڈاکٹر صاحب نے جو امام شافعی رحمہ اللہ کا حوالہ دیا ہے، ساری دنیا کی کتابوں میں دیکھ لیں، وہ روایت شاذ ہے، تمام دنیا نے اور امام شافعی رحمہ اللہ کے شاگردوں نے اس کا رد کیا ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: عزل کرنا وَأْد

خفی ہے، یہ بھی گویا ایک قتل کی صورت ہے۔ فرق اتنا ہے کہ درگور روح کے آنے کے بعد کرتے ہیں اور یہاں روح والی اسٹیج آنے سے پہلے درگور کر رہے ہیں۔

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ایسی عورتوں سے شادی کیا کرو جن سے زیادہ بچے پیدا ہوتے ہوں، تاکہ قیامت والے دن میں اپنی اُمت کی کثرت پر فخر کر سکوں۔ اب کوئی آدمی ان ساری احادیث کو چھوڑ کر اللہ کے دین کو بدلے تو اس سے بڑا ملعون اور کون ہو سکتا ہے؟

جو شخص دین کو بدلتا ہے وہ حق چھپانے سے بھی بڑا مجرم ہے کہ اس نے حرام کو حلال کر دیا یا حلال کو حرام کر دیا۔ یہ تو کفر کی حدوں کو پہنچ جاتا ہے۔ حق کو چھپانا دو وجہ سے ہوتا ہے: ایک لالچ کی وجہ سے حق کو چھپانا یا ڈر کی وجہ سے کہ مجھے نقصان ہوگا۔ کسی حال میں بھی حق کو چھپانا جائز نہیں۔ ایسا کرنا بڑا گناہ ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور بہت سارے صحابہ رضی اللہ عنہم سے منقول ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"مَنْ سُئِلَ عَنْ عِلْمٍ عَلِمَهُ ثُمَّ كَتَمَهُ أُلْجِمَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ بِلِجَامٍ مِنْ نَارٍ." [جامع ترمذی، رقم: ۲۶۴۹]

اگر کسی شخص سے کوئی مسئلہ پوچھا گیا اور وہ اس مسئلہ کا علم رکھتا تھا، لیکن اس نے جاننے کے بعد حق کو چھپا دیا تو ایسے آدمی کو قیامت والے دن جہنم کی آگ کی لگام دی جائے گی۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں آتا ہے کہ وہ فرماتے تھے: اگر اللہ تعالیٰ کے قرآن میں یہ آیت مبارکہ نازل نہ ہوتی تو میں کسی کو حدیث نہ سناتا۔ (اس لیے جو حدیث سنی ہے وہ لوگوں تک پہنچاتا ہوں)، وہ آیت یہ تھی: ﴿إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالْهُدٰى مِنْ بَعْدِ مَا بَيَّنّٰهُ لِلنَّاسِ﴾ [البقرۃ: ۱۵۹]

قبر کا عذاب:

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ ہم ایک جنازے میں حضور اکرم ﷺ کے ساتھ تھے، حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:

"إِنَّ الْكَافِرَ يُضْرَبُ ضَرْبَةً بَيْنَ عَيْنَيْهِ، يَسْمَعُهَا كُلُّ دَابَّةٍ غَيْرُ الثَّقَلَيْنِ، فَتَلْعَنُهُ كُلُّ دَابَّةٍ سَمِعَتْ صَوْتَهُ." [تفسیر ابن کثیر: ۲/۴۴۱]

کافر جب مر کر قبر میں جاتا ہے تو اس کو اللہ تعالیٰ کے فرشتے ایک ایسی ضرب مارتے ہیں جو دونوں آنکھوں کے

درمیان ماری جاتی ہے، اس کو مارنے کی آواز ہر جانور سن لیتا ہے، مگر انسان اور جن نہیں سن سکتے۔ ہر جانور جو اس کی آواز سنتا ہے اس پر لعنت کرتا ہے۔

حضور اکرم ﷺ کچھ قبروں کے پاس سے گزرے، ایک کو غیبت کی وجہ سے، دوسرے کو پیشاب سے نہ بچنے کی وجہ سے اور تیسرے کو چغل خوری کی وجہ سے قبر کا عذاب ہو رہا تھا۔

[شعب الایمان، رقم: ۱۱۱۰۰]

اللہ تعالیٰ نے اس سے استثناء کیا کہ وہ لوگ بچ جائیں گے جو پہلے کتمان کرتے تھے بعد میں انہوں نے اس سے توبہ کر لی اور اپنے اعمال اچھے کر لیے اور لوگوں کو اپنے پہلے اعمال سے آگاہ کر دیا جس کو وہ چھپاتے تھے ان توبہ کرنے والوں پر اللہ تعالیٰ مہربانی کر کے توبہ قبول کرتے ہیں۔ اس آیت میں یہ مسئلہ بھی سمجھ آگیا کہ اگر کوئی آدمی کفر یا بدعت کی طرف بلانے والا ہے، لیکن پھر اس نے توبہ کر لی تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ بھی منظور فرما لیتے ہیں۔

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: پہلی اُمتیں جو گزری ہیں، ان میں ایسے لوگوں کی توبہ قبول نہیں ہوتی تھی۔ یہ حضور اکرم ﷺ کی برکت ہے، چونکہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے رحمۃ للعالمین، نبی التوبہ اور نبی الرحمۃ بنا کر بھیجا، اس کی وجہ سے ہم پر یہ رحمت ہے کہ اگر ہم سچے دل سے توبہ کریں تو ہماری توبہ قبول ہو جاتی ہے۔

کفار پر لعنت بھیجنے کا حکم:

جن لوگوں نے کفر کیا اور اسی کفر پر جمے رہے، یہاں تک کہ موت آگئی تو وہ قیامت تک لعنت میں رہیں گے اور پھر جہنم میں ڈالے جائیں گے اور وہ لعنت ان کے ساتھ ہوگی، نہ ان کا عذاب گھٹے گا اور نہ ان کو مہلت ملے گی۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ایسے عذاب سے بچائیں۔

حضرت ابو العالیہ رحمہ اللہ اور حضرت قتادہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: جو کفر کی دعوت دینے والے ہیں، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ان کو کھڑا کریں گے، اللہ تعالیٰ ان پر لعنت بھیجیں گے، پھر ملائکہ لعنت بھیجیں گے، پھر سارے لوگ بھی لعنت بھیجیں گے۔

کافروں پر لعنت کرنے میں کوئی اختلاف نہیں ہے کیونکہ دعائے قنوت نازلہ میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مطلقاً کافروں پر لعنت کرتے تھے۔ یہ مسئلہ ہے کہ کسی معین کافر پر لعنت کرنا جائز ہے یا نہیں؟ تو بعض علماء نے منع کیا ہے، کیونکہ

ہمیں معلوم نہیں، شاید اللہ تعالیٰ اس کو مرنے سے پہلے مسلمان کردے اور بعض علماء نے فرمایا کہ معین کافر پر لعنت کرنا جائز ہے۔ اس قول کو فقیہ ابوبکر ابن العربی المالکی رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے۔ انہوں نے بعض احادیث سے استدلال کیا ہے۔ مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: وہ احادیث ضعیف ہیں۔

ایک شرابی کو لایا گیا اور اس پر حد جاری کی گئی تو ایک آدمی نے کہا: ''أَللّٰهُمَّ الْعَنْهُ'' یعنی یہ کتنا لعنتی ہے کہ بار بار کوڑے کھاتا ہے، لیکن شراب نہیں چھوڑتا۔ اے اللہ! اس پر لعنت فرما۔ تو حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:

''لَا تَلْعَنْهُ فَإِنَّهُ يُحِبُّ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهُ.'' [مسند البزار، رقم:۲۶۹/ مصنف عبدالرزاق، رقم:۱۷۰۸۲]

لعنت نہ کرو، کیونکہ بہر حال یہ مسلمان ہے، اللہ تعالیٰ اور اللہ کے رسول ﷺ کو محبوب رکھتا ہے۔ غلطی کی ہے تو سزا بھگت رہا ہے۔ اس سے علماء اور مفسرین نے استدلال کیا ہے کہ جو اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کو محبوب رکھنے والا ہو، اس پر لعنت کرنا جائز نہیں۔

بعض احادیث مبارکہ میں آیا ہے گو وہ احادیث ضعیف بھی ہیں، لیکن کثرت طرق کی وجہ سے ایک دوسرے کو طاقت دیتی ہیں کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:

''إِذَا رَأَيْتُمُ الَّذِيْنَ يَسُبُّوْنَ أَصْحَابِي فَقُوْلُوا: لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى شَرِّكُمْ.'' [جامع ترمذی، رقم:۳۸۶۶]

جب تم ان لوگوں کو دیکھو جو میرے صحابہ کو گالیاں دیتے ہیں تو کہو: تمہارے شر پر اللہ کی لعنت ہو۔

﴿وَإِلٰهُكُمْ إِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ لَآ إِلٰهَ إِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۶۳﴾ إِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِيْ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ أَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ ۖ وَّتَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَآءِ وَالْأَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴿۱۶۴﴾﴾ [البقرۃ:۱۶۳، ۱۶۴]

''تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے، کوئی معبود نہیں سوائے اس کے وہ بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے۔ آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں اور رات دن کے آنے جانے میں اور دریاؤں (اور سمندروں) میں چلنے والی کشتیوں میں جو لوگوں کو نفع پہنچاتی ہیں اور جو اللہ نے آسمان سے پانی اُتارا پھر اس سے زمین کو زندگی دی اس کے بنجر ہو جانے کے بعد اور اس میں طرح طرح کے جانور پھیلائے اور ہواؤں کے پھیرنے میں اور بادل میں جو آسمان اور زمین کے درمیان مسخر ہے (ان میں) تدبر کرنے والی قوم کے لیے (اللہ کی توحید کی) نشانیاں ہیں۔''

آیت کا شانِ نزول:

ابن ابی حاتم رحمہ اللہ کی روایت میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے میرے نبی! یہ لوگ جو مطالبہ کرتے ہیں کہ صفا کو سونے کا پہاڑ بنا دیں۔ یہ اس سے بڑی بڑی نشانیاں دیکھ چکے ہیں، ان کو نہیں مانے تو اس کو کیسے مانیں گے؟ ابن ابی حاتم رحمہ اللہ کی روایت میں ہے کہ جب حضور اکرم ﷺ پر یہ آیت مبارکہ اُتری: ﴿وَإِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ ۖ لَّا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ الرَّحْمَٰنُ الرَّحِيمُ ﴿١٦٣﴾﴾ تو کفار قریش کہنے لگے: یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک الٰہ سارے کام کرے؟ (کوئی بچہ مانگ رہا ہے، کوئی روٹی مانگ رہا ہے، کوئی پیسے مانگ رہا ہے، کوئی شفاء مانگ رہا ہے)۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ بہت سارے خدا ہوں اور کام تقسیم ہوں۔ جیسا کہ ہمارے علاقہ میں بھی لوگوں نے کام تقسیم کر رکھے ہیں، اگر جانور بیمار ہوں تو ایک پیر کی قبر پر لے جائیں گے، اگر جنات ہوں تو دوسرے پیر کی قبر پر لے جائیں گے، بچے نہ ملتے ہوں تو تیسرے پیر کی قبر پر لے جائیں گے اور جس کی شادی نہ ہوتی ہو وہ ایک اور پیر صاحب کی قبر پر جاتا ہے۔ کفار قریش اس لئے کہتے تھے کہ ایک خدا سارے کام کیسے کر سکتا ہے؟ اس لئے انہوں نے تین سو ساٹھ بت رکھے ہوئے تھے، ہر قبیلے کا اپنا خدا تھا۔ اس جہالت کی وجہ یہ ہے کہ وہ خدا کو اپنے اوپر قیاس کرتے تھے کہ جب ایک بندہ بادشاہ بن جائے تو اکیلا کام نہیں کر سکتا، بلکہ وہ وزیروں، مشیروں اور بیوروکریسی کا محتاج ہوتا ہے تو انہوں نے سمجھ لیا کہ خدا کو بھی اسی طرح دوسروں کی ضرورت پڑتی ہے، یہ نہ سوچا کہ مخلوق ناقص ہے اور اللہ کی ذات کامل ہے، اس کو ان کی کیا ضرورت ہے، ﴿إِنَّمَا أَمْرُهُ إِذَا أَرَادَ شَيْئًا أَن يَقُولَ لَهُ كُن فَيَكُونُ ﴿٨٢﴾﴾ [یٰسین: ۸۲] جب اللہ تعالیٰ کے ارادہ میں کسی کام کا ہونا ہوتا ہے تو بس اس کو حکم ہوتا ہے کہ ہو جا تو ﴿فَيَكُونُ﴾ وہ ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اللہ کو

وزیروں، مشیروں کی کوئی ضرورت نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں ارشاد فرمایا کہ یہ جاہل لوگ اپنے اپنے اندازے لگاتے ہیں کہ ایک خدا کیسے کرے گا۔ یہ غور کریں کہ اس سارے نظام کو کون چلا رہا ہے؟ آسمانوں کو، زمینوں کو کس نے پیدا کیا؟ رات و دن کے اختلافات کس نے بنائے؟ تو جو خدا ان پر قادر ہے وہ باقی کاموں پر بھی قادر ہے۔

کچھ بنیادی عقائد اور مسائل:

عقائد میں تین مسائل اہم ہیں: 1 توحید 2 نبوت و رسالت 3 معاد۔ توحید کی متعدد اقسام ہیں: توحید رُبوبیت، توحید اُلوہیت، توحید فی الاسماء والصفات۔ ان سب اقسام میں اہم توحید اُلوہیت ہے، ویسے تو ساری اقسام اہم ہیں۔ توحید ربوبیت یہ ہے کہ ہمیں پیدا کرنے والا، روزی دینے والا، آسمانوں زمینوں کو پیدا کرنے والا، بارشیں اُتارنے والا، کھیتیاں اُگانے والا اللہ تعالیٰ ہے۔ وہی الٰہ ہے اور وہی عبادت کا مستحق ہے، اس کے سوا کسی کی عبادت جائز نہیں۔ جب تک توحید کا یہ مقام حاصل نہیں ہوگا اس وقت تک عقیدہ ٹھیک نہیں ہوگا۔ ہم نماز اللہ تعالیٰ کے لئے پڑھتے ہیں، رکوع و سجود اللہ کے لئے کرتے ہیں، صرف نماز پڑھنے کا نام توحید نہیں ہے، بلکہ توحید یہ ہے کہ صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت کرے غیر کی عبادت نہ کرے، اللہ کو سجدہ کرے غیر کو سجدہ نہ کرے، اللہ تعالیٰ کے آگے جھکے غیر کے آگے نہ جھکے، اللہ سے مانگے غیر سے نہ مانگے، اللہ کے گھر کا طواف کرے کسی غیر کے گھر کا طواف نہ کرے، اللہ کے نام کی منت مانے کسی غیر کی منت نہ مانے، اللہ کے نام کی نذر دے کسی غیر کی نذر نہ دے، اللہ کے نام پر قربانی کرے کسی غیر کے نام پر قربانی نہ کرے، اللہ کے سوا سب کی نفی کرنی ہوگی، تب جا کر توحید بنے گی۔ یہ نہیں کہ اللہ کو بھی سجدہ کر لیا اور قبر پر بھی سجدہ کر لیا۔ یہ توحید نہیں ہے، اللہ کو بھی پکارے اور اللہ کے علاوہ کسی نبی یا ولی کو بھی پکارے تو اس نے پکارنے میں غیر کو شریک کر لیا۔

ہر مسلمان کے لئے لازم ہے کہ اس کا عقیدہ صحیح اور اس طرح ہو جیسے حضور اکرم ﷺ نے سکھایا اور بتایا ہے۔ فضائل، اعمال اور دوسرے مسائل میں کچھ وسعت اور تسامح بھی ہوتا ہے، لیکن عقیدہ کا مسئلہ بڑا سخت اور شدید ہے۔ ہماری بنیاد کلمہ طیبہ پر ہے، جب اس کو پڑھا تو صدقِ دل سے اعتراف کیا کہ "لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ"، اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد پاک ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔ جب تک آدمی کا اس پر ایمان نہ ہو تو وہ

مسلمان نہیں کہلا سکتا۔ جب معبودِ برحق اللہ تعالیٰ ہے تو عبادت صرف اسی کی ہوگی۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اسلام کی پہلی بنیاد ''شَهَادَةُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ'' ہے اور فرمایا: ''مَنْ كَانَ آخِرُ كَلَامِهٖ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ دَخَلَ الْجَنَّةَ'' جس کا خاتمہ اس عقیدہ پر ہوگا وہی جنت میں داخل ہوگا۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: جس شخص نے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا اقرار کیا، پھر اس نے کسی چیز کو اللہ کا شریک نہیں بنایا، نہ اللہ تعالیٰ کی ذات میں اور نہ اللہ تعالیٰ کی صفات خاصہ میں کسی کو شریک بنایا اور اسی حال پر اس کو موت آ گئی تو اللہ تبارک وتعالیٰ اس پر جہنم کی آگ کو حرام کر دیتے ہیں۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: جس شخص کو اس بات پر موت آ گئی کہ اس نے اللہ کے ساتھ شرک کیا، اللہ تعالیٰ اس پر جنت میں داخل ہونے کو حرام کر دیتے ہیں۔ اور عقیدہ اللہ کے قرآن سے ثابت ہوگا، قصے، کہانیوں اور قیاسات سے ثابت نہیں ہوتا۔ عقیدے کے لیے تو اللہ تعالیٰ نے ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیائے کرام علیہم السلام کو بھیجا ہے۔

اور لڑکے دینے والے مسئلے کو قرآن نے کھول کر بیان کیا کہ ﴿يَهَبُ لِمَنْ يَّشَآءُ إِنَاثًا وَّيَهَبُ لِمَنْ يَّشَآءُ الذُّكُوْرَ ۝﴾ [الشوریٰ: ۴۹] جسے ہم چاہتے ہیں اس کو لڑکے دیتے ہیں اور جس کو چاہتے ہیں لڑکیاں دیتے ہیں اور جس کو چاہتے ہیں جوڑا یعنی لڑکے بھی دیتے ہیں اور لڑکیاں بھی دیتے ہیں اور جس کو چاہتے ہیں عقیم بنا دیتے ہیں، نہ لڑکی دیتے ہیں اور نہ لڑکا دیتے ہیں۔ لیکن ہم کلمہ پڑھ کر مسلمان بھی کہلائیں اور ہمارا عقیدہ یہ ہو کہ لڑکا ہمارے پیر نے دیا ہے۔ ہم نے اسلام کے بارے میں صرف تصور بنا لیا ہے کہ ہم مسجدیں، مدرسے بنوا رہے ہیں، ہماری مسواک ایسی ہونی چاہیے، چادر پنڈلیوں پر باندھتے ہیں، ہم کوشش کرتے ہیں کہ ہماری پگڑی بھی حضور اکرم ﷺ کی طرح ہو، ہم تو قدم قدم پر حضور اکرم ﷺ کے عاشق اور غلام ہیں۔ لیکن جس ملک میں کفر کا نظام چل رہا ہو اور وہاں آپ صرف ان باتوں پر توجہ دیں اور جس کام کے لئے حضور اکرم ﷺ آئے تھے، اس کے لیے آپ نے کبھی ایک کانٹا بھی برداشت نہ کیا ہو تو کیا قیامت میں اللہ تعالیٰ کو یہی جواب دیں گے کہ نمازیں پڑھتے تھے؟ اگر ہم سے پوچھا جائے کہ آپ کی بیوی نماز پڑھتی تھی؟ تو جواب دیں کہ ہم نے کہا تو تھا، لیکن وہ بات نہیں مانتی تھی۔ تمہارے بچے جن رہی ہے، وہ بات مانتی ہے، لیکن نماز والی بات نہیں مانتی، یہ کیسا جھوٹ اور مکر ہے؟ اللہ کے ساتھ فریب کر رہے ہیں، اگر تیری بیوی کو یہ پتہ ہو کہ میں نے اگر نماز نہ پڑھی تو خاوند کے ساتھ میرا آخری دن ہوگا تو مجال ہے کہ وہ نماز

نہ پڑھے۔ تم اپنے چھ، سات سال کے بچے کو مسجد میں لے آؤ اور اس کو دکھاؤ کہ لوگ کیسے نماز پڑھ رہے ہیں؟ تو بڑا ہو کر کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ نماز نہ پڑھے؟ بعض لوگوں کے نزدیک تو اسلام صرف چند عبادات کا نام ہے اور کہتے ہیں کہ نماز پڑھنا ہر آدمی کا ذاتی معاملہ ہے، کوئی نماز پڑھتا ہے تو پڑھ لے، نہیں پڑھتا تو نہ پڑھے۔ اس طرح تو یورپ میں بھی آپ کو اجازت ہے، وہاں مسجد بنائیں، جماعت کے ساتھ نماز پڑھائیں، جمعہ پڑھائیں، کوئی منع نہیں کرتا۔ آج ہمیں کیا ہو گیا کہ نہ عقیدہ میں پکے رہے، نہ اعمال کے اعتبار سے پکے مسلمان بنے اور اتباعِ رسول میں بھی کسی حد تک ہم مسلمان بنے ہیں، بس روایتی مسلمان ہیں کہ مسلمان کے گھر کے اندر پیدا ہو گئے، دکھاوے کے مسلمان ہیں۔ کوئی نماز پڑھتا ہے اس لئے مسلمان ہے کوئی آدمی سال میں مکہ شریف ہو آتا ہے اس لئے مسلمان ہے اور کسی کے دماغ میں یہ ہے کہ سال میں جو مرضی آئے کرو، رمضان شریف مکہ میں گزار لو تو یوں سمجھ لو کہ گنگا نہا کر آ گئے۔ بڑے بڑے سود خور رمضان شریف میں باقاعدگی کے ساتھ مکہ میں آتے ہیں۔ اللہ کا کرم اور شکر ہے، سبحان اللہ! رمضان شریف کا روزہ اللہ کعبہ میں نصیب کر دیتا ہے۔ حالانکہ اس کا پیسہ حرام کا ہوتا ہے، کھانا حرام کا ہوتا ہے تو کس بات کی خوشی ہے کہ میرے گناہ بخشے جائیں گے۔ اگر ہم ٹھیک ہوتے تو آپ کا کیا خیال ہے کہ حج پر بیس لاکھ آدمی اکٹھا ہو، رمضان میں اکٹھا ہو، تہجد کا وقت ہو اور رو رو کر دعائیں مانگیں، لیکن ایک دعا بھی منظور نہ ہو؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے اسلام کا نام لے کر اسلام کو بدنام کیا ہے، اللہ تعالیٰ ہم سے ناراض ہیں۔ کبھی کبھی تھوڑی رحمت آ جاتی ہے، وہ بھی جانوروں، کیڑے مکوڑوں کی وجہ سے آ جاتی ہے یا کسی اور مخلوق کی وجہ سے آ جاتی ہے۔

برنارڈ شاہ بڑا رائٹر گزرا ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ میں جب قرآن پڑھتا ہوں تو اس سے اعلیٰ کتاب کوئی نہیں پاتا، لیکن جب ان مسلمانوں کو دیکھتا ہوں تو ان جیسی ذلیل قوم میں نے نہیں دیکھی۔ اخبارات میں لکھا آتا ہے کہ یہ یہودیوں کے ایجنٹ ہیں، یہ ہندوؤں کے ایجنٹ ہیں، یہ فلاں کام کرا رہا ہے۔ آخر وہ کن سے کروا رہے ہیں اور کن کو خریدتے ہیں؟ انہی کلمہ پڑھنے والوں کو خرید کر کے مسجدوں میں گولیاں چلواتے ہیں۔ مسلمان بکتا ہے چاہے خریدار ہندو ہو یا یہودی ہو۔ اللہ تعالیٰ رحمت فرمائے اور ہمیں صحیح معنوں میں مسلمان بنا دے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے عقائد و اعمال درست فرما دیں اور ہمیں ہمت و قوت دیں کہ قرآن کو قرآن سمجھیں، صرف برکت اور تعویذوں کی کتاب نہ سمجھیں، بلکہ قرآن جو حکم دے، اس کی تعمیل کریں۔

علاجِ قرآنی:

اس لیے اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ہمیں پہلا سبق دیا کہ یہ عقیدہ رکھو کہ ﴿وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ﴾ تم سب کا معبود برحق ایک ہے، اس کا کوئی شریک نہیں اور کہیں فرمایا: ﴿قُلْ هُوَاللّٰهُ اَحَدٌ ۝١﴾ اور حضور اکرم ﷺ نے دعا سکھائی: ''اَللّٰهُمَّ أَنْتَ رَبِّیْ أَنْتَ الْأَحَدُ الصَّمَدُ الَّذِیْ لَمْ یَلِدْ وَ لَمْ یُوْلَدْ'' کہ کوئی معبود برحق نہیں، مگر اللہ۔ لہٰذا اگر اللہ کے علاوہ کوئی معبود ہے تو وہ باطل ہے۔ جب معبود برحق اللہ ہے تو عبادت بھی اسی کی ہوگی۔ اس لئے ہم روزانہ پڑھتے ہیں: ﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۝٤﴾ صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔ قرآن میں دوسری جگہ آیا: ﴿وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا﴾ [النساء: ٣٦] اسی کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے میرے نبی! آپ ان کو کھل کر کہہ دیں: ﴿يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ ۝١ لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ ۝٢﴾ [الکافرون: ۱، ۲] عبادت کے لائق اللہ ہے، اس لئے کہ اسی نے ہمیں پیدا کیا ہے، جو خالق ہے، مالک ہے، ساری کائنات کا تصرف اسی کے ہاتھ میں ہے، پیدا کرنے والا، مارنے والا بھی وہی ہے، لہٰذا عبادت کا مستحق بھی وہی ہے۔ اور جن کی تم عبادت کرتے ہو، یہ نہ تو پیدا کرتے ہیں، نہ مالک ہیں اور نہ ان کے ہاتھ کوئی ذرّے کے برابر چیز ہے۔ اس لئے قرآن میں مشرکوں کو چیلنج ہے: ﴿اَرُوْنِيْ مَاذَا خَلَقُوْا مِنَ الْاَرْضِ اَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِي السَّمٰوٰتِ ۚ اَمْ اٰتَيْنٰهُمْ كِتٰبًا فَهُمْ عَلٰي بَيِّنَتٍ مِّنْهُ ۚ بَلْ اِنْ يَّعِدُ الظّٰلِمُوْنَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا اِلَّا غُرُوْرًا ۝٤٠﴾ [فاطر: ٤٠] میرے نبی! ان کافروں سے کہو کہ جن کی تم عبادت کرتے ہو، مجھے بتاؤ تو سہی انہوں نے زمین کا تھوڑا سا ٹکڑا بنایا ہو مجھے دکھاؤ، یا آسمانوں کے بنانے میں ان کی کوئی شرکت ہو تو وہ بتائیں۔ میرے مدنی! جو میرے دروازے کو چھوڑ کر کبھی درختوں کو سجدے کرتے ہیں، کبھی دیوی کو سجدہ، کبھی دیوتا کو سجدہ، کبھی جمنا کو سجدہ، کبھی قبروں کو سجدہ، کبھی دلال کو سجدہ۔ ان سے کہو کیا تمہارے پاس کوئی کتاب ہے؟ کیا اللہ نے کہا ہے کہ ان کو سجدہ کرو؟ یعنی تمہارے پاس کوئی عقلی یا نقلی دلیل ہے تو لے آؤ۔ اصل وجہ یہ ہے کہ یہ ظالم ایک دوسرے کو جھوٹے دھوکے میں مبتلا کئے ہوئے ہیں کہ جب تم بتوں کی پوجا کرو گے، جب تم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا سمجھو گے، جب حضرت عزیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا بناؤ گے، جب تم اولیاء اللہ کو حصہ دار مختار بناؤ گے، جب تم اہل بیت رسول اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو مختار بنالو گے تو یہ اللہ

کے پیارے ہیں، یہ تمہیں وہاں چھڑا لیں گے، اللہ سے کہہ کر تمہارے سارے مسئلے حل کرا دیں گے۔ اس دھوکہ میں یہ مبتلا ہو گئے ہیں، ورنہ میرے پاس کسی مشرک کی سفارش کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ ﴿اِنَّ اللّٰهَ يُمْسِكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ اَنْ تَزُوْلَا ۚ وَلَىِٕنْ زَالَتَاۤ اِنْ اَمْسَكَهُمَا مِنْ اَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِهٖ ؕ اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا ۝﴾ [فاطر: ۴۱] میرے مدنی! ان آسمانوں کو کس نے روکا ہوا ہے کہ بغیر ستون کے کھڑے ہیں؟ ہزاروں سال گزر گئے، آئندہ خدا جانے کتنے گزریں گے؟ کون سی طاقت ہے جس نے آسمانوں کو روکا ہے؟ اور اگر میں ان کو گرانا چاہوں تو کون روک سکتا ہے؟ اور روکنا چاہوں تو کون ہٹا سکتا ہے؟ جب ان کے پلے میں نہ آسمان میں کچھ ہے اور نہ زمین میں کچھ ہے تو پھر یہ میرے شریک کیسے بن گئے؟ جو خود خیرات کا مستحق ہے وہ کیسے خدا بن سکتا ہے؟ اگر خیرات کا مستحق نہیں تو کوئی شراکت تو ثابت کریں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا ۝﴾ میری شان یہ ہے کہ میں حلم والا اور بخشنے والا ہوں، ورنہ اگر میں چاہوں تو ان لوگوں کو ان کے گناہوں کی وجہ سے پکڑ لوں، زمین پر کوئی چیز چلتی ہوئی نظر بھی نہیں آئے گی۔ یہ تو میری رحمت ہے کہ ان کو مہلت دی ہوئی ہے شاید توبہ کر لیں اور بچ جائیں۔ معبود برحق اللہ ہے تو عبادت اسی کی ہوگی۔ سجدہ عبادت ہے، قربانی کرنا عبادت ہے، طواف کرنا عبادت ہے وغیر ذالک تو یہ ساری عبادات اللہ کے لیے ہوں گی، اگر اللہ کے سوا کسی غیر کی ہوگی تو یہ شرک ہے۔

سوچو! دریاؤں کو پیدا کرنے والا اور دریاؤں سے کشتیوں کو چلانے والا کون ہے؟ اگر تم لوہے کا ایک تولہ دریا میں ڈالو تو وہ نیچے چلا جائے گا، لیکن ہزاروں ٹن کی کشتیاں اوپر کھڑی رہتی ہیں، ڈوبتی نہیں ہیں۔ تم تو کہتے ہو کہ فلاں کمپنی اور ان کے آدمیوں نے جہاز بنایا ہے۔ ان بندوں کو کس نے پیدا کیا ہے؟ ہم نے کشتی اس لئے بنائی تاکہ لوگ اس سے نفع اُٹھا سکیں، کشتیاں بھری ہوئی مشرق سے مغرب اور مغرب سے مشرق کی طرف جا رہی ہیں۔ ایسی جگہیں جہاں کوئی سواری نہیں جا سکتی، وہاں تیرے لئے دریاؤں کو مسخر کر دیا ہے، تاکہ تیری تجارت کا ذریعہ بنے۔

اللہ تعالیٰ کا اسم اعظم:

(حدیث) حضرت شہر بن حوشب نے حضرت اسماء بنت یزید بن السکن سے روایت کی ہے کہ حضور پاک ﷺ نے فرمایا:

"اِسْمُ اللّٰهِ الْاَعْظَمُ فِيْ هَاتَيْنِ الْاٰيَتَيْنِ." [سنن ابی داود، رقم: ۱۴۹۶ / جامع ترمذی، رقم: ۳۴۷۸]

اللہ تعالیٰ کا اسم اعظم ان دو آیتوں میں ہے ﴿وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ﴾ [البقرۃ:۱۶۳] اور ﴿الٓمّٓ ۙ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ﴾ [آل عمران:۱،۲]

اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات سے ایک ''اسم اعظم'' ہے، اس کی شان یہ ہے کہ جب اس نام کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے مانگا جائے تو اللہ تبارک وتعالیٰ قبول فرماتے ہیں اور وہ دعا قبول ہوجاتی ہے۔ علماء نے آیاتِ قرآنیہ کو جمع کیا ہے کہ ان میں اسم اعظم کون سا ہے؟ ''الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ'' اسم اعظم ہے۔ اسی طریقہ سے علماء کرام کے اور بھی اقوال ہیں، لیکن زیادہ اقوال اسی لفظ ''اللہ'' کے بارے میں آتے ہیں۔ آدمی کو چاہیے کہ ان آیات مبارکہ کو پڑھ کر اللہ تعالیٰ سے دعا کیا کرے۔

اللہ تعالیٰ کی تخلیق کی عظمت:

﴿وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ﴾

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اُلوہیت اسی کے لئے ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ کا کوئی شریک نہیں۔ اگلی آیت میں اللہ نے اس کی دلیل ذکر فرمائی ہے کہ اس ذات پاک نے آسمانوں کو پیدا کیا، زمینوں کو پیدا کیا اور اس کے اندر جو مخلوق ہے اس کو پھیلایا اور بنایا۔ سب مخلوق پر نظر کریں تو اس کی وحدانیت پر دلالت کرتی ہے کہ وہ وحدہ لاشریک لہ ہے۔ آسمان اور زمین کی دلیل اس لیے دی، کیونکہ ہر وقت ان کے ساتھ انسان کا واسطہ ہے، دوسری بات یہ کہ یہ دونوں عظیم کرّے ہیں، اتنا ان کا طول وعرض ہے کہ آج تک کوئی جان نہیں سکا، کوئی یہ دعویٰ نہیں کرسکا کہ آسمان کتنا بڑا ہے؟ تیسری بات یہ کہ قدرت کی صناعت پر ایک عجیب دلیل اتنا بڑا آسمان ہے اور پھر اس کے اوپر چھ آسمان ہیں، ان میں سے ہر ایک کے درمیان پانچ سو سال کا فاصلہ ہے اور ہر آسمان پر اللہ کی مخلوق ہے اور اللہ تعالیٰ نے ان آسمانوں کو بغیر ستونوں کے روکا ہوا ہے، یہ اس کے کمال قدرت کی دلیل ہے۔ دنیا میں جو لوگ سورج کے پجاری ہیں، وہ بھی یہ نہیں کہتے کہ سورج نے آسمان وزمین بنایا۔ وہ یہ تو کہتے ہیں کہ آسمان وزمین میں جو تصرف ہے وہ سورج، چاند اور تاروں کی وجہ سے ہے، لیکن دنیا میں کوئی ایسا احمق پیدا نہیں ہوا جو یہ کہے کہ سورج نے آسمان و زمین بنائے ہیں یا ان تاروں نے آسمان وزمین بنائے ہیں۔ اسی طرح جن لوگوں نے انبیاء کو خدا کا درجہ دے دیا ہے، وہ یہ نہیں کہہ سکتے کہ آسمان وزمین انہوں نے بنائے ہیں۔ آج بھی اگر آپ دنیا میں دیکھیں جو لوگ شخصیت

پرستی کے بت میں مبتلا ہیں، زندہ، مردہ لوگوں کو خدا کا مقام دیئے ہوئے ہیں، ان کو بھی یہ دعویٰ کرنے کی ہمت نہیں ہوسکی کہ فلاں آسمان کا ٹکڑا فلاں شخصیت نے بنایا ہے، فلاں آسمان کا ٹکڑا فلاں شخصیت نے بنایا ہے۔ یہ کوئی دعویٰ نہیں کرتا، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے کئی مقامات پر فرمایا ہے: ﴿ءَأَنْتُمْ تَخْلُقُوْنَهٗۤ اَمْ نَحْنُ الْخٰلِقُوْنَ﴾ [الواقعہ:٥٩] کیا ان چیزوں کو تم نے پیدا کیا ہے یا ہم پیدا کرنے والے ہیں؟ ﴿وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ﴾ [الزمر:٣٨] دونوں اتنی بڑی دلیلیں ہیں جن کا کوئی مشرک اور کافر بھی انکار نہیں کرسکتا، مگر کوئی معاند، جاہل ہو جو کہے میں نہ مانوں تو اس کا کوئی علاج نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں فرمایا کہ تم آسمانوں کی بلندی پر نظر ڈالو، آسمانوں کی لطافت پر نظر ڈالو، آسمانوں کی وسعت پر نظر ڈالو، ان موجود سیارات اور ستاروں پر نظر ڈالو۔ بعض سیارات چلنے والے ہیں اور بعض ایک مقام پر کھڑے ہیں، پھر زمین کی کثافت وغلظت پر نظر ڈالو، زمین میں پہاڑوں پر نظر ڈالو، زمین میں دریاؤں پر نظر ڈالو، اس کے جنگلوں پر نظر ڈالو، زمین کے بچھانے پر نظر ڈالو، زمین کے اندر جو تعمیرات کی ہیں ان پر نظر ڈالو، زمین میں جو منافع ہیں ان پر نظر ڈالو، ہر چیز دلالت کر رہی ہے کہ وہی وحدہ لاشریک لہ ہے، ہر چیز اپنے حال میں با کمال ہے اور اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ وحدہ لاشریک لہ ہیں۔ ان میں سے بعض فلاسفر آسمانوں کا انکار کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ دور سے جو نظر آتا ہے ایک نیلگوں سی چیز ہے ایک خلا ہے جو دور ہونے کی وجہ سے ایسے نظر آتا ہے، ورنہ آسمانوں کا کوئی وجود نہیں ہے۔ یاد رکھیں! جب آسمانوں کا انکار ہوگا تو اس پر جو مخلوق ہے اس کا خود بخود انکار ہوگا اور کرسی کے انکار سے عرش کا انکار ہوجائے گا اور عرش کے انکار سے اللہ کا انکار ہوجائے گا۔ جدید فلاسفر کہتے ہیں کہ آسمان ہیں، لیکن ہمیں نظر نہیں آتے۔

﴿وَّاَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ﴾ وہ کون ہے جس نے فضاء میں سے پانی اُتارا، جس طرح زمین پر پانی ہے اسی طرح فضا میں بھی پانی ہے۔ پانی ثقیل چیز ہے، اس کا تقاضا تو ہے کہ نیچے گرے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: دیکھو! اس کو کس نے تھام رکھا ہے؟ تمہارے سر سے بادل گزرتے ہیں، تم اگر چاہو تو ان سے پانی کا ایک گلاس بھی نہیں بھر سکتے۔ تم تو کہتے ہو کہ زمین کے اندر حرارت بڑھی اور بارش ہوئی تو اس زمین کو کس نے پیدا کیا ہے؟ ﴿فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا﴾ پھر ہم زمین کو اس کے بنجر ہونے کے بعد زندہ کرتے ہیں کہ آسمانوں سے پانی بھیج کر ان کو آباد کیا۔ علماء فرماتے ہیں کہ یوں سمجھو کہ زمین ایک عورت اور آسمان ایک مرد کی حیثیت میں ہے، جیسے اللہ تعالیٰ دو پانیوں سے

اولاد پیدا کرتے ہیں، اسی طرح آسمانوں سے پانی بھیج کر زمینوں سے نباتات اُگاتے ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ زمین کے نیچے سے پانی ختم کر دیں اور اوپر سے پانی نہ برسائیں تو کیا کرو گے؟ جو ملک مصنوعی بارش کرتے ہیں، ان سے پوچھو کہ ایک مربع زمین پر مصنوعی بارش کرنے کے لیے کتنے پیسے خرچ ہوتے ہیں؟ ﴿وَبَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ﴾ اللہ تعالیٰ نے زمین کے اندر چلنے والی چیزیں پیدا کی ہیں، بعض چیزیں توالد وتناسل سے پیدا ہوتی ہیں اور بعض چیزیں مٹی سے پیدا ہو جاتی ہیں ان کے لیے اللہ تعالیٰ نے تولید رکھی ہے، توالد وتناسل نہیں رکھا۔

سائنس اور قرآن کا تقابلی جائزہ:

ان میں سے بعض لوگ آسمانوں کا بالکل انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ صرف چاند، سورج گردش کر رہے ہیں۔ جدید فلاسفہ کہتے ہیں کہ اصل گردش چاند نہیں کرتا، بلکہ زمین آفتاب کے گرد بڑی تیزی کے ساتھ گھوم رہی ہے۔ آپ جو کہتے ہیں کہ چاند گرہن ہو گیا یا سورج گرہن ہو گیا، وہ کہتے ہیں کہ جب زمین چاند اور سورج کے گرد چکر کاٹ رہی ہوتی ہے تو زمین جب اس کے آگے آ جاتی ہے تو اس کی روشنی ختم ہو جاتی ہے۔ اب جدید مفکرین کہتے ہیں کہ زمین بھی گردش کر رہی ہے اور آفتاب بھی گردش کر رہا ہے۔ یہ سب کے سب ان کے خیالات ہیں، توہمات ہیں۔ اصل بات وہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے قرآن میں اُتاری ہے اور ہمارے آقا ﷺ نے فرمائی ہے، آپ ساری تحقیقات کر لیں، لیکن لوٹ کر اسی پر آئیں گے جو حضور اکرم ﷺ نے فرمایا ہے۔

میں جدید معلومات کے بارے میں پڑھ رہا تھا۔ انہوں نے لکھا کہ سورج بوڑھا ہونا شروع ہو گیا ہے، ابھی اس کی عمر تقریباً 2.5 بلین سال باقی ہے، اس کے بعد یہ چالیس لاکھ ٹکڑوں میں بٹ کر ختم ہو جائے گا۔ حالانکہ قرآن نے پہلے بتا دیا ہے کہ سورج پھٹ جائے گا، چاند گر جائے گا، ستارے گر جائیں گے: ﴿إِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ ۝ وَإِذَا النُّجُومُ انْكَدَرَتْ ۝﴾ [التکویر:۱،۲]... ﴿إِذَا السَّمَاءُ انْشَقَّتْ ۝ وَأَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ ۝﴾ [الانشقاق:۱،۲]... ﴿إِذَا السَّمَاءُ انْفَطَرَتْ ۝ وَإِذَا الْكَوَاكِبُ انْتَثَرَتْ ۝﴾ [الانفطار:۱،۲] اللہ تعالیٰ نے جو قرآن میں فرمایا ہے، وہ حق ہے اور جو حضور پاک ﷺ نے فرمایا ہے وہ حق ہے۔ اس کے علاوہ آپ جتنا دماغ دوڑائیں گے، نتیجہ کچھ بھی نہیں نکلے گا۔ صرف توہمات، تخیلات اور اپنی دولت کا ضیاع کر کے وہیں آ جائیں گے جو قرآن نے فرمایا ہے۔ قرآن نے ہمیں اس مسئلے پر نہیں اُلجھایا۔ علماء فرماتے ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کا نظام ہے جو قائم ودائم ہے، ہمارا ایمان ہے اللہ تعالیٰ نے

کئی مقامات پر سماوات کا ذکر فرمایا ہے، ہمارا یہ بھی ایمان ہے کہ آسمانوں کے دروازے ہیں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿فَفَتَحْنَآ اَبْوَابَ السَّمَآءِ بِمَآءٍ مُّنْهَمِرٍ﴾ [القمر:۱۱] کہ جب نوح علیہ السلام کی قوم پر ہم نے عذاب بھیجا تو آسمانوں کے دروازے ہم نے کھول دیئے۔ اسی طرح معراج والی حدیث میں ہے کہ حضور اکرم ﷺ کے لیے ہر آسمان پر دروازہ کھلا اور آپ ﷺ اوپر تشریف لے گئے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ چاند، سورج اور تارے اپنے اپنے مدار میں گردش کر رہے ہیں اور زمین کے بارے میں دو لفظ آتے ہیں کہ زمین کو ہم نے ثابت بنایا، ﴿الَّذِىْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً ۪ وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً﴾ [البقرۃ:۲۲] اسی طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ زمین کو جمانے کے لیے ہم نے پہاڑوں کی میخیں لگا دیں، ﴿اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًا ۙ وَّالْجِبَالَ اَوْتَادًا ۙ﴾ [النباء:۶،۷] دیکھو! کیا ہم نے زمین کو تمہارے لیے بچھونا نہیں بنا دیا، کیا ہم نے اس میں پہاڑوں کی میخیں نہیں لگا دیں کہ زمین حرکت نہ کرے۔ اس لیے راجح یہ بات محل نظر ہے، کیونکہ زمین کی حرکت کا مشاہدہ ہے اور قرآن وسنت کی تعلیمات کے مخالف بھی نہیں ہے۔ اقوال اسی طرف ہیں کہ زمین کے پھرنے کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔

زمین کی گردش کے متعلق ابن عباس رضی اللہ عنہما کا جواب:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس ایک آدمی نے آ کر سوال کیا کہ زمین گردش کر رہی ہے اور بہت تیزی سے گردش کرتی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ان سے فرمایا: تم کیا کرتے ہو؟ اس نے کہا: میرا کھجوروں کا باغ ہے۔ آپ نے فرمایا: تمہارے کنویں کا پانی کبھی اُلٹا ہو کر آیا ہے؟ اس نے کہا: نہیں۔ آپ نے فرمایا: جس دن تیرے کنویں کا پانی اُلٹا ہو جائے اور تم سر کے بل ہو جاؤ تو مجھے آ کر بتانا کہ زمین چکر کاٹ رہی ہے یا نہیں کاٹ رہی، ورنہ اپنی عقل کو مت دوڑاؤ اور اتنی بات پر رہو جتنی بات حضور اکرم ﷺ نے سمجھائی ہے۔ جو چیزیں سمجھانے کی ضرورت نہیں تھی، ان میں اللہ تعالیٰ نے ہمیں نہیں اُلجھایا، مثلاً اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے چاند کی تاریخ رکھی ہے، سورج کی تاریخ نہیں رکھی، ورنہ چاند بھی اسی کا ہے اور سورج بھی اسی کا ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ چاند کو ہر آدمی دیکھ سکتا ہے کہ آج تیسری کا چاند ہے یا پہلی کا چاند ہے۔ اگر سورج کا معاملہ ہوتا تو اس کی رفتار اندازہ کرنا رصد گاہوں کے علاوہ ممکن نہ ہوتا۔ اس لئے جتنی چیزیں اللہ تعالیٰ نے بتائیں، ''آمَنَّا وَ صَدَّقْنَا'' اور جتنی باتیں حضور اکرم ﷺ نے بتائیں ''آمَنَّا وَ صَدَّقْنَا''۔ ان کے علاوہ جو معلومات ہیں وہ ٹھیک بھی ہو سکتی ہیں اور غلط بھی ہو سکتی ہیں، صرف اللہ تعالیٰ و رسول کی

بات غلط نہیں ہو سکتی۔

﴿وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ﴾ دن چلا گیا رات آ گئی، رات چلی گئی دن آ گیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو ایک دوسرے کا خلیفہ بنا دیا، اللہ کے سوا کوئی ایسا نہیں کر سکتا۔ فرمایا: ﴿وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ اَرَادَ اَنْ يَّذَّكَّرَ اَوْ اَرَادَ شُكُوْرًا﴾ [الفرقان: ۶۲] میں نے دن کو رات کا خلیفہ بنایا اور رات کو دن کا خلیفہ بنایا۔ خلیفہ کہتے ہیں جو کسی چیز کے بعد آئے۔

نکتہ:

علماء نے لکھا ہے کہ اصل خلیفہ اس کو کہتے ہیں جس کے ہوتے ہوئے وہ خلیفہ آ جائے، مثلاً بیٹا باپ کا خلیفہ ہوتا ہے اور باپ کے ہوتے ہوئے بھی وہ آ جاتا ہے اور کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ باپ کی زندگی میں حمل ٹھہر گیا، پھر باپ مر گیا، بچہ بعد میں پیدا ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے رات کو دن کا اور دن کو رات کا خلیفہ بنایا، دن جب آتا ہے تو رات کا کچھ حصہ باقی ہوتا ہے تو وہ خلیفہ (دن) آ جاتا ہے۔ یوں سمجھیں کہ آپ نے رمضان کا چاند دیکھا تو اسی رات تراویح شروع کر دی، حالانکہ روزہ ابھی نہیں آیا، لیکن اس پر اثر قائم کر دیا۔ جیسا کہ آپ کہتے ہیں: آج جمعرات ہے، حالانکہ جمعہ تو بعد میں آیا، لیکن اس کا اثر اس پر شروع ہو جاتا ہے۔ علماء نے لکھا ہے اگر آپ تحقیق کریں چاروں صحابہ رضی اللہ عنہم حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے خلفاء ہیں، اگر حقیقی طور پر ''من جمیع الوجوہ'' دیکھا جائے تو خلافت کے حق دار صرف سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں، کیونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہی خلیفہ تھے۔ اسی لیے جب سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو ''خلیفۃ الرسول'' لکھا گیا تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: مجھے خلیفہ نہ لکھو، کیونکہ میں تو ابوبکر کا خلیفہ ہوں، اگر خلیفہ لکھو گے تو یوں لکھنا پڑے گا: ''خلیفۃ خلیفۃ رسول اللہ'' اور میرے بعد جو آئے گا اس کے لیے آپ کو ''خلیفۃ خلیفۃ خلیفۃ رسول اللہ'' لکھنا پڑے گا۔ اتنی لمبی بحث میں کیوں پڑتے ہو؟ صرف ''امیر المؤمنین'' لکھ دو، کافی ہے۔

ابھی عرض کیا تھا کہ خلافت کی شان یہ ہے کہ جس کا خلیفہ بننا ہے، اس کے ہوتے ہوئے آ جائے تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مصلّی پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہوتے ہوئے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ آ گئے اور یہ مقام صرف سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو ملا۔ لہٰذا صحیح معنی میں جو مرتبۂ خلافت ہے، وہ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا ہے۔ اس لیے کہا جاتا



ہے: ''خلیفة بلافصل'' جس کے درمیان میں کوئی حائل نہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فوراً بعد خلافت پر آنے والے سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں۔ جیسے دن کے بعد رات ہے اور رات، دن کی خلیفہ ہے، ان کے درمیان میں یہ نہیں ہوتا کہ ابھی رات ہے، درمیان میں کوئی اور چیز آجائے، پھر دن ہوگا۔ اور یہ نہیں کہ دن چلا جائے اور رات نہ آئے، یا رات تو چلی جائے اور دن نہ آئے، اس میں کچھ دیر ہو جائے، بلکہ جو اللہ تعالیٰ کا نظام ہے ویسے ہی ہوگا۔

﴿لَا الشَّمْسُ يَنْۢبَغِيْ لَهَآ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ ۭ وَكُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ ۝۴۰﴾ [یٰسین:۴۰]

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میرا نظام دیکھو کہ کبھی دن بڑا ہے اور کبھی رات بڑی ہے۔ کبھی اس سے لے کر اس میں ڈال دیتے ہیں اور کبھی اس سے لے کر اس میں ڈال دیتے ہیں اور کبھی ہم ان کو برابر کر دیتے ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرمایا: ﴿اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۡ كُلٌّ يَّجْرِيْٓ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى وَّاَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝۲۹﴾ [لقمان:۲۹] کہ کبھی دن کا کچھ حصہ رات کو دے کر رات کو بڑھا دیتے ہیں اور کبھی رات کا کچھ حصہ دن کو دے کر دن کو بڑھا دیتے ہیں۔

﴿وَبَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ﴾

میرے بندو! غور کرو! میں نے زمین پر چلنے والی مخلوقات کی کتنی اقسام پیدا کی ہیں۔ صرف انسانوں میں دیکھو تو کتنے رنگ اور کتنی شکلیں ہیں؟ ایک ایک بندے کے اندر کتنے اعضاء ہیں؟ ایک ایک عضو پر نظر ڈالو تو قدرت کا کمال نظر آئے گا۔ اللہ تعالیٰ نے حیوانات کی کتنی قسمیں بنائی ہیں؟ اور پھر ان کے اندر رنگ دیکھو اور ان کے منافع دیکھو اور ان جانوروں میں کوئی بڑا ہے، کوئی چھوٹا ہے، کوئی سیاہ ہے، کوئی سفید ہے۔ کوئی گرم علاقوں میں ہے، کوئی ٹھنڈے علاقوں میں ہے۔ تم جب ان سب چیزوں پر نظر ڈالو گے تو تمہیں میری اُلوہیت اور وحدانیت کی دلیلیں نظر آئیں گی۔

ان کے رنگوں کو دیکھو کہ بعض رنگ ایسے ہوتے ہیں کہ ایک دم سے نظر نہیں آتے، بلکہ ضعف سے شدت کی طرف بڑھتے ہیں اور بعض شدت سے ضعف کی طرف بڑھتے ہیں اور بعض رنگ ایسے ہوتے ہیں جو ہمیشہ ثابت رہتے ہیں، ان میں تبدیلیاں نہیں ہوتیں۔ مثلاً آپ گندم کا ایک دانہ ڈالیں، جب نکلے گا تو اس کا رنگ اور ہوگا اور جوں جوں گندم بڑی ہوتی جائے گی اس کا رنگ اور ہوتا جائے گا، جب اس پر دانے لگیں گے تو ان کا رنگ ہوگا اور جب دھوپ میں پک جائے گی تو اس کا رنگ بدل جائے گا۔ اسی طرح پھلوں اور درختوں کا رنگ ہے۔ لیکن بعض رنگ

ایسے ہوتے ہیں جو نہیں بدلتے، جیسا کہ انسانوں کا، حیوانوں کا، پہاڑوں کا رنگ، جو اللہ تعالیٰ نے بنا دیا ہے وہی رنگ قائم رہے گا اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ان کے منافع پر نظر ڈالو کہ ہر چیز کے اندر ہم نے منافع رکھے ہیں۔ پھر یہ ساری چیزیں تیری خدمت کے اندر مصروف ہیں، اللہ تعالیٰ نے کوئی چیز ایسی پیدا نہیں کی جو انسانوں کے کام نہ آتی ہو۔ دیکھیں! دنیا میں سب سے زیادہ خطرناک چیز سانپ ہے، لیکن اب وہ بھی فٹوں کے حساب سے بکتا ہے، بعض سانپ ایسے ہوتے ہیں کہ بیس ہزار روپے کا ایک فٹ ہوتا ہے، بعض سانپ ایسے ہیں جن کے چمڑے بکتے ہیں اور بعض سانپ ایسے ہیں جن کا زہر بکتا ہے۔ اس وقت دنیا میں سونا، چاندی، پلاٹینم سے مہنگا بکتا ہے، کیونکہ اس سے تریاق بن رہا ہے اور ایسی ایسی بیماریوں کے علاج کے لئے کام آ رہا ہے جن کا کوئی علاج نہیں تھا۔

اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یہ ساری چیزیں تیری خدمت کے لئے پیدا کی ہیں، یہ نہ ہو کہ تم میری زمین پر رہو، میرے آسمان کے نیچے رہو، میری پیدا کی ہوئی غذائیں استعمال کرو، میرے جانوروں کی سواری استعمال کرو، میرے جانوروں کا دودھ استعمال کرو اور پھر سجدہ غیروں کو کرو، نذر و نیاز دوسروں کی کرو اور میری ذات کے ساتھ شرک کرو تو دنیا میں اس سے بڑی کوئی بغاوت نہیں ہے۔ اس لیے جیسے دنیا میں بغاوت کی سزا موت ہے، اللہ تعالیٰ نے بھی شرک کی سزا جہنم رکھی ہے کہ اس سے کبھی نکلنا نہیں ہوگا۔

میرے رب نے جتنی مخلوق پیدا کی ہے سب کو جاننا بھی اسی کا کمال ہے۔ پرندے ہیں، وہ اپنے اپنے گھونسلوں میں، کوئی جنگل میں ہے اور کوئی غاروں میں ہے، جس نے مٹی کھانی ہے اس کو مٹی ملتی ہے، جس نے گوشت کھانا ہے اس کو گوشت ملتا ہے اور پھر ہر جانور اور پرندے کو اس کے رزق اور نفع و نقصان کے بارے میں معلومات مہیا کرنا، یہ بھی اللہ تعالیٰ کا کمال ہے۔ آپ نے کبھی نہیں سنا ہوگا کہ شیر گھاس کھائے، بلکہ وہ گوشت کھاتا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کی شان دیکھیں کہ جب شیر بیمار ہو جاتا ہے تو اس کو پتہ ہے کہ جنگل میں فلاں بوٹی کا پتہ ہے، وہ کھالوں تو ٹھیک ہو جاؤں گا تو وہ جا کر وہی کھائے گا۔ اسی طرح بندر اور دوسرے جتنے جانور ہیں ان کو کہیں زخم آ جائے تو فوراً جا کر بوٹیوں کو لے آئیں گے اور کھا کر ٹھیک ہو جائیں گے اور بعض اوقات زخم کو چاٹتے ہیں، کیونکہ اس کے لعاب کے اندر جو اللہ نے مادہ رکھا ہے، وہ ان کے زخم کا علاج ہے۔

ایک مرغی کو انڈوں پر بٹھایا، اس کے بیس پچیس بچے نکل آئے اور قدرت کا کیا نظارہ ہے کہ مرغی آگے جا رہی ہوتی ہے اور چھوٹے چھوٹے بچے اس کے پیچھے جا رہے ہوتے ہیں۔ جب وہ بچے بلی کو دیکھیں گے یا اس کی آواز کو

سنیں گے تو فوراً ماں کے پروں کے نیچے جائیں گے، حالانکہ گھر کا مالک موجود ہے، مرغی کا بچہ اس کی طرف کبھی نہیں دوڑتا، بلکہ وہ فوراً ماں کے نیچے جائے گا کہ یہیں سے مجھے شفقت اور مدد کی اُمید ہے۔ چوہے کو پتہ ہے کہ بلی دشمن ہے، بلی گھر میں آجائے تو وہ رخصت ہو جاتے ہیں، بلی کو صندوق میں بند کر کے تالا لگا دیں اور اس کو بہت دور چھوڑ آئیں تو کچھ دنوں کے بعد دوبارہ تمہارے گھر میں ہوگی۔ اس کو کس نے یہ راستے سمجھائے؟ اس نے کس پیر کی منت مانی؟ وہ کہاں کہاں نُور اتیں بیٹھی؟ اس نے کون سے غیروں کی مدد مانگی اور پکارا؟ یہ تو اللہ کا نظام ہے جسے اللہ تعالیٰ چلا رہے ہیں۔

ہوائیں بھی اللہ کی نعمت:

﴿وَتَصْرِيفِ الرِّيٰحِ﴾ اور ان ہواؤں کے چلنے پر غور کرو کہ ان کا خالق اور ان ہواؤں کو چلانے والا اللہ تعالیٰ کبھی مشرق سے مغرب کی طرف اور کبھی مغرب سے مشرق کی طرف اور کبھی شمال سے جنوب کی طرف اور کبھی جنوب سے شمال کی طرف چلاتے ہیں۔ بعض ہواؤں سے اللہ تعالیٰ نے نزولِ رحمت کا کام لیا اور بعض ہواؤں سے نزولِ عذاب کا کام لیا۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:

"نُصِرْتُ بِالصَّبَا، وَ أُهْلِكَتْ عَادٌ بِالدَّبُوْرِ." [صحیح بخاری، رقم: ۱۰۳۵]

"اللہ تعالیٰ نے میری مدد بادِ صبا سے کی ہے اور قومِ عاد کو اللہ تعالیٰ نے دبور کی ہوا سے ہلاک کر دیا۔"

اس میں کمالِ قدرت ہے کہ ہواؤں کو پیدا کیا اور پھر ہوا اتنی لطیف چیز ہے کہ نظر نہیں آتی، لیکن موجود ہے اور اس کی اتنی وسعت ہے کہ اس کے بغیر کوئی زندہ نہیں رہ سکتا۔ جب ہواؤں پر نظر ڈالیں تو اللہ تعالیٰ کی اُلوہیت کی صفات نظر آئیں گی اور اس سے لوگوں کے لیے نفع کے سامان بنا دیئے تو اس سے رحمان و رحیم کی صفت نظر آئے گی۔ اللہ تعالیٰ ان سے کبھی بادلوں کو جمع کرتے اور چلاتے ہیں اور ان ہواؤں سے کبھی ان بادلوں کو ہٹا دیتے ہیں۔

ہواؤں کے مختلف نام:

ريح الشمال، ريح الجنوب، ريح الأزيب، ريح الجربياء، ريح الصبا، ريح القبول، ريح الدبور.

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بعض لوگوں نے ہوا کے اوپر بھی کتابیں لکھی ہیں اور اس کے اندر ہواؤں کے نام، ان کی اقسام، ان کے فوائد اور منافع ذکر کئے ہیں۔ ان کو یہاں ذکر کرنے سے بلاوجہ ایک طوالت ہوگی۔ اگر کسی نے اس

فن کو پڑھنا ہو تو علیحدہ کتابیں موجود ہیں، وہاں دیکھ سکتا ہے، جیسے (کتاب الریح لابن خالویہ، التوفی: ۳۷۰ھ)۔

یاد رکھیں! یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کا ایک نظام ہے۔ دنیا میں جیسے ایک بادشاہ ہوتا ہے، اس کی رعایا کے اندر اس کے اپنے بھی ہوتے ہیں، اس کے قبیلے والے بھی ہوتے ہیں، اس کی تائید کرنے والے بھی ہوتے ہیں اور اس کی مخالفت کرنے والے بھی ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سارے بادشاہوں کے بادشاہ ہیں اور تمام کائنات کے خالق و مالک ہیں۔

دوسری بات یہ یاد رکھیں کہ ایک ملک عارضی ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر کسی نے آپ کو کہا: یہ آپ عینک رکھ لیں اور اس سے فائدہ اُٹھائیں تو اب یہ آپ کی عارضی مِلک ہوگئی اور کچھ اس سے زیادہ ملک ہوتا ہے کہ آپ نے خرید لیا تو یہ آپ کا ملک ہوگیا، لیکن حقیقتاً یہ بھی عارضی ہے کسی وقت ٹوٹ جائے گی، گر جائے گی۔ میں مر گیا تو میری جائیداد تقسیم ہوگئی، میرے ورثاء کے بعد ان کے ورثاء کو چلی گئی۔ اسی طرح بات بڑھتی گئی اور آگے جا کر ضرب تقسیم ہوتی رہی اور پھر سب چلے گئے تو بات ختم ہوگئی۔ لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ کا ملک حقیقی ملک ہے، کیونکہ وہ خالق ہے اور جو خالق ہوتا ہے حقیقت میں وہ مالک ہوتا ہے، باقی تو مجازی مالک ہیں۔ اس لئے آتا ہے: ﴿قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ﴾ [آل عمران: ۲۶] اس ملک کا مالک اللہ ہے۔ فرمایا: ﴿تَبٰرَكَ الَّذِيْ بِيَدِهِ الْمُلْكُ ۡ وَهُوَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرُ ۝﴾ [الملک: ۱] اسی کے قبضۂ قدرت میں ملک ہے اور کہیں فرمایا: ﴿لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ [البقرۃ: ۱۰۷] اسی ہی کے لئے ہے ملک آسمانوں اور زمینوں کا، اور کہیں فرمایا: ﴿وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ﴾ [آل عمران: ۱۰۹] اللہ ہی کے لئے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور زمینوں میں ہے۔ آپ جہاں جہاں نظر ڈالیں مالک حقیقی صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، باقی سب دنیا قابلِ فنا ہے، قابلِ ہلاک ہے۔ دنیا کے اندر جتنے دعوے ہیں سب عارضی ہیں، محدود زمانے کے اور محدود مکان تک ہیں۔

﴿وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝﴾

سحاب، بادل کو کہتے ہیں۔ اسی آیت میں پہلے آیا کہ پانی آسمانوں سے بھی اُترتا ہے اور بادلوں سے بھی اُترتا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے زمین پر پانی کے خزانے تقسیم کیے ہیں کہ پہاڑوں کے اوپر برف جما دیتے ہیں، وہ پگھلتی ہے تو دریا چلتے رہتے ہیں اور بندوں کے کام ہوتے رہتے ہیں۔ ایسی حفاظت بندے بھی نہیں کر سکتے اور ان

پہاڑوں کی رگیں ہیں جو ہمیں نظر نہیں آتیں، ان رگوں کے ذریعے اللہ تعالیٰ کچھ پانی پھر زمین کے اندر داخل کر دیتے ہیں اور کچھ پانی اللہ تعالیٰ اوپر محفوظ رکھتے ہیں۔ ایسے ہی آسمانوں کے اوپر بھی اللہ تعالیٰ نے دریا رکھے ہوئے ہیں، جب اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں تو اس دریا کو حکم دے دیتے ہیں اور زمینوں کو بھی حکم دے دیتے ہیں، جیسا کہ نوح علیہ السلام نے دعا مانگی تھی کہ یا اللہ! اس قوم میں ایمان لانے کی کوئی اُمید باقی نہیں رہی، ان کو ہلاک و برباد کر دے تو اللہ تعالیٰ نے حکم دے دیا کہ آسمانوں کے دروازے بھی کھولو اور زمین کو حکم دیا کہ تم بھی اپنے چشمے باہر نکالو۔ یہ دونوں پانی جب ایک بن گئے تو اللہ تعالیٰ کا فیصلہ پورا ہو گیا کہ ساری زمین پر پانی کا طوفان آ گیا۔ آسمانوں سے بھی اللہ تعالیٰ بارش برساتے ہیں اور ان بادلوں سے بھی اللہ تعالیٰ بارش برساتے ہیں، لاکھوں ٹن پانی دے کر ان بادلوں کو آسمان و زمین کے درمیان بغیر کسی ستون کے معلق رکھتے ہیں اور اللہ کے حکم کے بغیر ان سے قطرہ بھی نہیں گرتا۔ ان ساری چیزوں میں اللہ تعالیٰ نے اپنی توحید کی نشانیاں رکھی ہیں ان لوگوں کے لیے جن کو عقل ہے، اور جو شرک کر کے اپنی عقل ختم کر چکے ہیں، ان کے لئے نشانیاں نہیں ہیں، کیونکہ وہ آخرت کے علم سے غافل ہیں۔ یہ دنیا کے پیچیدہ مسئلے حل کر رہے ہیں، لیکن میری توحید کو نہ سمجھ سکے۔

(حدیث) حافظ ابوبکر بن مردویہ رحمہ اللہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل فرمایا ہے کہ قریش کے سردار حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر کہنے لگے: اے محمد! ہم آپ کے پاس اس لئے آئے ہیں کہ آپ اپنے رب سے دعا مانگیں کہ اللہ اس صفا پہاڑ کو سونے کا بنا دیں اور پھر ہم یہ سونا بیچیں گے، گھوڑے اور ہتھیار خریدیں گے اور پھر ہم آپ پر ایمان لے آئیں گے اور پھر ہم آپ کے ساتھ مل کر آپ کے دشمنوں سے قتال کریں گے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر میں یہ دعا کروں اور اللہ تعالیٰ ایسا کر دیں تو کیا تم ایمان لے آؤ گے؟ انہوں نے کہا: ہم ایمان لے آئیں گے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کی تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت جبرائیل علیہ السلام کو نازل فرمایا کہ میرے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) سے کہہ دیں کہ اگر آپ چاہتے ہیں تو ہم جبل صفا کو سونے کا بنا دیتے ہیں، لیکن پھر سنۃ اللہ یہ ہے کہ جو قوم اپنے منہ سے معجزہ مانگے اور وہ ہم دے دیں، اس کے بعد وہ ایمان نہ لے آئیں تو ہم ایسا عذاب دیں گے جو عالم میں کبھی کسی کو نہیں ہوا ہوگا۔ آپ چاہتے ہیں تو ہم صفا پہاڑ سونے کا بنا دیتے ہیں، اگر آپ کی قوم ایمان نہ لائی تو ہم عذاب نازل کریں گے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''رَبِّ لَا، بَلْ دَعْنِيْ وَ قَوْمِيْ، فَلَأَدْعُوْ يَوْمًا بِيَوْمٍ'' میرے اللہ! میری قوم کو ان کے حال پر چھوڑ دیں، میں ان کو دعوت دیتا رہوں گا، جن کے مقدر میں دعوت



ہے وہ ایمان لے آئیں گے اور جن کے مقدر میں ایمان نہیں ہے وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں یہ آیات نازل فرمائیں کہ ان کو نشانیاں نہیں چاہئیں، یہ تو محض استہزاء کرتے ہیں، اگر انہوں نے نشانیاں دیکھ کر ایمان لانا ہوتا تو آسمان وزمین سے بڑی کوئی نشانی ہے؟ "اختلاف اللیل و النہار" سے بڑی بھی کوئی نشانی ہے؟

کافر اور مسلمان کی سوچ میں فرق:

اس سے یہ اشارہ ملا کہ کافر کی نظر دنیا پر ہوتی ہے کیونکہ اس کا مطمح نظر دنیا ہے۔ دنیا کے بعد والے عالم پر اس کا ایمان ہی نہیں ہے اور جس آدمی کا جس چیز پر ایمان ہو تو وہ اسی کے لئے محنت کرتا ہے، اس لئے کافر کہتے ہیں: ﴿إِنْ هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوثِينَ ۝﴾ [الانعام:۲۹] بس یہی دنیا کی زندگانی ہے، اس میں ہم مرتے ہیں، اسی میں ہم پیدا ہوتے ہیں، اسی میں ہم مر جائیں گے، اس کے بعد ہم نہیں اُٹھائے جائیں گے، کوئی قیامت نہیں، کوئی آخرت نہیں، کوئی جنت جہنم نہیں ہے۔ اس لئے ان کی نظر دنیا پر ہوتی ہے، نبی سے مانگنے کے لیے آئے تو دنیا مانگنے آئے کہ صفا سونے کا پہاڑ بن جائے، اس سے گھوڑے اور ہتھیار خریدیں گے۔ کیونکہ یہ جنگجو قوم تھی، ان کا ہر وقت کام ہی ڈاکے، لُوٹ مار اور قتل عام تھا۔

مومن اور کافر کی نظر میں دنیا کی حیثیت:

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:

"اَلْمُؤْمِنُ يَأْكُلُ فِي مِعًى وَاحِدٍ، وَ الْكَافِرُ يَأْكُلُ فِي سَبْعَةِ أَمْعَاءٍ." [صحیح بخاری، رقم: ۵۳۹۳]

مومن ایک آنت میں کھاتا ہے اور کافر سات آنتوں میں کھاتا ہے۔ مومن ایک آنت میں کھاتا ہے اس کا بظاہر معنیٰ تو یہ معلوم ہو رہا ہے کہ کافر زیادہ کھاتا ہے، یعنی وہ دنیا میں کھانے وغیرہ میں بہت حریص ہے۔

جیسا کہ حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: ہم آپ کے لیے ایک اچھا جوڑا بنا دیں کہ جب باہر کے لوگ آئیں تو آپ بھی اچھا لباس پہنیں۔ آپ بالکل سادہ لباس پہنتے ہیں تو باہر کے لوگوں پر اچھا تاثر نہیں ہوگا۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اللہ کے بندو! کیا کہتے ہو؟ اللہ کے فرشتے نے صور پر منہ رکھا ہوا ہے، آنکھیں اوپر ہیں اور حکم کا انتظار کر رہا ہے، جب آخرت اتنی قریب ہے تو ہمیں دنیا کے لباس کی کیا ضرورت ہے؟

سیدنا ابوبکر صدیق ﷛ کی جب وفات کا وقت قریب آیا تو وصیت فرمائی کہ میری پرانی چادروں کو دھو ڈالو اور انہی میں مجھے کفن دینا۔ عرض کیا گیا: دو نئی چادریں لے لیں۔ فرمایا: نئی چادریں حضور اکرم ﷺ کی اُمت کے غریبوں کے کام آجائیں گی، مُردے کو نئی چادروں کا کیا فائدہ ہے؟ اگر میرے اعمال اچھے ہیں تو انہی پرانی چادروں میں جنت کا باغ ہوگا اور اگر اعمال بُرے ہیں تو چاہے ریشم کے کپڑوں میں کفن دو، بے فائدہ ہے۔

اس لئے یاد رکھیں! مومن کی نظر ہمیشہ آخرت پر ہوتی ہے، دنیا پر اس کی نظر نہیں ہوتی اور کافر کی نظر دنیا پر ہوتی ہے آخرت پر نہیں ہوتی۔

علماء نے قرآن وسنت کی روشنی میں لکھا ہے کہ دنیا میں علماء حق اور علماء سُوء کا امتیاز اس طرح کریں گے کہ علماء حق انبیاء کے وارث ہوں گے، ان کی نظر دنیا پر نہیں ہوتی اور جو علماء سُوء ہوتے ہیں، ان کی نظر ہمیشہ دنیا پر ہوتی ہے، کیونکہ انبیاء ﷼ نے فرمایا: ﴿إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَىٰ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝﴾ [الشعراء: ۱۰۹] میں تو ثواب بھی رب سے مانگتا ہوں، آپ لوگوں سے تو شکریہ بھی نہیں مانگتا تو جب مجھے آپ سے لالچ نہیں ہے تو میں غلط بات کیوں کروں گا؟ اسی طرح علماء حق اللہ سے اجر مانگتے ہیں، ان کے مقابلہ پر دیکھیں کہ جب فرعون نے بڑے بڑے جادوگروں کو بلایا تو انہوں نے فرعون سے کہا: ﴿إِنَّ لَنَا لَأَجْرًا إِن كُنَّا نَحْنُ الْغَالِبِينَ ۝﴾ [الاعراف: ۱۱۳] اگر ہم موسیٰ (﷤) سے جیت جائیں تو ہمیں کیا ملے گا؟ فرعون نے کہا: میں تمہیں بڑے بڑے انعام دوں گا، تم میرے کرسی نشین بنو گے، تمہیں بڑے بڑے خطابات سے نوازا جائے گا کہ کسی کو سر کا خطاب ملے گا اور کسی کو شمس العلماء کا خطاب ملے گا۔ تمہیں ہم بڑی بڑی ڈگریاں دیں گے، تم اللہ کے نبی کے ساتھ مقابلہ تو کرو۔ اللہ نے تو یہاں وادیوں کی وادیاں سونے کی بنا دیں، وہ تمہیں بھی دے سکتے ہیں، بس اس کا ایک فیصلہ ہے: ﴿وَلَوْ أَنَّ أَهْلَ الْقُرَىٰ آمَنُوا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِم بَرَكَاتٍ مِّنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ﴾ کہ بستی والے ایمان لے آئیں، میری توحید کا اقرار کرلیں اور متقی و پرہیزگار بن جائیں، نافرمانیاں چھوڑ دیں، میرے قانون پر عملدرآمد کرلیں تو میں آسمان وزمین کے خزانوں کے دروازے کھول دیتا ہوں، ﴿وَلَٰكِن كَذَّبُوا فَأَخَذْنَاهُم بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ۝﴾ [الاعراف: ۹۶] لیکن جب انہوں نے تکذیب کی تو ہم نے بھی انہیں عذاب میں پکڑ لیا۔



﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ؕ وَلَوْ يَرَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ ۙ اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعَذَابِ ﴿١٦٥﴾ اِذْ تَبَرَّاَ الَّذِيْنَ اتُّبِعُوْا مِنَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا وَرَاَوُا الْعَذَابَ وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْاَسْبَابُ ﴿١٦٦﴾ وَقَالَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا لَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّاَ مِنْهُمْ كَمَا تَبَرَّءُوْا مِنَّا ؕ كَذٰلِكَ يُرِيْهِمُ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ حَسَرٰتٍ عَلَيْهِمْ ؕ وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنَ النَّارِ ﴿١٦٧﴾﴾ [البقرة:١٦٥ تا ١٦٧]

''اور لوگوں میں سے بعض وہ ہیں جو غیر اللہ کو معبود بنا لیتے ہیں ان سے ویسی محبت رکھتے ہیں جیسے اللہ سے محبت رکھنی چاہیے، اور جو ایمان لائے وہ اللہ سے انتہائی محبت رکھتے ہیں اور کیا خوب ہوتا اگر مشرک جب دنیا میں مصیبت کو دیکھتے تو سمجھ جاتے کہ سب قدرت اللہ کے پاس ہے اور اللہ سخت عذاب والا ہے۔ جب بیزار ہو جائیں گے وہ لوگ جن کی اتباع کی گئی تھی ان لوگوں سے جنہوں نے اتباع کی تھی اور عذاب (دوزخ) دیکھ لیں گے اور ان کے سب تعلق کٹ جائیں گے۔ اور اتباع کرنے والے (گمراہ) کہیں گے: کاش! ہم (دنیا میں) لوٹ جاتے اور ہم بھی ان سے ایسے بیزار ہوتے جس طرح وہ ہم سے بیزار ہوئے ہیں، اسی طرح سے اللہ ان کو ان کے اعمال ان پر حسرتیں بنا کر دکھائے گا اور وہ جہنم سے نہیں نکالے جائیں گے۔''

آیات کا شانِ نزول:

دوسری جگہ ''أَرْبَابٌ'' کا لفظ آتا ہے اور یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے احبار کو خدا بنا رکھا ہے۔ جب یہ آیت اُتری تو ایک صحابی جو ابھی تازہ تازہ مسلمان ہوئے تھے، انہوں نے کہا: یا رسول اللہ! ہم نے کبھی اپنے علماء کو رب نہیں بنایا۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہمارے احبار، رہبان تھے، مولوی تھے اور قرآن کہہ رہا ہے کہ ان کو رب بنایا ہوا ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: وہ پیر اور تمہارے مولوی اگر کہہ دیتے کہ یہ چیز حلال ہے تو تم اس کو حلال سمجھتے تھے؟ انہوں نے عرض کیا: جی ہاں! یہ بات تو ٹھیک ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اگر انہوں نے کہہ دیا کہ یہ کام کرو تو کرتے تھے؟ انہوں نے کہا: جی ہاں! آپ ﷺ نے فرمایا: اگر انہوں نے منع کر دیا کہ یہ کام نہ کرو تو نہیں کرتے تھے؟ صحابی نے عرض کیا: جی ہاں! تو آپ ﷺ نے فرمایا: حرام، حلال کرنے والا تو رب ہے، جب تم بندوں کے

کہنے پر حلال حرام مان لو تو گویا تم نے خدا کے مقابلے میں ان کو رب بنالیا۔

''أَنْدَاد''، ''نِدٌّ'' کی جمع ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے سوا جو شریک بنالیا اور ان سے ایسی محبت کی جیسے اللہ سے محبت کی جاتی ہے۔

آیات میں مشرکین مکہ کی حالت کا بیان:

اللہ تعالیٰ نے ان آیات مبارکہ کے اندر مشرکین کا دنیا میں حال اور جو اُن کا آخرت میں انجام ہوگا، اس کا ذکر فرمایا ہے۔ فرمایا: دنیا کے اندر مشرکین کا یہ حال ہے کہ انہوں نے چھوٹے چھوٹے خدا بنا رکھے ہیں، ان کی عبادت کرتے ہیں اور ان کے ساتھ ایسی محبت کرتے ہیں جیسی اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت کرنی چاہیے۔ آج لوگوں کو ایک بڑا دکھ ہے کہ جو لوگ اللہ کے سوا بتوں، دیوی، دیوتاؤں کی پوجا کرتے ہیں اور جو لوگ سورج، چاند اور آگ کی پوجا کرتے ہیں، صرف وہ کافر ہیں۔ یہ بات نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ أَنْدَادًا﴾ [البقرۃ:١٦٥] اور فرمایا: ﴿وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ يَّدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ [الاحقاف:٥] تو اللہ نے ہر جگہ ﴿مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ فرمایا کہ اللہ کے سوا، اس کے اندر ساری مخلوق آگئی ہے اور اگر کوئی اللہ کے سوا انبیاء کو بھی عبادت کے لائق سمجھ لے تو وہ بھی مشرک ہو جائے گا۔ اسی طرح اگر کوئی اللہ کے فرشتوں کو حاجت روا، مشکل کشا سمجھ لے، ان کی عبادت کرے اور ان کو پکارے، ان کی نذر و نیاز کرے تو یہ بھی شرک ہے۔ عبادت کے معنی کے اندر آج لوگوں کو غلط فہمی ہے کہ نماز پڑھیں گے تو عبادت ہے۔ حالانکہ نماز بھی عبادت ہے، دعا اور پکارنا بھی عبادت ہے۔ جیسے اگر کوئی غیر اللہ کی نماز پڑھے تو کافر ہو جائے گا، اسی طرح غیر اللہ کو پکارے تو کافر ہو جائے گا۔ اسی طرح ایک آدمی کسی کو پوجتا نہیں ہے۔ ایک طبعی محبت ہوتی ہے کہ ہر آدمی کو اپنی اولاد سے، اپنی بیوی، اپنے والدین سے محبت ہوتی ہے، یہ محبت غیر اختیاری ہے، اختیاری محبت صرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہونی چاہیے۔ یوں سمجھیں کہ ایک آدمی کا ایک خوبصورت، سمجھدار بیٹا ہو، باپ کی جان ہر وقت بیٹے میں اٹکی ہوئی ہے، اگر وہی بچہ قرآن کو اُٹھا کر پھینک دے تو وہی باپ اُٹھ کر اس کو تھپڑ مارے گا کہ بد بخت! تُو نے اللہ تعالیٰ کے قرآن کو پھینک دیا ہے۔ اب بچے کی محبت ختم ہوگئی اور اللہ کی محبت غالب آگئی۔ اس لیے جہاں اللہ تعالیٰ کی عبادت آجائے مومن وہاں سب کو چھوڑ دے گا۔ اس لیے فرمایا: ﴿مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ أَنْدَادًا﴾ جو اللہ کے علاوہ شریک بنائے، وہ مشرک ہے۔

شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی اپنے شاگرد کو نصیحت:

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ جو اللہ کے بہت بڑے ولی گزرے ہیں۔ ان کے پاس ایک شاگرد، خادم تھا۔ حضرت کا بڑا مطیع، فرمانبردار تھا۔ حضرت نے اس کو بعد میں خلیفہ بنا دیا۔ جب وہ خلیفہ بن کر اپنی تربیت مکمل کر کے جانے لگا تو حضرت کی خدمت میں آ کر عرض کی کہ مجھے کچھ نصیحت فرما دیں۔ حضرت نے فرمایا: ایک تو خدائی کا دعویٰ نہ کرنا اور ایک نبوت کا دعویٰ نہ کرنا، اپنے آپ کو انسان ہی رکھنا۔ اس نے کہا: حضرت! کمال ہو گیا، اتنا عرصہ میں نے آپ کی خدمت کی، علم حاصل کیا، میں نے اللہ اللہ سیکھا اور آپ نے میری تربیت کی، آپ نے میرا تزکیۂ نفس کیا۔ میں جب اس مرتبہ پر پہنچا تو آپ نے مجھے خلافت سے نوازا اور اب جا رہا ہوں تو آپ کو مجھ پر گمان ہے کہ میں خدائی کا دعویٰ کروں گا، پھر تو میں مسلمان بھی نہ رہا۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: ٹھنڈے دل سے بات کو سمجھو کہ تم کبھی مثلاً ایسی بات شیخ بن کر کہہ دو کہ ہم نے کہہ دیا ہے آپ کو بچہ ملے گا۔ یہ بات خدا کہہ سکتا ہے، بندے کی طاقت نہیں ہے۔ اللہ چاہیں تو دے دیں اور اگر چاہیں تو نہ دیں۔ اس لئے ایسی باتیں نہ کرنا کہ جن سے خدائی کا دعویٰ ٹپکے۔ کبھی یہ نہ کہنا کہ آپ میری مخالفت کر رہے ہیں، میں آپ کو برباد کر دوں گا۔ یہ دعویٰ کرنا تو اللہ کی شان ہے۔ وہ کسی کو آباد کرے یا کسی کو برباد کرے۔ لہٰذا جب تم ایسی باتیں کرو گے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ خدائی کے دعوے کر رہے ہو۔ اور تم نبوت کا دعویٰ بھی نہ کرنا کہ کوئی آدمی تیرے پاس آ کر کہے کہ حضرت! آپ نے یہ مسئلہ بیان کیا ہے، لیکن یہ مسئلہ صحیح نہیں لگتا اور تم کہو کہ میری بات تو غلط نہیں ہو سکتی، جس نے آپ کو کہا، وہ غلط ہے۔ کسی کی بات غلط نہ ہو، یہ نبی کی شان ہے، اللہ کے انبیاء معصوم ہوتے ہیں، ان کی بات وحی سے تعلق رکھتی ہے۔ اس لئے ایسی باتیں نہ کرنا اور اپنے آپ کو بندہ ہی سمجھنا۔

غیر اللہ کو پکارنا بڑا گناہ ہے:

''عَنْ عَبْدِاللّٰہِ، قَالَ: قُلْتُ یَا رَسُولَ اللّٰهِ! أَيُّ الذَّنْبِ أَعْظَمُ؟ قَالَ: أَنْ تَجْعَلَ لِلّٰهِ نِدًّا وَ هُوَ خَلَقَكَ.''

[صحیح بخاری، رقم: ۱۰۰۱]

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! سب سے بڑا گناہ کون سا ہے؟ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ تم اللہ کے ساتھ شریک کرو، جس نے تمہیں پیدا کیا ہے۔



﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ﴾ جو صحیح معنی میں مومن ہیں، وہ سب سے زیادہ محبت اپنے اللہ سے کرتے ہیں۔ لفظ ''اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ'' آیا، یعنی تھوڑی تھوڑی محبت تو اوروں سے بھی ہو سکتی ہے، لیکن وہ اللہ کی محبت سے بڑھ نہیں سکتی کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کو ٹال دے۔ مثلاً آدمی کو عورت سے محبت ہے، لیکن اس کو طلاق دے بیٹھا تو اب آدمی کہتا ہے کہ وہ مجھ پر حرام ہوگئی ہے، اللہ کا حکم ہے میں کیا کر سکتا ہوں۔ یہ اللہ کے ساتھ محبت ہے کہ جہاں اللہ تعالیٰ کا حکم آگیا کہ یہ حلال ہے تو اس کو حلال سمجھے اور جہاں حرام کا حکم آگیا تو اس کو حرام سمجھے۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ آج دوبارہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو زندہ کر دیں، ہم جب ان کو دیکھیں گے تو ہم کہیں گے کہ یہ دیوانے لوگ ہیں اور صحابہ رضی اللہ عنہم جب ہمیں دیکھیں گے تو کہیں گے: پتہ نہیں یہ کون لوگ ہیں؟ انہیں اسلام کے بارے میں دور کا پتہ نہیں۔

حضرت زید رضی اللہ عنہ نے اپنی بیوی حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو طلاق دے دی اور قرآن کے اندر یہ واقعہ آیا ہے کہ ان کو طلاق ہوگئی۔ یہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی کی بیٹی تھیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود حضرت زید رضی اللہ عنہ کے لیے ان کا رشتہ مانگا، لیکن بی بی زینب رضی اللہ عنہا نے انکار کر دیا کہ میں زید سے نکاح نہیں کرنا چاہتی۔ زید ایک غلام ہے، میں ایک سردار زادی ہوں، نبی کے خاندان سے تعلق رکھتی ہوں۔ حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے بھائی نے بھی انکار کر دیا اور کہا: یارسول اللہ! آپ کو حکم آنکھوں پر ہے، ہم نے تو سمجھا تھا کہ آپ نے اپنے لیے پیغام بھیجا ہے۔ آپ مہربانی کریں، وہ غلام ہے، اس کا نہ یہاں گھر ہے تو اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک نازل فرما دیا: ﴿وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ﴾ [الاحزاب:۳۶] یہ کیسے مومن مرد اور مومنہ عورتیں ہیں میرے نبی ایک فیصلہ کر دیں، پھر وہ کہتے ہیں کہ ہمیں منظور نہیں۔ جب یہ آیت اُتری تو بی بی زینب رضی اللہ عنہا کے بھائی دوڑے ہوئے آئے کہ حضور! ہمیں نکاح منظور ہے، آپ زید کو بلائیں اور رشتہ کریں۔ بی بی کا نکاح ہوگیا، لیکن ذہن میں چھوٹے بڑے کا فرق تو رہتا ہے اس لئے ہر وقت خاوند اور بیوی کی نہ بنتی۔ حضرت زید رضی اللہ عنہ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ حضرت! میرا گزارا نہیں ہوتا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: پہلے نکاح میں باتیں ہوئیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی پھوپھی کی بیٹی غلام کے نکاح میں دی، اب تم طلاق دے کر میرے لئے ایک اور مصیبت بنانا چاہتے ہو کہ سارا خاندان کہے گا کہ طلاق دلوا دی۔ تم صبر کرو، کوئی بات نہیں، آہستہ آہستہ معاملہ ٹھیک ہو جائے گا۔ حضرت زید رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: حضور! میں اب برداشت نہیں کر سکتا تو تقدیر نے ایک مسئلہ حل فرمایا کہ منہ سے کہا

ہوا بیٹا اور ہوتا ہے اور حقیقی بیٹا اور ہوتا ہے۔ صلبی بیٹے کی بیوی سے تم نکاح نہیں کر سکتے، چاہے وہ طلاق دے دے اور اگر کسی کو منہ سے بیٹا کہا تھا تو کہنے سے بیٹا نہیں بن جاتا۔ جاہلیت میں اگر کسی کو بیٹا کہہ دیتے تو اس کو حقیقی بیٹے کے احکام دیتے تھے۔ بہرحال حضرت زید رضی اللہ عنہ نے بی بی کو طلاق دے دی تو اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا کہ آپ شادی کر لیں۔ اب یہ کتنا بڑا امتحان ہے!؟ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید رضی اللہ عنہ کو بلوایا اور فرمایا: اب میرے نکاح کا پیغام بھی تم بی بی زینب کے پاس لے جاؤ۔ آپ تو یہی کہیں گے کہ خود بیوی کو طلاق دے کر اس کا نکاح کراتا پھرتا ہے، اس لئے کہ تم قرآن نہیں جانتے کہ جب طلاق دے دی تو عورت اجنبی ہوگئی تو اب غیرت کا کیا مطلب ہے؟ غیرت تو اس وقت تھی جب وہ بیوی تھی۔ حضرت زید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: جب میں پیغام لے کر آیا تو ان سے پشت کر کے کھڑا ہوگیا (کہ اب مجھے نظر ڈالنے کا حق نہیں ہے)، ان کو پکارا، انہوں نے پوچھا: کیا بات ہے؟ میں نے کہا: حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح کا پیغام لے کر آیا ہوں تو اب بی بی نے بھی نہیں کہا کہ تم عجیب آدمی ہو، کل تم میرے خاوند تھے، مجھے طلاق دے دی، اب تم کسی اور کا پیغام لے کر آگئے ہو۔ اس میں بھی ہمارے لئے سبق ہے۔ بی بی زینب رضی اللہ عنہا نے کہا: تم اتنا بڑا رشتہ لے کر آئے ہو، لیکن میں جواب نہیں دیتی، جب تک اللہ تعالیٰ سے نہ پوچھوں، اللہ تو اُن سے بھی بڑا ہے۔ اس کے بعد میں جواب دوں گی۔ حضرت زید رضی اللہ عنہ واپس آگئے تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھا تو انہوں نے عرض کیا: بی بی نے کہا ہے کہ میں اپنے رب سے استخارہ کروں گی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ٹھیک ہے۔ ابھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم غور فرما رہے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرائیل علیہ السلام کو بھیج کر قرآن نازل فرما دیا کہ اللہ کے نبی! آپ کیا سوچ رہے ہیں؟ ہم نے آپ کا نکاح خود کر دیا ہے، بی بی زینب آپ کی بیوی ہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے آکر دروازہ کھٹکھٹایا، تین دفعہ حکم پورا کر کے اندر گئے تو بی بی دوڑ کر اندر کمرے میں داخل ہوگئیں اور کہا: میرے گھر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم بغیر اجازت کے کیسے آگئے؟ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میرے اللہ نے میرا تمہارے ساتھ نکاح کیا ہے اور یہ قرآن کی آیات ہیں۔ بی بی زینب نے جو حضرت زید رضی اللہ عنہ کو پسند نہیں کرتی تھیں، لیکن اللہ کے حکم سے نکاح کر لیا تو اللہ نے ان کو یہ بدلہ عطا فرمایا کہ ان کو محمد مدنی صلی اللہ علیہ وسلم کی بیوی بنا دیا۔

یہ سارے اللہ تعالیٰ کے احکام ہیں۔ اب ایک آدمی کہے کہ میں نے دوسری شادی کرنی ہے، لیکن بیوی نہیں مانتی، وہ کب مانے گی؟ ہمارے ہاں اُلٹا چکر ہے، زنا کرتے رہیں گے، عشق بازیاں کرتے رہیں گے، دس پندرہ

عورتوں سے عشق معاشقے چلتے رہیں گے، وہ جائز ہے کہ چھوڑ و مردوں میں ایسے عیب ہوتے ہیں۔ اور اگر وہ مرد کہے کہ میں شادی کرتا ہوں تو سارا خاندان تلوار لے کر کھڑا ہو جائے گا کہ تم نے شادی کی تو ہم تمہاری بہن کو طلاق دے دیں گے۔

سات شہیدوں کی بیوہ کے نکاح کا واقعہ:

یہ کہاں کا اسلام ہے؟ بس ہم نے اسلام کا نام رکھا ہوا ہے۔ میدانِ جنگ ہے، خیمے لگے ہوئے ہیں، ایک بی بی بیٹھی ہوئی ہیں، صحابی نے باہر آ کر بیٹھ کر سلام کیا، انہوں نے جواب دیا۔ صحابی نے کہا: آپ بیوہ ہیں، عدت گزر چکی ہے، میں آپ سے شادی کرنا چاہتا ہوں اور میری ایک بات سن بھی لیں کہ شادی بھی کرنا چاہتا ہوں اور کل میں شہید بھی ہو جاؤں گا۔ تمہاری مرضی ہے، میں تو حضور اکرم ﷺ کی سنت پوری کرنا چاہتا ہوں۔ اس نے کہا: میرے سات خاوند پہلے شہید ہو گئے، آٹھویں آپ ہوں گے، گواہوں کو بلاؤ اور نکاح کر لو۔ ہمارے لوگ کسی ایسی عورت کو دیکھ لیں تو کہیں گے: یہ تو ڈائن ہے، جو بھی شادی کرتا ہے مر جاتا ہے۔ یہ ان کو پتہ نہیں کہ وہ شہادت کے مرتبہ پر چلا جاتا تھا اور وہ شہید کی بیوی کہلاتی تھی۔ لیکن ہم کہتے ہیں کہ شوہر مر گیا تو اب گھر بیٹھ جاؤ۔ یہ ہندوؤں کی باتیں ہیں، اسلام کی بات نہیں ہے۔ ہاں! اگر عورت صاحبِ اولاد ہے اور وہ خود نہیں چاہتی تو ٹھیک ہے، اس کی مرضی ہے۔ مومن کی شان یہ ہونی چاہیے کہ جہاں اللہ تعالیٰ کا حکم آ جائے تو سب سے پیارا وہی حکم ہو۔

﴿اِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ﴾ کی تفسیر:

اور جو لوگ اللہ کے سوا غیروں کی عبادت کرتے ہیں، ان کی منتیں مانتے ہیں، ان کے بارے میں فرمایا: ﴿وَلَوْ يَرَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْۤا اِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ ۙ اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعَذَابِ﴾ [البقرة:١٦٥] اس آیت کا بعض علماء نے یہ معنی کیا ہے کہ جب مشرکین اللہ تعالیٰ کا عذاب چکھیں گے، جہنم کو دیکھیں گے، اس وقت یہ جان لیں گے کہ تمام قوت و طاقت کی مالک اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، وہ اکیلا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں، تمام دنیا کا ذرہ ذرہ اس کے قہر، اس کی سلطنت اور اس کے غلبہ کے نیچے ہے۔ اللہ تعالیٰ کا سب پر حکم چلتا ہے اور اللہ تعالیٰ مشرکین و کافرین کو سخت عذاب کرنے والے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے احکام کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔ اب جو اُن کے کاہن، علماء اور سردار تھے جن کے کہنے پر وہ شرک کیا کرتے تھے، آج (قیامت کے دن) وہ کہیں گے کہ ہمارا تم سے کوئی

تعلق نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اس دن اُتباع متبوعین سے لڑیں گے اور متبوعین اُتباع سے لڑیں گے۔

مشرکین کی اقسام:

حضرت نوح علیہ السلام سے لے کر حضور اکرم ﷺ تک جتنے رسول اور نبی گزرے ہیں، ان کی جو اُمتیں گزری ہیں، ان اُمتوں میں جو غیر اللہ کی عبادت کرتے رہے، ان کی اتنی اقسام ہیں کہ ہم نہیں گن سکتے کہ مشرک کتنے تھے اور ان میں شرک کی کتنی اقسام تھیں؟ لیکن مشرکین کی جو بڑی قسمیں تھیں، ایک وہ جو بتوں کی پوجا کرتے تھے۔ بعض بتوں کے پجاریوں کا یہ عقیدہ تھا کہ ہمارا یہ بت فلاں فرشتے کی شکل میں ہے یعنی اصل وہ فرشتے کی عبادت کر رہے ہیں اور بت صرف نمونہ ہے، جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا تھا: تم خود جا کر ان خداؤں سے پوچھ لو۔ انہوں نے کہا: تم ہمارے ساتھ مذاق کرتے ہو، یہ کہاں بولتے ہیں؟ یہ کیسے بتا سکتے ہیں؟ تو ان کے دماغ میں یہ ہوتا تھا کہ یہ ملائکہ کی شکل ہے، ہم ان کی عبادت کریں گے تو گویا ملائکہ کی عبادت ہے۔

آج بھی دنیا کے اندر اگر کوئی کسی کا محبوب اور معشوق ہو تو آدمی اس کے فوٹو کو جیب میں رکھتا ہے۔ تو اس کا مطلب یہی ہے کہ فوٹو والے سے محبت ہے، فوٹو سے محبت نہیں ہے، یہ تو صرف اس کی یادگار ہے کہ جب چاہا اس کو دیکھ لیا۔ میرے محبوب کو پتہ چلے گا کہ یہ تو میرے عشق میں اس حد تک دیوانہ ہو گیا ہے کہ میرا فوٹو ہر وقت اس کی جیب میں ہے۔

یہی ان مشرکین بت پرستوں کا عقیدہ تھا کہ یہ بت فرشتے کی شکل ہے اور یہ بت فلاں جنوں کے سردار کی ہے۔ کیونکہ جن ہماری مدد کرتے ہیں، جب ہم اس کو پوجیں گے تو وہ خوش ہو جائے گا۔ تیسرا ان کا یہ عقیدہ تھا کہ جب اللہ والے فوت ہو جاتے تو ان کی صورت پر بھی وہ بت بنا لیتے تھے، کوئی اللہ کی صالحہ اور مقبول بی بی فوت ہو جاتی تو اس کی شکل بنا لیتے، جیسا کہ جب حضور اکرم ﷺ کعبہ میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا بھی بت ہے اور بی بی مریم علیہا السلام کا بھی بت ہے۔ وہ اصل عبادت بی بی مریم علیہا السلام کی کر رہے تھے، یہ بت تو نمونہ تھے۔ آج بھی عیسائیوں کے گرجا گھر پر صلیب بنی ہوئی ہے، وہ بھی جانتے ہیں کہ یہ صلیب کا نشان ہے۔ اصل تو ان کے نزدیک یہ ہے کہ یہ وہ صلیب ہے جس پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو پھانسی دی گئی، لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے اتنا پیار ہے کہ انہوں نے ان کی صلیب کو بھی علامت بنا رکھا ہے، اس لیے وہ جنگوں کے اندر بڑی بڑی سونے، چاندی کی صلیب آگے

گاڑھ دیتے کہ جب ہم اس صلیب کی عبادت کریں گے تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو پتہ لگے گا کہ میرے عاشق ہیں، جب عیسیٰ علیہ السلام راضی ہوں گے تو ہمارا کام ہو جائے گا۔ یہ ان کا اصل میں عقیدہ تھا، وہ پتھروں کے پجاری نہ تھے۔ آج بھی دیکھ لیں! ہندو پاک میں لوگوں نے اپنے بزرگوں کی بڑی بڑی تصویریں بنا کر گھر میں رکھی ہوئی ہیں، روزانہ ان پر پھول چڑھاتے ہیں، ان کا ادب کرتے ہیں۔

ڈاکوؤں کا بزرگ کی تصویر دیکھ کر سامان چھوڑ دینے کا واقعہ:

میں نے خود اخبار میں پنجاب کا ایک واقعہ پڑھا ہے کہ کچھ ڈاکوؤں نے ڈاکہ مارا، ایک بہت بڑے آدمی کے گھر میں داخل ہوئے، سارے گھر والوں کو ایک کمرے میں بند کر کے سارے گھر کی دولت سمیٹ لی، ایک کمرہ بچ گیا، ڈاکوؤں نے اس کو کھولا، تا کہ اس کمرہ میں جو مال ہے، وہ ہم نکالیں تو اس کے اندر ان کے پیر کی ایک قد آدم تصویر لگی ہوئی تھی۔ ڈاکو نے اس گھر والے سے پوچھا: اس بزرگ کی گھر میں تصویر کیوں لگائی ہوئی ہے؟ اس نے کہا: یہ ہمارے پیر و مرشد ہیں۔ ڈاکو نے باقی ڈاکوؤں کو بلایا اور کہا: جتنا سامان لوٹا ہے رکھ دو۔ ڈاکو نے کہا: اسی کے تو ہم مرید ہیں، یہ ہمارے پیر بھائی ہیں، ہم ان کے گھر میں تو ڈاکہ نہ ڈالیں۔

یہ بڑا مشہور واقعہ ہے۔ اب میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ہم نے جو گھروں میں تصویریں لگائی ہوئی ہیں، اگر کوئی ضعیف الاعتقاد مسلمان ہو تو وہ کہے گا: پیر نے بچا لیا ہے۔ یہ ایک اصولی بات ہے، جیسے ہندو کا بچہ ہو تو وہ کہتا ہے: بھگوان نے دیا ہے، اسی طرح عقیدے بگڑتے اور خراب ہوتے ہیں۔

بُراق کی تصویر بنانے والے:

اس لئے اب ہم لوگ اتنا آگے بڑھ گئے ہیں کہ ہم نے براق کا فوٹو بنا کر بھی گھر میں لگایا ہوا ہے۔ اب یہ براق کا فوٹو تخیلات کی پرواز تو بنا سکتی ہے ورنہ جب معراج ہوئی مکہ والوں کو بھی پتہ نہیں، اس فوٹو کھینچنے والے کو کیسے پتہ لگ گیا؟ میں نے بعض فوٹو دیکھے، اللہ معاف کرے کہ اوپر سر عورت کی شکل کا ہے اور باقی گھوڑے یا خچر کی شکل میں ہے۔ کیا اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کے لیے ایسی سواری بھیجی تھی جو عورت کی شکل رکھتی ہو؟ کیا یہ ادب ہے یا بے ادبی ہے؟ حضور اکرم ﷺ جنہوں نے کبھی غیر محرم عورت کو چھوا تک نہیں، جنہوں نے اسلام کی بیعت میں بھی کسی غیر محرم عورت کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں نہیں لیا، حضور اکرم ﷺ پردہ کراتے تھے، عورتیں دوسری طرف بیٹھ جاتی تھیں،

آپ ﷺ قرآن شریف پڑھتے، وہ کہتی جاتیں کہ ہم نے بیعت کی تو حضور اکرم ﷺ فرماتے: میں نے قبول کرلی۔ اب آپ لوگوں نے براق کی شکل عورت کی سی بنا دی ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک عورت اُڑ رہی ہے اور اس پر اللہ کا نبی بیٹھا ہوا ہے۔ معاذ اللہ! غیب کی چیزوں کے بارے میں ایسے تصورات قائم کر کے ایک چیز کا بنانا حرام ہے۔

ذی رُوح کے مصوّرین کو قیامت کے عذاب ہوگا:

دوسری بات یہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: جتنی ذی روح چیزیں ہیں، ان کی تصویر بلا وجہ بغیر کسی ضرورت کے کھینچنا موجب لعنت ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: سب سے زیادہ عذاب قیامت کے دن مصوروں کو، فوٹو بنانے والوں کو دیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: تم نے اس چیز کا فوٹو بنایا، اب تم ہی اس کے اندر روح ڈالو۔ بندہ کہے گا: اللہ میاں! میں روح نہیں ڈال سکتا۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: پھر نقل کیوں کی تھی؟ اور فرشتوں کو حکم ہوگا کہ اس کو جہنم میں ڈال دو۔

﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِي الْاَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۭ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۝ اِنَّمَا يَاْمُرُكُمْ بِالسُّوْۗءِ وَالْفَحْشَاۗءِ وَاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَي اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِــعُ مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَاۗءَنَا ۭ اَوَلَوْ كَانَ اٰبَاۗؤُھُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَـيْــــًٔـا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ ۝ وَمَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا كَمَثَلِ الَّذِيْ يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ اِلَّا دُعَاۗءً وَّنِدَاۗءً ۭ صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ۝﴾

[البقرة:١٦٨ تا ١٧١]

''اے لوگو! زمین کی حلال پاکیزہ چیزوں سے کھاؤ اور شیطان کے راستوں پر نہ چلو، وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔ وہ تمہیں گناہ اور گندے کاموں کا ہی حکم کرتا ہے اور ان باتوں میں اللہ پر جھوٹ نہ لگاؤ جن کو تم نہیں جانتے۔ اور جب ان سے کوئی کہے اس کی اتباع کرو جس کو اللہ نے اُتارا ہے کہتے ہیں: بلکہ ہم اس کی اتباع کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادوں کو پایا ہے۔ کیا اگرچہ ان کے باپ دادے کچھ عقل نہ رکھتے ہوں اور ہدایت پر نہ ہوں۔ اور کفر کرنے والوں کی حالت اس شخص کی طرح ہے جو اس کو پکارے جو نہ سنے، مگر صرف پکار اور آواز، یہ (کافر) بہرے، گونگے، اندھے ہیں (نصیحت کو) نہیں سمجھتے۔''

ماقبل آیات کے ساتھ ربط:

گزشتہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو توحید کا سبق دیا اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے توحید کے دلائل کا ذکر فرمایا اور اب ان آیات کے اندر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جب خالق اور مالک میں ہوں تو حلال اور حرام کرنے والا بھی میں ہوں تو ان آیات کا پچھلی آیات کے ساتھ اس طرح ربط بنا کہ مشرکین خود حلال کو حرام اور حرام کو حلال بناتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تم ایسا نہ کرو، بلکہ تم ان چیزوں کو کھاؤ اور پیو جو تمہارے لئے حلال ہیں اور طیب ہیں۔

﴿حَلٰلاً طَيِّبًا﴾ کا معنی:

﴿حَلٰلاً طَيِّبًا﴾ طیب کا معنی ہے: "پاکیزہ"۔ علماء نے فرمایا: ایک چیز فی ذاتہٖ حلال ہے، مثلاً بکری حلال ہے، لیکن اگر کوئی اس کو چوری کر کے کھائے تو حرام ہو جائے گی۔ اس لئے فرمایا کہ وہ چیز حلال بھی ہو اور پاکیز بھی ہو کہ اس میں کسی دوسری چیز کا دخل بھی نہ ہو۔

بعض علماء نے فرمایا: طیب کے ساتھ ایک اور چیز کا بھی اضافہ ہوتا ہے کہ حلال بھی ہو، پاکیزہ بھی ہو، تمہیں اس میں رغبت بھی ہو کیونکہ بعض چیزیں ایسی ہیں کہ طبیعت ان کی طرف رغبت نہیں کرتی۔ اور وہ چیز بدن یا عقل کو نقصان پہنچانے والی نہ ہو، مثلاً منشیات چرس۔ یہ بھی زمین سے پیدا ہوتی ہیں، لیکن حرام ہیں اور اس سے یہ اشارہ بھی ہو گیا کہ جو چیزیں حرام کی گئی ہیں وہ عقل یا بدن کو نقصان دیتی ہیں، پاکیزہ نہیں ہیں، اس لئے حرام کی گئی ہیں۔

﴿حَلٰلاً﴾ حلال کا مادہ "حَلَّ" ہے، بمعنی کسی گرہ کو کھولنا۔ گویا اللہ تبارک وتعالیٰ نے تمہارے لئے اس کی گرہ کو کھول دیا کہ تم اس کو کھا سکتے ہو۔ اور حلال وہ ہوتا ہے جو اللہ اور اللہ کا رسول حلال بتلائے۔ کیونکہ تمام چیزوں کا خالق و مالک اللہ ہے، ساری چیزیں اسی کی مِلک میں ہیں۔ اور جن کی دنیا میں کوئی مِلک ہی نہیں ہے، ان کو حلال و حرام کرنے کا کوئی اختیار نہیں ہے۔

حلال اور حرام چیز کا معیار:

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے لوگو! تمہارے لئے زمین کی چیزیں حلال کر دی گئی ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے، لیکن دو چیزوں کا خیال رکھنا ہے کہ وہ چیز اللہ کی شرع میں حلال اور پاکیزہ ہو اور ایسی چیز ہو جو نفس کو مرغوب ہو، ایسی چیز نہ ہو جو بدن یا عقل کو نقصان پہنچانے والی ہو کیونکہ بعض چیزیں ایسی ہیں جن کا اثر بدن پر پڑتا

ہے تو وہ حرام ہیں، مثلاً منشیات، بھنگ، چرس (زہر) وغیرہ۔ یہ بھی زمین سے پیدا ہوتی ہیں۔ بظاہر ان کے کاشت کرنے والوں کو جتنا بڑا پیسہ ملتا ہے، لیکن یہ انسان کی عقل کو نقصان بھی پہنچاتی ہیں۔ عقل جب زائل ہو جائے تو انسان ایسے کام کرتا ہے جس سے بڑا خسیس بن جاتا ہے اتنا تو حیوان بھی نہیں ہے، انسان کو اس لئے اشرف المخلوقات کا شرف ملا ہوا ہے کہ انسان خیر اور شر میں تمیز کرتے ہیں، جیسا کہ جب آدمی قاتل بن جائے تو اس کو انسانی خون لگ جاتا ہے اس سے بڑا کوئی جانور نہیں کہ اس کو لوگوں کے قتل کرنے میں مزہ آتا ہے اور اس آیت سے اشارہ ہو گیا کہ اے میرے بندے! جو چیزیں میں نے تمہارے لئے حرام کی ہیں، ان کے اندر تمہارا نقصان ہے یا تیرے بدن کو نقصان پہنچے گا یا تیری عقل کو نقصان پہنچے گا۔

اسلام نے خنزیر اور کتے کو نجس اور حرام قرار دیا اور کفار نے اسلام کے مقابلہ میں اتنا ان دونوں جانوروں کو ترجیح دی ہے اور کتے کو اتنی اہمیت دی ہے کہ اگر گھر میں چار بیٹے اور ایک کتا ہے تو یوں سمجھ لو کہ اس کے پانچ بیٹے ہیں، بلکہ کتا ان چار سے بھی زیادہ اہمیت رکھتا ہے اور اس کے نزدیک زیادہ وفادار کتا ہے۔

اور اسی طرح خنزیر ہے کہ ہر چیز کے اندر اس کا استعمال کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ معاف کرے، اب تو آپ کے جتنے بسکٹ وغیرہ بنتے ہیں یا عورتیں لپ اسٹک وغیرہ لگاتی ہیں، اس کے اوپر باقاعدہ لکھا ہوا ہوتا ہے کہ اس کے اندر سور کی چربی ہے۔ اس لیے وہ کہتے ہیں کہ ہم نے لکھ دیا ہے، اگر پھر بھی تمہارا مسلمان استعمال کرتا ہے تو اس کے اندر ہمارا کیا قصور ہے؟ اس طرح برش کے اندر خنزیر کے بال استعمال کرتے ہیں، اب ان کو بھی ماننا پڑ گیا ہے کہ خنزیر کے گوشت میں اور اس کی چربی میں یہ نقصان ہے۔

اس بات کو مان گئے ہیں کہ اگر کتا برتن میں منہ مارے تو اس کے منہ میں ایک ایسا جرثومہ ہوتا ہے جس کو آگ بھی نہیں جلاتی۔ اب ان کی تحقیق نے یہ بات مان لی ہے کہ وہ جرثومہ مٹی کے بغیر کسی چیز سے ختم نہیں ہوتا، جبکہ حضور اکرم ﷺ نے چودہ سو سال پہلے فرما دیا تھا کہ جب کتا کسی برتن میں منہ مار جائے تو اس کو سات دفعہ پانی کے ساتھ اور ایک دفعہ مٹی کے ساتھ مانجھو۔

اسی طرح یورپ والے اب خود کہتے ہیں کہ شراب نہ پیو۔ ان کے جو اچھے لوگ ہیں، وہ شراب نہیں پیتے۔ وہ کوشش کرتے ہیں کہ ہم شراب سے بچیں۔ اس پر انہوں نے بڑے بڑے پوسٹر، لٹریچر چھاپے کہ خبردار! شراب نہ پینا، اس کے اندر خطرناک چیزیں ہیں۔ دیکھیں! جیسا کہ انہوں نے اس کو اتنا اپنایا کہ اپنا سب لٹا بیٹھے ہیں اور سب

کچھ شراب کے پیمانوں میں تباہ و برباد کر دیا ہے، اب ان کو سمجھ آئی ہے۔

اس لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے میرے بندے! میں نے جو تیرے لئے حلال کیا ہے اس میں تیرے لئے بھلائی ہے اور میں نے جو چیزیں تیرے لیے حرام کی ہیں اس کے اندر تیرے لیے بھلائی نہیں ہے، تیرا کام یہ ہے کہ اپنے خالق و مالک کے حکم کی تعمیل کر، بلا وجہ دنیا کے اندر اپنی طرف سے نئی نئی چیزیں پیدا نہ کر۔

﴿وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۭ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ﴾... ''خطوات''، ''خطوۃ'' کی جمع ہے۔ دو قدموں کے درمیان جو جگہ ہوتی ہے اس کو ''خطوۃ'' کہتے ہیں۔

اللہ پاک وہ ذات ہے جس نے موت کو بھی پیدا کیا اور حیات کو بھی پیدا کیا، تاکہ تمہارا امتحان لیں کہ تم میں کون اچھے عمل کرنے والا ہے؟ کون اللہ تعالیٰ کی توحید پر چلنے والا ہے؟ اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: خبردار! شیطان کے پھندوں سے بچنا، وہ مختلف انداز میں حملہ کرتا ہے۔

مسجد کی طرف اُٹھنے والے قدم پر ثواب ملتا ہے:

(حدیث) اس لئے ایک حدیث مبارک میں آیا کہ بنو سلمہ انصار کا ایک قبیلہ تھا، ان کے گھر مسجد نبوی سے دور تھے، انہوں نے حضور اکرم ﷺ سے اجازت طلب کی کہ اگر آپ اجازت دیں تو ہم اپنے وہ گھر بیچ کر مسجد نبوی کے قریب آباد ہو جائیں، کیونکہ ہمیں بڑی دور سے آنا پڑتا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''دِيَارَكُمْ دِيَارَكُمْ تُكْتَبْ آثَارُكُمْ'' تم جتنے خطوات (قدم) اُٹھاتے ہو، ہر قدم پر نیکی ملتی ہے۔ اس لیے اپنے گھروں میں ہی رہو (اور وہیں سے مسجد نبوی میں نماز کے لئے آیا کرو) تو ہم نے مسجد نبوی کے قریب رہائش کو پسند نہ کیا۔ [مستخرج ابی عوانہ، رقم: ۸۹۴]

﴿خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ﴾ کی مختلف تفاسیر:

حضرت قتادہ رحمہ اللہ اور حضرت سدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ جتنے نافرمانی کے کام ہیں، سب شیطان کے راستے ہیں۔ حضرت عکرمہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہ شیطان کے وساوس کا مسئلہ ہے جو تجھ سے وسوسہ ڈالتا ہے اور تم اس پر چل پڑتے ہو۔

حضرت ابومجلز رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ گناہوں کے اندر جو منتیں مانتے ہیں کہ فلاں کام ہو جائے، مثلاً فلاں عورت سے میرا تعلق پورا ہو جائے تو ایسی منت ماننا یہ سب شیطان کے راستے ہیں۔

حضرت شعبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ایک آدمی نے منت مانی کہ میں اپنے بیٹے کو ذبح کروں گا۔ اس آدمی نے حضرت مسروق رحمہ اللہ کی خدمت میں آکر کہا تو آپ نے فرمایا: جاؤ، ایک دنبہ ذبح کرو، بیٹے کو ذبح کرنا شیطان کا طریقہ ہے کیونکہ اولاد کا ذبح کرنا حرام ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا تھا اور انبیاء کے خواب تو وحی ہوتے ہیں، پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو بھی بیٹا ذبح نہیں کرنے دیا اور تم اپنے بیٹے کو ذبح کرنے کی منتیں مان رہے ہو۔ یہ شیطان کا راستہ ہے، اس کو چھوڑ دو۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی خدمت میں ضرع اور نمک لایا گیا، آپ اس کو کھا رہے تھے تو ایک آدمی آپ کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ آپ نے فرمایا: تم بھی کھاؤ۔ اس نے کہا: میں نہیں کھاتا۔ آپ نے فرمایا: کیا تمہیں روزہ ہے؟ اس نے کہا: میں نے اپنے اوپر اس چیز کو حرام کیا ہوا ہے، میں اس کو نہیں کھاؤں گا۔ آپ نے فرمایا: عقل کرو، یہ شیطان کا راستہ ہے کہ اللہ کے حلال کو بلاوجہ اپنے اوپر حرام کر رہے ہو۔ تم کھاؤ اور اپنی قسم کا کفارہ ادا کرنا۔ جیسا کہ بعض لوگ اپنے بھائی سے جھگڑ کر کہہ دیتے ہیں کہ آئندہ مجھ پر تیرے گھر کا پانی بھی حرام ہے۔ یہ خطوات الشیطان ہیں، آدمی کو ایسی قسم پر قائم نہیں رہنا چاہیے، بلکہ فوراً اس قسم کو توڑے اور دس مسکینوں کو کھانا کھلائے۔

آج کل سب سے بڑے جھگڑے خاندانوں میں ہیں، کیونکہ سب لوگ شیطان کے راستے پر چل پڑے ہیں۔

حضرت ابورافع رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مجھے ایک دن اپنی بیوی پر سخت غصہ آیا۔ اس نے کہا: اچھا ایک دن میں یہودیہ ہوں، ایک دن میں نصرانیہ ہوں اور جتنے میرے غلام ہیں سب آزاد ہیں اگر تو نے مجھے طلاق نہ دی۔ میں نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی خدمت آکر عرض کیا تو آپ نے فرمایا: یہ شیطان کے راستے ہیں۔

اور اسی طرح میں حضرت زینب بنت اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا کے پاس آیا۔ یہ مدینہ منورہ میں بڑی فقیہہ عورت تھیں۔ انہوں نے بھی یہی فرمایا کہ یہ خطوات الشیطان ہیں، اس سے کچھ نہیں ہوتا۔ اسی طرح حضرت عاصم رحمہ اللہ کے پاس آیا تو انہوں نے بھی مجھے اسی طرح فرمایا۔

﴿وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ﴾ اس کا عام ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ تم شیطان کے راستوں کی پیروی نہ کرو۔ علماء نے فرمایا: ''خُطُوٰت'' جمع کا صیغہ ہے اور قرآن میں جہاں جہاں کفر کا لفظ آیا ہے تو وہاں بھی جمع کا صیغہ استعمال فرمایا ہے، اس میں اشارہ ہے کہ دنیا میں کفر کی کئی اقسام ہیں: کوئی سورج کے پجاری بن کر کافر ہو گئے، کوئی ستاروں کو متصرف مان کر کافر ہو گئے اور کوئی آگ کے پجاری بن کر کافر ہو گئے، کوئی بتوں کے پجاری بن کر کافر ہو گئے،

کوئی اللہ کے قرآن کا انکار کر کے کافر ہو گئے، بعض لوگ اللہ کے انبیاء کا انکار کر کے کافر ہو گئے، بعض لوگوں نے اللہ کے قرآن کو مانا، لیکن بعض احکامات کا انکار کر کے کافر ہو گئے۔ اسی طرح شیطان کے بھی گمراہ کرنے کے کئی راستے ہیں۔

قرآن میں آتا ہے کہ شیطان نے اللہ کی بارگاہ میں عرض کیا کہ میں تو راندۂ درگاہ بن گیا ہوں، لیکن میں تیرے بندوں کو بھی نہیں چھوڑوں گا، میں ان کو بھی گمراہ کروں گا، میں ان کے آگے سے بھی حملہ کروں گا، پیچھے سے بھی حملہ کروں گا، دائیں سے بھی حملہ کروں گا اور بائیں سے بھی حملہ کروں گا۔ یعنی آگے سے ان کو آخرت کا منکر کر دوں گا اور پیچھے سے ان کی دنیا کو ہلاک کر ڈالوں گا اور دائیں بائیں سے ان کے جوارح کو گناہوں میں مبتلا کر دوں گا۔ میں ان کو ہر معاملے کے اندر تیرا نافرمان بناؤں گا۔ تو شیطان کے کئی راستے ہیں، وہ ہر راستے سے لوگوں کو بھٹکاتا ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ شیطان کے طرق سے ہمیں محفوظ رکھیں۔

شیطان کے بھٹکانے کے بڑے عجیب انداز ہوتے ہیں۔ بعض لوگوں کو اولاد کی محبت گمراہ کر دیتی ہے، بعض لوگوں کو بیوی کی محبت گمراہ کر دیتی ہے اور بعض لوگوں کو دوست گمراہ کر دیتے ہیں۔

ایک حدیث مبارک میں آیا کہ آدمی خود بڑا اچھا ہوگا، لیکن بیوی کی وجہ سے جہنم میں چلا جائے گا۔ بعض لوگ ایسے ہوں گے جو اولاد کی وجہ سے جہنم میں چلے جائیں گے اور بعض لوگ ایسے ہوں گے جو دوستوں کی وجہ سے جہنم میں جائیں گے۔

شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے:

﴿اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ﴾ تحقیق شیطان تمہارا کھلا دشمن ہے۔ ایک دشمن تو ایسا ہوتا ہے کہ اس کا ہمیں علم نہیں ہوتا اور ایک دشمن ایسا ہوتا ہے جو کہہ دے کہ میں تمہارا دشمن ہوں۔ شیطان نے حضرت آدم علیہ السلام سے عداوت کی اور اس نے اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑے ہو کر بانگ دہل یہ بات کہہ دی کہ اے اللہ! میں تیرے بندوں کو تیرا نافرمان کروں گا۔ اللہ نے بھی فرما دیا: مجھے بھی اپنی عزت وجلال کی قسم! جنات وانس میں سے جو تیری پیروی کرے گا، میں ان سے جہنم بھر دوں گا اور جو میرے حقیقی بندے ہیں، ان پر تم کوئی غلبہ حاصل نہیں کر سکتے۔ شیطان کی عداوت حضرت آدم علیہ السلام سے شروع ہوئی اور آج تک چلی آرہی ہے۔ اس لیے اگر کوئی شخص اتنے بڑے دشمن سے احتراز

نہ کرے اور اس کے راستوں پر چلتا رہے تو اس جیسا بیوقوف کوئی نہیں ہوگا۔

﴿اِنَّمَا یَاْمُرُكُمْ بِالسُّوْٓءِ وَالْفَحْشَآءِ﴾... "اِنَّمَا" حصر کے لئے ہوتا ہے، یعنی شیطان تو تم کو صرف "سُوْء" اور "فَحْشَاء" کا حکم کرتا ہے۔ ﴿بِالسُّوْٓءِ﴾ کا معنی ہے ایسا کام جو شریف آدمی کو بُرا لگے۔ بعض نے فرمایا: ﴿بِالسُّوْٓءِ﴾ کا معنی بُرے افعال ہیں۔ ﴿وَالْفَحْشَآءِ﴾ کا معنی بے حیائی والا کام۔ قرآن نے زنا کو فاحشہ کہا ہے۔ اب دیکھیں! جتنے شیطانی کام ہیں، ان کے اندر ماسوائے برائی اور بے حیائی کے کچھ نہیں ملتا۔

شیطان کے حربے:

شیطان کہے گا فلم دیکھا کرو، فلم دیکھتے دیکھتے تمہیں کہے گا کہ ان کے اندر اچھی چیزیں بھی تو ہوتی ہیں، ان میں ہدایت کے سبق بھی تو ہوتے ہیں، جب تمہیں اس فلم کا عادی بنا لے گا تو تم کو بلیو پرنٹ پر لے جائے گا، پھر کہے گا: دیکھنے کا کیا فائدہ؟ اگر تم اپنی بیوی سے خود ایسے نہ کرو اور وہی حرکات اپنی بیوی سے کرنی شروع کر دے گا جو وہاں دیکھی ہوں گی اور اسی طرح کرتے کرتے وہ تمہیں زنا میں ڈالے گا۔ بے حیائی، برائی میں ڈالے گا، سود میں ڈالے گا، سٹہ میں ڈالے گا۔ دیکھو! یہ تو انعام ہے جس کے گلاس پر دس نمبر آیا، اس کو ہم دو ہزار روپے دیں گے۔ لیکن ہم نے یہ نہ سوچا کہ اس ایک نمبر کی تلاش پر کمپنیوں نے لاکھوں حاصل کر لئے اور لاکھوں میں سے ایک آدمی کو دو ہزار روپے دے دیا تو خوش ہو گئے۔ کیونکہ لوگوں کو تھوڑا تھوڑا لوٹا گیا، اس لئے احساس نہیں ہوتا۔

بدعت کے متعلق مسائل:

اور شیطان تم سے کہے گا: ﴿اَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ تم اللہ کی طرف ایسی باتیں منسوب کرو جن کا علم بھی نہیں رکھتے کہ یہ حلال ہے، یہ حرام ہے۔ حالانکہ حلال حرام کا اختیار اللہ کو ہے۔ علماء نے فرمایا: یہ تمہیں بدعت میں ڈالتا ہے کہ ایک ایسا کام جسے دین سمجھ کر کیا جائے اور ثواب کی اُمید سے کیا جائے حالانکہ اب اس کام پر ملتا ہے جو اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا ہے۔ ہمارا ایمان ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے ہمیں ساری خیر کی باتیں بتا دی ہیں، اپنی اُمت کو کامل دین پہنچا دیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس پر مہریں لگا دی ہیں۔

﴿اَلْیَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِیْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْكُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا﴾[المائدۃ:۳] اب دین میں کسی چیز کا اضافہ کرنا اور ایسے نئے نئے طریقے نکالنا، جن کی اصل نہ ہو، بدعت ہے۔ بعض کہتے ہیں: فلاں صحابی نے یہ

عمل کیا۔ انہوں نے اس لیے کیا کہ اس کی اصل موجود تھی، اور جب کسی حکم کی اصل موجود ہو تو وہ چیز بدعت نہیں ہوتی۔
مثال کے طور پر ہم کہتے ہیں کہ اذان سے پہلے صلوٰۃ وسلام یا اذان کے بعد پڑھنا بدعت ہے تو کوئی کہتا ہے کہ تراویح کو بھی بدعت کہو، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے کہا تھا کہ بیس رکعات پڑھو اور ایک قاری کے پیچھے پڑھو۔ آپ دیکھیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تراویح پڑھی ہیں چاہے جتنی رکعات پڑھی ہوں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک رات، دوسری رات بھی پڑھی، تیسری رات صحابہ رضی اللہ عنہم انتظار کرتے رہے، لیکن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نہ آئے۔ بہر حال اس سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا رمضان میں تراویح پڑھنا ثابت ہو گیا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جیسے میرا طریقہ سنت ہے اسی طرح میرے خلفاء راشدین کا طریقہ بھی سنت ہے:

"عَلَيْكُمْ بِسُنَّتِي وَ سُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الْمَهْدِيِّينَ الرَّاشِدِينَ، تَمَسَّكُوا بِهَا وَ عَضُّوا عَلَيْهَا بِالنَّوَاجِذِ."

[سنن ابی داؤد، رقم:۴۶۰۷]

میرے طریقے کو اور میرے بعد خلفاء راشدین کے طریقے کو لازم پکڑو۔ پھر جب حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے تمام صحابہ کو جمع کیا تو کسی ایک صحابی نے بھی مخالفت نہ کی، اس طرح اجماع صحابہ ہو گیا، اس سے ہمیں اصل مل گیا۔ لیکن اذان سے پہلے جو درود کا مسئلہ ہے، نہ تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی کوئی اصل ملتی ہے، ہمیں حضرت بلال رضی اللہ عنہ کا کوئی عمل ملتا ہے، نہ حضرت عبداللہ بن اُمِ مکتوم رضی اللہ عنہ سے، نہ حضرت ابو محذورہ رضی اللہ عنہ سے، نہ خلفاء راشدین سے اور نہ اجماع صحابہ سے کوئی عمل ملتا ہے، اس لیے اپنے ایجاد کیے ہوئے کام کے ثبوت کے لیے ان حضرات کے عمل سے مثال دینا کھلی غلطی ہے۔ دونوں کے اندر زمین و آسمان کا فرق ہے۔
اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: شیطان کے پھندے میں نہ آنا، کیونکہ یہ تمہیں کہے گا کہ اللہ پر ایسی ایسی باتیں کرو جن کا تمہیں علم بھی نہیں۔

حضرت عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کا شیطان سے مکالمہ:

حضرت عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ایک دن میں عبادت میں مصروف تھا، میں نے دیکھا کہ یکدم روشنی ہو گئی اور آواز آئی کہ عبدالقادر! ہم تم سے بہت خوش ہوئے، ہم نے آج کے بعد تم سے عبادت کی تمام تکلیفیں اُٹھا لیں، اب تم عبادت کرو یا نہ کرو، بس میرے پیارے ہو۔ مجھے فوراً سمجھ آگئی اور میں نے پڑھا، "أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ

الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْم'' کہ یہ شیطان ہی ہوسکتا ہے۔ اللہ نے جب اپنے نبی سے عبادت معاف نہیں کی تو میں کون ہوں؟ صحابہ سے عبادت معاف نہیں ہوئی، میرا مقام اتنا بلند ہوگیا ہے کہ مجھ پر فرض بھی معاف کردیئے ہیں؟ شیطان ظاہر ہوا اور کہا: عبدالقادر! تم عالم آدمی تھے، تمہارے علم نے تمہیں بچالیا، ورنہ میں نے ایسے کئی بزرگوں کی گردنیں توڑ ڈالی ہیں۔ حضرت عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے دوبارہ ''اعوذ باللہ'' پڑھ کر فرمایا: کمبخت! اب تُو مجھے اس طرح مارنا چاہتا ہے؟ مجھے تو میرے اللہ نے بچالیا ہے، علم نے نہیں بچایا۔ کتنے بڑے علم والے قادیانی بن گئے، صحابہ کے دشمن بن گئے، معتزلی بن گئے۔

اس لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ﴾ خبردار! شیطان کے طرق و وسائل کا شکار نہ ہوجانا، وہ دین والے کو دین کے طریقے سے مارتا ہے کہ عالم کو کہے گا تیرے جیسا اب تو عالم کوئی نہیں ہے، اگر کوئی تقریر اچھی ہوگئی تو شیطان دماغ میں ڈالے گا کہ کمال کردیا۔ اس طرح تکبر آیا تو انسان برباد ہوگیا۔ کسی عالم کے دماغ میں ڈال دیا کہ تم نے اللہ تعالیٰ کے لیے بڑا کام کیا ہے۔ یہ سب وساوس شیطانی ہیں، اللہ تعالیٰ ان سے حفاظت فرمائے۔ اسی طرح اگر ایک انسان صف اوّل کا نمازی ہے تو شیطان دماغ کے اندر ڈال دیتا ہے کہ تو صف اوّل کا نمازی ہے، اگر کوئی آدمی صف اوّل میں آکر بیٹھنا چاہے تو اس کو کہتا ہے کہ میں یہاں پچاس سال سے بیٹھ رہا ہوں۔ اس کو خواہ مخواہ بتاتا ہے حالانکہ کیا اس نے رپورٹ مانگی تھی کہ مجھے اپنی پچاس سال کی رپورٹ بتا۔

ایک اللہ والے کی تہجد قضا ہونے کا واقعہ:

ایک اللہ والے کی تہجد قضا ہوگئی، وہ سارا دن روتے رہے، اشراق پڑھ رہے ہیں، چاشت پڑھ رہے ہیں، سارا دن ذکر کررہے ہیں، اور رورہے ہیں کہ مولا! مجھ سے کونسا ایسا گناہ ہوگیا ہے کہ میں رات کی عبادت سے محروم ہوگیا ہوں؟ قاعدہ یہ ہے کہ آدمی جب عبادت سے محروم ہوتا ہے تو کوئی غلطی ہوتی ہے، جیسے آپ میرے ساتھ زیادتی کریں تو میں کہوں گا کہ آئندہ میرے گھر نہ آنا لیکن جب تک آپ غلطی نہیں کریں گے تو میں آپ کو منع نہیں کروں گا۔ بہرحال جب وہ اللہ والے رات کو سوئے تو مثلاً اگر تہجد کے ساڑھے تین بجے اُٹھتے تھے تو تین بجے شیطان نے آکر ان کو تہجد کے لئے اُٹھایا۔ جب وہ بزرگ بیدار ہوئے تو انہوں نے کہا: تم شیطان ہوکر مجھے نماز کے لئے جگا رہے ہو؟ شیطان نے کہا: آپ نے جو سارا دن اللہ کے آگے رو رو کر میرا ستیاناس کیا ہے، میں نے کہا: اس سے بہتر

ہے کہ تُو تہجد پڑھ لیا کرے، باقی عبادت نہ کرے۔ میں نے آپ کو ایک گھنٹے کی عبادت سے روکا، لیکن آپ نے بارہ گھنٹے اللہ تعالیٰ کی یاد میں لگا دیئے۔ اس لئے بارہ گھنٹے سے ایک گھنٹہ بہتر ہے۔ شیطان ہر آدمی کو اس کے طریقے سے گمراہ کرتا ہے۔

بے نمازی پیر کا واقعہ:

ایک پیر صاحب ہمارے ساتھ شریک سفر ہو گئے۔ ان کے ساتھ ایک ان کا مرید تھا جو مجھے روزانہ پیر صاحب کی کراتیں سناتا تھا۔ کبھی اس کی سُن لیتے تھے اور کبھی ٹال دیتے تھے۔ ایک دفعہ اتفاق ایسا ہوا کہ صبح کی نماز کے وقت میں نے پیر صاحب کو دس دفعہ جھنجھوڑا کہ حضرت! اُٹھیں، نماز جارہی ہے۔ وہ اوں آں کر کے پھر خراٹے لینے شروع کر دیتا تھا۔ میں وضو کر کے آیا، نماز کا وقت جارہا تھا، آخر میں نے بڑا ادب کرتے ہوئے حضرت کو گدے سے نیچے پھینک دیا، لیکن پھر بھی اس کی آنکھ نہ کھلی۔ اس کے بعد میں نے سوچا کہ حضرت کے لئے اب ایک طریقہ رہ گیا ہے کہ کوئی سوئی وغیرہ لے کر آؤں۔ آخر ہم دو آدمیوں نے نماز پڑھی اور ان بے چاروں نے پتہ نہیں پڑھی یا نہیں پڑھی، لیکن میرے سامنے نہیں پڑھی۔ کیونکہ میں نماز کے بعد چلا گیا تھا۔ جب ہم پیر اور مولوی یہ کریں گے تو لوگ کیسے نماز پڑھیں گے؟ ایک جلسہ یا جلوس شروع ہوگا، نمازیں ختم ہو جائیں گی، کوئی خدا کا خوف نہیں کرے گا کہ نماز کا وقت ہے۔

خان محمد کمتر کا واقعہ:

ایک شخص خان محمد کمتر نعت خوان ایسے گزرے ہیں، ایسے نماز پڑھتے تھے کہ ایسی نماز کسی مولوی کی بھی نہیں ہوگی۔ کئی دفعہ نماز کا وقت ہوا، گاڑی اسٹیشن پر رکی، حضرت نے نماز شروع کی، گاڑی چلی گئی، سامان بھی چلا گیا، لیکن انہوں نے نماز نہیں چھوڑی۔ یہ مجھے دوستوں نے بتایا ہے، میں نے ان کو نہیں دیکھا کہ وہ کالے رنگ کا لمبا تڑنگا آدمی تھا، مگر جب ان کو موت آئی تو اللہ تعالیٰ نے ان کا چہرہ اتنا روشن کر دیا جیسے کوئی تارا چمک رہا ہے۔ سب نماز کی برکت اور صحابہ رضی اللہ عنہم کی محبت کی برکت تھی۔

حلال رزق کی اہمیت:

مسند احمد کی حدیث میں ہے کہ حضور پاک ﷺ نے فرمایا:

"إِنَّ كُلَّ مَالٍ نَحَلْتُهُ عِبَادِي فَهُوَ لَهُمْ حَلَالٌ." [مسند احمد، رقم:۱۸۳۳۸]

کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: میں نے اپنے بندوں کو جو مال دیا، ان کے لئے حلال کیا۔

اوران چیزوں کوحرام کیا جوان کے لئے نقصان دہ تھیں اور جب میں اپنے بندوں کو پیدا کرتا ہوں تو ہر آدمی دین فطرت پر پیدا ہوتا ہے، شیاطین آکر ان کو گمراہ کرتے ہیں، ان کو ان کے دین سے ہٹا دیتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی عبادت سے ہٹا دیتے ہیں اور ان پر ان چیزوں کو حرام کر دیتے ہیں جو میں نے ان کے لئے حلال کی تھیں۔ کہتے ہیں: یہ بھی حرام ہیں۔

(حدیث) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نقل کرتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے یہ آیت مبارک تلاوت کی گئی: ﴿يَاأَيُّهَا النَّاسُ كُلُوا مِمَّا فِي الْأَرْضِ حَلَالًا طَيِّبًا وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ﴾ [البقرۃ:۱۶۸] حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے کھڑے ہو کر عرض کیا: یارسول اللہ! آپ میرے لئے دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ مجھے مستجاب الدعوۃ بنا دیں، جو بھی دعا کروں میری منظور ہو جائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"يَا سَعْدُ! أَطِبْ مَطْعَمَكَ تَكُنْ مُسْتَجَابَ الدَّعْوَةِ، وَ الَّذِي نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهِ إِنَّ الْعَبْدَ لَيَقْذِفُ اللُّقْمَةَ الْحَرَامِ فِي جَوْفِهِ مَا يُتَقَبَّلُ مِنْهُ عَمَلَ أَرْبَعِينَ يَوْمًا، وَ أَيُّمَا عَبْدٍ نَبَتَ لَحْمُهُ مِنْ سُحْتٍ فَالنَّارُ أَوْلَى بِهِ."

[الترغیب والترہیب:۲/۵۴۷]

اے سعد! اگر یہ چاہتے ہو تو اپنے کھانے کو پاکیزہ کرو (کیونکہ جب تیرے اندر رزق حلال ہو جائے گا اور تیرا کھانا حلال کا ہوگا تو دعائیں منظور ہوں گی)۔ مجھے قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری زندگی ہے بندہ کبھی ایک لقمہ حرام کا منہ میں ڈالتا ہے، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کی چالیس دن تک کی عبادت قبول نہیں ہوتی اور وہ بندہ جس کا بدن حرام سے پروان چڑھتا ہے اور سود سے پل رہا ہے اس کے لئے بہتر ٹھکانہ جہنم کی آگ ہے۔

دعائیں قبول کیوں نہیں ہوتیں؟

دوسری حدیث مبارک میں ہے، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"أَيُّهَا النَّاسُ! إِنَّ اللهَ طَيِّبٌ لَا يَقْبَلُ إِلَّا طَيِّبًا، وَ إِنَّ اللهَ أَمَرَ الْمُؤْمِنِينَ بِمَا أَمَرَ بِهِ الْمُرْسَلِينَ، فَقَالَ: ﴿يَا أَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوا مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَ اعْمَلُوا صَالِحًا، إِنِّي بِمَا تَعْمَلُونَ عَلِيمٌ﴾ وَ قَالَ: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ

آمَنُوا كُلُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ﴾، ثُمَّ ذَكَرَ الرَّجُلَ يُطِيلُ السَّفَرَ أَشْعَثَ أَغْبَرَ، يَمُدُّ يَدَيْهِ إِلَى السَّمَاءِ، يَا رَبِّ، يَا رَبِّ، وَ مَطْعَمُهُ حَرَامٌ، وَ مَشْرَبُهُ حَرَامٌ، وَ مَلْبَسُهُ حَرَامٌ، وَ غُذِيَ بِالْحَرَامِ، فَأَنَّى يُسْتَجَابُ لِذَلِكَ؟" [صحیح مسلم، رقم:۱۰۱۵/ جامع ترمذی، رقم:۲۹۸۹]

اے بندے! تیرا کھانا بھی حرام کا ہوتا ہے اور تیرا پینا بھی حرام کا ہوتا ہے، تیرا لباس بھی حرام کا ہوتا ہے، پھر کہتا ہے: یارب، یارب، یارب! اللہ تعالیٰ کو پکارتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: تیری دعائیں کہاں سے منظور ہوں گی؟ جبکہ تیرے اندر حرام ہی حرام ہے، تیرا لباس حرام ہے، تیرا کھانا حرام ہے۔

یہی وجہ ہے کہ آج ہم لاکھوں مسلمان دعائیں مانگتے ہیں، لیکن نتیجہ کوئی نہیں نکلتا۔ بہت کم مسلمان ہوں گے جن کا کھانا حلال کا ہے، جو ایک ایک پیسے کی فکر کرتے ہیں کہ کہاں سے آیا ہے، کہاں جا رہا ہے؟ ورنہ دشمن نے اس دور میں ایسا جال پھیلایا ہے آدمی جتنا بھی بچنا چاہے، لیکن نصیب والا بچ سکتا ہے، جیسا کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: میری اُمت پر ایک ایسا وقت آئے گا کہ لوگ سود تو نہیں کھائیں گے، لیکن سود کا دھواں ان کو بھی پہنچ جائے گا۔ صحابہ کے زمانہ میں ذرا بھی کوئی مشقت ہوتی، دعا کے ہاتھ اُٹھاتے تھے تو وہ تکلیف ختم ہو جاتی تھی۔

درد کے علاج کا نبوی نسخہ:

حضرت عثمان بن ابی العاص رضی اللہ عنہ ایک صحابی ہیں، فرماتے ہیں کہ مجھے اتنا شدید درد تھا جس نے مجھے تقریباً بے کار ہی کر دیا تھا تو مجھے نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اپنا دایاں ہاتھ اپنے درد کی جگہ پر رکھو اور یہ کہو: "بِسْمِ اللهِ، أَعُوذُ بِعِزَّةِ اللهِ وَ قُدْرَتِهِ مِنْ شَرِّ مَا أَجِدُ وَ أُحَاذِرُ" سات دفعہ پڑھ کر پھونک مارو تو مجھے اللہ تعالیٰ نے شفاء دے دی۔

اب ہم میں سے کسی کو درد یا تکلیف ہو تو یہ دعا سات دفعہ پڑھ لو۔ لیکن ہم سو دفعہ پڑھتے ہیں، درد بڑھ جاتا ہے، کم نہیں ہوتا۔ کیونکہ پڑھنے والی زبان گندی، ناپاک ہے تو کہاں سے اثر ہوگا؟ اللہ تعالیٰ کا فرمان برحق ہے، کلمات رسول اللہ ﷺ برحق ہیں، لیکن ہمارا کھانا اور لباس حرام ہے، صدقِ مقال اور اکلِ حلال نہیں ہے، اس لئے ہماری دعائیں منظور نہیں ہوتیں۔

قدرت کا امتحان ہے کہ ہر انسان کے ساتھ ایک شیطان ہے جو تمہارے دل کے اندر برائی کا خیال ڈالتا ہے کہ نماز نہ پڑھو، آؤ تفریح کرتے ہیں، کسی ہوٹل پر جا کر کوئی گانا سنتے ہیں تو سمجھو یہ شیطان کی طرف سے ہے اور جو

تمہارے دل میں اچھائی کا داعیہ پیدا کرے کہ نماز پڑھ لیں، پتہ نہیں پھر جماعت نہ ملے، یہ فرشتہ ہے جو تمہارے دل میں اچھی بات کا القاء کرتا ہے۔

چونکہ انسان کے اندر خیر کی طاقت بھی ہے اور شر کی طاقت بھی ہے، لیکن انسان اپنے اختیار سے ان دونوں میں سے ایک کو اختیار کرتا ہے۔ اگر خیر کا راستہ اختیار کرتا ہے تو ثواب کا مستحق بنتا ہے اور اگر کوئی برائی کا راستہ اختیار کرتا ہے تو عتاب کا مستحق بنتا ہے۔

اس آیت کے اندر دوسری جگہ یہ بات معلوم ہوئی کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: شیطان تمہارا کھلا دشمن ہے۔ اس لیے انسان کو چاہیے کہ اس سے ہوشیار رہے۔ اس کے دشمن ہونے کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے ہمیں خبر دی ہے۔ سب سے پہلے اس نے حضرت آدم علیہ السلام کے دل میں وسوسہ ڈالا، جس سے حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حواء علیہا السلام کو جنت سے نکلنا پڑا۔ یہ آج سے ہمارا دشمن نہیں، بلکہ ہمارے باپ سے دشمن ہوا اور اس نے قیامت تک ہمارے اندر وساوس ڈالنے ہیں۔ شیطان کی دشمنی کھلی ہے، لیکن وہ نظر نہیں آتا، ہم جنات وشیاطین کو نہیں دیکھ سکتے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ایسا پردہ ڈال دیا ہے کہ وہ تو ہمیں دیکھ سکتے ہیں، لیکن ہم ان کو نہیں دیکھ سکتے تو ایسا دشمن بڑا خطرناک ہوتا ہے، اس سے بچنے کا علاج یہ ہے کہ ''أَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ'' پڑھ کر اللہ کی پناہ پکڑو۔ اللہ کی ذات بڑی ہے، اس کو کوئی بھی نہیں دیکھ سکتا۔ جب تم اللہ تعالیٰ کی پناہ میں آ ؤ گے تب ہی شیطان کے فتنے سے بچ سکتے ہو۔

شیطان سے بچنے کا دوسرا طریقہ ذکر اللہ ہے۔ ہر وقت اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو، نماز، قرآن پڑھنا، طواف کرنا، ''لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ، سُبْحَانَ اللّٰهِ، اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ، اَللّٰهُ اَكْبَرُ'' یہ سب ذکر ہیں۔ جب تم اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے ہو تو شیطان دور ہو جاتا ہے اور جب تم اللہ تعالیٰ کے ذکر سے غافل ہو جاتے ہو تو شیطان اپنا ڈیرہ لگا لیتا ہے۔

طلاق ہر حال میں واقع ہو جاتی ہے:

طلاق مرد کا حق ہے اور یہ مسئلہ بڑا نازک ہے۔ طلاق کے لفظ سے بچنے کی کوشش کیا کرو۔ یہ لفظ اللہ تعالیٰ کو بڑا ناپسند ہے، اگرچہ حلال ہے۔ کیونکہ کبھی ایسے حالات ہو جاتے ہیں کہ طلاق کے علاوہ راستہ نہیں ہوتا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''ثَلَاثٌ جِدُّهُنَّ جِدٌّ وَ هَزْلُهُنَّ جِدٌّ: اَلنِّكَاحُ، وَ الطَّلَاقُ، وَ الرَّجْعَةُ.'' [جامع ترمذی، رقم:۱۱۸۴]

تین چیزیں ایسی ہیں جن کی حقیقت بھی حقیقت ہے اور مذاق بھی حقیقت ہے۔ نکاح، طلاق اور رجوع۔
اگر کوئی آدمی مذاق میں بھی بیوی کو کہہ دے کہ میں نے تجھے طلاق دی تو طلاق ہو جائے گی۔ کل اگر وہ کہے کہ میں تو مذاق کر رہا تھا، میں نے تو ڈرانے میں کہا تھا، حقیقت میں طلاق نہیں دی تھی، میری نیت بھی نہیں تھی، اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کیا دنیا میں یہی ڈرامے رہ گئے تھے کہ میرے حلال کو حرام کرتے رہو اور جب چاہو شریعت کے الفاظ سے کھیلتے رہو۔ اس لئے اسلام ایسی باتوں کی اجازت نہیں دیتا۔ اس لئے نکاح اور طلاق کے معاملہ میں احتیاط کریں۔
بعض لوگ کہتے ہیں: بچہ اور بچی چھوٹی تھی، دونوں کے والدین نے نکاح کر دیا تو وہ نکاح ہو گیا؟ جی ہاں! ہو گیا، کیونکہ دونوں کے ولی موجود ہیں اور کبھی اس طرح بھی ہوتا ہے کہ لڑکی کا والد کہتا ہے: میں نے اپنی لڑکی آپ کے لڑکے کو دی، اس نے قبول کر لیا تو نکاح ہو گیا۔ اس کے لئے کوئی ضروری نہیں ہوتا کہ اشٹام ہو، رجسٹر ہو۔ جیسے بعض لوگ آ کر کہتے ہیں کہ میں نے طلاق دی اور رجسٹری کر کے والدین کو پہنچائی کہ میری بیوی کو یہ پہنچا دیں۔ میرے والدین نے جب یہ دیکھا تو کہا: بڑا بیوقوف ہے۔ انہوں نے فوراً مجھے رجسٹری واپس کر دی تو کیا طلاق واپس ہو گئی؟ حالانکہ یہ مذاق نہیں، بلکہ جب تم نے طلاق لکھ دی تو واقع ہو گئی، اگرچہ وہ اس تحریر نامہ کو آگے نہ بھیجیں، تب بھی طلاق ہو گئی۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ میں نے طلاق بھیجی، میری بیوی نے وصول بھی نہیں کی حالانکہ اگر کسی آدمی کو بندوق سے گولی مارو تو وہ گولی وصول کرتا ہے؟ گولی، گولی ہے، وہ لگے گی، چاہے اس کو وصول کرو یا نہ کرو۔ بعض لوگ کہتے ہیں: میں نے جب طلاق دی تو عورت نہیں سن رہی تھی۔ حالانکہ طلاق تم دے رہے ہو، بیوی تو طلاق نہیں دے رہی۔ وہ طلاق سنے یا نہ سنے، اس کو طلاق ہو گئی۔
اس لیے اگر جھگڑا ہو جائے تو علیحدہ ہو جاؤ، غصہ کر لو، بیوی کو والدین کے گھر بھیج دو، اس سے بولنا چھوڑ دو، اس کے ہاتھ سے کھانا پینا چھوڑ دو، چار رشتہ دار درمیان میں ڈال کر کوئی حل نکالو، یہ نہیں کہ طلاق دے دو۔ ماشاء اللہ! ہمارے ہاں بعض ایسے لوگ بھی ہیں کہ کھانے میں ذرا نمک زیادہ ہو تو بیوی کو طلاق دے دی، اگر اس نے بھینسوں کا دودھ نہیں نکالا یا لیٹ ہو گئی تو تب بھی طلاق دے دی، اگر اس نے کپڑے دھوئے اور اچھے صاف نہ ہوئے تب بھی طلاق دے دی۔ اس طرح اگر جمع کریں تو مہینہ کی تقریباً دو اڑھائی ہزار طلاق بن جاتی ہے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ.

میاں بیوی میں لڑائی پر شیطان زیادہ خوش ہوتا ہے:

حدیث مبارک میں آتا ہے کہ ابلیس لعین باقاعدہ اپنے ماتحتوں سے رپورٹ لیتا ہے جو ماتحت کہے کہ میں نے

میاں بیوی کو لڑا دیا ہے تو شیطان اس کو اپنے پاس بٹھاتا ہے اور کہتا ہے کہ تُو نے اصل کام کیا ہے کہ اب دو خاندان لڑیں گے، قتل تک نوبت آجائے گی، لڑائیاں بڑھیں گی، جائیدادیں تقسیم ہوں گی، مرد علیحدہ گناہ کرے گا اور عورت علیحدہ گناہ کرے گی۔

طلاق دینے کا سنت طریقہ:

اگر کبھی ایسے حالات پیدا ہو جائیں کہ تیری بیوی کے ساتھ گزر بسر نہیں ہوتی تو اپنے علاقے کے عالم کے پاس جا کر مسئلہ پوچھ کر طلاق دو۔ آدمیوں کے سامنے ایک طلاق دے دو۔ یہ نہیں کہ طلاقوں کی ایک لمبی چوڑی لسٹ لگا دو۔ اور وہ ایک طلاق بھی اس وقت دو جب عورت حیض سے پاک ہو اور تم نے اس سے ان پاکی کے دنوں میں جماع بھی نہ کیا ہو، کیونکہ اسلام چاہتا ہے کہ تم کسی طرح دوبارہ مل جاؤ، صلح ہو جائے۔ لیکن جب کوئی حل باقی نہ رہے تو اگلے ماہ دوسری طلاق دے دو، اگر پھر بھی طلاق دینی ہو تو اگلے تیسرے پاکی کے دنوں میں تیسری طلاق دو۔

زمانۂ جاہلیت کی رسمِ بد کی تردید:

یہ جاہلیت کی بات ہے کہ جب تم نے طلاق دے دی، پھر کہو کہ اگر تم نے آگے شادی کی تو تجھے قتل کر دوں گا۔ یہ گناہ کبیرہ ہے۔ اب طلاق کے بعد وہ تمہارے لئے ایک اجنبی عورت ہے اور تم اجنبی مرد ہو۔ اس کی مرضی ہے جہاں چاہے شادی کرے۔ اگر تم اس کا راستہ روکو گے تو وہ زنا کرے گی، اس کا گناہ تمہارے بھی حساب میں لکھا جائے گا۔

غصہ میں قسم یا منت ماننا بھی شیطانی دھوکہ ہے:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے تھے کہ اگر کوئی آدمی غصے میں آ کر قسم کھا لیتا ہے یا منت مان لیتا ہے یہ بھی شیطان دھوکہ میں ڈالتا ہے۔ اس کا علاج یہ ہے کہ وہ کفارہ ادا کرے، دس مسکینوں کو کھانا کھلائے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یہ بدبخت شیطان جب بھی تمہیں حکم کرے گا تو بُرے افعال کا حکم کرے گا، زنا کا حکم کرے گا، بُرائی کا حکم دے گا اور سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ یہ تمہیں ایسی باتوں میں ڈالے گا کہ اللہ نے یہ کہا ہے۔ حالانکہ وہ کام خود کرے گا۔ اس سے پوچھیں کہ یہ کہاں لکھا ہے؟ تو کہے گا: بزرگوں نے کہا ہے۔ یہ کون سے بزرگ ہیں تو نہیں بتائے گا تو یہ بھی اللہ تعالیٰ پر جھوٹ بولنا ہے، ہر کافر اور ہر بدعتی اس قول میں داخل ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ پر جھوٹی باتیں بناتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو بدعات سے بچائے اور اتباعِ سنت کی توفیق دے۔



کوئی ایسا مسئلہ جو توحید سے تعلق رکھتا ہے یا نبوت ورسالت سے تعلق رکھتا ہے یا اثباتِ معاد سے تعلق رکھتا ہے اور ان کے علاوہ بھی اللہ تعالیٰ نے کوئی ایسا مسئلہ بیان نہیں کیا کہ جس کی دلیل نہ دی ہو۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ کسی دلیل تک آپ پہنچ سکے اور کسی پر آپ نہیں پہنچ سکے، اس میں عقل کا تو قصور ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کے حکم کا کوئی قصور نہیں ہے۔

مثلاً آج سے پچاس سال پہلے جب سادگی کا زمانہ تھا، پردہ کا زمانہ تھا، اس وقت جرائم کا کیا عالم تھا اور اب جب عورتیں سڑکوں پر نکل آئیں تو اب جرائم کا کیا حال ہے؟ پہلے دور میں دیہاتوں میں ایک رسم ہوتی تھی، کالی آندھی چلتی یا سرخ آندھی چلتی تو کہتے تھے کہ زمین پر کہیں قتل ہو گیا ہے۔ ٹھنڈے دل سے غور کریں! جب آپ نے فلمیں دیکھیں، بچوں نے فلمیں دیکھیں کہ پچاس سال کے پہلے والے بچوں کے اندر کتنی حیاء تھی اور اب کے بچے کے اندر کتنی حیاء ہے؟ بہر حال اللہ تعالیٰ نے جتنے بھی مسائل بیان فرمائے ہیں، ان کے دلائل بھی دیئے ہیں۔

مسئلہ تقلید:

﴿وَمَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا كَمَثَلِ الَّذِيْ يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ اِلَّا دُعَآءً وَّنِدَآءً ؕ صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ﴾ [البقرۃ:۱۷۱] بعض حضرات اس آیت مبارکہ کو لے کر تقلید پر اعتراض کرتے ہیں کہ باپ دادا، بزرگوں کے طریقے پر چلنے کو اللہ نے شرک اور حرام قرار دیا ہے۔ یہ افراط وتفریط میں پڑنے والی بات ہے۔ ایک حق کی تقلید ہے اور ایک باطل کی تقلید ہے۔ باطل کی تقلید میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ کفر وشرک ہے۔ اسی آیت میں غور کریں جس آیت کو اللہ تعالیٰ نے کفار ومشرکین کے لئے اُتارا، اس کو مسلمانوں پر چسپاں نہ کرو۔ ﴿اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْـًٔا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ﴾ [البقرۃ:۱۷۰] اس آیت کے اندر آرہا ہے کہ ان کے باپ دادا میں عقل بھی نہیں ہے اور ہدایت بھی نہیں ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ اگر ماں باپ میں عقل بھی ہو اور ہدایت بھی، تب ان کی بات ماننی جائز ہے، جیسا کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا: ﴿اِنِّيْ تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ۝ وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَآءِيْۤ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ﴾ [یوسف:۳۷، ۳۸] میں نے اس قوم کے طریقہ کو چھوڑ دیا ہے جو کافر ومشرک ہیں، میں تو ان کی اتباع کرتا ہوں جو میرے آباء واجداد گزرے ہیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت اسحاق علیہ السلام، حضرت یعقوب علیہ السلام۔ اس سے معلوم ہوا کہ اگر ماں باپ ہدایت والے ہوں اور ہدایت کی بات کریں تو ان کی بات ماننا قابل تعریف ہے۔

کیونکہ اس کا تو اللہ تعالیٰ نے ہمیں حکم دیا ہے کہ ﴿فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ [النحل: ۴۳] اب ہر آدمی تو مقامِ مجتہد کو نہیں پہنچ سکتا تو مجتہدین سے پوچھنا ہوگا، علماء سے پوچھنا ہوگا، اس کے بعد عمل کرنا ہوگا۔ اس لیے افراط وتفریط کے اندر کبھی ہم قرآن کی وہ آیات جو اللہ تعالیٰ نے کافروں کے لیے بھیجی ہیں، وہ ہم مسلمانوں پر بھی لگا دیتے ہیں، حالانکہ سیاق وسباق دیکھنا چاہیے، اوّل سے آخر تک آیات کو دیکھیں۔ ﴿اِذْ تَبَرَّاَ الَّذِيْنَ اتُّبِعُوْا مِنَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا﴾ [البقرۃ: ۱۶۶] قیامت والے دن بڑے اور چھوٹے ایک دوسرے سے علیحدہ ہو جائیں گے، یعنی کافر جو اتباع کرنے والے اور اتباع کرانے والے، ﴿وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنَ النَّارِ﴾ [البقرۃ: ۱۶۷] کافر جہنم سے کبھی نہیں نکلیں گے۔ ورنہ اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا: حلال وطیب کھاؤ۔ یہ مسلمانوں کو حکم ہے، نہ کہ ان لوگوں کو جو بتوں کے نام پر اپنے جانور چھوڑ کر حرام کر دیتے تھے اور اللہ تعالیٰ پر ایسی باتیں کرنا جو اللہ تعالیٰ نے نہیں فرمائی ہیں، یہ بھی کافروں کا شیوہ ہے، مسلمان اللہ پر ایسی بات نہیں کر سکتا۔ اور جب ان کافروں کو کہا جاتا ہے کہ تم میرے پاک پیغمبر کا کہا مانو تو کہتے ہیں کہ ہم تو اپنے باپ دادا کے طریقہ پر ہیں۔ لہٰذا ان تمام آیات کا سیاق وسباق مشرکین کے حق میں ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اندھی تقلید جس میں کفر وشرک آ جائے، جس میں ہم باطل کی تقلید کریں، اللہ کے قرآن، احکام اور سارے مسائل کو چھوڑ کر اس کے خلاف چلیں، ایسی تقلید کے حرام ہونے میں کسی کو شبہ نہیں ہے۔ اگر ایک آدمی جاہل ہے، قرآن بالکل نہیں پڑھ سکتا یا پڑھ تو سکتا ہے، لیکن اس سے جو مسائل اخذ ہوتے ہیں وہ ان کو نہیں سمجھ سکتا، اس کے لیے حکم ہے: ﴿فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ﴾ وہ علم والوں کے پاس جا کر مسائل پوچھے اور ان کی پیروی کرے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ [النحل: ۴۳] اگر تم مسئلہ نہیں جانتے تو اس سے پوچھو جو عالم ہے۔ اگر کسی عالم کے اندر استنباط کی تمام شرائط پائی جاتی ہوں تو اس کو کسی کی تقلید کی کوئی ضرورت نہیں ہے اور اگر ایک آدمی اتنا علم نہیں رکھتا کہ قرآن کے مسائل کا استنباط کر سکے، وہ ناسخ اور منسوخ کا علم نہ رکھتا ہو، احادیث مبارکہ کی تاریخوں کا علم نہ رکھتا ہو تو ایسا آدمی لازماً کسی سے مسئلہ پوچھے گا۔ اگر یہ بات نہ ہو تو پورا نظام درہم برہم ہو جائے۔ بخاری شریف اور مسلم شریف میں احادیث آ جائیں تو ہم ہر حدیث پر ان سے دلیل نہیں مانگتے، بلکہ کہتے ہیں کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے فرمایا ہے، صحیح ہے۔ حالانکہ تحقیق تو انہوں نے فرمائی ہے، ہم نے ان کے لکھے ہوئے پر آنکھیں بند کر کے یقین کر لیا، کیونکہ ہمارا ایمان ہے کہ انہوں نے تحقیق کر کے جو احادیث لکھی ہیں، کوئی حدیث ایسی نہیں ہے جو قابلِ اعتراض ہو۔ جب فقہ کا مسئلہ آیا تو ہم نے امام شافعی رحمہ اللہ، امام احمد رحمہ اللہ، امام

ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی فقہ کی طرف رجوع کیا، کیونکہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اور امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ بھی مسائل میں ان کی طرف رجوع کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ ان سب پر اپنی کروڑوں رحمتیں نازل فرمائے۔

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے پاس غیر مقلد عالم مولانا ثناء اللہ رحمۃ اللہ علیہ بیٹھے ہوئے تھے کہ مسئلہ تقلید کا موضوع چل پڑا تو مولانا نے بڑی تقریر فرمائی، تاکہ اقبال کچھ سنے...... کیونکہ وہ حنفی آدمی ہے...... جب تقریر ختم کی تو علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ سے مخاطب ہوئے کہ اقبال! تمہیں بھی کچھ میری تقریر سمجھ آئی ہے یا اپنے کسی شعر میں تحقیق کر رہے ہو؟ انہوں نے کہا: میں نے آپ کا ایک ایک لفظ بڑے غور سے سنا ہے۔ مولانا ثناء اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: پھر آپ کا کیا خیال ہے؟ انہوں نے کہا: حضرت! مجھے تو بات سمجھ نہیں آئی، یوں سمجھ آتا ہے کہ اگر اماموں کا مسئلہ ہی ختم کر دیں تو جیسے بے امام نماز ہو تو کوئی رکوع میں پڑا ہوگا اور کوئی سجدے میں پڑا ہوگا، ان کو کسی بات پر جمع کرنے کے لئے کسی کا کہنا ماننا ہوگا، ورنہ نظام نہیں چل سکتا، نظام عائلی چلانے کے لئے بھی آپ کو گھر میں کسی کو بڑا بنانا پڑے گا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر تم سفر کرنے کے لیے نکلے ہو تو ایک آدمی کو اپنا امیر بناؤ اور اپنے امیر کے حکم پر چلو۔

نماز میں ﴿صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ ﴾ [الفاتحہ] سے سبق ملا کہ اے اللہ! ہمیں ان لوگوں کے راستہ پر چلا جن پر تیرا انعام ہے۔ ان سے راستہ پر نہ چلانا جو گم کردہ راہ ہیں یا مغضوب ہیں۔ جن لوگوں پر تُو نے انعام فرمایا، وہ لوگ یہ ہیں: ﴿فَأُولَٰئِكَ مَعَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِينَ ۚ وَحَسُنَ أُولَٰئِكَ رَفِيقًا ﴾ [النساء: ٦٩] صرف انبیاء کا ذکر کافی تھا، لیکن آگے صدیقین، شہداء اور صالحین کا ذکر فرمایا۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہر آدمی کو ان چار میں سے کسی نہ کسی سے تو رہنمائی لینی پڑے گی، اتباع کرنی پڑے گی۔

بعض مسائل ایسے ہوتے ہیں جو میدانِ جنگ سے تعلق رکھتے ہیں، وہ شہداء مجاہدین سے معلوم ہوں گے اور بعض مسائل ذکر وفکر اور علم سے تعلق رکھتے ہیں، وہ صالحین سے معلوم ہوں گے۔ اس لیے ائمہ مجتہدین کی تقلید یا ائمہ اربعہ کی تقلید یہ نہیں کہ وہ قرآن کے مخالف ہیں اور ہم ان کی تقلید کریں، بلکہ ان لوگوں نے قرآن وحدیث کو سمجھ کر عام لوگوں کے لئے قرآن وحدیث کے مسائل کو آسان کر دیا ہے۔ جیسے آپ کو کوئی آدمی حج کی کتاب لکھ کر دے تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ اسی مولوی کی بات کو مان رہے ہیں، بلکہ آپ نے کتاب تو مولوی کی لکھی ہوئی لی ہے، لیکن اس نے احکام جو نقل کئے ہیں وہ قرآن وسنت کے نقل کئے ہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں قراءت کا کوئی

مسئلہ ہوتا تو آپ ﷺ فرماتے: اُبی بن کعب بڑا قاری ہے، تفسیر قرآن کا مسئلہ ہے تو عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ، فقہ کا مسئلہ ہے تو عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، قضاء کا مسئلہ ہے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ، اور اگر مجموعی مسائل ہیں، کوئی علم کا پہاڑ ہے تو وہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں، امتیاز بین الحق والباطل فاروق رضی اللہ عنہ، اس کے بعد میرے خلفاء راشدین میں حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ ہیں۔ اس زمانے میں بھی لوگ ان بڑے بڑے صحابہ سے جا کر مسائل پوچھتے تھے۔ کتنی آیات اور کتنی احادیث رسول ہیں، جب لوگوں نے ان کے سامنے آ کر پڑھیں تو ان صحابہ رضی اللہ عنہم نے فرمایا: تم نے اس کو سمجھا ہی نہیں۔

لہٰذا اہل حق کے راستے پر چلنا، مجتہد سے راستہ کا پوچھنا، جاہل کا عالم سے پوچھنا، عین دین ہے، اس کے بغیر دین میں گزارا نہیں ہے۔ وہ تقلید حرام ہے جو کافر کرتے تھے کہ قرآن کو چھوڑ کر ماں باپ کی تقلید کرتے تھے اور یہ تقلید حرام ہے کہ آدمی کو اللہ کا قرآن ملے اور وہ کہے کہ مجھے میرے باپ نے یہ کہا ہے۔ اللہ تعالیٰ ایسی اندھی تقلید سے بھی ہمیں بچائے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں حق پر چلنے کی توفیق دے اور حق والوں کے ساتھ رکھے اور اسلام پر موت عطا فرمائے۔

اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایک دن میں پانچ وقت نماز کا پابند کیا اور حکم دیا کہ ایک امام کے پیچھے آ کر کھڑے ہو جاؤ اور کبھی تو یہ ہوتا ہے کہ امام تھوڑا پڑھا لکھا ہوتا ہے اور پیچھے بڑے بڑے علماء آ کر کھڑے ہو جاتے ہیں، ان کی نماز ہو جاتی ہے۔ کیونکہ حضور اکرم ﷺ نے سکھا دیا کہ جب امام تکبیر کہے تو تم بھی تکبیر کہو (جب تک وہ کھڑا رہے تو تم بھی کھڑے رہو۔ تمہاری یہ جرأت نہیں ہونی چاہیے کہ تم اس سے پہلے اللہ اکبر کہہ دو اور رکوع میں چلے جاؤ)۔ حضور اکرم ﷺ نے فرما دیا کہ جب وہ رکوع کرے تو تم بھی رکوع کرو اور جب وہ سجدہ کرے تو تم بھی سجدہ کرو۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی حدیث کے اندر ہے کہ جب وہ پڑھے تو تم چپ رہو۔ یہ سارا کام اس لیے سکھایا ہے کہ ایک کے پیچھے چلنے کا روزانہ پانچ دفعہ سبق دہرایا جائے اور غلطی نہ ہو۔

کافروں کی مثال:

اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان آیات کے اندر کافروں کی مثال بیان فرمائی، جیسے کوئی جانور باہر چرنے والا ہو، وہ بھی کچھ نہیں سمجھ سکتا جب اس کو چرانے والا اس کو آواز دے کہ آگے گڑھا ہے یا راستہ خراب ہے، وہ جانور تو نہیں جانتا۔ بس آواز سن رہا ہے۔ یہی حال کافروں کا ہے کہ وہ سنتے تو ہیں، لیکن سمجھتے نہیں ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: اس مثال کا مقصد یہ ہے کہ جیسے یہ بتوں کو پکارتے ہیں حالانکہ بت نہ سنتے ہیں، نہ دیکھتے ہیں اور نہ سمجھتے ہیں۔ مفسر رحمہ اللہ فرماتے

ہیں کہ پہلی مثال راجح ہے کہ مشرکین کی مثال یہ ہے کیونکہ بت تو بالکل سنتے بھی نہیں ہیں اور نہ دیکھتے ہیں اور نہ پکڑ سکتے ہیں اور نہ ان میں کوئی زندگی ہے۔

﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُلُوا مِن طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ وَاشْكُرُوا لِلَّهِ إِن كُنتُمْ إِيَّاهُ تَعْبُدُونَ ﴿١٧٢﴾ إِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنزِيرِ وَمَا أُهِلَّ بِهِ لِغَيْرِ اللَّهِ ۖ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَلَا عَادٍ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿١٧٣﴾﴾ [البقرة: ۱۷۲، ۱۷۳]

''اے ایمان والو! کھاؤ حلال چیزوں سے جو ہم نے تمہیں رزق دیا ہے اور اللہ کا شکر ادا کرو اگر تم اسی کی عبادت کرنا چاہتے ہو۔ بلاشبہ تم پر حرام کیا ہے (کھانا) مردار، خون اور خنزیر کے گوشت کا اور جو غیر اللہ کا نام لے کر ذبح کیا گیا۔ پس جو مجبور ہو جائے، نہ نافرمانی کرے اور نہ زیادتی تو اس پر کچھ گناہ نہیں، اللہ بخشنے والا بڑا مہربان ہے۔''

خطابِ مؤمنین:

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے ہم کو سمجھایا کہ کفار کی عادت تھی کہ خود ہی چیزوں کو حرام کر دیتے تھے۔ فرمایا: یہ غلط بات ہے، بلکہ ہم نے زمین میں جو کچھ تمہارے لیے پیدا کیا ہے، یہ ہماری نعمت ہے، ان کو کھاؤ لیکن شرط یہ ہے کہ دو چیزوں کا خیال رکھو۔ جو چیز استعمال کرو، وہ حلال ہو یعنی جس کو اللہ تعالیٰ نے حلال کیا ہے اور وہ چیز پاکیزہ اور پسندیدہ بھی ہو۔ اس لیے اگر ایک چیز حلال تو ہے، لیکن اس کو ذبح نہ کیا گیا تو وہ طیب نہ رہی۔ اسلام دین رہبانیت نہیں، جیسے عیسائیوں نے رہبانیت کو دین بنالیا کہ غاروں میں بیٹھ جاؤ، کھانا چھوڑ دو گوشت نہیں کھاتے، دودھ نہیں پیتے، شادی نہیں کرتے، لوگوں کے ساتھ میل جول نہیں رکھتے۔ اسلام اس رہبانیت کی اجازت نہیں دیتا، بلکہ اسلام کہتا ہے کہ آپ معاشرہ میں اللہ کے دین کے نائب اور مبلغ، داعی بن کر رہیں، لوگوں کو بھلائی کا حکم کریں، برائی سے ان کو منع کریں۔ یہ عقیدہ نہ رکھیں کہ جو نہیں کھاتا وہ بڑا بزرگ ہے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ بعض اللہ والے اللہ کی عبادت میں اتنے محو ہو جاتے ہیں کہ ان کو عبادت میں اتنی لذت ملتی ہے کہ وہ کھانے کے لیے وقت نہیں نکال سکتے یا ان کو کھانے کی طلب نہیں ہوتی۔ یہ بات نہیں ہے کہ وہ کھانے کو حلال نہیں سمجھتے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اگر ہم نے

آپ کو کوئی نعمت دی ہے تو اس نعمت کا اثر آپ پر بھی ظاہر ہونا چاہیے، لیکن اس کے اندر فضول خرچی بھی نہ کرو۔ یہ نہیں کہ میک اپ سنگھار پر لاکھوں روپے خرچ کرو۔ یہ بھی منع ہے، اسی طرح بخل بھی منع ہے۔قرآن نے اس کا نقشہ کھینچ کر فرمایا: ﴿وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً إِلَى عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُومًا مَّحْسُورًا﴾ [بنی اسرائیل:۲۹] کہ ہاتھوں کو ایسے بھی نہ کرو بالکل گردن پر باندھ دو کہ کچھ خرچ بھی نہ کرو، اور نہ ایسا کرو کہ بالکل کچھ بھی نہ بچے کہ پھر اُداس اور غمزدہ ہو کر بیٹھے رہو۔ بلکہ میانہ روی اختیار کرو۔

ان آیاتِ مبارکہ کے اندر بھی اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یہ ساری چیزیں اللہ تعالیٰ نے پیدا کی ہیں، ان نعمتوں سے انسان کو فائدہ اُٹھانا چاہیے اور پھر اللہ تعالیٰ کا شکر کرنا چاہیے۔

شکر کا معنیٰ:

﴿وَاشْكُرُوْا لِلّٰهِ﴾ جو ہم نے بنا رکھا ہے کہ روٹی کھا کر کہہ دیا کہ اللہ میاں! تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے، یہ شکر نہیں ہے۔ ہم نے سنت کو ختم کر دیا ہے اسی طرح سود کا پیسہ زیادہ مل جائے یا رشوت کا پیسہ ٹھیک ٹھاک مل جائے اور اس سے پوچھا جائے کہ کیا حال ہے تو کہتا ہے کہ اللہ کا بڑا شکر ہے۔ یہ تو اللہ کے عذاب کو دعوت دینے والی بات ہے۔ یہ تو ایسے ہی ہے کہ کوئی زنا کرے اور پھر کہے کہ اللہ! تیرا شکر ہے۔ سود تو ستر زناؤں کے برابر ہے۔ بعض روایات میں ہے کہ اپنی سگی ماں کے ساتھ ستر مرتبہ زنا کرنے کے برابر ہے۔

یاد رکھیں! سب سے پہلا شکر ایمان لے آنا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ پر ایمان نہیں لایا، لاکھ شکر کرتا ہے، یہ کوئی شکر نہیں ہے۔ ایمان کے بعد شکر یہ ہے کہ جو اللہ تعالیٰ نے نعمتیں دی ہیں ان کو اس کی رضا والے اعمال میں خرچ کرنا۔ مثلاً آنکھیں اللہ تعالیٰ کی نعمت ہیں، اللہ تعالیٰ نے ناک اور کان دیئے ہیں، یہ سب اعضاء اللہ تعالیٰ کی نعمت ہیں، ان کو اس منعمِ حقیقی کی فرمانبرداری میں لگا دو تو یہ شکر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تمہیں مال دیا، زکوٰۃ فرض تھی، زکوٰۃ دے دی تو یہ شکر ہے۔ یہ سارا شکر کرنے کے بعد زبان سے بھی الحمد للہ کہے تو یہ شکر ہے۔ یہ نہیں کہ عمل میں نافرمانی ہو اور زبان پر شکر ہو، دعویٰ تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کا کرے، لیکن نافرمان ہو تو یہ اطاعت نہیں ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فقر کو پسند فرمایا ہے، لیکن اس کے باوجود آپ کو جو نعمت ملتی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کو استعمال فرماتے تھے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے شادیاں کیں، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اچھا لباس ملا تو استعمال فرمالیا، اگر نہیں ملا تو صبر کر لیا۔ حضرت

سلیمان علیہ السلام جن کو اللہ تعالیٰ نے نبوت کے ساتھ دولت بھی عطا فرمائی تھی، پوری دنیا کے اندر کون ہے کہ جو اللہ نے ان کو شرف دیا تھا، اس میں ان کا مقابلہ کر سکے؟

﴿اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ﴾ اس لئے اسلام کہتا ہے کہ حلال اور پاکیزہ چیزوں سے فائدہ اُٹھاؤ، لیکن حرام نہ کھاؤ۔ آج ہمارا معاشرہ اس لئے خراب ہو گیا ہے کہ ہم حرام کی پروا نہیں کرتے اور حلال سے شرماتے ہیں، مثال کے طور پر ہر آدمی کو پتہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر آدمی کے لئے چار بیویاں حلال کی ہیں، لیکن دوسری شادی کرنے سے گھبراتا ہے اور اگر وہی آدمی (اللہ تعالیٰ معاف کرے) زنا کرتا رہے تو گھر والے بھی راضی ہیں، پہلی بیوی بھی راضی ہے، یعنی حرام پر راضی ہیں اور حلال پر ناراض ہیں۔

اگر ایک آدمی ملازم ہے، حلال پر گزارا کرتا ہے، بیوی ناراض ہے، بچے ناراض ہیں، سارا خاندان ناراض ہے کہ تم کیسے عجیب آدمی ہو کہ بچوں کے پاس گاڑی نہیں ہے، تم سے چھوٹے عہدے دار ہیں، انہوں نے گاڑیاں بنالی ہیں۔ یہ آدمی کہے کہ وہ تو رشوت لیتے ہیں۔ خاندان والے کہتے ہیں: تم پاگل ہو جو تنخواہ پر گزارا کر رہے ہو۔ یعنی اگر وہ حلال پر ہے سب ناراض ہیں اور اگر وہ حرام کھانا شروع کر دے تو سب خوش ہیں۔

احادیث مبارکہ میں دوسری چیزوں کا بھی ذکر ہے۔ لیکن ''اِنَّمَا'' حصر کے لئے ہوتا ہے، اس سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ ان چیزوں کے علاوہ کوئی اور چیز حرام بھی نہ ہو تو علماء نے فرمایا ہے کہ یہاں حصر اضافی ہے کہ مشرکین جن چیزوں کو چاہتے تو کہہ دیتے کہ یہ حلال ہیں اور جن کو چاہتے تھے تو کہہ دیتے کہ یہ حرام ہیں۔ مشرکین کی ان باتوں کا رد کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے حصر کر دیا۔ یہ حصر اضافی ہے، حقیقی نہیں ہے، کیونکہ ان کے علاوہ اور بھی چیزیں ہیں جن کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے حرام کیا ہے۔

﴿الْمَيْتَةَ﴾ سے مراد وہ جانور ہے جو خود مر جائے۔ اس کا کھانا حرام ہے۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے دوسری جگہ وضاحت فرمائی ہے: ﴿اُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ وَطَعَامُهٗ مَتَاعًا لَّكُمْ﴾ [المائدۃ: ۹۶] کہ سمندر کی چیزیں تم پر حلال کر دی گئی ہیں۔ اگر مچھلی ہے تو ذبح کی کوئی ضرورت نہیں، لیکن اگر کوئی مچھلی خود بخود پانی میں مر گئی اور خود بخود پانی کے اوپر مردہ حالت میں آ گئی تو اس کا کھانا جائز نہیں ہے۔ اور ﴿الْمَيْتَةَ﴾ کے اندر یہ بھی شمار ہے کہ آپ نے کسی جانور کو پہاڑ کی چوٹی سے گرایا، وہ مر گیا یہ بھی حرام ہے، یا کسی جانور کو آپ نے لٹھ ماری اور وہ مر گیا تو یہ جانور بھی حرام ہے۔ اسی طرح کسی جانور کا گلا گھونٹ دیا اور وہ مر گیا تو یہ بھی حرام ہے۔ کیونکہ جانور کے حلال ہونے کا ذریعہ یہ ہے کہ اللہ کے حکم پر اللہ کا نام لے کر

اس کو باقاعدہ ذبح کیا جائے، جیسا کہ آیا: ﴿فَكُلُوا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ إِنْ كُنْتُمْ بِآيَاتِهِ مُؤْمِنِينَ﴾ [الانعام: ۱۱۸] وہ جانور کھاؤ جس پر اللہ تعالیٰ کا نام لیا جائے اور دوسرے مقام پر فرمایا: ﴿وَلَا تَأْكُلُوا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَإِنَّهُ لَفِسْقٌ﴾ [الانعام: ۱۲۱] وہ جانور بالکل نہ کھانا جس پر اللہ تعالیٰ کا نام نہ لیا جائے۔

بعض دشمنانِ اسلام یہ اعتراض کرتے ہیں کہ دیکھو! وہ جانور جن کو اللہ نے مار دیا ہے، اس کو تو یہ مسلمان نہیں کھاتے، لیکن جن جانوروں کو یہ خود مار دیتے ہیں، اس کو کھا لیتے ہیں؟ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: بندے کو بھی میں نے پیدا کیا اور اس جانور کو بھی میں نے پیدا کیا۔ دونوں کی موت وحیات کے اسباب و ذرائع میں نے مقرر کئے ہیں۔ اگر ایک بندہ خود اپنے آپ کو چاقو مار کر مر جائے تو وہ حرام موت ہے، اور اگر وہی آدمی اللہ کے راستے میں لڑتے ہوئے مر جائے تو وہ شہید کے مرتبے پر پہنچ جاتا ہے۔ اس لئے جانور کو ذبح کرنے کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے اور اس کے اندر حکمتیں رکھی ہیں۔ ذبح کے وقت وہ خالق کے نام پر ذبح کیا جاتا ہے، دوسرا اس کے خون کا اخراج ہوتا ہے، اس کے اندر اللہ تعالیٰ کا حکمت ہے کہ جو دم غلیظ ہوتا ہے وہ نکل جاتا ہے اور جو باقی منافع والی چیز ہوتی ہے وہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے کے لئے حلال کر دی۔

مشینی ذبیحہ کا حکم:

بعض لوگوں کو اس بات سے دھوکہ لگتا ہے کہ یہودیوں اور نصرانیوں کا ذبیحہ حلال ہے، لیکن ہندوؤں کا ذبیحہ حلال کیوں نہیں ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ جانور پر ذبح کرتے وقت اللہ تعالیٰ کا نام لیا جائے اہل کتاب ذبح کے وقت اللہ تعالیٰ کا نام لیتے ہیں، لیکن دہریہ اور جتنے منکرین خدا ہندو اور سکھ ہیں یا آج کل کرنٹ کے ساتھ ذبح کیا جاتا ہے، یہ سب طریقے حرام ہیں۔ لہٰذا اہل کتاب کا ذبیحہ اس وقت حلال ہے جب وہ ذبح کے وقت اللہ تعالیٰ کا نام لیں، ورنہ حلال نہیں۔

آج کل تو انہوں نے بھی سارا ایسا سسٹم کر دیا ہے کہ مشینی ذبیحہ ہوتا ہے یا بعض جانور کٹتے ہیں تو ان کو بھی مشین کاٹتی ہے۔ اور وہ کہتے ہیں کہ اس طرح جانور کو کوئی تکلیف نہیں ہوتی، مسلمان تو بڑی تکلیف دیتے ہیں۔ یہ جانور کے ساتھ بڑی ہمدرد قوم ہے اور ہیروشیما پر ایٹم بم گراتی ہے۔ اپنے دشمن سامنے ہوں تو تباہ و برباد کر دیں اور اگر مسلمانوں کی عزتیں لوٹی جائیں، ان کو مارا جائے تو وہاں ان کی اگر، مگر، چونکہ اور چنانچہ شرائط، معاہدات کی گنجائش

سے باہر نہیں نکلتے ہیں۔ یہ اتنے بڑے سفاک ہیں کہ پوری دنیا کو سلو پوائزن (ہلکا ہلکا زہر) کھلا کر مار رہے ہیں اور ہمدردِ انسانیت بھی بنے ہوئے ہیں۔ ان کو اللہ کے قہر کا انتظار کرنا چاہیے۔ جب اللہ تعالیٰ کا عذاب اور پکڑ آتی ہے تو دنیا کے جدید ذرائع ڈھیلے کے برابر بھی کام نہیں آتے۔

بندوق اور گولی سے شکار کا حکم:

موجودہ دور کے اندر ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ اگر ایک جانور ایسا ہے کہ اس کو پکڑ کر ذبح نہیں کر سکتے، وہ بھاگ جاتا ہے تو وہاں ہمیں شریعت نے اجازت دی ہے کہ تیر سے یا نیزے سے اس کا شکار کریں، اور جب تیر چھوڑیں تو بسم اللہ، اللہ اکبر پڑھ لیں۔ اس سے جانور مر بھی جائے تب بھی حلال ہے۔ اگر وہ زندہ پکڑا جائے تو اس کا ذبح کرنا ضروری ہے۔ اب اس کے اندر قابلِ اُلجھن مسئلہ یہ ہے کہ بندوق کا کیا حکم ہے کیونکہ اُس زمانے کے اندر تیر اور نیزے سے شکار ہوتے تھے، بندوق نہیں ہوتی تھی۔ علماء نے لکھا ہے کہ بندوق کی گولی ضرب مارتی ہے اور اسلام کہتا ہے کہ ایسا آلہ جو جارحہ ہو، یعنی زخم لگانے والا ہو گولی زخم نہیں لگاتی، بلکہ پھاڑ دیتی ہے۔ جارحہ اور خارقہ میں فرق ہے۔ مثال کے طور پر آپ کو چوٹ لگتی ہے تو تب بھی چمڑا پھٹ جاتا ہے اور اگر نشتر سے کاٹیں تب بھی چمڑا کٹ جاتا ہے۔ پھٹنے اور کٹنے میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اس لئے علماء نے لکھا ہے کہ بندوق کی گولی کا شکار حلال نہیں ہوگا۔ علماء متاخرین نے لکھا ہے کہ اب ایسی گولی بھی بنا دی گئی ہے جیسے نیزے کے پھل کی چونچ ہوتی ہے اور وہ نوک دار ہوتی ہے۔ اگر وہ ماری جائے اور بسم اللہ، اللہ اکبر پڑھا جائے تو جانور حلال ہو جاتا ہے، لیکن اکثر علماء کا فتویٰ اس پر ہے کہ احتیاط کریں، نہ کھائیں۔ کیونکہ وہ گولی بھی جارحہ نہیں بنتی، بلکہ خارقہ بنتی ہے۔

سدھائے ہوئے کتوں کا شکار:

کتوں کے ساتھ شکار کھیلنے کی بھی اجازت ہے، مگر ایسے کتے ہوں جو سدھائے گئے ہوں۔ کتے کو شکار کی تعلیم دینے کا طریقہ یہ ہے کہ ہم نے ایک ایسا کتا چھوڑ دیا اس نے شکار کو پکڑ لیا، اگر وہ شکار کو پکڑ کر مالک کے لئے بیٹھا ہوا ہے تو یہ سدھایا ہوا کتا ہے اور اگر اس نے شکار کو خود کھانا شروع کر دیا تو اس کا مطلب ہے کہ وہ کتا معلَّم نہیں ہے، سدھایا ہوا نہیں ہے۔

میتہ کے احکام:

جب میتہ حرام ہے تو اس کا بیچنا بھی حرام ہے، اس کی تجارت بھی حرام ہے۔ صحیح حدیث مبارک میں ہے کہ حضور اکرم ﷺ کے زمانہ میں شراب حرام ہوگئی، ایک صحابی نے حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا: میرے پاس یتیم بچے ہیں، ان کا پیسہ میرے پاس تھا، شراب حرام نہیں تھی، میں نے ان یتیموں کے پیسوں سے شراب خریدی کہ بیچوں، لیکن مدینہ میں پہنچا تو اطلاع ملی کہ اللہ تعالیٰ نے شراب حرام کر دی ہے۔ یتیموں کا سارا مال اس شراب میں ڈوب گیا ہے، اب میں کیا کروں؟ کیا میں اس کو کسی دوسرے ملک میں لے جاؤں اور کافروں کو بیچ دوں؟ تاکہ ان یتیموں کا مال نہ ڈوبے۔ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''ثَمَنُ الْحَرَامِ حَرَامٌ'' حرام چیز کا بیچنا بھی حرام ہوتا ہے۔ لہٰذا یاد رکھیں! اگر کوئی آدمی مردار بیچتا ہے یا نجاست بیچتا ہے تو یہ بالکل حرام ہے۔ علماء نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ نجاست تم اپنی مرضی سے جانور کو بھی نہ کھلایا کرو۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ تم نے کسی جگہ رکھی اور کتا، بلی آکر کھا گئے، لیکن تم اپنی نیت سے ان کو نہ کھلاؤ۔

مسئلہ:

میتہ کی ہڈیاں یا اس کا چمڑا یا اس کے بال وغیرہ نجس نہیں ہوتے۔ اللہ تعالیٰ نے خود بیان فرمادیا: ﴿وَمِنْ أَصْوَافِهَا وَأَوْبَارِهَا وَأَشْعَارِهَا أَثَاثًا وَمَتَاعًا إِلَىٰ حِينٍ﴾ [النحل:۸۰] کہ اگر تم ان کے بالوں سے، ان کے چمڑوں سے فائدہ اُٹھانا چاہو تو اُٹھا سکتے ہو۔ چونکہ جانوروں کے بال میں پلیدی نہیں لگتی، ان کو ویسے ہی بیچ سکتے ہیں، لیکن چمڑے میں چونکہ نجاست اثر کر جاتی ہے، اس لیے جب تک چمڑے کی دباغت نہ کریں، اس وقت تک نہیں بیچ سکتے۔

خنزیر کے احکام:

ہاں! خنزیر ایک ایسا پلید جانور ہے جو ذبح کرنے کے بعد بھی حرام ہے۔ ویسے مر جائے، تب بھی حرام ہے، اس کا گوشت، پوست، ہڈی، بال ہر چیز حرام ہے، ان کے پاک ہونے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بعض فقہاء نے لکھا ہے کہ اس کے چمڑے کا دھاگہ بنا کر چمڑا سیا جائے تو گنجائش ہے، لیکن اس سے بھی اکثر فقہاء منع فرماتے ہیں۔

جانور کو ذبح کرنے کے لیے اللہ نے جو چار عروق (رگیں) بنائی ہیں، ان کا کٹنا ضروری ہے۔ افضل یہ ہے کہ گردن بالکل علیحدہ نہ ہو، لیکن اگر علیحدہ ہو جائے تو پھر بھی حلال ہے۔

یادرکھیں! وہ پروردگارِ عالم جو ہمیں غسل کے مسئلے بھی سمجھاتے ہیں، عورتوں کے حیض کے مسئلے بھی سمجھاتے ہیں، اگر انہوں نے ہم پر کوئی جانور حرام کیا ہے تو اس کے اندر حکمتیں ہیں کہ وہ حرام چیز یا تو ہمارے جسم کو نقصان پہنچانے والی ہے یا وہ ہماری روح کو نقصان پہنچانے والی ہے۔ اگر اس کے اندر مضرت نہ ہوتی تو اللہ تعالیٰ بلا وجہ کیوں کسی چیز کو اپنے بندوں پر حرام کرتے؟

مثال کے طور پر نکاح حلال ہے اور زنا حرام ہے۔ حالانکہ نکاح بھی ایک مرد اور عورت کی رضامندی کا معاملہ ہے اور زنا میں بھی (اللہ معاف کرے) عاشق معشوق راضی ہیں یا عورت پیشہ ور ہے تب بھی راضی ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے فرمایا: نکاح حلال ہے اور زنا فاحشہ اور حرام ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر تم بغیر نکاح کے بُرائی کرتے پھرو گے تو ایک تو یہ بُرائی آگے پھیلے گی اور پورے معاشرے کو گندا کرے گی۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگر کہیں تمہارا نطفہ قرار پکڑ گیا تو وہ اولاد بالزنا کہلائے گی، محروم النسب ہوگی۔ آج جتنے ترقی یافتہ ممالک ہیں، ان میں لاکھوں کروڑوں ایسے بچوں کی تعداد ہے جن کو اپنے ماں باپ کا پتہ نہیں ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے جو چیز بھی حرام کی ہے، اس میں ہمارا فائدہ ہے۔

دو مُردار اور دو خون حلال ہیں:

دو مُردار حلال ہیں، کیونکہ حدیث مبارک میں آتا ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:

''أُحِلَّتْ لَنَا مَيْتَتَانِ وَ دَمَانِ: فَأَمَّا الْمَيْتَتَانِ فَالْحُوتُ وَ الْجَرَادُ وَ أَمَّا الدَّمَانِ فَالْكَبِدُ وَالطِّحَالُ.''

[مسند احمد بن حنبل، رقم: ۵۷۲۳]

ہمارے لئے دو مُردار اور دو خون حلال ہیں۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: وہ کیا ہیں؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ایک مچھلی ہے کہ اگر اس کو ذبح نہ کیا جائے تب بھی حلال ہے، دوسرا ٹڈی حلال ہے۔ اور دو خون ایک جگر اور ایک تلی حلال ہیں۔ دوسرے خون ہم پر حرام ہیں۔ یہاں آیت میں مطلقاً ﴿وَالدَّمَ﴾ آیا ہے، لیکن دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿اِلَّآ اَنْ يَّكُوْنَ مَيْتَةً اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا اَوْ لَحْمَ خِنْزِيْرٍ﴾ [الانعام: ۱۴۵] وہ خون حرام ہے جو بہنے والا ہے کہ جانور کو ذبح کرنے کے وقت جو خون نکل رہا ہے، یہ حرام ہے۔ ہمارے بعض لوگ بڑی غلطی کرتے ہیں کہ جانور ذبح کرتے ہیں تو چھری کو دمِ مسفوح لگ جاتا ہے، اس چھری کو صاف نہیں کرتے اور دوسرے جانور کو ذبح

کردیتے ہیں یا اسی چھری سے اس جانور کا گوشت بنانا شروع کردیتے ہیں۔ بقر عید اور شادیوں کے موقع پر یہ غلطی عام ہوتی ہے۔ جب دم (خون) حرام ہے تو اس کا بیچنا بھی حرام ہے، وہ نجاسات میں سے ہے جس کو لگے گا، وہ چیز نجس ہوجائے گی۔

انتقالِ خون کا مسئلہ:

سوال: جب خون حرام ہے، اس کا بیچنا اور خریدنا حرام ہے اگر کسی بندے کو خون کی ضرورت ہو تو کیا کیا جائے؟

جواب: بعض علماء اس طرف گئے کہ ناجائز ہے کیونکہ خون حرام ہے اور حرام کے اندر اللہ تعالیٰ نے شفا نہیں رکھی اور یہ تکریم انسانیت کے خلاف ہے۔ لیکن جمہور علماء کا فتویٰ یہ ہے کہ اس کی مثال دودھ کی سی ہے کہ ماں کے سینے سے نکلتا ہے اور اس کو بچے کی غذا بنادیا گیا ہے حالانکہ اسی خون سے دودھ بنتا ہے تو جیسے اس دودھ کا انتقال صحیح ہے۔ خون کے لئے کیونکہ کانٹ چھانٹ کی ضرورت نہیں، بلکہ سرنج سے لیا اور سرنج سے دے دیا، اس سے انسانیت کی توہین نہیں ہے لیکن اس کے لئے شرط ہے کہ اگر انسان کا علاج اس خون کے بغیر نہیں ہوسکتا اس وقت خون دینا جائز ہے اور اگر خون دینے کے بغیر علاج ممکن ہے تو خون نہ دیں۔ فقہاء نے یہاں یہ بات لکھی ہے کہ اگر کوئی خون دے تو وہ عطیہ کردے، خون کو کاروبار نہ بنائے۔ دوسرا یہ بھی کوشش کریں کہ آدمی کافر اور حرام کھانے والوں کا خون نہ لے۔

خنزیر کے متعلق مسائل:

﴿اَوْ لَحْمَ خِنْزِیْرٍ﴾ بعض لوگ کہتے ہیں کہ اگر خنزیر کا نام لو چالیس دن تک زبان پاک نہیں ہوتی۔ اللہ کے بندو! خدا کا خوف کرو۔ اگر ایسی بات ہوتی تو اللہ تعالیٰ ایسی چیز کا نام قرآن میں کیوں ذکر کرتے؟ کیونکہ ان چیزوں کا ذکر آرہا ہے جن کو وہ کھاتے تھے اور گوشت کھایا جاتا ہے، اس لیے خنزیر کے گوشت کا ذکر کردیا گیا۔

بعض نے کہہ دیا کہ خنزیر کا گوشت تو حرام ہے، لیکن اس کی ہڈی، بال، چربی میں کوئی حرج نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کے گوشت کو حرام کیا ہے۔ اس لیے آج کل جتنے شیونگ برش ہیں سب سے قیمتی برش خنزیر کے بالوں کا ہوتا ہے۔ حالانکہ حضور اکرم ﷺ نے بیان فرمادیا کہ سور کی کھال، ہڈی، بال سب کچھ حرام ہے۔ جب اس آیت کی تفسیر حضور اکرم ﷺ نے بیان فرمادی ہے جن پر اللہ تعالیٰ نے قرآن کو اُتارا تھا تو خود سے قیاس ٹھیک نہیں ہے۔

جادوگر لوگ ہمیشہ اپنے پاس خنزیر کی ہڈی رکھتے ہیں، کیونکہ سحر کا تعلق شیطان سے ہے اور جتنا آدمی پلید ہوتا



ہے، شیطان اس سے اتنی دوستی بناتا ہے۔ خنزیر کی ہڈی پلید ہے، اس لیے اس کو جادوگر اپنے پاس رکھتے ہیں، تاکہ شیطان کے ساتھ دوستی پکی ہو جائے۔

خنزیر نجس العین ہے۔ علماء نے لکھا ہے کہ خنزیر کی سب سے مرغوب غذا بندے کا فضلہ ہے۔ دوسرا خنزیر کے اندر بے حسی، بے حیائی، بے غیرتی کا مادہ ہوتا ہے۔ اتنا طاقتور ہونے کے باوجود آپ دیکھیں گے کہ مادہ ایک ہوگی، لیکن خنزیروں کی لائن لگی ہوگی۔ آج تجربہ شاہد ہے کہ جن ملکوں میں خنزیر کا گوشت کھایا جاتا ہے وہاں غیرت کا کوئی مسئلہ نہیں، کوئی پابندی نہیں ہے۔ بعض کمپنیاں جو بسکٹ بناتی ہیں، خاص طور جن میں کریم لگی ہوتی ہے، ان کو بھی پڑھ لیا کریں اور اگر اینیمل فیٹ لکھا ہوا ہو کہ جانور کی چربی سے بنایا گیا ہے تو وہ یقیناً حرام ہوتا ہے اور اگر اس میں ویجیٹیبل فیٹ ہو یعنی وہ چربی سبزیوں سے نکالی گئی ہے تو اس کا استعمال ٹھیک ہے۔

غیر اللہ کے نام کی چیزوں کا حکم:

﴿وَمَآ أُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ﴾ وہ چیزیں جو غیر اللہ کے نام پر ذبح کی جائیں، غیر اللہ کے نام پر ان کو چھوڑا جائے، وہ چیز بھی اسی طرح حرام ہے جس طرح خنزیر حرام ہے۔ اس کے اندر دو صورتیں ہیں: ایک صورت تو یہ ہے کہ ایک جانور کو غیر اللہ کے نام پر چھوڑا اور ذبح کرنے کے وقت بھی غیر اللہ کا نام لیا، اس کے حرام ہونے میں کسی کو شبہ نہیں ہے۔ اسی طرح ایک جانور ہم نے چھوڑا کہ فلاں پیر کے نام پر ہے اور جب ذبح کیا تو اس پیر کا نام لیا تو اس کے اندر بھی کوئی شبہ نہیں کہ یہ حرام ہے۔ کوئی ایک بندہ نہیں جو اس کو حلال کہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ جانور کو غیر اللہ کے نام پر مخصوص کیا، لیکن ذبح کرنے کے وقت اللہ تعالیٰ کا نام لیا تو یہ بھی تمام علماء کے نزدیک حرام ہے، کیونکہ تقرب الی غیر اللہ کی نیت آگئی ہے۔ علماء نے فرمایا: زمانہ جاہلیت کے اندر عادت تھی کہ اگر کوئی بادشاہ یا کوئی بڑا آدمی آتا تو اس کے نام پر جانور ذبح کرتے تھے۔ یہ بھی حرام ہے، کیونکہ یہ بھی غیر اللہ کے نام پر تقرب کیا گیا ہے۔

﴿أُهِلَّ﴾ کا اصل معنی آواز ہے۔ اس لیے چاند کو ہلال کہتے ہیں کیونکہ پہلی رات لوگ آواز لگاتے ہیں تو اس آیت کا معنی ہے کہ جس جانور پر اللہ کے سوا کسی غیر کے نام کی آواز لگائی گئی، وہ بھی خنزیر کی طرح حرام ہے۔

اللہ تعالیٰ نے دوسری جگہ ارشاد فرمایا: ﴿وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ﴾ [المائدۃ: ۳] جو جانور کسی نامور چیز پر ذبح کیا جائے کہ بت کے نام پر ذبح کرو یا ولی کے نام پر ذبح کرو۔ وہ بھی حرام ہے۔ علماء نے لکھا ہے کہ یہ دیگیں، حلوہ

مٹھائی یہ تو ذبح نہیں ہوتیں تو اللہ تعالیٰ نے یہاں ﴿وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ﴾ فرمایا کہ جس چیز پر بھی میرے نام کے سوا کسی غیر کا نام لیا جائے چاہے وہ چیز جانور ہو یا مٹھائی ہو، وہ حرام ہے۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں ایک عورت آئی۔ اس نے کہا: ہمارے ہمسائے کافر ہیں، ان کے ہاں کبھی کوئی رسم ہوتی ہے جب وہ گوشت تقسیم کرتے ہیں تو ہمیں بھی دیتے ہیں۔ بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: گوشت نہ کھایا کرو، اگر کوئی پھل وغیرہ ہو تو کھالیا کرو۔

فرزدق بڑا شاعر گزرا ہے، اس کے باپ کا نام غالب تھا۔ اس نے ایک اونٹ ذبح کیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا، آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: حرام ہے۔ اگر کسی آدمی نے دربار یا پیر کے نام پر جانور چھوڑا ہوا ہے کہتا ہے وہیں ذبح کروں گا تو علماء نے لکھا ہے کہ اس جانور کو ذبح کرنے والا مرتد ہو جاتا ہے اور مرتد کا ذبیحہ حرام ہے کیونکہ اس نے غیر اللہ کے نام پر اللہ کی چیز تقرب کر کے اسی نیت سے ذبح کیا ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں ہماری نیت تو ثواب کی ہوتی ہے تو ثواب پہنچانے کے لیے قبر پر لانے کی کیا ضرورت ہے؟ کیا تم ثواب اپنے ہاتھ سے اندر پہنچاتے ہو یا اللہ تعالیٰ ثواب پہنچاتے ہیں؟ اگر اللہ تعالیٰ ثواب پہنچاتے ہیں تو یہ جانور اگر تیرے گھر میں ذبح ہوتا تب بھی اللہ تعالیٰ ثواب پہنچا دیتے۔ لیکن تمہارے دربار پر لانے سے معلوم ہوا کہ تم نے اس کو غیر اللہ کے لیے مخصوص کیا ہے تو یہ بھی حرام ہے۔

حلال کھانے کا حکم:

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: حلال کا کھانا دعا اور عبادت کے قبول ہونے کا سبب ہے، جیسا کہ حرام کھانے سے دعا اور عبادت قبول نہیں ہوتی۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے لوگو! اللہ تعالیٰ پاک ہیں اور اللہ قبول نہیں فرماتے، مگر پاک کو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی ذات پاک ہے تو پاک کو پاک چیز پسند ہوتی ہے لہٰذا اگر تمہارے کھانے یا لباس میں حرام ہے تو اللہ تعالیٰ کے ہاں نہ عبادت میں تاثیر ہوتی ہے اور نہ دعا میں اثر ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان آیات مبارکہ کے اندر اپنے ایمان والوں کو ان چیزوں کا حکم دیا ہے جن چیزوں کا اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں کو حکم فرمایا: ﴿يٰٓاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا ۭ اِنِّىْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ﴾[المومنون:٥١] رسول

ہمیشہ پاک ہیں اور پاک کھاتے ہیں، ان کا تو اللہ نے ایسا نظام بنایا تھا کہ حرام ان کے قریب ہی نہیں آتا تھا اور وہ کبھی خود بھی کسی حرام چیز کے قریب نہیں آتے تھے، لیکن اس کے باوجود اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اے پیغمبرا پاک چیزیں کھاؤ۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ان کی اُمتوں کو تنبیہ ہو اس لئے اللہ تعالیٰ نے عباد مومنین کو بھی فرمایا: ﴿يَآأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَاشْكُرُوْا لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ﴾ [البقرة:۱۷۲] (اے ایمان والو! ہم نے جو تمہیں پاکیزہ رزق دیا ہے، اس سے کھاؤ اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو اگر تم خالص اس کی عبادت کرنے والے ہو)۔

(حدیث) حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ایک آدمی لمبے لمبے سفر کرتا ہے، اس کے بال بھی کھلے ہوتے ہیں اور سفر کی وجہ سے مٹی کا اثر بھی ہوتا ہے، اس کے بعد وہ دعائیں مانگتا ہے: یارب، یارب! لیکن اس کی حالت یہ ہے کہ ''مَطْعَمُهُ حَرَامٌ، وَ مَشْرَبُهُ حَرَامٌ، وَ مَلْبَسُهُ حَرَامٌ، وَ غُذِيَ بِالْحَرَامِ، فَأَنّٰى يُسْتَجَابُ لِذٰلِكَ؟'' [صحیح مسلم، رقم:۱۰۱۵/ جامع ترمذی، رقم:۲۹۸۹] اس کا کھانا بھی حرام سے ہے، اس کا پینا بھی حرام سے ہے اور اس کا لباس بھی حرام سے ہے اور اس کو حرام کی غذا دی گئی تو اس قسم کے آدمی کی دعا کیسے منظور ہوگی؟ ہمیشہ یاد رکھیں! جب بدن میں حرام آجائے تو دعاؤں میں اثر نہیں رہتا، عبادت میں لذت نہیں رہتی۔

تین مستجاب الدعوات کو حرام کھلانے کا واقعہ:

تاریخ کا مشہور واقعہ کہ جب حجاج بن یوسف گورنر بن کر بصرہ میں آیا تو اس نے آکر پوچھا کہ یہاں اچھے اللہ والے بھی رہتے ہیں؟ لوگوں نے ذکر کیا کہ یہاں تین چار افراد ہیں، ایک مسجد میں رہتے ہیں اور وہ صحیح معنوں میں اللہ والے لوگ ہیں۔ وہ لوگوں کو ہدایت کرتے ہیں اور زیادہ کسی سے ملتے نہیں ہیں، وہ بڑے مستجاب الدعوات ہیں۔ حجاج نے حکم دیا کہ دعوت کا انتظام کرو اور ان کو کہو کہ میرا کھانا قبول کریں۔ ان کو دعوت دی گئی تو انہوں نے انکار کر دیا۔ حجاج نے دوبارہ بلانے پر اصرار کیا اور آخر ان کو مجبور کر دیا کہ وہ دعوت پر آجائیں۔ جب وہ آگئے تو ان کو بڑے اکرام سے بٹھایا اور ان کو کھانا کھلایا۔ اس کے بعد کہا: آپ کی بڑی مہربانی آپ آئے، اب آپ تشریف لے جائیں۔ انہوں نے کہا: آپ نے ہماری بڑی عزت کی ہے، کوئی ہمارے ذمہ کام ہو تو بتائیں۔ حجاج نے کہا: میرا جو کام تھا، وہ ہو گیا ہے۔ انہوں نے کہا: ہمیں بات سمجھ نہیں آئی۔ اس نے کہا: میں نے سنا تھا کہ تمہاری دعائیں

منظور ہوتی ہیں اور میں بہت ظالم آدمی ہوں، میں نے ظلم کرنا ہے۔ لازماً تم مجھے بددعا کرتے، اس لئے اب تمہارے اندر حرام کا کھانا چلا گیا، اب جتنی مرضی میرے خلاف دعائیں کرو، تمہاری دعائیں قبول نہیں ہوں گی۔

شیخ الہند مولانا محمود الحسن رحمۃ اللہ علیہ کا تنخواہ بڑھانے پر انکار کا واقعہ:

شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ جب دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث تھے تو مجلس شوریٰ کا اجلاس ہوا، انہوں نے کہا: حضرت کو مدرسہ میں پڑھاتے اتنے سال گزر گئے، ہم نے آپ کی تنخواہ میں کوئی اضافہ نہیں کیا، حالانکہ مہنگائی ہر سال بڑھتی چلی جا رہی ہے، یہ انصاف نہیں ہے۔ لہٰذا شوریٰ کو غور کرنا چاہیے کہ حضرت کی تنخواہ میں اضافہ کیا جائے۔ ساری شوریٰ نے کہا: بات بالکل ٹھیک ہے، ہم نے اس طرف توجہ نہیں کی اور حضرت نے اضافہ مانگا بھی نہیں۔ لہٰذا اتنا اتنا اضافہ کیا جائے۔ بالاتفاق تمام مجلس شوریٰ کے ممبران نے منظوری دی اور ایک دوست کے ذمہ لگایا کہ آپ جا کر حضرت کو اس فیصلے سے مطلع کر دیں۔ اس آدمی نے بہت خوش ہو کر حضرت کی خدمت میں آ کر یہ بات سنائی۔ حضرت نے فرمایا: یہ تو بڑا غلط فیصلہ ہے۔ فوراً مجلس شوریٰ کو خط لکھا کہ جب تک میں جوان تھا، میں زیادہ محنت سے پڑھاتا تھا اور زیادہ وقت لگاتا تھا، اب میں اتنی محنت نہیں کر سکتا۔ میں تو یہ توقع کر رہا تھا کہ میری تنخواہ سے پیسے کاٹے جائیں۔ لہٰذا مہربانی کر کے میری تنخواہ میں اضافہ کے بجائے اتنا کاٹا جائے، تاکہ میں قیامت کے دن اللہ کے ہاں حساب میں نہ پکڑا جاؤں۔

آج کوئی ملازم ایسا نہیں ہوگا جو اس طرح کرے۔ یہ تو ہر ایک کو یاد ہوتا ہے کہ مزدور کو پسینہ خشک ہونے سے پہلے مزدوری دے دو، لیکن یہ یاد نہیں ہوتا کہ مالک کو جو وقت دیا تھا، اس میں صحیح معنوں میں کام کیا یا نہیں کیا؟ اس طرح ہم نے اپنے حلال کو حرام کر لیا۔ اس طرح چھوٹی چھوٹی باتیں ہوتی ہیں، لیکن ہم ان کا خیال نہیں کرتے۔ مثال کے طور پر بغیر بیماری کے دوسرے بیمار کے نام پر ہم نے دوائی لے لی کہ اس کو کمپنی نے بل دینا ہے۔ اگر میں خریدنے جاؤں گا تو لازمی بات ہے پیسے دینے پڑیں گے تو میں اپنے ساتھی سے کہہ دیتا ہوں کہ آج ڈاکٹر صاحب نے یہ دوائی میرے نام پر پرچی لکھوا لینا اور وہ پرچی مجھے دے دینا۔ اس طرح ہم نے اپنے حلال کو حرام کر لیا۔ قدرتی بات ہے کہ حرام میں زیادہ لذت ہوتی ہے اور وہ جلدی منہ کو لگ جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پوری دنیا میں معاشرہ اُلٹ پلٹ ہو گیا ہے کہ بیوی اپنے خاوند کے حقوق کا لحاظ نہیں کرتی اور خاوند اپنی بیوی کے حقوق کا لحاظ نہیں

کرتا۔ اس کی وجہ یہی حرام ہے۔ حلال کے اندر برکت ہوتی ہے، حرام سے اللہ تعالیٰ برکتیں اُٹھا لیتے ہیں۔

یورپ میں مسلمانوں کا حال:

ہم یورپ کے دورے پر گئے تو مجھے کئی مسلمان دوستوں نے بتایا کہ ہمارے ہمسائے انگریز اور سب کافر ہیں، یہ سب ہمارے مقروض ہیں۔ کیونکہ ان کو حرام لگا ہوا ہے جب ان کو پیسہ ملا، چھٹی کا دن آیا تو شراب کی بوتلیں لے کر نکل گئے اور سارا پیسہ کھا پی کر ختم کر دیتے ہیں اور ہم مزدور لوگ ہیں، اپنا ایک ایک روپیہ بچاتے، ہیں ہماری زیادہ سے زیادہ تفریح یہ ہوتی ہے کہ مسجد میں چلے گئے، اللہ نے توفیق دی تو تبلیغ والوں کے ساتھ تین دن، سات دن، چالیس دن کے لیے چلے گئے اور ہم نے اپنا ایسا نظام الاوقات بنایا ہوا ہے کہ ہمارے بچے پہلے ٹائم انگریزی سکول میں پڑھتے ہیں، جب وہاں سے چھٹی ہوتی ہے تو دینی سکولوں میں پڑھ لیتے ہیں۔ عشاء کے بعد گھر آتے ہیں۔ اس طرح ہم لوگ اپنے آپ کو اتنا مصروف رکھتے ہیں اور ان کو قرض دیا ہوا ہے جن سے ہم مکان لے کر بیٹھے ہوئے تھے، آج وہ ہمارے مقروض ہیں۔ حرام کے اندر برکت نہیں ہوتی، اگر آدمی نے ایک لاکھ روپیہ کما لیا، لیکن بیٹا بے حیا بن گیا تو ساری زندگی کی کمائی ختم ہوگئی۔ تم نے ساری زندگی لوگوں پر ظلم کر کے جو پیسہ لوٹا تھا، ایک بچہ پیدا ہوا، اس نے سب اُڑا دیا۔

مُردار اور اس کے انڈے بھی حرام ہیں:

مسئلہ: اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر میتہ کو حرام فرما دیا۔ بعض مردار ایسے ہوتے ہیں جن کے اندر انڈے ہوتے ہیں، ان کا کیا حکم ہے؟ امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: وہ پلید ہیں، ان کو بھی استعمال نہیں کرنا چاہیے، کیونکہ یہ میتہ کا جزء ہیں۔ امام مالک رحمہ اللہ کی ایک روایت میں ہے کہ وہ چیز تو اصل میں پاک تھی، لیکن نجاست کی مجاورت کی وجہ سے ناقابلِ استعمال ہوگئی۔ اسی طرح انزائم کا مسئلہ ہے کہ معدہ کے اندر ایک ایسا جوہر ہوتا ہے جس کو دودھ میں ڈال کر اس سے جبن (پنیر) وغیرہ بناتے ہیں، اس کے بنانے میں بڑے جانور کے انزائم (جراثیم) استعمال ہوتے ہیں کہ یہاں تو گائے کا انزائم ہوگا اور یورپ وغیرہ میں خنزیر کا انزائم استعمال کرتے ہیں۔ اس انزائم کے مسئلہ میں اختلاف ہے۔ بعض علماء نے فرمایا کہ وہ بھی حرام ہے، کیونکہ خنزیر کا ایک جزء حلال میں شامل ہوگیا۔ بعض علماء نے اس پر محمول کیا کہ جیسے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے زمانہ میں مجوسی لوگوں کے علاقہ سے جبن (پنیر) آتا تھا، صحابہ رضی اللہ عنہم اس کا

استعمال کر لیتے تھے تو اب بھی کفار کے علاقوں سے آنے والے پنیر کو استعمال کر سکتے ہیں۔

وہ کہتے ہیں کہ پنیر میں انزائم کی اتنی قلیل مقدار ہوتی ہے اس کو کثیر مقدار میں ملایا جاتا ہے لہٰذا تھوڑی مقدار قابلِ معافی ہے۔ لیکن علماء متاخرین نے یہ تحقیق کی ہے کہ جس جبن میں خنزیر کے انزائم استعمال ہوں، وہ بالاتفاق حرام ہے۔ کیونکہ خنزیر نجس العین ہے۔ اس لیے آدمی جب جبن وغیرہ خریدے تو تحقیق کرے کہ کس ملک کا بنا ہوا ہے اور کون سی کمپنی کا بنا ہوا ہے؟ اگر وہ کافروں کے ملک کا بنا ہوا ہے تو اس سے بچے اور اگر مسلمان ملکوں کا ہے تو ان سے اچھا گمان رکھنا چاہیے کہ وہ خنزیر کے انزائم استعمال نہیں کرتے۔

اسی طرح دوائیں ہیں، ان کے بارے میں متاخرین علماء کا یہ حکم ہے کہ اگر متبادل دوائی ملتی ہے، مثلاً ایک آدمی کو کھانسی ہے، اس کو ایک سیرپ مل رہا ہے، اس کے اندر الکحل موجود ہے اگر اس کے متبادل کوئی دوائی موجود ہے اور اس کے اندر الکحل نہیں ہے تو الکحل والی دوائی استعمال نہ کرے۔ علماء متاخرین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اگر اس مرض کے علاج کا کوئی متبادل موجود نہ ہو اور اس دوا کے استعمال میں نفع کا امکان ہے تو اس کو بطور مرض کے نہ کہ بطور لذت کے استعمال کر سکتے ہیں۔

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ نے حضرت ابوعثمان النہدی رحمہ اللہ کی سند سے ایک روایت نقل فرمائی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ یہ گھی، جبن، فراء (جبن کی ایک قسم ہے) آتا ہے، اس کا کیا حکم ہے؟ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اَلحَلَالُ مَا أَحَلَّ اللّٰهُ فِي كِتَابِهٖ، وَ الحَرَامُ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ فِي كِتَابِهٖ، وَ مَا سَكَتَ عَنهُ فَهُوَ مِمَّا عَفَا عَنهُ.'' [جامع ترمذی، رقم:۱۷۲۶]

یاد رکھو! حلال وہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے کتاب میں حلال کیا اور حرام وہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے حرام کر دیا ہے اور جن چیزوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے کتاب میں بیان نہیں کیا، اس میں بندے کے لیے گنجائش ہے۔ لیکن احتیاط زیادہ بہتر ہے، جیسا کہ دوسری جگہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جملہ میں سارے مسائل حل کر دیے، فرمایا:

''اَلحَلَالُ بَيِّنٌ وَ الحَرَامُ بَيِّنٌ، وَ بَيْنَ ذٰلِكَ أُمُورٌ مُشْتَبِهَاتٌ.'' [جامع ترمذی، رقم:۱۲۰۵]

حلال بھی واضح ہے، حرام بھی واضح ہے۔ حلال اور حرام کے درمیان میں بعض چیزیں ہیں جن میں شبہ ہے کہ حلال ہے یا حرام ہے؟ تو تم ان شبہ والی چیزوں کو بھی چھوڑ دو۔

اور اس کی آپ ﷺ نے ایک مثال بیان فرمائی کہ ایک آدمی نے کھیتی لگائی ہے اور اس کے اردگرد اس نے باڑ لگا دی ہے اور تم بکریاں چرا رہے ہو۔ اگر تم باڑ کے قریب چراؤ گے تو خطرہ ہے کہ بکری اس کے اندر منہ ڈال لے، لیکن اگر تم باڑ کے قریب ہی نہیں آؤ گے تو سوال ہی پیدا نہیں ہوسکتا کہ بکری منہ مارے۔ اس لیے جب آپ مشتبہ سے بچ جائیں گے تو آپ حرام کے قریب بھی نہیں جائیں گے اور اگر آپ مشتبہ چیزوں میں پڑنا شروع ہو گئے تو پتہ نہیں آہستہ آہستہ حرام تک بھی چلے جائیں گے۔ شریعت کے کافی سارے مسائل میں گنجائش ہوتی ہے، آج کل ہم گنجائش ڈھونڈتے ہیں، تاکہ حرام تک پہنچ جائیں، جبکہ اللہ تبارک وتعالیٰ تو نیتوں کو جانتے ہیں۔ اسلام کی باقی پابندیوں پر عمل کریں تو رعایت کا فائدہ بھی اُٹھالیں، لیکن ہم پابندیوں پر عمل کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں، صرف رعایتیں ڈھونڈ رہے ہیں۔

غیر اللہ کے نام پر ذبح ہونے والا جانور:

حضرت حسن بصری ؒ سے کسی نے مسئلہ پوچھا کہ ہمارے ہاں ایک عورت نے گڈے گڈی کی شادی کی ہے اور اس نے اونٹ ذبح کیا ہے اور ہمیں گوشت بھیجا ہے تو کیا ہم وہ گوشت کھا سکتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: اس گوشت کو مت کھانا، وہ اونٹ اللہ کے سوا ایک غیر (بت) کے لیے ذبح ہوا ہے۔

بتوں کی پوجا کی وجہ:

اندازہ لگائیں کہ یہ تو ایک کھیل تھا، عبادت تو نہیں ہو رہی تھی، لیکن فرمایا کہ وہ اونٹ غیر اللہ کے لئے ذبح ہوا ہے، اس لیے حرام ہے۔ ساری کائنات کو پیدا کرنے والی اللہ کی ذات ہے جب جانوروں کا خالق و مالک اللہ ہے وہ جانور اپنے مالک کے نام پر ذبح ہوگا تو حلال ہوگا، کسی غیر کے نام لگائیں گے تو اس کے حلال ہونے کا تصور ہی نہیں ہوسکتا، وہ حرام ہو گیا ہے۔ آج کل لوگوں کے ذہن کے اندر ہے کہ وہ بتوں کے نام پر ذبح کرتے تھے اس لئے وہ جانور حرام تھے۔ ذرا سوچیں! وہ بت کیا تھے؟ جو لوگ آج بھی پتھر کا مجسمہ بنا کر پوجا کرتے ہیں تو کیا وہ اس پتھر کی پوجا کر رہے ہیں؟ اگر مکہ والے پتھروں کی پوجا کرنا چاہتے تو جبل ابوقبیس اتنا بڑا پہاڑ ان کے پاس موجود تھا، اس کی عبادت کرتے، صفا و مروہ بڑے پہاڑ تھے، جبل ثور، جبل نور ان کے پاس موجود تھا، اگر کوئی سونے کا بت بناتا ہے سونے کی عبادت مقصود ہوتی تو سونے کی ڈلی ویسے رکھ لے۔ اصل میں بت کی عبادت کی وجہ یہ تھی کہ پہلے جو اللہ والے بزرگ فوت

ہو گئے، ان کے نام پر ان کی شکلوں کے تخیلاتی مجسمے تیار کرتے تھے، جیسا کہ کعبہ شریف میں سب سے بڑا بت لات تھا، وہ ایک اللہ کا ولی گزرا، جو ستو گھول کر حاجیوں کو پلایا کرتا تھا، جب وہ فوت ہو گیا تو لوگوں نے اس کا ایک بت بنالیا اور اس کی پوجا شروع کر دی۔ اسی طرح ہندوؤں کو دیکھیں! ان کے ہاں پینتیس کروڑ دیوی دیوتاؤں کا تصور ہے اور انہوں نے مختلف دیوی دیوتا بنائے ہوئے ہیں کہ یہ قہر کی دیوی ہے، یہ کالی دیوی ہے اور یہ فلاں ہے۔ اگر صرف پتھر کا پوجنا ان کا مقصد ہوتا تو مرد وعورت کی شکل بنانے کا کیا مطلب ہوا؟ اصل میں وہ بھی جنوں یا انسانوں کی عبادت کرتے ہیں۔ اس لئے اللہ تعالیٰ کے سوا جس کے تقرب کے لئے جانور یا کوئی چیز تقسیم کرے، وہ حرام ہے۔

غیر اللہ کے نام کا جانور:

مسئلہ: ایک آدمی نے تقرب الی غیر اللہ کرتے ہوئے دس بکرے کسی بزرگ شخص یا جگہ کے نام پر لگا دیئے اور وہ آ کر ان مجاوروں کو دے دیئے۔ ان مجاوروں نے ان کو بیچا اور کسی نے خرید لیا تو اس کا کیا حکم ہے؟ علماء نے لکھا ہے کہ جب تک اصل مالک کی ملک ختم نہ ہو، کسی دوسرے سے ان کو خرید کر ذبح کر کے کھانا بھی حرام ہے۔

اسی طرح ایک آدمی نے کہا کہ یہ اونٹ فلاں بزرگ کے نام پر ہے۔ اس کو کسی آدمی نے مسئلہ سمجھایا کہ غیر اللہ کے تقرب کرنے سے جانور حرام ہو جاتا ہے۔ اس نے کہا: میں توبہ کرتا ہوں، مجھ سے غلطی ہو گئی۔ اب وہ جانور حلال ہے، کیونکہ جب اس نے اپنی اس نیت سے توبہ کر لی تو بات ختم ہو گئی۔

﴿فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ﴾ اور محرمات کو بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اگر کوئی آدمی حالت اضطرار میں ہے، مثلاً کوئی شخص جنگل میں سفر کر رہا تھا، اس کا زاد راہ ختم ہو گیا۔ اب یہ حالت ہو گئی ہے کہ حرام چیز تو ملتی ہے لیکن حلال نہیں ملتی اور جان کو بھی خطرہ ہے۔ جان حرام کھانے سے بچ سکتی ہے، ورنہ مر جاتا ہے تو حرام کھانے کی دو شرطیں رکھی ہیں کہ جان لبوں پر آ جائے، دوسری شرط یہ ہے کہ نہ تو وہ حد سے نکلنے والا ہو، خوب پیٹ بھر کر کھانے والا نہ ہو اور نہ باغی ہو اور صرف اتنا کھائے جس سے جان بچ سکتی ہو، اس سے تجاوز نہ کرے اور لذت کے لیے نہ کھائے۔ آگے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم نے مجبور ہو کر جان بچائی اور حرام کھایا تو تم پر گناہ نہیں ہوگا، البتہ حرام تو حرام رہے گا۔ ﴿اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾ [البقرة: ۱۷۳] اگر تم ان آیات سے پہلے کوئی غلطی کر چکے ہو تو توبہ کر لو۔ اللہ تعالیٰ بخشنے والا اور مہربان ہے۔ ان آیات کے نزول کے بعد اگر تم سے کوئی خطا ہو گئی ہے تو توبہ کا دروازہ



بند نہیں ہوا، توبہ کرلو۔ ساتھ یہ بھی اشارہ کر دیا کہ اللہ تعالیٰ نے جو چیزیں حرام کی ہیں، ان کے اندر بھی تیرا بھلا ہے، کیونکہ وہ چیزیں یا تو جسمانی طور پر ضرر پہنچانے والی ہیں یا روحانی طور پر ضرر پہنچانے والی ہیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے بندوں پر حرام کر دیا ہے۔

حلال میں ہر انسان کے لیے راحت ہے:

یورپ کے سفر میں ایک دوست نے دعوت کی اور کہا کہ ہم گھر میں کھانا نہیں کھاتے، بلکہ کسی ہوٹل میں کھانا کھلاتے ہیں۔ میں نے کہا: پتہ نہیں، یہاں ہوٹل کیسے ہوں گے؟ اس نے کہا: اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ مسلمان ساتھیوں نے ہوٹل بنایا ہوا ہے اور وہ حلال چیز استعمال کرتے ہیں۔ وہاں میں نے دیکھا کہ ان کی ٹیبلوں پر انگریز بھی بیٹھے ہوئے تھے حالانکہ کھانے ہمارے ملک والے تھے، چٹخارے اور مرچ مسالے والے تھے۔ میں نے اس ہوٹل والے کو بلا کر پوچھا کہ کافر تو مرچیں مسالہ نہیں کھاتے، یہ تو اُبلی ہوئی سبزی اور اُبلا ہوا گوشت کھانے والے لوگ ہیں، یہ تمہارے ہوٹل پر کیسے آجاتے ہیں؟ اس نے کہا: سب سے زیادہ یہ کھاتے ہیں، ان کو بھی حلال میں مزہ آتا ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے جس چیز کو بندے کے لیے حلال کیا ہے اس میں بندے کے لیے جسمانی راحت بھی ہے، روحانی راحت بھی ہے اور جن چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے حرام کیا ہے، اس میں جسمانی مضرت بھی ہے اور روحانی مضرت بھی ہے۔

بعض علماء نے اس آیت کا ترجمہ یوں بھی کیا ہے کہ وہ آدمی جس نے اپنے صالح بادشاہ کے خلاف بغاوت کی ہو، ایسا آدمی مر رہا ہے تو اس کو حرام کھا کر جان بچانے کی اجازت نہیں ہے، کیونکہ اس نے پہلے ہی اللہ تعالیٰ کے حکم کو توڑا ہے، یہ تو باغی ہے۔ اس لیے ہر مسلمان کے لیے شرعاً اور عقلاً لازم ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرے اور اس کے رسول کی اطاعت کرے اور اپنے اُولوالامر کی اطاعت کرے۔

﴿أُولِي الْأَمْرِ﴾ کا مصداق و معنی:

﴿أُولِي الْأَمْرِ﴾ کے مصداق میں حاکم اور علماء دونوں شامل ہوتے ہیں۔ حاکم کی اطاعت کا اتنی شدت سے حکم ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: تمہارے اوپر یہ بات لازم ہے کہ جب تمہیں تمہارا حاکم کوئی حکم کرے تو اس کی اطاعت کرو۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اگر کبھی تمہارے اوپر کوئی سیاہ فام چھوٹے سر والا غلام افسر بن گیا تو تم اس کی

بھی اطاعت کرو۔

حضرت عطاء الخراسانی رحمہ اللہ کہتے ہیں: ایسا نہ کرے کہ مردار جانور کا گوشت کاٹ کر اس کو بھونے یا اس کو تلے، بلکہ ایک آدھ لقمہ لے لے جس سے جان بچ جائے اور جب حلال ملے تو اس حرام کو پھینک دے، کیونکہ اگر آپ ان کو بھونیں گے، پھر تو آپ لذت کے لیے کھائیں گے جو کہ ٹھیک نہیں ہے۔

﴿فَمَنِ اضْطُرَّ﴾ کے اندر مفسرین کا دوسرا قول یہ ہے کہ جس پر جبر کیا گیا ہو، مثلاً کوئی کافر ملک کے اندر پھنس گیا، انہوں نے کہا: حرام کھاؤ۔ شراب نہیں پیو گے تو گولی ماردیں گے۔ اس وقت اس نے حرام کھالیا یا پی لیا تو اللہ اس پر رحمت کرے گا، اس پر کوئی گناہ نہیں ہوگا۔

ایک آدمی حالت اضطرار میں تھا، اس کے سامنے کسی دوسرے کی روٹی رکھی ہے، دوسرا اس کے سامنے میتہ پڑا ہے تو وہ کیا کھائے؟ تو وہاں پر دیکھنا پڑے گا کہ دونوں میں اخف چیز کیا ہے؟ وہ یہ ہے کہ دوسرے آدمی کی جو روٹی رکھی ہے، وہ کھالے۔ کیونکہ جب وہ آئے گا اس سے معافی بھی مل سکتی ہے، وہ بخش بھی سکتا ہے، لیکن میتہ سے تو کچھ نہیں کیا جا سکتا۔ اور اس کے مال سے اتنا کھائے جس سے جان بچ جائے، یہ نہ ہو کہ سارا مال کھا کر کہو کہ میں مضطر تھا۔

اس روٹی کا معاوضہ اس کو ادا کریں گے یا ادا نہیں کریں گے؟ اس کے اندر دو قول ہیں: بعض علماء فرماتے ہیں کہ اس کا حق ادا کرے۔ اور بعض علماء فرماتے ہیں: جب اللہ تعالیٰ نے اضطرار کی حالت میں اجازت دی ہے تو اس پر گناہ کوئی نہیں۔ بہر حال تقویٰ اس میں ہے کہ اس کو معاوضہ ادا کرے۔

قحط کی وجہ سے ایک صحابی کی بھوک:

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ نے عباد بن شرحبیل الغبری کی سند سے روایت کیا ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ ایک سال بڑا قحط آ گیا۔ میں مدینہ منورہ آیا۔ ایک باغ میں آیا، میں نے اس سے خوشے کاٹے اور ان کو کھانا شروع کر دیا اور کچھ کپڑے میں بھی رکھ لیا تو کھیت والا آدمی آ گیا۔ اس نے مجھے تھپڑ مارا اور میرا کپڑا بھی چھین لیا۔ میں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آ کر عرض کیا کہ حضور! میں تو بھوکا تھا...... حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آدمی کو بلایا اور فرمایا: تم عجیب آدمی ہو، جب وہ بھوکا تھا تو تم نے اس کو کھلایا نہیں۔ اور وہ بیچارا مسئلہ نہیں جانتا تھا، جاہل تھا، تم نے اس کو مسئلہ بھی نہیں سمجھایا، تم نے تو بڑی زیادتی کی ہے، اس کو کپڑا واپس کرو۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے وہ کپڑا

واپس دلا دیا اور نصف وسق یا ایک وسق غلہ دینے کا حکم دیا۔

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہ روایت صحیح ہے اور اس کے بہت سے شواہد ہیں۔

باغات کے رستوں میں پھل کھانے کا حکم:

(حدیث) ایک آدمی نے حضور اکرم ﷺ سے پوچھا کہ ہم باغات میں گزر رہے ہوتے ہیں، وہاں پھل لٹک رہے ہوتے ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا: "مَنْ أَصَابَ مِنْهُ مِنْ ذِي حَاجَةٍ غَيْرَ مُتَّخِذٍ خُبْنَةً فَلَا شَيْءَ عَلَيْهِ" [جامع ترمذی، رقم:۱۲۸۹] کسی نے اتنی مقدار لے لی کہ منہ میں لے کر کھا لے یہ نہیں کہ بوریاں بھرے یا اُٹھاتا پھرے۔ تھوڑی مقدار میں جو منہ میں ڈال لی، اللہ تعالیٰ اس کو معاف فرمادیں گے۔

حالت اضطرار میں حرام کھانے کا حکم:

ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جان بچانے کے لئے بھی تین لقمہ سے زیادہ نہ کھائیں۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ جان بچانے کے لیے حرام کھانا، یہ عزیمت ہے، رخصت نہیں ہے۔ کیونکہ اگر وہ نہیں کھائے گا تو مر جائے گا تو اس طرح یہ خودکشی شمار ہوگی۔ ہمارے ہاں اگر کوئی آدمی زیادہ بیمار ہو اور روزہ دار ہو، لوگ اس کو کھلانا چاہیں، لیکن وہ کہے کہ میں روزہ دار ہوں تو لوگ کہتے ہیں: بڑا نیک آدمی ہے۔ یہ کون سی نیکی ہے؟ وہ تو شریعت کی خلاف ورزی کر رہا ہے، کیونکہ شریعت نے حکم دیا تھا کہ اگر تم بیمار ہو تو روزہ نہ رکھو۔ اگر روزہ رکھ لیا تو شدت بیماری کے تقاضا کی وجہ سے روزہ توڑ دو اور بعد میں اس کی قضا کر لو۔ حضرت مسروق رحمہ اللہ نے فرمایا:

"مَنِ اضْطُرَّ فَلَمْ يَأْكُلْ وَ لَمْ يَشْرَبْ، ثُمَّ مَاتَ دَخَلَ النَّارَ." [تفسیر ابن کثیر:۱/۱۹۵]

جس نے حالت اضطرار میں نہ کھایا اور نہ پیا، اگر ایسے میں آدمی مر گیا تو جہنم میں ڈالا جائے گا۔

﴿إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ مِنَ الْكِتَابِ وَيَشْتَرُونَ بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا ۙ أُولَٰئِكَ مَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ إِلَّا النَّارَ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللَّهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا يُزَكِّيهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الضَّلَالَةَ بِالْهُدَىٰ وَالْعَذَابَ بِالْمَغْفِرَةِ ۚ فَمَا أَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ ۝ ذَٰلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ نَزَّلَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ ۗ وَإِنَّ الَّذِينَ اخْتَلَفُوا فِي الْكِتَابِ لَفِي شِقَاقٍ بَعِيدٍ ۝﴾ [البقرۃ:۱۷۴تا۱۷۶]

''جو لوگ چھپاتے ہیں جو اللہ نے کتاب (تورات) میں (حضور ﷺ کی صفت کو) اُتارا اور اس کے عوض معمولی سی دنیا کماتے ہیں، یہ لوگ نہیں بھرتے اپنے پیٹ میں، مگر آگ ۔ نہ تو اللہ ان سے قیامت کے دن بات کرے گا اور نہ ان کو پاک کرے گا، بلکہ ان کے لیے دردناک عذاب ہوگا۔ یہی ہیں جنہوں نے ہدایت کی جگہ گمراہی کو لے لیا ہے اور مغفرت کے بدلے میں عذاب کو۔ پس کتنے صابر (جری) ہیں آگ سہنے پر۔ یہ اس لیے ہوا کہ اللہ نے حق کے ساتھ کتاب (قرآن) کو اُتارا اور وہ لوگ جنہوں نے قرآن کے متعلق اختلاف کیا، وہ ضد میں دور جا پڑے ہیں۔''

جن کو پیغامِ رسالت نہیں پہنچتا، ان کی نجات کا حکم:

ان آیاتِ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے محرماتِ معنویہ کا بیان فرمایا ہے۔ اس سے پہلے محرماتِ حسیہ کا بیان تھا۔ ان آیات سے یہود مراد ہیں، کیونکہ حضور اکرم ﷺ کے آنے سے پہلے مشرکین مکہ کے پاس کوئی کتاب نہیں تھی، بلکہ مشرکین مکہ کے پاس حضور اکرم ﷺ سے پہلے کوئی ڈرانے والا بھی نہیں آیا تھا۔

اس لیے علماء نے لکھا ہے کہ جو لوگ آپ کی بعثت سے پہلے وفات پا گئے، ان کے بارے میں ہم کوئی فیصلہ نہ کریں کہ وہ جنت میں جائیں گے یا جہنم میں جائیں گے۔

جمہور علماء فرماتے ہیں کہ نبی اور رسول کا نہ آنا اور تعلیماتِ نبوت و رسالت کے نہ آنے میں بڑا فرق ہے۔ ہندوستان میں ہمارے پاس بھی رسول نہیں آئے، لیکن اللہ کے نبی کی تعلیمات علماء کے ذریعہ وہاں تک پہنچ گئیں۔ اگر بفرضِ محال ہم مان لیں کہ ایک جماعت ایسی ہے کہ اس کو نہ اللہ کا رسول ملا اور نہ ان کی تعلیمات پہنچیں، مثلاً سائبیریا کا علاقہ ہے، منجمد شمالی کا علاقہ ہے، جہاں کوئی آدمی نہیں جا سکتا، اگر وہاں کوئی آدمی پائے جائیں تو ان کے بارے میں علماء نے فرمایا ہے کہ ان سے صرف توحید کے مسئلے کے بارے میں سوال ہوگا۔ اگر وہ اللہ کو مانتے ہوں گے تو جنت میں چلے جائیں گے۔ باقی ان سے شریعت کا مسئلہ نہیں پوچھا جائے گا۔ کیونکہ ان کے پاس شریعت نہیں پہنچی، لیکن توحید کا مسئلہ فطرتِ انسانی سے تعلق رکھتا ہے، ہر آدمی سوچ سکتا ہے کہ یہ آسمان و زمین بغیر کسی بنانے والے کے نہیں بن سکتے۔



تحریف تورات وانجیل:

اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب کی یہاں تک مذمت بیان فرمائی ہے کہ یہ اہل کتاب ہونے کے باوجود کتنے بڑے کافر ہیں۔ یہ کہتے ہیں کہ خنزیر حلال ہے، مُردار جانور حلال ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جیسے حلال کو حرام یا حرام کو حلال کرنا بہت بڑا جرم ہے، لیکن اس سے بڑا جرم یہ ہے کہ کتاب میں مسئلہ موجود ہو اور اس کو چھپایا جائے۔ یہ بھی سب سے بڑا جرم ہے۔ اہل کتاب اللہ کی کتاب میں تحریف لفظی بھی کرتے تھے اور تحریف معنوی بھی کرتے تھے۔ یا تو اپنی طرف سے کسی جگہ کوئی لفظ ڈال دیا تو ترجمہ بدل گیا یا کسی جگہ اپنی طرف سے لفظ گھٹا دیا تو ترجمہ بدل گیا یا کسی جگہ ایک حرف کے دو معنی ہوتے تھے جو معنی مراد ہوتا ہے اس کو چھوڑ کر دوسرا معنی کر دیتے تھے۔

تحریف قرآن:

سب سے پہلے تحریف کرنے والے یہود ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے خود قرآن میں فرمایا: ﴿مِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ﴾ [النساء:۴۶] کہ یہ ایسی بد بخت قوم ہے جو اللہ کے کلمات کو اپنی جگہ سے بدل دیتے ہیں۔ اور یہودیوں سے تحریف کا سلسلہ چلتا ہوا عبداللہ بن سبا کی جماعت میں آیا، کیونکہ اس کی بنیاد بھی یہودیت ہے، ان کا مؤسس اعلیٰ عبداللہ بن سبا اور حسن بن سبا ہیں، وہ دونوں یہودی النسل تھے تو یہودیت والی ساری بیماریاں ان میں بھی داخل ہوگئیں۔ انہوں نے بھی اللہ تعالیٰ کے قرآن کو بدل ڈالا۔ قرآن کہتا ہے: ﴿كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ [آل عمران:۱۱۰] لیکن انہوں نے کہا: یہاں ''خَيْرَ أَئِمَّةٍ'' کا لفظ تھا کہ تم بڑے بڑے امام بہت اچھے ہو، تم لوگوں کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرو۔ اسی طرح قرآن کی آیت ہے: ﴿فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ﴾ [البقرة:۵۹] اس جماعت نے وہاں ایک لفظ بڑھا دیا کہ ''فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا (آل محمد) قَوْلًا'' وہ لوگ بڑے ظالم ہیں جنہوں نے آل محمد ﷺ پر بڑا ظلم کیا۔ حالانکہ یہاں آلِ محمد ﷺ کی بات نہیں تھی، یہاں تو یہودیوں کی بات ہو رہی تھی۔ یہ اللہ کے قرآن میں تحریف ہے اور کبھی لفظ وہی رہنے دیتے ہیں، لیکن ترجمہ بدل دیتے ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَجَعَلْنَا لَهُمْ لِسَانَ صِدْقٍ عَلِيًّا﴾ [مریم:۵۰] تو انہوں نے کہا: ﴿عَلِيًّا﴾ سے مراد علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ ہیں۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن تو حضور پاک ﷺ پر اُتارا ہے اور پھر حضور اکرم ﷺ نے صحابہ کو ایک ایک حرف پڑھا دیا اور صحابہ نے پوری اُمت کو

پڑھادیا اور پھر دیکھیں قرآن کے الفاظ ﴿وَجَعَلْنَا لَهُمْ﴾... ﴿لَهُمْ﴾ جمع کی ضمیر ہے، اس سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کیسے مراد ہو سکتے ہیں؟

اسی طرح کا ایک جاہل سنی تھا، اس نے کہا: ﴿عَلِيًّا﴾ سے پہلا صدق ہے تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تو پہلے ہیں، اور اس نے کہا: میرے پاس اس کی تائید بھی ہے کہ قرآن میں ﴿وَالَّذِي جَاءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِهِ أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ﴾ [الزمر: ۳۳] سے مراد ابوبکر رضی اللہ عنہ ہیں تو یہاں بھی ابوبکر رضی اللہ عنہ پہلے ہیں۔ تمہارا مسئلہ پھر بھی حل نہ ہوا۔

جن لوگوں نے تحریف کی ہے، یہ اتنے بڑے خطرناک ہیں کہ ان کے مولوی اہلسنت والجماعت بن کر چھپے رہے، ساری دنیا ان کو اہلسنت سمجھتی رہی، لیکن وہ کہیں نہ کہیں اپنا زہر پھیلا گئے اور ایسا جملہ لکھ گئے کہ اپنے مذہب کا حق ادا کر دیا۔

فرزدق شاعر کا بادشاہ کے ساتھ واقعہ:

فرزدق ایک بڑا شاعر گزرا ہے۔ سلیمان بن عبدالملک کے زمانہ کی بات ہے، جب وہ بادشاہ تھا۔ فرزدق نے بادشاہ کی شان میں ایک قصیدہ لکھا کہ مجھے انعام ملے گا۔ لیکن اتفاق یہ ہوا کہ بادشاہ کو پسند نہ آیا۔ اس شاعر کے مخالفوں نے بادشاہ کو اس کے خلاف ورغلا دیا۔ بہرحال بادشاہ نے اس کو انعام نہ دیا۔ فرزدق کو بڑی چوٹ لگی کہ میری بڑی بے عزتی ہوگئی۔ اس نے غصہ میں آکر ایک اور نظم لکھی، جس کا ایک شعر یہ بھی تھا:

؎ لَقَدْ ضَاعَ شِعْرِيْ عَلَى بَابِكُمْ
كَمَا ضَاعَ دُرٌّ عَلَى خَالِصَةِ

میرے شعر تمہارے دروازے پر ایسے گندے ہو گئے جیسے موتی خالصہ پر کہ اس کی بدصورتی کی وجہ سے موتی بے قیمت ہو گیا۔ اس طرح تمہاری ہی بے وقوفی کی وجہ سے میرے شعر بے قیمت ہو گئے۔

(خالصہ، بادشاہ کی محبوبہ تھی)۔ وہ شعر خالصہ کو پہنچا۔ وہ بادشاہ کی منظورِ نظر تھی، اس نے بادشاہ سے کہا کہ یہ میری توہین کرتا ہے۔ بادشاہ نے کہا: اس کو گرفتار کر کے پیش کرو۔ شاعر کو زنجیروں میں جکڑ کر بادشاہ کی خدمت میں لایا گیا، خالصہ بھی پردے کے پیچھے اس کا حشر دیکھنے کے لیے بیٹھی ہوئی تھی۔ بادشاہ نے غصہ میں کہا کہ یہ شعر تم نے کہا ہے؟ اور وہ شعر بادشاہ نے پڑھ دیا۔ فرزدق نے کہا: بادشاہ سلامت! شعر تو میں نے کہا ہے، لیکن اس میں میرے

دشمنوں نے ردّ و بدل کیا ہے۔ بادشاہ نے کہا: وہ کیسے؟ اس نے کہا: میں نے "ضَاءَ" ہمزہ کے ساتھ کہا تھا کہ میرے شعر تمہارے دروازے پر آ کر کیسے روشن ہو جاتے ہیں، جیسے موتی خالصہ پر جا کر چمک اُٹھتا ہے۔ دشمنوں نے میری بے عزتی کرانے کے لیے ہمزہ کو عین بنا دیا ہے۔ خالصہ سے صبر نہ ہو سکا، وہ پردے سے باہر نکل آئی اور پورے گلے کے ہار اس کو انعام میں دے دیئے اور بادشاہ نے بھی اس کا اعزاز و اکرام کیا۔ اس کی اُردو والے نے بھی مثال دی ہے:

ہم دُعا لکھتے رہے وہ دَغا پڑھتے رہے
ایک نقطہ نے ہمیں مُحرم سے مجرم بنا دیا

تحریف کرنے کی وجوہات:

﴿وَيَشْتَرُوْنَ بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا﴾ یہ ساری تحریف و کتمان اس لئے کرتے ہیں، تا کہ مال و دولت ملے، بڑے آدمی کے لیے اور مسئلہ اور غریب کے لئے دوسرا مسئلہ بنا دیا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یہ نہیں ڈال رہے اپنے پیٹوں میں، مگر جہنم کی آگ۔ بظاہر تو حلوے، مٹھائیاں کھا رہے ہیں، لیکن اس کا انجام جہنم ہے۔ ایسے بدبختوں کے لئے تین سزائیں ہیں: قیامت والے دن اللہ تعالیٰ ایسے بدبختوں سے کلام بھی نہیں فرمائیں گے، یعنی کلامِ رحمت نہیں فرمائیں گے۔ بعض علماء نے فرمایا: قیامت کا دن عدل کا دن ہے، اس دن اللہ تبارک و تعالیٰ سب سے بات فرمائیں گے، لیکن یہ ایسے بدقسمت ہیں کہ ان سے غصہ والی بات بھی نہیں ہوگی، بلکہ اللہ تعالیٰ اپنے فرشتوں سے فرمائیں گے کہ ان کو کہہ دو: یہ اس قابل ہی نہیں ہیں کہ میں ان سے ہم کلام ہوں۔ اس تقابل سے معلوم ہوا کہ جو حق کہنے والے ہیں، جو اللہ کا قرآن صحیح بیان کرنے والے ہیں، ان سے اللہ تعالیٰ خود کلام فرمائیں گے۔

جیسا کہ حدیث مبارک میں آتا ہے کہ جب قیامت والے دن جنت والے جنت میں چلے جائیں گے اور جنت میں بڑے مزے سے ہوں گے، ساری جنت میں روشنی بھر جائے گی، وہ سر اُٹھا کر دیکھیں گے کہ یہ روشنی کیسے ہوگئی؟ تو وہ دیکھیں گے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ ان کے اوپر نظر ڈالیں گے اور فرمائیں گے: السلام علیکم تو اللہ تعالیٰ ان سے خود کلام فرمائیں گے۔ تو مومن کو جب دیدار باری تعالیٰ نصیب ہوگا تو باقی ساری نعمتیں بھول جائیں گی۔

﴿وَلَا يُزَكِّيْهِمْ﴾ اور اللہ تعالیٰ ان کو پاک بھی نہیں فرمائیں گے، جیسے ایک کپڑا خراب اور گندا ہو جائے تو اس کو دھو کر پاک صاف کر لیتے ہیں، اسی طرح بندہ بھی گناہوں سے پلید ہو جاتا ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ بھی تو اپنے بندوں

کو دنیا میں پاک کر دیتے ہیں کہ کوئی بیماری آگئی، کوئی پریشانی آگئی، نوکری چھوٹ گئی، گھر کے اندر ناچاقی ہوگئی، تاکہ میرا بندہ دنیا میں پاک ہو جائے اور بعض بندے ایسے ہیں جو گناہ لے کر مر گئے تو اللہ تبارک وتعالیٰ ان کو جہنم میں گناہوں کے بقدر ڈال کر پاک کر دیں گے اور پھر ان کو جنت میں بھیجیں گے۔ البتہ جو اللہ تعالیٰ کے احکام کو چھپاتے ہیں، اللہ کی کتابوں کو بدل ڈالتے ہیں، اللہ تعالیٰ کے احکام کو قلیل ثمن کے عوض بیچ ڈالتے ہیں، ان کو پاک نہیں کیا جائے گا اور ان کو ہمیشہ کے لئے جہنم میں ڈالا جائے گا اور ان کے لئے عذاب دردناک ہوگا، جس کا کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا۔ ﴿أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الضَّلَالَةَ بِالْهُدَىٰ وَالْعَذَابَ بِالْمَغْفِرَةِ ۚ فَمَا أَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ﴾ [البقرۃ:۱۷۵] یہ ایسا تاجر ہے جس نے ہدایت کے بدلے گمراہی خریدی اور مغفرت کے بدلے عذاب خریدا۔ ان بدبختوں کی کتنی بہادری ہے کہ جہنم کی آگ سے جلنے کے لیے بھی تیار کھڑے ہیں۔

﴿ذَٰلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ نَزَّلَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ ۗ وَإِنَّ الَّذِينَ اخْتَلَفُوا فِي الْكِتَابِ لَفِي شِقَاقٍ بَعِيدٍ﴾[البقرۃ:۱۷۶]

خبردار! سُن لو جو اللہ تعالیٰ نے اُتارا ہے وہ حق ہے اور جن لوگوں نے اللہ تعالیٰ کے قرآن میں اختلاف کیا، حلال کو حرام کر دیا اور حرام کو حلال کر دیا، جھوٹ کو سچ کر دیا اور سچ کو جھوٹ کر دیا، یہی لوگ ہیں جو دور گھاٹی میں جا پڑے ہیں۔

چونکہ حق کو چھپانے اور تحریف کرنے میں یہودی سب سے آگے تھے، لہٰذا اکثر آیات میں یہود کا ذکر آتا ہے، ورنہ حکم عام ہے کوئی بھی آدمی اگر اللہ تعالیٰ کے قرآن کا مسئلہ چھپائے یا تحریف کرے، اس کے لیے بھی یہی عذاب ہے، کوئی آدمی صحیح حدیث مبارک کا مسئلہ چھپا دے تو اس کے لیے بھی یہی سزا ہے۔ قرآن میں مشرکین یا یہود و نصاریٰ کا ذکر اس لیے آتا ہے کیونکہ قرآن جب نازل ہوا تو یہی لوگ مخاطب تھے اور یہی لوگ مقابلہ میں تھے۔ اس لیے واقعہ تو ان کا ہوگا، لیکن حکم عام ہوگا۔ نماز پڑھنے کا حکم آیا تو یہ نہیں کہ حکم صرف صحابہ رضی اللہ عنہم کے لیے ہو، بلکہ سب کے لیے ہے۔

یہود کی عہد شکنیاں اور ان کا انجام:

پھر یہودیوں نے ایسی ایسی عہد شکنیاں کیں کہ حضور اکرم ﷺ جو رحمت للعالمین ہیں، ان کو بھی یہ فیصلہ کرنا پڑا کہ ان کے ساتھ جنگ کی جائے، حالانکہ حضور اکرم ﷺ نے تو کبھی اپنے دشمن کو اپنی ذات کے بدلہ میں سزائیں نہ دیں۔ آپ ﷺ کی یہودیوں سے دو دفعہ جنگ ہوئی۔ ایک دفعہ تو حکم دیا کہ اے یہود! مدینہ سے نکل جاؤ اور

جتنا سامان اپنا لے جاسکتے ہو لے جاؤ تو وہ مدینہ سے نکل کر خیبر میں پہنچ گئے۔ دوسرے قبائل نے وہی دشمنی جاری رکھی، پھر حضور اکرم ﷺ نے ان کا محاصرہ کیا اور حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو حکم بنایا تو یہ فیصلہ ہوا کہ ان کے مرد قتل کر دیئے جائیں، عورتیں کنیزیں بنالی جائیں۔ اسی طرح یہودیوں کی قوت کو ختم کیا گیا۔ جب وہ خیبر میں آباد ہوئے تب بھی وہ اپنی حرکتوں سے باز نہ آئے، حتیٰ کہ حضور اکرم ﷺ کو مدینہ سے فوج لے کر خیبر پر چڑھائی کرنی پڑی، کیونکہ انہوں نے خیبر کے اندر بیٹھے بیٹھے روم سے مل کر مدینہ پر حملہ کرنے کا ارادہ کیا۔ حضور اکرم ﷺ نے اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم کو حکم دیا کہ بجائے اس کے کہ وہ ہم پر حملہ کریں، تم ان پر حملہ کرو...... پھر حضور اکرم ﷺ نے حکم دیا:

"أَخْرِجُوا الْيَهُودَ وَ النَّصَارَى مِنْ جَزِيرَةِ الْعَرَبِ." [مسند البزار، رقم: ۲۳۰]

"یہود ونصاریٰ کو جزیرۂ عرب سے نکال دو۔"

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اس حکم کی تعمیل کی اور ان کو جزیرۂ عرب سے باہر کر دیا۔ وہ دشمنی آج تک یہود کے رگ و پے میں چلی آ رہی ہے۔

یہودی ذلیل ہیں یا نہیں؟

لوگوں کو شبہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تو فرمایا کہ ان یہودیوں کی دنیا بھی برباد ہے اور آخرت بھی برباد ہے، لیکن یہودی تو دنیا میں بڑی طاقت میں ہیں، ساری دنیا کے سرمایہ پر وہ سانپ بن کر بیٹھے ہوئے ہیں، ساری دنیا کو گولڈ، ڈائمنڈ ان کے کنٹرول میں ہے، پھر وہ ذلیل تو نہ ہوئے، بلکہ ان کے مقابلہ پر ہم مسلمان ہر جگہ ذلیل ہیں۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ عزت و ذلت کے پیمانے کو سمجھنا چاہیے کہ عزت کس کو کہتے ہیں اور ذلت کس کو کہتے ہیں؟ جب یہ بات سمجھ آ جائے گی تو آپ کو مسئلہ سمجھ آ جائے گا۔ آپ لوگوں کی نظروں میں اس کی عزت ہے جس کے پاس پیسہ ہو، لیکن اللہ تعالیٰ کے ہاں یہ عزت کا پیمانہ نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝۸﴾ [المنافقون: ۸] عزت تو اللہ کے لیے ہے، اللہ کے رسول کے لیے ہے، مومنین کے لیے ہے۔ اگر عزت کا پیمانہ دولت ہوتی تو دنیا میں سب سے بڑے امیر محمد مصطفیٰ ﷺ ہوتے، کیونکہ حضور اکرم ﷺ سے زیادہ نہ کوئی شرف میں بڑا ہوا اور نہ قیامت میں کوئی بڑا ہوگا۔ جبکہ حضور اکرم ﷺ کے گھر میں کھانا بھی نہیں پکتا تھا، تین تین ماہ آگ نہیں جلتی تھی، آپ ﷺ نے کبھی دو تین جوڑے بنا کر گھر میں نہیں لٹکائے۔

عزت کا پیمانہ وہ نہیں جو ہماری نظروں میں ہے، ورنہ شیطان کے پاس اتنی قوت ہے کہ منٹ میں جو چاہے شکل بدلے اور ایک سیکنڈ میں لاکھوں لوگوں کے دلوں میں وسوسہ ڈال کر ان کو گمراہ کر ڈالے۔ سمندر کے اوپر تخت لگا کر بیٹھا ہو، ایک ملک سے دوسرے ملک میں وہ سیکنڈوں میں منتقل ہو جائے تو پھر اس کا کیا مطلب ہے کہ شیطان بھی عزت والا ہے؟ اس لیے سمجھ لیں کہ ہم نے جو عزت کا پیمانہ بنایا ہوا ہے وہ غلط ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں ایمان والا عزت والا ہے، چاہے اس کے پاس روٹی کا ٹکڑا بھی نہ ہو، وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں بہت بڑی شان رکھتا ہے۔

(حدیث) اس کی میرے آقا ﷺ نے ایک مثال بیان فرمائی کہ بعض اوقات ایسا آدمی ہوتا ہے کہ اس کے بال کھلے ہوئے، اوپر مٹی پڑی ہوتی ہے، کسی سے رشتہ مانگے تو اس کو کوئی رشتہ بھی نہ دے، کسی سے جا کر کوئی بات کرے تو کوئی اس کی بات بھی نہ سنے، لیکن وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اتنی شان والا ہوتا ہے کہ اگر زبان سے کوئی بات نکال دے تو اللہ تعالیٰ اس کو پورا کر دیتے ہیں۔ جب تمہیں عزت کا پیمانہ سمجھ میں آ جائے گا تو تمہیں معلوم ہوگا کہ یہود عزت میں نہیں ہیں، یہ تو ظاہری اور دنیوی باتیں ہیں اور دنیا کی عزت کوئی عزت نہیں ہے۔

دوسری بات سمجھیں کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے جو عزت کا وعدہ کیا ہے، وہ وعدہ ایمان سے مشروط ہے، اگر ایمان نہ ہو تو وہ وعدہ خود بخود ختم ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میں تمہیں عزت، غلبہ اور نصرت عطا کروں گا، شرط یہ ہے کہ تم میری عبادت کرو گے اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرو گے۔ فرمایا: اے میرے مدنی! یہ کتاب میں جو آپ کی صفات ہیں، ان کو اس لیے چھپا رہے ہیں کہ ان کی سرداری نہ چلی جائے۔ آپ ان کو دعوت دیں کہ آؤ، ہم اس بات پر اکٹھے ہو جائیں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت نہیں کریں گے، اس کی ذات کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کریں گے اور ہم اپنے بڑے بڑے پیروں، فقیروں کو خدا نہیں بنا ڈالیں گے اور ہم خالص اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں گے۔ وہ یہ وعدہ کریں تو ہم ان کو بھی عزت دینے کے لئے تیار ہیں۔

﴿أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الضَّلَالَةَ بِالْهُدَىٰ﴾ جن لوگوں نے حق بات کو ثمن قلیل کے عوض چھپایا، ان کا نتیجہ یہ ہے کہ دنیا کے اندر رسوائی اور آخرت میں جہنم کا عذاب ہے۔ دنیا میں یہود اس طرح ذلیل ہوئے کہ انہوں نے یہ کوشش کی تھی کہ جب ہم یہ صفات چھپا دیں گے تو حضور اکرم ﷺ پر کوئی ایمان نہیں لے آئے گا، لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو سچا کر دیا، اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم ﷺ کو آیات اور دلائل دیئے اس کی وجہ سے یہ لوگ جلتے رہ گئے اور دوسرے لوگ حضور اکرم ﷺ پر ایمان لے آئے اور آپ ﷺ کے مددگار بنے، صحابہ رضی اللہ عنہم کی جماعت

ان ظالموں سے لڑتی رہی اور ان کا انجام یہ ہوا کہ یہ اللہ تعالیٰ کے عذاب پر عذاب لے کر لوٹے۔

صحیح حدیث پاک میں آیا ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''مَنْ شَرِبَ فِي إِنَاءٍ مِنْ ذَهَبٍ، أَوْ فِضَّةٍ، فَإِنَّمَا يُجَرْجِرُ فِي بَطْنِهِ نَارًا مِنْ جَهَنَّمَ.''

[صحیح مسلم، رقم: ۲۰۶۵]

جو آدمی بھی آج دنیا کے اندر سونے یا چاندی کے برتن میں پیے گا، قیامت والے دن اس کا پیٹ انگاروں سے بھرا جائے گا۔

سونے چاندی کا استعمال مردوں پر حرام ہے:

سونے چاندی کا استعمال اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم ﷺ کی اُمت کے مردوں پر حرام فرما دیا ہے۔

حدیث مبارک میں ہے کہ آپ ﷺ نے دو ٹکڑے ہاتھ میں لیے، ایک ہاتھ میں ریشم کا ٹکڑا اور دوسرے ہاتھ میں سونے کا ٹکڑا لیا اور فرمایا: یہ دونوں چیزیں میری اُمت کے مردوں پر حرام ہیں۔ اس لیے سونے کا استعمال کسی بھی شکل میں ہو، مثلاً انگوٹھی کی صورت میں یا آج کل گھڑی کی چین سونے کی آجاتی ہے یا قلم سونے کا بنا ہوتا ہے، سونے کا استعمال کرنا مرد کے لیے حرام ہے۔ اس کے اندر اسراف اور تکبر کا اظہار ہے۔ البتہ عورت کے لیے سونے کے زیور کی اجازت ہے اور مرد کے لیے چاندی کے اندر اتنی گنجائش ہے کہ زیادہ سے زیادہ ساڑھے تین ماشے جس سے انگوٹھی بن جائے، اس کا استعمال مرد کے لیے جائز ہے یا اس کا کوئی دانت ٹوٹ گیا اور اس نے سونے کا لگوا لیا تو جائز ہے یا دانت خراب تھا، اس کے اوپر سونے کا خول چڑھا دیا تو وہ بھی جائز ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی قدرت ہے کہ اس دھات میں بدبو پیدا نہیں ہوتی۔

﴿لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ۗ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ۗ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ﴿١٧٧﴾﴾

[البقرة: ۱۷۷]

''نیکی کچھ یہی نہیں کہ تم اپنے رُخ (نماز میں) مشرق یا مغرب کی طرف کرلو لیکن بڑی نیکی تو یہ ہے جو ایمان لائے اللہ پر اور قیامت کے دن پر اور فرشتوں پر اور کتابوں پر اور انبیاء پر اور دے مال اس کی محبت پر رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں کو اور طلبگاروں کو اور (غلاموں اور قیدیوں کی) گردنیں چھڑانے میں اور نماز قائم رکھے اور زکوٰۃ دیا کرے اور اپنے اقرار کو پورا کرنے والے جب عہد کریں، اور سختی میں اور تکلیف میں اور قتال کے وقت صبر کرنے والے، یہی لوگ سچے ہیں، اور یہی پرہیزگار ہیں۔''

آیات کا ربط:

اس آیت سے پہلے محرماتِ حسیہ اور محرماتِ معنویہ کا بیان تھا۔ یہاں تک سورۃ البقرۃ کا نصف ہو گیا، یہاں تک خطاب عام تھا یعنی تمام اُمتِ دعوت کو خطاب تھا۔ آگے اُمتِ اجابت کو خطاب ہوگا، یعنی اس امت کو خطاب ہوگا جو اُمت کلمہ پڑھنے والی ہے، حضور اکرم ﷺ کو ماننے والی ہے۔ پہلے اُصولیات یعنی توحید، نبوت و رسالت اور معاد کے مسئلے کا بیان تھا، اب فروعیات کے مسائل بیان ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یہ کوئی نیکی نہیں ہے کہ تم اپنے چہرے مشرق کی طرف کرلو یا مغرب کی طرف کرلو، بلکہ اصل بھلائی یہ ہے کہ اپنے دلوں کو اللہ تعالیٰ کے احکام کے تابع کردو۔

﴿اَلْبِرّ﴾ کا معنی ومفہوم:

حضرت ضحاک رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ﴿اَلْبِرّ﴾ کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو چیزیں فرض کی ہیں، ان کو ادا کرو۔ حضرت سفیان ثوری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس آیت کے اندر بھلائی کی تمام انواع ہیں، یہ ساری اپنے اندر پیدا کرو، کیونکہ جس آدمی نے اپنے اندر یہ صفات پیدا کرلیں وہ اسلام کی چوٹی پر پہنچ گیا اور اس کو سب بھلائیاں مل گئیں۔ ﴿اَلْبِرّ﴾ کا معنی بھلائی ہے... جبکہ ''اَلْبَرّ'' جنگل کو کہتے ہیں اور اگر سمندر ہو تو اس کو ''اَلْبَحْر'' کہتے ہیں۔ صحرا اور جنگل میں وسعت ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: خیر اور بھلائی میں وسعت ہوتی ہے۔

ایمانیات کی تفصیل:

سب سے پہلے اللہ تعالیٰ پر اور اللہ تعالیٰ کی اُلوہیت اور اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات پر ایمان لانا، اللہ تعالیٰ کو معبود

برحق ماننا، اللہ تعالیٰ کو کامل فی العلم اور کامل فی القدرۃ ماننا، یہ اصل بھلائی اور ایمان ہے۔ اس کے بعد قیامت پر ایمان لے آنا نیکی ہے، کیونکہ اگر قیامت پر ایمان نہیں تو گویا اللہ تعالیٰ پر بھی ایمان نہیں ہے، قیامت پر ایمان نہیں تو گویا انبیاء پر بھی ایمان نہیں ہے، کیونکہ اگر قیامت پر ایمان نہ ہو تو اللہ تعالیٰ کے عدل وانصاف پر ایمان نہیں، تو اس کا مطلب ہوا کہ یہ دنیا اس لیے بنی تھی کہ کافر مزے کرتے رہیں اور مسلمان تکلیفیں اُٹھاتے رہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یہ دنیا دار العمل ہے۔ اصل بدلہ دار الآخرت میں ملے گا، اصل کامیابی آخرت کی کامیابی ہے۔ جب تک آخرت پر ایمان نہ ہو، اس وقت تک اعمال کی اصلاح نہیں ہوسکتی۔ مثلاً اللہ تعالیٰ نے بکری حلال کر دی اور خنزیر حرام کر دیا۔ اب ہم بکری کو ذبح کرنے کے بعد اس کا گوشت کھاتے ہیں، لیکن خنزیر نہیں کھاتے۔ کیونکہ اگر ہم نے خنزیر کھالیا تو قیامت میں پکڑے جائیں گے اور ہمیں ہر چیز کا حساب دینا ہے اور ہم اس لیے حلال کھاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں آخرت میں بدلہ عطا فرمائیں گے۔

اور ملائکہ پر بھی ایمان ہو کہ اللہ تعالیٰ کے فرشتے برحق ہیں، وہ اللہ تعالیٰ کی نوری مخلوق ہیں، ہم ان کو نہیں دیکھ سکتے اور ان کا عدد بھی نہیں جان سکتے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے فرشتوں کی ڈیوٹیاں تقسیم کی ہوئی ہیں، بعض فرشتے ہمیں القاء کرنے کے لیے ہیں، بعض فرشتے کراماً کاتبین ہیں، بعض فرشتے دنیا میں سیاحت کرنے والے ہیں اور بعض فرشتے بندوں کے اعمالِ صالحہ کو لے جانے والے ہیں، بعض فرشتے روحوں کو قبض کرنے والے ہیں، بعض فرشتے اللہ کے عرش کو اُٹھانے والے ہیں۔ اور اللہ نے جتنی کتابیں اُتاری ہیں ان پر بھی ایمان ہو، تفصیلی ایمان ہو، اللہ تعالیٰ کے قرآن پر جو اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم ﷺ پر اُتارا ہے، اور اللہ کے تمام نبیوں پر ایمان ہو کہ اللہ نے جتنے نبی بھیجے ہیں سب برحق ہیں، یہ نہیں کہ ایک نبی پر ایمان لے آئے اور ایک نبی پر ایمان نہ لے آئے۔ کیونکہ ایک نبی پر ایمان لانا تمام انبیاء پر ایمان لانا ہے اور ایک نبی کا انکار کرنا سب نبیوں کا انکار کرنا ہے۔ ایمان تمام نبیوں پر لائیں گے، لیکن تعمیل حکم حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی کریں گے۔ یہ ایمان کے اصولوں کا بیان تھا۔ اب آگے فروعات کا بیان ہے۔

﴿وَاٰتَی الْمَالَ عَلٰی حُبِّہٖ﴾ کی تفسیر:

﴿اٰتَی الْمَالَ عَلٰی حُبِّہٖ﴾ انسان مال کو اس وقت مسکینوں پر خرچ کرے جب اسے وہ چیز محبوب بھی ہے مرغوب

بھی ہے اور اس کو خود بھی حاجت ہے۔ اگر ایک ایسی چیز خرچ کر دی، جس کی اس کو ضرورت نہیں ہے تو اللہ تعالیٰ اس پر بھی ثواب کو ضائع نہیں فرمائیں گے، لیکن ثواب کا اعلیٰ مرتبہ حاصل نہیں ہوتا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ۬ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ۝﴾ [آل عمران: ۹۲] وہ چیز اللہ کے راستہ میں خرچ کرو جو تمہیں سب سے پیاری ہو۔

حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: ایک آدمی موت کے قریب آ کر خیرات کرتا ہے، اس کی مثال ایسے ہے کہ جب خود پیٹ بھر گیا اور جو بچ گیا، اس کے بارے میں کہا کہ غریبوں کو دے دو۔ کیونکہ موت قریب آ گئی ہے تو اب وہ رکھ کر کیا کرے گا۔ اصل خیرات اللہ تعالیٰ کو اس وقت محبوب ہے کہ جب پیسہ خود مرغوب ہو، اس وقت تم اللہ کی رضا کے لیے اللہ کے بندوں پر خرچ کرو تو یہ مال اللہ تعالیٰ کے ہاں بہت قدر والا ہے۔

حالانکہ اس کو مال سے محبت بھی ہے، لیکن پھر بھی وہ مال قریبی رشتہ داروں کو دیتا ہے۔ آپ چاہے زکوٰۃ نکالو یا صدقات نکالو، خیرات کر دو یا ہدیہ کرو، سب سے زیادہ مستحق آدمی کے رشتہ دار ہیں۔ کیونکہ رشتہ داروں میں خیرات کرنے کے دو فائدے ہیں، ایک فائدہ تو یہ ہے کہ تم نے اللہ تعالیٰ کے لیے خیرات کی اور دوسرا فائدہ یہ ہے کہ صلہ رحمی ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کو رحم کا صلہ بڑا محبوب ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے رحم پیدا کیا تو فرما دیا تھا کہ جس نے صلہ رحمی کو توڑ ڈالا، میں بھی اس کو توڑ ڈالوں گا اور جس نے صلہ رحمی کی اور اپنے رشتہ داروں کا خیال رکھا، میں اس کو اپنی رحمت سے جوڑ دوں گا۔

رحم، رحمت کے مادہ سے ہے۔ رشتہ داروں میں خیرات کرنے کا ایک فائدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ جو رشتہ دار ہوتے ہیں ان کے بارے میں آدمی کو پتہ ہوتا ہے مثلاً زکوٰۃ کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ ہم صحیح مستحق کو زکوٰۃ ادا کریں اور زکوٰۃ کے مال کا زکوٰۃ کی نیت سے اس بندے کو مالک بنا دیں، تب جا کر زکوٰۃ ادا ہوتی ہے۔ رشتہ داروں کے اندر ہر آدمی کو پتہ ہوتا ہے کہ کون غریب ہے؟ اس لیے حکم ہے کہ رشتہ داروں کو زکوٰۃ وخیرات دیں اور رشتہ داروں میں زیادہ مستحق وہ ہے جو زیادہ قریب ہے۔

عمل کے قبول ہونے کی شرائط:

حدیث مبارک میں ہے کہ کوئی عمل اس وقت تک قبول نہیں ہوتا جب تک کہ اس میں دو شرطیں نہ ہوں۔ ایک تو

عمل خالص اللہ کی رضا کے لئے ہو۔ اس کے اندر دکھاوا نہ ہو اور نہ کوئی اس میں شریک ہو، یعنی کسی بت یا غیر اللہ کے نام نہ ہو۔ دوسری شرط یہ ہے کہ جو عمل کر رہے ہیں وہ حضور ﷺ کی شریعت کے موافق ہو۔ اگر کسی کے عمل میں یہ دو شرطیں نہیں ہوں گی تو وہ عمل کبھی قبول نہیں ہوگا۔ بظاہر وہ عمل کتنا خوبصورت کیوں نظر نہ آتا ہو، لیکن اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کا مچھر کے برابر بھی وزن نہیں ہے۔

علماء نے لکھا ہے کہ جو بھی عمل کرو، اس کے لئے ایک تو علم ہونا چاہیے، دوسری نیت ہو، تیسرا اخلاص ہونا چاہیے، چوتھا اس عمل پر استقامت ہونی چاہیے، کیونکہ اگر علم نہ ہو تو عمل مفید نہیں ہوتا اور اگر نیت نہ ہو تو عمل قبول نہیں ہوتا "إِنَّمَا الأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ" کی وجہ سے اور اگر وہ عمل خالص اللہ کے لئے نہیں ہے تب بھی عمل قبول نہیں اور اگر حضور ﷺ کی سنت کے مطابق نہیں تو تب بھی وہ عمل قبول نہیں اور اگر اس عمل پر استقامت نہیں ہے تو اس عمل کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ ایک رات تو آدمی سو رکعت نفل پڑھ لے، پھر سارا سال تہجد نہ پڑھے، اس سے تو بہتر ہے کہ آدمی دو رکعت پڑھے، لیکن ہمیشہ پڑھے۔

حضور ﷺ نے فرمایا:

"لَا تَسُبُّوا أَصْحَابِي." [صحیح بخاری، رقم: ۳۶۷۳]

"خبردار! میرے صحابہ کو گالی نہ دینا۔"

اس سے اشارہ ہوا کہ ایک وقت آئے گا جب لوگ صحابہ کو برا کہیں گے۔ اور آپ ﷺ نے فرمایا: تم اُحد پہاڑ کے برابر سونا خرچ کرو اور میرا صحابی چُلّو بھر دانے خیرات کر دے تو تم اس کے ثواب کو نہیں پہنچ سکتے۔ صحابہ نے جس اخلاص سے خرچ کیا، وہ اخلاص تم پیدا ہی نہیں کر سکتے۔ اس لئے جب کوئی چیز دیں تو دل سے دیں۔

افضل صدقہ کا بیان:

اس آیت کی تفسیر میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور سلف وخلف نے اس بات پر اتفاق کیا ہے کہ اس وقت مال اللہ کے راستے میں دے، جب مال اس کو پیارا اور مرغوب ہو۔ صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک صحابی نے حضور اکرم ﷺ سے پوچھا: کون سا صدقہ بہتر ہے؟ حضور ﷺ نے فرمایا:

"أَنْ تَصَدَّقَ وَ أَنْتَ صَحِيحٌ شَحِيحٌ تَخْشَى الفَقْرَ، وَ تَأْمُلُ الغِنَى."

[صحیح بخاری، رقم: ۱۴۱۹/صحیح مسلم، رقم: ۱۰۳۲]

سب سے بہتر صدقہ یہ ہے کہ تُو اس وقت صدقہ کرے جب تُو تندرست ہو اور تجھے اس کی ضرورت بھی ہو اور تجھے غنیٰ کی خواہش بھی ہے، تمہیں یہ بھی ڈر ہو کہ اگر میں نے سارا خرچ کر دیا تو میں فقیر بھی ہو سکتا ہوں، لیکن پھر بھی اللہ کے راستہ میں خرچ کرے۔ یہ اللہ کو زیادہ پیارا ہے۔

حدیث میں آتا ہے کہ ایک جنگ میں صحابی کی شہادت کا وقت قریب تھا، پانی مانگا تو ایک صحابی نے چھاگل پیش کی اور دوسرے زخمی نے پانی مانگا تو انہوں نے کہا: پہلے اس صحابی بھائی کو پلا دو، اس کو زیادہ ضرورت ہے۔ جب پلانے والا دوسرے صحابی کے پاس گیا تو تیسرے صحابی نے آواز لگائی۔ دوسرے صحابی نے کہا: ان کو پانی دے دو، ان کو زیادہ ضرورت ہے۔ تین صحابہ تک پانی پہنچا، لیکن ایک دوسرے کی خاطر کسی نے نہیں پیا اور تینوں ہی پیاسے شہید ہو گئے۔ اس کا قرآن نے نقشہ کھینچا ہے: ﴿وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۚ وَمَن يُوقَ شُحَّ نَفْسِهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۝﴾ [الحشر:۹] جو اپنے نفسوں پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں، حالانکہ خود بھی محتاج ہیں۔

اسلام کے اندر تو یہاں تک حکم ہے کہ اتنا اونچا مکان نہ بناؤ کہ تیرے ہمسائے سے سورج کی دھوپ رک جائے۔

کھانے پینے میں بھی ہمسائے کا خیال:

اسلام تو یہ بھی حکم دیتا ہے کہ اگر پھل فروٹ کھاؤ تو چھلکے باہر نہ پھینکو، تاکہ کسی غریب کا دل دیکھ کر پھٹ نہ جائے اور تیرے لئے بددعا نکلے تو تجھ پر کہیں اللہ تعالیٰ کا عذاب نہ آجائے۔

حضور ﷺ نے فرمایا: اگر تم اپنے ہمسائے کو گوشت نہیں دے سکتے ہو تو پانی زیادہ بڑھا کر شوربا بھیج دو، تاکہ تیرے ہمسائے بھوکے نہ سوئیں۔

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ آدمی کو مال کی خواہش وتمنا ہے، لیکن خیرات کر دی اور اس سے اعلیٰ مرتبہ یہ ہے کہ خود بھوکا ہے، لیکن دوسروں کو کھلا دیا۔

حضرت بایزید بسطامی رحمہ اللہ کا نوجوان سے ملاقات کا واقعہ:

حضرت بایزید رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میرے پاس بلخ سے ایک نوجوان آیا اور ہمارے لنگر میں کچھ دن ٹھہرا، ذکر و عبادت میں شریک ہوتا رہا۔ ایک دن میں نے اس سے پوچھا: اتنے دن ہو گئے ہیں تم ہمارے پاس آئے ہو، تمہارا کیا حال احوال ہے؟...... اس نوجوان سے میں جتنا شرمندہ ہوا، پوری زندگی میں کبھی اتنا شرمندہ نہیں ہوا...... اس

نے کہا: آپ کا کیا حال احوال ہے؟ میں نے کہا: اللہ کا شکر ہے۔ مل جاتا ہے تو کھا لیتے ہیں، نہیں ملتا تو صبر کرتے ہیں۔ نوجوان ہنس پڑا۔ میں حیران ہوا اور اس سے پوچھا: ہنستے کیوں ہو؟ کہنے لگا: ہمارے بلخ کے جو کتے ہیں، ان کا یہی حال ہے کہ کوئی ہڈی ڈال دے تو کھا لیتے ہیں، نہیں تو مالک کے دروازے پر پڑے رہتے ہیں۔ مجھے اس بات سے بڑی چوٹ لگی۔ میں نے پوچھا: وہاں کے بزرگوں کا کیا حال ہے؟ اس نے کہا: مل جائے تو دوسروں کو کھلا دیتے ہیں، نہ ملے تو شکر کرتے ہیں کہ اے اللہ! تو نے نہیں دیا، اس کے اندر تیری کوئی حکمت ہے۔ حضرت بایزید رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: میں نے اس کو کہا: تم تو بہت بڑے مقام کے آدمی ہو!!

﴿وَالْيَتٰمٰى﴾... یتیم کی تعریف:

جو بالغ نہیں ہوئے اور ان کے باپ فوت ہو گئے، ان کے لئے کوئی کمانے والا نہیں ہے، وہ یتیم ہوتے ہیں، ان کی مدد کریں: حضور ﷺ نے خوشخبری سنائی:

"أَنَا وَ كَافِلُ الْيَتِيمِ فِي الْجَنَّةِ كَهَاتَيْنِ." [جامع ترمذی، رقم: ۱۹۱۸]

قیامت کے دن میں اور یتیم کی کفالت کرنے والا اکٹھے ہوں گے۔ اس لیے جس کے گھر میں یتیم ہیں، وہ ان کو بوجھ نہ سمجھیں، بلکہ یہ سمجھیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں جنت میں جانے کا ذریعہ دیا ہے۔

(حدیث) حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

"لَا يُتْمَ بَعْدَ حُلُمٍ." [مسند البزار، رقم: ۶۲۴۳]

"جب یتیم بالغ ہو جائے تو وہ یتیم نہیں رہتا۔"

مسکین کی تعریف:

﴿وَالْمَسٰكِيْنَ﴾، مساکین سے مراد وہ ہیں جن کے پاس اتنا مال نہیں ہے کہ وہ کھانا پینا بھی کر سکیں اور رہائش بھی حاصل کر سکیں۔ اگر رہائش اور ہر روز کی روٹی موجود ہے تو وہ مسکین نہیں ہے۔ مسکین وہ ہوتا ہے جس کے پاس ایک دن کا کھانا بھی، رہنے کے لیے جگہ نہ ہو۔

(حدیث) صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، حضور ﷺ نے فرمایا:

"لَيْسَ الْمِسْكِيْنُ الَّذِي يَطُوفُ عَلَى النَّاسِ تَرُدُّهُ اللُّقْمَةُ وَ اللُّقْمَتَانِ، وَالتَّمْرَةُ وَالتَّمْرَتَانِ، وَ لٰكِنِ

الْمِسْكِينُ الَّذِي لَا يَجِدُ غِنًى يُغْنِيهِ، وَ لَا يُفْطَنُ بِهِ، فَيُتَصَدَّقُ عَلَيْهِ وَ لَا يَقُومُ فَيَسْأَلُ النَّاسَ.''

[صحیح بخاری، رقم:۱۴۷۹/صحیح مسلم، رقم:۱۰۳۹]

یہ پھرنے والا مسکین نہیں ہوتا کہ کبھی اس کو ایک کھجور مل گئی اور کبھی دو کھجوریں مل گئیں، کبھی ایک لقمہ مل گیا اور کبھی دو لقمے مل گئے (یہ تو بھکاری ہے)۔ مسکین وہ ہوتا ہے کہ اس کے پاس اتنا نہیں جو اس کو بے پروا کردے اور پھر وہ ظاہر بھی نہیں ہوتا کہ لوگ سمجھیں کہ یہ مسکین ہے۔ پھر اس پر صدقہ کریں ایسے لوگ مستحق ہیں، ان کو ڈھونڈ کر پہنچانا چاہیے، تاکہ اللہ تعالیٰ ہمیں اس کا اجر عطا فرمائیں۔ صحیح حدیث میں حضور ﷺ نے فرمایا:

اللہ تعالیٰ روزانہ آسمان سے فرشتے اُتارتے ہیں، ان کی ڈیوٹی یہ ہے کہ وہ صبح سے لے کر شام تک دعا کرتے رہتے ہیں کہ اے اللہ! ہر خرچ کرنے والے کو اس کا بدلہ عطا فرما اور جو بخل کر رہا ہے، اس کے مال کو برباد کردے۔ اس لیے آدمی جتنا اللہ کے راستے میں خرچ کرتا ہے، اس کے مال میں برکت ہوتی ہے۔

مسئلہ:

زکوٰۃ اپنے اُصول یعنی باپ دادا کو نہیں دے سکتے اور اپنے فروع یعنی بیٹے اور پوتے کو بھی نہیں دے سکتے۔ البتہ بہن، بھائی، چچا، ماموں باقی رشتہ داروں کو زکوٰۃ دے سکتے ہیں۔ والدین کو زکوٰۃ نہ دینے کی وجہ یہ ہے کہ زکوٰۃ، مال و دولت کی مَل کچیل ہے، ہمارے والدین میل کچیل کے لئے تو نہیں ہیں اور دوسری بات یہ ہے کہ زکوٰۃ اڑھائی فیصد ہے، والدین کا تو ہم پر اتنا حق ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:

''أَنْتَ وَ مَالُكَ لِأَبِيكَ.'' [سنن ابن ماجہ، رقم:۲۲۹۱]

تم اور تمہارا مال تمہارے باپ کا ہے۔ (اگر وہ ضرورت مند اور محتاج ہو تو بقدر ضرورت لے سکتا ہے، اگر ضرورت سے زائد لیا تو اس پر قرض ہے)۔ اسی طرح بیٹا، بیٹی کو زکوٰۃ نہیں دے سکتے، کیونکہ ان کا خرچ والدین کے ذمہ ہے۔

(حدیث) حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ بیمار ہوئے، حضور اکرم ﷺ تشریف لے آئے، آپ ﷺ نے دیکھا کہ انہیں بڑی تکلیف تھی اور ایک روایت میں ہے کہ بالکل موت کے کنارے پر پہنچ گئے تھے۔ حضور اکرم ﷺ نے وضو فرمایا اور جو پانی بچا، فرمایا: اس کے اوپر چھڑک دو اور حضور اکرم ﷺ نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو

دعا دی کہ اللہ تجھے شفا دیں گے اور اللہ تبارک وتعالیٰ تجھ سے بڑے خیر کے کام لیں گے اور تم سے اللہ تعالیٰ دشمنوں کی ہلاکت کا کام لیں گے۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو ایسی دعا لگی کہ وہ ۵۰ ہجری تک زندہ رہے۔ اس بیماری میں حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے بہت مال دیا ہے، میری ایک بیٹی ہے، اور کوئی اولاد نہیں ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ سارا مال خیرات کردوں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایسا ہرگز نہ کرنا۔ انہوں نے عرض کیا: حضور! مجھے اجازت دے دیں کہ میں آدھا مال خیرات کردوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: آدھا بھی نہ کرو۔ انہوں نے پھر عرض کی کہ مجھے اجازت دیں، میں دو ثلث (دو تہائی) خیرات کردوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں۔ انہوں نے عرض کیا کہ حضور! مجھے اجازت دیں کہ میں تیسرا حصہ خیرات کردوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تیسرا حصہ تمہیں خیرات کرنے کی اجازت ہے، لیکن تیسرا حصہ بھی بہت زیادہ ہوتا ہے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بہتر ہے کہ تم اپنے بچوں کو امیر چھوڑ کر مرجاؤ۔ یہ نہ ہو کہ تیرے مرنے کے بعد تیرے وارث لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلا کر سوال کرتے پھریں۔ لہٰذا اپنی اولاد کو دینا ہماری ذمہ داری ہے، ہم ان کے لیے کچھ جمع کریں اور ان کے لیے کچھ بنائیں، تاکہ ہماری موت کے بعد اولاد محتاج نہ ہو۔ حتیٰ کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر کوئی آدمی ایک لقمہ اُٹھا کر اپنی بیوی کے منہ میں رکھتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو خیرات اور صدقہ کا ثواب عطا فرماتے ہیں۔

جتنی مال کی محبت ہو اور پسندیدہ مال اللہ کے راستے میں دے، نیکی ملے گی۔ رشتہ داروں کے بعد ان لوگوں کا حق ہے جو یتیم ہیں، جن کے ماں باپ مرگئے ہیں، ان پر کوئی شفقت کا ہاتھ پھیرنے والا نہیں ہے۔ مساکین سے مراد غرباء اور فقراء ہیں، مساکین سکون سے ہے جیسے آدمی سکون میں بیٹھ گیا کہ کوئی ذریعہ معاش نہیں ہے، ہر چیز سے تھک ہار کر بیٹھ گیا ہے۔ اسی طرح سے بیوہ محتاج کا حق ہے۔

گردن چھڑانے کے کیا معنی ہیں؟

﴿وَفِي الرِّقَابِ﴾ اگر اللہ تمہیں مال دے تو گردن چھڑانے میں مال خرچ کرو۔ اس کے دو مطلب ہیں: ایک یہ کہ ڈرائیور سے گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہوگیا، اس کے لئے دیت مقرر ہوگئی، مثلاً وہ ایک لاکھ چالیس ہزار ریال دیت دے۔ ایک ڈرائیور کے پاس اتنے پیسے کہاں سے آسکتے ہیں؟ اور جب تک دیت نہ دے، اس کی ضمانت بھی نہیں ہوسکتی۔ اگر کوئی ضامن دے گا تو وہ اس چیز کی ضمانت دے گا کہ میں اس کو حاضر کردوں گا۔ اب دیت ایک لاکھ

چالیس ہزار ہے اگر مثلاً ایک سو چالیس آدمی ایک ایک ہزار ریال دے دیں تو دیت ادا ہو جائے گی اور بندہ بھی چھوٹ جائے گا۔

غلاموں کو خرید کر آزاد کرنا، یہ گردن کا چھڑانا ہے، جیسا کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ غلام تھے، کافراُن کو مارتے تھے اور ان پر ظلم کرتے تھے تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جا کر ان کے مالک سے بات کی کہ جتنے پیسے لینے ہیں، لے لو اور ان کو آزاد کر دو۔

علماء نے لکھا کہ ایک آدمی پر قرضہ آ گیا۔ اس کی گردن بھی گویا کہ پھنسی ہوئی ہے، آپ اس کی مدد کر رہے ہیں کہ وہ قرضہ ادا کر دے اور اس کی گردن چھوٹ جائے تو یہ بھی ﴿وَفِي الرِّقَابِ﴾ میں شامل ہے۔ یہ مالی مسائل کا بیان تھا۔

آگے فرمایا: ﴿وَأَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ﴾ کہ نماز قائم کرے اور زکوۃ ادا کرے۔ کسی کے ذہن میں یہ آ سکتا تھا کہ ہم اللہ کو مانتے ہیں، آخرت کو مانتے ہیں، غریبوں اور مسکینوں میں بڑی خیرات کرتے ہیں، یہ کافی ہے۔ اللہ نے فرمایا: اس میں خوش نہ رہے کہ نماز چھوڑ دے۔ اس نے حقوق مالی ادا کئے اور حقوق بدنی ادا نہ کئے تو وہ کامل مسلمان نہ بنا۔ جیسا کہ آج کل کئی لوگ خیرات تو کرتے ہیں، حج پر بھی لوگوں کو بھیج دیتے ہیں، لیکن نماز نہیں پڑھتے۔ ایسی خیرات کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا کہ نماز چھوڑنے کے عذاب سے بچ جائے۔ نماز، ایمان اور کفر میں فرق کرتی ہے، نماز اللہ اور بندے کو جوڑنے والی ایک رسی ہے، جس نے اس کو توڑ ڈالا تو گویا اس نے اللہ سے رشتے کو توڑ ڈالا۔

بے نمازی کا حکم:

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ اور شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ اور کئی علماء نے فتویٰ دیا کہ کوئی آدمی اگر ایک نماز بھی جان بوجھ کر چھوڑ دے تو وہ کافر ہو جاتا ہے اور اس کا نکاح بھی ختم ہو جاتا ہے۔ اگر وہ مر جائے تو اس کا جنازہ نہ پڑھیں اور مسلمانوں کے قبرستان میں اس کو دفن بھی نہ کریں۔ باقی ائمہ فرماتے ہیں کہ بے نمازی فاسق اور فاجر ہوتا ہے، لیکن اس نے ایسا کام کیا ہے جو کبھی اس کو کفر تک لے جائے گا۔

یہ بھی نہ کرے کہ وہ صدقہ، خیرات، مسکینوں یتیموں کو کھلانے میں مگن ہو جائے اور زکوۃ ادا نہ کرے، بلکہ فرض عبادت (زکوۃ) تو ضروری ہے۔

﴿وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا﴾ کی تفسیر:

مومن کی نشانی ہے کہ اگر وہ عہد کرے تو اس کو پورا کرے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ قیامت والے دن پوچھا جائے گا کہ تم نے وعدہ کیا تھا تو اس کو پورا کیوں نہیں کیا تھا؟

وعدہ پورا کرنا اور اس کی میعاد:

کسی شخص نے دوسرے کے ساتھ وعدہ کیا اور وعدہ کرنے کے وقت نیت بھی ہو کہ میں وعدہ پورا کروں گا۔ اگر پھر خدانخواستہ پورا نہ کر سکا، لیکن اپنی طرف سے کوشش کی تو اللہ تعالیٰ معافی دے دیتے ہیں۔ اور اگر وعدہ کرتے وقت ہی یہ نیت کر رہا ہے کہ میں پورا تو نہیں کروں گا، بس اس کو دھوکہ دے رہا ہوں۔ یہ بھی نفاق ہے، یہ مومن کی صفت نہیں ہے۔

﴿وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ﴾ ہر تنگی، ہر بیماری میں، ہر دُکھ سکھ میں صبر کرنے والا مومن ہے اور جب عین جنگ کا وقت ہو تو جمنے والا ہو۔ یہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے قول کو سچا کیا اور یہی لوگ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والے ہیں۔

"أبواب البر و الصلة" صفاتِ ایمان:

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے بڑے عظیم جملے اور عام قاعدے جو سب کو شامل ہیں اور ایسے اصول بیان فرمائے ہیں جو ہمیشہ قائم رہنے والے ہیں۔ اس لئے علماء نے اس آیت کا عنوان "أبواب البر و الصلة" تجویز فرمایا ہے۔

(حدیث) ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی سند سے روایت بیان فرمائی کہ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ ایمان کیا ہے؟ آپ نے یہ آیت مبارکہ تلاوت فرمائی، یعنی جن کے اندر یہ صفات ہوں گی، وہ مومن ہیں۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے پھر پوچھا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر یہی آیت تلاوت فرمائی۔ پھر انہوں نے پوچھا کہ حضور! مجھے ایمان کی تعریف بتلائیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر بھی یہی آیت مبارکہ تلاوت فرمائی اور اس کے بعد فرمایا:

"إِذَا عَمِلْتَ حَسَنَةً أَحَبَّهَا قَلْبُكَ، وَ إِذَا عَمِلْتَ سَيِّئَةً أَبْغَضَهَا قَلْبُكَ." [مستدرک الحاکم، رقم: ۳۰۷۷]

جب تم کوئی بھلائی کا کام کرو اور وہ تمہارے دل کو پیارا لگے تو سمجھو ایمان کی نشانی ہے اور اگر گناہ ہو جائے اور تیرا



دل نفرت کرے کہ میں نے غلطی کی ہے تو یہ بھی ایمان کی علامت ہے۔

دوسری حدیث مبارک میں آتا ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ خدانخواستہ اگر تم سے کوئی گناہ ہوجائے اور تم یوں محسوس کرو کہ میرے اوپر تو پہاڑ گر پڑا، تم رو رہے ہو، ڈر رہے ہو، اللہ تعالیٰ سے فریادیں کررہے ہو اور بار بار نیکی کے عمل کررہے ہو کہ میں کسی طرح اس گناہ کی میل کچیل کو دھوڈالوں تو سمجھ لو کہ ایمان ہے۔ اور اگر تم سے گناہ کا کام ہوجائے اور تم ایسے سمجھو کہ جیسے مکھی ناک پر بیٹھی تھی اور اس کو اُڑا دیا کہ انسان سے تو گناہ ہوتے رہتے ہیں تو سمجھ لو کہ اندر سے ایمان کمزور ہو چکا ہے۔

ایک روایت میں ہے کہ ایک آدمی حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں آیا اور کہا: ہمیں ایمان کے بارے میں بتلائیں۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے یہی آیت تلاوت فرمائی۔ اس نے کہا: میں نے آپ سے ابواب البر نہیں پوچھے، میں نے تو آپ سے ایمان کے بارے میں پوچھا ہے۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میرے بھائی! اسی طرح جیسے تُو نے سوال کیا ہے میں نے حضور ﷺ سے سوال کیا تھا کہ ایمان کیا ہے تو حضور ﷺ نے یہی آیت تلاوت فرمائی تھی کہ یہ ایمان کی صفات ہیں، اور میں بھی اسی طرح راضی نہیں ہوتا تھا، جیسے تم میری بات پر راضی نہیں ہورہے۔ حضور ﷺ نے اپنی انگلی سے سمجھایا اور فرمایا:

"اَلْمُؤْمِنُ إِذَا عَمِلَ حَسَنَةً سَرَّتْهُ وَ رَجَا ثَوَابَهَا، وَ إِذَا عَمِلَ سَيِّئَةً أَحْزَنَتْهُ وَ خَافَ عِقَابَهَا."

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۱۹۷]

مومن وہ ہوتا ہے کہ جب اس سے اچھا کام ہوجائے تو خوش ہو اور اللہ تعالیٰ سے ثواب کی امید کرے اور جب اس سے کوئی گناہ سرزد ہوجائے تو اس کو برا محسوس کرے اور اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرے۔ یہ اس کے ایمان کی علامت ہے۔

ایمان اطاعتِ الٰہی و اطاعتِ رسول کا نام ہے:

مفسر رحمہ اللہ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو حکم دیا کہ بیت المقدس کی طرف نماز پڑھو اور پھر حکم دیا کہ بیت المقدس کو چھوڑ کر کعبہ شریف کی طرف رخ کر کے نماز پڑھو۔ یہ بات اہل کتاب کو بڑی عجیب لگی کہ پہلے تو ہمارے کعبہ کی طرف پڑھتے تھے، اب حضور ﷺ نے قبلہ بھی بدل دیا اور بعض مسلمانوں کو بھی



یہ بات بڑی مشکل لگی کہ کعبہ شریف کا حکم کیوں تبدیل ہو گیا ہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے قرآن میں یہ آیت مبارکہ نازل فرما کر حکمت بیان فرمائی کہ مومن بندے کا یہ کام ہے کہ وہ اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے حکم کے تابع کر دے۔ اللہ جس طرف رخ کرنے کا حکم دے، اس طرف پھر جائے اور جس طرف رخ کرنے سے روکے، اس طرف سے رک جائے، اسی کا نام ایمان کامل ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو حکم دیا کہ قربانی کی عید پر جانور ذبح کریں۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کو نہ بکری کا گوشت چاہیے اور نہ اس کے خون کی ضرورت ہے، بلکہ اللہ پاک تو یہ دیکھتے ہیں کہ میرے بندے کتنی پرہیز گاری سے میرے حکم کی اطاعت کرتے ہیں۔

﴿اِبْنُ السَّبِيْلِ﴾ کون لوگ ہیں؟

﴿وَابْنَ السَّبِيْلِ﴾ کے معنی میں دو قول ہیں: ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد مسافر ہیں، مثلاً ایک آدمی سفر پر جاتا ہے، اپنے ملک میں لاکھوں پتی ہے، لیکن سفر میں اس کے پیسے گر گئے یا چوری ہو گئے یا ختم ہو گئے تو اس کا کیا حال ہوگا؟ اب وہ کسی آدمی سے سوال نہیں کر سکتا۔ کیونکہ جس نے ساری زندگی سوال نہ کیا ہو، اس کے لئے سوال کرنا موت ہے اور جن کو سوال کی عادت پڑ گئی ہے، ان کے لیے سوال کو چھوڑ دینا موت ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ایک قول ہے کہ ﴿وَابْنَ السَّبِيْلِ﴾ کا معنی مہمان ہے، کیونکہ وہ بھی مسافر ہوتا ہے۔ اگر تمہارے گھر میں کوئی مہمان آئے تو اس کو تین دن تک ضیافت دینا سنتِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ آج کل تو آدمی اسی کی ضیافت اور اس کو کھلاتا ہے جو مالدار ہو۔ حالانکہ اسلام کا قاعدہ یہ ہے کہ جو جتنا غریب ہے وہ تیری ہمدردی کا زیادہ مستحق ہے۔ بڑے آدمی کو تو ریسٹورنٹ میں جگہ مل جائے گی، اصل تو وہ مسافر ہے کہ جس کو کوئی دعوت دینے والا نہیں ہے۔

﴿وَالسَّآئِلِيْنَ﴾ مانگنے والا کوئی آ گیا تو اس کو بھی دیں۔ مانگنا اتنی بڑی ذلت ہے کہ اس سے بڑی کوئی ذلت نہیں ہے تو قرآن میں اس لیے آ گیا کہ کوئی اس وقت مانگنے جائے گا کہ اس کے پاس کوئی حل نہیں ہوگا، تب وہ جا کر ذلت برداشت کرے گا اور تیرے آگے ہاتھ پھیلائے گا، ورنہ کون ہے جو ذلت کا سوال کرے۔ اس لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مانگنے والے کا ایک حق ہوتا ہے، کوئی بھی مانگے تو اس کو دے دو، چاہے وہ سواری پر سوار ہو کر کیوں نہ آئے۔ اگر وہ غلط مانگ رہا ہے تو قیامت میں خود پکڑا جائے گا۔ اگر کچھ نہیں کر سکتے تو سائل کو محبت سے ٹال دو کہ اللہ تیرے لیے بھلا کرے، اللہ ہمارے لیے بھی بھلا کرے۔

ایک روایت میں یہ بھی آتا ہے کہ اگر مانگنے والا گھوڑے پر بھی آرہا ہے پھر بھی وہ مانگتا ہے تو اس کو دے دو، اس کو خالی نہ لوٹاؤ۔ قیامت میں فیصلہ ہوگا کہ اس نے ضرورت کے مطابق مانگا تھا یا عادت بنالی تھی۔

﴿يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ كُتِبَ عَلَيْكُمُ ٱلْقِصَاصُ فِى ٱلْقَتْلَى ۖ ٱلْحُرُّ بِٱلْحُرِّ وَٱلْعَبْدُ بِٱلْعَبْدِ وَٱلْأُنثَىٰ بِٱلْأُنثَىٰ ۚ فَمَنْ عُفِىَ لَهُۥ مِنْ أَخِيهِ شَىْءٌ فَٱتِّبَاعٌۢ بِٱلْمَعْرُوفِ وَأَدَآءٌ إِلَيْهِ بِإِحْسَٰنٍ ۗ ذَٰلِكَ تَخْفِيفٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ ۗ فَمَنِ ٱعْتَدَىٰ بَعْدَ ذَٰلِكَ فَلَهُۥ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿١٧٨﴾ وَلَكُمْ فِى ٱلْقِصَاصِ حَيَوٰةٌ يَٰٓأُو۟لِى ٱلْأَلْبَٰبِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴿١٧٩﴾﴾ [البقرۃ:۱۷۸، ۱۷۹]

''اے ایمان والو! مقتولوں کے متعلق تم پر قصاص فرض ہے، آزاد آزاد کے بدلے میں، غلام غلام کے بدلے میں، عورت عورت کے بدلہ میں (قتل کی جائے)، پس جس کو معاف کر دیا گیا اس کے بھائی (یعنی مقتول کے وارث) کی طرف سے کچھ، پس دستور کے مطابق تابعداری کرنی چاہیے اور اس (دیت) کو خوبی کے ساتھ ادا کرنا چاہیے، یہ تمہارے رب کی طرف سے آسانی اور مہربانی ہے، پھر جو اس فیصلہ کے بعد زیادتی کرے تو اس کے لیے دردناک عذاب ہے۔ اور تمہارے لیے قصاص میں بقائے عظیم ہے اے عقل والو کہ تم (قصاص کے خوف سے خون ریزی سے) بچے رہو۔''

ان آیاتِ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے مسئلہ قصاص کو بیان فرمایا ہے۔ اس کے اندر ''أبواب البر و الصلة'' کی فروع کا حکم بیان ہوگا۔

قصاص کا معنی:

مماثلت، برابری۔ یعنی کسی نے آپ کو کوئی نقصان پہنچایا ہے تو بالکل عین اس کے برابر نقصان دینا قصاص ہے۔ پھر یہ لفظ بدلہ میں استعمال ہوا۔

تمام احکامِ الٰہی کو تسلیم کرنا فرض ہے:

اللہ تعالیٰ نے جتنے احکام، حدود کو بیان کیا ہے وہ سراپا عدل وانصاف ہیں۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کی کتاب پر، اللہ

کی توحید پر، رسالت پر ایمان لانا ضروری ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ کے تمام شرائع، حدود کو ماننا اور ایمان لانا دلیل اسلام ہے اور ان پر اعتراض کرنا کفر کی دلیل ہے۔ اگر آج کوئی آدمی یہ دعویٰ کرے کہ میں مسلمان ہوں، نماز بھی پڑھتا ہوں، روزہ بھی رکھتا ہوں، قرآن پر، حضور پاک ﷺ پر ایمان بھی رکھتا ہوں، لیکن ساتھ یہ بھی کہتا ہے کہ اسلام کی بعض سزائیں بڑی سخت ہیں، جیسے چور کا ہاتھ کاٹ دینا، رجم (سنگسار کرنا)، شرابی کو کوڑے مارنا، تہمت لگانے والے کو کوڑے مارنا، جھوٹی گواہی دینے والے کو کوڑے مارنا۔ یہ ٹھیک ہے کہ یہ سزائیں اس دور میں تو مناسب تھیں جس دور میں قرآن پاک نازل ہوا تھا کیونکہ وہ جاہلیت کا دور تھا، کوئی امن وامان نہیں تھا اور کوئی نظام قائم نہیں تھا، کوئی پولیس اور کوئی چوکیاں نہیں تھیں۔ اس لئے اس دور میں عبرتناک سزائیں رکھی گئیں، تاکہ کوئی آدمی جرم پر جرأت نہ کر سکے، لیکن آج متمدن اور ترقی یافتہ دور ہے، اس دور میں چودہ سو سال پہلے والی سزاؤں کا اجراء کیسے کیا جا سکتا ہے؟

کوئی آدمی یہ عقیدہ رکھے تو وہ کافر ہے کیونکہ اگر کسی نے یہ عقیدہ رکھ لیا تو کافر کو یہ کہنے کا موقع مل جائے گا کہ حضور ﷺ کی نبوت بھی اس زمانے کے لئے تھی، اب ہمیں کیا ضرورت ہے؟ ہم تو خود پڑھے لکھے لوگ ہیں۔ دوسرا آدمی اُٹھ کر یہ کہہ سکتا ہے کہ ہمیں حضور ﷺ کی نبوت ورسالت اور شریعت کی کوئی ضرورت نہیں ہے، جیسا کہ دنیا میں ایسے لوگ پیدا ہوئے جنہوں نے کہا کہ اب ہمیں نماز کی کوئی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ نماز بندے کو فٹ رکھنے کے لئے ایکسرسائز تھی، اب ورزش کے اور کئی طریقے نکل آئے ہیں، اس لیے نماز کی کوئی ضرورت نہیں رہی۔ اس طرح تو دین بازیچۂ اطفال بن جائے گا کہ جس نے جیسے چاہا توڑ دیا، کھیل بنا دیا۔

عقلی اور فطری بات ہے کہ اگر آپ کسی ملک میں ویزہ لے کر جاتے ہیں، اس ملک میں داخل ہونے کے بعد آپ کو اس کے قوانین کا احترام کرنا پڑتا ہے، وگرنہ آپ اس ملک میں داخل ہی نہ ہوں۔ آپ کو کسی نے بلایا تو نہیں ہوتا، آپ اپنی خواہش اور مرضی سے جاتے ہیں۔ آپ دنیا کے کسی ملک میں چلے جائیں اور اس کے شہری بن جائیں تو اس ملک کے قوانین آپ پر لاگو ہو جائیں گے یا پھر آپ اس ملک کی شہریت اختیار نہ کریں، خدا کے لئے ذرا تم غور کرو کہ تم ٹریفک قوانین کے پابند ہو، ڈاک خانے کے بنے ہوئے قواعد کے پابند ہو کہ لفافے میں جو وزن مقرر ہے، اس سے زیادہ وزن ڈالو تو وہ اس پر جرمانہ کریں گے یا پھر آپ کی ڈاک واپس آجاتی ہے۔ ہم ان ساری چیزوں پر پابندی ضروری سمجھتے ہیں تو کیا صرف دین محمد مصطفیٰ ﷺ ایسا ہے کہ کلمہ پڑھو، پھر جو مرضی آئے، کرتے رہو؟

یاد رکھیں! مسلمان کا سب سے پہلا بنیادی فرض یہ ہے کہ جب ہم نے کلمہ پڑھ لیا تو ہم نے اللہ اور اللہ کے رسول کے دین کو بطور دین قبول کر لیا۔ اب ہم پر اس کے بندے بن کر اور اس کے تابع ہو کر چلنا ضروری ہے۔ اگر بدقسمتی سے کسی ملک میں اسلام کا قانون نہیں ہے تو جہاں تک ہم اسلام پر کاربند رہ سکتے ہیں، رہنا ہوگا اور دعا کرنی ہوگی کہ اللہ وہاں اسلام کو بطور دین نافذ کر دے اور جہاں نافذ ہے، اللہ تعالیٰ اس کو قائم و دائم رکھے۔

دوسری بات یہ یاد رکھیں کہ اللہ تعالیٰ خالقِ کائنات ہیں اور یہ دنیا کا مسلّم قاعدہ ہے کہ جو خالق ہے، وہ مالک ہے۔ لہٰذا یہ مخلوق اللہ کی ہے تو حکم بھی اسی کا چلے گا۔

انگریزی قانون ناقص ہے:

تیسری بات یہ یاد رکھیں کہ پوری دنیا میں جتنے قانون ہیں، سب ناقص ہیں، صرف اللہ کا قانون کامل ہے۔ انگریز کو اپنے قانون پر بڑا ناز ہے، انہوں نے جب سب سے پہلے قانون بنایا اس میں انہوں نے قتل کے بارے میں لکھا کہ اس آدمی کو پھانسی پر لٹکا دیا جائے۔ ہندوستان کی تاریخ میں یہ بات موجود ہے کہ بیرسٹر محمود کے پاس ایک مقدمہ آیا، انہوں نے فائل کے اندر دیکھا کہ فائل بڑی مضبوط تھی، ایف آئی آر سے قتل تک ملزم کے چھوٹ جانے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ بہرحال انہوں نے فائل کا مطالعہ کیا اور ان کے دماغ میں ایک نکتہ آ گیا تو انہوں نے کہا کہ میں اتنی فیس لوں گا۔ دوسری شرط یہ ہے کہ کسی ماتحت کورٹ میں بھی نہیں آؤں گا پہلے جو میرے جونیئر وکیل پیشیاں بھگتتے رہے بہرحال وہ عدالت کے آخری فیصلے پر گئے، مجرم کو سزائے موت ہوگئی۔ وکیل صاحب نے صرف اتنی درخواست دائر کر دی کہ ہمیں فلاں دفعہ کے تحت حق حاصل ہے کہ میرے مؤکل کو پھانسی پر لٹکایا جائے، وہاں مجھے بھی حاضر ہونے کی اجازت دی جائے جج نے اجازت دے دی۔ جب مجرم کو پھانسی پر لٹکایا جانے لگا تو وکیل صاحب نے مجسٹریٹ سے کہا کہ آپ کا قانون یہ کہتا ہے کہ زیر دفعہ تین سو دو اس آدمی کو پھانسی پر لٹکا دیا جائے۔ میرا مؤکل لٹک چکا ہے اور یہ نہیں لکھا ہوا کہ اس کو لٹکا کر موت دی جائے۔ اب اگر آپ نے اس کو مار ڈالا تو میں آپ پر فلاں کیس کروں گا۔ جب انہوں نے قانون کو دیکھا تو ان کو بھی حیرت ہوئی اور ان کا دماغ ہلا۔ انہوں نے اپنے بڑے افسران سے رابطہ کر کے بتلایا تو انہوں نے کہا: فی الحال پھانسی روک دو اور اس کو کوٹھڑی میں بھیج دو۔ مغز مار مار کر اس نتیجہ پر پہنچے کہ وکیل سچ کہتے ہیں، اس ملزم کو بری کیا جائے اور آئندہ قانون میں یہ اضافہ کر دو کہ موت تک

لٹکا رہنے دیا جائے۔ تو جو سب سے مایہ ناز ان کا قانون تھا، اس کے لفظ بھی غلط ہو گئے۔

اور میں نے خود کافی سارے ججوں کے ریمارکس پڑھے ہیں کہ ملزمان نے کورٹ میں آ کر زیادتی کی، جس سے جج کی توہین ہوئی۔ ان ججوں نے ریمارکس دیئے کہ توہین عدالت کا قانون اتنا نامکمل اور ناقص ہے کہ ہم اس ملزم کو کوئی سزا نہیں دے سکتے، مہربانی کر کے اس میں ترمیم کی جائے۔ لیکن اسلام کا قانون ایسا ہے کہ اس کا بنانے والا اللہ ہے اور یہ قانون کامل ہے۔ جس کی ذات میں کوئی نقصان نہیں، اللہ بھولنے سے پاک ہے، غلطی سے پاک ہے اور اس قانون کو لے آنے والا اپنی حدود میں کامل ہے اور پھر جس پر قانون اُتارا گیا وہ مخلوق میں کامل ہے۔ لہٰذا یہ قانون کامل مکمل ہے، جس میں ایک زبر زیر کے اضافہ کی ضرورت نہیں ہے۔ چودہ سو سال گزرنے کے باوجود پوری دنیا قرآن کے مقابلہ پر ایک آیت بھی نہیں لا سکی اور آج بھی قرآن کا چیلنج موجود ہے اور قیامت تک رہے گا۔

قتل کی اقسام اور ان کے احکام:

قتل کی دو قسمیں ہیں: 1 قتل عمد 2 قتل خطا۔

قتل عمد: جان بوجھ کر کسی تیز دھار آلہ سے یا ایسے آلہ سے جس سے بدن کٹ جاتا ہو، اس سے ضرب لگا کر بندہ کو مار دے۔ اسلام نے قتل عمد کی سزا قتل رکھی ہے، لیکن اس کی شرط یہ ہے کہ مقتول کے ورثاء میں کوئی ایک بھی دیت پر راضی نہ ہو۔ مثال کے طور پر ایک آدمی قتل ہو گیا، اس نے چار بیٹے چھوڑے۔ اگر مقتول کے سارے کے سارے ورثاء اس بات پر بضد ہیں کہ اس نے ہمارے باپ کو قتل کیا ہے ہم بدلہ لیں گے، اس کے لیے کوئی رعایت نہیں اور اگر وارثوں میں سے کسی نے کہا کہ میں معاف کرتا ہوں یا میں دیت پر راضی ہوں تو اب وہ آدمی قتل نہیں کیا جائے گا، اس سے دیت لی جائے گی۔

قتل خطا: غلطی سے کوئی مارا گیا، مثلاً گاڑی چلا رہے تھے کوئی آدمی نیچے آ گیا، شکار کھیل رہے تھے اتفاق سے کسی انسان کو گولی لگ گئی، کسی کو تھپڑ مارا اور وہ مر گیا عموماً لوگ تھپڑ سے مرتے نہیں ہیں، تو یہ سب چیزیں قتل خطا میں آ جاتی ہیں۔ قتل خطا کی سزا دیت ہے اور دیت ایک سو اونٹ یا ایک ہزار دینار یا دس ہزار درہم ہیں اور ان چیزوں کی قیمت گھٹتی بڑھتی رہتی ہے، قتل خطا میں ماسوائے دیت کے قتل کی سزا نہیں دے سکتے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تمہارے اوپر قصاص لکھا ہے برابر کا بدلہ لینا ہے اس میں کسی قسم کی زیادتی نہیں کرنی، جیسا

کہ اللہ تعالیٰ نے دوسری آیات میں ارشاد فرمایا کہ نفس کے بدلہ میں نفس لیا جائے گا اور فرمایا:

﴿فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ ۠ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ۝﴾ [البقرة:۱۹۴]

اگر تمہارے ساتھ زیادتی کرے تو تم بھی اتنی زیادتی کر سکتے ہو جتنی اس نے کی ہے اگر تمہیں کسی نے عذاب پہنچایا ہے تو تم بھی اسی کے بقدر عذاب اور تکلیف پہنچا سکتے ہو۔

لیکن یاد رکھیں اگر آپ کو کسی نے مارا ہے تو تم یہ نہ کرو کہ خود اس کو مارنے لگ جاؤ، بلکہ تم متعلقہ قاضی اور محکمے سے شکایت کرو اگر کسی نے تمہارا قتل کیا ہے تو تم جا کر خود قتل نہ کر دو، شریعت اس چیز کی اجازت نہیں دیتی۔ جہاں اسلامی حکومت نہیں ہے وہاں صبر کرنا ہے کیونکہ اس کے علاوہ کوئی حل نہیں ہے ورنہ تو ایک فساد شروع ہو جائے گا۔ اس لیے حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:

''عَلَيْكُمْ بِالسَّمْعِ وَ الطَّاعَةِ لِمَنْ وَلَّاهُ اللّٰهُ أَمْرَكُمْ وَ إِنْ كَانَ عَبْدًا حَبَشِيًّا.'' [شعب الایمان، رقم:۷۵۱۵]

اپنے اُولوالامر کی سنو اور اطاعت کرو، اگرچہ وہ حبشی غلام ہی کیوں نہ ہو۔

ہمارے قبائل میں ایک مصیبت ہے کہ اگر ایک قتل ہو جائے تو چار قتل کرتے ہیں، یہ بھی ظلم ہے اسی طرح اگر ان کی عورت ماری گئی تو وہ ان کے مرد ماریں گے یہ بھی ظلم ہے۔ بعض اوقات یہ ہوتا ہے کہ ایک قبیلہ مضبوط ہے اس کا آدمی مارا گیا اس نے کمزور قبیلے کے چار بندے مار دیئے، پھر جب صلح کا مطالبہ ہوا تو انہوں نے کہا: ہم اس وقت صلح کریں گے جب یہ قبیلہ ہم کو دو لڑکیاں دے یہ بھی ظلم ہے۔ اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا، یہ کافروں کے قواعد ہیں ڈنڈے کا قانون ہے اسلام انصاف کا حکم دیتا ہے۔

قصاص میں برابری:

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مدینہ منورہ میں دو قبیلے آباد تھے، اکثر ان میں لڑائی رہتی تھی۔ ایک دفعہ بنو نضیر بنو قریظہ پر غالب آ گئے اگر بنو نضیر بنو قریظہ کا کوئی بندہ مار دیتے تو بدلہ میں وہ قتل نہیں کیے جاتے تھے کیونکہ وہ طاقتور تھے بلکہ وہ ایک سو وسق کھجور دے دیتے تھے کہ تم دیت لے لو ہمارا بندہ قتل نہیں ہوگا کیونکہ ہم بڑے لوگ ہیں اور اگر بنو قریظہ کے کسی بندے نے بنو نضیر کا بندہ مار دیا تو وہ قتل ہوتا تھا اگر بنو نضیر والے ناراض ہو گئے کہ ہم قتل کا بدلہ نہیں لیتے لیکن



تم دیت ادا کرو۔ تمہاری دیت سو وسق کھجور تھی ہماری دیت دو سو وسق کھجور ہوگی کیونکہ ہم تم سے زیادہ عزت والے لوگ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے حکم دے دیا کہ قصاص کے اندر عدل وانصاف ہوگا تم ہرگز پیروی نہ کروان لوگوں کی جو فساد کرنے والے ہیں جو تحریف کرنے والے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے احکام کی مخالفت کرنے والے ہیں۔

بعض روایات میں ہے کہ وہ کہتے تھے کہ ہمارا غلام مارا گیا اس کے بدلہ میں ہم تمہارا آزاد ماریں گے۔ اگر عورت ماری گئی تو ہم اس کے بدلہ میں تمہارا مرد ماریں گے وگرنہ تمہاری اور ہماری صلح نہیں ہوسکتی ہے تو اللہ تعالیٰ نے قرآن میں یہ آیات نازل فرمائیں کہ تم کیا کر رہے ہو؟ قصاص کا معنی تو برابری ہے اس وجہ سے آیت میں آزاد کی قید آگئی جس سے بعض حضرات نے اس سے آیت کا مخالف مفہوم لے لیا کہ اگر کوئی آزاد غلام کو قتل کردے تو غلام کے بدلہ میں آزاد قتل نہیں ہوگا۔ لیکن راجح قول ﴿وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَآ أَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ ۙ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْأَنفَ بِالْأَنفِ وَالْأُذُنَ بِالْأُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ ۙ وَالْجُرُوحَ قِصَاصٌ ۚ فَمَن تَصَدَّقَ بِهِۦ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهُۥ ۚ وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَآ أَنزَلَ اللَّهُ فَأُو۟لَـٰٓئِكَ هُمُ الظَّـٰلِمُونَ ۝﴾ [المائدۃ:۴۵] ہے اگر عورت نے قتل کیا ہے تو بدلہ میں وہی عورت قتل ہوگی۔

اسی طرح اسلام نے ہمیں حکم دیا ہے کہ جب کافروں کے ساتھ مقابلہ ہو تو ان کی عورتوں کو قتل نہ کرو، لیکن جو عورت بندوق لے کر لڑنے کے لئے آجائے تو اس کو قتل کیا جائے گا، کیونکہ اس نے خود مرنا قبول کیا ہے۔

اسی طرح کافروں کے جو پنڈت، پادری ہیں ان کو بھی قتل نہ کیا جائے لیکن اگر وہ لڑنے کے لئے آجائیں تو ان کو بھی قتل کیا جائے گا، کیونکہ حکم ہے: ﴿فَمَنِ اعْتَدَىٰ بَعْدَ ذَٰلِكَ فَلَهُۥ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝﴾ [البقرۃ:۱۷۸]

بعض مفسرین فرماتے ہیں: اس آیت کا حکم ﴿النَّفْسَ بِالنَّفْسِ﴾ والی آیت کے ساتھ منسوخ ہوگیا۔

﴿وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ﴾ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر آزاد نے غلام کو قتل کیا تو بدلہ میں آزاد قتل ہوگا کیونکہ سورۃ المائدہ والی آیت عام ہے۔ امام ثوری رحمہ اللہ، ابن ابی لیلیٰ رحمہ اللہ اور امام داؤد رحمہ اللہ کا مذہب بھی یہی ہے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ، حضرت سعید بن المسیب رحمہ اللہ اور حضرت قتادہ رحمہ اللہ کا بھی یہی مسلک ہے۔

اسی طرح امام بخاری رحمہ اللہ، علی بن المدینی رحمہ اللہ، ابراہیم نخعی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اگر کسی سردار نے اپنے غلام کو قتل کردیا تو سردار کو قتل کیا جائے گا اس حدیث کے عام ہونے کی وجہ سے کہ جس میں ہے:

''مَنْ قَتَلَ عَبْدَهُ قَتَلْنَاهُ، وَ مَنْ جَدَعَهُ جَدَعْنَاهُ، وَ مَنْ أَخْصَاهُ أَخْصَيْنَاهُ.'' [سنن النسائی، رقم:۴۷۳۶]

جس نے اپنے غلام کو قتل کیا ہم اس کو قتل کریں گے، جس نے غلام کا کان، ناک کاٹا ہم اس کا کان، ناک کاٹیں گے اور اپنے غلام کو خصی کیا تو ہم اس کو بھی خصی کریں گے۔

بعض مفسرین فرماتے ہیں: آزاد کو غلام کے بدلے میں قتل نہیں کیا جائے گا کیونکہ غلام ایک مال ہے اگر عبد خطأ مارا جائے تو اس میں دیت بھی نہیں ہوگی، بلکہ اس کی جو قیمت ہے وہ دی جائے گی جب اس کا قصاص نہیں لیا جاتا تو نفس کے معاملہ میں بھی نہیں لیا جائے گا۔

ذمی کافر کے بدلہ میں مسلمان کا قتل:

بعض علماء نے فرمایا: مسلمان کو ذمی کافر کے بدلہ میں قتل نہیں کیا جائے گا۔لیکن امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مسلمان کو ذمی کافر کے بدلہ میں قتل کیا جائے گا۔

امام صاحب رحمہ اللہ کا ایک اصول ہے۔ وہ سب سے پہلے کتاب اللہ کو لیتے ہیں، پھر سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو لیتے ہیں اور اگر دو احادیث بظاہر متعارض ہوں اور دونوں حدیثیں صحیح ہوں تو امام صاحب فرماتے ہیں کہ دیکھو! ابوبکر وعمر وعثمان وعلی رضی اللہ عنہم نے کس پر عمل کیا ہے؟ کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمادیا تھا کہ میرے اور خلفائے راشدین کے عمل کو پکڑنا، خلفاء راشدین سب سے زیادہ علم والے تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سب سے زیادہ قریب تھے۔ انہوں نے اگر کسی ایک حدیث پر عمل کیا ہے تو ان کے علم میں کوئی وجہ ضرور ہوگی۔اگر خلفاء راشدین کا عمل نہ ملے تو عشرہ مبشرہ کے عمل کو دیکھتے ہیں جن کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا میں جنت کی خوشخبری سنائی تھی، کیونکہ ان سے غلطی نہیں ہوگی اور اگر ان کے عمل میں نہ ملے تو بیعت رضوان میں شریک صحابہ رضی اللہ عنہم کے عمل کو دیکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پوری دنیا میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی فقہ کو پذیرائی ملی ہے۔ پوری دنیا میں مسلمانوں کی تعداد دیکھ لیں، ان میں دو تہائی آپ کو فقہ حنفی پر عمل کرتے ہوئے نظر آئیں گے۔

عورت کے بدلے میں مرد کو قتل کیا جائے گا:

﴿وَالْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى﴾ بعض حضرات سورۃ البقرۃ کی اس آیت مبارکہ کو لے کر فرماتے ہیں کہ اگر مرد نے عورت کو قتل کردیا تو مرد کو قتل نہیں کیا جائے گا۔

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جمہور نے ان کی مخالفت کی ہے۔ کیونکہ آیت المائدۃ میں موجود ہے کہ مرد کو

عورت کے بدلے میں قتل کیا جائے گا۔ اسی طرح حضور ﷺ نے فرمایا:

''اَلْمُسْلِمُوْنَ تَتَكَافَأُ دِمَاؤُهُمْ.'' [سنن ابی داؤد، رقم: ۲۷۵۱]

تمام مسلمانوں کا خون برابر ہے۔

ایک آدمی نے اپنی بیوی کو قتل کر دیا تو کیا اس کو بیوی کے بدلہ میں قتل کیا جائے گا یا نہیں؟ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ قتل نہیں کیا جائے گا، لیکن جمہور فرماتے ہیں کہ اس کو قتل کیا جائے گا۔ ہمارے ہاں عام رواج ہے کہ بیوی پر شبہ ہو تو اس پر تیل ڈال کر جلا دیا یا قتل کر دیا۔ حالانکہ مرد کو اس چیز کا حق نہیں ہے۔ اگر اس کو شبہ ہے تو اس کو طلاق دے دے، اس کو قتل نہیں کر سکتا۔ اگر تم اس کو قتل کرو گے تو شریعت میں تمہیں قتل کیا جائے گا۔

قاتل زیادہ ہوں تو ان کا حکم:

ایک آدمی کے قتل میں مثلاً دس آدمی شریک تھے تو کیا اب دس کے دس قتل ہوں گے یا ایک قتل ہوگا؟ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور جمہور علماء اس طرف گئے ہیں کہ دس کے دس آدمی شریک تھے مثلاً آٹھ آدمیوں کے ہاتھوں میں لکڑیاں تھیں اور دو کے ہاتھ میں کلہاڑیاں تھیں، مقتول کے جسم پر کلہاڑی کی ضرب ہے اور لاٹھی کی ضرب نہیں ہے تو موجودہ قانون کہتا ہے کہ اس کے جسم پر کلہاڑی کی ضرب ہے، لاٹھی کی ضرب نہیں ہے لہٰذا یہ مارنے میں شریک نہیں۔ جبکہ اسلام کہتا ہے کہ جب یہ سارے نیتِ قتل کے ساتھ چل پڑے ہیں، اگرچہ انہوں نے نہیں مارا، لیکن یہ معاون جرم ہیں، اس لیے سب کو قتل کیا جائے گا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا کہ اگر بستی والے اکٹھے ہو کر ایک آدمی کو ماریں تو کیا کیا جائے؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: پوری بستی کو قتل کر دو۔ آخر انہوں نے ایک انسان کو کیوں قتل کیا ہے؟ لیکن آج ہمارے بعض ملکوں میں یہ حال ہو گیا ہے کہ کتے کے مرنے پر جتنا غم ہوتا ہے انسان کے مرنے پر اتنا غم نہیں ہوتا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ایک مقدمہ آیا کہ سات آدمیوں نے مل کر ایک غلام کو قتل کر دیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ان سب کو قتل کر دو اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب فیصلہ فرمایا تو کسی صحابی نے مخالفت بھی نہیں کی تھی تو گویا یہ اجماع ہو گیا۔ اور یہی بات امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: جیسے بیس تراویح حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مقرر فرمائیں اور کسی صحابی نے انکار نہیں کیا تو اس پر بھی اجماع ہو گیا، لیکن کچھ لوگ اس کو نہیں مانتے۔

معاف کرنے پر قاتل کی رضا کا حکم:

﴿فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ﴾ امام مالک رحمہ اللہ، امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ، امام ابویوسف رحمہ اللہ، امام محمد رحمہ اللہ، امام شافعی رحمہ اللہ اور امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ ان سب کا یہ قول ہے کہ ایک آدمی نے قتل عمد کیا۔ اسلام کہتا ہے کہ اس کو قتل کرو۔ مقتول کے وارثوں نے کہا: ہم نے اس کو معاف کیا، یہ دیت ادا کرے۔ اب دیت میں سے وارث کہیں کہ ہم اتنا معاف کرتے ہیں تو سارے ائمہ فرماتے ہیں: اس کے اندر قاتل کی رضا بھی ضروری ہے۔ پہلے دور کے اندر لوگ شریف اور بااصول ہوتے تھے کہ جب انہوں نے مجھے قتل سے بچالیا اور اب میں ان کو کہوں کہ دیت میں کچھ معاف کردو یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ انسان زندہ ہو تو پیسہ کما سکتا ہے دولت تو آنی جانی چیز ہے تو ضمیر والا آدمی کبھی یہ برداشت نہیں کرتا کہ مجھے پیسوں کی بھی معافی دی جائے۔ اور اگر وہ راضی ہو کہ میں تو اتنے پیسے ادا نہیں کرسکتا مجھے معاف کردو میں راضی ہوں تو معاف کرنا ٹھیک ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: معاف کرنے میں قاتل کی رضا کا کوئی مسئلہ نہیں ہے، بلکہ مالک کی مرضی ضروری ہے۔

ایک آدمی کو قتل کیا گیا اور دیت طے ہوگئی۔ مقتول کے وارثوں میں عورت بھی ہے تو کیا عورت بھی معافی دے سکتی ہے یا نہیں؟ بعض علماء فرماتے ہیں کہ عورت کو معاف کرنے کا حق نہیں ہے۔ بعض نے فرمایا: جتنے وارث ہیں، ہر ایک کو معاف کرنے کا برابر حق ہے چاہے وہ مرد ہو یا عورت ہو۔

﴿ذٰلِكَ تَخْفِيْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ﴾ کی تفسیر:

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: قتل عمد کے اندر ہم نے دیت رکھی، یہ ہماری رحمت ہے۔ کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں قتل کا کوئی بدلہ نہیں تھا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں قتل کا بدلہ قتل تھا، دیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اسلام کو معتدل بنادیا کہ اگر قتل عمد ہے اور ورثاء مقتول معاف نہیں کرتے تو قصاص ہوگا اور اگر ورثاء مقتول معاف کرتے ہیں تو دیت ہوگی، اور اگر قتل خطاء ہے تو صرف دیت ہوگی۔

ایک آدمی نے قتل کیا، مقتول کے ورثاء نے دیت مانگی کہ دیت ادا کرو، ہم تمہیں چھوڑتے ہیں۔ اس نے دیت دے دی۔ اس کے بعد انہوں نے کہا کہ اس نے ہمارے باپ کو قتل کیا تھا، اس کو قتل کرو تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: پھر میں عذاب دوں گا۔

ہمارے ہاں یہی بہت بڑی غلطی ہے کہ ایک آدمی سے قتل ہو گیا، مقتول کے ورثاء نے معاف کر دیا تو دل سے معاف کریں اور سب کچھ بھول جائیں۔

﴿وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ﴾ [البقرۃ:۱۷۹] کیونکہ جب قاتل کو پتہ ہو گا کہ اگر میں نے قتل کیا تو مجھے بدلہ میں قتل کر دیا جائے گا تو قتل کرنے سے رک جائے گا۔

﴿كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَكَ خَيْرَا ۖ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۸۰﴾ فَمَنْ بَدَّلَهٗ بَعْدَ مَا سَمِعَهٗ فَاِنَّمَآ اِثْمُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يُبَدِّلُوْنَهٗ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۸۱﴾ فَمَنْ خَافَ مِنْ مُّوْصٍ جَنَفًا اَوْ اِثْمًا فَاَصْلَحَ بَيْنَهُمْ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۸۲﴾﴾

[البقرۃ:۱۸۰تا۱۸۲]

”تم پر فرض ہے جب تم میں سے کسی کو موت (کے آثار) ظاہر ہوں اگر اس نے مال چھوڑا ہو تو والدین اور رشتہ داروں کے لیے شریعت کے مطابق وصیت کرے۔ یہ حکم پرہیز گاروں پر لازم ہے (یہ حکم بعد میں منسوخ ہو گیا تھا)۔ پس جس نے (اس کی) وصیت کو سننے کے بعد بدل دیا تو اس کا گناہ ان لوگوں پر ہو گا جو اس کو تبدیل کریں گے۔ بے شک اللہ سننے والا، جاننے والا ہے۔ پس جس کو وصیت کرنے والے سے طرفداری یا گناہ کا خوف ہو پھر ان میں باہم (عدل کر کے) صلح کرا دے تو اس پر کوئی گناہ نہیں۔ بے شک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔“

آیات کا باہمی ربط:

ان آیاتِ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے موت سے قبل والدین اور رشتہ داروں کے بارے میں وصیت کرنے کا حکم دیا ہے۔ جب تک میراث کی آیات مبارکہ نازل نہیں ہوئی تھیں اس وقت تک اپنے اموال میں ورثاء کے لیے وصیت کرنا فرض و واجب تھی، لیکن میراث کا حکم نازل ہوا تو وصیت کی فرضیت کا حکم ختم ہو گیا۔ اب ان کے لیے وصیت فرض ہے جن کا لوگوں سے لین دین ہے یا ان پر قرض ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس آیت مبارک کو تلاوت کر کے ارشاد فرمایا کہ یہ آیت منسوخ ہو چکی ہے۔ حضرت

ابن عباس ؓ سے روایت ہے کہ پہلے والدین اور رشتہ داروں کے لیے وصیت ہوتی تھی، اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے والدین کے لیے جب میراث میں حصہ مقرر فرما دیا اور وہ قریبی رشتہ دار جن کا حصہ میراث میں مقرر نہیں ہے ان کے لیے وصیت باقی رہ گئی، لیکن مرنے والا ان کے لیے بھی اپنے کل مال کے ایک تہائی ۱/۳ حصہ میں وصیت کر سکتا ہے، اس سے زیادہ کی وصیت نہیں کر سکتا۔

آیت سے متعلق امام رازی ؒ کی تفسیر کا جواب:

مفسر ابن کثیر ؒ فرماتے ہیں: مجھے ابوعبداللہ محمد بن عمر الرازی پر تعجب ہے کہ انہوں نے اپنی تفسیر میں یہ بات کہہ دی کہ یہ آیت منسوخ نہیں، بلکہ یہ آیت المیراث کی تفسیر اور بیان ہے اور انہوں نے لکھا کہ اس طرف بہت سارے علماء کا بھی یہی قول ہے کہ یہ آیت منسوخ نہیں ہے۔ تعجب اس وجہ سے ہے کہ جلیل القدر صحابہ و تابعین اور سلف صالحین نے فرمایا ہے کہ یہ منسوخ ہے۔ البتہ ایک قول یہ ہے کہ یہ آیت ان لوگوں کے حق میں منسوخ ہے جن کا اللہ تعالیٰ نے میراث میں حصہ مقرر کر دیا۔ لیکن جن کا حصہ میراث میں مقرر نہیں ان کے لیے وصیت کا حکم اب بھی باقی ہے۔ تو پھر امام رازی ؒ نے کیسے کہہ دیا کہ یہ آیت منسوخ نہیں ہے؟

(حدیث) حضرت عمرو بن خارجہ ؓ فرماتے ہیں کہ میں نے حضور ﷺ کو خطبہ دیتے ہوئے سنا:

''إِنَّ اللهَ تَبَارَكَ وَ تَعَالَى قَدْ أَعْطَى لِكُلِّ ذِي حَقٍّ حَقَّهُ، فَلَا وَصِيَّةَ لِوَارِثٍ.'' [جامع ترمذی، رقم: ۲۱۲۰]

اللہ تعالیٰ نے ہر حق والے کے حق کو بیان فرما دیا ہے، اب وارث کے لیے وصیت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

چنانچہ مدینہ منورہ میں ایک آدمی نے جائیداد لی، رجسٹری کے کاغذ کو لوہے کے رول میں رکھ کر اس بلڈنگ کی ایک دیوار میں دفن کر دیا۔ اللہ کی شان ہے کہ اس نے اپنے وارثوں کو بتا دیا کہ میں نے جائیداد خریدی تھی وہ فلاں جگہ ہے اور فلاں جگہ اس کے کاغذات ہیں۔ دوسرے لوگ اس پر قابض ہو گئے اور کہا کہ یہ ہماری جائیداد ہے۔ مقدمہ چلا تو ان سے پوچھا گیا کہ تمہارے پاس کیا ثبوت ہے؟ انہوں نے کہا: مجسٹریٹ موقع پر جا کر دیوار توڑ دیں، اگر اندر سے کاغذات نکل آئیں تو جگہ ہماری ہے اور اگر کاغذات نہ نکلیں تو وہ ہماری جائیداد نہیں ہے۔

مجسٹریٹ نے موقع پر کھڑے ہو کر وہ دیوار گروائی تو اندر سے وہ کاغذات برآمد ہو گئے۔

بزرگوں نے فرمایا کہ لکھا ہوا کبھی نہ کبھی کام آجاتا ہے۔ اس لیے آدمی کو چاہیے کہ اگر اس کی کوئی جائیداد ہے



معاملات ہیں، لین دین ہے تو اس کو لکھ کر اپنے پاس رکھے۔ اگر اپنی اولاد سے چھپانا چاہتا ہے تو اس کا جو قانونی وکیل ہے اس کے پاس محفوظ کروادے یا کوئی امانت دار دوست ہیں تو ان کو دے دے کہ یہ میرے معاملات ہیں۔ اس طرح آدمی جھگڑوں سے بچ جاتا ہے۔

یہ بات بالاجماع ثابت ہوگئی کہ جن وارثوں کے لیے اللہ تعالیٰ نے حصے مقرر کر دیئے ان کے لیے کوئی وصیت کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ ان کا حصہ خود اللہ تعالیٰ نے ہر حق والے کا حق مقرر فرما دیا، اس کو حق ملے گا اب وارث کے لیے وصیت نہیں ہے۔

صحیحین میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما راوی ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

"مَا حَقُّ امْرِئٍ مُسْلِمٍ لَهُ شَيْءٌ يُوصِي فِيهِ، يَبِيتُ لَيْلَتَيْنِ إِلَّا وَ وَصِيَّتُهُ مَكْتُوبَةٌ عِنْدَهُ."

[صحیح بخاری، رقم: ۲۷۳۸/صحیح مسلم، رقم: ۱۶۲۷]

اگر مسلمان کا کوئی لین دین ہے تو اس پر لازم ہے کہ اس پر دو راتیں نہ گزریں، مگر اس کے پاس وصیت لکھی ہوئی ہو۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ جب سے میں نے یہ سنا تو میری کوئی رات ایسی نہیں گزری، مگر میرے پاس اس کے متعلق وصیت لکھی ہوتی ہے۔

یہ عمل کا جذبہ تھا کہ صحابہ جو حضور پاک ﷺ سے سنتے تھے اس پر عمل کرتے تھے اور یہی ان کی کامیابی کی دلیل تھی اور ہماری ناکامی اور پریشانی کی یہی وجہ ہے کہ ہم اللہ اور اللہ کے رسول کے حکموں پر عمل نہیں کرتے اور اگر ہمیں کوئی حکم سنایا جائے تو اپنی عقل سے اس کا توڑ ڈھونڈتے ہیں، جبکہ اسلام کا معنی ہے کہ ہم نے اپنے آپ کو اللہ اور اس کے رسول کے سپرد کر دیا۔ لہٰذا پھر اللہ کے کسی حکم کے اندر اگر، مگر، چونکہ اور چنانچہ لگانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

عبد بن حمید نے اپنی سند سے حدیث قدسی بیان فرمائی کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

"يَا بَنِ آدَمَ! اِثْنَتَانِ لَمْ تَكُنْ لَكَ وَاحِدَةٌ مِنْهُمَا: جَعَلْتُ لَكَ نَصِيبًا مِنْ مَالِكَ حِينَ أَخَذْتُ بِكَظَمِكَ لِأُطَهِّرَكَ بِهِ وَ أُزَكِّيَكَ، وَ صَلَاةُ عِبَادِيْ عَلَيْكَ بَعْدَ انْقِضَاءِ أَجَلِكَ." [سنن ابن ماجہ، رقم: ۲۷۱۰]

اے ابن آدم! میں نے دو ایسی چیزیں عنایت کیں جن میں سے ایک پر بھی تمہارا حق نہیں بنتا تھا۔ جس وقت تمہاری سانس روکوں اس وقت تمہیں مال کے ایک حصہ (یعنی تہائی مال کے صدقہ کرنے) کا اختیار دیا۔ جب کسی



بندے کو موت آتی ہے تو اس کا سارا مال غیر (ورثاء) کی طرف منتقل ہو جاتا ہے، مگر میں نے تیرے لیے اس میں ایک تہائی میں بصورت وصیت کے تصرف باقی رکھا ہے، تاکہ اس کے ذریعے سے میں تمہیں پاک کروں اور تمہارا تزکیہ کروں، دوسری چیز تمہارے مرنے کے بعد میرے بندوں کا تم پر نماز (جنازہ) پڑھنا۔

﴿اِنْ تَرَكَ خَيْرًا﴾... خیر کا معنی یہاں مال ہے۔ بعض علماء نے فرمایا کہ اگر مال زیادہ ہو تو وصیت کرے، وگرنہ وصیت نہ کرے۔ اب مال کی مقدار میں اختلاف ہے۔

ایک روایت میں ہے کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے کہا گیا کہ ایک آدمی مر گیا ہے، اس نے تین سو دینار یا چار سو دینار چھوڑے ہیں اور اس نے وصیت نہیں کی ہے۔ آپ نے فرمایا: تین یا چار سو دینار کی کوئی بات نہیں۔ اللہ نے فرمایا ہے: ﴿اِنْ تَرَكَ خَيْرًا﴾... ﴿خَيْرًا﴾ کی تنوین عظمت کے لیے ہے کہ اگر وہ بہت زیادہ مال چھوڑے تو وصیت کرے۔

ایک روایت میں ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا کوئی قریبی رشتہ دار بیمار ہو گیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اس کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے۔ اس آدمی کو کہا گیا کہ وصیت کرو تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اگر تمہارے پاس بہت سارا مال ہے تو وصیت کرو اور اگر تھوڑا سا ہے تو اس کو اپنی اولاد کے لیے چھوڑ دو۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا ایک قول مبارک ہے کہ جس نے ساٹھ دینار چھوڑے اس کے پاس کچھ نہیں ہے۔ بعض نے فرمایا: اسی درہم اور بعض نے فرمایا: ایک ہزار یا اس سے بھی زیادہ چھوڑے گا تو وصیت ہے وگرنہ نہیں ہے۔

علماء نے یہاں ایک مسئلہ بیان فرمایا ہے کہ اگر وصیت کرنا ضروری ہے تو کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وصیت فرمائی تھی؟ صحابہ نے فرمایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وصیت نہیں فرمائی تھی۔ علماء نے اس کا جواب یہ لکھا ہے کہ وصیت یا تو دین کے معاملہ میں ہوگی یا دنیا کے معاملہ میں ہوگی۔ اگر دینی اُمور کی بات ہے تو اس کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرما دیا کہ اے میری اُمت! میں تمہیں دو چیزیں دے رہا ہوں، ان کو پکڑ لو کبھی گمراہ نہیں ہو گے، ایک اللہ کا قرآن اور دوسری میری سنت۔ اور جہاں تک دنیا کا تعلق ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہم جتنے بھی انبیاء گزرے ہیں ہماری میراث درہم و دینار نہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر ہم نے کوئی مال چھوڑا بھی ہو تو وہ اللہ کے راستہ میں خیرات ہے۔ ہماری میراث تو علم ہے۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی جائیداد نہیں، کوئی چیز تقسیم نہیں ہونی تو وصیت کی ضرورت نہیں ہے۔

ہمارے ہاں ایسا رواج ہے کہ اگر کسی کو وصیت لکھنے کے لیے بلائیں تو وہ کہتا ہے کہ اللہ آپ کو لمبی عمر عطا فرمائے۔ حالانکہ جتنی لمبی عمر ہوتی جائے گی آدمی اتنا ذلیل ہوتا جائے گا، چلنے کے قابل نہیں رہے گا، لوگوں کا محتاج ہوگا کہ اُٹھائیں، پکڑیں، کھلائیں، ﴿وَمَنْ نُّعَمِّرْهُ نُنَكِّسْهُ فِي الْخَلْقِ ۭ اَفَلَا يَعْقِلُوْنَ﴾ [یٰسین:٦٨]... اللہ پاک نے جتنی عمر دی ہے اللہ ایمان پر رکھے، ایمان کی موت دے اور کسی کا محتاج نہ کرے، ورنہ جس دور میں ہم گزر رہے ہیں کوئی بیٹا پانی پلانے کے لیے تیار نہیں ہے۔

ایک واقعہ:

مجھے ایک دوست نے واقعہ سنایا کہ آج کل فرمانبرداری کا یہ عالم ہے کہ ایک آدمی نے اپنے بیٹوں کے لئے کروڑوں کی جائیداد چھوڑی ہے، لیکن اولاد نافرمان ہے۔ جب باپ بیمار ہوا اور اس کو ہسپتال میں داخل کیا گیا اس کی حالت بڑی خراب تھی اس کو ڈاکٹروں نے آکسیجن لگادی۔ ایک بیٹا باپ کو دیکھنے کے لئے آیا اور پلنگ کے قریب کھڑے ہو کر کہتا ہے: اباجان! آپ میری غلطی معاف کردیں اور جو حکم ہو وہ فرمائیں۔ باپ نے کہا: پہلے یہ مہربانی کرو کہ پائپ سے پاؤں اُٹھادو۔ آکسیجن روک رہے ہو، تا کہ میں جلدی مرجاؤں۔

حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ کا واقعہ:

حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ بیمار تھے، ان کو ایک دوست ملنے آئے اور کہا کہ آپ ماشاء اللہ! خلیفہ ہیں، اللہ نے آپ کو بڑی عظمت دی ہے۔ آپ نے ساری جائیداد خیرات کردی، اولاد کے لیے کچھ نہیں رکھا، آپ اپنی اولاد کے لیے کچھ وصیت کر دیں، وگرنہ آپ کے بعد آپ کی اولاد کیا کرے گی؟ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ مسکرائے اور فرمایا: تمہاری خیر خواہی کا شکریہ کہ تم نے میرے بیٹوں کے لیے اچھی بات سوچی ہے، لیکن یاد رکھو! میرے بیٹے اچھے بنیں گے یا برے بنیں گے، اس کے علاوہ تیسری قسم نہیں ہوسکتی۔ اگر میرے بچے اچھے بن گئے تو قرآن میں موجود ہے: ﴿اِنَّ وَلِيِّۦَ اللّٰهُ الَّذِيْ نَزَّلَ الْكِتٰبَ ښ وَهُوَ يَتَوَلَّى الصّٰلِحِيْنَ﴾ [الاعراف:١٩٦] کہ جو میرے صالح بندے ہیں ان کا میں خود نگہبان ہوں۔ اگر میری اولاد صالح ہوئی تو مجھے فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں اور اگر میری اولاد بری بن گئی تو قرآن میں ہے: ﴿وَتَعَاوَنُوْا عَلَي الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ۠ وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَي الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۠ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ﴾ [المائدۃ:٢] بھلائی میں مدد کرو، برائی میں مدد نہ کرو۔ میں جائیداد کیوں چھوڑ جاؤں؟

میری اولاد شراب پیے تو میں قیامت میں پکڑا جاؤں۔

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کا ملفوظ:

یہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کا مقام تھا، تم ایسے نہ بننا، تم اولاد کے لئے کچھ چھوڑ جانا۔ وہ اللہ والے لوگ تھے، ان کا مزاج الگ تھا۔ اب ہر آدمی ابوذر رضی اللہ عنہ نہیں بن سکتا۔ وہ فرماتے تھے کہ شام کو جو روٹی بچے، اس کا گھر میں رکھنا گناہ ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان سے فرمایا: آپ مہربانی کریں اور مدینہ سے باہر چلے جائیں، کیونکہ اس طرح تو نظام نہیں چل سکتا۔

اللہ نے قرآن میں میراث کے احکام نازل فرمائے ہیں، وہ اس وقت ہی ہوگا جب مال وجائیداد موجود ہوگی۔

﴿بِالْمَعْرُوْفِ﴾ کی تفسیر:

﴿بِالْمَعْرُوْفِ﴾... معروف کا معنی نرمی اور احسان ہوتا ہے یا معروف کا معنی ہے کہ ہر وہ چیز جو شریعت کے حکم کے مطابق ہو اور جو شریعت کے مخالف یا شرعی ممنوعات میں سے ہو، وہ منکر ہے۔

وصیت کب کرے؟

حضرت حسن رحمہ اللہ نے جب یہ آیت تلاوت فرمائی تو فرمایا کہ وصیت کرنا ہر مسلمان پر لازم ہے کہ جب علاماتِ موت آجائیں تو وصیت کرے۔

علماء نے فرمایا: جب آدمی کی ساٹھ سے ستر سال عمر ہو جائے تو وہ یوں تصور کرے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے مطابق میرے دن پورے ہو گئے ہیں۔ اب جو دن ہیں، اللہ کی رحمت سے مجھے ملے ہوئے ہیں اور وہ اپنی تیاری شروع کر دے۔

علماء نے فرمایا کہ قرآن میں آیا: ﴿جَآءَكُمُ النَّذِيْرُ﴾... ﴿النَّذِيْرُ﴾ کا ایک ترجمہ تو یہ ہوتا ہے کہ اللہ کے نبی ڈرانے والے آئے، پھر پیغمبروں کے وارث علماء اُمت ڈرانے والے آئے۔

بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی یہ ہے کہ جب انسان کی داڑھی یا سر میں سفید بال آجائیں تو سمجھو کہ ڈرانے والا آگیا۔ اس لیے انسان کو چاہیے کہ اس کے بعد اپنی آخرت کی تیاری شروع کر دے اور قاعدہ ہے کہ جو آدمی وقت پر تیاری کرے، اس کو سفر میں تکلیف نہیں ہوتی۔ اس لئے ایسا آدمی جس کی عمر ساٹھ سے ستر سال ہو جائے تو وہ اپنی

آخرت کی تیاری کرے۔ وصیت کرے، کسی کا حق دینا ہے تو ادا کرے، کسی کا قرضہ دینا ہے تو ادا کرے، اگر ادا کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہے تو اس سے جا کر معافی مانگے کہ خدا کے لیے مجھے بخش دو، اللہ تعالیٰ تجھے کسی اور جگہ سے عطا فرما دے گا۔ اب جب یہ تیار ہوگا اور اس کو موت آئے گی تو اس کو کوئی فکر نہیں ہوگی اور وہ خوش ہو کر موت کا استقبال کرے گا کیونکہ موت ہی ہمارے اور اللہ کے درمیان ملاقات میں رکاوٹ ہے۔ اس لیے جب انسان پر موت کی علامات آ جائیں تو وہ اپنے والدین اور رشتہ داروں کے لیے وصیت نہ کرے اور یہ بھی نہ کرے کہ سب کچھ لٹا دے اور خاندان بھوکا بیٹھا رہے۔ اس لیے فرمایا: احسان کے ساتھ وصیت کرے۔

تہائی مال کی وصیت کے بارے میں آپ ﷺ کا ارشاد:

صحیحین کی حدیث ہے کہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! اللہ نے مجھے بہت مال دیا ہے اور میرا کوئی وارث نہیں ہے، صرف ایک بیٹی ہے جو وارث ہے۔ اس لیے آپ مجھے اجازت دیں کہ میں اپنے مال کے دو حصے خیرات کر دوں اور ایک حصہ بچی کو دے جاؤں۔ حضور ﷺ نے فرمایا: یہ تو بہت زیادہ ہے۔ انہوں نے عرض کیا: حضور! مجھے اجازت دیں کہ میں آدھا مال خیرات کر دوں اور آدھا بچی کے لیے چھوڑ دوں۔ حضور ﷺ نے فرمایا: یہ بھی زیادہ ہے۔ انہوں نے عرض کیا: آپ مجھے تیسرے حصہ کی خیرات کرنے کی اجازت دیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

''اَلثُّلُثُ، وَ الثُّلُثُ كَثِيرٌ، إِنَّكَ أَنْ تَذَرَ وَرَثَتَكَ أَغْنِيَاءَ، خَيْرٌ مِنْ أَنْ تَذَرَهُمْ عَالَةً يَتَكَفَّفُونَ النَّاسَ.''

[صحیح بخاری، رقم: ۱۲۹۵/ صحیح مسلم، رقم: ۲۱۱۶]

چلو تم تیسرا حصہ خیرات کر دو، لیکن یہ بھی زیادہ ہے اور حضور ﷺ نے فرمایا: بہتر ہے کہ تم اپنی اولاد کو غنی چھوڑ دو۔ یہ نہ ہو کہ وہ تمہارے بعد لوگوں کے دروازے پر ہاتھ پھیلاتے پھریں۔

اس حدیث مبارک سے اندازہ لگاؤ کہ اسلام نے عورت کے لئے کتنا حق رکھا ہے۔ اسلام تو صرف یہ چاہتا ہے کہ مرد اپنے حقوق و حدود میں رہے اور عورت اپنی حدود میں رہے، وگرنہ اسلام نے کبھی عورت کو علم سے نہیں روکا، کبھی عورت کو کام سے نہیں روکا، لیکن اس کی حدود ہیں۔

صحیح بخاری شریف میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ لوگوں کے لئے یہ بہتر ہے کہ وہ اپنے مال کے تیسرے حصہ کے بجائے چوتھے میں وصیت کریں، کیونکہ حضور ﷺ نے تیسرے حصہ کو بھی زیادہ سمجھا۔

منہ بولے بیٹے کی وصیت کے بارے میں آپ ﷺ کا ارشاد:

مسند امام احمد بن حنبل میں حنظلہ بن حذیم بن حنیفہ سے روایت ہے کہ ان کے دادا حنیفہ نے اپنی گود میں ایک بچہ لیا ہوا تھا، انہوں نے اس کے لیے ایک سو اونٹ کی وصیت کی کہ میرے بعد اس کو ایک سو اونٹ دیئے جائیں۔ ان کی اولاد کو یہ بات ناگوار گزری کہ یہ منہ بولا بیٹا ہے کوئی حقیقی بیٹا تو نہیں ہے، تو حضرت حنیفہ رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹوں کو ساتھ لیا اور حضور ﷺ کی خدمت میں آ کر عرض کیا: یارسول اللہ! میں نے ایک یتیم بچے کو بیٹا بنایا تھا، میں نے وصیت کی ہے کہ میرے بعد اس بچے کو ایک سو اونٹ دیئے جائیں، آپ ﷺ نے فرمایا:

"لَا، لَا، لَا، اَلصَّدَقَةُ خَمْسٌ وَ إِلَّا فَعَشْرٌ وَ إِلَّا فَخَمْسَ عَشْرَةَ وَ إِلَّا فَعِشْرُونَ وَ إِلَّا فَخَمْسٌ وَ عِشْرُونَ وَ إِلَّا فَثَلَاثُونَ وَ إِلَّا فَخَمْسٌ وَ ثَلَاثُونَ، فَإِنْ كَثُرَتْ فَأَرْبَعُونَ."

[مسند احمد بن حنبل، رقم: ۲۰۶۶۵]

ایک سو اونٹ تو بہت زیادہ ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ہرگز نہیں، ہرگز نہیں، ہرگز نہیں، زیادہ سے زیادہ تم وصیت کرنا چاہتے ہو تو پانچ اونٹوں کی وصیت کر دو، دس اونٹ کی کر دو، یا پندرہ اونٹ کی کر دو، یا بیس کی کر دو یا تیس کی کر دو یا پینتیس کی کر دو، اور اگر صدقہ زیادہ کرنا ہو تو چالیس اونٹ کی وصیت کر دو، اس سے زیادہ نہ کرو۔

وصیت کے بعد اس میں کمی بیشی کرنا:

﴿فَمَنْ بَدَّلَهٗ بَعْدَمَا سَمِعَهٗ فَاِنَّمَآ اِثْمُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يُبَدِّلُوْنَهٗ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ﴾ اگر کوئی شخص وصیت کر گیا، اس کے بعد جس کے پاس وہ وصیت تھی، اس نے اس میں تحریف و تبدیلی کی اور اس کے حکم کو بدل ڈالا، کچھ اپنی طرف سے بڑھا دیا یا کچھ کم کر دیا۔ یہ سب سے بڑا کاتم (چھپانے والا) ہے جو حق کو چھپانے والا ہے۔ اب گناہ ان لوگوں پر ہوگا جنہوں نے وصیت میں تبدیلی کی۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: اگر کوئی آدمی وصیت کر گیا کہ میری موت کے بعد ایک سو ریال خیرات کیے جائیں، لوگوں نے سو کو بدل کر دس ریال کر دیا۔ اللہ اس میت کو تو سو کا ثواب دیں گے، لیکن گناہ ان پر ہوگا جنہوں نے وصیت میں تغیر و تبدل کیا ہے۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ﴾ اللہ سننے والے اور جاننے والے ہیں۔ اللہ نے سن لیا کہ وصیت کرنے والے نے کیا

وصیت کی اور جنہوں نے بدلا، ان پر گناہ ہوگا۔

﴿فَمَنْ خَافَ مِنْ مُّوْصٍ جَنَفًا اَوْ اِثْمًا فَاَصْلَحَ بَيْنَهُمْ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ﴾ کہتے ہیں کہ کسی جانب زیادہ میلان ہو جائے۔ ﴿اِثْمًا﴾ کا معنی گناہ ہے۔

بعض حضرات نے فرمایا: ﴿جَنَفًا﴾ تمام قسم کی غلطیوں کو شامل ہے، یہ بھی خطا ہے کہ کسی وارث کو زیادہ دیا اور کسی کو کم کر دیا کہ بیٹے کے بیٹے کو حصہ دے دیا کیونکہ پوتے کو دینا بھی بیٹے کو دینا ہے۔ اور کبھی خطاً ایسا کر بیٹھا کہ پوتے سے محبت تھی، جان کر اس طرح نہیں کیا۔

جس آدمی کو وصیت کی گئی ہے اگر وہ چاہتا ہے کہ شریعت کے مطابق تبدیلی کر دی جائے تو تبدیل کر دے، جیسے شریعت نے درجہ رکھا ہے اسی طرح تبدیل کر دے۔ اللہ تعالیٰ نیتوں کو جانتے ہیں کہ اس تبدیلی کرنے والے کی نیت اصلاح کی تھی یا تحریف و تبدیلی کی تھی۔

وصیت کرنے والوں کے لیے بشارتِ نبوی:

حضور ﷺ نے فرمایا:

"إِنَّ الرَّجُلَ لَيَعْمَلُ بِعَمَلِ أَهْلِ الْخَيْرِ سَبْعِيْنَ سَنَةً، فَإِذَا أَوْصَى حَافَ فِيْ وَصِيَّتِهِ، فَيُخْتَمُ لَهُ بِشَرِّ عَمَلِهِ فَيَدْخُلُ النَّارَ، وَ إِنَّ الرَّجُلَ لَيَعْمَلُ بِعَمَلِ أَهْلِ الشَّرِّ سَبْعِيْنَ سَنَةً، فَيَعْدِلُ فِيْ وَصِيَّتِهِ فَيُخْتَمُ لَهُ بِخَيْرِ عَمَلِهِ فَيَدْخُلُ الْجَنَّةَ." [سنن ابن ماجہ، رقم: ۲۷۰۴]

بعض لوگ ایسے ہیں جو ستر سال اچھے عمل کرتے رہے، جب موت قریب آ گئی تو وصیت میں ظلم کر دیا تو جہنم کا حق دار بن گیا۔ اور ایک آدمی ستر سال تک گناہ کرتا رہا، جب موت کا وقت آیا تو شریعت کے مطابق وصیت کی تو اس وجہ سے اللہ نے اس کو معاف کر دیا اور جنت میں چلا گیا۔



﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ۝ أَيَّامًا مَعْدُودَاتٍ ۚ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ أُخَرَ ۚ وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ ۖ فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَهُ ۚ وَأَنْ تَصُومُوا خَيْرٌ لَكُمْ ۖ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ۝﴾

[البقرۃ: ۱۸۳، ۱۸۴]

’’اے ایمان والو! تم پر روزے فرض کر دیئے گئے ہیں جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیے گئے تھے تا کہ تم پرہیزگار ہو جاؤ۔ گنتی کے چند دن روزے رکھ لو، پھر جو کوئی تم میں سے بیمار ہو یا مسافر ہو تو اس پر دوسرے دنوں میں (قضا) رکھنی ہے، اور ان لوگوں پر جو روزہ کی طاقت نہیں رکھتے، فدیہ ہے ایک مسکین کا کھانا، اور جو اس سے بھی زیادہ دے وہ اس کے لیے بہتر ہے، لیکن اگر (روزہ چھوڑنے اور فدیہ کی بجائے) روزہ رکھو تو تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم سمجھ رکھتے ہو۔‘‘

ربط آیات:

اللہ پاک نے اس سے پہلے قتل سے بچنے کا حکم دیا، پھر وصیت میں ظلم کرنے سے بچنے کا حکم دیا ہے، ان چیزوں سے بچنا تقویٰ ہے۔ اب تقویٰ تک پہنچنے کے اور اسباب وذرائع کا بیان ہے کہ تقویٰ کا ذریعہ روزے ہیں۔

روزے کی فرضیت کیوں ہوئی؟

قرآن پاک اور احادیث مبارکہ کی روشنی میں اللہ کے نظام کو چلانے کے لیے بنیادی چیز تقویٰ ہے۔ قرآن و احادیث کیوں پڑھائی جاتی ہیں؟ تا کہ بندے کے دل کے اندر اللہ تعالیٰ کا ڈر پیدا ہو تو پھر اس کو جرم سے روکنے کے لیے نہ کسی فوج کی ضرورت ہے اور نہ پولیس کی ضرورت ہے اور نہ انٹیلی جنس اداروں کی ضرورت ہے، بلکہ جب اس کے دل کے اندر اللہ کا خوف پیدا ہو گیا تو اس کے اعمال خود بخود ٹھیک ہوتے چلے جائیں گے۔

مثال کے طور پر ایک آدمی رات کو اپنے گھر میں آرام سے سویا ہوا ہے، رات کے آخری حصہ میں جو سب سے زیادہ مزے دار ہوتا ہے کہ اس میں خوب سناٹا ہو جاتا ہے، آدمی مزے کی نیند میں ہوتا ہے، لیکن اس وقت وہ کھڑا ہو جاتا ہے کہ میری تہجد نہ چلی جائے، وضو کر کے علیحدہ کمرہ میں نماز پڑھتا ہے اور اس طرح اُٹھتا ہے کہ میرے اُٹھنے کا میرے گھر والوں کو بھی احساس نہ ہو۔ آخر کس سپاہی نے جگایا ہے؟ یہ اس کے دل کا خوف ہے جو اس کو آرام نہیں

کرنے دیتا۔ اس کو پتہ ہے کہ میں نے مرنے کے بعد قبر میں جانا ہے اور پھر آخرت کے اندر آرام ہی آرام ہے، یہ زندگی کے چند دن ہیں، اس کے اندر محنت کرلوں تا کہ اپنی آخرت کی زندگی کو سنوار سکوں۔ اس کے مقابلہ پر ایک دوسرا آدمی ہے جو جاگ رہا ہے، تندرست ہے، جوان ہے، فجر کی اذان کو سنتا ہے، اُٹھ کر سگریٹ پی کر سو جاتا ہے، اس کے دل میں اللہ کا خوف نہیں ہے۔ اسلام میں بنیادی سبق تقویٰ کا پڑھایا جاتا ہے اور یہی حکمت اور مقصود روزے کی فرضیت سے ہے اور اس لیے بھی کہ روزہ کے اجر میں آدمی جہنم کی آگ سے بچ جائے۔

صوم کا لغوی اور شرعی معنیٰ:

صیام، صوم کی جمع ہے۔ لغت میں اس کا معنیٰ ہے: منع کرنا، رکنا۔ اور شریعت میں صوم کا معنیٰ ہے طلوعِ فجر سے غروبِ آفتاب تک کھانے پینے اور جماع سے رکنا۔

﴿كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ﴾ بعض علماء نے فرمایا: اس سے مراد یہود و نصاریٰ ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ کہنا کہ روزے اس اُمت کے ساتھ خاص ہیں، یہ قرآن کے عموم کے خلاف ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جو تم سے پہلے گزرے ہیں یعنی حضرت نوح علیہ السلام سے لے کر ہمارے آقا ﷺ تک ہر شریعت میں روزہ تھا، لیکن ان کے روزوں کے دن مختلف تھے، شرائط و ارکان مختلف تھے۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ نصاریٰ کے لیے روزے ہر ماہ میں تین دن کے تھے، یہود کے لیے ہر مہینے میں تین دن اور ایک عاشورا کا روزہ تھا۔

رمضان سے پہلے کون سے روزے فرض تھے؟

بعض روایات میں آتا ہے کہ پہلی اُمتوں پر بھی ایک مہینے کے روزے تھے۔ اگر تین دن کو بھی جمع کیا جائے تو بات تقریباً وہیں جا کر بنتی ہے۔

ابتداء اسلام میں ہمارے لیے بھی روزے کے احکام مختلف تھے، پہلے اس اُمت پر بھی تین دن کے روزے فرض تھے جسے ایام بیض کہتے ہیں، یعنی ہر ماہ تیرہ، چودہ و پندرہ کے دنوں اور راتوں میں چاند اپنے پورے جوبن پر آ جاتا ہے اور ایک یومِ عاشوراء کا روزہ فرض ہوتا تھا۔ یومِ عاشوراء کے روزے کی وجہ کے بارے میں احادیث کے اندر آتا ہے کہ جب حضور ﷺ مدینہ منورہ میں آئے اور آپ نے دیکھا کہ یہودی یومِ عاشوراء کا روزہ رکھتے ہیں حضور ﷺ نے ان سے پوچھا: دس محرم کا روزہ کیوں رکھتے ہو؟ انہوں نے کہا: یومِ عاشوراء ایک دن ہے کہ

اس میں اللہ نے اپنے کلیم حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دریا عبور کرایا تھا اور دشمن فرعون کو غرق کیا تھا تو اس خوشی میں ہم روزہ رکھتے ہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا: تم سے زیادہ تو موسیٰ علیہ السلام کے ہم حق دار ہیں، کیونکہ ہم تو ان کے صحیح ماننے والے ہیں، تم تو ماننے والے نہیں ہو، تم تو زبانی کلامی ان کا نام لیتے ہو۔ آپ ﷺ نے اپنے صحابہ کو حکم دیا کہ اگلے سال جب محرم آ جائے تو تم بھی عاشوراء کا روزہ رکھو، لیکن ایک بات کا خیال کر و یا تو اس سے ایک دن پہلے یا ایک دن بعد روزہ رکھو، تاکہ عاشوراء کا روزہ بھی ہو جائے اور لوگ یہ بھی نہ سمجھیں کہ ہم وہ عمل کر رہے ہیں جو یہودیوں نے کیا ہے۔ لیکن جب قرآن پاک کی یہ آیت اور دوسری آیت: ﴿فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ﴾ نازل ہوئی تو اب پہلے والے روزے فرض نہ رہے، اب وہ نفل کی حیثیت میں آ گئے۔ اگر کوئی آدمی رمضان المبارک کے روزوں کے علاوہ ایام بیض کے روزے رکھنا چاہے تو بہت اچھا ہے، اسی طرح اگر کوئی آدمی ہفتہ میں سوموار اور جمعرات کا روزہ رکھنا چاہے تو یہ بھی مستحب ہے۔ اگر اس کو اس سے بھی زیادہ اہمیت دیتا ہے تو جیسا کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ اگر تم نے نفلی روزوں میں بڑھنا ہے تو داؤد علیہ السلام کا روزہ سب سے بہتر ہے، وہ ایک دن روزہ رکھتے تھے اور ایک دن چھوڑ دیتے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے ہر بندہ کے اندر مختلف قویٰ اور ملکات رکھے ہیں، ہر بندے کے اندر قوتِ حیوانیہ بھی ہے کہ اچھا بھلا انسان جنگلی جانوروں سے بڑا حیوان بن جاتا ہے اور انسانوں کا خون بہا دیتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ قوتِ حیوانیہ غالب آ جاتی ہے اور قوتِ ملکیہ دب جاتی ہے، اور جب آدمی عبادت کرتا ہے، روزے رکھتا ہے، اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے تو قوتِ حیوانیہ دب جاتی ہے اور قوتِ ملکیہ غالب آ جاتی ہے اور آدمی زیادہ سے زیادہ تقویٰ کے قریب ہو جاتا ہے۔

روزہ گناہوں کی ڈھال ہے:

بخاری و مسلم کی حدیث ہے، حضور ﷺ نے فرمایا:

''يَا مَعْشَرَ الشَّبَابِ! مَنِ اسْتَطَاعَ مِنكُمُ البَاءَةَ فَلْيَتَزَوَّجْ، وَ مَنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَعَلَيْهِ بِالصَّوْمِ فَإِنَّهُ لَهُ وِجَاءٌ.'' [صحیح بخاری، رقم: ۵۰۶۵ / صحیح مسلم، رقم: ۱۴۰۰]

اے نوجوانو! جو تم میں سے شادی کی طاقت رکھتا ہو وہ شادی کر لے اور جو غریب ہے، شادی کی طاقت نہیں رکھتا وہ (کثرت سے) روزے رکھے، کیونکہ روزہ گناہوں سے ڈھال ہے۔

خصوصی طور پر روزے کا بدلہ اللہ تعالیٰ دیں گے:

صحیح حدیث مبارک میں آتا ہے، حضور ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

"اَلصَّوْمُ لِي وَ أَنَا أَجْزِيْ بِهٖ." [صحیح بخاری، رقم: ۷۴۹۲]

روزہ میرے لیے ہے اور اس کا بدلہ بھی میں خود دوں گا۔

حالانکہ باقی عبادات بھی تو اللہ کے لیے ہیں، لیکن روزہ کے بارے میں بطور خاص فرمایا کہ یہ میرے لیے ہے۔ علماء نے لکھا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر عبادت میں ریا کا احتمال ہے، مگر روزہ ایک ایسی عبادت ہے جو بندے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان ہے جسے کوئی دیکھنے والا نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ روزہ اتنی بڑی چیز ہے کہ اس سے تقویٰ پیدا ہوتا ہے۔

روزے کے چند احکام:

روزہ چاند دیکھنے سے شروع ہوگا اور افطار بھی چاند دیکھنے سے ہوگا۔ یاد رکھیں! اسلام میں وجودِ ہلال کی ضرورت نہیں ہوتی، وگرنہ تو ہم چاند کے پجاری ہو گئے، اسلام یہ نہیں کہتا کہ چاند ڈھونڈو، اس کے پیچھے پڑو، بلکہ میں نے تمہارے اوقات کے لیے چاند کا سلسلہ رکھا ہے، اگر تیس شعبان کو چاند نظر آ گیا تو ٹھیک ہے، نہیں نظر آیا تو تب بھی ٹھیک ہے، حتیٰ کہ حضور ﷺ نے فرمایا: چاند تو تھا، لیکن بادلوں میں چھپ گیا نظر نہیں آیا تو تم تیس دن پورے شمار کرلو۔ کیونکہ مقصود شہودِ ہلال ہے وجودِ ہلال نہیں ہے۔ باقی یہ بات کہ ہم چودہ سو سال سے لکیر کے فقیر ہیں، ہم تو اپنی نجات کا ذریعہ ہی یہی سمجھتے ہیں۔ ہم نے تو آج تک اپنا باپ نہیں بدلا، نبی کیسے بدلیں گے؟ ہزاروں سال پہلے جو ہمارا باپ بابا آدم تھا، ہم نے تو اس کا بھی انکار نہیں کیا، ہم نے تو اپنی اماں بی بی حواء کا انکار نہیں کیا تو اللہ کے نبی کا کیسے انکار کر سکتے ہیں؟ ہم تو اسی لکیر کے محتاج ہیں اور روزانہ دعا مانگتے ہیں: ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝﴾ [الفاتحہ:۵] کہ اے اللہ! ہمیں سیدھے اسی راستہ پر چلا جس پر ہمارے محمد مدنی ﷺ تھے۔ تم آزاد ہو کر بطلیموس کے نظریات کو لے لو یا فیثاغورث کے نظریات کو لے لو، اور ہم محمد مدنی ﷺ کو ماننے والے ہیں یہ تو اپنی اپنی نظر اور پہچان ہے۔ ہر کسی کو آزادی ہے تو ہمیں بھی آزادی دیں کہ ہم محمد مدنی ﷺ کے غلام رہ سکیں۔

﴿أَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ﴾ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ نہ ہم نے اتنے روزے رکھے ہیں کہ عبادت سے عادت بن جائے اور نہ اتنے تھوڑے رکھے کہ نفس کی کچھ اصلاح نہ ہو سکے۔

ابتدء اسلام میں یہ بات ضروری تھی، مثلاً روزہ افطار کرلیا تو رات کو اس وقت تک کھا پی اور جماع کر سکتے تھے جب تک جاگ رہے ہیں، اگر عشاء کی نماز پڑھنے کے بعد سو گئے تو کھانا، پینا، جماع بند ہو گیا اس طرح غروب آفتاب تک رہنا ہوتا تھا اس سے لوگوں کو بڑی تکلیف ہوتی تھی، کیونکہ وہ سارا دن محنت کرتے تھے۔ عرب کی زمین میں گرمیوں کے دنوں میں کام کرنا ان کو پتہ ہے جو اس گرمی میں مزدوری کرتا ہے اور جو اے سی میں بیٹھ کر حکم چلاتا ہے اسے کیا معلوم؟ جو اے سی کاروں سے نکل کر اے سی کمروں میں آ جاتے ہیں۔ ان کے بس میں نہیں ہے، وگرنہ یہ اپنی قبروں میں بھی اے سی لگوالیں۔ لیکن وہاں کا جزیرۃ اللہ کے ہاتھ میں ہے، اگر یہ لگوا بھی دیں تو بند ہو جائے گا اور جن کی قبروں کو اللہ نے ٹھنڈا رکھا ہے، ان کی قبریں ویسے ہی جنت کے باغ بن جاتے ہیں۔ بہر حال اللہ تعالیٰ نے پھر ان کو حکم دے دیا: ﴿أُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلَىٰ نِسَائِكُمْ﴾ میرے مدنی! اپنی اُمت سے کہہ دو کہ اب ہم نے حلال کر دیا کہ رات کو کھائیں، پئیں، بیوی سے مل سکتے ہیں، لیکن صبح صادق ہو جائے تو رک جائیں۔

﴿فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ أُخَرَ﴾ فرمایا: اگر تم میں کوئی شخص بیمار ہو گیا ہے۔ بیمار سے مراد وہ بیمار ہے جس کو روزہ رکھنے سے نقصان ہو یا روزہ رکھنے سے بیماری بڑھ جانے کا اندیشہ ہو۔ اگر نزلہ زکام ہو جائے تو یہ بیماری نہیں ہے، تو جو بیمار ہو اس کو اسلام نے اجازت دی ہے کہ روزے چھوڑ دے اور جب اللہ تعالیٰ صحت عطا فرما دے جتنے دن کے روزے رہ گئے تھے اتنے دن کی قضا کر لے۔

﴿أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ﴾ قرآن نے مسافر نہیں فرمایا، بلکہ ''عَلَىٰ سَفَرٍ'' فرمایا ہے یعنی جو سفر کے اوپر سوار ہو۔ لہٰذا اگر کوئی دو چار میل سفر میں چلا جائے تو یہ مسافر نہیں ہے۔ فقہاء نے لکھا ہے کہ کم از کم تین منزلوں کا سفر ہو یعنی اڑتالیس میل کا سفر ہو اور جہاں پندرہ دن اقامت کا ارادہ کر لیا وہاں مسافر نہیں رہتے۔

﴿عَلَىٰ سَفَرٍ﴾ سے معلوم ہوا کہ اکثر سفر اڑتالیس میل سے بھی زیادہ ہوتے ہیں، لیکن اب گاڑیاں ائر کنڈیشنڈ ہیں، آدمی آرام سے اس کے اندر بیٹھتا ہے تو اب سفر میں مشقت کی وہ کیفیت نہیں جو پہلے زمانے کے اندر تھیں گو گنجائش تو ہے کہ یہ سفر ہے تو لفظ ''عَلَىٰ سَفَرٍ'' کے تقاضوں کا بھی خیال رکھنا ہوگا۔

﴿فَعِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ أُخَرَ﴾ فرمایا ہے، ''فَعَلَيْهِ الْقَضَاء'' نہیں فرمایا۔ اس سے اشارہ ہو گیا کہ مریض و مسافر پر فوت شدہ روزوں کی قضاء صرف اس صورت میں واجب ہوگی، جبکہ مریض صحت کے بعد اور مسافر مقیم ہونے کے بعد اتنے دنوں کی مہلت پائے، جنہیں قضاء کر سکے۔ چنانچہ اگر کوئی شخص اتنے دن سے پہلے ہی مر گیا تو اس پر

روزوں کی قضاء یا ان کے فدیہ کی وصیت کرنا لازم نہیں ہوگا۔ ہاں اگر زندہ رہے تو ﴿فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ﴾ وہ دن گنے گا یعنی اتنے دن کے روزے رکھے گا۔ اور دوسرا اس سے معلوم ہوا کہ ترتیب ضروری نہیں ہے، مثلاً رمضان المبارک کے دس روزے رہ گئے، ہم تو دس روزے رکھتے ہیں یہ نہیں کہ مہینہ کے اول دس روزے چھوٹے تھے تو مہینے کے اول میں پورے کریں اور یہ بھی ضروری نہیں کہ لگاتار پورے رکھیں بلکہ اس گنتی کو پورا کرنا ہے۔

رمضان المبارک میں عورت کے حیض کے دن ہیں وہ روزے نہیں رکھے گی۔ جب رمضان المبارک گزر جائے گا تو ان کی قضا کرے گی۔ اسی طرح اگر اللہ نے عورت کو اولاد دی اور نفاس کے دن رمضان میں آ گئے اس میں بھی وہ روزے نہیں رکھے گی، جب وہ پاک ہو جائے گی تو اس کو روزے قضا کرنے ہوں گے۔ عورت کے حیض و نفاس کے اندر جو نمازیں قضا ہوتی ہیں ان کی قضا نہیں لیکن جو روزے چھوڑے ہوں گے ان کی قضا ہے۔

﴿وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ﴾ ترجمہ: ''جو طاقت رکھتے ہیں وہ ایک دن کا فدیہ دیں۔'' اس کی تفسیر میں دو قول ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ ابتداء اسلام میں جب روزے فرض ہوئے تھے لوگوں کو روزہ رکھنے کی عادت نہیں تھی اللہ نے رعایت دے دی کہ اگر کوئی بندہ روزہ نہیں رکھ سکتا لیکن اس کے پاس پیسے ہیں تو وہ ایک مسکین کو ہر روز کھانا کھلا دیا کرے روزہ نہ رکھے، یہ ابتداء اسلام میں حکم تھا، لیکن جب حکم آ گیا: ﴿فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيضًا أَوْ عَلَى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ﴾ کہ روزے رکھنے ہیں تو فدیہ والا حکم ختم ہو گیا۔

دوسرا قول بعض علماء نے فرمایا یہ حکم ختم نہیں ہوا۔ اصل میں یہ حکم یوں ہے: ﴿وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ﴾ کہ جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت نہیں رکھتے مثلاً ایک آدمی بوڑھا ہے روزہ رکھنے کی طاقت نہیں رکھتا تو وہ اپنے روزے کے بدلہ میں ایک مسکین کو فدیہ دے۔ جو کہ احناف کے ہاں پونے دو سیر گندم ہوگی یا اس کی قیمت دے۔ اسی طرح ایک ایسا بیمار ہے اس کا مرض نہیں چھوٹتا مثلاً فالج کے اندر پڑا ہوا ہے یا کوئی ایسی بیماری ہے جس سے تندرست نہ ہوگا اس کی بجائے کہ میں اس حال میں پڑا رہوں گا تو اس کے لیے بھی یہی حکم ہے کہ وہ فدیہ دے۔ اگر تم نے زیادہ روزوں کا فدیہ دینا ہے تو ایک مسکین کی بجائے دو کو یا چار کو یا دس کو تقسیم کر کے دو تو زیادہ مسکینوں کو پہنچے گا اور اگر شفاء سے مایوس مریض فوت نہ ہوا بلکہ صحت یاب ہو گیا تو روزوں کا وہ فدیہ دیا ہوا کام نہیں آئے گا ان دنوں کے روزے پر قضاء کرنا لازم ہوں گے۔

آگے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے تم کو یہ رعایت تو دے دی ہے، لیکن یاد رکھو، ﴿وَأَنْ تَصُومُوا خَيْرٌ لَّكُمْ إِنْ



كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴿۱۸۴﴾ اگر تم روزہ رکھا کرو تو یہ تمہارے لیے بہتر ہے کیونکہ اگر رمضان کا روزہ رہ جائے تو قضا کرنا بڑا مشکل ہو جاتا ہے، وہ لوگ قضا کرتے ہیں جن کے دلوں میں اللہ تعالیٰ کا خوف ہوتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہم شوال، ذی قعدہ یا کسی دوسرے مہینے میں قضا کریں گے رمضان والی برکت نہیں ملے گی۔

اسلام نے یہ بھی اجازت دی ہے مثلاً آپ بھی روزے سے ہیں اور بیوی بھی روزے سے ہے لیکن میاں بیوی ایک بستر پر اکٹھے لیٹے ہوئے ہیں ایک دوسرے کے بدن سے بدن لگ رہا ہے تو کوئی حرج نہیں لیکن جماع کرنا منع ہے۔ شریعت نے ہمیں یہ سبق دیا ہے کہ اگر دونوں نوجوان ہیں تو ایک دوسرے کے قریب نہ آئیں، تاکہ خطا نہ ہو جائے اور اگر بوڑھے ہیں خوف نہیں ہے تو ان کے لیے اجازت ہے۔

روزہ ہمیں کیا درس دیتا ہے؟

یاد رکھیں! ہم سارا دن تو روزہ رکھ لیتے ہیں لیکن شام کو اتنا کھا لیتے ہیں کہ اتنا کوئی چار دن میں بھی نہ کھائے حالانکہ روزہ کا اصل مقصد یہ ہے کہ آدمی کھانے پینے کو کم کرے اور عبادت کو بڑھائے، لیکن ہمارے روزے بڑے مزے دار ہیں، صبح کی نماز پڑھ کر ہم سو جاتے ہیں اور دوپہر کو اُٹھتے ہیں آدھا دن سونے میں گزر گیا ظہر کی نماز پڑھ کر لیٹ گئے، عصر کو اُٹھے غسل کیا کپڑے پہن کر مسجد میں آ گیا اور روزہ ختم ہو گیا ہمارا روزہ تو سونے میں گزر جاتا ہے نہ تلاوت ہے، نہ عبادت ہے، نہ نماز ہے، نہ محنت و مشقت ہے اور نہ تکلیف ہے۔ آج دنیا میں ڈائٹنگ کا بڑا رواج ہے کہ اپنے آپ کو موٹا ہونے سے بچاؤ۔ کھانا بند، گھی بند، چربی بند، اچھی غذائیں بند یہ سب کچھ ڈاکٹر کے کہنے پر کرتے ہیں اور اللہ نے جو ہمارے لیے روزہ جیسی نعمت رکھی ہے، جو عبادت کی عبادت ہے اور صحت کی صحت ہے۔ روزے کے اندر افضل یہ ہے کہ آدمی کھجور پر افطار کرے اور کھجور اگر تازہ ملے تو وہ سب سے افضل ہے، اسی طرح سحری کھجور کے ساتھ کرنا افضل ہے۔

روزہ صرف کھانے پینے سے رکنے کا نام نہیں:

صحیح حدیث میں آتا ہے اگر کوئی آدمی روزہ رکھنے کے بعد جھوٹ بولتا ہے، گالیاں بکتا ہے، لوگوں سے لڑتا ہے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں اس کو کہہ دو مجھے تیرے بھوکے رہنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، جب تم نے اپنی زبان کو نہیں روکا جب تم نے اپنی آنکھوں کو، جب تم نے اپنی برائیوں کو نہیں روکا تو روزہ رکھنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ ہمارے

بعض لوگ تو روزہ لڑنے کے لیے رکھتے ہیں کہ جس دن روزہ ہو کبھی اس سے لڑ رہا ہے اور کبھی اس سے لڑ رہا ہے، یہ روزہ نہیں ہوتا بلکہ روزہ تو یہ ہے کہ اپنے آپ کو بُری باتوں سے روکنا اور اچھی باتوں پر لگا دینا۔ جب اللہ تعالیٰ نے کھانا پینا روک دیا ہے تو گالی گلوچ کا کیا مطلب ہے؟

بعض لوگوں کا روزہ بڑا مزے دار ہوتا ہے، وہ روزہ رکھنے کے بعد فلم چلا کر بیٹھ جاتے ہیں کہ تین گھنٹے اسی شغل میں گزر جائیں گے۔ یہ کتنی غلط بات ہے اور روزہ کا ثواب بھی کم ہوا۔ کیونکہ روزے کے ساتھ فلم دیکھنے سے فلم کا گناہ اور زیادہ بڑھ گیا، حالانکہ روزہ کا مقصد تھا تقویٰ کہ تم بُرائی سے رکو اور تم روزے کو بُرائی سے شروع کر رہے ہو۔

بعض لوگ تاش کھیلنا شروع کر دیتے ہیں کہ وقت گزر جائے گا اور بعض کیرم بورڈ کھیلنا شروع کر دیتے ہیں، یہ سب چیزیں اسلام میں حرام ہیں، ان کی کوئی گنجائش نہیں ہے روزہ لہو ولعب کا نام نہیں ہے، روزہ کے اندر زیادہ سے زیادہ قرآن کی تلاوت کرو کیونکہ رمضان المبارک کے مہینے اور قرآن پاک میں ایک تعلق ہے۔ اللہ تعالیٰ مجھے بھی اور آپ کو بھی صحیح معنی میں روزہ رکھنے کی توفیق عطا فرمائیں اور اللہ پاک ہمیں اس کے برکات وثمرات سے نوازیں۔

اکابر کے روزوں کی مثال:

ہمارے شیخ تھے۔ ان کا روزہ یہ تھا کہ افطار کے وقت تین کھجور کے دانے ہوتے تھے اور ایک پانی کا گلاس ہوتا تھا اس کے بعد نہ روٹی ہے نہ چائے ہے، جب سحری کا وقت آیا تو اس وقت بھی تین دانے کھجور کے کھا لیے اور آدھا گلاس دودھ کا پی لیا اور پندرہ پارے روزانہ قرآن کی منزل پڑھتے بیس تراویح اور تہجد پڑھتے تھے اس کے بعد بھی جو وقت بچا ہے اس میں اللہ کا ذکر کرتے تھے، ایسے روزوں کے برکات وثمرات ہوتے ہیں، ہمارے روزے تو میلہ ہیں کہ کئی قسم کے سموسے بنواؤ، کباب بنواؤ، دہی بھلے، چٹنیاں، پکوڑے پتہ نہیں کیا کچھ ہوتا ہے نیک لوگ نہ کھانے کے لیے روزہ رکھتے ہیں اور ہم کھانے کے لیے روزہ رکھتے ہیں۔

اللہ پاک نے بیان فرمادیا کہ روزہ سارا سال نہیں رکھنا ہے، تاکہ تم مشقت سے ڈر نہ جاؤ بلکہ چند گنے چنے دن ہیں یعنی ایک مہینہ ہے خدا کی قدرت ہے جو آدمی دن گنے وہ جلدی گزر جاتے ہیں کیونکہ رمضان المبارک کا مہینہ ہر آدمی گنتا ہے کہ آج پہلا روزہ ہو گیا، آج دوسرا روزہ ہو گیا، اس طرح پورا مہینہ گزر جاتا ہے اور جس دور میں ہم بیٹھے ہیں یہ قیامت کی علامت ہے۔

وقت کا جلدی گزر جانا قیامت کی علامت ہے:

(حدیث) حضور ﷺ نے فرمایا: علاماتِ قیامت میں ایک علامت یہ بھی ہے کہ سال ایسے گزرے گا جیسے مہینہ گزرتا ہے اور مہینہ ایسے گزرے گا جیسے ہفتہ گزرتا ہے اور ہفتہ ایسے گزرے گا جیسے ایک دن گزرتا ہے اور ایک دن ایسے گزرے گا جیسے ایک گھڑی گزرتی ہے۔ آج وہی عالم ہے معلوم ہوتا ہے کہ حاجی ابھی آ گئے ہیں اور کل جانا شروع ہو جائیں گے اس طرح عمر گھٹ رہی ہے کہ آدمی کو پتہ ہی نہیں لگ رہا کہ وقت کہاں جا رہا ہے، آدمی خوش ہوتا ہے کہ میرا بیٹا بڑا ہو رہا ہے، حالانکہ اس کی عمر تو کم ہو رہی ہے، وہ تو چھوٹا ہوتا جا رہا ہے کیونکہ وقت گزر رہا ہے، لیکن ہم پھر بھی غافل ہیں نہ اللہ کی یاد ہے اور نہ اللہ کے دروازے پر آنا ہے۔

نماز میں تین تبدیلیاں ہوئیں:

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نماز پر بھی تین حالات گزرے اور روزے پر بھی تین حالات گزرے یعنی تبدیلیاں آئیں۔ پہلے آپ ﷺ مکہ میں نماز بیت اللہ اور بیت المقدس کی طرف رخ کر کے پڑھتے تھے۔ حضور ﷺ مدینہ منورہ تشریف لے آئے تو آپ سترہ مہینہ تک بیت المقدس کی طرف نماز پڑھتے رہے، پھر اللہ نے حکم دیا کہ کعبہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھیں۔

پہلے یہ ہوتا تھا کہ نماز کے لئے ایک دوسرے کو اطلاع دی جاتی تھی کہ نماز کا وقت ہو گیا۔ ایک صحابی نے خواب میں دیکھا اور انہوں نے حضور ﷺ کی خدمت میں آ کر عرض کیا: یارسول اللہ! میں نے خواب میں دیکھا، میرا خواب ایسا ہے کہ اگر میں کہوں کہ میں نیند میں نہیں بلکہ جاگ رہا تھا پھر بھی میں سچا ہوں، میں نے دیکھا کہ ایک آدمی ہے جس پر سبز رنگ کی دو چادریں ہیں، اس نے کعبہ کی طرف رخ کر لیا اور اس کے بعد اس نے کہا: ''اَللّٰهُ اَكْبَرُ، اَللّٰهُ اَكْبَرُ، أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ...'' (جیسے اذان دی جاتی ہے ویسے پوری اذان کہی۔) پھر کچھ دیر گزرنے کے بعد اس نے اقامت کہی، وہ بھی اذان کی طرح تھی، لیکن اس کے اندر یہ دو لفظ زیادہ تھے، ''قَدْ قَامَتِ الصَّلٰوةُ، قَدْ قَامَتِ الصَّلٰوةُ''، حضور ﷺ نے اس صحابی نے فرمایا:

''عَلِّمْهَا بِلَالًا فَلْيُؤَذِّنْ بِهَا.'' [مسند احمد بن حنبل، رقم: ۲۲۱۲۴]

بلال کو سکھا دو، اس طرح نماز کے لئے بلایا کرے تو سب سے پہلے مؤذن حضرت بلال رضی اللہ عنہ ہیں جنہوں نے

اذان شروع کی تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی حاضر ہوئے اور عرض کیا: یا رسول اللہ! میں نے بھی (اسی طرح) ایک خواب دیکھا ہے کہ آدمی آیا اور اس نے اذان دی لیکن مقدر کی بات ہے کہ صحابی مجھ سے پہلے پہنچ گئے، ورنہ خواب میں نے بھی دیکھا ہے، اسی طرح معاذ رضی اللہ عنہ نے بھی دیکھا اور ان کے خواب کی تصدیق حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی اور جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تصدیق فرمادی تو وہ سنت ہوگئی۔

تیسری حالت نماز کی یہ تھی کہ اگر امام نماز پڑھا رہا ہے اور ایک آدمی بعد میں آیا وہ آکر پوچھتا تھا کہ کتنی نماز پڑھ لی ہے، وہ بتاتے کہ تین رکعت پڑھ لی ہیں یعنی نماز کے اندر بات کر سکتے تھے، بعد میں اللہ تعالیٰ نے نماز میں بولنا بالکل منع کردیا۔

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نماز میں آیا اور چپ کر کے کھڑا ہوگیا۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھ لی تو میں نے اپنی بقیہ نماز پوری کرلی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جیسے معاذ نے کیا ہے تم بھی اسی طرح کیا کرو۔

روزے میں بھی تین تبدیلیاں ہوئیں:

اسی طرح روزے پر بھی تین حالات گزرے ہیں۔ پہلے یہ تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مہینہ میں صرف تین روزے رکھتے تھے جسے ایام بیض کہتے ہیں پھر جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لے آئے تو آپ نے عاشوراء کا روزہ بھی رکھا، نو اور دس محرم یا دس اور گیارہ محرم کو روزہ رکھا، پھر اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں یہ آیت نازل فرمائی کہ اللہ تعالیٰ نے رمضان کے روزے فرض کردیئے ہیں، لیکن ان روزوں کے اندر اللہ نے اجازت دے دی کہ اگر کوئی آدمی روزہ نہ رکھنا چاہے ایک مسکین کو کھانا کھلادے تو اس پر گناہ نہیں ہوگا، پھر اللہ تعالیٰ نے دوسری آیت نازل فرمائی: ﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ ۚ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ﴾ جس آدمی کو بھی رمضان کا چاند نظر آئے اس پر روزہ فرض ہے۔ اب روزہ کی بجائے مسکین کو کھانا کھلانے والا مسئلہ ختم ہوگیا۔

روزہ کی تیسری حالت یہ تھی کہ پہلے حکم یہ تھا کہ جب روزہ مغرب کو افطار کرلیا تو آپ کھائیں پئیں، بیوی سے ملیں لیکن شرط یہ ہے کہ جب تک تم سو نہ جاؤ اگر کوئی آدمی عشاء کی نماز پڑھ کر سو گیا تھکا ہوا تھا اس کو نیند آگئی اب چاہے اس کی نیند آدھی رات کو بھی کھل جاتی اس کے لیے کھانا، پینا، بیوی سے ملنا بند ہوجاتا جب آنکھ کھلی اس وقت سے روزہ شروع ہوجاتا تھا یہ مسئلہ اس طرح چلتا رہا۔

حضرت صرمہ بن قیس انصاری رضی اللہ عنہ بڑی محنت و مشقت کر کے آئے تو سو گئے اب نیند کے بعد کھانا نہیں کھا سکتے تھے اگلے دن دوپہر کو بے ہوش ہو گئے۔ اگلے دن بیوی سے کھانے کا پوچھا اس نے کہا گھر میں تو کچھ نہیں کہیں سے پوچھ آتی ہوں چونکہ وہ محنت مزدوری سے تھکے ہوئے تھے تو نیند آ گئی۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ان کو دیکھا تو فرمایا میں دیکھ رہا ہوں تم تو بڑی تکلیف میں ہو یا تم پر روزے کا اثر ہے انہوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! میں مزدور آدمی ہوں محنت کرنے والا آدمی ہوں، عشاء کے بعد جلدی سو گیا، میری ابھی پہلے دن کی مشقت بھی نہیں اُتری تھی، پھر میرا دوسرا روزہ شروع ہو گیا اس لیے مجھے زیادہ تکلیف ہوئی ہے تو اللہ تعالیٰ نے رعایت دی کہ سونے سے کچھ نہیں ہوتا ایک وقت مقرر ہے تم ساری رات کھا پی سکتے ہو، جب تک کہ صبح صادق نہ ہو۔

اسی طریقہ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بھی واقعہ پیش آ گیا کہ وہ بھی عشاء کے بعد سو گئے آنکھ کھلی تو اپنی بیوی سے مل بیٹھے (اور ایک روایت میں ہے کہ وہ نہیں سوئے تھے بلکہ ان کی بیوی سو گئی تھیں جب حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے خواہش ظاہر کی تو بیوی نے کہا کہ میں تو سو چکی ہوں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے سمجھا کہ یہ مجھے ٹالنا چاہتی ہے اور اس سے مل بیٹھے) حالانکہ نیند کے بعد ملنا منع تھا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آ کر عرض کیا حضور! میں تو برباد ہو گیا، مجھ سے تو غلطی ہو گئی میں سو گیا تھا لیکن جب آنکھ کھلی تو بیوی سے مل لیا، تو اللہ تعالیٰ نے قرآن میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت پر رعایت فرما دی:

﴿اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمْ ۭ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ﴾ [البقرۃ:۱۸۷]

روزے کی نیت کب سے کرنی ہے؟

رمضان المبارک کے قضا روزے کے لیے ضروری ہے رات سے ہی روزے کی نیت ہو، اگر نیت نہ کی تو روزہ ادا نہیں ہوگا، کیونکہ کوئی عمل بغیر نیت کے ادا نہیں ہوتا ہے۔ رمضان کے مہینے میں رات کے وقت نیت ضروری نہیں دوپہر سے پہلے تک نیت کر سکتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"إِنَّمَا الأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ." [صحیح بخاری، رقم:۱]۔

"تمام اعمال کا دارومدار نیت پر ہے۔"

اصل نیت دل میں ہوتی ہے زبان سے نیت نہیں، زبان سے تو صرف آدمی کو خوابِ غفلت سے جگانے کی بات ہے۔

﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ ۚ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ۭ وَمَنْ كَانَ مَرِيْضًا اَوْ عَلٰي سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ۭ يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ۡ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰي مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝﴾

[البقرۃ:۱۸۵]

"ماہِ رمضان وہ ہے جس میں قرآن اُتارا گیا جو لوگوں کے لیے ہدایت ہے اور ہدایت حق و باطل میں فرق کرنے کی واضح ہدایات ہیں، پس تم میں سے جو بھی اس مہینہ کو پائے تو اس کے روزے رکھے، اور جو مریض ہو یا جو سفر پر ہو تو دوسرے دنوں میں قضا کرے، اللہ تمہارے ساتھ آسانی کا ارادہ رکھتا ہے اور تمہارے ساتھ دُشواری کا ارادہ نہیں رکھتا، تا کہ تم رمضان کے روزوں کی تعداد پوری کرو اور اس بات پر اللہ کی بڑائی بیان کرو کہ اس نے تمہیں ہدایت دی اور تا کہ تم احسان مانو۔"

(حدیث) رمضان المبارک کا مہینہ رحمتوں، برکتوں اور عظمتوں کا مہینہ ہے پہلے چند انعامات کا ذکر کیا تھا یہاں سے بھی انعامات کا ذکر ہو رہا ہے۔

صحیح حدیث میں ہے کہ رمضان کے مہینے کا پہلا عشرہ رحمت ہے دوسرا عشرہ مغفرت اور تیسرے عشرہ میں جہنم سے آزادی ملتی ہے، رمضان کا پورا مہینہ رحمت ہے، اس کے دن بھی رحمت ہیں اور راتیں بھی رحمت ہیں۔

روزہ دار کے لیے دو خوشیاں:

حضور ﷺ نے فرمایا: ہر روزہ رکھنے والے کو اللہ تعالیٰ دو خوشیاں نصیب فرماتے ہیں، ایک خوشی اس کو افطار کے وقت ہوتی ہے اور دوسری خوشی تب ہوگی جب اللہ تعالیٰ سے ملاقات کرے گا۔

اللہ تعالیٰ اپنے فرشتوں کو کہیں گے میرے بندوں کو کہہ دو اے ایمان والو! اب جنت کی نعمتیں کھاؤ پیو، اب نہ پابندیاں ہیں نہ تکلیف، جو پابندیاں تم نے گزار لی ہیں آج تمہیں ان کا بدلہ مل رہا ہے۔

رمضان اور آسمانی کتابوں کے نزول کا خصوصی تعلق:

رمضان کے مہینہ کو اللہ کی کتابوں سے خصوصی تعلق ہے اللہ نے جتنی کتابیں اُتاری ہیں وہ سب رمضان کے مہینے

میں اُتاری ہیں۔بعض روایات میں یہ بات بھی ملتی ہے کہ اللہ نے چوبیسویں کی رات کوقرآن اُتارا۔اس لیے بعض علماء کرام کا یہ خیال ہے کہ چوبیسویں کی رات ہی دراصل لیلۃ القدر کی رات ہے، کیونکہ اسی رات کو اللہ تعالیٰ نے قرآن اُتارا ہے۔قرآن تیئیس سال کی مدت میں اُترا تو پھر رمضان کے مہینہ میں قرآن اُتارنے کا معنی یہ ہے کہ اللہ نے سب سے پہلے لوحِ محفوظ سے قرآن کو آسمانِ دنیا پر ایک جگہ ہے جس کا نام بیت العزت ہے وہاں پورا قرآن اُتارا گیا پھر بیت العزت سے حضور ﷺ پر تیئیس سال کی مدت میں اُترا۔

رمضان کے مہینے کوقرآن سے خصوصی تعلق ہے اس لیے علماء فرماتے ہیں کہ رمضان کے مہینہ میں افضل عبادت قرآن کا پڑھنا ہے جیسا کہ مکہ کے اندر نفلی عبادتوں میں افضل طواف ہے کیونکہ آپ کو باقی عبادات دنیا میں مل سکتی ہیں لیکن طواف نہیں مل سکتا۔مدینہ منورہ کے اندر نفلی عبادتوں میں افضل کثرت سے درود شریف پڑھنا ہے کیونکہ آپ اس مقام پر، ان گلیوں اور اس شہر میں ہیں جو مقامِ ہجرت، مقامِ مسجد نبوی اور مقام محمد مصطفیٰ ﷺ ہے۔

اللہ تعالیٰ نے رمضان کے مہینہ کوقرآن کی حفاظت کا ذریعہ بھی بنا دیا کہ جو حافظ سارا سال قرآن نہ پڑھے، رمضان شریف میں وہ بھی پڑھتا ہے، رمضان میں ہر مسجد اور ہر منبر ومحراب میں اللہ کا قرآن پڑھا جاتا ہے۔

حضور ﷺ کا سب سے بڑا معجزہ قرآن ہے۔

آسمانی کتابوں کا نزول رمضان میں ہوا:

اللہ تعالیٰ نے تمام آسمانی کتابیں رمضان کے مہینہ میں نازل فرمائیں۔حضور ﷺ نے فرمایا:

''أُنْزِلَتْ صُحُفُ إِبْرَاهِيمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ فِي أَوَّلِ لَيْلَةٍ مِنْ رَمَضَانَ، وَ أُنْزِلَتِ التَّوْرَاةُ لِسِتٍّ مَضَيْنَ مِنْ رَمَضَانَ، وَ الْإِنْجِيلُ لِثَلَاثَ عَشْرَةَ خَلَتْ مِنْ رَمَضَانَ، وَ أُنْزِلَ الْفُرْقَانُ لِأَرْبَعٍ وَ عِشْرِينَ خَلَتْ مِنْ رَمَضَانَ.'' [مسند احمد بن حنبل، رقم: ۱۶۹۸۴]

صحفِ ابراہیم رمضان کی پہلی رات میں اُتارے گئے اور تورات ۷ رمضان کو اُتاری گئی اور زبور ۹ رمضان میں اُتاری گئی اور انجیل ۱۳ رمضان کو اُتاری گئی اور قرآن مقدس رمضان المبارک کی پچیس کو اُتارا گیا۔

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ زبور تیرہ رمضان کو، انجیل اُنیس رمضان المبارک کو اُتری۔

باقی حدیث اسی طرح ہے۔

پہلے جتنی کتابیں اُتاری گئیں وہ ایک دم اُتاری جاتی تھیں، قرآن پاک کی شان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو تیئس سال کی مدت میں اُتارا، جیسے کوئی واقعہ پیش آیا قرآن اُترتا گیا۔

قرآن پاک کو ایک بار میں نازل کیوں نہ کیا گیا؟

علماء نے لکھا ہے اس میں کئی حکمتیں تھیں اللہ تعالیٰ کے علم میں تھا کہ ہم نے پہلی کتابوں کو قیامت تک باقی نہیں رکھنا لیکن اللہ تعالیٰ کے علم میں تھا کہ حضور ﷺ آخری نبی ہیں اور قرآن آخری کتاب ہے۔ آپ ﷺ کے بعد نبوت اور وحی کا دروازہ بند ہے لہٰذا اللہ نے تھوڑا تھوڑا قرآن اس لئے نازل فرمایا، تاکہ یاس ہوتا جائے اور سینوں میں محفوظ ہوتا جائے، کیونکہ قیامت تک اللہ تعالیٰ نے اس کو باقی رکھنا ہے۔

دوسرا اس کے اندر حضور ﷺ کی عظمت کی دلیل بھی تھی کہ ایک تو یہ ہے کہ آپ کے پاس کتاب موجود ہے اور آپ نے اس میں مسئلہ تلاش کرنا ہے اس کے اندر وقت تو لگے گا۔ اللہ نے حضور ﷺ کو اتنی بڑی شان دی کہ اگر کوئی مسئلہ پیش آئے تو میرے نبی نہ ڈھونڈتے رہیں، بلکہ ہم جبرائیل علیہ السلام کو بھیج کر اسی وقت بتلادیں۔

اور یہ حکمت بھی تھی کہ جب حضرت جبرائیل علیہ السلام آتے اور اللہ کے نبیوں کو ملتے تھے تو دو رسولوں کا لقاء ہوتا تھا، ایک اللہ کا نبی اور ایک حضرت جبرائیل علیہ السلام جو نوری مخلوقات میں سے ہیں اور نبی بشر تھے دونوں رسولوں کے لقاء سے اللہ تعالیٰ برکات وثمرات نصیب فرماتے ہیں، جس سے انبیاء کے مدارج میں ترقی ہوتی تھی۔ تو باقی انبیاء کے پاس جبرائیل علیہ السلام ایک دفعہ آئے اور کتاب دے دی، لیکن حضور ﷺ کے لیے حضرت جبرائیل علیہ السلام آسمانوں سے کئی مرتبہ اُترے اور جوں جوں قرآن اُترتا تھا تو ایمان والوں کا ایمان بڑھتا گیا اور کافر کفر میں بڑھتے گئے۔

حضرت عطیہ بن الاسود رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: میرے دل میں ایک شک پیدا ہوا کہ قرآن پاک میں آیا: ﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ﴾ ہم نے قرآن رمضان کے مہینہ میں اُتارا ہے اس طرح قرآن کہتا ہے کہ قرآن لیلۃ القدر میں اُتارا گیا مجھے شک پڑ گیا کہ یہ کیا بات ہے قرآن تو محرم، صفر، ربیع الاول بلکہ سال کے ہر ماہ میں اُترا ہے اور ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن صرف رمضان میں اُترا ہے، میں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے پوچھا، آپ نے فرمایا: تم نے سمجھا نہیں، پورا قرآن جب لوحِ محفوظ سے آسمانِ دنیا پر اُتارا گیا تو رمضان المبارک کا مہینہ تھا، اس کے بعد جیسے جیسے حالات پیش آتے گئے قرآن اُترتا گیا،

کبھی قرآن مکہ میں اُترا، کبھی مدینہ میں اُترا، کبھی تبوک میں اُترا۔ اس طرح مجھے بات سمجھ آگئی۔

﴿هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنَاتٍ مِّنَ الْهُدَىٰ وَالْفُرْقَانِ﴾ اس میں اللہ تعالیٰ نے قرآن کی مدح بیان فرمائی کہ اللہ نے قرآن اُتارا ہے تاکہ بندوں کو ہدایت نصیب ہو لیکن ہدایت اس کو ملے گی جو قرآن پر ایمان لایا اور اس کی تصدیق کی۔

﴿بَيِّنَاتٍ﴾ سے مراد دلائل ہیں کہ قرآن میں اگر کوئی بات بیان ہوتی ہے تو اس کی دلیل دیتے ہیں اور ایسے روشن دلائل ہیں کہ اگر کوئی آدمی تھوڑا سا بھی تدبر کرے تو سمجھ آجائے کہ اللہ کے قرآن کا جو بھی حکم ہے وہ حق ہے، سراپا خیر و برکت ہے۔ ﴿الْفُرْقَانِ﴾ کا معنی ہے: فرق کرنے والا، حلال و حرام کو علیحدہ کرنے والا، حق و باطل کو علیحدہ کرنے والا۔

بعض علماء نے فرمایا: رمضان کے مہینہ کو صرف رمضان نہ کہا کرو کیونکہ اللہ نے بھی قرآن میں شہر رمضان فرمایا ہے، رمضان اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سے ایک نام ہے۔ اس لیے شہر رمضان کہا کرو۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ صرف رمضان کہنا بھی جائز ہے۔

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ پہلا قول نجیح بن عبدالرحمٰن کا ہے جو سیر اور مغازی میں امام ہیں، لیکن حدیث کے معاملہ میں ضعیف ہیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی کتاب میں باقاعدہ باب باندھا ہے کہ "باب يقال رمضان" لہٰذا رمضان کہنا بھی جائز ہے۔ جن لوگوں نے منع کیا ہے ان کا استدلال قوی نہیں ہے، ان کی حدیث ضعیف ہے، حدیث میں آتا ہے:

"مَنْ صَامَ رَمَضَانَ، إِيمَانًا وَ احْتِسَابًا، غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ." [صحیح بخاری، رقم:۳۸]

جس شخص نے بھی رمضان المبارک کے روزے رکھے ایمان کے ساتھ اور ثواب کی اُمید کرتے ہوئے اس کے پہلے سارے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔

حالتِ سفر میں روزہ رکھے یا چھوڑ دے؟

بعض حضرات نے کہا ہے کہ ایک آدمی اپنے گھر میں تھا رمضان المبارک کا چاند نظر آگیا اس کے بعد اس نے روزے شروع کر دیئے، پندرہ رمضان کو وہ سفر پر جائے تو اس کو روزہ چھوڑنے کی اجازت نہیں ہے، کیونکہ ﴿فَمَنْ شَهِدَ مِنكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ﴾ جو مقیم ہے اس نے چاند دیکھا اس پر لازم ہے کہ روزہ رکھے۔ یہ اجازت تو اس کے لئے ہے کہ وہ سفر پر تھا اور چاند سفر میں دیکھا تو اس کو روزہ چھوڑنے کی اجازت ہے۔ لیکن یہ قول بہت عجیب

وغریب ہے۔ اصل بات وہی ہے کہ اگر مقیم ہے تو روزے رکھے اور اگر مسافر ہے تو چاہے چاند سفر میں نظر آئے یا گھر میں نظر آئے، وہ حالت سفر میں ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس کو اجازت دی ہے کہ وہ روزہ نہ رکھے اور اس کے بدلے میں قضا کرے۔

اللہ نے فرمایا: ﴿فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ﴾ تو بعض علماء فرماتے ہیں کہ اگر سفر پر ہے تو آدمی پر واجب ہے کہ وہ روزہ چھوڑ دے، کیونکہ اللہ نے فرمادیا ہے کہ بعد میں رکھے۔ لیکن جمہور کا قول یہ ہے کہ اس پر واجب نہیں ہے، بلکہ اس بندے کی اپنی مرضی ہے سفر میں اللہ تعالیٰ نے اس کو روزہ چھوڑنے کی اجازت دی ہے، چاہے تو وہ روزہ رکھ لے کیونکہ حدیث میں موجود ہے، صحابہ فرماتے ہیں کہ ہم نے رمضان میں حضور ﷺ کے ساتھ سفر کیا، بعض روزے والے ہوتے تھے اور بعض روزہ چھوڑنے والے ہوتے تھے، روزے والے بغیر روزہ والوں پر عیب نہیں لگاتے تھے اور وہ ان پر عیب نہیں لگاتے تھے۔

دوسری حدیث میں آتا ہے، حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم ایک سفر میں نکلے، رمضان المبارک کا مہینہ تھا، اتنی شدید گرمی تھی کہ ہم ہاتھوں کو سر پر رکھ لیتے تھے تاکہ گرمی سے اپنے سروں کو بچالیں۔ اس حالت میں تمام لوگوں نے روزہ چھوڑا ہوا تھا، لیکن حضور ﷺ روزے کے ساتھ تھے اور عبداللہ بن رواحہ نے بھی روزہ رکھا ہوا تھا۔

مریض اور مسافر کے روزے کا حکم:

اللہ تعالیٰ نے مریض اور مسافر کو اجازت دی ہے کہ اگر وہ رمضان میں روزہ نہ رکھ سکیں تو بعد میں قضا کرلیں۔
اگر آدمی سفر میں ہے تو امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کے لیے روزہ رکھنا بہتر ہے ایک تو یہ ہے کہ ایسا سفر ہو کہ جس میں مشقت کی وجہ سے روزہ نہیں رکھ سکتا تو سب کے نزدیک یہ ہے کہ روزہ نہ رکھے۔ اور ایک یہ ہے کہ اگر روزہ رکھ سکتا ہے تو روزہ رکھنا افضل ہے یا چھوڑنا افضل ہے؟ امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ روزہ رکھنا افضل ہے جیسا کہ حدیث میں آپ نے پڑھ لیا کہ حضور ﷺ سفر میں تھے اور روزے کی حالت میں تھے۔
علماء کی ایک جماعت کا قول ہے کہ سفر میں روزہ نہ رکھنا افضل ہے یعنی افطار کرنا افضل ہے کیونکہ جب اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایک رخصت دی ہے تو اس سے فائدہ اُٹھانا زیادہ بہتر ہے جیسا کہ ایک حدیث مبارک میں حضور ﷺ

سے پوچھا گیا کہ سفر میں روزہ رکھنے کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: سفر میں روزہ نہ رکھنا بہتر ہے اور اگر کسی نے سفر میں روزہ رکھا تو اس پر کوئی گناہ نہیں ہے۔

حضور ﷺ نے فرمایا: اللہ پاک نے جو رخصت دی ہے اس سے فائدہ اُٹھاؤ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے سفر میں نماز دو رکعت کر دی، اسی طرح روزہ نہ رکھنے کی اجازت بھی دی ہے۔

بعض علماء فرماتے ہیں کہ دونوں برابر ہیں سفر میں روزہ رکھے تو مرضی ہے اور روزہ نہ رکھے تو مرضی ہے۔ ایک صحابی حضرت حمزہ بن عمرو الاسلمی رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ سے پوچھا: یارسول اللہ! میں ایسا آدمی ہوں جو کثرت سے نفلی روزے رکھتا ہوں، مجھے اجازت ہے کہ میں سفر میں روزہ رکھ لوں؟ حضور ﷺ نے فرمایا: چاہو تو رکھ لو، چاہو تو چھوڑ دو۔

رخصت پر عمل نہ کرنے کی وعید:

ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اگر کوئی آدمی یہ عقیدہ رکھ لے کہ مجھ پر سفر میں روزہ رکھنا لازم ہے تو اس کو روزہ افطار کرنا لازم ہے کیونکہ یہ اللہ کی رخصت کا انکار کر رہا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت جابر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے جو رخصتیں دی ہیں، ان کو جو قبول نہ کرے اس پر اتنا بڑا گناہ ہے جیسے عرفات کے بڑے بڑے پہاڑ ہیں۔

اس لیے یاد رکھیں! کسی امام یا کسی محدث کے قول کو اس وجہ سے رد نہ کر دو کہ میرے مسلک کے مطابق نہیں اس لیے غلط ہے، ایسا کرنا غلط ہے کیونکہ جتنے ائمہ کرام ہیں ان سب کا مآخذ اللہ کا قرآن اور حدیث رسول اللہ ﷺ ہے۔ علماء کا فیصلہ ہے کہ کسی امام کے بارے میں غلط قسم کا لفظ نہ کہیں اور کسی امام کا قول لینے والے کو بُرا نہ کہیں۔ سب کے بارے میں یہ کہیں کہ اللہ تعالیٰ سب پر رحمتیں نازل فرمائے۔

ائمہ کرام کا اختلاف کے باوجود باہمی ادب واحترام:

ائمہ کرام کا آپس میں اتنا ادب واحترام ہوتا تھا، اگرچہ مسئلہ میں اختلاف ہے کہ ان کی رائے ایک ہے اور ان کی رائے دوسری ہے، لیکن جب ان کے پاس دوسرے امام کی رائے پہنچتی تو کہتا اللہ میرے بھائی پر رحمت کرے، اس نے بات سمجھی نہیں، اصل بات یوں تھی۔ اور پہلے امام کو جب ان کا قول پہنچا تو کہا اللہ میرے بھائی پر رحمت کرے، اچھا ہوا کہ مجھ تک حق بات پہنچا دی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کے اندر علم تھا اور ان کے اتباعِ رسول ﷺ تھی، ان

کے اندر کوئی ذاتی تفاخر اور تکبر نہیں تھا۔ آج جھگڑے اس لیے ہیں کہ ہر آدمی میں انا ہے، وہ بڑا بننا چاہتا ہے، وہ حق کا متلاشی نہیں ہے۔ اگر حق کا متلاشی ہو تو جھگڑا نہ ہو۔ آج ایک آدمی اگر غلط مسئلہ بتائے تو اسی پر اَڑ جاتا ہے کہ میں نے جو کہا بس وہ ٹھیک ہے۔ یہ سب سے بڑی غلطی ہے۔ اللہ ہم سب کو ہدایت عطا فرمائے اور اللہ ہم سب کو احترام کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ، امام محمد رحمۃ اللہ علیہ، امام زفر رحمۃ اللہ علیہ یہ تینوں امام ہیں، لیکن امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد ہیں اور کتنے مسئلے ہیں کہ انہوں نے اپنے استاد کے قول سے اختلاف کیا کیونکہ جب ان کی سمجھ میں ایک مسئلہ آ گیا تو انہوں نے اس کو لے لیا۔ وہ خود بھی مجتہد کے درجہ پر پہنچے ہوئے تھے۔ علماء نے لکھا ہے کہ بعض صوفیاء کرام، اولیاء اللہ گزرے ہیں جن کی زندگی تصوف اسلامی میں گزری ہے، ان کے بارے میں علماء نے لکھا ہے کہ ان بزرگوں کی باتوں پر کبھی بحث نہ کرو۔ ایک قول یاد رکھو کہ صوفیاء حضرات کے قول شریعت میں حجت نہیں ہوتے۔ شریعت میں قرآن وسنت کے مطابق جو فیصلے ہیں وہ حجت ہیں۔ باقی اگر بعض صوفیاء نے کوئی بات کی ہے جو سمجھ نہیں آ رہی تو سمجھنے کی کوشش کر کے اس کو ایسے محل پر لوٹائیں کہ اچھی بات بن جائے اور کوئی ایسی تاویل نہیں کر سکتے تو چپ کر جائیں، ان کے معاملہ کو اللہ پر چھوڑ دیں۔ پتہ نہیں کہ جب انہوں نے یہ بات کہی تھی تو ان کا مقصد اور حالات کیا تھے؟

معرفتِ الٰہی کیسے حاصل ہوتی ہے؟

میں نے ایک کتاب میں پڑھا کہ حضرت امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا کہ اس آدمی کو اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل نہیں ہوتی جو اپنے آپ کو کافر سے بھی اچھا سمجھے۔ جب میں نے قول پڑھا تو مجھے سمجھ نہ آیا کہ یہ عجیب بات ہے کہ ہم اپنے آپ کو کافر سے بھی اچھا نہ سمجھیں۔ والد صاحب زندہ تھے تو میں نے ان سے کہا کہ آپ حضرت حاجی صاحب کو اپنا پیرو مرشد مانتے ہیں، یہ ان کی بات ہے، مجھے سمجھ نہیں آتی ہے۔ اس وقت والد صاحب کی نظر بہت زیادہ کمزور ہو گئی تھی، فرمایا: مجھے پڑھ کر سناؤ کہ کیا لکھا ہے؟ میں نے پڑھ کر سنایا تو کہا: شیخ نے تو ٹھیک لکھا ہے، اگر تم جاہل ہو تو ہم کیا کریں؟ میں نے کہا: کیسے ٹھیک لکھا ہے؟ فرمایا: بات کو سمجھو کہ اللہ تعالیٰ اس بات پر قادر ہے کہ تم کو کافر کر کے مار دے۔ میں نے کہا: اللہ تعالیٰ قادر ہیں۔ فرمایا: کیا اللہ اس بات پر بھی قادر ہے کہ کافر کو مسلمان کر دے اور اس کو سعادت کے مرتبہ پر پہنچا کر اونچا کر دے۔ فرمایا: یہی سبق دے رہے ہیں کہ اپنے آپ کو حقیر

سمجھو، دوسرے کو گندا نہ سمجھو، کہیں اللہ تعالیٰ ناراض نہ ہو جائے۔

اس لیے علماء کرام نے فرمایا: بعض اوقات اولیاء کرام کی بات بڑی مشکل ہوتی ہے، بڑی پیچیدہ ہوتی ہے، ان کی بات کو سمجھ لیا تو اس کی تاویل کر دو اور اگر بالکل سمجھ میں نہیں آ رہی تو چپ کر جاؤ اور اپنی زبان سے کوئی اچھا لفظ نکالو۔

ایک گنہگار کا ایک بزرگ سے بیعت کا واقعہ:

میں نے پڑھا کہ ایک آدمی ایک بزرگ کی خدمت میں بیعت ہونے کے لیے آیا، وہ کوئی امیر زادہ تھا، بڑی مشکل سے اس کو کھینچ کر بزرگ کی خدمت میں لے آئے کہ یہ ہمارا بگڑا ہوا شہزادہ ہے، مہربانی کر کے اس کو بیعت کر لیں اور اس کا علاج بھی کریں۔ بزرگوں نے اس آدمی سے پوچھا: تمہارا کیا ارادہ ہے؟ اس نے کہا: حضرت! میں بیعت ہونے کے لیے نہیں آیا، یہ تو مجھے پکڑ کے لے آئے ہیں۔ بزرگ نے فرمایا: اگر تم نہیں چاہتے تو کوئی زبردستی نہیں ہے۔ اس آدمی نے کہا: میں ایک شرط پر بیعت ہوں گا۔ پوچھا تو اس نے کہا: میں گانا نہیں چھوڑ سکتا، مجھے طوائفوں کا گانا سننے کی عادت ہے اور زنا، شراب بھی نہیں چھوڑ سکتا۔ میں بڑے آدمی کا بیٹا ہوں، پوری زندگی ان گانوں میں گزری تو یہ میری زندگی کا ایک حصہ بن گیا ہے، میں طوائف کے گانے کے بغیر رات کو نہیں سو سکتا۔ اگر اس شرط پر بیعت کرنی ہے تو کر لیں۔ بزرگوں نے فرمایا: تمہاری شرط منظور ہے۔ اب اس بات کو اگر کوئی آدمی پڑھے تو وہ کہے گا: یہ اچھا پیر ہے جو کہہ رہا ہے کہ زنا کرتے رہو۔ بزرگوں نے فرمایا: ایک ہماری شرط ہے کہ نماز پڑھ لیا کرو، نماز جماعت کے ساتھ پڑھا کرو۔ اس نے کہا: ٹھیک ہے، اور بیعت ہو کر چلا گیا۔ اللہ والے کی نظر تو اپنی جگہ پر تھی کہ نماز صحیح معنی میں پڑھی جائے تو یہ بُرے کاموں سے اور منکر سے روکنے والی ہے۔ یہ نہیں کہ ان کو زنا کی اجازت دے دی۔ وہ لڑکا اپنے گھر میں واپس آیا۔ عصر کے بعد اس کی محفل کا وقت شروع ہو جاتا تھا اس نے غسل کیا اور تیار ہوا تو اس کے ساتھیوں نے کہا مجلس تیار ہے، اس نے کہا مجلس عشاء کے بعد بناؤ کیونکہ میں نے اپنے مرشد سے نماز پڑھنے کا وعدہ کیا ہے عصر کے بعد مغرب آ جائے گی اور اس کے بعد عشاء آ جائے گی اگر عصر کے بعد محفل شروع کر دی تو مغرب اور عشاء کی نماز چلی جائے گی اور میرا وعدہ پورا نہیں ہوگا۔ اس نے عصر، مغرب اور عشاء بھی پڑھ لی اور بجائے اپنے ڈیرے پر آنے کے گھر میں چلے گئے نوکروں نے کہا، مجلس لگی ہوئی ہے اس نے کہا آج میرا جی نہیں چاہتا، کل عشاء کے بعد محفل کریں گے دوسرے دن لوگ پھر آئے، اس نے کہا اب اللہ نے اپنے گھر بلا

لیا ہے شرم آتی ہے، ادھر میں قرآن پڑھوں اور پھر اس زبان سے گانے گاؤں اور اس سے شراب پیوں۔ بزرگوں کی بات کے انجام کو ہم دیکھتے اور سمجھتے نہیں پہلے اعتراض کر دیتے ہیں۔

(حدیث) حالانکہ یہ بات حدیث میں بھی موجود ہے کہ ایک آدمی نے حضور ﷺ کی خدمت میں آکر کہا کہ میں اسلام قبول کرتا ہوں لیکن مجھے زنا کی عادت ہے میں اس کو چھوڑ نہیں سکتا، حضور ﷺ نے فرمایا: کلمہ تو پڑھو۔ اس نے کلمہ پڑھ لیا تو حضور ﷺ نے فرمایا: کیا تمہیں یہ بات پسند ہے کہ کوئی تمہاری ماں سے زنا کرے؟ اس نے کہا: نہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: تمہاری بہن سے کوئی زنا کرے؟ اس نے کہا: میں اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دوں گا۔ حضور ﷺ نے فرمایا: تمہاری بیٹی سے کوئی زنا کرے، حضور ﷺ نے فرمایا: جس سے تم زنا کرتے ہو وہ بھی تو کسی ماں، بہن، بیٹی ہے۔ اس نے کہا: حضور! مجھے مسئلہ سمجھ آ گیا ہے، میری زنا سے توبہ ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: جس نے کلمہ پڑھ لیا، اس کے پہلے سارے گناہ مٹ گئے۔ اس نے کہا: آئندہ بھی میرا وعدہ ہے کہ اب اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہیں ہوگی۔

قضاء روزوں کی ادائیگی کا طریقہ:

سفر یا بیماری کی وجہ سے پانچ چھ روزے چھوڑ دیئے تو ان کی قضا لگاتار کریں یا وقفہ چھوڑ کر کریں، مثلاً ایک روزہ رکھ لیا، دو دن چھوڑ کر پھر دو روزے رکھ لیے۔ اس بارے میں ائمہ کے دو قول ہیں۔ بعض ائمہ فرماتے ہیں کہ لگاتار قضا کرے۔ بعض ائمہ فرماتے ہیں کہ یہ ضروری نہیں کہ لگاتار روزے رکھے تاکہ آرام بھی ملتا رہے روزے بھی قضا ہوتے رہیں۔ اصل اس کے اپنے بھی حالات پر محمول ہے اگر آدمی لگاتار روزے رکھ سکتا ہے تو لگاتار قضا کر لے، وگرنہ وقفہ وقفہ سے قضا کر لے۔

ایک دن روزہ، ایک دن افطار:

﴿یُرِیۡدُ اللّٰہُ بِکُمُ الۡیُسۡرَ وَلَا یُرِیۡدُ بِکُمُ الۡعُسۡرَ﴾ اللہ تعالیٰ تمہارے لیے آسانی چاہتے ہیں، اللہ تعالیٰ تمہارے لیے تنگی نہیں چاہتے۔ حدیث پاک میں آیا ہے:

"اِنَّ الدِّیۡنَ یُسۡرٌ." [صحیح بخاری، رقم:۳۹]

دین سب کا سب آسان ہے۔ اللہ پاک نے دین میں کوئی حکم ایسا جاری نہیں فرمایا جو اس کے بندوں کے لئے

نا قابلِ عمل ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ خالق کائنات ہیں وہ اپنی مخلوق کو سب سے زیادہ جاننے والے ہیں کہ میرے بندے کس عمل کی طاقت رکھتے ہیں اور کس عمل کی طاقت نہیں رکھتے۔ اس لیے فرمایا: ﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾ [البقرۃ:۲۸۶] حضور ﷺ نے ایک اعرابی کو فرمایا:

''إِنَّ خَيْرَ دِينِكُمْ أَيْسَرُهُ، إِنَّ خَيْرَ دِينِكُمْ أَيْسَرُهُ.'' [مسند احمد بن حنبل، رقم:۱۵۹۳۶]

تمہارے دین کی سب سے بڑی بھلائی اس کا آسان ہونا ہے۔ اسلام ایک ایسا دین ہے جو سب کے لئے قابلِ عمل ہے۔ بچے کے لیے، بوڑھے کے لئے، جوان کے لئے، عورت کے لئے سب کے لئے قابل عمل ہے اور ہر دور میں قابلِ عمل رہا ہے۔ اگر کوئی عمل نہ کرنا چاہے تو اس کے لیے بہانے بڑے ہیں۔

حضرت ابو عروہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ہم حضور ﷺ کی انتظار میں بیٹھے تھے، حضور ﷺ تشریف لائے اور آپ کے سر کے بالوں سے پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ حضور ﷺ تازہ غسل فرما کر آرہے تھے یا حضور اکرم ﷺ نے مسح فرمایا تو بالوں پر پانی زیادہ لگایا، اس لئے پانی کے قطرے گر رہے تھے۔ حضور ﷺ نماز پڑھانے کے بعد بیٹھ گئے اور لوگوں نے سوالات کرنے شروع کئے کہ اگر ہم یہ کام کریں تو گناہ ہوگا اگر ہم یہ کام کریں تو ہم پر کیا حرج ہوگا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ کا دین آسان ہے، اللہ تعالیٰ کے دین کے اندر کوئی مشکلات نہیں ہیں، اللہ پاک نے اپنے بندوں کے لئے بڑی آسانیاں پیدا فرمادی ہے۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے نقل کیا، حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

''يَسِّرُوا وَ لَا تُعَسِّرُوا، وَ سَكِّنُوا وَ لَا تُنَفِّرُوا.'' [صحیح بخاری، رقم:۶۱۲۵]

لوگوں کو آسانی والے احکام بتایا کرو، مشکلات میں نہ ڈالا کرو۔ لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی رحمت کی باتیں سنایا کرو جن سے ان کو اطمینان حاصل ہو۔ ایسی باتیں نہ سنایا کرو کہ ان کو نفرت ہو جائے کہ اسلام پر چلنا بہت مشکل ہے۔

حضور ﷺ نے جب حضرت معاذ رضی اللہ عنہ اور حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو یمن کے علاقے میں قاضی بنا کر بھیجا اس وقت حضور ﷺ نے فرمایا: لوگوں کو اسلام کے اندر جو خوشخبریاں ہیں وہ سنانا، ایسے نہ ہو کہ جہنم کی باتیں تو سناؤ، جنت کی خوشخبریاں اور رحمت کی باتیں نہ سناؤ، لوگوں کو مشکلات میں تو ڈالو اور آسانی پیدا نہ کرو بلکہ ان کے لیے آسانی پیدا کرنا مشکلات میں نہ ڈالنا اور ایک دوسرے سے اتفاق کرنا اختلاف نہ کرنا ایک دوسرے کی اطاعت

کرنا اور آپس میں جھگڑے نہ کرنا۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کا عدل چرواہے کی زبانی:

حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں تاریخ شاہد ہے کہ ایک دن چرواہا صبح کو اپنی بکریاں لے کر جنگل میں گیا تو دوسرے چرواہے سے کہنے لگا: معلوم ہوتا ہے کہ آج ہمارا بادشاہ کوئی اچھا آدمی آ گیا ہے۔ اس نے کہا: میں نے بکریاں چرائی ہیں اور آپ نے بھی بکریاں چرائی ہیں، ہمارا بادشاہوں سے کیا تعلق ہے؟ اس نے کہا کہ میں نے دیکھا کہ آج بھیڑیے آئے، بکریوں کے ریوڑ کے قریب پھرتے رہے، لیکن کسی بکری کو نہیں چھیڑا اور چپ کر کے چلے گئے۔ بھیڑیوں نے ظلم چھوڑ دیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی عدل والا بادشاہ آ گیا ہے۔ کچھ دن گزرے تو ان کو پتہ چلا کہ عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ اس تاریخ کو تخت پر بیٹھے تھے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کو حکم دے دیتے ہیں کہ میرے بندوں کی غلامی کرو۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ایک جنگل میں پڑاؤ ڈالنے کا واقعہ:

صحابہ کرام ایک جہاد کے لئے تشریف لے جا رہے تھے ایک جگہ بڑا جنگل تھا جب وہاں پہنچے تو قافلہ تھکا ہوا تھا متواتر سفر کر کے آ رہے تھے امیر نے حکم دیا کہ یہاں پڑاؤ کرو کل دوبارہ سفر شروع کیا جائے گا ابھی سامان اُتار رہے تھے کہ بستی کے کچھ لوگ ان کے پاس آئے اور پوچھا کہ تم کون لوگ ہو؟ صحابہ نے کہا ہم مسلمان ہیں انہوں نے پوچھا تمہارا بڑا کون ہے؟ مسلمانوں نے کہا وہاں خیمے میں ہیں بستی والے ان کے پاس آئے اور کہا کہ آپ کا اور ہمارا کوئی تعلق نہیں ہے لیکن آپ بھی انسان ہیں اور ہم بھی انسان ہیں۔ یہ جنگل اتنا خطرناک ہے کہ ہم رات کو اپنی بستی کی حفاظت کے لئے آگ جلاتے ہیں تاکہ جنگل کا کوئی درندہ ہم کو نقصان نہ پہنچائے اور آپ تو جنگل کے سرے پر اپنا پڑاؤ ڈال رہے ہیں، رات کو جنگلی جانور آپ کا نقصان کر دیں گے، امیر نے کہا آپ نے اطلاع دے دی ہے اللہ تمہیں اس کی اچھی جزاء دے گا۔ ہم بڑے تھکے ہوئے ہیں سامان اُتر چکا ہے، خیمے لگ گئے ہیں، اب تو ہم یہیں رات گزاریں گے، جو ہمارے اللہ کو منظور ہے دیکھا جائے گا، بستی والے چلے گئے۔ صحابہ کہتے ہیں کہ ہمارے امیر نے عصا پکڑا اور کھڑے ہو کر خطبہ پڑھا کہ اے جنگل کے درندو خبردار! ہم اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور اللہ کے دین کے لیے نکلے ہیں خبردار! اگر تم نے ہماری کسی چیز کو چھیڑا۔ صحابہ کہتے ہیں کہ ہم سن رہے ہیں کہ ہمارے

امیر صاحب کھڑے تقریر کر رہے ہیں یہ باتیں کہنے کی نہیں ہیں بلکہ جب یہ باتیں سامنے آتی ہیں تو حقیقت کھل جاتی ہے۔ کہتے ہیں جوں جوں اندھیرا ہوتا گیا ہم نے دیکھا کہ جنگل میں شیر، لومڑی، گیدڑ سارے جنگل چھوڑ کر جا رہے ہیں تا کہ رات کو ہمارے چلنے پھرنے سے حضور ﷺ کے صحابہ کی نیند میں خلل نہ آئے، جب تک صحابہ وہاں رہے وہ جنگل میں نہیں آئے۔ ان کو کس نے حکم دیا تھا اور کس نے انسانوں کی بولی سکھا دی تھی؟

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا دریائے نیل کو خط لکھنے کا واقعہ:

کیا دنیا کا مؤرخ اس کا انکار کر سکتا ہے کہ سیدنا امیر المومنین حضرت عمر بن خطاب نے دریا کو خط لکھا تھا؟ کیا تمہارے ملک میں دریا خط پڑھتے ہیں؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خط لکھا تھا کہ اے دریا! اگر چلنا ہے تو اللہ کے حکم سے چلو، اگر نہیں چلنا تو میرا اللہ دوسرے طریقہ سے بھی ہمیں رزق دینے پر قادر ہے ہمیں تیری کوئی ضرورت نہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مصر کے گورنر حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو لکھا کہ میرا خط لے جاؤ اور دریائے نیل کو وسط میں رکھ دو۔ گورنر نے خط دیکھا اور کہا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے لکھا ہے تو ٹھیک ہے جس کی رائے کے مطابق بعض دفعہ عرش سے قرآن اُتر پڑتا ہے تو دریا کی کیا طاقت ہے؟ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے دریائے نیل کے وسط میں خط رکھا اور باہر نکل آئے تو اسی رات میں دریا اپنی پوری طغیانی سے چڑھ گیا اور آج تک اس سطح سے نیچے نہیں اُترا۔

یہ بات ہماری سمجھ میں اس وقت آئے گی جب اس دل میں اللہ پر ایمان، یقین کامل ہو جائے گا کہ ﴿اِنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ وہ بموں کو، میزائلوں کو روک سکتا ہے اور بغیر سود کے روٹی دے سکتا ہے۔

عبادت بھی کرو، معاملات میں بھی حصہ لو:

حدیث پاک میں آتا ہے کہ حضور ﷺ نے ایک آدمی کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا۔ آپ ﷺ اس کو کافی دیر تک دیکھتے رہے۔ پھر حضور ﷺ نے فرمایا: کیا اس آدمی کو دیکھا ہے کیا یہ سچے دل سے اتنی لمبی نمازیں پڑھ رہا ہے؟ صحابہ نے کہا: یہ مدینہ منورہ میں نماز کا بہت بڑا عاشق ہے لمبی لمبی نمازیں پڑھتا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: زور سے باتیں نہ کرو، کہیں وہ تعریف سن کر خوش ہو جائے اور ریاء میں نہ مبتلا ہو جائے اور یہی بات اس کی ہلاکت کا باعث نہ بن جائے۔

اللہ تعالیٰ نے مشقت میں بھی نہیں ڈالا تھا کہ آدمی چوبیس گھنٹے اس کی عبادت میں رہے بلکہ دنیا کے بھی کام کرو اور

دین کے بھی کام کرو۔ اسلام کے اندر رہبانیت نہیں ہے بلکہ اسلام سبق دیتا ہے کہ نماز بھی پڑھو، تجارت بھی کرو، لیکن عبادت کو تجارت پر مقدم کرو۔ یہی وجہ ہے کہ جمعہ کی نماز اہم نماز ہے، اگر کسی کے تین جمعہ جان بوجھ کر چھوٹ جائیں تو اس پر مہر لگ جاتی ہے کہ یہ بندہ منافق ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جمعہ کے بارے میں فرمایا کہ جب تمہیں نماز جمعہ کے لئے پکارا جائے تو فوراً چل پڑو، تجارت میں بیٹھے رہو۔ صحابہ ﷺ کا یہ عمل ہوتا تھا کہ اگر کسی چیز کا وزن کر رہے ہیں اذان آگئی تو معاملہ روک دیا کہ اب اللہ کے قرآن کے خلاف ہے۔ آگے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جب نماز ہو جائے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا رزق تلاش کرو۔ یہ نہیں کہ مسجد میں بیٹھے رہو اور رہبانیت اختیار کرلو۔ اس لیے صحابہ کرام کوئی رومال وغیرہ لے لیتے تھے جب جمعہ پڑھ لیتے اور باہر نکلتے تو اس رومال کو بیچنا شروع کر دیتے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ رزق حاصل کرو تو ضرور اس میں برکت ہوگی اس لیے کوئی تھوڑی چیز ہی بیچ لوں۔

اسلام کہتا ہے کہ تم حرام نہ کھاؤ، چوری، ڈاکہ نہ ڈالو۔ اسلام نے حلال رزق سے منع نہیں کیا۔ اندازہ کریں کہ کچھ صحابہ کرام اکٹھے ہوئے اور اُمّ المومنین کے پاس آکر سوال کرنے کے بعد کہنے لگے: ہم ساری زندگی روزہ رکھیں گے، رات کو جاگیں گے اور بعض نے کہا: ہم شادی نہیں کریں گے۔ حضور ﷺ کو غصہ آگیا اور فرمایا کہ کون ہے جو میرا مقابلہ کرے۔ میں رات کو جاگتا بھی ہوں سوتا بھی ہوں، میں روزہ بھی رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں، میں شادیاں بھی کرتا ہوں اور بیویوں کے حقوق بھی ادا کرتا ہوں۔ فرمایا: تیرے نفس کا بھی تجھ پر حق ہے، تیری آنکھوں کا بھی تجھ پر حق ہے، تیرے بدن کا بھی تجھ پر حق ہے، تیرے بیوی بچوں کا بھی تجھ پر حق ہے، تیری اولاد کا بھی تجھ پر حق ہے، جب تک ہر حق والے کو حق نہ دو، دین کا دعویٰ نہ کرو۔

حضور ﷺ نے فرمایا: مجھے دنیا کی تمام چیزوں میں سب سے محبوب خوشبو، پاک بیوی پسند ہیں اور نماز میری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔ یہ کوئی بزرگی نہیں ہوتی کہ بیوی کئی سال بیٹھی رہے اور کہا جائے کہ حضرت تو اپنی بیوی کی طرف بھی نظر نہیں اُٹھاتے ہیں، حضرت اللہ سے مل گئے۔ کیا نبی سے بھی بڑھ گئے ہیں؟ نبی پاک ﷺ تو ہر روز اپنی بیویوں کے گھر میں تشریف لے جاتے تھے، ان سے بات کرتے، حال پوچھتے، پھر جس بیوی کا نمبر ہوتا اس کے گھر میں رات گزارتے تھے۔ حضور ﷺ سفر کے لئے جاتے تو بیویوں کا بلا کر قرعہ اندازی کرتے، جس بیوی کا نام نکلا، سفر میں انہیں اپنے ساتھ لے جاتے۔ حضور ﷺ اس بیماری میں جس میں آپ کی وفات ہوئی تھی، اس میں بھی آپ حکم دیتے کہ آج میری جس بیوی کی باری ہے مجھے اس کے گھر میں لے جاؤ، مگر آخر میں سب بیویوں

کے اتفاق اور رضامندی سے آپ ﷺ نے بیماری کے ایام اپنی بیوی حضرت عائشہ ؓ کے گھر میں گزارے۔

﴿وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ ۖ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ ۖ فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي وَلْيُؤْمِنُوا بِي لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُونَ ﴿١٨٦﴾﴾ [البقرة:۱۸۶]

''اور جب آپ سے میرے بندے میرے متعلق پوچھیں تو میں (ان کے) قریب ہوں، میں دعا مانگنے والے کی دعا کو قبول کرتا ہوں جب وہ مجھے پکارتا ہے۔ پس چاہیے کہ وہ میرا حکم مانیں اور مجھ پر ایمان رکھیں شاید کہ وہ نیک راہ پر آجائیں۔''

شانِ نزول:

بعض احادیث میں آتا ہے کہ صحابہ کرام نے حضور ﷺ کی خدمت میں عرض کیا کہ آپ ہمیں یہ بتائیں کہ ہمارا رب دور ہے یا ہمارا رب قریب ہے؟ اگر ہمارا رب دور ہو تو ہم اس کو زور سے پکاریں اور اگر ہمارا رب قریب ہے تو ہم آہستہ پکاریں اور دعا کریں تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی کہ ان کو بتا دیں کہ میں تمہارے قریب ہوں، دور نہیں ہوں۔

﴿وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ ۚ إِنَّ الَّذِينَ يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِي سَيَدْخُلُونَ جَهَنَّمَ دَاخِرِينَ ﴿٦٠﴾﴾
[المومن:۶۰]

جب قرآن کی یہ آیت مبارکہ نازل ہوئی تو صحابہ نے کہا کہ کس وقت مانگیں؟ کیا کوئی خاص گھڑی ہے جس میں ہم اللہ تعالیٰ سے مانگیں تو وہ سنے گا؟ اللہ نے فرمایا: جس وقت بھی مجھے کوئی پکارے، رات ہے، دن ہے، اندھیرا ہے، روشنی ہے، عرب ہے، عجم ہے، مکہ ہے، مدینہ ہے، جب دل سے پکارو گے تو میں فوراً جواب دوں گا۔

اللہ نے فرمایا: میرے بندے تو سو جاتے ہیں لیکن میں سونے سے پاک ہوں، میں تو غفلت سے پاک ہوں اور لوگوں کو دینے سے میرے خزانے میں کوئی کمی نہیں آتی، میں تو ایسا رب ہوں مجھ سے شیطان نے بھی مانگا تو میں نے اس کو بھی دیا، کیونکہ یہ اس کا بھی عقیدہ تھا کہ مجھے اللہ کے سوا کوئی نہیں دے سکتا۔ اب جو لوگ خدا کو چھوڑ کر غیر خدا سے مانگیں، ان کے بارے میں خود سوچیں کہ وہ کتنے کم عقل ہیں۔

ربط آیات:

اس آیت سے پہلے اور بعد میں روزے کا حکم ہے، درمیان میں یہ آیت کیوں آئی ہے؟ علماء نے فرمایا اور بعض روایات میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی اس بات کو نقل کیا گیا ہے کہ اس سے اللہ تعالیٰ نے اشارہ کیا کہ رمضان کا مہینہ اتنی برکتوں والا ہے کہ اس میں کئی خاص اوقات ہیں، جن میں بندے کی دعا قبول کرتا ہوں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: روزہ دار کے لیے جب روزہ کو افطار کرنے کا وقت آتا ہے اس وقت اس کے لیے میں نے ایسی گھڑی رکھی ہے کہ جو دعا مانگتا ہے میں قبول کرتا ہوں۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے بارے میں منقول ہے کہ جب افطار کا وقت آتا اور آپ اپنے گھر میں موجود ہوتے تو سارے گھر والوں کو اکٹھا کر لیتے کہ دعا مانگو، اس گھڑی میں اللہ تعالیٰ دعا کو قبول فرماتے ہیں۔ اسی طرح لیلۃ القدر کی رات بھی ایسی رات ہے وہ بھی رمضان المبارک کے اندر ہے جس میں ایک رات کی عبادت ہزار مہینوں کی عبادت سے بڑھ کر ہے، اس کے اندر ایسی رحمت کی گھڑیاں ہیں کہ جو بھی مانگو وہ ملتا ہے، شرط یہ ہے کہ وہ شریعت کے خلاف نہ ہو تو وہ دعا فوراً منظور ہو جاتی ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ میں اگر لیلۃ القدر کو پالوں تو مجھے بتائیں کہ میں اللہ تعالیٰ سے کیا مانگوں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ دعا مانگنا:

"اَللّٰهُمَّ إِنَّكَ عُفُوٌّ تُحِبُّ الْعَفْوَ فَاعْفُ عَنِّي." [جامع ترمذی، رقم: ۳۵۱۳]

اے اللہ! آپ بخشنے والے ہیں، بخشنے کو پسند کرتے ہیں، پس مجھے بھی بخش دیں۔

علماء نے یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے اس قول مبارک سے یہی اشارہ ملتا ہے کہ اللہ تعالیٰ لیلۃ القدر کو اپنے بندوں پر کچھ واضح کر دیتے ہیں، ان کو کچھ اشارات مل جاتے ہیں کہ آج لیلۃ القدر ہے۔ بہر حال چونکہ رمضان المبارک کو دعاؤں کے قبول ہونے میں ایک خصوصی تعلق تھا، اس لئے اللہ تعالیٰ نے روزوں کی آیات کے بیان کے درمیان میں یہ آیت بھی نازل فرما دی۔

دعا مانگنے کا صحیح طریقہ:

اس آیت مبارکہ اور دیگر آیات مبارکہ سے علماء کرام، فقہاء عظام نے یہ مسئلہ نکالا ہے کہ آدمی جب اللہ تعالیٰ

سے دعا مانگے تو آہستہ مانگے۔ چیخ چیخ کر دعا مانگنا اور شور کرنا یہ شریعت کے اندر منع ہے جیسا کہ حاجی حضرات جب طواف میں دعائیں مانگتے ہیں یا صفا و مروہ میں دوڑتے ہوئے دعائیں مانگتے ہیں تو چیخ چیخ کر دعائیں مانگتے ہیں، یہ منع ہے۔

اللہ بندے کے کتنا قریب ہے؟

دعا کا فلسفہ ہی یہ ہے کہ دعا آہستہ مانگی جائے۔ کچھ چیزیں ایسی ہیں جہاں زور سے کہنے کا حکم ہے، جیسا کہ تلبیہ زور زور سے کہا جائے۔ دوسری آیت میں آیا ہے: ﴿إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ﴾ [الاعراف:۵۵] دعاؤں میں حد سے نکل جانے والوں کو اللہ تعالیٰ محبوب نہیں رکھتے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کی دعائیں بھی نقل فرمائی ہیں، ﴿إِذْ نَادَىٰ رَبَّهُ نِدَاءً خَفِيًّا﴾ [مریم:۳] کہ جب حضرت زکریا علیہ السلام نے اپنے رب کو پکارا، حالانکہ لفظ ﴿نِدَاءً﴾ ہے لیکن اس کے آگے لفظ ﴿خَفِيًّا﴾ لگا دیا کہ مجھے چیخ چیخ کر نہیں پکارا، بلکہ چپکے چپکے سے پکارا کہ تہجد کا وقت اور رات کا اندھیرا ہے، پیغمبر اکیلا ہے لیکن پھر بھی آہستہ آہستہ پکار رہے ہیں۔ جہر کا معنی آواز بلند کرنا کے ہیں مگر جو تم سن رہے ہو یہ بھی خفی ہے اور اگر تم اتنا آہستہ مانگ رہے ہو گویا وہ الفاظ تمہیں بھی سنائی نہیں دے رہے تو یہ بھی دعائے خفی ہے۔

اس لئے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فاتحہ کے بعد آمین آہستہ کہنے کے حق میں ہیں، کیونکہ آمین بھی دعا ہے کہ یا اللہ! امام صاحب نے جو دعا مانگی ہے، اس کو قبول فرمائیں۔

اور بعض ائمہ کرام جہر پر عمل فرماتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سب پر اپنی کروڑوں رحمتیں نازل فرمائے۔

یہاں تو فرمایا: میں قریب ہوں۔ دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ﴾ [ق:۱۶] ہم اپنے بندے کے بہت زیادہ قریب ہیں جو اس کی شہ رگ ہے اس سے بھی زیادہ قریب ہیں۔ شہ رگ جس میں انسان کا سانس اور مدار زندگی ہے وہ ہر آدمی کے اندر ہے، باہر نکلی ہوئی نہیں ہے اس کے بغیر زندگی ممکن ہی نہیں ہے۔

ایک اور آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنْتُمْ ۚ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ﴾ [الحدید:۴] اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ ہیں، تم جدھر بھی ہو۔

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ اپنے بھائی کو لے کر فرعون کی طرف جاؤ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے

عرض کیا: یا اللہ! ہمیں ڈر ہے وہ بڑا ظالم ہے اس کے پاس قوت اور طاقت ہے اور میرے پاس تو ماسوائے تیری ذات کے سہارے کے کچھ بھی نہیں ہے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿لَا تَخَافَآ اِنَّنِيْ مَعَكُمَآ اَسْمَعُ وَاَرٰى﴾ [طٰہٰ: ۴۶] تمہیں ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں فرعون کو جا کر دعوتِ توحید دو میں تمہارے ساتھ ہوں سننے والا ہوں اور دیکھنے والا ہوں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں ایک اور مقام پر آیت آتی ہے کہ جب وہ بنی اسرائیل کے لشکر کو لے کر چل پڑے آگے دریا آ گیا اور پیچھے فرعون آ گیا قوم گھبرا کر کہنے لگی کہ ہم تو مارے گئے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا:

﴿كَلَّا ۚ اِنَّ مَعِيَ رَبِّيْ سَيَهْدِيْنِ﴾ [الشعراء: ۶۲]

میری قوم! مت ڈرو، میرا رب میرے ساتھ ہے، وہ مجھے راستہ دکھلائے گا۔

قرآن مقدس میں ایک اور مقام پر بھی آیا ہے کہ حضور ﷺ ہجرت والی رات غارِ ثور میں تشریف لے گئے اور سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ ساتھ تھے۔ اب قریش مکہ آپ کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے اس غار پر جا پہنچے جہاں آپ تشریف فرما تھے تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: اگر ہمیں دشمنوں نے دیکھ لیا تو کیا ہوگا تو اللہ تعالیٰ نے قرآن نازل فرمایا اور آپ ﷺ نے وہ آیات پڑھیں: ﴿لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا﴾ [التوبۃ: ۴۰] میرے مدنی! اپنے ساتھی سے کہہ دو کہ غم اور فکر نہ کرے، میں تم دونوں کے ساتھ ہوں۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی صحابیت کا انکار کفر ہے:

اس لیے علماء نے یہاں ایک مسئلہ بھی لکھا ہے کہ ''مَنْ أَنْكَرَ صُحْبَةَ أَبِيْ بَكْرٍ فَهُوَ كَافِرٌ'' جو آدمی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے صحابیٔ رسول ہونے کا انکار کرے تو وہ کافر ہے، کیونکہ ان کا صحابی ہونا قرآن کی آیت سے ثابت ہے۔ روافض بھی اس بات کا انکار نہیں کرتے اور انہوں نے یہ بات مان لی ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کے ساتھ تھے البتہ انہوں نے بغض باطن کی وجہ سے اس بات کو ایک اور رنگ دیا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن اس لیے اُتارا تھا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے وہاں (معاذ اللہ) شور مچانا شروع کر دیا تھا تاکہ مشرکین مکہ آواز سن لیں اور اللہ کے نبی کو پکڑ لیں۔

حالانکہ وہ یہ نہیں سوچتے کہ حضور پاک ﷺ مکہ سے مدینہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے جا رہے ہیں جب یہ سفر حکم خداوندی ہے تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو جو ساتھ لے کر جا رہے ہیں وہ بھی اللہ کا حکم ہے تو کیا (نعوذ باللہ) اللہ کو بھی پتہ

نہیں چلا؟ نبی کے ساتھ دشمن لگا دیا؟ تم اور تمہارے وڈیروں کو جہاں خطرہ ہو تو وفادار ملازم ساتھ رکھتے ہیں تو کیا اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کے لیے ایسا ساتھی چنا جو غارِ ثور میں شور کرنے لگ گیا؟

دوسری بات یہ ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ مکہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ گئے یا غار میں اکٹھے ہوئے؟ تو غار میں شور مچانے کی کیا ضرورت تھی؟ راستے میں شور کیوں نہیں کیا؟ تیسری بات کہ اس واقعہ کو چودہ سو سال گزر گئے بقول ان کے جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے شور مچایا تو کیا چودہ سو سال گزرنے کے بعد انہوں نے یہ شور سن لیا؟ لیکن جو چودہ سو سال پہلے وہاں موجود تھے انہوں نے یہ شور نہیں سنا؟ کیونکہ اگر انہوں نے شور سنا ہوتا تو وہ کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ دیتے؟

قرآن میں ایک جگہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: جب تم تین شخص سرگوشی کر رہے ہو تو چوتھا میں ہوتا ہوں اور جب تم پانچ لوگ سرگوشی کرتے ہو تو چھٹا میں ہوتا ہوں۔

ان آیات کو دیکھ کر بعض لوگوں نے یہ عقیدہ بنا لیا کہ اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے اللہ ہمارے قریب ہے انہوں نے کہا: بندہ عبادت کرتے کرتے اس مقام پر پہنچ جاتا ہے کہ اللہ اس کے اندر داخل ہو جاتا ہے یعنی حلول کر جاتا ہے اب وہ خود (معاذ اللہ) خدا بن جاتا ہے۔

حلولی فرقے:

یاد رکھیں! اس عقیدے کی بنیاد بھی یہود و نصاریٰ نے رکھی تھی، ان کے بعد یہ عقیدہ روافض میں آ گیا انہوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ (نعوذ باللہ) خود حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اندر حلول کر گئے۔ اب حضرت علی رضی اللہ عنہ صرف علی نہیں، بلکہ مولا علی ہیں اور یہ بات ان کی کتابوں میں موجود ہے۔

حالانکہ ایک دفعہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سامنے تیس چالیس آدمیوں کا وفد لایا گیا جو یہ عقیدہ رکھتا تھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ میں (نعوذ باللہ) خدا حلول کر گیا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کو بلایا اور ان سے پوچھا کہ تم میرے بارے میں کیا عقیدہ رکھتے ہو؟ انہوں نے کہا: آپ خدا ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حکم دیا کہ ان کو جیل میں ڈال دو، بھوکے پیاسے پڑے رہیں، اگر یہ توبہ کریں تو ان کو چھوڑ دو اور اگر توبہ نہ کریں تو میرے سامنے پیش کر دو۔ تین دن کے بعد پھر ان سے پوچھا گیا تو انہوں نے کہا: آپ خدا ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حکم دیا کہ ان کو قتل کر کے آگ میں جلا دو۔ جب

ان کو لے جانے لگے تو آپ نے سمجھا شاید یہ ڈر گئے۔ آپ نے پوچھا: اب تمہارا کیا عقیدہ ہے؟ انہوں نے کہا: پہلے تو کچھ شک تھا، اب تو پکا یقین ہو گیا کہ آپ خدا ہیں، کیونکہ آگ کا عذاب خدا دیتا ہے، خدا کے سوا اور کوئی نہیں دے سکتا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کو قتل کرنے اور جلانے کا حکم دیا۔

جب یہ عقیدہ ان لوگوں سے آگے پھیلا تو بعض لوگوں میں اس عقیدے نے جگہ بنائی کہ حضرت منصور حلاج کو جب سولی پر چڑھایا گیا اور وہ "أنا الحق" کہہ رہے تھے تو بعض لوگوں نے کہنا شروع کر دیا وہ ظاہر میں منصور تھا لیکن اندر سے خدا تھا۔

اس سے آگے بڑھ کر بعض جاہلوں نے کہہ دیا کہ ہمارا ایمان ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا لباس بشر والا ہے، لیکن اندر سے وہ خود خدا ہیں۔

خدا کے پلّے میں وحدت کے سوا کیا ہے
جو کچھ میں نے لینا ہے لے لوں گا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے

اور اس طرح انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی خدا بنا دیا اور اس سے آگے بڑھ کر کہہ دیا کہ میرا پیر و مرشد ذی تصرف ہے، سب دنیا کا نظام اس کے ہاتھ میں ہے۔ اللہ میاں چھٹی پر ہیں (نعوذ باللہ) اس طرح وہ آگے بڑھے اور مسلمانوں کو دھوکہ دینے کے لیے ان آیات کا سہارا لیا کہ خدا خود کہتا ہے میں قریب ہوں، میں شہ رگ سے بھی قریب ہوں، شہ رگ اندر ہے تو اس کا مطلب ہے خدا اندر ہے۔ ان وہابیوں کو تو قرآن سمجھ نہیں آتا تو یہاں سے حلول کے مسائل نکلے اور اس طرح انہوں نے لوگوں کو گمراہ کر دیا اور خود بھی گمراہ ہوئے۔

معیتِ خداوندی کا معنی:

اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہونے کا کیا معنی ہے؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے موسیٰ و ہارون! میں تم دونوں کوئی خوف نہ کرو، میں تم دونوں کے ساتھ ہوں اور آگے ساتھ ہونے کی وضاحت کر دی کہ میں سننے والا اور دیکھنے والا ہوں یعنی میرا علم اتنا وسیع اور اتنا محیط ہے کہ کوئی چیز میرے علم سے باہر نہیں ہے۔ ہر چیز میرے علم میں اور میرے سامنے ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے جہاں فرمایا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں اس سے اللہ کی معیت علمی مراد ہے کہ اللہ کا علم اتنا کامل ہے کہ کوئی چیز اس کے احاطۂ علم سے باہر نہیں ہے۔ اور آدمی جو چیز جانتا ہو وہ قریب ہوتی

ہے اور جس کا علم نہ ہو وہ دور ہوتی ہے۔ کائنات کا ذرّہ ذرّہ اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے، اس لیے فرمایا: ﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يَخْفَىٰ عَلَيْهِ شَيْءٌ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ﴾ [آل عمران:۵] اور فرمایا: ﴿اللَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّومُ ۚ لَا تَأْخُذُهُ سِنَةٌ وَلَا نَوْمٌ ۚ لَّهُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ۗ مَن ذَا الَّذِي يَشْفَعُ عِندَهُ إِلَّا بِإِذْنِهِ ۚ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۖ وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهِ إِلَّا بِمَا شَاءَ ۚ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ ۖ وَلَا يَئُودُهُ حِفْظُهُمَا ۚ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيمُ﴾ [البقرۃ:۲۵۵] تو یہ معیت علمی ہے لہٰذا اگر عقیدہ رکھا جائے خدا نبی میں ہے تو کیا ایک نبی میں ہے یا ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء میں ہے؟ اگر ایک میں ہے تو باقیوں نے کیا گناہ کیا ہے؟ اور اگر سب میں ہے تو ﴿وَإِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ ۖ لَّا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ الرَّحْمَٰنُ الرَّحِيمُ﴾ [البقرۃ:۱۶۳] اور ﴿قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ﴾ [الاخلاص:۱] کہ اللہ تعالیٰ کی ذات ﴿أَحَدٌ﴾ ہے، ﴿الصَّمَدُ﴾ ہے، ﴿لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ﴾ ہے اور اگر (معاذ اللہ) اللہ تعالیٰ ہر بندے میں حلول کرتے ہیں تو کیا اس کے پیدا ہونے کے بعد حلول کرتے ہیں یا اس سے پہلے حلول کرتے ہیں؟ اس لیے کوئی عقل کی بات کرو اللہ تعالیٰ نے ہمیں سمجھنے کے لیے عقل دی ہے اللہ تعالیٰ نے ہمیں حق اور باطل کے سمجھنے کے لیے سیدھے راستے دیئے ہیں۔ جب خدا خود اندر ہو تو کیا بھوک لگ سکتی ہے؟ کیونکہ اللہ تعالیٰ تو کھانے پینے سے پاک ہے اور پیر صاحب تو کھاتے بھی ہیں اور پیتے بھی ہیں۔ جب حضرت کا کوئی بچہ قرار پکڑے گا تو اس کے اندر کیا ہوگا؟

﴿أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ ۖ فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي وَلْيُؤْمِنُوا بِي لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُونَ﴾ [البقرۃ:۱۸۶] دوسرا مسئلہ بھی حل ہو گیا۔ لوگ کہتے ہیں کہ جب بادشاہ کے پاس جانا ہو تو آدمی پہلے سیکرٹری کو، وزیر کو ملتا ہے یا کسی افسر کو ملنا ہو تو پہلے چپڑاسی کو ملتا ہے پھر اجازت ملتی ہے اور بندہ پہنچتا ہے۔ جب بندے تک پہنچنے کے لیے سیڑھیوں کی ضرورت ہے تو ہم خدا تک بلا واسطہ کیسے پہنچ سکتے ہیں؟ ہم بھی ان کے پیاروں کے پاس جاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تمہیں سیڑھیوں کی ضرورت تو اس وقت ہو کہ جب میں دور ہوں جبکہ میں تمہارے قریب ہوں۔ اگر کوئی کہے اللہ میاں! آپ تو اپنے پیاروں کی سنتے ہیں، گناہ گاروں کی کہاں سنتے ہیں؟ اللہ نے فرمایا: میں تو ہر پکارنے والے کی پکار سنتا ہوں جب بھی مجھے پکارے، پکارنے والا گناہ گار ہو تب بھی میں سنتا ہوں، پکارنے والا نیکوکار ہو تب بھی میں سنتا ہوں۔ شیطان نے کہا: اللہ میاں! مہلت دے دو، اللہ تعالیٰ نے اس کو مہلت دے دی۔ اللہ شیطان کی سن لیتا ہے تو کیا ہماری نہیں سنتا؟ ﴿فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي وَلْيُؤْمِنُوا بِي لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُونَ﴾ جب قریب میں ہوں اور تیری پکار کو

سننے والا بھی میں ہوں تو اب تجھ پر لازم ہے کہ تُو میری اطاعت کر، میری فرمانبرداری کر۔ تُو ان کے حکم پر کیوں چلتا ہے جو تیری سنتے بھی نہیں ہیں، تیری مدد بھی نہیں کرتے اور جو ذرّے کے برابر بھی کسی چیز کے مالک نہیں ہیں؟

دعائیں قبول کیوں نہیں ہوتیں؟

اگر دعا شریعت کے مطابق ہو اور انتہائی تضرع وزاری اور یقین کے ساتھ ہو کہ میں جو اللہ سے مانگ رہا ہوں مجھے ضرور ملے گا۔ جب ہم مانگتے ہیں تو اللہ وہ دے دیتے ہیں یا کبھی ہم جو دعا مانگتے ہیں وہ چیز تو نہیں ملتی لیکن ایک بہت بڑی مصیبت آرہی ہوتی ہے اللہ تعالیٰ اس دعا کے بدلے اس کو ٹال دیتے ہیں اور ہمیں پتہ بھی نہیں ہوتا۔ تیسری صورت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: میرے بندے کی دعا روک دو، تاکہ اس کا بدلہ قیامت کے دن دوں۔

حدیث مبارک میں ہے کہ جب قیامت کا دن آئے گا اور آدمی کو دعاؤں کا بدلہ ملے گا تو وہ بندہ خوش ہو کر کہے گا:

اے اللہ تعالیٰ! اگر مجھے پتہ ہوتا تو میں وہاں یہی دعا کرتا کہ اللہ تعالیٰ مجھے دنیا میں کچھ نہ دو اور سب ادھر ہی دے دو۔

دعا کے لئے ضروری ہے کہ غافل دل سے نہ ہو کہ خود کو بھی پتہ نہ ہو کہ میں کیا مانگ رہا ہوں۔ جب بھی دعا مانگو تو دل، ذہن، فکر سب اس کی طرف متوجہ ہوں تاکہ بندے کو معلوم ہو کہ میں اپنے اللہ پاک سے کیا مانگ رہا ہوں۔

دعا مانگنے میں یہ نہ کہو کہ بڑی مدت ہوگئی ہماری دعا منظور نہیں ہوئی، پتہ نہیں کیا بات ہے؟ حضور ﷺ نے فرمایا: تم مایوس ہونا شروع نہ ہو جاؤ، کیونکہ مایوس ہونا کافروں کی عادت ہے، اللہ کے مومن بندے کبھی نا اُمید نہیں ہوتے۔

باقی یہ بات کہ ہماری دعا جلدی منظور نہیں ہوتی، یہ اللہ تعالیٰ کی مرضی ہے، بعض انبیاء کرام ستر سال دعائیں مانگتے رہے تب جا کر ان کی دعا منظور ہوئی۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کی آنکھیں حضرت یوسف علیہ السلام کے فراق میں سفید پڑ گئیں لیکن کافی عرصہ کے بعد جا کر دعا منظور ہوئی۔ اس لیے یہ کہنا کہ میں نے دعا مانگی تھی اور منظور نہیں ہوئی، یہ باتیں بندوں کو زیب نہیں دیتیں۔

آخری بات حضور ﷺ کا فرمان ہے کہ جب بندے کا کھانا حرام سے ہو، کپڑے حرام سے ہوں، پینا حرام سے ہو، اس کے بدن میں جو گوشت پروان چڑھ رہا ہے وہ بھی حرام سے ہو تو پھر دعائیں منظور نہیں ہوں گی۔ بڑا چیخو گے کہ یا رب یا رب! لیکن کہاں سے تمہاری دعائیں سنی جائیں گی؟

چاروں ائمہ کرام سے پوچھ لیں کہ ہمارے ہاں جو رواج ہے کہ باغ بیچتے ہیں ابھی بور لگتا ہے اور باغ بک

جاتے ہیں اور بعض باغ پانچ پانچ سال پیشگی بکے ہوئے ہیں حالانکہ یہ شریعت میں حرام ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: کوئی پھل اس وقت تک نہیں بیچا جا سکتا جب تک کہ وہ تیار نہ ہو جائے اس وقت تک بیچنا حرام ہے۔ اب اس باغ کا پھل جس کو پیشگی لے لیا تھا جہاں بھی بکے گا تم لاکھ خریدو گے وہ حلال نہیں ہے، اس کا مطلب ہوا کہ اگر خنزیر کا گوشت یہودی بیچے تو حرام ہے اور اگر مسلمان بیچے تو کیا حلال ہو جائے گا؟ حالانکہ حرام تو حرام رہے گا چاہے کتنے ہاتھ بدل جائیں۔ تو اب آپ کیسے تقویٰ اختیار کریں گے؟

پہلے زمانہ میں تو یہ عالم تھا کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے ایک آدمی نے کہا کہ میری بکری چوری ہو گئی۔ امام صاحب نے اپنے نوکروں سے کہا کہ خبردار! باہر سے کوئی بکری کا گوشت نہ خریدے۔ ہو سکتا ہے وہ چوری والی بکری بکنے کے لئے آجائے اور ہم کھالیں۔

ایک کافر کی پکار پر اللہ کی طرف سے جواب:

روایات اسرائیلیہ میں ایک واقعہ ہے کہ ایک کافر اپنے بت کا وظیفہ پڑھ رہا تھا، زبان سے غلطی سے "یاصنم" کی جگہ "یاصمد" نکل گیا تو اللہ نے فوراً فرمایا: مانگو بندے! کیا مانگتے ہو؟ ملائکہ نے عرض کیا: اے اللہ! یہ بدبخت کافر ہے، اس نے آپ کو تو نہیں پکارا۔ اللہ نے فرمایا: میں جانتا ہوں، میرے آگے کچھ نہیں چھپا ہوا۔ یہ جھوٹے کو پکارے، جواب نہ ملے اور سچے کو پکارے، جواب نہ ملے تو جھوٹے اور سچے میں کیا فرق رہ جائے گا؟

ایک کلمہ جو جنت کے خزانوں میں سے ایک ہے:

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم ایک غزوہ میں شریک تھے۔ ہم جب کسی اونچائی پر چڑھتے یا کسی وادی میں اُترتے تو ہم زور زور سے اللہ اکبر اللہ اکبر کے نعرے لگاتے، ہم یہی کرتے جا رہے تھے حضور ﷺ ہمارے قریب آئے اور فرمایا:

"أَيُّهَا النَّاسُ! ارْبَعُوا عَلَى أَنْفُسِكُمْ فَإِنَّكُمْ لَا تَدْعُونَ أَصَمَّ وَ لَا غَائِبًا، إِنَّمَا تَدْعُونَ سَمِيْعًا بَصِيْرًا، إِنَّ الَّذِي تَدْعُونَ أَقْرَبُ إِلَى أَحَدِكُمْ مِنْ عُنُقِ رَاحِلَتِهِ، يَا عَبْدَاللهِ بْنَ قَيْسٍ! أَلَا أُعَلِّمُكَ عَلَى كَلِمَةٍ هِيَ مِنْ كُنُوزِ الْجَنَّةِ لَا حَوْلَ وَ لَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللهِ." [السنن الکبریٰ للنسائی، رقم: ۷۶۸۰]

اے لوگو! اپنی جانوں پر رحم کرو، اپنی جانوں پر نرمی کرو، تم ایسی ذات کو نہیں پکار رہے ہو جو بہری ہو یا نہ دیکھنے

والی ہو، تم تو اس ذات کو پکار رہے ہو جو سننے والا بھی ہے اور دیکھنے والا بھی ہے، آہستہ آہستہ کہو، زور سے نہ کہو۔ تم جس اونٹنی پر سوار ہو اللہ پاک تو اس سے بھی زیادہ تمہارے قریب ہے تو زور لگانے کی کیا ضرورت ہے؟ اور آپ ﷺ نے فرمایا: اے عبداللہ بن قیس! کیا میں آپ کو جنت کے خزانوں میں سے ایسا کلمہ نہ بتاؤں جو جنت کا خزانہ ہے؟ صحابی نے عرض کیا: جی ہاں یا رسول اللہ! آپ ﷺ نے فرمایا: ''لَا حَوْلَ وَ لَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ'' یہ جنت کے خزانوں میں سے ہے۔

دعا کی قبولیت کا ایک راز:

ایک حدیث مبارک میں یہ بھی آیا ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:

''إِنَّ اللّٰهَ يَقُولُ: أَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِي بِي وَ أَنَا مَعَهُ إِذَا دَعَانِي.'' [صحیح مسلم، رقم: ۲۶۷۵]

اللہ پاک فرماتے ہیں کہ میں اپنے بندے کے گمان کے پاس ہوں جب وہ مجھے پکارے تو میں اس کے ساتھ ہوتا ہوں۔

معنی یہ ہے کہ جیسے بندہ اپنے اللہ کے ساتھ یقین رکھتا ہے اور اپنا رجحان رکھتا ہے اللہ پاک بھی اسی طرح اس کے ساتھ معاملہ کرتے ہیں کیونکہ اللہ غنی ہیں اور ساری دنیا اس کی محتاج ہے تو جب اللہ تبارک وتعالیٰ سے آپ کو رجاء کامل اور اُمید کامل نہ ہو تو اللہ تعالیٰ کو کیا ضرورت ہے؟

دوسرا فرمایا کہ ''أَنَا مَعَهُ'' میں اس کے ساتھ ہوں یعنی معیت علمیہ یعنی جب بھی وہ مجھے یاد کرے جب بھی مجھے پکارے میں اپنے بندے کی پکار کو سنتا ہوں۔ فرق صرف یہی ہوتا ہے کہ پکارنے والے نے کتنے اخلاص سے پکارا ہے اور پکارنے والے نے کتنے صحیح طریقے سے پکارا ہے۔ اب دیکھیں ہم اس کے کتنے فرمانبردار ہیں کیا ہم واقعی اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار ہیں؟ اگر ہیں تو ٹھیک ہے وہ ہماری ہر بات کو سنیں گے اور ہماری ہر بات کو قبول بھی فرمائیں گے اور اگر ہم سر سے لے کر پاؤں تک اللہ پاک کے احکام کے نافرمان ہیں تو پھر تو اس کا کرم ہے کہ کبھی سن لی اور کبھی نہ سنی، کبھی دے دیا اور کبھی نہ دیا، ورنہ ہمارا حق تو کسی طرح بھی نہیں بنتا۔

پس آپ ایک اصولی بات کو یاد رکھیں کہ اگر آپ اپنے نافرمان بیٹے کو نہیں دیتے تو وہاں تو مسئلہ ہی بندے کا ہے کہ تم اس کے بندے اور اس کی مخلوق ہو اور وہ خالق ہے، تم اس کے مملوک، اس کے غلام ہو اور وہ تمہارا مالک ہے۔ مالک اور غلام کا تو معاملہ ہی علیحدہ ہوا کرتا ہے تو اگر بیٹا بھی نافرمان ہے، بیوی بھی نافرمان ہے، شاگرد بھی نافرمان

ہے اور وہ آپ سے ایک ریال بھی مانگے تو آپ کو گولی لگتی ہے کہ کیا کرتے ہو کیوں مانگتے ہو بیس باتیں آپ اسے سنا دیتے ہو اور کبھی کبھی دے بھی دیتے ہو تو جب ہم اپنے اللہ تعالیٰ کے آگے ہاتھ پھیلاتے ہیں تو سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ یہ ہاتھ جو ہم نے اُٹھائے ہیں تو کیا یہ اللہ تعالیٰ کی بندگی میں لگے رہتے ہیں؟ کیا یہ گناہ میں تو نہیں لگتے؟ کیا ہمارا چہرہ ہماری صورت ہماری شکل اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق ہے؟ کیا ہمارا کھانا پینا، ہمارا لباس، ہمارا اُٹھنا بیٹھنا، ہماری زندگی اللہ تعالیٰ کے فرمان کے مطابق ہے؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں نے تمہیں اپنی عبادت کے لیے پیدا فرمایا تو کیا ہم اتنی عبادت کرتے ہیں؟ جس سے ہمارا اللہ راضی ہو جائے، ہم کم از کم فرائض ادا کرتے ہیں؟ تو جب ہمارا سر سے پاؤں تک معاملہ نافرمانی کا ہو اور مطالبہ یہ ہو کہ جب ہم مانگیں ہمیں مل جائے تو پھر خود سوچیں کہ تم کیا کہہ رہے ہو کیا مانگ رہے ہو۔ اس کے مقابلے میں آپ دیکھ لیں کہ جتنے انبیاء وصالحین اور اولیاء اللہ گزرے ہیں انہوں نے مانگا تو اللہ تعالیٰ نے دے دیا۔ اگر کبھی انبیاء علیہم السلام کی دعاؤں میں دیر لگی ہے تو اس میں بھی حکمتیں تھیں کہ کبھی جلال کا بھی اظہار ہوتا ہے کبھی اس کی عظمت، حکمت اور ہیبت کا اظہار ہوتا ہے کہ میں کوئی محتاج تو نہیں ہوں کہ جو بھی وہ مانگیں ہر شکل میں مجھے دینا پڑے میری مرضی ان کی دعا اس وقت قبول کروں یا دیر سے قبول کروں یا اس کو آخرت کے لیے ذخیرہ رکھ دوں۔ آدمی جب اللہ تعالیٰ سے مانگے تو مانگنے والا بھی تو سوچے کہ کیا میرا معاملہ اپنے رب کے ساتھ صاف ہے؟

دنیا میں آپ اپنے معاملات کو دیکھ لیں کہ مثلاً کوئی آدمی آپ کو ملازم رکھتا ہے اور مثلاً ۲۰۰۰ ریال دیتا ہے آپ پورا مہینہ غائب رہیں اور مہینہ گزرنے کے بعد یکم تاریخ آ جائے تو آپ پورے مہینے کی تنخواہ لینے آ جائیں دفتر والے پوچھیں کہ کیا بات ہے جی؟ آپ کہیں کہ جناب تنخواہ چاہیے وہ کہے گا کہ بڑے بدبخت آدمی ہو پورا مہینہ تو دفتر میں آئے نہیں کوئی کام بھی نہیں اور تنخواہ لینے بھی آ گئے ہو؟ تو جب تم اللہ کے حضور ہاتھ اُٹھاؤ تو ذرا سوچ لیا کرو کہ آج میں نے کتنے جھوٹ بولے ہیں جس زبان سے میں کلمہ پڑھتا ہوں اس زبان سے کتنی گالیاں دی ہیں کتنے لوگوں کا میں نے گلہ شکوہ کیا ہے، کتنی غیبت کی ہے، کتنے لوگوں کو میں نے برا کہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جو مجھے آنکھیں دی ہیں ان سے میں نے کتنی مرتبہ قرآن دیکھا ہے یا لوگوں کی بیٹیوں کو دیکھتا رہا ہوں اللہ تعالیٰ نے جو پاؤں چلنے کے لئے دیئے ہیں ان سے چل کر میں مسجد کی طرف گیا تھا یا گناہوں کی طرف گیا تھا۔ اس لیے مانگتے ہوئے آدمی ذرا اپنے اوپر تجزیہ کر لے، غور و فکر کر لے جب تجزیہ کر لیتا ہے تو پھر اعتراف ذنب کی شکل آتی ہے کہ میں گناہگار ہوں اور

جب اعتراف آتا ہے تو وہ رحیم وکریم ہے معاف بھی کر دیتا ہے اس لئے فرمایا کہ مجھے جب پکارو تو میں ساتھ ہوں۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے آقا سرکار مدینہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے، فرماتے ہیں:

"قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى: أَنَا مَعَ عَبْدِي حَيْثُمَا ذَكَرَنِي وَ تَحَرَّكَتْ بِي شَفَتَاهُ."

[صحیح بخاری، بَابُ قَوْلِ اللّٰهِ تَعَالٰى: "لَا تُحَرِّكْ بِهِ لِسَانَكَ"]

میں اپنے بندے کے ساتھ ہوں جب میرا بندہ مجھے یاد کرتا ہے تو میں اس کے ساتھ ہوتا ہوں جب وہ اپنے ہونٹ ہلاتا ہے مجھ سے مانگتا ہے تو میں اس کے ساتھ ہوں میں اس کی ہر ضرورت کو پورا کرنے والا ہوں اس کی ہر بات کو سننے والا ہوں۔ اس لیے خدا فرماتے ہیں: ﴿فَاذْكُرُونِيٓ أَذْكُرْكُمْ﴾ [البقرۃ:۱۵۲] میرے بندو! تم مجھے یاد کرو، تاکہ میں تمہیں یاد کروں۔

ایک اور حدیث مبارک میں آتا ہے کہ میرے بندو! جب تم مجھے علیحدہ یاد کرتے ہو تو میں بھی تمہیں علیحدگی میں یاد کرتا ہوں اور جب تم مجھے کسی جماعت میں یاد کرتے ہو تو میں تم سے بہتر جماعت ملائکہ کی جماعت میں تمہیں یاد کرتا ہوں اور اللہ پاک نے فرمایا: ﴿وَاشْكُرُوا لِي﴾ میرا شکر کرو، ﴿وَلَا تَكْفُرُونِ﴾ [البقرۃ:۱۵۲] اور میری نعمتوں کا کفر نہ کرو۔

شکر اور کفر کی تفسیر:

شکر کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ پر ایمان لے آؤ، اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرو، اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کرو، اللہ تعالیٰ نے جتنے تمہیں اعضاء دیئے ہیں اللہ کے کام میں لگاؤ، اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے ان کو بچاؤ۔ یہ معنی ہوتا ہے شکر کا۔

شکر کا معنی یہ نہیں ہوتا کہ زبان سے کہتا رہے اللہ میاں! تیرا شکر ہے ویسے میں نماز تو نہیں پڑھتا، لیکن تیرا بڑا شکر ہے اور روزہ بھی کبھی کبھی میں رکھتا ہوں، سال میں ایک آدھ روزہ رکھ لیتا ہوں لیکن تیرا بڑا شکر ہے تیرا لاکھ شکر ہے۔ سارا دن میں سود کھاتا ہوں، حرام کھاتا ہوں لیکن تیرا لاکھ شکر ہے کہ تُو نے بہت کچھ ہمیں دیا ہے، بڑا رشوت کا دور دورہ ہے، ٹھیک ٹھاک پیسے بچ رہے ہیں تیرا شکر ہے۔ یہ شکر نہیں، کفر ہے۔

شکر کا معنی یہ ہے: ﴿إِمَّا شَاكِرًا وَإِمَّا كَفُورًا ۝٣﴾ [الدھر:۳] اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میرے شکر گزار بندے وہ ہیں جو



مجھ پر ایمان لے آتے ہیں اور جو ایمان نہیں لاتا وہ شکر گزار بھی نہیں ہوتا اور شکر یہ ہے کہ اللہ پاک فرماتے ہیں کہ جو چیزیں میں نے تمہیں دی ہیں وہ میری فرمانبرداری میں خرچ کرو جو میں نے تمہیں عقل دی، تمہیں دماغ دیا، تمہیں قلم دیا، تمہیں زبان دی، تمہیں پاؤں چلنے کے لیے دیئے ان سب کو میری فرمانبرداری میں لگا دو یہ ہے شکر۔ اب اس کے بعد زبان سے بھی کہو:

''اَلْحَمْدُلِلّٰہِ، سُبْحَانَ اللّٰہِ وَ بِحَمْدِہٖ سُبْحَانَ اللّٰہِ الْعَظِیْمِ.''

ورنہ صرف زبان سے شکر کرے اور دل سے کفر کرے، زبان سے شکر کرے اور اعضاء سے کفر کرے تو یہ شکر نہیں ہوتا، بلکہ ناشکری ہوتی ہے اور استہزاء ہوتا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے عذاب کو دعوت دینا ہوتا ہے۔ جیسے آپ نے دیکھا ہوگا کہ لوگ رشوت کے پیسے لے کر بڑی بڑی کوٹھیاں بنا دیتے ہیں، سود کے پیسے لے کر بڑی بڑی کوٹھیاں بنا لیتے ہیں، سمگلنگ اور منشیات کے پیسوں سے بڑی بڑی کوٹھیاں بنا کر اس کے اوپر لکھتے ہیں: ''ھٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّیْ'' کہ میں نے جو یہ حرام کمایا ہے کیا یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے؟

یہ اللہ تعالیٰ کے عذاب کو دعوت دینا ہے کہ ایک تو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرو اور دوسرا کہو کہ یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے جی، اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ مجھ کو ایسی کرسی پر بٹھایا ہے کہ پیسے ملتے ہیں۔ تجھ پر اللہ تعالیٰ کا فضل نہیں ہے تم جوتیاں چٹخاتے پھر رہے ہو حالانکہ یہ نہیں سمجھتے کہ اصل فضل اس پر ہے جو حرام سے بچا ہوا ہے، اصل فضل یہ ہے کہ اس کے پاس ایک وقت کا کھانا ہے اور دوسرے وقت کا کھانا نہیں ہے، لیکن کبھی پیٹ میں حرام کا لقمہ نہیں جانے دیا۔ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو حرام سے بچایا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو گناہوں سے اور اپنی نافرمانی سے بچایا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے۔

اُصولی بات یہ ہے کہ اگر آپ کا کوئی بہت ہی پیارا دوست ہو تو کیا آپ یہ گوارا کریں گے کہ اس کو کسی گندے کام میں لگا دیں؟ دیکھیں کہ آپ کا کوئی بہت ہی گہرا دوست ہو وہ آپ کے گھر میں آئے تو آپ اسے حمام میں سلائیں گے یا بیڈ روم میں سلائیں گے؟ آپ اسے گندی جگہ پر سلائیں گے یا اچھی جگہ پر سلائیں گے؟ یہ عقل کی بات ہے تو اگر خدا کا بندہ اس کا محبوب ہو اور وہ حرام کمانے میں لگا ہوا ہو تو سمجھ آ گئی کہ اللہ تعالیٰ نے اسے ٹھکرا دیا ہے اسی لیے تو اللہ تعالیٰ نے اسے گندے کاموں میں لگا دیا ہے کہ تم اسی لائق ہو، اسی میں پڑے رہو۔ اب ایک آدمی بیچارہ بڑی غربت میں ہے، فاقہ میں ہے، بڑی تنگدستی میں ہے، لیکن اس کے پیٹ میں حرام نہیں گیا تو سمجھو کہ مالک

اس سے راضی ہے، اس کو گندی چیزوں سے پیٹ کو ناپاک کرنے کی توفیق نہیں دے رہا۔ یہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی حکمتیں ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے فرمان کو سمجھیں، ﴿إِنَّ اللَّهَ مَعَ الَّذِينَ اتَّقَوا وَّالَّذِينَ هُم مُّحْسِنُونَ﴾ [النحل:۱۲۸] اللہ پاک فرماتے ہیں کہ میں ان لوگوں کے ساتھ ہوں جو مجھ سے ڈرنے والے ہیں اور جو اچھا کام کرنے والے ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام سے ارشاد فرمایا:

﴿لَا تَخَافَا إِنَّنِي مَعَكُمَا أَسْمَعُ وَأَرَىٰ﴾ [طٰہٰ:۴۶]

تم مت ڈرو، میں تم دونوں کے ساتھ ہوں، میں سنتا ہوں اور دیکھتا ہوں۔

یعنی معیت علمی مراد ہے۔ اس آیت سے ہمیں یہ خلاصہ ملا کہ اللہ پاک پکارنے والے کو نامراد نہیں کرتے، ناامید نہیں کرتے، اس کی پکار کو سنتے ہیں اور اللہ تبارک وتعالیٰ جانتے ہیں، اللہ تعالیٰ کے آگے کوئی چیز چھپی ہوئی نہیں ہے اور اس کی شان یہ ہے کہ ہمارے کروڑوں اربوں بندے دعا مانگیں تو یہ نہیں ہے کہ وہ کسی کی دعا کو نہ سن سکے۔ آپ دیکھیں کہ دنیا میں بڑے سے بڑا آدمی ہو تو بیس آدمی اس کو پکاریں گے تو اس کو ایک کی سنائی دے گی اور دس کی نہیں سنائی دے گی۔ فرمایا کہ ساری کائنات مجھے پکارے تو میں سب کی پکار سنتا ہوں، سب کی پکار کو جانتا ہوں، سب کی پکار کو سمجھتا ہوں اور سب کی امیدیں پوری بھی کرتا ہوں۔ آپ نے کعبہ شریف میں نہیں دیکھا کہ کوئی فارسی میں مانگ رہا ہے، کوئی عربی میں، کوئی امریکی زبان میں، کوئی انگریزی میں، کوئی ہندی میں، کوئی سندھی میں، کوئی برمی میں، سب اپنی اپنی بولیاں بول رہے ہیں اور مالک سب کی سمجھ رہا ہے، سب کی سن رہا ہے اور سب کی فریادیں جان رہا ہے۔

اس کے بعد مفسر رحمہ اللہ حدیث لائے ہیں کہ حدیث پاک میں آتا ہے، حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''إِنَّ اللهَ لَيَسْتَحْيِيْ أَنْ يَّبْسُطَ الْعَبْدُ إِلَيْهِ يَدَيْهِ يَسْأَلُهُ فِيْهِمَا خَيْرًا فَيَرُدَّهُمَا، خَائِبَتَيْنِ.''

[تفسیر ابن کثیر:۲/۱۰۷]

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ مجھے حیاء آتی ہے کہ میرا بندہ میرے سامنے ہاتھ پھیلائے، میرے سامنے سوال کرے اور میں اس کو اسی طرح نامراد ہاتھ لوٹادوں میری رحمت کے خلاف ہے میری رحمت ہے کہ میں رحیم ہوں، میں کریم

ہوں، میں پکارنے والے کو اپنے دروازے پر ہاتھ پھیلانے والے کو کچھ نہ کچھ دے دیتا ہوں خالی ہاتھ نہیں لوٹاتا۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کی یہی تو شان کرم ہے ورنہ ہم تو اپنے اعمال کے حوالے سے اس مقام پر پہنچ گئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ معاف فرمائے کہ اگر ہم حضور اکرم ﷺ کی امت نہ ہوتے تو شاید عذاب خسف (زمین میں غرق ہونا) آچکا ہوتا کہ پوری امت غرق ہو چکی ہوتی یا عذاب مسخ آچکا ہوتا کہ شکلیں تبدیل ہو چکی ہوتیں۔ یہ اس امت پر اللہ تعالیٰ کی رحمتیں ہیں کہ ہمارے بڑے کروڑوں گناہ ہیں لیکن پھر بھی وہ ہمیں مہلت دیتا ہے پھر بھی وہ ہمیں معافی دیتا ہے پھر بھی وہ ہمیں مانگنے کی گنجائش دیتا ہے یہ کتنی بڑی نعمت ہے۔

حدیث مبارک میں آتا ہے کہ ایک بندے کے دل میں خیال آیا کہ (نعوذ باللہ) آج میں برائی کروں گا تو اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ میرے بندے کے دل میں خیال ہے ارادہ ہے نہ لکھو کہ اگر وہ اس برائی پر عمل کرے تو پھر بھی ایک لکھو اور بندے کے دل میں خیال آیا کہ آج تو بھئی! درس کے بعد ان شاء اللہ طواف کریں گے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میرے بندے نے نیکی کا ارادہ کیا ہے چاہے اس نے نہیں کی مگر تم لکھ لو اور جب وہ میرا بندہ نیکی کرے تو اس کے بعد دس گنا لکھ دو، اور اگر وہ مسجد حرام میں نیکی کرے تو ایک کا بدلہ ایک لاکھ لکھ دو۔ اللہ نہ کرے اللہ نہ کرے بندے نے گناہ کیا تو دو فرشتے ہیں، ایک ہمارے یمین میں ہے اور ایک ہمارے شمال میں ہے، جو یمین میں ہے اس کے ذمہ ہے کہ وہ ہماری حسنات کو لکھتا جائے اور جو ہمارے شمال میں ہے اس کے ذمہ ہے کہ وہ ہماری برائیاں لکھتا جائے تو جب ہم سے کوئی برائی یا گناہ ہوتا ہے تو فرشتہ اس کو لکھنا چاہتا ہے تو دائیں والا اس کو کہتا ہے کہ ٹھہرو ٹھہرو، ابھی لکھنے میں جلدی نہ کرو، کیا پتہ وہ توبہ کر لے تو توبہ بھی لکھ دو اور اللہ تعالیٰ معافی دے دے اس کو ذرا مہلت تو دو یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہمارے ساتھ کتنا رحم کا معاملہ فرمایا ہوا ہے۔ پھر آپ دیکھیں کہ ستر سال سے کوئی بندہ شرک میں مبتلا ہے، زنا میں مبتلا ہے، شراب میں مبتلا ہے، حرام میں مبتلا ہے، ستر سال کے بعد دل میں خیال آیا کہ میں کیا کر رہا ہوں، میں تو بڑی غلطی میں ہوں، اب ذرا سر سجدہ میں ڈال کر رو پڑا تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تو نے توبہ کی، میں نے تیرے ستر سال کے گناہ معاف کر دیئے، ستر سال کا شرک میں نے معاف کر دیا، تم نے میرے خلاف ستر سال بغاوت کی، میرے سوا تم غیروں کو پکارتے رہے ہو، میرے سوا تم غیروں کے لیے نذریں نیازیں منتیں چڑھاتے رہے ہو، میرے سوا تم غیروں سے سوال کرتے رہے، اولادیں مانگتے رہے، تم ان کو نفع نقصان کا مالک سمجھتے رہے، لیکن تم نے ایک مرتبہ بھی توبہ کی ہے تو میں نے ستر سال کے گناہ معاف کر دیئے ہیں۔ اب اتنی بڑی

رحمت کا دروازہ بھی کھلا ہوا ہے اور اس کے بعد بھی ہم لوگ ہدایت حاصل نہ کرسکیں تو ہماری بدقسمتی ہے، پھر ہماری محرومی ہے کہ جیسے دریا کسی کے گھر کے سامنے بہہ رہا ہو پھر بھی وہ ہاتھ منہ نہ دھوئے اور گندگی میں پڑا رہے تو یہ اپنی ہی بدنصیبی ہے۔

اب دیکھیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں دنیا میں کتنے مواقع عطا فرمائے ہیں کہ غریب سے غریب آدمی بھی حرم کے چاروں اطراف اتنے حمام ملتے ہیں جو ان کے گھروں میں بھی نہیں ہیں کپڑے بھی دھوسکتا ہے، غسل بھی کرسکتا ہے، نہا بھی سکتا ہے۔ لیکن اگر اس کو گندا رہنے کی عادت ہے، اگر اس نے کپڑا بدلنا ہی نہیں ہے کہ میں نے ایک مرتبہ کپڑا بدلا تھا اگلی مرتبہ مولوی صاحب ہی بدلیں گے جب مریں گے ان شاء اللہ تعالیٰ! اور اس نے کبھی اپنی بنیان کو دھویا بھی نہیں ہے اور اگر کبھی دھویا بھی ہے تو اوپر والا کپڑا دھولیا، لیکن نیچے والا کپڑا اسی طرح ہے کہ کسی کے ساتھ نماز میں کھڑا بھی ہو تو پوری صف بیچاری پریشان ہوتی ہے کہ یہ کون سی بلا آگئی ہے؟ اس کا کسی کے پاس کیا علاج ہے؟ خود گندا رہنا چاہتا ہے تو کوئی اور کیا کرے؟ اللہ تعالیٰ کی رحمت تو دریا کی موجوں سے بھی زیادہ چل رہی ہے، لیکن ہم رحمت کو نہ لینا چاہیں تو اس میں کسی کا کیا قصور ہے؟

ابلیس کا ایک آیت سے غلط استدلال:

بعض بزرگوں نے ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک مرتبہ شیطان ایک اللہ والے نیک بزرگ (حضرت سہل بن عبداللہ تستری رحمہ اللہ جو اپنی عبادت میں مشغول تھے) کے پاس گیا۔ جب وہ آیا تو انہوں نے فرمایا کہ اچھا میں نے تمہیں پہچان لیا ہے، تم ابلیس ہو ناں؟ اس نے کہا کہ ہاں۔ انہوں نے فرمایا کہ کیوں آئے ہو؟ اس نے کہا کہ آج میں آپ سے ایک مسئلہ پوچھنے آیا ہوں۔ انہوں نے کہا: ابلیس کو مسئلہ پوچھنے کی ضرورت پیش آگئی ہے؟ اس نے کہا کہ آپ بزرگ آدمی ہیں، اللہ کے نیک بندے ہیں، کچھ میرا مسئلہ بھی حل کریں۔ اس نے کہا کہ مجھے آپ یہ بتائیں کہ میں کچھ شے ہوں کہ نہیں ہوں؟ آپ مجھے یہ بتائیں کہ میں شیء ہوں یا لاشیء ہوں؟ انہوں نے فرمایا کہ تم ابلیس ہو پھر تو شے تو ہو۔ اس نے کہا کہ اگر میں شیء ہوں تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَرَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ﴾ [الاعراف:۱۵۶] (میری رحمت ہر شے پر وسیع ہے) تو تم مولویوں نے مجھے رحمت سے باہر کیوں نکالا ہوا ہے؟ اللہ تعالیٰ کی رحمت جب برسنے پر ہے تو میں بھی شیء ہوں تو لہٰذا مجھ پر بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت ہوگی۔ اللہ والے نے فرمایا کہ تم نے قرآن

پاک کی آدھی آیت پڑھی ہے، پوری آیت نہیں پڑھی۔ پوری پڑھتے تو تمہیں مسئلہ سمجھ میں آجاتا تم نے تو اتنی پڑھی ہے آگے تو تم نے پڑھا ہی نہیں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ۚ فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ﴾ [الاعراف:۱۵۶] میری رحمت اس کے لیے ہے جو مجھ سے ڈرنے والے ہیں اور تُو تو خود میری رحمت سے نکل گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت تو ہر شے پر وسیع ہے، لیکن یہ رحمت ان لوگوں کے لیے ہے جو اس سے ڈرنے والے ہیں، لیکن تم تو متقین میں نہیں ہو، تم نے نافرمانی کی، فاسقین میں آگئے تو تم نے تو خود اپنے آپ کو رحمت سے نکالا ہے۔

یاد رکھو کہ ابلیس اللہ تعالیٰ کے حکم پر ہمارے ابا (حضرت آدم علیہ السلام) کو سجدہ نہ کرے اس پر تو قیامت تک لعنت ہو اور تم اگر اللہ کے قرآن میں سیکڑوں احکام اور مدنی سرکار کے لاکھوں فرمان کے مطابق بھی سجدہ نہ کرو تو تم کون ہو؟ اب تم خود فیصلہ کرو کہ ابلیس نے تو صرف ایک تیرے ابا جان کو سجدہ نہیں کیا اور وہ بھی ایک بار، کوئی پانچ دفعہ سجدے کا حکم نہیں تھا کہ دن میں پانچ مرتبہ سجدہ کیا کرو، ساری زندگی کرنے کا حکم بھی نہیں تھا، صرف یہ تھا کہ ﴿وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓىِٕكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ۭ اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ ڭ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ﴾ [البقرۃ:۳۴] اے فرشتو! آدم علیہ السلام کو سجدہ کرو۔ سب نے سجدہ کیا اور اس نے نہ کیا تو تیرے ابا جان کو ایک سجدہ نہ کرنے کی وجہ سے وہ ملعون، مردود، لعنتی اور جہنمی ہو گیا وہ تو قیامت تک جہنم میں پڑا رہے گا اور تم اگر خدا کو سجدہ نہ کرو تو تم کیا بن جاؤ گے؟

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

''مَا مِنْ مُسْلِمٍ يَدْعُو بِدَعْوَةٍ لَيْسَ فِيهَا إِثْمٌ وَ لَا قَطِيعَةُ رَحِمٍ إِلَّا أَعْطَاهُ اللّٰهُ بِهَا إِحْدَى ثَلَاثٍ إِمَّا أَنْ تُعَجَّلَ لَهُ دَعْوَتُهُ وَ إِمَّا أَنْ يَدَّخِرَهَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ وَ إِمَّا أَنْ يَصْرِفَ عَنْهُ مِنَ السُّوْءِ مِثْلَهَا.''

[مسند احمد بن حنبل، رقم:۱۱۱۳۳]

جب کوئی اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہے لیکن شرط یہ ہے کہ اس کی دعا میں کوئی ایسی دعا نہ ہو جو گناہ کی ہو، مثلاً کوئی دعا کرے کہ فلاں لڑکی سے مجھے عشق ہے، اللہ تعالیٰ اس لڑکی کو آج رات میرے پاس لے آئے اور نہ ہی ایسی دعا کہ جس میں قطع رحمی ہو (کہ اللہ ان دو بھائیوں کو آپس میں لڑا دے) تو اس کی دعا تین صورتوں میں سے ایک صورت میں قبول ہو جائے گی۔ ''إِمَّا أَنْ تُعَجَّلَ لَهُ دَعْوَتُهُ'' جو مانگا تھا وہ عطا کر دیا، ''وَ إِمَّا أَنْ يَدَّخِرَهَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ'' اللہ تعالیٰ نے اس کی دعا کو محفوظ رکھا کہ روزِ قیامت اس کا بدلہ دوں گا، ''وَ إِمَّا أَنْ يَصْرِفَ عَنْهُ مِنَ السُّوْءِ مِثْلَهَا''

اللہ تعالیٰ نے اس دعا کی برکت سے کوئی اس طرح کی مصیبت ٹال دی۔

جتنا مانگو، اللہ تعالیٰ کی رحمت تو اس سے بھی زیادہ ہے:

اس حدیث میں حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ جو بھی اللہ تعالیٰ کا مسلمان بندہ اللہ تعالیٰ سے دعا مانگتا ہے یا تو اللہ تعالیٰ اس کو دے دیتے ہیں یا اس دعا کے بدلے کوئی مصیبت دفع فرما دیتے ہیں۔

"يُسْتَجَابُ لِأَحَدِكُمْ مَا لَمْ يَعْجَلْ، يَقُولُ: دَعَوْتُ فَلَمْ يُسْتَجَبْ لِي." [صحیح بخاری، رقم: ۶۳۴۰]

اس حدیث پاک میں آیا کہ اللہ تعالیٰ تمہاری دعائیں قبول فرماتے ہیں جب تک کہ وہ جلدی نہ کرے۔ جلدی کا کیا معنی ہے؟ کہ میں نے تو دعا کی، لیکن میری دعا منظور نہیں ہوئی۔

او اللہ کے بندے! بندے کا کام تو مانگنا ہوتا ہے اس کی مرضی چاہے تیری زبان سے نکلے اور وہ تمہیں عطا کر دے یا دیر سے عطا کر دے۔

اور چاہے تو وہ تمہیں عطا نہ کرے پھر بھی ستر سال مانگتے رہیں تیرا کام تو مانگنا ہے اور یقین کامل کے ساتھ مانگتے رہو اور اس کی رحمت سے یقین ہوا تو ضرور ملتا ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"لَا يَزَالُ يُسْتَجَابُ لِلْعَبْدِ، مَا لَمْ يَدْعُ بِإِثْمٍ أَوْ قَطِيعَةِ رَحِمٍ، مَا لَمْ يَسْتَعْجِلْ، قِيلَ: يَارَسُولَ اللّٰهِ! مَا الِاسْتِعْجَالُ؟ قَالَ: يَقُولُ: قَدْ دَعَوْتُ وَ قَدْ دَعَوْتُ، فَلَمْ أَرَ يَسْتَجِيبُ لِي، فَيَسْتَحْسِرُ عِنْدَ ذٰلِكَ وَ يَدَعُ الدُّعَاءَ." [صحیح مسلم، رقم: ۲۷۳۵]

آدمی کی دعا منظور ہوتی رہتی ہے جب تک کہ وہ کوئی گناہ کی دعا نہ مانگے، قطع رحمی کی دعا نہ مانگے اور جلدی نہ کرے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پوچھا کہ یارسول اللہ! جلدی کا کیا معنی ہے؟ حضور پاک ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ وہ کہتا ہے کہ میں نے مانگا اور اتنا عرصہ ہو گیا ہے مانگتے مانگتے میری دعا منظور نہیں ہوئی۔ پھر وہ مانگ مانگ کر اُکتا جاتا ہے اور دعا کرنا چھوڑ دیتا ہے۔

بس وہ محروم ہو گیا کیونکہ اصل میں اس کا کام یہ ہے کہ مانگتا رہے مانگتا رہے باقی کب ملے گا؟ یہ میرے مالک

کے علم میں ہے بندے کا کام یہ نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس ہو جائے کیونکہ قرآن مقدس کی ایک آیت میں بھی آتا ہے، فرمایا:

﴿وَهُوَ الَّذِي يُنَزِّلُ الْغَيْثَ مِنْ بَعْدِ مَا قَنَطُوا وَيَنْشُرُ رَحْمَتَهُ ۚ وَهُوَ الْوَلِيُّ الْحَمِيدُ﴾ [الشوریٰ:۲۸]

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میری وہ ذات ہے۔ جب بندے مایوس ہو جاتے ہیں کہتے ہیں بس جی اب تو مانگ مانگ کر تھک گئے ہیں سال ہو گیا بارش آتی ہی نہیں مانگ مانگ کر جب بالکل نا اُمید ہو گئے تو پھر میں اپنی رحمت بھیج دیتا ہوں۔ اس لیے فرمایا کہ تم میری رحمت سے نا اُمید نہ ہوا کرو، تمہارا کام ہے کہ تم اپنے اللہ سے مانگو۔

نیک آدمی کی تحنیک کی برکت:

اور ایک بات یاد رکھو کہ بزرگوں نے ایک مثال دی ہے کہ کسی بزرگ کے ہاں ایک لڑکی پیدا ہوئی، اس کے پاس اس کے استاد بہت بڑے عالم، محدث، بڑے بزرگ اور اللہ والے تھے وہ مہمان تھے۔ لڑکی جو پیدا ہوئی تو گھر والے نے اس بچی کو اُٹھایا اور تحنیک کے لیے ان کے پاس لے آیا۔

تحنیک کہتے ہیں کہ کوئی کھجور یا کوئی میٹھی چیز اُنگلی لگا کر اس کے منہ میں دے دی جائے تا کہ وہ کچھ چاٹ لے، یہ سنت ہے۔ انہوں نے کہا کہ اتنے بڑے عالم اور بزرگ ہیں بڑی اچھی بات ہے کہ بس ان سے تحنیک کروالوں بجائے اس کے کہ میں کوئی بوڑھا آدمی ڈھونڈوں اور تلاش کروں۔ جب لے آیا تو حضرت نے کھجور لی اور سنت کے مطابق تحنیک کی۔ جب لڑکی بڑی ہوئی تو لڑکی بڑی شرارتیں کرتی۔ اس کی ماں یعنی اس کی بیوی نے ایک دن اپنے شوہر سے کہا کہ تمہارے استاد نے اچھی تحنیک کی تھی، یہ تو بڑی شرارتی بچی ہے۔ اس نے کہا کہ بی بی! تُو نہیں سمجھی، اگر وہ تحنیک نہ کرتے تو یہ کیا بنتی؟ تم اس کی فکر کرو۔ یہ تو پتہ نہیں کہ اس نے کیا بننا تھا؟ یہ تو شکر ہے کہ ہو سکتا ہے اس کی دعا سے یہ بچ گئی ہو۔

دعا مانگنے کے فائدے:

اس لیے یاد رکھا کرو کہ تم جو دعائیں مانگتے ہو تم سمجھتے ہو کہ جی میں نے اتنا عرصہ دعا مانگی اور جناب میری دعا منظور نہیں ہو رہی، لیکن تمہیں کیا پتہ کہ اللہ تعالیٰ نے کتنی بلائیں تم سے روکی ہوئی ہیں اور اگر تم دعا نہ مانگتے تو تمہارا کیا حشر ہوتا؟ تم دعا نہ مانگتے تو نہ معلوم کس مصیبت پر پہنچے ہوئے ہوتے؟ اس لیے اللہ تعالیٰ سے مانگنے میں نا اُمید نہ ہوا

کریں یعنی ایک تو یقین سے مانگا کریں کہ ہم مانگ رہے ہیں اور تیرے دروازے کے علاوہ اور کوئی دروازہ بھی نہیں ہے اور پھر مولا! تُو نے حکم دیا ہے کہ مجھ ہی سے مانگو اور تیرے حکم پر تجھ سے مانگ رہے ہیں اور تیرے دروازے کو چھوڑ کر ہم نے کہیں اور جانا بھی نہیں ہے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"لَا يَزَالُ الْعَبْدُ بِخَيْرٍ مَا لَمْ يَسْتَعْجِلْ" [مسند احمد بن حنبل، رقم:۱۳۱۹۸]

"بندہ خیر میں رہتا ہے جب تک وہ جلدی نہ کرے۔"

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پوچھا کہ حضور! جلدی کا کیا معنی ہے؟ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "قَدْ دَعَوْتُ رَبِّي فَلَمْ يَسْتَجِبْ لِي" بڑی دعا کی، بڑی دعا کی، یار! میری دعا تو سنی نہیں جاتی۔ یہ جلد بازی ہے جلدی نہ کرے، بلکہ مانگتا رہے اور اسی مانگنے میں اللہ تعالیٰ کی بڑی حکمتیں ہیں۔

دعا جلد قبول نہ ہونے میں اللہ تعالیٰ کی حکمتیں:

بعض علماء کرام نے ایک اور فلسفہ بیان کیا ہے، فرمایا ہے کہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ گناہ گار مانگتا ہے تو فوراً بات بن جاتی ہے اور ایک اللہ تعالیٰ کا نیک بندہ مانگتا ہے تو دعا منظور نہیں ہوتی، کبھی دیر لگ جاتی ہے اور وہ مانگتے رہتے ہیں، اس کی کیا وجہ ہے؟ فرمایا کہ اس میں بھی اللہ تعالیٰ کی حکمتیں ہیں کہ جب اللہ تبارک وتعالیٰ کا کوئی فاسق وفاجر بندہ ہو تو اللہ تعالیٰ چاہتے بھی نہیں کہ یہ مجھ سے ہمکلام ہو اس نے مانگا تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اسے دے دو دفع کرو چھوڑو بس دے دو اور بعض بندے ایسے ہوتے ہیں کہ ان کا ہمکلام ہونا اللہ تعالیٰ کو محبوب ہے۔

﴿إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ التَّوَّابِينَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِينَ ﴾ [البقرۃ:۲۲۲]

اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والوں اور پاک صاف رہنے والوں کو محبوب رکھتے ہیں۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کو محبوب رکھتے ہیں۔ تو پھر جب اس کے محبوب بندے ہوتے ہیں تو اللہ پاک کو ان کا مانگنا بھی محبوب ہوتا ہے، اللہ پاک فرماتے ہیں کہ اسے مانگنے دو، اسے مانگنے دو۔ اس کے مانگنے میں بھی ایک لطف ہے، یہ مانگنے میں بھی لطف اُٹھا رہا ہے اور میں مالک ہوں، میں اس کی درخواست سن رہا ہوں۔ میری مرضی جب آئے گی تو میں اس کو اتنا دوں گا کہ اس کے تصور سے بھی بالاتر ہوگا۔ تو اس لیے کبھی مایوس نہ ہوجایا کریں

کہ میں نے تو بہت دعا کی ہے، لیکن قبول نہیں ہوتی۔

اچھا کبھی ایسا ہو جاتا ہے کہ ہم جو مانگ رہے ہوتے ہیں ہمارے علم میں بھی نہیں ہوتا ہم تو مانگتے ہیں کہ اے اللہ! اولاد عطا فرما، اے اللہ! اولاد عطا فرما۔ نہ معلوم کہ وہ اولاد کوئی امتحان بنتی۔ تو ہمیں پتہ نہیں ہوتا، ہم سمجھتے نہیں ہیں، ہمارے علم میں نہیں ہوتا۔

آپ دیکھیں کہ کتنے بڑے بڑے علماء گزرے ہیں جن کی اولادیں جاہل ہو گئیں، کتنے بڑے بڑے اللہ کے بندے گزرے اور بیوی کافر اور کتنے بڑے بڑے ظالم فاسق و فاجر حتیٰ کہ فرعون گزرے اور بیوی آسیہ جیسی نیک۔ یہ اللہ تعالیٰ کا نظام ہے شوہر تو فرعون ہو، خدائی کا دعویٰ کرے، نبیوں سے مقابلہ کرے اور بیوی کون ہے؟ بیوی آسیہ اور ایمان والی، جنت کی سردار اور اللہ تعالیٰ نے اس کو اتنی بڑی عظمت دی کہ جنت میں اللہ تعالیٰ اسے ہمارے مدنی سرکار ﷺ کی بیوی بنائیں گے، اس سے بڑی کوئی عظمت ہے کہ حضور اکرم ﷺ کی بیوی بنے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا نظام ہے ہم اس کو سمجھ نہیں پاتے۔ اس لیے کبھی اپنی عدم سمجھ کی بناء پر اللہ تعالیٰ سے دعا کو نہ چھوڑیں، بلکہ مانگتے رہیں، مانگتے رہیں اور یقین کامل سے مانگیں۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا:

''مَا مِنْ عَبْدٍ مُؤْمِنٍ يَدْعُو اللّٰهَ بِدَعْوَةٍ فَتَذْهَبُ، حَتّٰى تُعَجَّلَ لَهُ فِي الدُّنْيَا أَوْ تُدَّخَرَ لَهُ فِي الْآخِرَةِ، إِذَا لَمْ يَعْجَلْ أَوْ يَقْنُطْ.'' [تفسیر ابن کثیر: ۲/۴۹۱]

کوئی بھی بندہ اللہ تعالیٰ سے مانگتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو دے دیتے ہیں یا اس کی دعا کو اس کے لیے آخرت میں ذخیرہ بنا دیتے ہیں جب تک کہ وہ جلدی نہ کرے اور نا اُمید نہ ہو جائے۔ حضرت عروہ نے پوچھا کہ اماں جان! اس کے جلدی کرنے اور نا اُمید ہونے کا کیا معنی ہے؟ تو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ بیٹا! وہ یوں کہے کہ میں نے بڑی دعا کی، میں نے بڑی دعا کی تھی، کتنے دن ہو گئے ہیں میں دعا مانگ رہا ہوں میری دعا تو منظور نہیں ہو رہی ہے، میری تو دعا ہی منظور نہیں ہوتی چھوڑ دی کیا دعا مانگیں ہم تو گناہ گار ہیں ہماری تو دعا منظور نہیں ہوتی دماغ میں ایسا تصور کر لینا مایوسی اور قنوط ہے اور یہ ناجائز ہے۔ آدمی کا کام ہے کہ ملے یا نہ ملے مگر اللہ تعالیٰ سے مانگتا رہے کیونکہ اگر دنیا میں نہ ملا تو آخرت میں تو ملے گا ہی۔ جب یہ دو چیزیں نہ آئیں تو اللہ تعالیٰ اس پر رحمت فرماتے ہیں اس کو کبھی دنیا میں دعا کا بدلہ عطا فرما دیتے ہیں اور کبھی اس کے لیے آخرت میں ذخیرہ بنا دیتے ہیں کہ اس کی دعا کا

بدلہ آخرت میں ملے گا۔

اللہ پاک ہمیں ان لوگوں میں نہ بنائے جو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس ہو گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی رحمتوں سے مایوس ہونا کافروں کی صفت ہے اللہ تعالیٰ کے نیک بندے کبھی بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس نہیں ہوتے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا کیا کریں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اور تمہیں اپنے سے معافی مانگنے کی توفیق عطا فرمائیں اور ہمیں کامل یقین عطا فرمائیں۔ بس ہمارا یقین ہونا چاہیے کہ جو اللہ تعالیٰ نے تقدیر میں فیصلہ کیا ہے وہی ہمارے لیے بہتر ہے، ہم اس کی رضا پر راضی ہیں، اس کی رضا اور اس کے فیصلوں پر راضی ہیں۔

یہ بھی یاد رکھیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں اپنی ذات سے مانگنے کی توفیق دے دے تو یہ اللہ تعالیٰ کا کتنا بڑا کرم ہے یعنی آپ دنیا میں دیکھیں کہ کتنے لوگ ہیں جن کو کبھی خیال ہی نہیں آتا کہ خدا سے مانگنا بھی ہے، ان پر بڑی بڑی مصیبتیں بھی آجائیں تو کبھی نماز نہ پڑھیں گے، بڑی سے بڑی مصیبت آجائے تو کبھی خیرات نہیں کریں گے، صدقہ نہیں کریں گے، اللہ تعالیٰ سے نہیں مانگیں گے اور اسلام اور دین کی طرف متوجہ نہیں ہوں گے۔ یہ کتنی بڑی بدنصیبی ہے۔

اور یہ سب سے بڑا انعام ہے کہ بندے پر مصیبت تو آگئی، لیکن بندہ اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو گیا یہ سب سے بڑا انعام ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ علماء کرام نے ایک فلسفہ بھی بیان کیا ہے، انہوں نے کہا کہ دیکھیں کہ اگر آپ کو کسی سے چھوٹا کام ہو اور بڑے کو بات کرنے کا موقع مل جائے تو آدمی بڑا مطمئن ہو جاتا ہے کہ بھئی! یہ تو بڑا افسر ہے، چھوٹے کو کہے گا۔ جب آدمی اپنے اللہ تعالیٰ سے کہنا شروع کر دے تو اس سے بڑا تو کوئی ہے ہی نہیں، وہ تو ہر چیز پر قادر ہے، ﴿فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيدُ﴾ [البروج:١٦] "يَفْعَلُ مَا يَشَاءُ" جو چاہے کر دے۔

واقعہ:

حضرت مالک بن دینار رحمہ اللہ اپنے ساتھیوں سے کہا کرتے تھے کہ میری جو دعا منظور ہو جاتی ہے میں سمجھ جاتا ہوں کہ وہ منظور ہو گئی ہے اور میری جو دعا منظور نہیں ہوتی اس کا بھی مجھے اندازہ ہو جاتا ہے کہ منظور نہیں ہوئی۔ شاگرد بڑے حیران ہوئے کہ یہ تو غیب کا معاملہ ہے، آپ کو کیسے علم ہو جاتا ہے؟ فرمایا کہ بات یہ ہے کہ کسی چیز کے اثرات اس چیز پر دلالت کرتے ہیں، جیسے بادل گرج رہے ہوں اور بجلی کڑک رہی ہو بادل سیاہ ہو جائیں ٹھنڈی ہوا چل پڑے تو آدمی سمجھ جاتا ہے کہ بارش ہو گی۔ کوئی یہ نہیں کہتا کہ یہ علم غیب ہے تو آپ نے فرمایا کہ جب میں اللہ تعالیٰ

سے دعا مانگوں اور میرا دل لگ جائے کہ اور مانگوں اور مانگوں اور مانگنے میں مزہ آ رہا ہو اور آنسو بہہ رہے ہوں اور بدن اللہ تعالیٰ کے خوف سے کانپ رہا ہو اور بدن کے بال اللہ تعالیٰ کے ڈر سے کھڑے ہو رہے ہوں تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ دعا منظور ہو گئی اور جب میں دعا مانگ رہا ہوں لیکن دل نہیں لگ رہا اور مانگ رہا ہوں اور یہ بھی معلوم نہیں کہ کیا مانگ رہا ہوں بس رٹے رٹائے الفاظ پڑھتا جا رہا ہوں تو میں سمجھتا ہوں کہ دعا منظور نہیں ہوئی۔

اور اسی طرح علماء نے لکھا ہے کہ ایک ہوتا ہے دعا کا پڑھنا اور ایک ہوتا ہے دعا کا مانگنا۔ ان دونوں میں بڑا فرق ہے، جیسے کتاب پر لکھا ہوا ہے "رَبَّنَا"، آپ پڑھیں: "رَبَّنَآ اٰتِنَا اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً حَسَنَةً وَّ فِي الْاٰخِرَةِ" آپ پڑھتے ہیں: "وَ فِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً حَسَنَةً وَّقِنَا وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ عَذَابَ النَّارِ" یہ پڑھنا ہوا، یہ مانگنا نہیں ہوا، یہ تو پڑھنا ہوا۔

ایک ہے دعا کا مانگنا کہ آدمی زاری کر رہا ہے، رو رہا ہے، عاجزی کر رہا ہے، اللہ کے آگے تذلل کر رہا ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ اگر تم رو نہیں سکتے تو کم از کم رونے کی شکل بناؤ۔ رونا اپنے ہاتھ میں نہیں، لیکن رونے کی شکل بنانا تو تمہارے ہاتھ میں ہے۔ عاجزی کر رہا ہے، گڑگڑا رہا ہے اور رو رہا ہے اور اپنے اللہ کے ساتھ ایسے مشغول ہے جیسے اللہ تعالیٰ سے باتیں کر رہا ہے تو پھر یہ ہوتی ہے دعا، جو دل سے نکلتی ہے اور قلب و قالب دونوں اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ ایک دعا ہے کہ غافل دل سے دعا مانگی جائے کہ کہے "رَبَّنَا رَبَّنَا رَبَّنَا" کوئی پتہ نہیں کہ کیا کہہ رہا ہے۔ یہ دعا نہیں ہوتی، یہ تو پڑھنا ہوتا ہے جیسے طواف میں ہمارے لوگ دعا پڑھتے ہیں جو دعا مانگتے نہیں ایک آدمی نے کتاب ہاتھ میں پکڑی ہوئی ہے اور مسئلہ پڑھ رہا ہے یہ پڑھنے والی بات ہے دعا نہیں۔

اور اسی طرح علماء نے لکھا ہے کہ جب تک دعا میں یقین کامل نہ ہو دعا قبول نہیں ہوتی۔ دعا مانگنے والا خود متشکک ہے کہ نہ معلوم دعا منظور ہو گی یا نہیں تو پھر بھی منظور نہیں ہوتی۔ دعا اتنے یقین کامل سے مانگے کہ جب اللہ کے علاوہ دروازہ کوئی نہیں پھر اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ مجھ سے مانگو میں خود دوں گا پس اللہ تعالیٰ کی بات کبھی غلط نہیں ہو سکتی۔ اللہ تعالیٰ کا وعدہ سچا ہے تو جب اس نے وعدہ فرمایا ہے اور پھر میں بالکل صدقِ دل سے مانگ رہا ہوں اور کوئی دروازہ نہیں ہے تو کیسے قبول نہیں ہو گی۔

واقعہ:

ایک اللہ کے بہت بڑے ولی اللہ تھے وہ حج کے لیے تشریف لے گئے تو میدانِ عرفات میں جب بیٹھے تھے تو

اپنے ساتھیوں سے پوچھا کہ عرفات میں یہ جتنے لوگ ہیں اگر یہ سب اکٹھے ہو کر سخی کے دروازے پر چلے جائیں اور اس کے پاس سوال کریں کہ ہم سب تمہارے دروازے پر آئے ہیں کہ آپ ہمیں ایک پیسہ دے دیں تو کیا وہ سخی انکار کرے گا؟ انہوں نے کہا کہ حضرت! کیوں انکار کرے گا؟ ایک پیسہ دینے سے اس کا کیا بگڑے گا کہ اتنی مخلوق کو وہ واپس کرے اور ایک پیسہ نہ دے تو فرمایا کہ دیکھو! جتنے بھی عرفات میں لوگ ہیں اللہ تعالیٰ سے مانگ رہے ہیں اگر اللہ تعالیٰ ان سب کو دے دے تو اس کے خزانے میں ایک پیسے جتنی بھی کمی نہ ہوگی کیونکہ اگر سخی دے دے اس کا پیسہ تو پھر بھی کم ہو گیا لیکن خدا کے نزدیک ایک پیسہ کی بھی کمی نہیں ہوگی تو جب اس کے خزانے میں کمی نہیں ہوگی تو کیا وہ اپنے بندوں کو دھکا دے دے گا کہ میں نہیں دیتا؟ انہوں نے فرمایا کہ اتنے یقین کے ساتھ مانگو۔

حتیٰ کہ بعض علماء نے تو یہ بھی لکھا ہے کہ آدمی اگر عرفات میں ہو اور وہ دعا مانگے اور اس کو شک ہو کہ پتہ نہیں کہ آج میری دعا قبول ہوتی ہے یا نہیں ہوتی تو کہتے ہیں کہ وہ آدمی ایمان سے نکل جاتا ہے۔ اس لیے جب حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ جو یہاں مانگتا ہے تو میں اس کی بخشش کر دیتا ہوں تو شک کا کیا معنیٰ؟ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ حضور اکرم ﷺ کی زبان پر شک کر رہا ہے اور حضور پاک ﷺ کے فرمان پر شک کرنا تو کفر ہے حضور اکرم ﷺ کا فرمان تو حق ہے وہ تو کبھی قیامت تک اس میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا۔ اس لیے دعا کو یقین سے مانگیں، اپنے اللہ سے عاجزی سے مانگیں، تضرع سے مانگیں، گڑگڑا کر مانگیں، اس کے اوّل و آخر میں درود شریف پڑھیں، دعا گناہ کے بارے میں نہ کریں، اسلام کے احکام کے خلاف کوئی دعا نہ کریں اور قطع رحم کی دعا نہ کریں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ رحمت فرماتے ہیں اور دعا کا بدلہ مل جاتا ہے یا تو دنیا میں یا آخرت میں۔

ابن قسیط کہتے ہیں کہ میں نے حضرت سعید بن مسیب رحمہ اللہ سے سنا کہ وہ بھی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے قول کی طرح فرما رہے تھے۔

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضور پاک ﷺ نے فرمایا:

''اَلْقُلُوْبُ أَوْعِيَةٌ وَ بَعْضُهَا أَوْعَى مِنْ بَعْضٍ، فَإِذَا سَأَلْتُمُ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ أَيُّهَا النَّاسُ! فَاسْأَلُوْهُ وَ أَنْتُمْ مُوْقِنُوْنَ بِالْإِجَابَةِ، فَإِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَجِيْبُ لِعَبْدٍ دَعَاهُ عَنْ ظَهْرِ قَلْبٍ غَافِلٍ.'' [مسند احمد بن حنبل، رقم:۶۶۵۵]

اللہ تعالیٰ نے جو دل بنائے ہیں گویا کہ یہ بھی برتن ہیں، ظرف ہیں۔ کسی کا بڑا، کسی کا چھوٹا۔ اور فرمایا کہ جب تم اللہ تعالیٰ سے دعا مانگو تو اس یقین سے مانگو کہ میں مانگ رہا ہوں اور مجھے ملے گا۔ اللہ پاک اس بندے کی دعا منظور



نہیں فرماتے جو اپنے رب سے مانگے، لیکن اس کا دل غافل رہے، دل کہیں اور لگا ہوا ہے لیکن مانگ خدا سے رہا ہے یعنی پورے یقین سے مانگے کہ اللہ تعالیٰ سے مانگ رہا ہوں اور ملے گا۔

﴿إِنَّمَا أَمْرُهُ إِذَا أَرَادَ شَيْئًا أَنْ يَقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ ﴾[یٰسین: ۸۲] اس کی شان تو یہ ہے کہ وہ جو کچھ کرنا چاہے، کر گزرتا ہے۔

﴿أُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلَىٰ نِسَائِكُمْ ۚ هُنَّ لِبَاسٌ لَكُمْ وَأَنْتُمْ لِبَاسٌ لَهُنَّ ۗ عَلِمَ اللَّهُ أَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُونَ أَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ ۖ فَالْآنَ بَاشِرُوهُنَّ وَابْتَغُوا مَا كَتَبَ اللَّهُ لَكُمْ ۚ وَكُلُوا وَاشْرَبُوا حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ۖ ثُمَّ أَتِمُّوا الصِّيَامَ إِلَى اللَّيْلِ ۚ وَلَا تُبَاشِرُوهُنَّ وَأَنْتُمْ عَاكِفُونَ فِي الْمَسَاجِدِ ۗ تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ فَلَا تَقْرَبُوهَا ۗ كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ آيَاتِهِ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ ﴾[البقرۃ: ۱۸۷]

’’تمہارے لیے حلال ہے روزے کی رات میں اپنی بیویوں کے پاس جانا، وہ تمہارا لباس ہیں تم اُن کا لباس ہو، اللہ جانتا ہے تم (شب باشی کرکے) اپنے نفسوں سے خیانت کرتے تھے، اللہ نے تمہاری توبہ کو قبول کیا اور تمہیں معاف کیا، اب ان سے مباشرت کرو اور (اولاد) طلب کرو جو اللہ نے تمہارے لیے لکھی ہے اور کھاؤ اور پیو (تمام رات) جب تک کہ تمہارے لیے سفید دھاری صبح کی سیاہ دھاری سے فجر کے وقت صاف ظاہر ہو جائے، پھر روزہ کو رات (غروب) تک پورا کرو، اور تم ان سے مباشرت نہ کرو جب تک کہ تم مسجدوں میں اعتکاف کرو، یہ (احکام) اللہ کی حدود ہیں، ان کے (توڑنے کے) قریب نہ جاؤ۔ اسی طرح اللہ اپنی آیات کو لوگوں کے لیے بیان کرتا ہے، تاکہ وہ (محرمات سے) بچتے رہیں۔‘‘

ان آیاتِ مبارکہ میں روزہ کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے کچھ احکام بیان فرمائے ہیں۔

﴿أُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلَىٰ نِسَائِكُمْ ۚ هُنَّ لِبَاسٌ لَكُمْ وَأَنْتُمْ لِبَاسٌ لَهُنَّ﴾ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے تمہارے لیے حلال کردیا روزے کی راتوں میں جماع کرنا اپنی عورتوں سے۔

﴿أُحِلَّ لَكُمْ﴾ (حلال کردیا گیا تمہارے لیے) سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ پہلے وہ چیز حرام تھی، اب

اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے حلال کر دی۔ تو اب یوں سمجھیں کہ ابتداء اسلام میں جب روزے کا حکم آیا تو دن میں کھانا پینا اور مباشرت کرنا منع ہی تھا، لیکن رات کو یہ حکم تھا کہ جب تک تم جاگ رہتے ہو اس وقت تک کھانا پینا اور بیوی سے ملنا جائز ہے، لیکن اگر تم سو گئے تو سونے کے بعد نہ کھانا جائز، نہ پینا جائز اور نہ ہی بیوی سے ملنا جائز۔ کوئی آدمی عشاء کی نماز پڑھ کر سو گیا تو اب سونے کے بعد اس کی مثلاً آدھی رات کو نیند کھل گئی تو اب روزہ شروع ہے۔ ابتداء اسلام میں یہ حکم تھا تو اس کے بارے میں یہ ہوا کہ لوگ بڑی تکلیف میں مبتلا ہو گئے۔

تبدیلیٔ حکم کا سبب:

ایک صحابی جن کا نام قیس بن صرمۃ (اور ایک روایت میں قیس بن ابی صرمۃ ہے) جو انصاری صحابی ہیں حضور اکرم ﷺ نے دیکھا کہ وہ روزے کی حالت میں بیہوش ہو گئے اور ان پر پانی ڈالا گیا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے پوچھا کہ کیا بات ہے؟ تو انہوں نے کہا کہ حضور! روزے کی وجہ سے بیہوش ہو گئے۔ اصل وجہ یہ تھی کہ وہ بیچارے سارا دن باغ میں کام کرتے رہے اور وہ باغ میں کام کرنے والے محنتی مزدور آدمی تھے۔ سارا دن تھکے ہوئے آئے تو گھر میں کھانے کو کچھ نہیں تھا، بیوی پڑوسیوں کے گھر کچھ لینے گئی تو اتنے میں ان کی آنکھ لگ گئی۔ بیوی جب واپس آئی تو اس نے کہا کہ ہائے تیرا ناس ہو جائے تیرا تو روزہ شروع ہو گیا اور تیرے لیے کھانا پینا حرام ہو گیا۔ اب دوسرے دن کا روزہ شروع ہو گیا۔ اب پورا دن محنت ومشقت کی اور دوسرے دن بھی بغیر کھائے پیے روزہ رکھ لیا، اس کی وجہ سے وہ بے ہوش ہو گئے اور ان کا روزہ بیس گھنٹے کا ہو گیا۔ لہٰذا اس میں مشقت تھی، اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ہمیں رخصت دے دی۔

اسی طرح بعض صحابہ کے ساتھ اس طرح کا واقعہ پیش آیا کہ رات کو جب نیند کھلی تو میاں بیوی آپس میں مل بیٹھے تو انہوں نے حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں آکر عرض کیا تو اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں یہ احکام نازل فرمائے:

﴿اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمْ ؕ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ؕ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ ۚ فَالْـٰٔنَ بَاشِرُوْهُنَّ وَابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ ۪ وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ﴾ تک نازل ہوئی، ''فَفَرِحُوْا بِهَا فَرَحًا شَدِيْدًا'' اس آیت کے نزول کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم فرماتے ہیں کہ ہمیں بہت خوشی ہوئی۔ یہ لفظ طبرانی کے ہیں۔

[تفسیر طبری: ۲/۴۹۵]

اور اگلی آیت بھی نازل ہوگئی۔ اب رات میں بالکل کھانا پینا اور میاں بیوی کا ملنا بھی حلال ہوگیا صبح صادق تک۔

یہ ہم نے اپنے بندوں کے ساتھ رعایت کردی پس میرے بندوں کو کہہ دو کہ پہلے جو چیز حرام تھی، اللہ پاک نے اس کو حلال کردیا۔ اسی میں ایک مسئلہ یہ بھی سمجھو کہ اللہ تعالیٰ نے یہ تو فرمادیا: ﴿اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمْ﴾ ہم نے حلال کردیا لیکن حرام کرنے والا حکم قرآن میں موجود ہی نہیں۔ مسئلہ سمجھو کہ قرآن مجید میں یہ مسئلہ نہیں کہ رمضان المبارک میں میاں بیوی کا ملنا حرام ہے اور رمضان کی رات کو کھانا پینا حرام ہے۔ یہ پورے قرآن میں کہیں بھی نہیں تو جب وہ قرآن پاک میں نہیں ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ابتداء اسلام میں رات کو میاں بیوی کا ملنا حرام ہے یہ مسئلہ احادیث مبارکہ میں موجود ہے کہ ملنا حرام تھا اور سونے کے بعد کھانا پینا بھی حرام تھا۔ پس مسئلہ یہ نکلا کہ جو میرے مدنی ﷺ کا فرمان ہے وہ بھی اللہ پاک کا حکم ہے کیونکہ اس کا مرتبہ اگر حکم خداوندی کا نہ ہوتا تو اللہ تعالیٰ فرماتے کہ پہلے تو کوئی حکم تھا ہی نہیں بلکہ اللہ پاک نے فرمایا کہ ٹھیک ہے پہلے حرمت کا حکم تھا، اب ہم نے حلال کردیا یعنی گویا جو حضور پاک ﷺ نے حکم دیا ہے وہ بھی میرا ہی حکم ہے کیونکہ میرا مدنی ﷺ اپنی طرف سے کوئی حکم جاری نہیں کرتا۔

یعنی حکمِ رسول بھی حکمِ خداوندی ہوتا ہے، اس لیے فرمادیا: ﴿مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ﴾ [النساء: ۸۰] جس نے بھی میرے مدنی کی اطاعت کی، اس نے میری اطاعت کی۔ فرمایا: ﴿وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا﴾ [الحشر: ۷] جن چیزوں کا تمہیں اللہ تعالیٰ کا رسول حکم دے اسے لے لو اور جس سے منع کرے اس سے رک جاؤ۔ اس لیے کہ اللہ کا رسول کبھی اپنی طرف سے حکم نہیں دیتا۔ اس سے یہ مسئلہ بھی سمجھ آگیا کہ وہ لوگ جو ہر مسئلے کے بارے میں کہہ دیتے ہیں کہ یہ مسئلہ قرآن پاک میں تو نہیں ہے۔

اگر یوں کہا جائے کہ یہ مسئلہ قرآن پاک میں ہے تو یوں سمجھو کہ محمد عربی ﷺ بھی تو قرآن پاک کی عملی تفسیر ہیں۔ اس نے قرآن پاک میں جو الفاظ نازل کیے ان کی عملی تصویر اگر دیکھنی ہو تو وہ محمد رسول اللہ ﷺ ہیں کہ قرآن تو یہ ہے جو اللہ پاک نے اپنے الفاظ میں اُتارا ہے اور محمد پاک ﷺ نے اپنے عمل سے جو نمونہ دکھایا ہے وہ عملی قرآن ہے۔

تیسرا مسئلہ ناسخ اور منسوخ کا ہے کہ قرآن میں پہلے اور حکم تھا پھر دوسرا حکم آگیا اور پہلا حکم منسوخ ہوگیا، جیسے اللہ

پاک نے فرمایا: ﴿يَاأَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۝١ قُمِ اللَّيْلَ إِلَّا قَلِيلًا ۝٢ نِصْفَهُ أَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيلًا ۝٣ أَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْآنَ تَرْتِيلًا ۝٤﴾ [المزمل: ۱ تا ۴] اللہ پاک نے حکم دیا کہ رات کو تہجد کے لیے جاگیں، ﴿قُمِ اللَّيْلَ﴾ ساری رات جاگیں اور تھوڑا سا آرام بھی کرلیں کہ آدھی رات آرام اور آدھی رات عبادت۔ پھر یہ کہ دو حصے آرام کرلیں اور ایک حصہ عبادت کرلیں۔ تو پہلے یہ حکم تھا، لیکن بعد میں اللہ تعالیٰ نے رعایت فرمادی: ﴿عَلِمَ أَنْ سَيَكُونُ مِنْكُمْ مَرْضَىٰ ۙ وَآخَرُونَ يَضْرِبُونَ فِي الْأَرْضِ يَبْتَغُونَ مِنْ فَضْلِ اللَّهِ ۙ وَآخَرُونَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۖ فَاقْرَءُوا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ﴾ [المزمل: ۲۰] اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم جانتے ہیں کہ تم میں بیمار اور کمزور بھی ہوں گے اور ایسے بھی ہوں گے جو اللہ کے راستے میں جہاد کرنے والے اور ایسے بھی ہیں جو تجارت کرنے والے ہیں اور رات کے دو حصے جاگنا اور آدھی رات جاگنا بہت ہی مشکل ہے، اس لیے اللہ پاک نے فرمایا کہ اے نبی! میں نے پہلا حکم ختم کردیا، اب ہم نے اپنے بندوں پر رعایت کردی: ﴿فَاقْرَءُوا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ﴾ اب ساری رات میں اللہ پاک تم کو تہجد پڑھنے کی جتنی بھی توفیق دے دیا کرے پڑھ لیا کرو چاہے دو رکعت پڑھ لو، چار پڑھ لو، چھ پڑھ لو، آٹھ پڑھ لو، دس منٹ، پندرہ منٹ، بیس منٹ، جتنا تم سے ہوسکے۔ اب پہلا حکم بھی قرآن میں تھا اور دوسرا حکم بھی قرآن میں تھا۔ لیکن یہاں ایک مسئلہ یہ بھی سمجھ میں آیا کہ پہلا حکم تو قرآن پاک میں نہیں ہے وہ حکم تو حدیث پاک میں ہے تو بھی اللہ پاک اسی حکم کو جو قرآن پاک میں نہیں ہے اور احادیث پاک میں ہے اسے بھی قرآن پاک کی آیت بھیج کر منسوخ فرمادیتے ہیں۔ اب پہلا حکم جو حدیث پاک میں تو تھا لیکن قرآن پاک میں نہیں تھا لیکن نسخ قرآن پاک میں آگیا جو چیز پہلے حرام تھی، اب ہم نے تمہارے لیے حلال کردی ہے۔ معلوم ہوا کہ قرآن پاک سے بھی وہ احکام منسوخ ہوجاتے ہیں جو حدیث پاک میں موجود ہوں۔

اب مسئلہ سمجھو کہ ﴿أُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلَىٰ نِسَائِكُمْ﴾ ہم نے تمہارے لیے جماع کو حلال کردیا۔ کیوں حلال کردیا؟ اس لیے کہ ﴿هُنَّ لِبَاسٌ لَكُمْ وَأَنْتُمْ لِبَاسٌ لَهُنَّ ۗ عَلِمَ اللَّهُ أَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُونَ أَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ﴾ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تمہاری عورتیں تمہارا لباس ہیں اور تم ان کا لباس ہو۔ لباس کا معنی کیا ہے؟ یہ جو آپ نے پہنا ہوا ہے یہ لباس ہے؟ اب یہ بات سمجھ لو کہ لباس کیوں کہا گیا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں عورتوں کو لباس بھی کہا ہے اور حرث بھی کہا ہے۔ ''حَرْث'' کا معنی کھیتی ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس

آیت مقدسہ میں فرمایا ہے: ﴿أُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلَىٰ نِسَائِكُمْ ۚ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ۗ عَلِمَ اللَّهُ أَنَّكُمْ كُنتُمْ تَخْتَانُونَ أَنفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنكُمْ ۖ فَالْآنَ بَاشِرُوهُنَّ﴾ [البقرۃ:۱۸۷]

دوسری جگہ اللہ پاک فرماتے ہیں: ﴿فَأْتُوا حَرْثَكُمْ أَنَّىٰ شِئْتُمْ﴾ [البقرۃ:۲۲۳] تمہاری عورتیں تمہاری کھیتی ہیں جیسے چاہو اور جس طرح چاہو۔ وہاں لفظ ''حَرْث'' آیا ہے کہ عورت کو اللہ تعالیٰ نے مرد کے لیے کھیتی بنایا ہے۔ اسی طرح لفظ ''الفِرَاش'' بھی آیا ہے، جیسا کہ حدیث پاک میں آتا ہے:

''اَلْوَلَدُ لِلْفِرَاشِ وَ لِلْعَاهِرِ الْحَجَرُ.'' [صحیح بخاری، رقم:۲۰۵۳]

یعنی بچہ تو صاحبِ فراش کا ہے یعنی صاحبِ نکاح کا ہے تو وہاں لفظ ''الفِرَاش'' ہے۔ اس لیے علماء کرام نے فرمایا ہے کہ دراصل یہ کنایات ہیں تا کہ تم بات کو سمجھو کہ اللہ پاک نے مرد اور عورت کو آپس میں ایک دوسرے کے قریب رکھا ہے اور ان میں اتنا اتصال ظاہری اور باطنی ہے جیسے لباس کا اتصال ہے جیسے لباس بدن کے ساتھ لگا ہوا ہے یہ اتصال ظاہری باطنی اور معنوی پر ہے۔ یہ قرب صرف میاں بیوی کو حاصل ہو سکتا ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس کو لباس فرما دیا ہے اور دوسری بات ﴿حَرْثَكُمْ﴾ فرمائی ہے، اس سے اس بات کی طرف اشارہ ہو گیا ہے کہ جیسے زمینوں سے اللہ پاک نے تمہارے لیے کھیتی پیدا کی ہے اسی طرح اللہ تبارک وتعالیٰ نے تمہاری بیویوں کو تمہاری نسل کا ذریعہ بنایا ہے کہ اس سے ہم تمہیں اولاد دیتے ہیں اور پھر جو آگے اولاد ہے اور اولاد در اولاد نسل چلتی ہے تو یہ تمہارے لیے کھیتی بھی ہیں۔ اسی طرح عورت کو لباس فرمایا ہے، مثلاً آپ نے شلوار پہنی ہوئی ہے اور قمیض اور ٹوپی نہیں پہنی ہوئی اور باہر کوئی معزز آدمی آپ سے ملنے آ جائے تو آپ کہیں گے کہ ٹھہرو، میں اپنے کپڑے پہن لوں اور باہر آنے کے قابل تو بن جاؤں۔ حالانکہ آپ نے شلوار تو پہنی ہوئی ہے، ستر تو چھپایا ہوا ہے آپ ننگے تو نہیں ہیں لیکن عورت کو لباس فرمایا کہ لباس کا معنی ستر ہوتا ہے وہ تمہارا لباس ہیں، تمہارا ستر ہیں اور تم اس کا ستر ہو۔ کیا معنی ہوا کہ تم اس کو چھپانے کا ذریعہ بنو اور وہ تمہیں چھپانے کا ذریعہ بنے۔ یہ نہ کہ تم اسے نچانے کا ذریعہ بنو اور وہ تمہیں بے غیرت بنانے کا ذریعہ بنے۔ اسلام نے عورت اس لیے نہیں رکھی کہ تم عورت کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر اس کو ٹیبل پر لے آؤ، فلور پہ لے آؤ اور بازاروں میں لے آؤ، اسے کلبوں اور پارکوں میں لے آؤ، اور عورت تمہیں اتنا ذلیل کرے کہ ساری دنیا انگلیاں اُٹھا اُٹھا کر تمہاری طرف اشارہ کرے کہ دیکھو وہ دیوث جا رہا ہے جو اپنی بیوی کو بازاروں میں بے پردہ کر کے لے جاتا ہے۔ بلکہ تم اس کا لباس بنو اور وہ تمہارا لباس بنے، تم اس کو چھپاؤ اور وہ تمہیں چھپائے۔

اور علماء کرام نے یہ بھی فرمایا ہے کہ لباس میں ایک یہ اشارہ بھی کیا گیا ہے کہ جیسے لباس بدن کو چھپا لیتا ہے مرد عورت کو گناہوں سے چھپا لے اور عورت اپنے مرد کو گناہوں سے چھپا لے یعنی بچا لے۔ اور ہمیشہ اُصول کی بات ہے کہ جب حلال کے دروازے بند ہو جاتے ہیں تو حرام کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ اور بعض لوگ دولت اور دنیا کمانے کے لالچ چار چار سال باہر مکہ شریف میں رہتے ہیں اور بیوی اپنے ملک میں ہے تو اس کے پاک رہنے کا ذمہ دار کون ہے؟ دیکھو بھئی! تم بیوی والے ہو، تمہارا دل تمنا کرتا ہے تو عورت کا دل بھی اسی طرح تمنا کرتا ہے، اگر تمہیں خواہش ہوتی ہے تو عورت کو بھی اسی طرح خواہش ہوتی ہے، بلکہ بعض اطباء کے نزدیک تو عورت میں شہوت کا مادہ مرد سے بھی زیادہ ہوتا ہے، یہ تو علیحدہ بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس میں شرم کا مادہ رکھ دیا ہے، ورنہ تو خدا رحم کرے کہ انجام کیا ہوتا۔ تو اس لئے اللہ پاک نے فرمایا: ﴿هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ﴾ کہ تم عورت کے لیے بمنزلہ لباس کے ہو اور عورت تمہارے لیے بمنزلہ لباس کے ہے۔

اور اسی لئے علماء کرام نے فرمایا: ﴿وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً﴾ [الروم:۲۱] اللہ پاک نے فرمایا کہ میں نے تمہاری جنس میں سے تمہارے لئے بیویاں بنائی ہیں، تاکہ تم ان سے سکون حاصل کر سکو اور تمہارے درمیان محبت اور رحمت پیدا ہو سکے۔ اس لئے علماء کرام نے فرمایا کہ جس عورت سے خاوند کو سکون نہ ملے، وہ عورت، عورت کہلانے کی حق دار نہیں اور جس میاں اور بیوی کے درمیان میں مودّت اور رحمت نہیں ہے وہ بھی میاں بیوی کہلانے کے حق دار نہیں۔ کیونکہ اللہ پاک نے عورت پیدا ہی اس لیے فرمائی ہے۔

اس لئے فرمایا: ﴿هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ﴾ یہاں سے یہ بھی اشارہ نکلا کہ جیسے تیرا اُن پر حق ہے، اسی طرح ان کا بھی تجھ پر حق ہے۔

﴿وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ﴾ [البقرۃ:۲۲۸] اللہ پاک نے فرمایا: یہ نہ سمجھو کہ صرف مرد کا عورت پر حق ہے، بلکہ عورت کا بھی اسی طرح حق ہے کہ اس کے لیے رہائش اور نفقہ کا انتظام کرے، اس کے خرچے کا انتظام کرے اور اس کو ان کاموں سے بچائے جو ذلت و رُسوائی کا سبب بنیں۔ یہ اس کی ذمہ داری ہے، اس لئے کہ ﴿اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ﴾ [النساء:۳۴] اللہ تعالیٰ نے قوامیت والی صفت مرد کے لیے رکھی ہے۔

﴿عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ﴾ اللہ پاک نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ جانتے ہیں کہ رمضان المبارک میں تم اپنے متعلق خیانت کرتے ہو کیونکہ انسان ہے اب وہ تھکا ہوا ہے اور نیند سے اُٹھا بھوک لگی ہوئی ہے غلطی سے کھا بیٹھا یا اسی طرح سے آدمی ہے جوانی ہے اور صحت ہے اور گھر ہے آدھی رات کو نیند کھل گئی جوان بیوی ہے اور جماع کر بیٹھا ہے، جیسے بعض صحابہ کرام سے ایسی بات واقع ہوگئی حتیٰ کہ ایک روایت میں یہ بھی آتا ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میں تو برباد ہوگیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا ہوگیا؟ تو انہوں نے کہا: حضور! رمضان کی رات میں اپنی بیوی سے مل بیٹھا اور یہ تو منع تھا، اس لیے میں ہلاک ہوگیا۔ (ہوا یہ تھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بیوی سو چکی تھی، جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خواہش کا اظہار کیا تو انہوں نے کہا: میں تو سو چکی ہوں، فرمایا: بہانہ کرتی ہو اور اپنی خواہش کو پورا کرلیا۔ حالانکہ میاں بیوی میں سے کوئی بھی سو چکا ہوتا تو اس کا روزہ شروع ہوجاتا)۔ آپ اندازہ کریں حالانکہ بیوی تھی، لیکن شریعت میں ملنے کی اجازت نہیں تھی تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اتنے گھبرائے کہ میں تو برباد ہوگیا، میں ہلاک ہوگیا۔ اس لیے مقامِ صحابہ کو سمجھو کہ مقامِ صحابہ اتنا عظیم ہے، اتنا عظیم ہے کہ تم تصور نہیں کرسکتے۔ مگر جو اُن سے غلطی ہوئی، وہ قیامت تک کے لیے دین بن گیا۔ اگر ان سے غلطی نہ ہوتی تو قیامت تک اُمت اس رعایت سے فائدہ کیسے اُٹھاتی؟ اللہ پاک نے قرآن نازل کردیا کہ رات کو ملنے کی تمہیں اجازت ہے۔ اللہ پاک نے فرمایا: ﴿فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ﴾ اللہ پاک نے تم پر مہربانی کردی اور اللہ پاک نے معاف کردیا۔ ﴿فَالْـٰٔنَ بَاشِرُوْهُنَّ﴾ اب تم روزے والی رات میں جماع کرسکتے ہو، لیکن یہ حکم نہیں کہ کرو، بلکہ معنی یہ ہے کہ جماع کرنے کی اجازت ہے، کوئی نہ کرے تو ٹھیک ہے۔ اور رات کو عبادت میں زیادہ وقت گزارے، جیسے حدیث پاک میں آتا ہے کہ جب آخری عشرہ آجاتا تھا تو بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم اپنی چادر کس کے باندھ لیا کرتے تھے اور اپنے گھر والوں کو بھی جگا کر رکھتے تھے۔ چادر کا کس کے باندھ لینے سے یہ اشارہ تھا کہ اب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی بیویوں کے قریب نہیں آتے تھے اور اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مشغول رہتے تھے، لیکن اللہ تعالیٰ نے ہمیں اجازت دے دی۔

خیطِ ابیض و خیطِ اسود کے معنی:

اب اگلا مسئلہ سمجھیں۔ اللہ پاک نے فرمایا: ﴿وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ

الْأَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ﴾ کہ رمضان کی راتوں میں کھاؤ پیو۔ اب تو کھانا بھی حلال، پینا بھی حلال۔ سوال یہ ہے کہ کب تک کھاتے پیتے رہیں؟ تو فرمایا: ﴿حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ﴾ جب سفید دھاگا کالے دھاگے سے بالکل علیحدہ ہو کر واضح ہو جائے۔ اب یہ معنی یاد رکھو کہ سفید خیط اور سیاہ خیط، سفید ڈور اور سیاہ ڈور، اس سے مراد صبح کاذب اور صبح صادق ہے۔ صبح کاذب یہ ہوتی ہے کہ ایک روشنی ایسے سیدھی اوپر چلی جاتی ہے پھیلتی نہیں ہے، یہ ہے صبح کاذب۔ اور صبح صادق وہ ہوتی ہے جس سے روشنی پھیلنی شروع ہو جائے۔

اچھا یہ مسئلے اس وقت ہیں جب آپ کسی ویرانے میں ہیں اور وہاں کوئی ٹائم یا وقت کے اندازے کے لیے کوئی چیز نہیں تو اس صورت میں آپ کے سامنے اُفق ہے اور آپ صبح صادق دیکھ سکتے ہیں تو وہاں آپ فیصلہ کر سکتے ہیں۔ لیکن جب ہم شہروں اور مکانوں میں ہیں تو بادل ہیں اور ہمیں نظر نہیں آتا تو اب جو گھڑیاں جو چیزیں بن گئی ہیں ان کے مطابق آدمی عمل کرلے کہ صبح صادق فلاں منٹ پر ہو جاتی ہے۔

علماء کرام نے فرمایا کہ فجر کی قید اس لیے لگائی گئی کہ یہ معنی نہیں ہے کہ بعض لوگوں کو بڑی غلط فہمی لگی، انہوں نے حدیثوں کو پڑھا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سحری کھاتے رہے، کھاتے رہے کہ صبح ہو گئی۔ بعض لوگوں نے یہ مسئلہ سمجھ لیا کہ صبح ہو جائے تب بھی کھانا جائز ہے، فجر کی اذان ہو جائے تب بھی جلدی جلدی کھانا جائز ہے۔ بعض لوگوں نے یہ مسئلہ بھی لکھا ہے کہ آدمی سو گیا تھا اور اذانِ فجر ہو رہی ہے اور نیند کھل گئی تو جب تک اذان ہو رہی ہے کھاتے رہو۔ یہ بات نہیں ہے، بلکہ مقصد یہ ہے کہ اگر یہ بات ہوتی تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم یہ نہ فرماتے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((لَا يَمْنَعَنَّ أَحَدَكُمْ أَذَانُ بِلَالٍ مِنْ سَحُورِهِ، فَإِنَّهُ يُؤَذِّنُ لِيَرْجِعَ قَائِمَكُمْ، وَيُنَبِّهَ نَائِمَكُمْ))

[صحیح بخاری، رقم: ۷۲۴۷]

((كُلُوا وَاشْرَبُوا حَتّٰى يُؤَذِّنَ ابْنُ أُمِّ مَكْتُومٍ، فَإِنَّهُ لَا يُؤَذِّنُ حَتّٰى يَطْلُعَ الْفَجْرُ))

[صحیح بخاری، رقم: ۱۹۱۸]

تم کو بلال کی اذان منع نہ کرے بلال جب اذان دے چونکہ وہ رات میں اذان دیتے ہیں حتیٰ کہ ابن اُمِّ مکتوم جب اذان دیں تو سحری کھانا بند کر دو۔ کیونکہ حضرت عبداللہ بن اُمِّ مکتوم صبح صادق ہونے کے بعد اذان دیتے تھے۔

ایک صحابی عدی بن ابی حاتم رضی اللہ عنہ تھے، انہوں نے دو دھاگے لیے ایک سیاہ اور ایک سفید اور انہیں سرہانے کے نیچے رکھ لیا اور صبح کے وقت انہیں دیکھ رہے ہیں اور کھا بھی رہے ہیں۔ اب وہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں

حاضر ہوئے کہ میں نے تو اس طرح کیا تھا تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تم نے ایسا کیوں کیا تھا؟ تو انہوں نے کہا کہ جی! قرآن میں فرمایا گیا ہے کہ سیاہ ڈورا جب سفید ڈورے سے جدا ہو جائے تو میں تو دونوں طرح کے ڈورے لے آیا تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''إِنْ كَانَ وِسَادُكَ إِذًا لَعَرِيضٌ، إِنَّمَا ذٰلِكَ بَيَاضُ النَّهَارِ مِنْ سَوَادِ اللَّيْلِ.''

[مسند احمد بن حنبل، رقم: ۱۹۳۷۰]

تمہارا سرہانہ تو بڑا ہی لمبا ہے کہ دونوں ڈورے اس کے نیچے آ گئے۔

دوسری جگہ یہ الفاظ آئے ہیں:

''إِنَّكَ لَعَرِيضُ القَفَا، إِنْ أَبْصَرْتَ الخَيْطَيْنِ، ثُمَّ قَالَ: لَا، بَلْ هُوَ سَوَادُ اللَّيْلِ وَ بَيَاضُ النَّهَارِ.''

[صحیح بخاری، رقم: ۴۵۱۰]

تمہاری گردن چوڑی ہے (کہ اس میں پوری مشرق آ جاتی ہے)۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اس سے مراد صبح صادق اور صبح کاذب ہیں۔ یہ مطلب نہیں کہ تم سیاہ اور سفید ڈورے لاکر ان کے رنگ دیکھتے رہو۔ یہ تو اللہ پاک نے ہمیں مثال دی ہے۔

دوسرا علماء کرام نے فرمایا کہ یہاں پر لفظ ﴿الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ﴾ فرمایا۔ ''خَیط'' دھاگے کو کہتے ہیں، معنی یہ ہے کہ صبح صادق کا ذرا سا حصہ بھی واضح ہو گیا تو بس کھانا پینا بند یعنی دھاگے کے برابر بھی صبح صادق ہو جائے۔ اس لیے ''خَیط'' (یعنی دھاگے) کا لفظ لانے میں بھی اللہ پاک کی حکمتیں ہیں۔

اور یہ بات بھی یاد رکھیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ﴾ معنی یہ ہے کہ ایسا بھی نہ کرو کہ صبح صادق میں ابھی بیس منٹ باقی ہیں اور کہیں کہ ابھی کھانا بند کر دو اور یہ زیادتی بھی نہ کرو کہ اذان ہو جائے، صبح صادق ہو جائے اور تم کھاتے رہو۔ جہاں جہاں صحابہ کرام کے واقعات ہیں وہ اسی حدیث پر محمول ہیں کہ بھئی! کھاتے رہے حتیٰ کہ صبح ہو گئی۔ اس کا معنی یہ نہیں کہ وہ صبح صادق تک کھاتے رہے، بلکہ معنی یہ ہے کہ وہ زیادہ سختی نہیں کرتے تھے جب تک کہ صبح صادق نہ ہو جائے۔ اس لیے حضور اکرم ﷺ نے فرما دیا کہ افطاری میں جلدی کرنا اور سحری میں تاخیر کرنا سنت ہے یعنی افطار میں سورج ڈوبا اور افطار ہو گیا۔ اب تو ہم اذان کا اس لیے انتظار کرتے ہیں کہ مسلمانوں کے ہاں سورج ڈوبتے ہی اذان ہو جاتی ہے، ورنہ روزے کے افطار

کرنے کا تعلق اذان سے نہیں ہے۔ لیکن اگر کوئی ایسی جگہ ہو کہ اذان نہ ہوتی ہو اب اگر کوئی اذان دے تو افطار کریں۔ اب مولوی صاحب کو نیند آ جائے اور وہ ایک گھنٹے کے بعد اذان دے تو ہمارا روزہ ایک گھنٹہ اور رہ جائے گا؟ نہیں، معنی یہ ہے: ﴿ثُمَّ أَتِمُّوا الصِّيَامَ إِلَى اللَّيْلِ﴾ غروب شمس کے ساتھ ہے کہ سورج ڈوبا اور افطار۔ (اگر کوئی افطار کے وقت نہ کھائے پیے تب بھی اس کا روزہ مکمل ہو جائے گا)۔ لیکن یہ یاد رکھو کہ اللہ پاک نے فرمایا: ﴿فَلَا تَقْرَبُوهَا﴾ اللہ پاک نے فرمایا کہ قریب بھی مت جاؤ۔ اس لیے علماء کرام فرماتے ہیں کہ صبح صادق سے بھی ایک دو منٹ پہلے بند کر دو۔ اس لیے کہ حکم یہ ہے کہ قریب بھی مت جاؤ۔ یہ حدیں ہیں، ان کے قریب بھی مت جاؤ۔ ﴿وَلَا تَقْرَبُوا مَالَ الْيَتِيمِ﴾ یتیم کے مال کے قریب بھی نہ جاؤ۔ اسی طرح فرمایا: ﴿وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنَىٰ﴾ زنا کے قریب بھی نہ جاؤ۔ جب تم غیر عورت سے ملو گے ہی نہیں، غیر عورت سے باتیں ہی نہیں کرو گے تو زنا کا خطرہ تو خود بخود ختم ہو گیا ناں۔ اب اگر تم یوں کہو کہ ہم زنا تو نہیں کرتے، لیکن ملنا ملانا تو آج کل کا معاشرہ ہے، اس کے بغیر تو حضرت! گزارہ نہیں ہو سکتا۔

حضور پاک ﷺ نے فرمایا کہ اس کی مثال ایسی ہے جیسے تم اپنے کھیت کے گرد باڑ لگا دیتے ہو کہ جانور وغیرہ میرا گھاس نہ چریں تو جو بکریاں اس باڑ کے قریب ہوتی ہیں کبھی کبھی وہ اندر بھی منہ مار لیتی ہیں، لیکن اگر باڑ کے قریب بھی نہ آئیں تو وہ باڑ کے اندر گھاس نہیں چھوئیں گی۔ اسی طرح مرد بھی روزے کی حالت میں اپنی بیوی سے نہ ملے، اختلاط پیدا نہ ہو یا نامحرم کو ہاتھ نہ ملائے، اتفاق سے سامنے آ جائے تو مرد اپنی آنکھیں نیچی کر لیں اور عورتیں اپنی آنکھیں نیچی کر لیں اور بغیر ضرورت کے باہر نہ نکلیں، بغیر ضرورت کے بات نہ کریں۔ اگر کوئی اجنبی بات کرے تو نرم لہجے میں بات نہ کرے، بلکہ سختی سے جواب دے، تاکہ اس کے دل میں کوئی شک وشبہ پیدا نہ ہو۔

اب تو یہاں بھی یہی حکم ہے کہ تمہیں کھانا پینا سب جائز ہے، بیوی سے ملنا بھی جائز ہے، لیکن کب تک؟ جب تک صبح صادق نہ ہو جائے۔ جب صبح صادق ہو جائے تو سب کچھ ختم ہو گیا۔ بفرض محال اگر ہم نے روزہ رکھا اور دیکھا کہ بادل ہیں تو ہم نے تحقیق کی، تصور کیا کہ سورج ڈوب گیا، پس ہم نے افطار کر لیا۔ جب افطار کر کے بیٹھ گئے تو سورج نکل آیا تو اب کیا حکم ہے؟ اب ہم گناہ گار تو نہیں ہوں گے، لیکن روزہ قضا کرنا پڑے گا۔ اس لیے کہ سورج موجود تھا اور ہم نے روزہ توڑ دیا، لیکن گناہ نہیں ہوگا۔ اس لیے کہ ہم نے تو کوشش کی تھی۔

اسی طرح مثال کے طور پر ہم سحری کھاتے رہے اور ہم نے کہا کہ سحری چار بجے بند ہوتی ہے۔ ہم نے دیکھا کہ

ہماری گھڑی میں ساڑھے تین بجے تھے، ہم نے کہا کہ ابھی آدھا گھنٹہ ہے کھاؤ پیو۔ اب آرام سے کھاتے رہے، کھاتے رہے تو کیا دیکھتے ہیں کہ آدھا گھنٹہ گھڑی ہی غلط تھی تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم نے تو صبح صادق کے بعد کھایا تو نتیجہ کیا نکلے گا کہ ہم گناہ گار تو نہیں ہوں گے، لیکن روزہ بھی نہیں ہوگا، ہمیں روزہ قضا کرنا پڑے گا۔ اس لیے کہ ہم نے صبح صادق کے بعد کھالیا ہے، جبکہ صبح صادق کے بعد کھانا پینا منع تھا۔ اسی طریقے سے یہ بات بھی سمجھیں کہ میاں بیوی آپس میں ملے اور اتفاق کی بات یہ ہے کہ جب وہ دونوں فارغ ہوئے تو صبح صادق ہوگئی۔ اب دونوں نے غسل بھی نہیں کیا اور کچھ بھی نہیں کھایا تو اسی حالت میں وہ روزے کی نیت کرلیں اور غسل بعد میں کرلیں تو روزہ درست ہوجائے گا۔ شریعت کے اندر اتنی رعایت ہے تو اللہ تعالیٰ نے ہمیں بڑی بڑی رعایتیں دی ہیں۔

دوسرا مسئلہ ﴿ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ﴾ کہ دن میں کھانے پینے سے رُکے رہو اور اب تمہارا روزہ پورا ہوگیا۔ کہاں تک پورا ہوگا؟ سورج ڈوبنے تک۔ جب سورج ڈوب جائے گا تو بس روزہ افطار کرلیں گے چاہے تم باہر نکل آئے ہو، لیکن حکم میں تم اعتکاف کے ہو یا تم مسجد میں ہو۔

﴿وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَاَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ ۙ فِي الْمَسٰجِدِ ۭ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا ۭ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ﴾ [البقرة:۱۸۷]

اعتکاف کے مسائل:

اللہ پاک نے فرمایا کہ رمضان کی راتوں میں میاں بیوی کا ملنا اور جماع کرنا حلال ہے، لیکن جب تم حالتِ اعتکاف میں ہو تو ملنا جلنا اور جماع نہ کرنا۔

یعنی اعتکاف کا معنی کیا ہوتا ہے؟ اعتکاف کا معنی یہ ہے کہ آدمی گھر بار چھوڑ کر مسجد میں آکر دس دن ڈیرہ لگالے، اسے اعتکاف کہتے ہیں۔ بغیر ضرورت کے باہر بھی نہ جائے اور بغیر ضرورت کے کسی سے باتیں بھی نہ کرے، اور اگر ضرورت ہے، مثلاً پیشاب، پاخانہ، استنجاء وغیرہ کی ہے تو اس کے لئے جاسکتا ہے۔ اللہ پاک نے فرمایا کہ جب تم اعتکاف کر بیٹھو تو پھر بیوی سے مجامعت نہیں کرسکتے۔

اچھا اعتکاف کہاں بیٹھے ہو؟ مسجد میں۔ تو بتائیں کہ کیا کوئی مسجد میں بھی جماع کرسکتا ہے؟ تو پھر ﴿وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَاَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ ۙ فِي الْمَسٰجِدِ﴾ کا کیا معنی ہے؟ جب تم حالتِ اعتکاف میں مسجد میں بیٹھے ہو تو بیوی

سے جماع نہ کرو۔ کیا مسجد میں کوئی بیوی سے جماع بھی کر سکتا ہے؟ تو معنی یہ ہوا کہ تم مسجد میں اعتکاف کی حالت میں تھے تو کھانے پینے یا پیشاب پاخانہ وغیرہ کی غرض سے نکلے تو کسی آدمی کا مثلاً مسجد کے قریب گھر ہے، وہاں قضائے حاجت کی، آگے اس کی بیوی بھی موجود تھی، اس نے سوچا کہ رات کو بیوی سے ملنا جائز ہے، جیسے رمضان کی راتوں میں جائز تھا۔ تو فرمایا کہ اب بھی بیوی سے ملنا جائز نہیں ہوگا۔ ملنے کا کیا معنی؟ جماع جائز نہیں ہوگا۔ جب کوئی اور معتکف کی خدمت کے لئے نہ ہو اور بیوی مسجد میں آجائے، کھانا، کپڑا وغیرہ پہنچا دے، خاوند نے اس کو برتن وغیرہ دے دیئے اور کوئی بات وغیرہ کر لی تو یہ منع نہیں ہے۔ اس لئے کہ حضور اکرم ﷺ کی بیویاں حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں مسجد میں آتی تھیں، حالانکہ آپ ﷺ اعتکاف کی حالت میں ہوتے تھے اور حضور پاک ﷺ مسجد سے اُٹھ کر مسجد کے دروازے تک اپنی بیوی کو چھوڑنے کے لئے آتے تھے اور پھر مسجد میں تشریف لے جاتے تھے۔ صرف ملنا منع ہے۔

لیکن بعض ائمہ فرماتے ہیں کہ مسجد سے مراد وہ مسجد ہے جہاں جمعہ ہوتا ہے، مسجد سے مراد وہ مسجد ہے جہاں جماعت ہوتی ہے۔ اعتکاف ہر مسجد میں جائز ہے اور عورت اپنے گھر میں جگہ مقرر کر کے وہاں اعتکاف میں بیٹھ سکتی ہے۔ سنت اعتکاف رمضان المبارک کا آخری عشرہ ہے اور اگر کوئی شخص پورا مہینہ اعتکاف میں بیٹھنا چاہے تو یہ بھی جائز ہے، اور اگر بیس دن بیٹھنا چاہے تو یہ بھی جائز ہے۔ یہاں تک علماء کرام نے لکھا ہے کہ اگر کوئی آدمی مسجد میں داخل ہوتا ہے اور دعا پڑھتا ہے: ''بِسْمِ اللّٰهِ وَ الصَّلٰوةُ وَ السَّلَامُ عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ، اَللّٰهُمَّ افْتَحْ لِيْ أَبْوَابَ رَحْمَتِكَ'' تو اگر کوئی شخص وہیں پر یہ نیت بھی کر لے کہ اے اللہ! جتنی دیر مسجد میں رہوں گا، اتنی دیر کے لیے میری اعتکاف کی نیت ہے تو اللہ پاک اس کو بھی اعتکاف کا ثواب عطا فرما دیتے ہیں۔ لہٰذا اگر کوئی شخص کچھ وقت کے لیے مسجد میں داخل ہوا اور وہ اتنے وقت کے لیے اعتکاف کی نیت بھی کر لے تو وہ بھی جائز ہے۔

یہ مسئلہ بھی سمجھ لیں کہ یہ تو سنت اعتکاف ہے، لیکن ہمارے محلے میں سے کوئی ایک دو آدمی بھی رمضان کے آخری عشرہ میں اعتکاف بیٹھ گئے تو باقی لوگوں پر اعتکاف چھوڑنے کا گناہ نہیں ہوگا اور اگر کوئی بھی اعتکاف نہ بیٹھے تو ترک سنت کا گناہ ہوگا۔

اب اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ﴾ یہ جتنے بھی احکام بیان کیے، یہ اللہ تعالیٰ کی حدیں ہیں، ﴿فَلَا تَقْرَبُوْهَا﴾ ان حدوں کو نہ توڑنا اور نہ ہی ان حدوں کے قریب جانا، تا کہ کہیں غلطی نہ ہو جائے۔ ﴿كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ

اٰیٰتِہٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ﴾ اسی طرح اللہ تعالیٰ اپنے احکام کو لوگوں کے لیے کھول کھول کر بیان کرتے ہیں، تاکہ وہ تقویٰ اور پرہیزگاری حاصل کرسکیں اور روزہ زیادہ تقویٰ حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔

﴿وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴾ [البقرۃ:۱۸۸]

''اور نہ کھاؤ ایک دوسرے کے اموال آپس میں ناحق اور نہ ڈالو ان کو حکام کے ہاں (رشوت میں) تاکہ کھا جاؤ لوگوں کے اموال میں سے کوئی حصہ ظلم کرکے اور تمہیں معلوم ہے۔''

ماقبل آیات سے ربط:

اللہ پاک نے پہلے تو روزہ کا حکم دیا اور فرمایا کہ روزہ اُمت محمد مصطفیٰ ﷺ پر فرض ہے اور روزہ ارکانِ اسلام میں سے ایک رکن ہے اور اس کے بعد اللہ پاک نے فرمایا کہ روزہ صرف ایک ماہ کے لئے فرض ہے اور وہ رمضان المبارک کا مہینہ ہے، جس میں تمام کتابیں نازل ہوئیں اور سب سے افضل کتاب یعنی قرآن پاک بھی اسی مہینہ میں نازل ہوا اور اسی مہینہ میں لیلۃ القدر ہے اور اسی مہینہ میں اللہ تعالیٰ نے روزے فرض کیے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے روزہ کے متعلق احکامات بیان فرمائے۔ اللہ پاک نے روزہ کے احکام میں اپنے بندوں سے رعایت فرمائی۔ اس کے آخر میں اللہ پاک نے اعتکاف کا حکم بیان فرمایا کہ اعتکاف بیٹھنا سنتِ محمد مصطفیٰ ﷺ ہے اور سب سے افضل اعتکاف رمضان المبارک کے آخری دس ایام ہیں۔ اور اعتکاف کے دنوں میں مزید حکم یہ تھا کہ جیسے رمضان کے دیگر ایام کی راتوں میں معتکف کے لیے بیوی سے ملنا جائز نہیں ہے اعتکاف کی باقی راتوں میں بیوی سے ملنا بھی جائز نہیں۔ پھر اللہ پاک نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے کھول کھول کر یہ احکامات بیان فرمائے ہیں، تاکہ تم پرہیزگاری حاصل کرسکو اور متقین کی صفوں میں شامل ہوسکو۔ اور روزہ میں چونکہ صبر کی تعلیم ہے اور اپنے آپ کو روکنے کی تعلیم ہے اور قوائے شہوانیہ کے توڑنے کی تعلیم ہے اور قوائے ملکیہ کے اُبھارنے کی تعلیم ہے تو تقویٰ کے لئے روزہ بہت بڑی نعمت ثابت ہوئی۔ اور روزہ ایسی عبادت ہے جس میں ریا نہیں ہے، ہر عبادت میں ریاء ہوسکتی ہے، جیسے آپ

نماز پڑھ رہے ہوں، دیکھنے والے دیکھتے ہیں۔ اب خیرات کریں تو آپ کسی کو تو دیں گے تو وہ دیکھے گا، لیکن روزہ ایسی عبادت ہے جس کا تعلق اللہ اور بندے کے ساتھ ہے اور کوئی نہیں جان سکتا کہ آپ روزے سے ہیں کہ نہیں ہیں، اگر روزے سے ہیں تو کتنی مشقت میں ہیں؟ کسی دوسرے شخص کو اس کا احساس نہیں ہو سکتا۔ جیسے خدانخواستہ کوئی آدمی روزہ نہ رکھے اور گھر میں جا کر پانی پیتا رہے تو کسی کو کیا پتہ چلے گا اور اگر آپ نے روزہ رکھا ہوا ہے تو دیکھنے والے کو پتہ نہیں چلتا کہ یہ روزے سے ہے کہ نہیں ہے۔ اس آیت کا گزشتہ آیات کے ساتھ بظاہر کوئی تعلق اور جوڑ معلوم نہیں ہوتا۔

﴿وَلَا تَأْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ﴾ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ دھوکے سے مال کھانا، اس میں تمام بیوع فاسدہ آگئیں، جتنی بیوع حرام ہیں وہ سب آگئیں۔ کتب فقہ میں ان کی تفاصیل موجود ہیں۔ ان کے ذریعہ سے مال کھانا، یہ بھی باطل ہے۔ اسی طرح جُوا، سٹہ، قمار بازی وغیرہ سب باطل ہیں کہ ہزاروں آدمیوں کو لُوٹ کر ایک آدمی کا گھر بھرا جاتا ہے۔ اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا۔ مثلاً جُوا کہ آپ ایک پرچی ڈالتے ہیں اور وہ تمہارے نام نکل آتی ہے اور آپ جیت جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جی! یہ تو قسمت کا کھیل ہے۔ قسمت تو تب ہو کہ اللہ پاک نے اس کی اجازت بھی دی ہو، جس چیز کو اللہ تعالیٰ نے حرام کر دیا ہے تو وہاں پر قسمت کا کیا تعلق ہے؟ وہاں قسمت آزمانے کا کیا مسئلہ ہے؟ اسی طرح رشوت کا مال، ڈاکہ، چوری، یتیموں کا مال، دھوکے سے کسی کا مال حاصل کرنا، اسی طرح پاسپورٹ بیچنا، بندوں کو بیچنا، ویزے بیچنا، غلط اور حرام چیزوں کو بیچنا سب اموال بالباطل ہیں۔

مال حرام کی اقسام واحکام:

اللہ تعالیٰ نے ہمیں منع فرما دیا: ﴿وَلَا تَأْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ﴾ یہاں پر ﴿اَمْوَالَكُمْ﴾ فرمایا، کیا معنی کہ تمہارا مال۔ مطلب یہ ہے کہ یہ جو تم اپنے بھائی کا مال لُوٹ رہے ہو یا دھوکے سے کھا رہے ہو در اصل یہ تمہارے بھائی کا مال گویا تمہارا مال ہے اس لیے کہ تم مسلمان ہو اور مسلمان تو ایک دوسرے کے بھائی ہوتے ہیں، ایک دوسرے سے اُخوتِ ایمانی رکھتے ہیں۔ اب جیسے تم اس کا مال لُوٹ رہے ہو، ایسے کوئی دوسرا آدمی آکر تمہارا مال لُوٹ لے گا۔ لہٰذا تم کسی دوسرے کا مال نہیں لُوٹ رہے، بلکہ حقیقت میں اپنا مال لُوٹ رہے ہو، تم اپنے مال کو حرام کر کے کھا رہے ہو۔

اگر ہم حرام مال کی ان تمام اقسام سے بچ جائیں تو دنیا کے سارے جھگڑے ختم ہو جاتے ہیں اللہ تعالیٰ رحمت فرمائے چونکہ ہم معاشیات کے طالب علم نہیں ہیں لیکن جو لوگ اس کو سمجھتے ہیں تو دیکھیں کہ جب آپ دنیا کے کافروں سے کسی قسم کا کوئی قرض لیتے ہیں تو آپ کو بظاہر ایک سنہرا خواب نظر آتا ہے کہ جی! ہم کو اتنا قرضہ مل گیا۔ لیکن اگر آپ بیٹھ کر اس کا تجزیہ کریں کہ انہوں نے آپ کو قرضہ نہیں دیا، بلکہ وہ تو آپ کا خون بھی نچوڑ لیتے ہیں۔ اگر آپ اس کا تجزیہ کریں گے کہ انہوں نے جو قرضہ دیا ہے وہ قرضہ نہیں دیا، بلکہ انہوں نے ایسے حالات پیدا کر دیئے ہیں کہ تمہارا خون نچوڑ کر وہ اپنی تجوریاں بھر ڈالیں اور تم اسی طرح غریب تر ہوتے چلے جاؤ، ان کے مقروض ہونے کے بعد دیتے چلے جاؤ۔

جیسے ہمارے ملک میں بے چارے لوگ سودی قرضہ لیتے ہیں کہ اگر باپ نے قرضہ لیا تھا تو بیٹے بیچارے جائیدادیں بیچ کر قرضہ ادا کرتے ہیں، جائیدادیں اور زمینیں بک گئیں اور بعض لوگوں نے اس سود کاری کے چکروں میں اپنی بیٹیوں کی عزتیں اور عصمتیں بیچ ڈالیں۔ اپنی لڑکیاں بوڑھوں کو دینی پڑیں کہ کسی طریقے سے ہماری قرض سے جان چھوٹ جائے لیکن قرضہ پھر بھی بڑھتا چلا جاتا ہے۔ یہ ایسی آکاس بیل ہے، ایسی لوط کی ٹہنی ہے کہ جس درخت پر ڈال دو، اس کو کھا جاتی ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان تمام چیزوں کو منع فرما دیا کہ ایسے طریقے اختیار کرنا اسلام کے اندر جائز نہیں، بلکہ تم خالص حلال طریقے سے کام کرو۔

حرام طریقہ سے مال کھانے کے مسائل:

اگلا مسئلہ اللہ پاک نے بیان فرمایا: ﴿وَتُدْلُوا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴾ اب مسئلہ یہ ہے کہ مثلاً ایک آدمی جھوٹا ہے، لیکن وہ یہ سمجھتا ہے کہ میرے پاس ایسے ذرائع موجود ہیں کہ اگر میں کورٹ میں جا کر دعویٰ کروں اور میرے پاس جھوٹے گواہ بھی ہیں، جھوٹی دستاویزات بھی بنا سکتا ہوں اور یہ آدمی جاہل ہے اور اس کی جائیدادیں قانوناً قبضہ میں کر سکتا ہوں۔

جیسے بعض لوگ بے چارے فوت ہو گئے۔ انہوں نے اپنی جائیداد مثلاً مکان، دکان وغیرہ آپ کو کرائے پر دی تھی۔ اب جب مالک مر گیا تو جو کرایہ دار تھا، وہ بڑا تیز اور شرارتی تھا، اس نے مرنے والے کا انگوٹھا بھی لگا لیا اور دو گواہ بھی بنا لیے اور عدالت میں جا کر دعویٰ کر دیا کہ یہ مکان میرا ہے، یہ تو اس آدمی نے مجھے بیچا تھا۔ اب انگوٹھے کی

شناخت کیسے کروائیں کہ وہ تو قبر میں چلا گیا ہے؟ اس کا بیان کیسے لیں کہ وہ تو مر چکا ہے؟ اب جو دو گواہ ہیں، وہ بھی اس کی اپنی پارٹی کے ہیں اور وہ گواہی دیتے ہیں کہ جناب! بالکل ٹھیک ہے، وہ آدمی آیا تھا اور اس نے ہمارے سامنے پیسے لئے اور اس مکان کو بیچا تھا اور یہ کہا تھا کہ میرے بچوں کو نہ بتانا کہ وہ پریشان ہوں گے۔ وہ تو جناب! کورٹ اس کے حق میں فیصلہ کر دیتی ہے کہ مکان اس کا ہے۔

تو اللہ پاک نے منع فرمایا ہے کہ تم جھوٹے ہونے کے باوجود تم جانتے ہو کہ میں جھوٹا ہوں، میری دستاویزات جھوٹی ہیں، تم جانتے ہو کہ میرے گواہ جھوٹے ہیں، لیکن تم عدالت کے ذریعے اس کو حلال کر کے جو کھا رہے ہو، یہ حلال نہیں ہوتا، عدالت حلال نہیں کر سکتی۔

عدالت نے اگر جھوٹی شہادت کی بناء پر فیصلہ کر دیا ہے تو تمہارے لئے قیامت کے دن اسی طرح جہنم کا ٹکڑا بنے گا۔ تم یہ نہ سمجھو کہ قانون نے میرے لیے حلال کر دیا۔ مجھے تو جی! کورٹ نے کہہ دیا ہے کہ آپ کا ہے، یہ میرے لیے حلال ہے۔ اللہ پاک نے فرمایا کہ تم تو جانتے ہو کہ یہ میرے لیے حرام ہے۔ اسی لئے میرے آقا خاتم الانبیاء سرکارِ مدینہ ﷺ نے فرمایا کہ اے لوگو! دیکھو، میرے پاس مدعی اور مدعا علیہ آتے ہیں اور ان میں سے بعض ایسے ہوتے ہیں کہ ان کو بات کرنی آتی ہے کہ جھوٹے ہونے کے باوجود ایسے لگتا ہے کہ وہ سچا ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر اس کی بات میں آکر میں کوئی فیصلہ کر دوں، حالانکہ وہ حق پر نہ ہو تو یہ نہ سمجھنا کہ اللہ کے نبی نے مجھے دے دیا ہے، بلکہ وہ جہنم کا ایک ٹکڑا ہوگا جو تیرے لیے عذاب کا باعث بنے گا۔ اس لیے کہ اس نے تو اپنی چالاکی سے اپنی ملکیت کو ثابت کر دیا ہے۔

اسی طرح ایک اور واقعہ ہے کہ ایک آدمی آپ ﷺ کی خدمت میں آیا اور اس نے دعویٰ کیا کہ یا رسول اللہ! فلاں چیز میری ہے اور اسلام کا ایک واضح اُصول ہے کہ آپ نے دعویٰ کیا ہے تو گواہوں کے ذریعے ثبوت آپ کے ذمہ ہے اور مدعا علیہ اگر مان لے تو بات ختم۔ اور اگر وہ انکار کرنے والا ہے اور مدعی کے پاس گواہ بھی نہیں ہیں تو مدعا علیہ قسم کھالے تو بھی آپ کو بات تسلیم کرنی ہوگی۔ پس حضور اکرم ﷺ نے مدعی کو بلایا اور فرمایا کہ ثبوت پیش کرو تو اس نے کہا کہ حضور! ثبوت تو کوئی نہیں ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں سچا ہوں، لیکن اتفاق کی بات یہ ہے کہ میرے پاس گواہ نہیں ہیں اور حالات ایسے ہیں کہ اس واقعہ کو جاننے والا کوئی نہیں ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ اسلام کا

تو بڑا واضح حکم ہے کہ اگر تمہارے پاس ثبوت نہیں ہیں تو ہم مدعا علیہ کو قسم دیتے ہیں اور تم اس کی قسم پر اعتبار کر لینا۔ اس نے کہا: حضور! ٹھیک ہے، شریعت جو حکم دیتی ہے وہ میری آنکھوں پر۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ قسم کھانے سے پہلے سوچ لو کہ اللہ پاک کا قرآن ہے: ﴿إِنَّ الَّذِينَ يَشْتَرُونَ بِعَهْدِ اللَّهِ وَأَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيلًا﴾ [آل عمران: ۷۷] کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کے عہد کو توڑتے ہیں اور جھوٹی قسمیں کھاتے ہیں، ان کے لیے جہنم کا بڑا دردناک عذاب ہے۔ یہ نہ سمجھنا کہ میں جھوٹی قسم کھا کے نکل گیا اور آگے کوئی نہیں پوچھے گا تو پھر ایک ایک ذرّے کا حساب ہوگا، پھر اس وقت تو دنیا کا عذاب نہیں، بلکہ جہنم کا عذاب ملے گا۔ اللہ تعالیٰ کے پاک پیغمبر ﷺ نے جب یہ آیت پڑھی تو اس نے کہا: حضور! اگر معافی دیں تو میں عرض کروں۔ فرمایا: بتاؤ، کیا بات ہے؟ اس نے کہا کہ میں تو جھوٹی قسم کھا رہا تھا، مدعی سچا ہے اور یہ چیز اسی کی ہے۔ اس پر بھی اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا۔

تنسیخ نکاح کے بعد دوسری جگہ شادی:

اسی طرح جیسے ہمارے ملک میں رواج ہے کہ جیسے کوئی آدمی عرب ممالک میں یا کسی ملک میں نوکری کے لیے چلا گیا۔ اب اس کی بیوی کے ساتھ کسی شیطان نے ناجائز تعلقات پیدا کر لیے، اس کو راضی کر کے کورٹ میں جا کر تنسیخ نکاح کا دعویٰ دائر کر دیا۔ اب تنسیخ نکاح کے دعوےٰ کے بعد لازمی بات ہے کہ کورٹ اس کے شوہر کو طلب کرے گی، وہاں سے باقاعدہ سمن نکالے گی اور ان کی رجسٹری ایسے انداز سے کی گئی کہ رجسٹری بھیج دی گئی اور یہاں اپنے بندے سے اس پر تعمیل کے دستخط کروا کر واپس منگوا لیے اور شوہر کو بتایا ہی نہیں یا سمن کورٹ سے تو نکلتے ہیں، لیکن باہر جاتے ہی نہیں اور تعمیل کرانے والوں کو پیسے دے دیئے گئے اور انہوں نے لکھ دیا کہ تعمیل سمن کرانے کے لیے بندہ گیا تھا لیکن شوہر چھپ جاتا ہے، وہ ہمیں مل نہیں رہا۔ اب ایک رپورٹ آئی، دوسری رپورٹ آئی اور اس کے بعد یکطرفہ ڈگری مل گئی اور عورت کو تنسیخِ نکاح مل گئی۔ شوہر بے چارا یہاں بیٹھا ہوا ہے اور عورت نے تنسیخ نکاح کی ڈگری لے لی اور نکاح کر لیا اور کسی نے کہا تو جواب دیا کہ ہم نے تو عدالت سے فیصلہ لیا ہے۔ ایسی عدالت سے حرام تو حلال نہیں ہوتا اور نہ کوئی حلال حرام ہو جاتا ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرما دیا کہ تم جانتے ہو کہ تم جھوٹے ہو۔ جب تمہیں پتہ ہے کہ اس بات پر میرا حق نہیں بنتا ہے تو پھر تم دھوکہ دے کر لے رہے ہو تو یہ تمہارے لیے حرام ہے۔



دودھ روکے ہوئے جانور کا بیچنا اور اس کی قیمت کا حکم:

اسی طرح مثلاً ایک آدمی نے گائے خریدی ہے، بھینس خریدی ہے اور دودھ والے جانوروں کی قیمت دودھ سے لگتی ہے جتنا دودھ زیادہ ہوگا اتنی ہی زیادہ قیمت لگے گی۔ مثلاً ایک گائے دس کلو دودھ دیتی ہے تو قیمت بھی دس ہزار ہوگی اور اگر وہی گائے دو کلو دودھ دیتی ہے تو اس کی قیمت دو ہزار ہو جائے گی۔ تو بعض لوگ اس کو اچھا چارہ کھلاتے ہیں اور ایک دو دن اس کا دودھ نہیں نکالتے، اب کے تھن بھر گئے اور دودھ جمع ہے اور لینے والے کو بلایا کہ جی! آپ اپنے ہاتھ سے دودھ نکالیں۔ اس نے جب دودھ نکالا تو دس کلو نکل آیا تو اس نے کہا: ٹھیک ہے جی! یہ لو دس ہزار اور اس نے کہا کہ جی! آپ نے خود دیکھ لیا ہے کہ دس کلو دودھ ہے اور آپ نے اپنے ہاتھوں سے نکالا ہے۔ لیکن اللہ پاک فرماتا ہے کہ میں تو جانتا ہوں کہ تم نے کیا کیا ہے تو یہ بیع بھی حرام ہے۔

اسی لیے اسلام نے ایسی بیوع کہ مثلاً آپ کے باغ میں پھل نہیں پکے اور آم نہیں آئے، ابھی اس کا تھوڑا تھوڑا بور لگا ہوا ہے اور آپ نے سودا کر لیا ہے، یہ بیع بھی حرام ہے۔ اس لیے کہ پتہ نہیں کہ کل کو پھل لگے گا یا نہیں لگے گا۔ پس شریعت میں اس بیع کو حرام قرار دیا گیا ہے۔

زمانہ جاہلیت کی خرید و فروخت:

اسی طرح زمانہ جاہلیت میں ایک رواج تھا کہ کپڑا لے کر کھڑے ہو جاتے تھے اور آواز لگاتے تھے کہ دس ریال، دس ریال، دس ریال۔ پس خریدار نے کہا کہ ٹھیک ہے بس کپڑا پھینک دیا کہ ٹھیک ہے دس ریال میں قبول ہو گیا۔ اب گھر جا کر کھولا تو دیکھا کہ دس جگہوں سے پھٹا ہوا ہے تو یہ بیع بھی شریعت میں حرام ہے۔

اسی طرح زمانہ جاہلیت میں کنکری کے پھینکنے کے بعد سودے ہوا کرتے تھے کہ مثلاً کنکری اُٹھا کر پھینک دی کہ میری کنکری جس کپڑے پر پڑ جائے تو وہ میرا ہو گیا۔ یہ بھی حرام ہے۔

اسی طرح آپ کوئی چیز بیچتے ہیں اور آپ کو اپنی چیز کے عیب کا پتہ ہے اور آپ دھوکے سے اس کے عیب پر پردہ ڈال دیتے ہیں تو یہ بھی حرام ہے۔ تجارت کرنا کوئی عیب نہیں، بلکہ سنت نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والتسلیم ہے۔ آپ ﷺ نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے مال سے تجارت کی اور قرآن وحدیث میں تجارت کا تذکرہ ہے، بلکہ بعض علماء کرام نے تو یہ بھی فرمایا ہے کیونکہ قرآن وحدیث میں تجارت کا تذکرہ ہے، اسی لیے تجارت میں بندے کے لیے

بہت برکت اور زیادہ نفع ہے۔ لیکن یہ کہ تجارت سود، دھوکہ اور حرام اُمور سے پاک ہو۔

قیامت کے دن تین سوالات سے پہلے کوئی نہیں ہل سکے گا:

اس لیے نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

”لَا تَزُوْلُ قَدَمُ ابْنِ آدَمَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مِنْ عِنْدِ رَبِّهٖ حَتّٰى يُسْئَلَ.“ [جامع ترمذی، رقم:۲۴۱۶]

قیامت کے دن میدانِ حشر میں کسی بندے کے پاؤں نہیں ہلیں گے جب تک کہ ان پانچ چیزوں کے بارے میں سوال نہیں کیا جائے گا کہ زندگی اور جوانی کہاں خرچ کی؟ مال کہاں سے حاصل کیا اور کہاں کہاں خرچ کیا؟ اور اسی طرح سوال کیا جائے گا کہ میں نے تجھے جو علم دیا تھا، اس پر تُو نے خود بھی عمل کیا کہ نہیں؟

حرام کھانے کا نتیجہ:

حرام کھانے سے دعا قبول نہیں ہوتی، آدمی گناہوں کی طرف مائل ہوگا، عبادت میں لذت نہیں ہوگی، اللہ تعالیٰ کا خوف جاتا رہے گا اور اولاد بھی بد ہوگی۔ حرام سے بدن میں جو دودھ پیدا ہوا وہ بھی مال حرام کی پیداوار ہے، جب حرام چیزوں سے بچوں کو جوان کیا تو ان سے کیا توقع ہوگی کہ وہ قرآن و سنت پر عمل کرنے والے بنیں گے؟

حلال رزق کی برکات وثمرات:

حلال کی سوکھی روٹی سے پلنے والا امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تھا۔ جب حلال روٹی اندر جاتی تھی تو مولوی الیاس بنتا تھا جس نے پوری دنیا میں تبلیغ کو پھیلا دیا۔ جب حلال کی روٹی اندر جاتی تھی تو شیخ الہند بنتا تھا، انور شاہ کشمیری بنتا تھا۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے پاس نہ تو تیر و تلوار تھے نہ کوئی نئی ٹیکنالوجی، میزائل اور راکٹ وغیرہ تھے، کیا بات تھی کہ عمر مدینہ میں بیٹھا ہے اور دریاؤں کو خط لکھتا ہے کہ چلتے ہو تو چلو، ورنہ بند ہو جاؤ۔ آج ہمیں ہندو ڈراتا ہے اور کافر ہم پر ہنستا ہے اور بتوں کا پجاری ہماری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مذاق اُڑاتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ہمارے اندر سب کچھ ہے، لیکن اسلام نہیں ہے۔ لہٰذا ہمیں اکلِ باطل سے بچنا چاہیے اور اکلِ حلال کا اہتمام کرنا چاہیے۔

﴿يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ ؕ قُلْ هِيَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ ؕ وَلَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى ۚ وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا ۪ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۱۸۹﴾﴾ [البقرۃ:۱۸۹]

''آپ سے نئے چاند کا حال پوچھتے ہیں، کہہ دیجیے یہ (تغیر) لوگوں کے اوقات (معلوم کرنے) اور حج کے لیے ہیں اور یہ نیکی نہیں کہ تم (احرام کی حالت میں) گھروں میں ان کی پشت کی طرف سے آؤ، بلکہ نیکی وہ ہے جو اللہ سے ڈرے، اور اپنے گھروں میں (احرام کی حالت میں) ان کے دروازوں سے آؤ اور اللہ سے ڈرو، تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ۔''

شانِ نزول اور چاند سے متعلقہ شرعی احکام:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ لوگوں نے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے چاند کے ابتدائی دنوں کے بارے میں پوچھا کہ سورج ایک حالت میں ہے اور چاند بڑھتا اور گھٹتا رہتا ہے تو اس میں ہمارے لئے کیا مصلحتیں اور کیا مفادات ہیں؟ تو اللہ پاک نے قرآن پاک میں یہ آیات نازل فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لیے چاند کا گھٹنا اور بڑھنا اس لیے بنا دیا ہے کہ وہ اپنے دین کے مسائل کو سمجھ سکیں اور اپنی عورتوں کی عدت کے معاملات اور ان کے آپس کے معاہدات کا تعلق چاند اور قمری تاریخوں کے ساتھ ہے۔ نیز روزوں کے متعلق کہ کب روزہ شروع ہوگا اور کب ختم ہوگا؟ ان سب کا تعلق چاند کے ساتھ ہے۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''إِنَّ اللهَ قَدْ جَعَلَ الْأَهِلَّةَ مَوَاقِيتَ فَإِذَا رَأَيْتُمُوهُ فَصُومُوا وَ إِذَا رَأَيْتُمُوهُ فَأَفْطِرُوا، فَإِنْ غُمَّ عَلَيْكُمْ فَاقْدُرُوا لَهُ.'' [مستدرک الحاکم، رقم:۱۵۳۹]

اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے چاند مقرر کر دیا ہے، اس کو دیکھ کر روزے شروع کرو اور اسے دیکھ کر روزہ کو افطار کرلو۔ مطلب یہ ہے کہ روزہ کا فیصلہ بھی چاند پر ہوگا اور عید کا فیصلہ بھی چاند پر ہوگا۔

اللہ تعالیٰ نے یہاں پر ایک سوال کے جواب میں قرآن پاک اُتارا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سوال پوچھا کہ یہ چاند ابتداء میں باریک ہوتا ہے، پھر بڑھتا ہے اور بڑھتے بڑھتے مکمل ہو جاتا ہے اور پھر گھٹنا شروع ہو جاتا ہے، لیکن سورج اپنی ایک ہی حالت میں رہتا ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جماعت ایسی پاکیزہ جماعت تھی کہ جنہوں نے صرف چودہ سوالات حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھے ہیں، حالانکہ پہلی کئی اُمتیں کثرتِ سوال کی وجہ سے ہلاک ہو گئیں۔ صحابہ

کرام رضی اللہ عنہم کا کمال ادب تھا کہ وہ زیادہ سوالات نہیں پوچھتے تھے، بلکہ وہ سوالات پوچھتے تھے جن سے اُمت کو کوئی فائدہ ہوتا تھا۔ ان چودہ سوالات میں سے چھ سوالات تو سورۃ البقرہ میں مذکور ہیں اور باقی آٹھ سوالات باقی سورتوں میں ہیں۔

پہلا سوال: ﴿وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ﴾ (اور جب میرے بندے آپ سے میرے بارے میں سوال کریں تو بے شک میں قریب ہوں)۔

دوسرا سوال: ﴿يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ﴾ (آپ سے سوال کرتے ہیں کہ ہم کتنا خرچ کریں)۔

تیسرا سوال: ﴿يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ﴾ (آپ سے سوال کرتے ہیں کہ حرمت والے مہینے کون سے ہیں اور حرمت سے کیا مراد ہے؟)۔ ان کو جواب دیا گیا کہ حرمت والے مہینے چار ہیں۔ ان کی حرمت یہ ہے کہ ان میں جنگ نہ کی جائے۔ وہ چار مہینے یہ ہیں: (۱) ذی القعدہ، (۲) ذی الحجہ، (۳) محرم الحرام، (۴) رجب۔

چوتھا سوال: ﴿وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ ۭ قُلْ هُوَ اَذًى ۙ فَاعْتَزِلُوا النِّسَاۗءَ فِي الْمَحِيْضِ﴾ (انسان کی بیوی حیض کی حالت میں ہو تو کیا حکم ہے کہ میاں بیوی حیض کی حالت میں مل سکتے ہیں یا نہیں؟ تو حکم یہ ہے کہ نہیں مل سکتے۔ اس لیے کہ یہ پلید ہے اور گندگی ہے۔ اس لیے مرد ایامِ حیض میں اپنی بیوی کے ساتھ مجامعت کرنے سے دور رہے اور بالکل اس کے قریب بھی نہ جائے، حتیٰ کہ بیوی پاک ہو کر غسل کرلے اور صاف ہو جائے تو ان کے لیے بیوی حلال ہے۔

پانچواں سوال: ﴿يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ﴾ (آپ سے شراب اور جوئے کے متعلق سوال کرتے ہیں)۔

چھٹا سوال: ﴿يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ﴾ اس سوال کے اندر تو یہ ہے کہ اس کے گھٹنے اور بڑھنے میں ہمارے لیے مصلحت ہے اور ایک یہ ہے کہ اس کے گھٹنے اور بڑھنے کی حقیقت کیا ہے؟ یہ کیوں اور کیسے گھٹتا اور بڑھتا ہے؟ یہ سوال تو فضول ہے، اللہ تعالیٰ تو اپنے بندوں کو فضول باتوں میں ڈالنا چاہتا ہی نہیں ہے۔ آج تک لوگوں نے چاند تاروں کے بارے میں جو بھی بحثیں کی ہیں، ان کا کوئی فائدہ نہیں ہوا اور ان چیزوں کی تحقیقات پر جو پیسہ خرچ کیا گیا، اگر اس کا حساب کیا جائے تو اتنا پیسہ بنتا ہے کہ اگر اسے ساری دنیا پر تقسیم کیا جائے تو دنیا میں کوئی غریب باقی نہ رہے۔ اللہ پاک نے ہمارے لئے واضح کر دیا کہ ہم نے ستارے آسمانوں کی زینت کے لیے بنائے ہیں، ﴿وَعَلٰمٰتٍ ۭ وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُوْنَ ⑯﴾ [النحل:۱۶] اور تیرے لئے راستہ دکھانے کے لئے ایک ذریعہ ہیں، اور پھر آسمانوں کی

حفاظت کے لئے شہاب ثاقب بنائے ہیں، تا کہ شیاطین آسمانی باتیں نہ سن سکیں۔ یہ جو چیزیں اللہ پاک نے بتادی ہیں، وہ کافی ہیں۔ اس لئے یہ بات سمجھیں کہ ان کا سوال اگر مصالح کے بارے میں ہے تو یہ ٹھیک ہے اور اگر مثال کے طور پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی حقیقت کے بارے میں سوال کیا تھا تو یہ بات اگرچہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مزاج سے بعید ہے، پھر بھی جواب مصلحت کے بارے میں دیا گیا۔ اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ تم اس چکر میں نہ پڑو۔ جیسے کسی آدمی کو پیاس لگی ہو اور وہ پانی پانی کی آواز لگائے، اب کوئی آدمی پانی لے کر حاضر ہو جائے تو اس کا کام یہ ہے کہ وہ چپ کر کے پانی پی لے اور اپنی پیاس بجھالے اور اس چکر میں نہ پڑے کہ پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ پانی کیسے بنتا ہے؟ اس میں ہائیڈروجن کی کتنی مقدار ہوتی ہے اور فلاں فلاں چیز کی کیا نسبت ہے؟ اس طرح کرے گا تو پانی پینے سے پہلے مر جائے گا۔ بھئی! حقیقت کو کیوں دریافت کر رہے ہو؟ تم اپنی غرض پوری کرو کہ جس مقصد کے لئے اللہ پاک نے تم کو پانی دیا ہے تم پانی پی لو ٹھیک ہے۔ پس اللہ پاک نے جواب یہ دیا: ﴿قُلْ هِيَ مَوَاقِيتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ﴾ [البقرة:۱۸۹]

﴿الْأَهِلَّةِ﴾، ہلال کی جمع ہے۔ ہلال کا معنی یہ ہے کہ جو پہلی چند راتیں ہوتی ہیں، مثلاً پہلی، دوسری اور تیسری رات، ان میں جو چاند ہوتا ہے اسے ہلال کہتے ہیں اور اس کے منازل بدلتے رہتے ہیں حتیٰ کہ وہ بدر کامل بن جاتا ہے اور چودھویں کی رات میں آ کر اس دائرہ مکمل ہو جاتا ہے، پھر اس کے بعد گھٹتے گھٹتے ایسے ہو جاتا ہے: ﴿كَالْعُرْجُونِ الْقَدِيمِ﴾ [یس:۳۹] جیسے کھجور کی ٹہنی سوکھ کر ٹیڑھی ہو جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے چاند کا گھٹنا بڑھنا تمہارے لئے اوقات کار کی تقسیم کے لئے اور حج کے لئے بنایا ہے۔

معنی یہ ہے کہ بعض معاملات اختیاری ہوتے ہیں اور بعض معاملات غیر اختیاری ہوتے ہیں۔ مثلاً میں نے آپ سے قرضہ لیا اور کہا کہ میں آپ کو ایک ماہ کے بعد دوں گا تو اب وہ ایک ماہ کا حساب چاند کی تاریخ سے کریں گے۔

اسی طرح اگر ہم یہ معاہدہ کریں کہ ہم یہ کام اکٹھے کر لیتے ہیں اور سال کے بعد حساب کریں گے۔ تو اب معاہدے کا وقت کیسے متعین کریں گے؟ چاند سے یہ معاملات اختیاری ہوئے۔

اسی طرح بعض معاملات ہمارے اختیار میں نہیں ہوتے، بلکہ ان کا نظام اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے، جیسے حج ہے کہ وہ سال میں ایک دن آئے گا، چنانچہ نو ذی الحجہ کو ہم نے حج کے لئے عرفات میں جانا ہے، اس کا حساب بھی چاند سے ہوگا۔

اسی طرح رمضان المبارک کے روزوں کا حساب بھی چاند سے ہوگا۔

اسی طرح ایام حیض کے دنوں کا شمار بھی چاند کی تاریخوں کے حساب سے ہوگا۔ اور اسی طرح کسی عورت کا خاوند مرجائے تو اس کی عدت چار ماہ دس دن ہوتی ہے، وہ بھی چاند کے حساب سے شمار ہوگی۔ پس اللہ تعالیٰ نے بیان فرما دیا کہ اس کے گھٹنے اور بڑھنے میں آپ کے لیے فائدہ ہے کہ میقات، عدتیں، معاہدے، حج، روزہ وغیرہ تمام کا مسئلہ چاند کے حساب پر موقوف ہے۔

لیکن یاد رکھیں کہ حساب چاند سے بھی ہوتا ہے اور سورج سے بھی ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سورج کا بھی قرآن پاک میں ذکر فرمایا ہے۔ اللہ پاک نے جہاں ﴿یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ ؕ قُلْ هِیَ مَوَاقِیْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ﴾ فرمایا ہے، اسی طرح ﴿فَمَحَوْنَاۤ اٰیَةَ الَّیْلِ وَجَعَلْنَاۤ اٰیَةَ النَّهَارِ مُبْصِرَةً لِّتَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِیْنَ وَالْحِسَابَ﴾ [الاسراء: ۱۲] (پھر ہم نے رات کی نشانی کو مٹا دیا اور دن کی روشن نشانی کو باقی رکھا، تاکہ تم اپنے رب کا رزقِ حلال حاصل کرسکو اور سالوں اور مہینوں کے حساب کو جان سکو)۔

اب قرآن پاک نے یہ بتادیا کہ حساب چاند سے بھی ہوسکتا ہے اور سورج سے بھی ہوسکتا ہے، لیکن ان دونوں کے دورے میں فرق ہے کہ چاند کا دورہ اٹھائیس راتوں میں مکمل ہوجاتا ہے اور سورج کا دورہ تقریباً تین سو ساٹھ دنوں میں مکمل ہوتا ہے۔ اب یہ چاند اٹھائیس راتوں میں اپنا دورہ مکمل کرلیتا ہے تو پھر جب وہ ڈوب جاتا ہے تو اگر وہ دو راتیں ڈوب جاتا ہے تو مہینہ تیس کا ہوگا اور اگر ایک رات ڈوبتا ہے تو مہینہ اُنتیس دن کا ہوگا تو اس سے اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے حساب رکھا ہے۔ لیکن اسلام میں حساب کا زیادہ دارومدار چاند کا ہوتا ہے۔ اس لیے کہ چاند کے منازل کو دیکھ کر حساب لگانا اتنا آسان ہے کہ جنگل میں رہنے والا بدو بھی چاند کو دیکھ کر بآسانی حساب لگا سکتا ہے کہ آج پہلی کا چاند ہے، آج دوسری کا اور آج تیسری کا چاند ہے، آج تیرھویں ہیں، آج چودھویں ہے وغیرہ وغیرہ، یہ حساب آسان ہے۔ اور سورج کا حساب آلاتِ رصدیہ کے سوا اس کو دیکھا اور سمجھا نہیں جاسکتا، گو اس کا حساب رکھنا بھی جائز ہے، لیکن شریعت کے احکام کا مدار چاند کے حساب پر ہے۔ لہٰذا علماء کرام نے لکھا ہے کہ اگر کوئی آدمی چاند کے حساب کو بالکل چھوڑ دے اور اپنے معاملات کو صرف شمسی تاریخوں کے حساب پر رکھے جیسے آج کل عام رواج ہوگیا ہے کہ مسلمانوں کو بالکل پتہ ہی نہیں ہوتا کہ آج اسلامی مہینہ کون سا ہے تو یہ جائز ہے، لیکن وہ گناہ گار ہوگا۔ اس لیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے پسندیدہ نظام کو چھوڑنے کا ذریعہ بن رہا ہے۔ البتہ آپ نے غیر ملک سے معاملات

کرنے ہیں تو علیحدہ بات ہے۔ لیکن اپنے پاس کوئی عربی تاریخوں کے محفوظ رکھنے کا ذریعہ تو بنائیے، تا کہ تمہیں پتہ چلے کہ اسلام کیا کہتا ہے کہ اسلام کے مہینے کون کون سے ہیں؟ اسلام کے مہینوں کی ابتداء وانتہاء کہاں سے ہوتی ہے؟ تا کہ آپ کو پتہ ہو کہ محرم الحرام کیا ہے؟ نیز صفر، ربیع الاول، ربیع الثانی، جمادی الاول، جمادی الثانی، رجب، شعبان، رمضان، شوال، ذی القعدہ اور ذی الحجہ کیا ہیں؟

مسلمانوں کو کم از کم ان کا حساب رکھنا بھی ضروری ہے، تا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے دین سے متعلق رہیں۔ اور جیسے ہمارے حساب کا دارومدار چاند پر ہے تو ہماری تاریخ کی ابتداء بھی ہجرت محمد مصطفیٰ ﷺ سے ہے، اس لئے مسلمانوں کی تاریخ کو ہجری کہا جاتا ہے، جیسے آپ دیکھیں گے کہ ۱۴۱۵ھ۔ تو دوسروں کی یعنی عیسائیوں کی تاریخ کو میلادی کہا جاتا ہے، جیسے آج کل لکھا جاتا ہے ۱۹۹۴ء۔ تو جو انیس سو چورانوے ہے وہ میلادی ہے۔ میلادی کا معنی یہ ہے کہ انہوں نے اپنی تاریخ کی بنیاد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی میلاد سے رکھی ہے۔

اس لئے میلاد منانا جیسے آج کل مالدار لوگ اپنی سالگرہ مناتے ہیں، یہ اسی عیسائیت کی اور انگریزوں کی اتباع اور تقلید ہے، اس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس لیے جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے مشورہ کیا کہ ہم اپنی تاریخ کی ابتداء کہاں سے کریں تو لوگوں نے کہا کہ جس دن آپ ﷺ پیدا ہوئے، ہم بھی اپنی تاریخ کی ابتداء اسی دن سے کریں گے تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے فرمایا کہ پھر ہمارے اور نصاریٰ کے درمیان کیا فرق رہا؟ وہ بھی میلادی اور ہم بھی میلادی، وہ بھی سالگرہ والی پارٹی اور ہم بھی سالگرہ والی پارٹی۔

پھر یہ بھی ہے کہ کتنے بڑے مسلمان کا گھر کیوں نہ ہو، وہ سالگرہ مناتے بھی نصاریٰ کے طریقے پر ہیں اور من وعن ایسی نقل کرتے ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ واقعی نصاریٰ کی اولاد ہیں (اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ)۔ اگر ہم نے حضور اکرم ﷺ سے محبت کی ہوتی تو کیا آپ ﷺ نے اپنی، اپنے بیٹوں یا بیٹیوں وغیرہ کی سالگرہ منائی؟ اور اگر حضور اکرم ﷺ نے نہیں منائی اور ہمارا ایمان ہے کہ ہمارے کروڑوں بیٹے حضرت محمد عربی ﷺ کے ایک بیٹے کی جوتی کے برابر بھی نہیں ہو سکتے تو اگر ان کے لیے نہیں تو ہم نے یہ کس کی اتباع کی ہے؟ نہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے منائی، نہ تابعین نے اور نہ ہی اہل بیت نے تو ہم کس کی اتباع میں منا رہے ہیں؟ کہتے ہیں: جی! یہ خوشی ہے۔ کیا خوشی؟ اور غیر اسلامی؟ پس اسلام نے میلاد کو کوئی اہمیت نہیں دی۔

اور بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے یہ کہا کہ ہم اپنی تاریخ کی ابتداء اس دن سے رکھیں جس دن قرآن اُترا۔ انہوں نے

کہا کہ قرآن تو تیئیس (23) برس اُتر تا رہا۔ پھر انہوں نے کہا کہ نہیں، بلکہ ہم اپنی تاریخ کی ابتداء اس دن سے رکھیں جس دن حضور اکرم ﷺ کی ہجرت سے اسلام چمکا ہے کہ جب اللہ پاک کے نبی ﷺ نے اسلام کے لئے گھر چھوڑا، اسلام کے لیے قربانیاں دیں اور اپنا محبوب وطن چھوڑا، اللہ تعالیٰ کا گھر چھوڑا، غاروں میں پناہ لی، چھپ چھپ کر سفر کئے اور اسلام کو اللہ تعالیٰ نے پھر چار چاند لگا دیئے کہ اسلام ہجرت کے بعد چڑھتا گیا، چڑھتا گیا اور پھیلتا گیا تو انہوں نے کہا کہ تاریخ کی ابتداء ہجرت سے ہی رکھو۔ اس لئے ہماری تاریخ بھی ہجری ہے اور ہماری تاریخ کا مدار بھی چاند پر ہے۔

اور یاد رکھیں کہ جو لوگوں کی فلسفیانہ بحثیں ہیں کہ زمین گھومتی ہے یا چاند گھومتا ہے یا دونوں گھومتے ہیں یا یہ بالعرض گھومتے ہیں یا بالطول گھومتے ہیں، ان کے چکر مستوی ہیں یا قمقری ہیں، یہ سب فضول بحثیں ہیں۔ پہلی بات یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہمیں ان بحثوں میں ڈالا ہی نہیں، بس اللہ پاک نے فرمایا کہ تمہارا کام عبادت کرنا ہے اور میری ان نعمتوں اور صنعتوں میں غور کر کے اپنے خالق اور مالک کو پہچانو۔ تم ان اُلجھنوں میں زیادہ نہ پڑو کہ زمین چکر لگاتی ہے یا چاند چکر لگاتا ہے۔

قرآن پاک میں ایسے الفاظ ملتے ہیں ان سے ان دونوں کی نہ نفی ملتی ہے اور نہ ہی اثبات ملتا ہے۔ لہٰذا ہمیں اس اُلجھن میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے؟ اب جب ''أهلة'' (چاند) کے بارے میں سوال ہوا تو اللہ تعالیٰ نے اس کی مصلحتیں بتائیں کہ اس میں بحث نہ کرو کہ چاند بڑھتا کیوں ہے؟ بس یہ سمجھو کہ اللہ تعالیٰ نے اس میں تمہارے لئے فائدے رکھے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے ان کی منازل مقرر کی ہیں:

﴿وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ حَتّٰى عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِيْمِ ۝ لَا الشَّمْسُ يَنْۢبَغِيْ لَهَآ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ ۭ وَكُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ ۝﴾ [یسین:۳۹، ۴۰]

سورج غروب ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ کے حضور سجدہ کرتا ہے اور پھر اجازت مانگتا ہے کہ یا اللہ! مجھے اجازت دے تو حکم ہوتا ہے کہ تم جہاں سے چلے تھے وہاں سے طلوع ہو جاؤ۔ اسی طرح وہ چلتا رہے گا، حتیٰ کہ ایک وقت آئے گا کہ قیامت قریب آئے گی تو سورج اجازت مانگے گا کہ یا اللہ! مجھے اجازت فرمائیں۔ اللہ پاک فرمائیں گے کہ آج تمہیں اجازت نہیں، بلکہ آج تم مشرق کی بجائے مغرب سے طلوع ہو جاؤ تو پھر سورج مشرق سے نکلنے کی بجائے مغرب سے نکلے گا، اور جب سورج کا طلوع مغرب سے ہو جائے گا تو توبہ کے دروازے بند ہو جائیں گے، پھر ہم لاکھ توبہ کریں تو توبہ قبول

نہیں ہوگی۔ یہ قیامت کی آخری نشانی ہوگی، "إِذَا طَلَعَتِ الشَّمْسُ مِنْ مَغْرِبِهَا أُغْلِقَتْ أَبْوَابُ التَّوْبَةِ" جب سورج مغرب سے نکلے گا تو توبہ کے دروازے بند ہو جائیں گے، پھر توبہ قبول نہیں ہوگی۔

اس لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے چاند میں تمہارے لئے آسانی رکھی ہے کہ وقت معلوم کرو حج کا، عبادت کا، روزے کا، صوم کا، معاہدات وغیرہ کا۔ سب تمہارے لئے "أهله" میں ہیں اور اللہ تعالیٰ نے ایک دوسرا مسئلہ بھی بیان فرمادیا۔

زمانۂ جاہلیت کی بُری رسمیں:

﴿وَلَيْسَ الْبِرُّ بِأَنْ تَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ ظُهُورِهَا وَلَكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقَى ۗ وَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ أَبْوَابِهَا﴾ زمانۂ جاہلیت میں رسم تھی کہ جب حج کے لئے احرام باندھ لیا جاتا تھا تو احرام باندھ کر جب گھر سے نکل آئے تو اب پھر گھر میں دوبارہ جانے کی کوئی ضرورت پیش آگئی تو اب گھر میں دوبارہ کیسے جائیں کہ اس کا طریقہ یہ ہے کہ پیچھے سے دیوار توڑ کر یا دیوار پھلانگ کر چلے جاؤ تو یہ جائز ہے، لیکن دروازے سے نہ جاؤ۔

یعنی ہمارے مسلمان بھی بڑے سمجھدار ہیں کہ منگل اور بدھ کے دن سفر نہ کیا کرو کہ یہ منحوس دن ہیں۔ اگر ان دنوں میں بیٹا پیدا ہو تو کیا اسے پھینک دیتے ہیں؟ وہ بھی تو پھر منحوس ہوگا۔

اسی طرح کوئی کسی کام کے لئے جارہا تھا اور کسی دوسرے نے پیچھے سے آواز دے دی تو جی یہ تو بڑا منحوس کام ہو گیا۔ اب تو یہ کام نہیں ہوگا۔ یعنی آواز دینے والے نے آواز دے کر تقدیر ہی بدل دی۔ کیا آواز دینے والے کے ہاتھ میں تقدیر ہے؟

اب جارہے ہیں اور آگے کالے رنگ کی بلی آگئی اور کہا کہ بس کام برباد ہو گیا، اس لئے کہ بلی نے راستہ کاٹ دیا۔ اللہ تعالیٰ نے جسے فی احسن تقویم بنایا، اس کی تقدیر بلی نے بدل ڈالی، سبحان اللہ! یہ کیا عقل کی بات ہے؟ کتا گزر جائے تو تقدیر خراب نہیں ہوتی، اس لیے کہ کتا تو انگریز کو پیارا ہے، وہ تقدیر کو کیسے خراب کرسکتا ہے؟ اور آج کل مسلمان بھی بطور فیشن اس (کتے) کو کاروں میں بٹھاتے ہیں، سیٹ پر بٹھاتے ہیں، رات کو اکٹھے سلاتے ہیں، اس کو باقاعدہ شیمپو سے نہلاتے ہیں، مکھن کھلاتے ہیں۔ غریب کا بچہ بھوکا مرجائے تو کوئی فرق نہیں پڑتا، مرتا ہے تو مر جائے، لیکن ہمارا ٹونی بھوکا نہ رہے۔ کبھی سوچا کہ یہ کیا ہے؟ اگر اللہ تعالیٰ نے ہمارا حشر کتے کے ساتھ کردیا تو ہمارا

حشر کیا ہوگا؟ کیونکہ جس سے محبت کرتا ہے، جس کی نقل اُتارتا ہے، اس کا اسی کے ساتھ حشر ہوگا۔

زمانۂ جاہلیت میں بھی یہ رسم تھی کہ گھر جانا ہے تو پیچھے سے نقب لگا کر داخل ہو جاؤ لیکن دروازے سے داخل نہ ہو۔ اس لیے کہ ہم تو گھر سے نکل آئے اور احرام باندھ لیا۔ اگر ہم واپس چلے گئے تو ہمارا حج تو خراب ہو جائے گا۔ دیکھا نہیں کہ ہمارے کئی بھائی گھر سے آجاتے ہیں تو ٹکٹ میں اگر گڑ بڑ ہو جائے یا کسی بھی وجہ سے وہ نہ آسکیں تو وہ کراچی میں ہی رہ جاتے ہیں کہ جب حاجی واپس ہوتے ہیں تو وہ بھی ہار پہن کر گھر چلے جاتے ہیں۔ اگر پہلے چلے جائیں تو لوگ کہیں گے کہ دیکھو جی! یہ وہابی تھا، آگیا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے آنے ہی نہیں دیا۔ اس لیے سمجھدار آدمی کراچی رہ جاتے ہیں جب حاجی واپس جائیں گے تو ہم بھی گلے میں ہار ڈال کر واپس چلے جائیں گے۔ وہ کہتے ہیں کہ گلے میں ہار ہی ڈالنا ہے اور کیا ڈالنا ہے تو حج پڑھ کر آرہے ہیں ماشاءاللہ! دین اس کو بھی نہیں آتا، مسئلے کا اسے بھی نہیں پتہ، مجھے بھی نہیں پتہ، جیسے اللہ تعالیٰ کی رحمت سے وہ خالی واپس آرہا ہے، میں بھی خالی ہوں تو ہم دونوں برابر ہیں فرق صرف اتنا ہے کہ وہ سمندر کے اُدھر سے آرہا ہے اور میں اِدھر سے آرہا ہوں، دونوں برابر۔

بہت سے لوگ بیس سال سے کعبہ کا طواف کر رہے ہوتے ہیں، لیکن ایک دفعہ بھی صحیح نہیں کرتے۔ اس لئے کہ کبھی کسی سے پوچھنا چاہتے بھی نہیں، علم کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ کئی لوگ ہر سال حج پڑھتے ہیں اور ہر سال غلطی کرتے ہیں اور پھر آکر مسئلہ پوچھتے ہیں، اس لئے کہ ضرورت ہی نہیں ہے۔ ہمارے بڑے بڑے کالجوں میں سب سے غیر ضروری پرچہ اسلامیات کا ہوتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اسلام کو سیکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔

اسی طرح اللہ پاک نے فرمایا کہ یہ کوئی نیکی نہیں ہے کہ دیواریں توڑ کر پیچھے سے داخل ہو جاؤ۔ اصل نیکی تو اللہ تعالیٰ سے ڈرنا ہے۔ جو اللہ تعالیٰ سے ڈر گیا، وہی کامیاب ہوگیا۔ اپنی عقل نہ چلاؤ، اپنی طرف سے غیر ضروری چیزوں کو ضروری نہ بنادو۔ بس اللہ تعالیٰ سے ڈرو، اپنی طرف سے غیر دینی چیزوں کو دین نہ بناؤ۔ اسی کا نام بدعات ہے۔ ہم نے غیر ضروری چیزوں کو ضروری بنا ڈالا ہے۔ وہ احکام جن کا قرآن وسنت میں ذکر تک نہیں ہے وہ ہمارے نزدیک فرض کے برابر بن گئے، فرض ہم سے چھوٹ گیا ہے، لیکن یہ چیزیں ہم سے نہیں چھوٹتیں۔ بجائے ثواب کے اللہ تعالیٰ کی لعنت ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں صحیح سمجھ نصیب فرمائے۔

تفسیرِ مکی

اس کائنات رنگ و بو میں کچھ ہستیاں ایسی ہیں جو مخلوق کے قلب
کے لیے متاعِ سکون کا ذخیرہ بھی ہیں [illegible]
کی کڑی ہے جس میں تجلیوں کا اجتماع ہے جو مخلوق کے دلوں کو گرمانے کا سامان بھی ہے
جس کا شاہد مسجد الحرام میں جمعہ کا خطبہ حضرت مولانا مکی صاحب دامت برکاتہم
العالیہ کے درسِ قرآن کے حلقوں کی پہچان بنا ہے حضرت مولانا مکی صاحب
دامت برکاتہم العالیہ کے درس کا یہ حسن ہے کہ جہاں توحید خالص کے موتی
اور سنت کی ترویج پر زور دیتے ہیں، وہیں حق و باطل کی پہچان کے ساتھ
سامعین کی محبت و احترام پر کوئی حرف نہیں آنے دیتے، بلکہ اپنے اکابر کے
طریق پر چلتے ہوئے جس کمال مہارت سے سامعین کو راہِ اعتدال پر گامزن
کرتے ہیں یہ انہی کے درس کا خاصہ ہے۔ حضرت اقدس دامت برکاتہم
العالیہ کے درس میں جہاں علمی نکات کی کثرت ملتی ہے وہیں حالات
حاضرہ اور آخرت سے متعلق [illegible]
بھی زور دیا جاتا ہے [illegible] تفسیر [illegible] حضرت
اقدس دامت برکاتہم العالیہ کے دروس کا مجموعہ ہے



مکتبہ